حضرت امام
ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ
کی
سیاسی زندگی
از
علامہ سید مناظر احسن گیلانی مرحوم
صدر شعبہ دینیات جامعہ عثمانیہ
مکتبۃ الحق
ماڈرن ڈیری جوگیشوری ممبئی
www.besturdubooks.wordpress.com

حضرت امام ابوحنیفہ رض کی سیاسی زندگی

از

علامہ سید مناظر احسن گیلانی مرحوم
صدر شعبہ دینیات جامعہ عثمانیہ

ناشر
مکتبہ الحق
ماڈرن ڈیری جوگیشوری ممبئی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نام کتاب ــــ حضرت امام ابوحنیفہؒ کی سیاسی زندگی

مصنف ــــ علامہ سید مناظر احسن گیلانی مرحوم
صدر شعبہ دینیات جامعہ عثمانیہ

استدعا

اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے انسانی طاقت اور بساط کے مطابق کتابت، طباعت، تصحیح اور جلد سازی میں پوری پوری احتیاط کی گئی ہے۔
بشری تقاضے سے اگر کوئی غلطی نظر آئے یا صفحات درست نہ ہوں تو ازراہ کرم مطلع فرمادیں۔ ان شاء اللہ ازالہ کیا جائے گا۔ نشاندہی کے لئے ہم بے حد شکر گزار ہوں گے۔
(ادارہ)
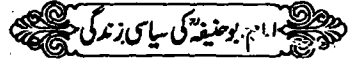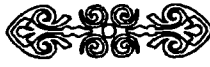
فہرستِ مضامین

حضرت امام ابوحنیفہ کی سیاسی زندگی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حرفِ آغاز

چوہدری محمد اقبال سلیم گاہندری

تقسیم ہند سے پہلے یہ جزیرہ نما خونی فسادات کی آگ میں لپٹا رہا، کبھی کلکتہ میں مسلمانوں کی خوں ریزی، کبھی بہار میں بے گناہ مسلمانوں پر بے پناہ مظالم، اور کبھی گڑھ مکتشیر کے معصوم مسلمانوں کے قتل وخون نے قوت فکر کو درہم برہم رکھا، خدا خدا کر کے مغربی سیادت ختم ہونے کا اعلان ہوا، اور بت کدۂ ہند میں ایک اسلامی حکومت وجود میں آئی، ہلالی پرچم لہرایا، ہم نے اطمینان کا سانس لیا۔ مگر اعلانِ تقسیم کے دو ہی دن بعد کافروں نے مشرقی پنجاب میں اللہ کا نام لینے والوں پر اللہ کی زمین تنگ کر دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سارا علاقہ مسلمانوں کے خون سے سیراب ہو گیا۔ علاقے کے علاقے پھونک دیئے گئے۔ خون اس طرح بہایا گیا کہ دوآبہ جالندھر دریائے خون میں ڈوب گیا۔ مسلمانوں کی شہ رگوں سے بہائے جانے والے خون کا ایک طوفان اٹھا جس نے دوآبہ کے پانی کو بھی پانی کر دیا۔

یہ بدنصیب بھی اسی دوآبہ کا رہنے والا ہے، میرا گاؤں گاہندراں ضلع جالندھر بھی تباہ و برباد ہوا۔ بچپن کے ساتھی، عزیز و اقارب سب کے سب منتشر ہو گئے۔ میں ڈیڑھ ہزار میل کے فاصلہ پر حیدرآباد دکن میں تھا، دل ریش، دماغ پریشاں، اس حالت میں کسی اشاعتی پروگرام کا روبہ عمل لانا ممکن ہی کہاں تھا۔

مشرقی پنجاب اور دہلی کے کافرانہ مظالم نے سی۔ پی، اور برار کے مسلمانوں پر دہشت طاری کر دی، اور وہ گھبراہٹ و پریشانی میں امن اور پناہ کے لیے حیدرآباد دکن

کی طرف روانہ ہوئے، اس طرح بھی دوستوں اور ملاقاتیوں کی ایک بڑی کثیر تعداد متاثر ہوئی، تھوڑے ہی دنوں کے بعد حیدرآباد کا ۸۲ ہزار مربع میل رقبہ ہندوستانی سنگینوں اور ٹینکوں کی زد میں آ گیا اور آنکھ جھپکتے ہی مملکت آصفیہ مملکت ہند کا جزو بن کر رہ گئی۔ سر زمین دکن میں جہاں سے ہم نے تذکرۂ حضرت شاہ ولی اللہ، اسلام کا نظام حیات، اسلامی نظریۂ اجتماع اور حکومت الٰہیہ جیسی کتابیں شائع کی تھیں، اب یہ حال تھا کہ ان کتابوں کا ناشر کہلانا، اقرارِ جرم کے برابر تھا۔

جوں توں کر کے ۲۰/نومبر ۱۹۴۸ء کی شام کو چھ بجے میں ''اپنی مملکت'' میں پہنچ گیا۔ کئی سال کے مسلسل تجارتی نقصانات، مالی دشواریوں اور سب سے زیادہ کراچی میں رہائشی دشواریوں کے لاینحل مسئلہ سے الجھ رہا ہوں۔ نجات تو اب بھی نہیں ملی ہے، لیکن کسی نہ کسی طرح قوائے عملیہ کو مجتمع کر کے اس قابل ہوا ہوں کہ یہ کتاب ''امام ابو حنیفہ کی سیاسی زندگی'' فاضل اجل حضرت علامہ سید مناظر احسن گیلانی، صدر شعبۂ دینیات جامعۂ عثمانیہ کی عظیم الشان اور بے مثل تصنیف، جسے مولانا موصوف نے ۲۵ سال کی مسلسل محنتوں کے بعد تیار کیا ہے۔ پیش کر رہا ہوں۔

حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ عالم اسلام کے ہر دل عزیز قابل فخر پیشوا اور قانون و دستور اسلامی کے سب سے بڑے ماہر تھے۔ قابل افسوس ہے کہ اس عظیم المرتبت امام کے حالات سے ہم ناواقف رہیں! خدا جزائے خیر دے علامہ شبلی نعمانی کو کہ انھوں نے اپنی کتاب کے ذریعہ بڑی حد تک اس کمی کو پورا کیا اور ان کی عظیم المرتبت شخصیت سے دنیائے اردو کو واقف کرایا۔ اب ہم سب شکر گزار ہیں فاضل محترم علامہ مناظر احسن گیلانی کے کہ انھوں نے ۲۵ سالہ محنت سے حضرت امام اعظم کی سیاسی زندگی سے ہمیں روشناس کرایا۔ حضرت امام ابوحنیفہؒ صرف سب سے بڑے فقیہ نہ تھے بلکہ وہ ایک بلند مرتبہ سیاسی رہنما بھی تھے۔ اور ان کی یہ حیثیت صرف اسی کتاب کے ذریعہ معلوم ہو سکے گی۔

فاضل مصنف نے ضمناً اس وقت کی سیاست اور اجتماعی زندگی پر بھی سیر حاصل بحث کی ہے۔ کہ آخر اموی، اور اوّلین عباسی دور میں جماعتی زندگی کیا تھی۔ مسند نشینانِ

علم و ادب اور جرأت آزمایانِ میدان قتال سے لے کر معمولی شہری زندگی تک کے حالات بڑی خوبی اور تفصیل کے ساتھ اس میں ملیں گے۔ عدالتی کارروائیاں، انصاف رسانی، اور مختلف سیاسی گروہوں کی جدوجہد کا ایک مکمل نقشہ اس میں نظر آتا ہے۔ اسلامی دستور حکومت، عامۃ المسلمین کے حقوق، انتخاب کا حق، اصول، آزادی کا نصب العین، جابر اور سخت گیر کے مقابلہ میں حق و صداقت کی صف آرائی، استقلال، صبر اور رضا کے وہ گراں بہا نمونے دکھائی دیں گے جن پر عالم انسانیت قیامت تک فخر کرتی رہے گی۔

میں اس کتاب کی اشاعت کو حاصل زندگی، اور اپنے سیاہ نامۂ اعمال میں ایک تابندہ سطر سمجھتا ہوں۔ کتاب اس سے پہلے شائع ہو چکی ہوتی، لیکن جیسا کہ اوپر لکھے ہوئے حالات سے ظاہر ہے، پریشانی، حیرانی، انتشار، اور بدامنی نے اشاعت کا موقعہ آنے نہیں دیا۔ اب جب کہ ہماری نوزائیدہ مملکت پاکستان کا دستورِ اساسی ترتیب و تدوین کی منزل میں ہے، اس کتاب کی اشاعت عمل میں آ رہی ہے اور شاید اللہ جل جلالہ کو یہی منظور تھا کہ ٹھیک اس وقت اس کی اشاعت ہو، جب کہ اہل علم سب سے زیادہ اس کی ضرورت محسوس کریں۔ یقیناً اس وقت جب کہ دنیا میں دو متضاد نظریۂ حیات کی کشمکش نے اللہ کی زمین کو اللہ کے بندوں کے لیے گہوارۂ راحت ہونے کے بجائے مقام کلفت و بے چینی بنا رکھا ہے اور مملکت پاکستان کی دستور سازی میں اس کی سعی ہو رہی ہے کہ درد و کرب سے کراہتی ہوئی دنیا کی ایک ایسے دستورِ مملکت کی طرف رہنمائی کی جائے جو اس کی نجات کا ذریعہ بن سکے۔ عالم اسلام کے سب سے بڑے فقیہ، امام اعظم کے سیاسی حالات اور ان کے افکار سے واقفیت بہر گونہ مفید ہوگی۔

خداوند تعالیٰ کا شکر ہے کہ اس نے مجھ جیسے ہیچمدان اور آغشتۂ عصیاں کو یہ توفیق دی کہ آج میں ایک فاضل اجل کی ۲۵ سالہ محنت کا ثمرہ امام اعظم کے سیاسی حالات و افکار کا مجموعہ پیش کر رہا ہوں۔

این سعادت بزورِ بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

اِنتساب

امامِ اعظمؓ

کی

خدمت میں

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

امام ابو حنیفہؒ کی سیاسی زندگی

کچھ اس تالیف اور اس کے مؤلف کے متعلق

جناب محترم ڈاکٹر حمید اللہ صاحب ایم، اے۔ پی، ایچ، ڈی

استاذی المحترم مولانا الحاج الحافظ سید مناظر احسن گیلانی مرحوم کی تالیف "امام ابوحنیفہ کی سیاسی زندگی" ابھی ابھی کراچی میں طبع ہوئی ہے۔ عموماً مؤلف اپنے اساتذہ یا مشابہ اساتذہ علماء سے کوئی تعارف یا پیش لفظ حاصل کرتے ہیں۔ فاضل استاذ کی گراں مایہ تالیف ان کے سب سے ادنیٰ و حقیر تلمیذ کے پاس آئی ہے تو ایک پیش لفظ کے ذریعہ سے خود سعادت اندوز ہونے کے سوا اور تو کوئی سوال نہیں۔ اگر ناشر کا بیان نہ ہوتا کہ خود استاذ محترم نے مجھ سے کچھ لکھوا لینے کا حکم دیا ہے تو شاید اس طرح کی سعادت اندوزی کو بھی گستاخی سمجھتا۔ "مشک آنست کہ خود ببوید" نہ کہ "شاگردی پراند"

مؤلف کی سوانح عمری:

علماء کی بے نیازی اور کسر نفسی شہرہ آفاق ہے۔ اسی لیے باوجود ملک کے مؤلفین کی صف اوّل میں ہونے کے استاذ محترم کی سوانح عمری کہیں چھپی ہوئی نہیں ملتی۔ اپنی معلومات درج کرتا ہوں تاکہ بعد والے کے لیے کچھ کام دیں۔

مناظر احسن (۱۳۱۰ھ) آپ کا تاریخی نام ہے۔ (میم کے زبر کے ساتھ) اور ماشاء اللہ اسم بامسمیٰ ہیں۔ خیال ہوگا کہ ابھی تو "ساٹھا پاٹھا" ہونے کو بھی ایک دو سال باقی ہوں گے۔ لیکن علم کی بدقسمتی ہے کہ مولانا کی صحت بہت کمزور ہے۔ قلب کے اور دیگر عارضوں سے بارہا طویل عرصوں تک علیل و فریش رہے ہیں۔ خدا آپ کی عمر و صحت میں

برکت عطا فرمائے۔ آمین

آپ کی ولادت صوبہ بہار میں گیلانی نامی گاؤں میں ہوئی۔ یا نسبت کے مزید اضافے کی جگہ آپ اپنے کو گیلانی ہی لکھتے ہیں۔ قطب الاقطاب گیلان سے نسبت گویا مقصود تھی۔ آپ کا تعلق نہ صرف بلند مرتبت شرفائے سادات سے ہے بلکہ علم وعمل بھی موروثی ہے۔ آپ کے بزرگوں کو غالباً علم ہیئت سے بھی خاص لگاؤ رہا ہوگا کیونکہ مکان میں ایک بہت پرانی اور عمدہ سنگ مرمر کی دھوپ گھڑی بھی دستیاب ہوئی تھی جو اوقات الصلاۃ کے لیے فرنگی گھڑیوں کی محتاجی سے بچاتی رہی ہوگی۔

آپ کی تعلیم متعدد دینی درس گاہوں میں ہوئی۔ بعض وقت ایسی صورتوں میں آدمی لا الی ھؤلاء ولا الی ھولاء ہو جاتا ہے۔ مگر مولانا میں علم وسیرت کی بڑی شان نظر آتی ہے کہ دیوبندی آپ کو اپنا کہتے ہیں تو بریلوی اپنا۔ ان دونوں مکاتب خیال کی انگریزی دور میں ملک میں جو ''مکافرت'' اور کشمکش تھی اس میں یہ اپنایا جانا حیرت انگیز ہے۔ مگر مولانا حقیقت میں ان دونوں سے بھی بالا ہیں یعنی آپ صرف مسلمان ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کسی کو نہ سنی شیعہ بنانے آئے تھے نہ حنفی وہابی۔ بلکہ ان الدین عنداللہ الاسلام کے ازلی پیغام کی تجدید کے لیے۔

جہاں حسن وجمال سے فائز، سرخ وسپید ہزاروں میں ممتاز وفائق تھے وہاں حسن باطنی

بالائے سرش زہوش مندی
می تافت ستارۂ بلندی

نوعمری ہی سے خطابت، انشاء پردازی اور شاعری، تینوں میں ہمسروں میں ممتاز رہے، کبھی گندی سیاسیات میں حصہ نہ لیا۔ اس لیے زورِ زبان وخطابت کے لیے محافل وعظ میں آپ کے لیے زیادہ کشش رہی تو زورِ قلم اور نظم ونثر ٹھوس علمی اور بلند پایہ جرائد کے سوا آپ کو کہیں اور نہ لے جاسکے۔

ایک مرتبہ فرما رہے تھے نوعمری میں میری ایک نظم کسی رسالے میں چھپی۔ برسوں گذر گئے میں خود اسے بھول بھلا گیا۔ پھر ایک مرتبہ ایک صاحب سے کہیں ملاقات ہوئی

جو شاعر بھی تھے انھوں نے اپنے جس کلام کو فخریہ سنانے کے لیے بیاض میں سے انتخاب کیا وہ وہی بھولی بسری نظم تھی۔ پہلی بیت ہی پر کھٹکا کہ یہ تو پہلے بھی کہیں پڑھی سنی ہوئی نظم ہے۔ دورانِ انش ء میں یاد آ گیا کہ

''چہ ولا دراست دزدی کہ بکف چراغ دارد۔'' اس سے کیا کہتے۔ صرف یہ کہا کہ ہاں بھئی نظم بہت اچھی ہے۔

ایک اور دفعہ ارشاد ہوا۔ مجھے ابتداء علومِ عقلیہ کا بڑا شغف تھا۔ حدیث وغیرہ سے دلچسپی نہ تھی۔ دیو بند میں شریک ہوا بھی تو ایک طرح سے غرور کے ساتھ کہ یہ بیچارے ہمیں کیا پڑھائیں گے۔ شیخ الحدیث کے درس میں پیچھے بیٹھتا تھا اور کچھ کھنچا کھنچا سا۔ چند دن گذرے تو استاذ نے خود توجہ کی۔ درس کے بعد ٹھیرایا اور پوچھا کہ کون ہو، تعلیم کا کیا حال ہے وغیرہ میں نے عرض کی کہ علوم عقلیہ پڑھ کر آ رہا ہوں۔ طرح طرح کے وسوسے دل میں ہیں اور حدیث شریف سنتے وقت بھی یہی حال رہتا ہے اس لیے ذرا پیچھے بیٹھتا ہوں۔ کہا اب آئندہ وسوسے نہیں ہوں گے۔ واقعہ یہ ہے کہ پھر اس دن کے بعد سے الحمد للہ وسوسوں کا نام ونشان نہ رہا اور میں روز افزوں دلچسپی سے علوم حدیث کی تحصیل میں مشغول ہو گیا۔

ملک کے مختلف مراکز علم میں تحصیل، چشم بد دور قابل رشک حافظہ اور ان سب کے ساتھ مطالعے کا ذوق اتنا کہ بیان سے باہر، اسی کا نتیجہ ہے کہ قلم برداشتہ لکھتے ہیں اور پھر بھی ایک بحر ذخار نظر آتا ہے کہ موجیں مارتا، ناظر کے قلب ودماغ کو غرقاب کرتا سب پر چھاتا نظر آتا ہے۔ جامعہ عثمانیہ میں درس کے علاوہ مجھے پانچ سات دفعہ آپ کی تقریریں پبلک میں سننے کا موقعہ ملا ہے۔ کبھی سیرت النبی کے مرغوب موضوع پر، کبھی اشتراکیت کے اسلامی نقطۂ نظر سے چھان بین پر۔ جیسے جیسے تمہید کے بعد آگے بڑھتے ہیں۔ زورِ بیان بڑھتا جاتا ہے۔ اور جیسے جیسے زورِ بیان بڑھتا ہے، جوشِ بیان بھی۔ سننے والے مسحور رہتے ہیں تو خود خطیب بھی خطابت کے کیف سے سرشار۔ آواز گونجنے لگتی ہے۔ خیالات کی مناسبت سے اعضاء میں تڑپ اور حرکت، گانے میں باجے، یا فوجی بینڈ میں ڈھول کی

اثر انداز صداؤں کا آمیزہ کر دیتے ہیں۔ الفاظ ہیں کہ آبشار کی طرح بیش از بیش گرتے چلے جاتے ہیں۔ بلکہ لغت خیالات کا ساتھ نہیں دے سکتی اور ہر قدم پر نئے الفاظ کی ضرورت پیش آتی ہے اور وہ خود بخود ڈھل ڈھل کر زبانِ سخاوت نشان پر نثار ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اور نئے الفاظ ہونے کے باوجود نامانوس نہیں ہوتے۔ جیسے ایک دن ایسے ہی ایک موقعہ پر کہا۔ ایک بڑا مچھلا ہے کہ چھوٹی مچھلیوں کو نگلتا جاتا ہے۔" تقریر کی روانی کا یہ حال ہے کہ ملک کے تیز قلم سے تیز قلم۔ مختصر نویس' (اسٹینوگرافر) بارہا کوشش کرتے رہے مگر کبھی کامیاب نہ ہوئے کہ آپ کی رفتارِ بیان کا ساتھ دے سکیں۔

حیدر آباد میں آمد:

پہلی عالمگیر جنگ کا زمانہ تھا، انگریز کے دورِ ستم میں ایک سیاسی پناہ گزیں کی طرح پایۂ تخت آصفیہ حیدر آباد دکن میں تشریف لائے بے کس و بے سہارا تھے۔ ذوق و عادت سے مجبور ہو کر حیدر آباد کی مشہور صد سالہ دینی درس گاہ جامعہ نظامیہ میں نام لکھا دیا جہاں تعلیم، قیام، طعام، بلکہ کتب ولباس تک سب کو مفت ملتے تھے۔ لیکن حالات نے اس کا موقعہ نہ دیا کہ ان سہولتوں سے کچھ استفادہ کرتے۔ جلدی ہی جامعہ عثمانیہ قائم ہو گئی اور غالباً مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی (وزیر امور مذہبی) کی توجہ سے آپ کو فنون و سائنس کی جماعتوں میں سنی طلبہ کو "دینیات لازم" پڑھانے کے لیے بطور لکچرار لے لیا گیا۔ اس کی ماہوار (۲۵۰ تا ۴۰۰) تھی۔

جامعہ عثمانیہ کوئی پھولوں کی سیج نہ تھی۔ ایک خودمختار دیسی ریاست ہونے کے باوجود انگریزی سفیر مقیم (ریذیڈنٹ) کی مرضی کے خلاف کوئی اہم کام مشکل سے ہو سکتا ہے۔ جدید وضع کی جامعہ اور ذریعہ تعلیم انگریزی نہ ہو بلکہ اردو، یہ گھریلو حیدر آبادی چیز نہ تھی، اس کے اثرات سارے برطانوی ہند کے نظامِ تعلیم پر پڑتے۔ انگریز کیوں منظور کرتا کہ اس کی بات کے چلتے انگریزی زبان پر کوئی ٹیڑھی نظر بھی ڈال سکے۔ لیکن بہر حال انگریز نے اسے منظور بھی کیا تو اس تصور اور تیاری کے ساتھ کہ "نظام کے خرچ پر یہ تجربہ کرایا جائے اور اس کے ناکام ہونے پر برطانوی ہند کے سیاسی شورش کرنے

والوں کو بتایا جائے کہ کسی ''کالی'' زبان میں جدید علوم کی تعلیم نہیں ہوسکتی۔

ملک کے اعلیٰ حکام میں جو رقابتیں ہر جگہ ہوتی ہیں، اس کے تحت بعض نہایت بااثر افسر ہمیشہ اس پر تلے رہے کہ یہ جامعہ چلنے نہیں۔

قدامت پسندی اور نئی روشنی کی کشمکش نے نصاب ساز جماعتوں کو اس پر آمادہ نہ ہونے دیا کہ نصاب قومی ضروریات کے مطابق بنایا جائے بلکہ صرف اس پر کہ صرف زبان کی تبدیلی کے ساتھ برطانوی ہند کی جامعات ہی کا نصاب جاری ہو۔ طالب علم چاہے انگریزی میں کتابیں پڑھ کر دہریہ، غلامانہ ذہنیت والا اور اپچ سے عاری بنے یا اردو میں پڑھ کر۔ فرق تو کچھ نہیں بلکہ خطرہ ہی بڑھ جاتا ہے کہ دہریت وغیرہ اب عوام کی دست رس میں بھی آجائے۔ صرف اتنا ہوا کہ جملہ طلبہ کو چاہے فنون کے ہوں یا سائنس کے، مذہب واخلاق پر بھی ہفتے میں دو گھنٹے لازمی طور پر لکچر ہوا کریں۔ سنیوں کے لیے دینیات لازم کے نام سے اور غیروں کے لیے اخلاقیات کے عنوان سے۔

دینیات لازم کے لکچرار کا فریضہ بڑا کٹھن اور نازک تھا۔ فلسفہ اور سائنس کے طلبہ اس سے آئے دن اور ہر سال سوال کرتے۔ بعض دق کرنے کے لیے اور بعض نیک نیتی سے ازالۂ شبہات کے لیے اور جو شخص خود ان جدید علوم سے بے بہرہ ہو وہ ان کی تشفی کیسے کرسکے۔ ابتداء میں صرف فطری ذہانت کام دیتی رہی ہوگی۔ پھر رفتہ رفتہ جدید علوم کی کتابیں ترجمہ ہوکر لکچرر دینیات کی دست رس میں بھی آتی گئیں اور وہ روزافزوں علوم جدید کے مختلف پہلوؤں سے واقف بھی ہوتے چلے گئے۔ ان کے کمزور پہلوؤں سے آگاہی جوابی اعتراض میں کام دیتی تو ان کے وسائل اور حربوں سے واقفیت کے باعث انھیں حربوں کو اسلام کی تائید میں استعمال کرنا ممکن ہوگیا۔ جو کام اپنے زمانے میں امام غزالی نے کیا، وہی کام اس جماعت۔ کے استاد کو کرنا پڑتا تھا اور کوئی ''احیاء العلوم'' ثانی چاہے ابھی تحریر میں نہ آئی ہو لیکن گزشتہ تیس سال سے سال بسال جامعہ عثمانیہ کے طلبہ اس جدید علم کلام سے مستفید ومتاثر ہوتے رہے ہیں اور نتیجہ یہ بتاتا ہے کہ ہمالیہ تلے کے براعظم کی ڈیڑھ دو درجن جامعات میں سب سے کم دہریت اگر کسی جگہ پھیل سکی تو وہ

جامعہ عثمانیہ رہی ہے۔ اور اس کا سہرا بہت بڑی حد تک صرف مولانا سید مناظر احسن گیلانی مدظلہ کے سر رہا ہے۔

آپ کچھ عرصہ شعبۂ دینیات میں رہے اور حدیث کا درس دیتے رہے اور غالباً انٹرمیڈیٹ میں مجھے اسی مضمون کے سلسلے میں چند دن شرف تلمذ کا راست موقعہ رہا۔ پھر وہ فنون وسائنس کے شعبوں میں دینیات لازم پڑھانے کے لیے بالکلیہ منتقل ہو گئے تو راست تلمذ کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ بہت برسوں کے بعد مکرر مولانا جواب لکچرار سے ترقی کر کے ریڈر بن چکے تھے، (اور ۳۵۰ تا ۶۰۰ ماہوار پاتے تھے) دوبارہ شعبہ دینیات میں منتقل ہوئے۔ مگر ایم۔اے میں میرا مضمون فقہ تھا۔ اس لیے راست تعلق پھر بھی پیدا نہ ہو سکا۔ مختلف درمیانی اساتذہ کی وفات، پیرانہ سالی کی بنا پر خدمت سے سبک دوشی وغیرہ کے باعث آخرالامر مولانا ہی سب سے سینئر ہونے کی بنا پر صدر شعبہ بنے۔ یہ دوسری جنگ عالمگیر سے کچھ ہی دن پہلے کا واقعہ ہے اس وقت ان کی ماہور (۵۰۰ تا ۱۰۰۰) ہو گئی۔ اور وہ فرسٹ گریڈ پروفیسر ہو گئے۔ علوم دینیہ کا اعزاز جامعہ عثمانیہ میں کسی اور دنیوی علم سے کم نہ تھا۔

میں ۱۳۵۵ھ (۱۹۳۵ء) میں جامعہ عثمانیہ شعبہ دینیات کا لکچرر فقہ بن کر مامور ہوا۔ لیکن چند ماہ بعد ہی شعبۂ قانون میں قانون بین الممالک وغیرہ پڑھانے کے لیے منتقل کر دیا گیا۔ اس طرح راست تلمذ کے بعد راست رفاقت بھی زیادہ دن نہ رہی لیکن ایک تو شخصی روابط، دوسرے ایک ہی عمارت میں ہم سب کا خدمت علم میں مشغول رہنا اور تیسرے نصابی وانتظامی مختلف کمیٹیوں میں آئے دن ملنے کا موقعہ اس دوری کو صرف نظری رکھتا ہے، واقعی نہیں۔ اور مولانا کی عملیت کو قریب سے دیکھنے کا موقعہ ملنے لگا۔

اس پندرہ سولہ سالہ خدمت جامعہ نے بڑا فرق پیدا کر دیا تھا۔ اب اس مولوی میں جو دیوبند وغیرہ سے دستارِ فضیلت باندھ کر آیا تھا، اور اس پروفیسر میں جو ایک جدید وضع کی جامعہ میں درس دے رہا تھا، کوئی نسبت تھی تو شاید یہی کہ وہ پہلے بھی پکے مسلمان تھے اور اب بھی...... لیکن جامعہ کے ماحول نے ان کو ایسی چیزوں کا موقعہ دیا جن کی کسی

دینی درس گاہ میں نہ تو ضرورت ہوتی ہے اور نہ سہولت۔

اوّلاً جدید ذہنیت کے طلبہ کو پڑھانا تھا جس کا اوپر ذکر آیا۔ دوسرے ایک چھت کے اندر ڈیڑھ دو سو اساتذہ درس دیتے تھے جو بیسیوں ہی علوم وفنون پڑھاتے تھے۔ آئے دن بلکہ ہر روز ان سے علمی مباحث رہتے اور طلبہ سے کہیں زیادہ ان سے باہمی افادے استفادے اور تبادلۂ خیال کا موقعہ ملتا۔ مثلاً کبھی کوئی پروفیسر تاریخ پوچھتا، مولانا مسلمانوں کی بحری زندگی پر میں ایک مضمون لکھ رہا ہوں اور قرآن نیز تاریخ سے میں مواد لے چکا ہوں، اگر حدیث کا کچھ مواد آپ مہیا فرما سکیں...... کوئی پروفیسر فلسفہ، کوئی پروفیسر معاشیات، کوئی پروفیسر قانون آئے دن آپ سے ایسے مسائل پر مواد مانگتا جو کسی عام مولوی کو کبھی ڈھونڈھنا ہی نہیں پڑتا۔ حیدرآباد کے بے نظیر کتب خانے، قلمی بھی اور مطبوعہ بھی اسلامیات کے لیے شاید استنبول اور قاہرہ کے بعد ساری دنیا میں تیسرے نمبر پر تھے۔ اور وہ ہر وقت دست رس میں تھے۔ کسی اور جگہ کے استاد کو یہ سہولت کہاں ملتی۔

اب ایک نیا واقعہ پیش آیا جس نے آپ کے فیضان کی رفتار و مقدار کو بہت بڑھا دیا۔ ۱۳۴۹ھ (۱۹۳۰ء) میں بعض شعبوں میں مابعد ایم۔ اے تحقیقات علمیہ کا ''ریسرچ ڈپلومہ'' قائم ہوا تھا اور پہلے ہی سال فقہ کے دو طلبہ اس میں لیے بھی گئے تھے لیکن پھر ایک طویل وقفہ رہا۔ مولانا کے صدر شعبہ بننے کے زمانے میں ایم۔ اے کے طلبہ کے لیے بھی ریسرچ لازمی کر دیا گیا۔ ہر سال تفسیر حدیث، فقہ اور کلام کے دو چار طلبہ ضرور ہوتے تھے۔ ان کے لیے اچھوتے عنوان تلاش کرنے اور ان سے تحقیقاتی کام لینے اور مقالہ لکھوانے کا کام زیادہ تر مولانا اپنے ہی متعلق رکھنے کا ایثار گوارا فرماتے تھے۔ شعبۂ دینیات سے بھی اس طرح کے ڈیڑھ دو درجن مقالے مرتب اور منظور ہو گئے۔ ان میں سے بعض مختلف علمی رسالوں میں بہ اقساط یا کتابی صورت میں چھپے بھی ہیں۔ چند ایک تو کہنا چاہئے کہ لاجواب ہیں۔ مثلاً ''اصول فقہ کی تدوین کی تاریخ''، ''اسلامی اصول معاشیات'' وغیرہ دوسری عالمگیر جنگ کا زمانہ تھا کہ پی۔ ایچ۔ ڈی کی جماعتیں بھی کھل گئیں اور کئی سال شوقین طلبہ آتے رہے جن میں سے غالباً دو کے مقالے منظور بھی ہو

گئے۔ ایک تو ''قانونِ جنایات بر بنائے غفلت کا تقابلی مطالعہ'' اور دوسرے ''اسلامی اصول معاشیات'' یہ مقالے اصل معہ ترجمہ اردو اور انگریزی دو زبانوں میں تیار ہوتے تھے اور ممتحنوں میں سے ایک یورپ یا امریکہ کا بھی ہوتا تھا۔

طلبہ سے اس طرح کا کام لینے میں اساتذہ کو بھی محنت اور مطالعہ کرنا پڑتا ہے اور طلبہ کو ''تحفہ'' دیئے ہوئے مواد کے بعد بھی بہت کچھ استاد کے پاس بچ رہتا ہے۔ ایسی ہی چیزوں سے مولانا اپنی بعض تالیفات تیار کرتے گئے اور ان میں سے کئی ایک اہل علم کے لیے چھپ کر منظر عام پر بھی آ گئی ہیں۔

اس کے علاوہ جامعہ عثمانیہ میں متعدد علمی رسالے تھے نیز علمی انجمنیں اور ادارے یا دائرے بھی۔ خود شہر حیدر آباد میں مزید براں رسالے اور ادارے تھے۔ ان سب میں مولانا کو حصہ لینا پڑتا اور ہر وقت کچھ نہ کچھ لکھتے رہنا پڑتا۔ برطانوی ہند کے علمی رسالے ان کے علاوہ تھے۔

میں نے کئی بار مولانا سے عرض کیا کہ اپنے نشریات کا ایک مکمل ذخیرہ کسی کتب خانے میں فراہم کر دیں۔ کم از کم ایسی ایک یادداشت تیار فرمائیں کہ کون سا مضمون کس رسالے کے کس نمبر میں کہاں اور کب شائع ہوا۔ مولانا ان چیزوں سے مستغنی ہیں اور خوف ہے کہ مولانا سے آج کل قریب رہنے والے اس پر فوری توجہ نہ کریں تو بہت سے جواہر ریزے ناپید نہ ہو جائیں۔

کتاب ہذا:

قدیم زمانے کے اسلامی علماء کی طرح زیر نظر کتاب جامع ضرور ہے، مگر مانع نہیں۔ یعنی اس میں اپنے موضوع پر جملہ متعلقہ مواد تو جمع کر دیا گیا ہے لیکن اس کے معنی یہ نہیں کہ دیگر معلومات کا بھی ضمناً آ جانا ممنوع رہا ہو۔ اس میں معلومات کا انبار ہے، لطیف استنباطات کی بھرمار ہے اور صبر سے اور بار بار پڑھنے والے کو ہر قدم پر اور ہر دفعہ نئی نئی چیزیں ملتی ہیں۔

یوں تو کتاب اپنے موضوع پر مفید ترین معلومات کی حامل ہے لیکن اس کی اہمیت

چودھویں صدی ہجری کے اس ثلث ثالث میں خاص کر اس کے مقام اشاعت یعنی پاکستان کے لیے غیر معمولی ہے۔

کتاب میں اصل میں یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ خانوادہ بنی امیہ، جب اپنی غلطیوں کو نباہنے کے لیے مزید غلطیوں کا حکومت میں عمداً اضافہ کرتا چلا گیا اور بالآخر اپنے خاتمے کے قریب اس کا پورا نظم ونسق پوری طرح از سرتا پا سڑا ہوا جسم بن گیا تو انقلاب ناگزیر بھی تھا اور ضروری بھی۔ خلفاء عباسیہ قوم کی امیدوں اور آرزوؤں کا مرکز بن کر برسر اقتدار آئے۔ لیکن قوم کو جلدی ہی مایوس ہونا پڑا۔ بات یہ تھی کہ پرانے عہدہ داروں کی جگہ لینے کے لیے نعم البدل نوجوانوں کو منظم طور پر تربیت دینے اور تیار کرنے کی طرف توجہ نہیں کی گئی تھی اور نتیجہ ع گاؤ آمد و خرفت تھا۔ عوام کی مصیبت میں کوئی کمی نہیں ہوئی۔ نئے حکمراں بھی استبداد پسند تھے اور نئے افسر اور حکام عدالت بھی جاہل ورشوت خوار۔

عام حالتوں میں انقلاب اور جوابی انقلابوں کا ایک سلسلہ شروع ہو جاتا۔ بنی امیہ کے خلاف بغاوت پر آمادہ کرنے کے لیے عوام میں جو شوریدہ سری پیدا کی گئی تھی وہ ہر نئے من چلے ہوشمند کو تیار وسائل خانہ جنگیوں کے لیے مہیا کرتی۔

امام ابوحنیفہ نے بنی امیہ کے خلاف تحریک کے آغاز ہی کے وقت اس ضرورت کو بھانپ لیا تھا اور گویا ایک خانقاہ بنا کر وہیں مستقبل کے افسروں کو پوری تن دہی اور بے نفسی سے اپنی بساط بھر تیار کرنا شروع کیا۔ خلاف عباسیہ کے آغاز پر انھوں نے کئی سو افراد ایسے تیار کر دیئے جو عالم باعمل تھے یعنی ان میں دین داری، دیانت داری اور ساتھ ہی فرائض نظم ونسق کی پناہ داری بھی تھی۔

جب یہ ہو گیا تو انھوں نے رائے عامہ کو ہم نوا بنایا کہ جاہل ورشوت خوار افسروں کو بھی خدمت سے الگ کیا جائے اور استبداد پسند خلیفہ بھی روزمرہ کے نظم ونسق میں دخل نہ دے کر دستور وآئین کا پابند رہے۔ امام ابوحنیفہ نے یہ اہم امر بھی طے کر لیا تھا کہ خود کوئی عہدہ بڑے سے بڑا بھی قبول نہ کریں۔ اس چیز کے باعث ان کی آواز میں بھی قوت آ گئی اور ان کے مخالفین بھی بوکھلا گئے۔

امام ابوحنیفہ کو شہید ہونا پڑا۔ لیکن ان کے خون سے اسلام کی سوکھی ہوئی کیاری سینچ گئی اور پیاسی زمین سیراب ہوتے ہی ہری بھری ہوگئی۔ چنانچہ ان کی وفات پر شاید دس سال بھی نہیں گذرتے تھے کہ ان کے شاگرد نظم و نسق پر چھا گئے اور امام ابویوسف کی سرکردگی میں ڈیڑھ سو سالہ اسلامی مملکت کو تباہی سے بچا کر مزید چند سو سال تک ایک نئی اور زیادہ صحت ور زندگی بخشنے کا سامان ہوگیا۔ اور جیسا کہ مولانا نے واضح فرمایا ہے (ص ۱۴۲) طبع جدید کا صفحہ، یہ بھی مجدد اوّل حضرت عمر بن عبدالعزیز کے فیض لامتناہی کی ایک اور برکت نظر آتی ہے۔ یہ دور امام ابوحنیفہ کی عمر کے تاثر پذیر دور کا ہم عصر ہے۔

ہوا یہ کہ خلفاء بنی امیہ نے بعض مرتبہ غالباً نیک نیتی سے، چند ایسے لوگوں کو قاضی مقرر کیا جو کردار تو عمدہ رکھتے تھے اور ہر طرح منصف مزاج اور بے لاگ قاضی بننے کے قابل تھے لیکن قانون سے واقفیت نہیں رکھتے تھے۔ قدیم رومی روایات کے تحت (جو شام میں کچھ نہ کچھ باقی رہی ہوں گی) خلفاء نے یہ کیا کہ ان پڑھ قاضی کو پڑھے لکھے مشیر و مفتی مدد دینے کے لیے مہیا کر دیئے اور اس طرح مقصد حاصل ہوگیا تھا۔ لیکن بعد میں اس نظیر سے بے جا کام لیا گیا اور جاہل قاضی روز افزوں ہوتے گئے۔ مزید برآں کوئی مجموعۂ قانون و نظائر ملک میں نہ تھا۔ استبداد پسند اموی خلفاء یہ چاہتے بھی نہ تھے۔ قاضیوں کے لیے ابتداء پوری نیک نیتی سے اجتہاد کی صلاحیت رکھنے کی ضرورت سمجھی گئی تھی تاکہ قرآن و حدیث سے مسائل استنباط کرلیا کریں۔ بعد کے زمانے میں یہ لفظ تو رہ گیا اور معنوں کی طرف توجہ نہ رہی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہر شہر کی نظیریں الگ ہوگئیں۔ بلکہ بُرے قاضیوں کی صورت میں خود ان کے اپنے فیصلے مماثل صورتِ مقدمہ کے باوجود فریق مقدمہ کے بدلنے پر مختلف ہونے لگے۔ ابھی انگریزی دور میں کلکتہ، مدارس، بمبئی، لاہور وغیرہ کی عدالت ہائے عالیہ میں دہلی کی مرکزی؟ کنیز لندن کی پریوی کونسل کی ترمیمی و اصلاحی شخصیت کی موجودگی کے باوجود جتنا اختلاف رائے تھا اس سے سب واقف ہیں اور اس سے ایک بہت ہی ہلکا تصور خلافت عباسیہ کے آغاز پر اسلامی قانون کے متعلق باہم متعارض نظائر کے متعلق کیا جاسکتا ہے۔

اس صورت حال کا (جس کا ذکر مولانا نے ص ۳۰۲ پر طبع جدید کا صفحہ؟) ایک جدید مصری تالیف کے واسطے سے کیا ہے لیکن جو رسائل البلغاء میں ابن المقفع کے اصل رسالے یعنی رسالہ فی الصحابہ کے شائع ہو جانے کے باعث راست و بلا واسطہ بھی کیا جا سکتا ہے) امام ابوحنیفہ نے علاج یہ سوچا تھا کہ سیاست باز تو فوجی انقلاب کی تیاریوں میں منہمک رہیں اور یہ اپنے شاگردوں کو لے کر دنیوی جاہ طلبی سے بے پروا ہو کر فقہ اسلامی کے انبار میں (جس میں بے لگام نظائر کے باہمی تعارض نیز علم حدیث کے کامل طور پر تا آں دم مدون و منقح نہ ہونے کے باعث متصادم؟ ایک مزید تعارض کے باعث مشکلیں بڑھ گئیں تھیں) ایک نظام قائم کرنے کی کوشش کریں۔

انھوں نے اوّلاً حکومتی نقطۂ نظر سے بے ضرر یعنی مسائل عبادات پر توجہ اور نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ ایک ایک باب کو لے کر اس کے متعلق زیادہ سے زیادہ جزئیات کو دلائل و شواہد کے ساتھ معین کرنا شروع کیا۔ رفتہ رفتہ حکومتی مسائل مال گزاری وغیرہ کو بھی مدون کیا۔ یہ یقیناً نقش اوّل تھا۔ لیکن ایک تو ایک کارکرد چیز (ترمیم و اصلاح کے لیے تیار) موجود ہو گئی اور اس سے بڑھ کر یہ کہ ایک جماعت مہیا ہو گئی جسے اس کام کے کرنے کی تربیت مل چکی تھی۔ ظاہر ہے کہ اس کی روایات نسلوں تک چلتی اور صدیوں تک کارفرما رہتی ہیں۔

مشکلات کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ ایک خلیفہ کو ایک مرتبہ چالیس ''مولوی نما'' بدمعاشوں نے یہ ''فتویٰ'' دیا کہ خلیفہ قانون سے بالا ہے۔ (کیا انگلستان کا بدنام مقولہ King can do no wrong۔ بادشاہ سے قصور سرزد ہو ہی نہیں سکتا، یہ بھی کہیں اسی کی نقالی تو نہیں تھی؟) ایک اور مشکل یہ تھی کہ فقہ زندگی کے ہر شعبے سے متعلق ہے۔ اور قانون کے ماخذوں میں قانون کے علاوہ لغت، صرف نحو، تاریخ وغیرہ ہی نہیں حیوانیات، نباتیات، بلکہ کیمیا و طبیعیات کی بھی ضرورت پڑتی ہے۔ قبلہ معلوم کرنا جغرافیہ طبیعی پر موقوف ہے۔ نماز اور افطار و سحری کے اوقات علم ہیئت وغیرہ کے دقیق مسائل پر مبنی ہیں۔ رمضان کے لیے رویت ہلال کو اہمیت ہے۔ اور بادل وغیرہ

کے باعث ایک جگہ چاند نظر نہ آئے تو کتنے فاصلے کی رویت اطراف پر مؤثر ہوگی، وغیرہ وغیرہ مسائل کی طرف اشارے سے اندازہ ہوگا کہ نماز، روزہ جیسے خالص عباداتی مسائل میں بھی علوم طبیعہ سے کس طرح قدم قدم پر مدد لینے کی ضرورت ہوتی ہے۔ کاروبار تجارت، معاہدات، آب پاشی، صرافہ، بنک کاری وغیرہ وغیرہ کے سلسلے میں قانون سازی میں کتنے علوم کے ماہروں کی نہ ضرورت ہوگی! امام ابو حنیفہ ہر علم وفن کے ماہروں کو ہم بزم کرنے اور اسلامی قانون یعنی فقہ کو ان سب کے تعاون سے مرتب و مدون کرنے کی کوشش میں عمر بھر لگے رہے اور بہت کچھ کامیاب بھی ہوئے۔

کتاب میں قسم قسم کے معلومات یک جا ہو گئے ہیں۔ کسے یقین آئے گا کہ امام ابو حنیفہ (فوت ۱۵۰ھ) زمین کے کروی اور گول ہونے کے قائل تھے؟ صفحہ (۲۳۲) پر جو قصہ لکھا ہے اس سے اس کے سوا کیا نتیجہ نکالا جا سکتا ہے۔ خلیفہ منصور کی موجودگی میں امام ابوحنیفہ سے کسی نے پوچھا کہ "دنیا کے ٹھیک بیچ میں کون سی جگہ ہے؟" "امام نے فرمایا کہ وہی جگہ جہاں تو بیٹھا ہے۔" زمین کے ٹھیک کروی الشکل ہوئے بغیر نہ تو یہ جواب صحیح ہو سکتا ہے اور نہ سائل اس پر چپ اور قائل ہو سکتا۔ (قطبین پر پچکنے سے یہاں بحث نہیں)۔

"جرتج شاید جارج کے لفظ ہی کی کوئی صورت ہے" (ص) اس کا تعلق گریگوری سے سمجھا جاتا ہے۔

امام ابو یوسف سب سے پہلے قاضی القضات تھے۔ (ص) بطور واقعہ اس میں کوئی شبہ نہیں۔ اسی طرح کا کام اولاً امام ابو حنیفہ کو پیش کیا گیا تھا جسے انھوں نے قبول نہیں فرمایا۔ (ص) اس کے ماننے سے بھی انکار نہیں۔ لیکن اس سے یہ مسئلہ حل نہیں ہوتا کہ اس عہدے کا تصور امام ابوحنیفہ کی (جو ایرانی النسل تھے) تجویز سے ہوا یا خود خلفاء عباسیہ کو اپنے ماحول کے ایرانی اثرات وروایات سے' قبل اسلام کے عہدۂ موبذ موبذان کے باعث، اس کی تجویز سوجھی، بہر صورت قاضی القضات کا تصور (جو وزیر عدالت اور میر عدل دونوں کے اجتماع کی حیثیت ہے) ایرانی تھا یا نہیں، مولانا کی طویل بحث کے باوجود حل نہ ہو سکا۔ موبذ موبذان آیا خالص مذہبی افسر تھا یا خالص عدالتی یا دونوں کا

جامع جب تک اس کا مواد سامنے نہ آئے خالص عدالتی قاضی القضات کے تصور کا ماخذ معلوم نہیں ہوسکتا۔ میں پورے استناد کے ساتھ تو نہیں کہہ سکتا۔ لیکن قدیم تر تمدنوں مثلاً یہودیوں وغیرہ کے ہاں مذہبی اور عباداتی اعلیٰ افسر ہی اعلیٰ ترین افسر عدالت ومرافعہ بھی ہوتا تھا۔ موبذ موبذاں بھی ایسا ہی رہا ہو، قرین قیاس ہے۔ جاحظہ نے موبذ موبذان کا ترجمہ اگر قاضی القضاۃ کیا تھا (ص) تو اس مذہبی افسر کے عدالتی شعبۂ فرائض کے ذکر کے سلسلے ہی میں ہوگا۔ ایران میں خالص عدالتی موبذ موبذان کا پتہ نہیں چلتا کہ قاضی القضاۃ کو اس کی تتبع قرار دیں۔ لیکن اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ خلافت راشدہ و خلافت بنی امیہ میں ایسی کوئی چیز مسلمانوں میں نہ تھی۔ اور یہ امر معنیٰ خیز ہے کہ اس طرح کا عہدہ بغداد اور قرطبہ میں ایک ہی وقت میں قائم ہوا (ص) گویا وہ ایک سماجی ضرورت تھی اور مسلمانوں کی عمرانی ضرورتوں نے اس کا قیام سجھایا تھا۔ اور بس۔

کتاب کے بعض اور دلچسپ معلومات میں سے یہ ہے کہ ابومسلم خراسانی کے زمانے میں بھی چینی کے برتن پائے جاتے تھے۔

وزراء کو نماز باجماعت نہ پڑھنے کی بنا پر عدالت میں مردود الشہادت قرار دیا جاتا تھا۔

ایک بڑی دلچسپ بات یہ کہ امام محمد شیبانی کو تدوین فقہ میں جو مددگار ملے ان میں ان کی اپنی بعض رومی لونڈیاں بھی تھیں (ص) اس سے مراد یونانی ہوں گی۔ کیونکہ تاریخ اسلام میں رومی سے مراد عموماً، بیزنطینی ہوتے ہیں یعنی قسطنطنیہ کی سلطنت والے۔ اور ان میں یونانی سب سے ممتاز تھے۔ کیا یہ لونڈیاں صرف صاف نویس تھیں یا اس سے زیادہ کچھ اور بھی؟

بنی تغلب (ص) کے متعلق ایک معاہدے کا بعض مورخ ذکر کرتے ہیں کہ انھوں نے یہ وعدہ کیا کہ خود تو عیسائی رہیں گے۔ لیکن اپنے بچوں کو بپتسمہ نہ دیں گے یعنی عیسائی نہ بنائیں گے۔ الوثائق السیاسیہ فی العہد النبوی والخلافۃ الراشدہ کی تدوین کے سلسلے میں پتہ چلا کہ یہ اصل میں "لا تقربوا الصلاۃ" کا سا واقعہ ہے۔ مکمل معاہدے

سے (طبری ص خراج ابی یوسف سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نومسلم تغلبیوں کی اولاد کے متعلق پادریوں کے اختیار سماعت اور عمل دخل کو روکنا مقصود تھا۔ ورنہ عیسائیوں کو یہ حکم دینا کہ اپنی اولاد کو عیسائی نہ بنائیں لا اکراہ فی الدین کے قرآنی احکام کے مغائر ہو جائے گا۔

ہارون الرشید کے زمانے میں خاندانی ناموں کا رواج نہیں ہوا تھا۔ اور مامون الرشید اور امین الرشید (ص) کا کوئی تاریخی وجود نہیں۔ عبداللہ المامون اور محمد الامین صحیح نام ہیں۔ امین و مامون زیادہ سے زیادہ لقب ہو سکتے ہیں۔ ان میں الرشید کے لفظ کا اضافہ ٹھیک نہیں۔

طبع اول میں کتاب اچھی چھپی ہے لیکن مؤلف کو بروقت پڑھنے کا غالباً موقعہ نہیں ملا۔ ص سطر نمبر ا میں کارہ کا لفظ ہے یعنی کراہت کرنے والا۔ پروف خواں نے اسے نہ سمجھا اور "ناکارہ" بنا کر اپنے ناکافی علم کا ثبوت درج کتاب کر دیا۔

ص سطر میں آزمائشوں کی بھٹیوں سے "کھرا" ہو کر تو کوئی نکل سکتا ہے "کھڑا" ہو کر نہیں جیسا کہ چھپا ہے۔ کم یا زیادہ اہم ایسی کچھ اور بھی طباعتی غلطیاں رہ گئی ہیں۔ یہ قابل معافی سمجھی جا سکتی ہیں۔ لیکن کاش ناشر کتاب میں ایک اشاریہ لگوا دیں جس کا شاید اب بھی وقت ہے موجودہ فہرست مضامین تک محض ناکافی ہے۔ طبع ثانی میں تو اس کی تیاری آسان ہے۔

تمنا و دعا:

مولانا کی اور تالیفوں کا کتاب میں مژدہ ہے مثلاً تدوین فقہ کی تاریخ وغیرہ دعا ہے کہ مولانا کا سایہ علم کے سر پر تادیر صحت و عافیت کے ساتھ باقی رہے کہ ان زیر تالیف کتابوں سے دنیا محروم نہ رہ جائے۔ براعظم ہند میں اسلامیات کے احیاء میں مولانا نے جو حصہ لیا ہے وہ کفر و جہالت کے منطقہ حارہ میں ٹھنڈی ہواؤں کے مصداق ہے۔ جزاہ اللہ عنا احسن الجزا۔

مولانا کی اہم تر تالیفیں

گمنام اور بانام مضامین تو بہ کثرت ہیں۔ مطبوعہ کتابوں میں سے قابل ذکر یہ ہیں:-

۱۔ النبی الخاتم
۲۔ اسلامی معاشیات
۳۔ مسلمانوں کی تعلیم دو جلدیں
۴۔ تذکرۂ حضرت شاہ ولی اللہ
۵۔ کتاب ہذا (امام ابو حنیفہ کی سیاسی زندگی)
۶۔ تدوین حدیث
۷۔ الدین القیم
۸۔ حضرت ابوذر غفاریؓ

فقط
محمد حمید اللہ

جمادی الاوّل ۱۳۶۹ھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اَلْحَمْدُلِلّٰہِ وَکَفٰی وَالصَّلٰوۃ وَالسَّلامِ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی.

تمہید:

جامعۂ عثمانیہ کے سابق نائب امیر (پرو وائس چانسلر) محترمی قاضی محمد حسین صاحب مرحوم نے ایک علمی مجلس جامعہ عثمانیہ میں اساتذہ کی قائم کر رکھی تھی، جس میں اپنے اپنے تدریسی فن کے مختلف موضوع پر اساتذہ مقالے سنایا کرتے تھے۔ خاکسار کی جب باری آئی تو اپنی کتاب ''تدوین فقہ'' کے ایک حصہ کا انتخاب کر کے مقالہ کی شکل میں متعدد مجلسوں میں اس کو پڑھتا رہا۔ ''یہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی سیاسی زندگی'' کی روئداد تھی۔ مضمون چونکہ کافی طویل تھا، اس لیے چند قسطوں میں بھی مکمل نہ ہو سکا۔ ہر خطبہ جو اس مجلس میں پڑھا جاتا تھا ''الفرقان'' بریلی میں اشاعت کے لیے بھیج دیا جاتا تھا، الفرقان سے بعض دوسرے مجلات میں بھی یہ مضمون نقل ہوا، خصوصاً ہمارے فاضل دوست مولانا ابوالاعلیٰ صاحب مودودی امیر جماعت اسلامی نے اپنے ایک طویل پیش لفظ کے ساتھ رسالہ ''ترجمان القرآن'' جلد ۱۶۔ عدد ۳و۴ میں بھی اس کو شائع فرما دیا تھا۔ لیکن مضمون بہرحال نامکمل ہی تھا۔ بعض لوگوں کے اصرار سے پچھلے دنوں اس مضمون کی تکمیل کا خیال پیدا ہوا۔ کتاب کی موجودہ نقطہ کا اندازہ پہلے سے نہ تھا، لیکن جب قلم اٹھا لیا گیا تو اس کا روکنا میرے بس میں نہ تھا، بس جہاں پر پہنچ کر وہ خود ہی رک گیا، میں نے بھی اپنے اس تالیفی سفر کو ختم کر دیا۔

سچ پوچھئے تو حنفی تاریخوں کے گوشے میں یہ چند فقرے جو پائے جاتے ہیں، یعنی بنی امیہ کی حکومت کے عہد میں کوفہ کا والی ابن ہبیرہ تھا، اس نے امام ابوحنیفہ سے خواہش کی کہ حکومت کی کسی ملازمت کو قبول کر لیں، امام صاحب نے انکار کیا۔ انکار کی سزا میں ابن ہبیرہ نے حضرت امام کو جیل خانے بھی بھجوا دیا تھا اور تازیانے سے اس بے رحم آدمی نے ان کو پٹوایا بھی تھا۔ ایک مختصر سا قصہ یہ اور دوسرا قصہ عباسی دور کا ان الفاظ میں جو

درج کیا جاتا ہے کہ عباسیوں کے دوسرے خلیفہ ابوجعفر منصور نے جب حکومت کی باگ سنبھالی، تو بغداد شہر کی تعمیر کے بعد اس نے چاہا کہ امام ابوحنیفہ کو اس شہر کا قاضی مقرر کریں، لیکن امام صاحب نے اس وقت بھی انکار پر ہی اصرار فرمایا۔ ابوجعفر نے بھی اس انکار کی سزا امام صاحب کو جیل اور تازیانے وغیرہ کی شکل میں دی۔

بس یہ دو فقرے حنفی تاریخوں کے گوشوں میں جو پائے جاتے ہیں، یوں سمجھئے کہ ان ہی کو متن بنا کر اس کی جو واقعی شرح تھی، اس کتاب میں پیش کی گئی ہے، اصل واقعات کے بیان کرنے سے پہلے یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ حضرت امام ابوحنیفہ کے عہد کی سیاسی تاریخ کا ایک ہلکا سا خاکہ ناظرین کے سامنے پیش کر دیا جائے۔

امام صاحب کے عہد کی سیاسی تاریخ

ولادت وماحول:

واقعہ یہ ہے کہ امام صاحب کی ولادتِ باسعادت بنی امیہ کے اس عہد میں ہوئی تھی، جب سارا عالم اسلام ان کے خوں چکاں مظالم سے تھرا رہا تھا۔ دنیا کے ان متوالوں سے وہ سب کچھ سرزد ہو چکا تھا جس کی نظیر اسلام ہی کیا شاید تاریخ عالم میں موجود نہیں۔ فرات کے ساحل پر اپنے رسول (ﷺ) کے نواسے اور ان کے خاندان کے پیاسے شہیدوں کے بہتے ہوئے لہو سے یہ اپنی حرص وآز کی پیاس بجھا چکے تھے۔ رسولؐ کا منور و پاک شہر حرہ کے واقعہ میں لوٹا جا چکا تھا، اور اس بری طرح لوٹا جا چکا تھا کہ جان و مال ہی نہیں بلکہ عصمتیانِ حرم کی آبرو و ناموس تک کی پروانہیں کی گئی۔ رسولؐ کی مسجد میں سعید بن المسیب کے سوا ایک زمانے تک نماز پڑھنے والا کوئی باقی نہیں رہا تھا اللہ کا گھر کعبہ تک بھی دنیا طلبی کی اس بھٹی کی چنگاریوں سے نذر آتش ہو چکا تھا، جو اس خاندان کے سینوں میں جل رہی تھی۔ خلافت اسلامی کے پہلے خلیفہ کے نواسے حضرت عبداللہ بن زبیر بیت اللہ کی چوکھٹ پر ان ہی کے ہاتھوں خاک وخون میں تڑپ چکے تھے۔ ''ظالم الامۃ'' حجاج کی بے پناہ تلوار لاکھوں مسلمانوں کی گردنیں معمولی معمولی باتوں میں اڑا چکی تھی، جن

میں صحابہ کی اولاد اور جلیل القدر تابعین بھی شامل تھے۔

الغرض بنی امیہ اور ان کے سنگ دل و سیاہ سینہ ولاۃ (گورنروں) کی بدتمیزیوں کے اس بے پناہ طوفان نے ایک ایسا دہشت ناک مہیب منظر دنیائے اسلام میں قائم کر دیا تھا کہ ہر ایک اپنی اپنی جگہ پر دم بخود تھا۔ منکرات دیکھے جا رہے تھے۔ لیکن ہاتھ سے روکنے کی جرأت کسی کو کیا ہوتی، بڑے بڑوں کی زبانیں تک خاموش تھیں، یزید، ابن زیاد، اور حجاج جیسے رسوائے زمانہ ہی نہیں بلکہ جو ان میں نیکی اور حلم و بردباری میں شہرت رکھتے تھے، ان کے درباروں میں بھی رسول اللہ ﷺ کے ممتاز صحابیوںؓ کے ساتھ جو سلوک ہوتا تھا، اس کا اندازہ اس ایک واقعہ سے ہوسکتا ہے عبدالملک بن مروان (جو اپنی مذہبی زندگی میں خاص امتیاز رکھتا تھا) کے پاس بوڑھے اور نابینا صحابی حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ مدینہ طیبہ سے چل کر دمشق صرف اس لیے آتے ہیں کہ واقعۂ حرہ کے بعد انتقاماً مدینہ منورہ والوں پر جو ظلم توڑے جا رہے تھے ان کو بند کرنے کی درخواست کریں۔ اس وقت رسول اللہ ﷺ کے پڑوسیوں پر زندگی کے تمام ذرائع بند کر دیئے گئے تھے۔ ہر شخص گویا اپنے گھر میں قیدیوں کی سی زندگی بسر کر رہا تھا۔ رسول کے صحابی اس کے پاس رحم کی سفارش لے کر آتے ہیں اور خلیفہ عبدالملک سے کہتے ہیں:

> ''امیر المومنین! مدینہ منورہ جس حال میں ہے، آپ دیکھ رہے ہیں۔ وہ ''طیبہ'' (یعنی پاک شہر) ہے، یہ نام حضور ﷺ نے اس کا رکھا ہے، اس کے باشندے آج کل قیدیوں کی طرح محصور ہیں، امیر المومنین کو اگر صلہ رحمی کا خیال ہو اور ان کے حق کو وہ پہچانیں تو ایسا کرنا چاہئے۔''

پیغمبر کے ایک صحابی پیغمبر کے شہر کے بے قصور باشندوں، بچوں اور عورتوں پر رحم کی درخواست پیش کرتے ہیں۔ لیکن بجائے سمجھنے کے عبدالملک کے سینہ میں غصہ کی آگ بھڑکنے لگی۔ چہرہ سرخ ہوگیا۔ حضرت چونکہ نابینا تھے۔ اس لیے ان کو اس کی ناراضگی کا پتہ نہ چلا۔ آپ بار بار اسی بات کو دہرا رہے تھے۔ قریب تھا کہ ان کے ساتھ بھی کوئی سخت واقعہ پیش آئے۔ لیکن اتفاق سے دربار میں ان کے ایک شاگرد قبیصہ

موجود تھے، انھوں نے حضرت کو خاموش کیا۔ ہاتھ پکڑ کر باہر نکال لائے اور حضرت کو سمجھانے لگے کہ:

یا ابا عبداللہ ان ھؤلاء القوم صاروا ملوکا. (ابن سعد)

''حضرت یہ لوگ (بنی امیہ) اب بادشاہ بن گئے ہیں۔''

مطلب یہ تھا کہ آپ کیا ابھی تک ان لوگوں کو واقعی مسلمانوں کا امیر اور خلیفہ ہی سمجھ رہے ہیں۔ یہ اپنے کو اب رسول کا جانشین نہیں سمجھتے، بلکہ گذشتہ رومی اور ایرانی سلاطین کے نقش قدم پر چل کر انھوں نے اپنے کو بادشاہ بنالیا ہے۔ قبیصہ پر عبدالملک چونکہ بہت بھروسہ کرتا تھا اور یہ بات مشہور تھی، اس لیے حضرت جابرؓ نے یہ سن کر قبیصہ سے فرمایا:

''مگر تم کو کوئی عذر کا موقعہ حاصل نہیں ہے، کیونکہ تمہارا صاحب تمہاری بات تو سنتا ہے۔''

اس پر قبیصہ نے جو بات کہی، اس سے ان خلفاء کے طرزِ عمل کی کیسی اچھی تشریح ہوتی ہے۔ انھوں نے کہا:

''حضرت! وہ سنتا بھی ہے اور نہیں بھی سنتا ہے، جو بات منشا اور مرضی کے مطابق ہوتی ہے، بس اسی کو سنتا ہے۔'' (ابن سعد)

مروانی خاندان کے پہلے خلیفہ کا یہ حال تھا، اسی سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ بعد کے خلفاء جنھوں نے سلطنت ہی کی گود میں آنکھیں کھولی تھیں، ملوکیت میں ان کا رنگ کتنا گہرا ہوتا چلا گیا ہوگا۔ اس سلسلہ میں سب سے زیادہ قابل رحم حالت کوفہ یعنی امام صاحب کے مولد کی تھی کہ اسی شہر میں مدت تک ابن زیاد اور اس کے بعد حجاج کی تلوار اپنے نیام سے باہر ہوکر بیکسوں اور مظلوموں کے سر پر مسلسل بیس سال تک انتہائی بے دردی کے ساتھ چمکتی رہی۔ کوفہ والے کس حال میں تھے اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ امام ابوحنیفہ کے استاذ حضرت ابراہیم نخعی کو جب حجاج کی موت کی خبر پہنچی تو وہ سجدہ میں گر گئے اور بیان کیا جاتا ہے کہ ان کی آنکھوں سے مسلسل خوشی کے

آنسو بہہ رہے تھے۔ یہ زمانہ تھا جب ''لوہے کی عصا'' سے اپنی حکومت قائم کی گئی تھی جس میں زبان سے کسی اصلاحی لفظ کا نکالنا، اپنے خون سے کھیلنا تھا، اور اسی لئے بڑے بڑوں کے پائے استقلال اپنی جگہ سے ہل چکے تھے۔ بجائے کھڑے ہونے کے وہ بیٹھنے کو ترجیح دے چکے تھے۔ خواجہ حسن بصری، ابن سیرین، ابراہیم نخعی، شعبی جیسے ائمہ عظام کے لیے خاموشی کے سوا کوئی چارہ نہیں رہ گیا تھا۔ (جس کی تفصیل تاریخ کی کتابوں میں موجود ہے) یہ واقعہ ہے کہ اس کا خطرہ پیدا ہو چلا تھا کہ حکومت کی قہرمانیت واستبداد کے اگر یہی لیل ونہار رہے تو آئندہ نسلوں میں امر بالمعروف ونہی عن المنکر[1] کا جذبہ جس کی قرآنی تعلیم اور آنحضرت ﷺ وخلفاء راشدین کے طرزِ عمل نے مسلمانوں میں پرورش کی تھی ہمیشہ کے لیے بجھ کر رہ جائے گا، جس کا آخری مآل اس کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا کہ نبوت نے جو اسلامی نظام قائم کیا تھا، حرص وہوا کے ان غلام بادشاہوں اور ان کے عمال وحکام کے ہاتھ بتدریج مسخ ہوتے ہوتے درہم وبرہم ہو کر رہ جائے۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز کی خلافت:

غالباً حضرت امام رحمۃ اللہ علیہ اپنی عمر کے اٹھارھویں سال میں تھے کہ اسلام کے متعلق وہی تجربہ جس کی شہادت تیرہ سو سال سے اسلامی تاریخ مسلسل ادا کر رہی ہے، ظاہر ہوا۔ یعنی اسلام کی کشتی جب کبھی نزاکت کے آخری گرداب میں اس طرح پھنسی ہے کہ دیکھنے والوں نے ہمیشہ کے لیے اس کے ڈوب جانے کی پیش گوئی کی، تو اچانک کسی غیبی لطیفہ نے ظاہر ہو کر ''انا له لحافظون'' کی توثیق کرتے ہوئے ناامیدی کی ان مایوسانہ پیش قیاسیوں کو ہمیشہ جھٹلا کر رکھ دیا ہے۔ میرا یہ مقصد ہے کہ ٹھیک ان ہی دنوں میں جب یہ سب کچھ ہو رہا تھا، بنی امیہ کے ان ہی مردہ لاشوں میں سے جنھوں نے خواہ ''سیاسی'' طور پر جس قسم کی زندگی کا ثبوت دیا ہو، لیکن اسلامی نقطۂ نظر سے ان میں اکثر مردہ ہو چکے تھے۔ اور اس حد تک مردہ ہو چکے تھے کہ ان ہی اموی خلفاء میں سے ایک نے اپنی ایک ناپاک کنیز کو بحالت جنابت عبا اور عمامہ پہنا کر مسجد میں امامت کے لیے

---

[1] اچھی باتوں کا حکم دینا اور بری باتوں سے روکنا۔ ۱۲

بھیجا، اور بیچارے ناواقف مسلمانوں کو اسی بدمست و ناپاک عورت کے پیچھے نماز پڑھنی پڑی۔ لیکن "مخرج الحی من المیت" کی عجیب شان ہے کہ ان ہی مردہ ضمیروں میں سے اس نے حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ تعالیٰ عنہ جیسے خلیفہ کو اموی تخت کا وارث بنایا، جس کی ایمانی زندگی نے نئے سرے سے اسلامی نظام کے تمام شعبوں میں زندگی کی نئی لہر دوڑا دی، جیسا کہ میں نے عرض کیا، امام صاحب کے عنفوانِ شباب کا زمانہ تھا، جس وقت عمر بن عبدالعزیز نے خلافت کی باگ اپنے ہاتھ میں لی، پہلی تقریر منبر پر پہنچ کر انھوں نے جو کی تھی اس کا سب سے اہم فقرہ یہ تھا کہ:

(لاطاعة لنا في معصية الله) (ابن سعد)

''اللہ کی نافرمانی میں ہماری فرماں برداری کوئی نہ کرے۔''

آزادی کا پہلا منشور:

آزادی کا یہ پہلا منشور تھا جس کا بنی امیہ کے عہد میں حضرت عمر بن عبدالعزیز کی جانب سے پہلی دفعہ اعلان کیا گیا۔ تمام ظالم گورنر جن کے حالات سے وہ بخوبی واقف تھے، ایک ایک کر کے ہٹا دیئے گئے ہر شخص کو حکم دیا گیا کہ ''اسلامی نظام'' میں جہاں جہاں جس قسم کی خرابیاں پیدا ہوگئی ہیں۔ ان کی اصلاح کی کوشش کی جائے اور پوری قوت سے کی جائے۔ اسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ساری زبانیں جن پر تلوار کے تالے چڑھائے گئے تھے، کھل پڑیں اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر و اظہارِ حق کے جذبہ کا جو چراغ قریب تھا کہ بجھ جائے پھر سینوں میں روشن ہوگیا۔ مشہور مدنی امام حضرت قاسم بن محمد بن ابی بکر کا مشہور تاریخی فقرہ۔

اليوم ينطق من كان لا ينطق. (ابن سعد)

''اب وہ بولیں گے جو نہیں بول سکتے تھے۔''

خلافت عمری کے اسی اعلانِ آزادی کا ترجمہ ہے۔ ایک طرف عمر بن عبدالعزیز کے زمانہ میں لوگوں کو یہ آزادی میسر آئی دوسری طرف ایک اور انقلاب کی ابتدا ان ہی کے زمانے سے شروع ہوئی۔ وہ یہ کہ بنی امیہ کی غیر اسلامی زندگی کا ایک اثر عام لوگوں پر

یہ بھی پڑا تھا کہ شرعی علوم یعنی قرآن و حدیث اور ان سے مسائل استنباط کرنے کا عام رجحان جسے فقہ کہتے ہیں بتدریج کم ہوتا جاتا تھا کیونکہ ہمیشہ علوم کی ترویج واشاعت میں ضرورت کو بہت زیادہ دخل ہوتا ہے، لوگوں میں اسلامی زندگی گذارنے کا جب شوق ہی مردہ ہو چلا تھا تو ظاہر ہے کہ اس کی ضرورت بھی کم ہو رہی تھی جیسا کہ خود امام صاحب کے ایک بیان سے معلوم ہوتا ہے عام لوگوں کی توجہ شرعی علوم سے ہٹ کر شعر و شاعری ادب وغیرہ کی طرف مائل تھی دینی علوم میں سب سے زیادہ اہمیت ان مسائل کو حاصل ہوگئی تھی، جن پر فلسفیانہ رنگ غالب تھا۔ جسے اس زمانہ میں علم کلام کہتے تھے۔ گویا دین بھی ایک قسم کی ذہنی عیاشی کا ذریعہ بن گیا تھا۔

حضرت امام کا ابتدائی تعلیمی رجحان

خود امام اعظم کا ابتدائی حال بھی یہی تھا، جیسا کہ خود بیان کرتے ہیں:

''ابتدا میں میرا حال یہ تھا کہ میں کلام کو تمام علوم میں سب سے بہتر علم خیال کرتا تھا، سمجھتا تھا کہ اس میں تو دین کی بنیاد سے گفتگو کی جاتی ہے۔''

اسی کا نتیجہ یہ تھا کہ جس قسم کی فطری ذکاوت و ذہانت لے کر امام صاحب آئے تھے، اس نے ان فلسفیانہ موشگافیوں میں آپ کی دلچسپی کو اتنا تیز کر دیا تھا کہ:

''امام صاحب اپنے زمانہ میں اس علم کے رئیس ہو گئے، لوگوں کی نگاہوں کے مرکز بن گئے......''(مناقب)

تعلیمی سوانح کو بیان فرماتے ہوئے امام صاحب خود اپنے کلامی شوق کا اظہار ان الفاظ میں کرتے تھے:

''میں دراصل ابتدا میں ایسا آدمی تھا جسے ''علم کلام'' میں مقابلہ و مجادلہ کا ذوق تھا، اس سلسلہ میں ایک زمانہ گذر گیا کہ اسی کے پیچھے میری تگ و دو تھی، اسی فن میں لوگوں سے مقابلہ کرتا اور چیلنج دیتا۔''

جوانی کے اس شوق بے پروا میں آپ جب کوفہ کے میدان کو تنگ پاتے تو بصرہ

تشریف لے جاتے جو اس زمانے میں علم کلام کا سب سے بڑا دنگل تھا، اور وہاں بڑے بڑے جغادریوں سے پنجہ آزمائی فرماتے۔ خود ہی بیان فرماتے ہیں:

''لڑائی جھگڑے کرنے والوں کی بڑی جماعت بصرہ میں رہتی تھی۔ میں تقریباً بیس دفعہ بصرہ اسی غرض سے گیا، اور وہاں کم وبیش سال سال بھر قیام کیا۔''

اس قسم کے بے معنی مباحث میں مسلمانوں کے الجھے رہنے سے چونکہ حکومت کا کچھ نہیں بگڑتا تھا، بلکہ طرح طرح کی فرقہ بندیوں کی اس سے بنیاد پڑتی تھی، جس سے ''فرق واحکم'' (پھوٹ ڈالو، اور حکومت کرو) کے سیاسی نظریہ کی تکمیل ہوتی تھی، اس لیے حکومت بھی اس قسم کے جھگڑوں میں دخل نہیں دیتی تھی، بلکہ ممکن ہے کہ حوصلہ افزائی کرتی۔ امام صاحب کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ بصرہ اس زمانہ میں مختلف کلامی فرقوں کا اکھاڑہ بنا ہوا تھا۔ فرماتے ہیں:

''میں نے بصرہ میں خارجیوں کے مختلف فرقوں مثلاً اباضیہ اور صفریہ سے مقابلے کئے اور بھی مختلف حشوی طبقات سے مباحثے رہے۔''

ان فلسفیانہ خیالات والوں کا کیا حال تھا اس کی شہادت بھی امام ہی کی زبانی سننا چاہئے۔ اپنے ان ذہنی مباحث کو دینی رنگ دینے کے لیے ان لوگوں نے اس کا نام کلام رکھا تھا، لیکن ان کا جو حال تھا، امام صاحب بیان فرماتے ہیں:

''نہ ان کی صورتیں پرانے بزرگوں کی سی تھیں اور نہ ان کا طریقہ صالحین کا تھا۔ میں دیکھتا تھا کہ ان کے دل سخت ہیں اور ان کے قلب بے حس ہیں۔ ان لوگوں کو کتاب وسنت کے خلاف بات کہنے میں ذرا باک نہ تھا۔ نہ ان میں تقویٰ تھا نہ خدا ترسی......'' (موفق)

مسلمانوں کا یہ میلان آہستہ آہستہ بڑھ رہا تھا، اگرچہ ابھی ملک قرآن وحدیث وفقہ کے جاننے والوں سے خالی نہیں ہوا تھا۔ لیکن خدانخواستہ اگر بیچ میں یکایک عمر بن عبدالعزیز کی حکومت قائم نہ ہو جاتی تو کون اندازہ کر سکتا ہے کہ کیا ہوتا؟ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے جس طرح اپنے پہلے خطبہ میں خلفاء کی اطاعت کی، وہ نوعیت بیان کی تھی، جو اوپر مذکور ہوئی،

اسی طرح انھوں نے پورے عزم اور کامل ارادہ کے ساتھ اس کا بھی اعلان کیا۔

فلوكان كل بدعة يميتها الله على يدى و كل سنة يبعثها الله على يدى ببعضة لحمى حتى ياتى اخر ذالك على نفسى كان فى الله يسيرا (ابن سعد)	اگر حق تعالیٰ ہر بدعت کو میرے ہاتھوں سے مردہ کرے اور ہر سنت کو میرے ہاتھوں پر زندہ کرے اور اس راہ میں میرے جسم کا ایک ایک ٹکڑا کام آئے یہاں تک کہ آخر میں میری جان کی نوبت آجائے تو اللہ تعالیٰ کی راہ میں یہ بہت ہی معمولی قربانی ہوگی۔

اس باب میں ان کے شغف کا یہ حال تھا کہ عاملوں اور گورنروں کے جو فرامین پایۂ خلافت سے ان کے زمانہ میں جاری ہوتے تھے، ان کے متعلق مؤرخین کا بیان ہے:

فيه رد مظلمة واحياء سنة أو أطفاء بدعة ادقم او تقدير عطاء أو خير حتى خرج من الدنيا. (ابن سعد)	ان میں یا تو کسی ظلم کا ازالہ ہوتا یا کسی سنت کے زندہ کرنے کا حکم یا کسی بدعت کے مٹانے کا فرمان یا کسی کا وظیفہ مقرر ہوتا، یا کوئی نیکی کی بات (یہ اس وقت تک ہوتا رہا) جب تک وہ دنیا سے روانہ ہوئے۔

رجحان میں تبدیلی:

ان ہی باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ طبائع کا رخ پلٹ گیا۔ قرآن وسنت کی طرف سے جو رجحان گھٹ رہا تھا پھر اس میں نیا جوش اور نئی زندگی پیدا ہوگئی۔ جہاں تک میرا خیال ہے امام صاحب پر بھی اس عام تحریک کا اثر پڑا۔ خود فرماتے ہیں کہ علم کلام کی ان ہی دلچسپیوں میں میں مستغرق تھا کہ اچانک میرا خیال بدل گیا، اور:

> ''ایک مدت علم کلام کی بحثوں میں گذارنے کے بعد میں نے اپنے دل کو ٹٹولا اور سوچنا شروع کیا تو دل نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ کے اصحابؓ اور تابعین جو گذر گئے، ان لوگوں سے کوئی ایسی بات چھوٹی نہیں تھی جسے ہم اب پانا چاہتے ہیں۔ حالانکہ وہ ان چیزوں کے جاننے کی زیادہ قدرت رکھتے تھے،

ان امور کے زیادہ عالم تھے، ان کے حقائق سے زیادہ واقف تھے، لیکن اس قسم کے مسائل کے متعلق نہ انھوں نے جھگڑے کیے نہ مباحثے۔ وہ ان باتوں میں کبھی منہمک ہی نہیں ہوئے بلکہ ہمیشہ ان کے متعلق خاموشی اختیار کی۔ البتہ وہ شرائع وقوانین فقہ کے ابواب میں غور وفکر کرتے تھے، ان کے متعلق باتیں کرتے تھے، باہم ان مسائل پر بیٹھ کر فکر وتامل فرماتے تھے، اوران کے متعلق لوگوں کو ابھارتے تھے، لوگوں کوان ہی مسائل کی تعلیم دیتے تھے اور ان کی طرف بلاتے تھے۔ صدر اول اسی حال میں گذرا، جس میں سب سے پہلے اسلام لانے والے صحابہؓ اوران کے تابعین گذرے۔''

بہر حال جہاں تک میرا خیال ہے امام صاحب کی نوجوان حساس فطرت عمر بن عبدالعزیز کے اصلاحی پیغام سے متاثر ہوئی اور اتنی متاثر ہوئی کہ اب تک جو کچھ آپ نے کلامی مباحث کا ذخیرہ اپنے دماغ میں جمع کیا تھا، سب میں ایک دفعہ آگ لگادی۔ فرماتے ہیں:

''جب میں نے اہل کلام کے اس حال کا اندازہ کیا، جس کا میں نے ذکر کیا ہے تو یہ جھگڑے رگڑے میں ترک کردیئے، اور کلام کے مسائل میں غور وفکر کرنے سے الگ ہوگیا، اور سلف جس طریقے پر تھے اسی کی طرف واپس ہو گیا اوراسی راہ کو اختیار کرلیا جس پر وہ تھے۔''

ظاہر ہے کہ اس ''انقلابی قدم'' نے علم کلام کے اس عالم کو اچانک پھرایک عامی کی حیثیت میں پہنچا دیا کیونکہ اس وقت تک امام نے شرعی مسائل کی طرف قطعاً توجہ نہیں فرمائی تھی، بلکہ ان مسائل سے اس درجہ بے تعلق تھے کہ خود فرماتے ہیں:

''لوگوں نے ''ایلاء'' کے لفظ کا ذکر کیا۔ امام صاحب نے اپنے ایک ساتھی سے پوچھا، یہ ایلاء کیا چیز ہے؟ اس نے جواب دیا میں نہیں جانتا۔''

امام حماد کی شاگردی:

لیکن ہمت بلند تھی، عمر اگرچہ زیادہ ہوچکی تھی، مگر آپ نے اس کی پروانہ کی اور

''جہل'' کا اعتراف کر کے اس زمانہ میں شرعی علوم کے مشہور امام حماد بن ابی سلیمان کے حلقۂ درس میں حاضر ہونے لگے، اور اب اس علم کا مذاق آپ پر اتنا مستولی ہوا کہ فرماتے ہیں:

''میں دس سال تک ان کے ساتھ رہا۔''

لوگوں کا بیان ہے کہ تجربہ سے اس کے بعد بھی امام نے اپنے کو اس فن میں پختہ نہ پایا، تو پھر رجوع ہو گئے، جیسا کہ انھیں کا بیان ہے:

''پھر میں ان سے اس وقت تک جدا نہیں ہوا جب تک ان کی وفات نہ ہوئی۔''

الغرض حضرت عمر بن عبدالعزیز کے انقلابی عہد نے ایک طرف تو امام صاحب کو شرعی علوم کی طرف راغب کیا اور دوسری طرف اس کا بھی میدان ان ہی کی حکومت نے تیار کر دیا تھا کہ ہر جاننے والا اپنے علم کی اشاعت کرے اور ''اسلامی نظام'' میں گذشتہ خلفاء بنی امیہ کی بدولت جو رخنے پیدا ہو گئے تھے، انھیں بند کرے۔ واقعات و حالات سے معلوم ہوا ہے کہ امام صاحب پر ان دونوں تحریکوں کا کافی اثر پڑا تھا۔ علمی تحریک کے نتائج حاصل کرنے میں تو خدا نے انھیں پوری کامیابی عطا فرمائی۔ لیکن یکا یک پھر زمانے نے پلٹا کھایا، اور جس علم کو لے کر امام صاحب چاہتے تھے کہ اصلاح یا امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے میدان میں اتریں اور اپنا حوصلہ پورا کریں، زمانہ نے پھر اس کی راہوں پر کانٹے بچھا دیئے۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز کی وفات اور بعد کے خلفاء بنوامیہ کی گمراہیاں

حضرت عمر بن عبدالعزیز اپنی خلافت کی مختصر مدت (دو ڈھائی سال تقریباً) پوری کر کے اپنے خدا سے جا ملے۔ اور ان کی جگہ جو شخص بنی امیہ کی گدی پر بیٹھا، وہ عبدالملک کا بیٹا یزید تھا۔ تخت پر بیٹھنے کے ساتھ ہی اس نے جو فرمان نکالا وہ تاریخوں میں درج ہے، اس کے چند فقرے یہاں نقل کئے جاتے ہیں:

اما بعد فان عمر کاف مغرورا — اما بعد واضح ہو کہ عمر بن عبدالعزیز ایک فریب
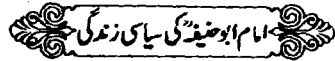
غررتموه انتم و اصحابكم فاذا اتاكم كتابي هذا فدعوا ما كنتم تعرفون من عهده. اعيدوا الناس الى طبقتهم الاولى اخصرو ام اجدبوا احبوا ام كرهوا احيوا ام ماتوا والسلام (عقد الفريد جلد ۲)

خوردہ شخص تھا، تم نے اور تمہارے ساتھیوں نے اسے خوب دھوکہ میں ڈالا۔ اب جونہی کہ میرا یہ فرمان تمہارے پاس پہنچے، یک لخت ان تمام طریقوں کو ترک کر دو جو اب تک تم عمر کے عہد کی چیزوں کے متعلق جانتے تھے لوگوں کی پہلی حالت کی طرف واپس لوٹا دو، خواہ سرسبزی کا زمانہ ہو، یا خشک سالی کا۔ لوگ اسے پسند کریں یا ناپسند کریں، جئیں یا مریں۔

اس کے بعد لوگوں کے حوصلوں پر جو اوس پڑی ہوگی۔ اس کا کون اندازہ کر سکتا ہے۔ یزید کے بعد امام صاحب کے زمانہ میں چھ خلفاء بنی امیہ میں ہوئے، لیکن ان میں زیادہ تر اسی قسم کے لوگ تھے جو بجائے عمر بن عبدالعزیز کو اسوۂ بنانے کے اپنے آباؤ اجداد کے نمونوں پر حکومت کرتے تھے، جنھوں نے نبوت کی راہ کو چھوڑ کر عجمی سلاطین کا طریقہ اختیار کر لیا تھا۔ خود بھی یزید جو عمر بن عبد العزیز کے تخت پر بیٹھا، اپنی آوارگیوں اور عیاشیوں میں اس حد کو پہنچا ہوا تھا، جس کا تذکرہ سلامہ اور حبابہ کے حسن و عشق کے قصوں میں عام طور پر مشہور ہے۔ یہاں تک بیان کیا جاتا ہے کہ سلامہ کی مردہ لاش تک کے ساتھ اس نے مجامعت کی۔

ایسی صورت میں حکومت کی جانب سے اصلاحی تحریکوں کے پھلنے، پھولنے کا کیا موقعہ مل سکتا تھا؟ بھلا جو اپنی رعایا کے ساتھ اس حد تک ظلم کرنے پر آمادہ ہو کہ ''وہ مریں یا جئیں لیکن حکومت اپنے مطالبات میں سے ایک رتی برابر بھی تخفیف نہیں کر سکتی۔'' اس سے کیا امید ہو سکتی تھی کہ وہ نظامِ شریعت کے احیاء میں لوگوں کی امداد کرے گا؟

لیکن اخلاص کے ساتھ جس تحریک کی بنیاد ڈالی جاتی ہے، قدرت اس کو بالآخر ناکام ہونے نہیں دیتی۔ عمر بن عبدالعزیز تو ایک نرسنگھا پھونک کر چلے گئے اور ان کے بعد فوراً اس آواز کو دبا دینے کی کوشش کی گئی، تاہم اس دبی ہوئی حالت میں یہ چنگاری ان

دلوں میں اندر ہی اندر سلگتی رہی، جنھوں نے ان کے پیغام کو عزم کی طاقت کے ساتھ قبول کیا تھا۔ میرے سامنے اس وقت دوسروں کا حال نہیں ہے، بلکہ اس سلسلہ میں یہاں صرف اس نوجوان کا حال بیان کرنا ہے، جو بعد کو امت میں "الامام الاعظم ابوحنیفۃ النعمانؒ" کے نام سے مشہور ہوا۔ (قدس اللہ سرہ وروح روحہ)

امام صاحب میں جو علمی انقلاب پیدا ہوا تھا اس کا قصہ تو مشہور ہے، لیکن علم کے بعد جس چیز کا درجہ ہے یعنی عملی انقلاب، اس میں امام ابوحنیفہ نے کیا کام کیا اور اتنے شدید موانع کے ہوتے ہوئے اس میں انھوں نے کس طرح کامیابی حاصل کی، اگرچہ مؤرخین نے ان کا تفصیلی تذکرہ نہیں کیا ہے، لیکن جستہ جستہ مقامات میں جو باتیں پائی جاتی ہیں، ان سے کچھ نہ کچھ اندازہ ضرور ہوتا ہے۔

خلافت اور بادشاہی کا فرق:

امام صاحب نے اپنے عمل کا نظام نامہ کیا مرتبہ کیا تھا؟ سچ تو یہ ہے کہ اس کا صحیح علم اسی وقت ہو سکتا تھا جب کہ امام صاحب خود یا ان کے شاگردوں کا کوئی بیان اس سلسلہ میں مجھے کسی طرح مل سکتا مگر جیسا کہ میں نے عرض کیا یہ تو بڑی بات ہے، یہاں تو اربابِ تاریخ نے بھی کوئی مسلسل چیز اس ذیل میں نہیں چھوڑی ہے۔ لیکن امام صاحب کا نظام نامہ اگر ہمارے پاس نہیں ہے تو کیا ہوا ان کا کام تو ہمارے سامنے ہے، آخر "ان" سے بھی تو لم[1] تک رہنمائی جاتی ہے اور پھلوں سے اکثر درختوں کو پہچانا گیا ہے۔ میری کوشش کی بھی اس راہ میں یہی نوعیت ہے۔

میں نے عرض کیا تھا، امام کو اپنی جوانی کے دنوں میں روشنی کے بعد جس تاریکی سے سابقہ پڑا تھا، وہ یزید بن عبدالملک کی حکومت اور اس حکومت کی بنیاد کا وہ اساسی فرمان تھا جسے عقد الفرید سے میں بجنسہ نقل کر چکا ہوں۔ اس فرمان کا وہ فقرہ یعنی اعیدوا الناس الی طبقتھم الاولی (لوٹا دو لوگوں کو پہلی حالت کی طرف) دراصل تشریح کا

---

[1] یہ منطق کی اصطلاح ہے "ان معلول لم۔ علت یعنی سبب تک راہ نمائی ہوتی ہے۔۱۲

محتاج ہے کہ اسی کی تشریح سے امام کے ابتدائی منصوبہ (پروگرام) کا جہاں تک میرا خیال ہے کچھ نہ کچھ اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

اس فقرہ کا سیدھا سادہ مطلب تو یہی ہے کہ عمر بن عبدالعزیز کی حکومت سے پہلے مسلمان جس حال میں تھے اس حال کی طرف واپس کر دیئے جائیں یہ یزید نے اپنے گورنروں کے نام حکم جاری کیا تھا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ مسلمانوں کا وہ حال کیا تھا جس کی طرف وہ انھیں لوٹا کر پہنچانا چاہتا تھا!

ممکن ہے لوگوں کو (مجھ سے اختلاف ہو لیکن میرا ذاتی خیال) یہ ہے کہ کچھ اسی زمانہ میں نہیں بلکہ تقریباً ایک حد تک ہر زمانہ میں (حکومتوں کے اثر سے) زیادہ تر وہی بگڑتے ہیں جو دراصل خود بگڑنا چاہتے ہوں۔ خصوصاً مذہب کی حد تک شاید میرا یہ دعویٰ بالکلیہ غلط نہیں قرار دیا جا سکتا۔ علی الخصوص ایسی صورت میں جب کہ حکومت کی باگ ڈور جن ہاتھوں میں ہو وہ خود اپنے کو اسی مذہب کا پیرو بتاتے ہوں اور وہ مرتد و منافق نہ ہوں۔

خلفاء بنی امیہ کی واقعی دینی حالت:

میرا مطلب یہ ہے کہ خلفاء بنی امیہ کی ذاتی زندگی مذہبی حیثیت سے جیسی کچھ ہو، لیکن بایں ہمہ ان پر بہتان ہوگا اگر یہ کہا جائے کہ العیاذ باللہ اسلامی عقائد کو ترک کر کے کفر کے خیالات پر وہ مسلمانوں کو مجبور کرتے تھے کون ثابت کر سکتا ہے کہ جس حکومت کے اکثر خلفاء خود نماز با جماعت کے پابند تھے، خود امامت کراتے تھے، روزے رکھتے تھے، حج کرتے تھے کراتے تھے وہی مسلمانوں کو نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ سے روکنا چاہتے تھے؟ یزید بن عبدالملک اپنے فرمان سے جس سابق حال کی طرف مسلمانوں کو لوٹانا چاہتا تھا ظاہر ہے کہ اس کی قطعاً یہ غرض نہ تھی کہ مسلمان بے دین بنا دیئے جائیں اور ان میں فسق و فجور پھیلایا جائے۔ کیونکہ نہ اس سے پہلے بنی امیہ کے خلفا نے ایسا کیا تھا اور عموماً حکومتیں اپنی رعایا کے مذہبی معاملات میں اتنا براہِ راست دخل دیتی ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ سلاطین و امرا کے شخصی حالات سے متاثر ہو کر جو بگڑتے ہیں، زیادہ

تر یہ وہی لوگ ہوتے ہیں جن کی فطرت چھچھوری اور جن کا دماغ کھوکھلا ہوتا ہے۔ پھر کسی قوم کے چند افراد بگڑ جاتے ہیں تو ان کے دیکھا دیکھی دوسرے بھی بتدریج ان ہی راہوں پر چل پڑتے ہیں۔ مگر یہ سب کچھ اسی وقت ہوتا ہے جب وہ خود چلنے پر آمادہ ہوں۔ پختہ عزم اور بلند حوصلہ رکھنے والوں نے جب کبھی یہ طے کر لیا ہے کہ دہر میں جو کچھ ہو رہا ہے ہونے دو لیکن ہم اس کے ساتھ نہیں گھومیں گے، تو خواہ کسی قسم کی حکومت ہو، ان کو اپنی راہ سے ہٹانے میں کبھی کامیاب نہیں ہوتی۔ خصوصاً جس زمانہ کا ہم ذکر کر رہے ہیں یہ وہ زمانہ ہے کہ عمر بن عبدالعزیزؒ کی ان تھک کوششوں نے اسلامی دنیا کے گوشہ گوشہ کو اہل علم وفضل سے بھر دیا تھا۔ ایک بڑا گروہ ایسے علما کا تقریباً ہر مرکزی مقام پر پیدا ہو گیا تھا جو مسلمانوں کے عقائد و اعمال کی نگرانی ہی کو اپنی زندگی کا سب سے بڑا نصب العین بنائے ہوئے تھا۔ تاریخوں میں لکھا ہے کہ اسی بنیاد پر حضرت عمر بن عبدالعزیز کو قوم کی جانب سے معلم والعلماء کا خطاب دیا گیا تھا۔ ابن سعد نے مشہور محدث میمون بن مہران سے نقل کیا ہے۔

کان عمر بن عبدالعزیز معلم العلماء (ص ۲۷۱ ج۶)

عمر بن عبدالعزیز علماء کے معلم اور استاذ تھے۔

بہر حال اور کسی حکومت کے عہد میں ایسا ہو یا نہ ہو، لیکن جس عہد میں حضرت امام رحمۃ اللہ علیہ نے ہوش سنبھالا تھا' اس وقت مختلف وجوہ سے مسلمانوں کا مذہب ان کا دین سلاطین و امراء کے دست رس سے باہر تھا' کم از کم میرا تو یہی خیال ہے۔ لیکن باوجود اس کے مسلمانوں کی زندگی کے دو شعبے' یعنی ان کا مال اور ان کا انصاف' حکومت کے پنجوں میں پھر بھی پھنسا ہوا تھا اور یہ دو چیزیں ہیں بھی ایسی کہ حکومت کے سوا اس کی نگرانی کوئی دوسری طاقت کر بھی نہیں سکتی۔ خلافت کے نام سے حکومت کا جو نظریہ اسلام نے پیش کیا تھا منجملہ اور خصوصیات کے ان دونوں شعبوں میں اس کا جو نقطۂ نظر تھا اور خلافت کے نظریۂ کو بادشاہت اور ملوکیت کے نظریہ سے جب بدل دیا گیا تو پھر حکومتوں کا جو طرز عمل اس سلسلہ میں ہو گیا تھا۔ اگرچہ اجمالاً اس کا علم تقریباً ہر پڑھے لکھے مسلمان کو ہے۔ لیکن
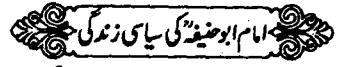
میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں اس کی صحیح تصویر لوگوں کے سامنے نہیں آسکتی جب تک کہ چند جزئی مثالوں سے اسے واضح نہ کیا جائے۔

اسلامی اموال میں خلافت راشدہ کا نقطۂ نظر:

اسلامی اموال یا بیت المال کے متعلق خلافت کے نقطۂ نظر کی تعبیر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ان واقعات سے ہوسکتی ہے، جو تواتر کی حیثیت میں تاریخ کی اکثر کتابوں میں عموماً بکھرے ہوئے ہیں۔ مثلاً کہا جاتا ہے کہ آپ کے پاس کوفہ کا عامل آیا حضرت اندر تھے۔ عامل وہیں بلا لیا گیا۔ اس نے دیکھا کہ حضرت کھانا تناول فرما رہے ہیں۔ وہ سخت متعجب ہوا جب ایشیا۔ افریقہ کے اتنے بڑے بادشاہ کے سامنے صرف جو کی روٹیاں اور زیتون کا تیل رکھا ہوا تھا۔ عامل نے کہا کہ آپ کے ممالک محروسہ میں گیہوں کی کافی مقدار پیدا ہوتی ہے پھر حضرت جو کی روٹی کیوں تناول فرما رہے ہیں؟ حضرت نے ارشاد فرمایا کہ کیا گیہوں کی اتنی مقدار پیدا ہوتی ہے کہ ہر ہر مسلمان تک اس کی روٹی پہنچ جائے؟ اس نے کہا کہ اس کی ذمہ داری کون لے سکتا ہے؟ فاروق نے اس وقت خلافت کے نظریہ کو ان الفاظ میں ظاہر فرمایا: مسلمانوں کا امیر گیہوں کی روٹی اس وقت تک کیسے کھا سکتا ہے جب تک ہر مسلمان کو جو ہمارے علاقہ میں آباد ہے۔ گیہوں کی روٹی نہ پہنچ جائے۔ عام رمادہ میں آپ کا غلام کچھ گھی اور پنیر لے آیا۔ حضرت نے فرمایا مجھے مسلمانوں کے حال کا احساس کیسے ہوسکتا ہے جب تک کہ خود بھی وہی نہ کھاؤں جو عام مسلمان کھاتے ہیں (کامل ابن اثیر و ابن سعید وغیرہ میں اس قسم کے واقعات کا ایک ذخیرہ موجود ہے)

اموی دور میں اسلامی اموال کے متعلق مطلق العنانی:

لیکن جب خلافت سلطنت کے قالب میں ڈھل گئی تو مسلمانوں کا وہی امیر جس کے فرائض کی ذمہ داریاں خواہ جتنی بھی اونچی ہوں لیکن مالی حقوق کے میدان میں وہ مسلمانوں کی صف کا سب سے آخری آدمی قرار دیا گیا تھا، اب بادشاہ بن کر وہ اسلامی

اموال کا سب سے پہلا مطلق العنان خودمختار حق دار بن گیا۔ رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام کی وہی گدی جس پر بیٹھنے والوں کو خلافت کے زمانہ میں اس حال میں پایا گیا تھا جیسا کہ امام مالک حضرت انس رضی اللہ عنہ کے واسطہ سے راوی ہیں کہ:

''میں نے عمر بن الخطاب کو دیکھا اس زمانہ میں جب کہ وہ مسلمانوں کے امیر تھے کہ اپنے مونڈھوں کے بیچ میں تین پیوند لگائے ہوئے ہیں، ایک کو دوسرے کے ساتھ چپکا دیا گیا تھا۔''

اور یہ تو امام مالک جیسے ثقہ راوی کا بیان ہے۔ ورنہ عام تاریخوں میں دس دس بارہ بارہ پیوندوں کا تذکرہ بھی کیا گیا ہے ان پیوندوں میں کبھی کبھی سرخ چمڑے کا ٹکڑہ بھی ہوتا تھا اور جس کے ''توشہ خانہ عامرہ'' کی یہ رپورٹ ہے کہ کبھی کبھی حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ وقت مقررہ پر گھر سے باہر نہ نکلتے، وجہ پوچھی جاتی تو اس زمانہ کی دنیا کا سب سے بڑا فرماں روا جواب دیتا۔

غسلت ثیابی فلما جفت خرجت الیکم (ازالۃ الخلفاء)

''کپڑے دھو رہا تھا جب خشک ہوئے تو تم لوگوں کے پاس آیا ہوں۔''

لیکن رسول کی یہی گدی مدینہ منورہ سے منتقل ہو کر جب دمشق پہنچتی ہے تو اس پر بیٹھنے والوں میں سے ایک کو گھر میں نہیں سفر میں اور وہ بھی حج کے سفر میں دیکھا گیا کہ

''حج کے ارادہ سے نکلا اور چھ سو اونٹوں پر صرف اس کے بدن کے کپڑے تھے۔'' (عقد الفرید ج ا ص ۳۶۶)

یہ عبدالملک کا بیٹا ہشام خلفاء بنی امیہ کا پانچواں خلیفہ تھا۔ زمانہ کی کیسی نیرنگیاں ہیں؟ مسلمانوں کا وہی مال جس کی ذمہ داریوں کے احساس میں کبھی اتنی نزاکت برتی جاتی تھی کہ بحرین سے کچھ مشک کے نافے آتے ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس کو وزن کرانا چاہتے ہیں، آپ کی حرم محترمہ بی بی عاتکہ فرماتی ہیں کہ حکم ہو تو میں تول کر بتا دوں آپ چپ ہو جاتے ہیں، حضرت عمر نے اس کے بعد جواب میں جو کچھ فرمایا دنیا کی قوموں میں نہ پہلے اس کی نظیر تھی اور نہ آئندہ اب تک ملی ہے، بی بی صاحبہ کو مخاطب فرما

کرارشاد ہوتا ہے:

''میں اس کو پسند نہیں کرتا کہ تم ترازو کے پلے میں مشک کو رکھو اور پھر یوں کرو۔ (ہاتھ سے اپنے اشارہ فرمایا)

راوی کہتے ہیں کہ حضرت کا مقصد یہ تھا کہ چھونے چھاننے سے ہاتھ میں مشک کی جو خوشبو رہ جائے گی اور تم نے اپنے اوپر اسے مل لیا' تو؟

فاصیب بذالک فضلا علی المسلمین (ازالۃ الخلفاء)

''عام مسلمانوں کے مقابلہ میں یادہ حصہ ہم تک پہنچ جائے گا۔''

بیت المال کا یہی مال ہے، مسلمانوں کے حقوق اس کے ساتھ اسی طرح بلاکم و کاست متعلق ہیں جس طرح پہلے تھے، مگر خلافت کے نام سے رسول کی وراثت کے مدعی بن کر جو بادشاہت کرتے تھے وہی اس مال کو خرچ کرتے ہیں اور کس پر خرچ کرتے ہیں، ابن عبدربہ کی زبانی سنیے عقد الفرید میں لکھتے ہیں۔

ولید نے مدینہ لکھا کہ اشعب[1] (مسخرہ) کو میرے پاس بھیج دیا جائے۔ اشعب جب دمشق پہنچا تو ولید نے بندر کی کھال جس میں دم بھی تھی اسے پہنائی اور فرمائش کی کہ کھال پہنے ہوئے تم میرے سامنے ناچو گاؤ۔ اگر ایسا کرو گے تو

---

[1] اشعب عہد بنی امیہ کا مشہور مسخرہ تھا لطائف ونوادر کے بیان کرنے میں طاق تھا۔ کسی نے پوچھا میاں اشعب! کبھی کوئی حدیث بھی تم نے یاد کی۔ بولا ہاں مجھ سے نافع نے ابن عمر سے روایت کی ہے کہ جس میں دو خصلتیں ہوں گی وہ خدا کے یہاں خالصین مخلصین میں لکھا جائے گا، پوچھا گیا کون سی دو خصلتیں؟ بولا ایک خصلت تو نافع ہی کو یاد نہ رہی تھی اور دوسری میں بھول گیا۔'' اس کے بعض عجیب نوادر ''محاضرات'' کی کتابوں میں منقول ہیں مثلاً کمہار کو جب پیالے بناتے ہوئے دیکھتا تو کہتا کہ ذرا بڑے پیالے بنایا کرو۔ کمہار نے کہا کہ تمھیں اس کی کیا پڑی ہے اشعب نے کہا کہ ممکن ہے اسی میں مجھے ہدیہ بھیجا جائے چھوٹا ہوگا تو ہدیہ کم آئے گا۔ خود اشعب کا بیان ہے کہ جنازہ کے ساتھ قبرستانوں میں جب دو آدمیوں کو گفتگو اور سرگوشی کرتے ہوئے میں دیکھتا ہوں تو سمجھتا ہوں کہ مرنے والے نے شاید میرے لئے کچھ وصیت کی۔

ہزار درہم تمھیں انعام دوں گا۔"

اشعب ولید کے سامنے ناچا گایا۔ ولید کو پسند آیا اور ہزار درہم اس نے انعام میں دیئے۔

اور یہ کوئی نادر یا انشائی واقعہ نہیں ہے بلکہ عمر بن عبدالعزیز کے سوا مسلمانوں کے بیت المال کو ان خلفا میں سے اکثر نے اپنی ذاتی ملکیت قرار دے رکھا تھا، من مانے طرز پر جس طرح جی چاہتا تھا اس میں تصرف کرتے تھے۔ کس کو دے رہے ہیں، کتنا دے رہے ہیں، کس لیے دے رہے ہیں، ان سوالات میں سے کوئی سوال ان کے سامنے نہیں تھا۔ تاریخ اس قسم کے واقعات سے لبریز ہے گڑے مردوں کی ہڈیاں اکھاڑنی فطرتاً میرے لیے نہایت مکروہ مشغلہ ہے، اس لیے اسی پر اکتفا کرتا ہوں، میں نے تمثیل کے لیے ایک واقعہ حضرت عمر بن عبدالعزیز سے پہلے خلیفہ ولید بن عبدالملک کا درج کیا ہے اور دوسری مثال کا تعلق ہشام بن عبدالملک سے ہے جو عمر بن عبدالعزیز کے بعد خلیفہ ہے۔ دکھانا یہ مقصود ہے کہ جس حال کی طرف یزید لوگوں کو واپس کرنا چاہتا تھا اس کا سب سے بڑا اہم شعبہ بیت المال ہی کا مسئلہ تھا عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ نے نہ صرف اپنی خانگی اور ذاتی زندگی سے اسلامی بیت المال کے نقطۂ نظر کو سمجھانا چاہا اور ایسی مثالیں پیش کیں جن کی نظیر خلافت راشدہ کے سوا دنیا کی کسی حکومت میں مل نہیں سکتی۔ بلکہ ہر قسم کی قوت جو انھیں حاصل تھی۔ انھوں نے چاہا کہ اس کے ذریعہ سے اس غیر اسلامی روح کو خلافت کے قالب سے نکال دیں۔ لیکن ان کے بعد کے خلفاء میں پھر وہی خبیث روح گھس گئی بنی امیہ کی عادت اتنی بگڑ چکی تھی کہ عمر بن عبدالعزیز نے جس وقت اعلان کیا کہ مسلمان کا بیت المال مسلمانوں کا ہے اور اس کی تقسیم اسی اصول پر ہوگی جس پر اللہ اور اس کے رسول (ﷺ) نے اسے بانٹا ہے تو ابتدا میں اچھی خاصی بے چینی امراء بنی امیہ میں پیدا ہوئی۔ لیکن جب ایک دن کڑک کر برسر منبر انھوں نے اعلان کیا:

ان لله في بني مروان ذبحا	شاید بنی مروان پر خدا کی طرف سے کوئی سخت
وایم الله لئن کان ذالک	خونریزی مقدر ہے۔ خدا کی قسم یہ خون ریزی میرے
الذبح علیٰ یدی (ابن سعد)	ہاتھوں اگر ہوئی ہو تو مجھے اس سے انکار نہ ہوگا۔

راوی کا بیان ہے کہ مروانی جانتے تھے کہ عمر ارادہ کا پکا ہے، کہیں ایسا نہ ہو کہ کر گذرے اس لیے:

''جب مروانی امرا کو اس کی خبر پہنچی تو شورش سے رک گئے کیونکہ عمر کے عزم کی پختگی سے واقف تھے جانتے تھے کہ جس بات کا ارادہ کرتا ہے کر گذرتا ہے۔'' (ابن سعد)

ایک دفعہ یہی امراء وفد کی صورت میں ان کے پاس حاضر ہوئے اور اپنا یہ معروضہ پیش کیا:

''تم سے پہلے جو سلوک ہم لوگوں کے ساتھ تمہارے پیش رو کرتے تھے تم نے اسے بہت گھٹا دیا ہے اس پر ان لوگوں نے حضرت عمر کو لعنت ملامت بھی کی۔'' (ابن سعد ج ٦)

اس وفد میں مروانی خاندان کا تقریباً ہر چھوٹا بڑا شریک تھا۔ اس سے بھی اندازہ ہوسکتا ہے کہ بیت المال کے متعلق خلفاء نے لوگوں کو کس بات کا عادی کر دیا تھا؟ حضرت عمر نے اس کے جواب میں ایک ایسی بات کا اعلان کیا کہ ان کے ہاتھ کے طوطے اڑ گئے اور آخری امید جو عمر کی موت سے وابستہ تھی اس کو بھی ختم ہوتے ہوئے دیکھ کر وہ چپ ہو گئے۔ حضرت عمر نے جواب میں فرمایا اور پورے عزم وارادے کے ساتھ فرمایا

لئن عدتم لمثل هذا المجلس	اگر تم لوگوں نے پھر کبھی میرے پاس آ کر ایسا
لا شدن رکابی ثم لاقد من	کیا تو میں سوار ہو کر فوراً مدینہ چلا جاؤں گا اور
المدینة ولا جعلنها امرها	حکومت کو مسلمانوں کے مشورہ کے سپرد کر
شوری (ابن سعد)	دوں گا۔

جس کے معنی یہ تھے کہ مسلمانوں کی حکومت اور ان کے بیت المال کو تمہارے

خاندان سے ہٹا کر پھر مسلمانوں ہی کے حوالہ کردوں گا۔ ظاہر ہے کہ ان میں ایسے افراد بھی شامل تھے جو عمر کے بعد اپنی خلافت و بادشاہت کا خواب دیکھ رہے تھے خطرہ پیدا ہوا کہ کہیں سارا خواب خواب پریشان ہو کر نہ رہ جائے۔ کہا جاتا ہے کہ اس کے بعد پھر اس قسم کی آواز ان لوگوں کی طرف سے نہیں اٹھی اور یہ تو بیت المال کے مصارف کا حال تھا۔ خلافت راشدہ کے بعد مداخل کے ساتھ بھی جو بے اعتنائیاں برتی جاتی تھیں، ان کی داستان طویل ہے۔ بس وہی مشہور تاریخی واقعہ اس کا اندازہ کرنے کے لیے کافی ہے کہ جب مصر کے فلاحوں نے اسلام قبول کرنا شروع کیا اور اس کی وجہ سے جزیہ کی آمدنی کم ہونے لگی تو اموی خلیفہ نے گورنر مصر کے نام حکم بھیجا کہ لوگوں کو اسلام قبول کرنے سے روکے۔ اور یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہا جب تک حضرت عمر بن عبدالعزیز ہی نے اپنے فرمان سے اس کا انسداد نہ فرمایا شریح بن حبان مصر کے گورنر تھے انھوں نے حسب دستور قدیم بارگاہِ خلافت میں اطلاع بھیجی کہ:

> ذمی رعایا تیزی سے اسلام میں داخل ہوتی چلی جارہی ہے جس سے جزیہ کی آمدنی میں ٹوٹا آرہا ہے۔

لیکن اب تخت خلافت پر ولید یا عبدالملک نہیں تھا بلکہ عمر فاروق کا نواسہ تھا۔ جواب میں ارقام فرمایا:

اما بعد فان الله بعث محمد اصلی الله علیه وسلم داعیا ولم یبعثه جابیا فاذا اتاک کتابی هذا فان کان اهل الذمه اسرعوا فی الاسلام و کسروالجزیة فاطو کتابک واقبل (ابن سعد ج۶ ص ۳۱۰)	اما بعد معلوم ہو کہ اللہ تعالیٰ نے محمد ﷺ کو داعی اور خدا کی طرف بلانے والا بنا کر مبعوث کیا تھا حضور کو خدا نے محصول (ٹیکس) وصول کرنے والا بنا کر نہیں بھیجا تھا۔ جس وقت میرا یہ خط تمہارے پاس پہنچے اور ذمی رعایا تیزی سے اسلام میں داخل ہوتی چلی جارہی ہو جس کی وجہ سے جزیہ کی آمدنی ختم ہورہی ہو تو اپنے حساب و کتاب کے رجسٹر کو لپیٹ کو فوراً میرے پاس چلے آؤ۔

انھوں نے صرف یہ ہی نہیں کیا، بلکہ تمام صوبوں کے عمال وولاۃ کے نام احکام جاری کیے کہ جزیہ دینے والوں کو اسلام کی دعوت دی جائے۔

مروانی حکومتوں کے بگاڑے ہوئے ایک خراسانی امیر نے اس پر عرض کیا کہ دل سے یہ لوگ اسلام نہیں لاتے اس لیے مناسب ہے کہ ختنہ کرانا بھی ان کے لیے آپ ضروری قرار دیجئے۔ اس نے سمجھا تھا کہ شاید اس تدبیر سے مقصد میں کامیابی حاصل ہو جائے۔ لیکن حضرت نے جواب میں فرمایا:

کیا ختنہ کی وجہ سے میں ان لوگوں کو اسلام سے روک دوں؟

اس کے بعد جو بات آپ نے فرمائی، ان تشدد پسند مولویوں کے لیے اس میں عبرت ہے جو مچھروں کے بچانے کے لیے اونٹوں کو قربان کر دینے کے عادی ہیں اور جو ایسا نہیں کرتا اس پر مداہنت کا الزام لگاتے ہیں، عمر بن عبدالعزیز سے زیادہ اسلامی تاریخ میں صحابہ کے بعد متصلب فی الدین ہونے کا دعویٰ کون کر سکتا ہے؟ لیکن وہی کہتے ہیں اور ختنہ جیسی موکدہ سنت بلکہ شعاری سنت کے متعلق فرماتے ہیں۔

جب وہ اسلام لے آئیں گے اور ان کا اسلام خوب اچھی طرح ان کے دلوں میں جم جائے گا تو ختنہ کی طرف خود دوڑیں گے۔

راوی کہتا ہے کہ اس نرمی کا نتیجہ یہ ہوا کہ صرف ایک اس علاقہ میں۔ ان کے ہاتھ پر چار ہزار آدمیوں نے اسلام قبول کیا۔

بہر حال یہ تو ایک ضمنی بات تھی۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ مصارف کے ساتھ مداخل میں بھی اسلامی حدود کی پروا نہیں کی جاتی تھی اور اس سلسلہ میں یہاں تک غلو بڑھ گیا تھا کہ مالی ترقیوں کی ہوس میں اسلام کے تنزل تک کو گوارا کر لیا جاتا تھا۔ بیچارے حضرت عمر بن عبدالعزیز نے مداخل کی اصلاح کی بھی پوری کوشش کی۔ لیکن اس اصلاحی تحریک کی وجہ سے خزانہ کو جو تاوان برداشت کرنا پڑتا تھا ہر شخص کے قلب میں اس کی قوت کہاں تھی جو عمر بن عبدالعزیز کی طرح تاوان کی شکایت کو سن کر یہ فرماتا جیسا کہ میمون بن مہران سے روایت ہے کہ کسی علاقہ کا عامل حاضر ہوا۔ آپ نے محصولات کی آمدنی کا حال پوچھا

اس نے جمع بتائی تو گذشتہ خلفاء کے زمانہ سے وہ بہت کم نکلی حضرت نے وجہ پوچھی عامل نے کہا کہ فلاں فلاں مدوں کی آمدنیوں کو آپ نے روک دیا یہ اسی کا نتیجہ ہے، جواب میں ارشاد ہوا۔

میں نے ان محصولوں کو ساقط نہیں کیا ہے۔ ان کا ساقط کرنے والا تو خدا ہے۔ (ابن سعد)

بیت المال کی جو حالت ان خلفاء کے زمانہ میں ہو گئی تھی اس کے اندازہ کے لیے غالباً میرا اتنا بیان کافی ہو سکتا ہے۔

خلافت راشدہ میں انصاف اور حکومت کا تصور:

اب میں دوسرے مسئلہ کی طرف متوجہ ہوتا ہوں، یعنی مسلمانوں کا جو ''انصاف'' ان خلفاء کے ہاتھ میں تھا، اس پر کیا گذر رہی تھی۔ کس قدر افسوس کی بات تھی وہی ''عدل'' جس کے متعلق قرآن نے کفر و اسلام کی تمیز بھی باقی نہیں رکھی ہے اور جن قوموں سے مسلمانوں کو عداوت و بغض کا تعلق ہے قرآن نے ان کے ساتھ بھی انصاف ہی کرنے کا حکم دیا ہے۔ اللہ اکبر جس شریعت کے شارع (علیہ السلام) نے علی رؤس الاشہاد یہ اعلان کیا ہوا۔

ولو ان فاطمة بنت محمد سرقت لقطعت يدها (اعاذها الله منه)

فاطمہ بنت محمد (اعاذ ہا اللہ تعالیٰ) بھی اگر چوری کرے گی تو میں اس کا ہاتھ کاٹ دوں گا۔

اور جہاں جبلہ بن ایہم جیسے بادشاہ کی شاہی قوت کو ایک معمولی غریب بدو کے انصاف پر ہمیشہ کے لیے قربان کر دیا گیا ہو، ایک بے جان بت کی آنکھ کے بدلہ میں زندہ مسلمان سپاہی کی آنکھ صرف اس لیے کہ انصاف قائم ہو، قانون کا احترام باقی رہے، ایک کافر کے حوالہ بہ خوشی کر دی جاتی ہو[1]

---

[1] یہ قصہ مصر میں پیش آیا تھا کسی مسلمان سپاہی نے ایک بت کی آنکھ توڑ دی بت کا مالک حضرت ؓ

اموی دور میں انصاف وحکومت سے بے راہ روی:

مگر جب خلافت نے سلطنت کا چولا بدلا اس وقت کیا ہوا اور کیا ہوتا رہا؟ ذکر کرتے ہوئے شرم آتی ہے۔ صرف یہی نہیں کہ قانون کے نافذ کرنے میں قریب و بعید دوست و دشمن کا فرق کیا جاتا تھا بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی قانون کی اپنے مطلب کے مطابق تشریح کا حق بھی ''ان'' بادشاہ خلیفوں'' اور ان کے ولاۃ وحکام نے اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے خلاف جب مدینہ منورہ کے والی عمرو بن سعید نے عبدالملک کے حکم سے چاہا کہ مکہ معظمہ پر فوجی حملہ کیا جائے اور اس لیے وہ مدینہ ہی سے فوج بھیجنے کا سامان کر رہا تھا، تو رسول اللہ ﷺ کے صحابی ابوشریح کھڑے ہوئے، بخاری میں ہے کہ انھوں نے فرمایا:

> اے امیر مجھے اجازت دیجئے کہ میں آپ سے ایک ایسی بات کہوں جسے رسول اللہ ﷺ نے فتح مکہ کے دوسرے دن فرمایا تھا۔ میرے دونوں کانوں نے اسے سنا ہے اور میرے دل نے اسے یاد رکھا ہے اور جس وقت حضور ارشاد فرما رہے تھے میری آنکھیں حضور کو دیکھ رہی تھیں۔

ابوشریح نے اپنے کلام میں اتنی قوت پہنچانے کے بعد آنحضرت ﷺ کا مشہور حکم کہ ''حرم مکہ میں خوں ریزی وغیرہ ہمیشہ کے لیے حرام کی جاتی ہے'' بیان فرمایا۔ لیکن سب کچھ سننے کے بعد عمرو بن سعید جو خود اپنے کو اسلامی قوانین کا شارح سمجھتا تھا آپ کو جھڑک کر کہتا ہے:

> ''ابوشریح! میں تم سے زیادہ عالم اور ان امور کا جاننے والا ہوں حرم کسی

لـه عمرو بن عاص کے پاس دادخواہ ہوا۔ فیصلہ یہی کیا گیا کہ تم بھی سپاہی کی آنکھ توڑ دو۔ اگرچہ بت پرست نے روپیہ لے کر خود معاف کر دیا۔ لیکن اسلام نے تو مسلمان کی آنکھ کو کفر کے حوالہ اس لیے کرایا کہ انصاف کے لیے تم اس کو توڑ سکتے ہو۔ خلافت راشدہ کی تاریخ کا ورق ورق ان حیرت انگیز واقعات سے معمور ہے، بطور مثال کے میں نے چند مشہور باتوں کا تذکرہ کیا ہے۔ عام ناظرین اس واقعہ کو قاضی سلیمان مرحوم کی سیرت رحمۃ للعلمین جلد سوم میں دیکھ ہیں۔

نافرمان اور خون کر کے بھاگنے والے کو پناہ نہیں دیتا۔''

بیچارے ابوشریح (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) اس کے بعد یہ فرما کر چپ ہو گئے:

''میں تو حضور کی صحبت میں موجود تھا اور تم غائب تھے۔ حضور کا چونکہ فرمان تھا کہ ہم میں جو حاضر ہوں وہ ان کو پہنچا دیں جو ہم میں سے غائب ہوں لہٰذا میں نے تم کو پہنچا دیا۔ اب تم جانو تمھارا کام۔''

قانون اور انصاف کے متعلق حضرت عمر بن عبدالعزیز کی وضاحت:

''قانون'' اور ''انصاف'' کے ساتھ خلفا کا یہی طرز عمل تھا جس کی اصلاح کا ارادہ فرماتے ہوئے حضرت عمر بن عبدالعزیز نے اعلان کیا تھا۔

لست بقاض ولکنی منفذ ولست بخیر من احد ولکنی اثقلکم حملا و احسبه قال ولست بمبتدع والکنی متبع ص ۲۷۱ ج ۶ (ابن سعد)

میں فیصلہ کرنے والا نہیں ہوں (میرا کام بحیثیت خلیفہ ہونے کے) صرف نافذ کرا دینا ہے۔ تم میں سے کسی ایک سے بہتر نہیں ہوں لیکن میرا بازو زیادہ بوجھل ہے اور میری باز پرس زیادہ سخت ہے۔ میں دین اور شرعی قانون میں کسی کمی بیشی کتر بیونت کا حق نہیں رکھتا بلکہ قانون جس حال میں ملا ہے اس کا اتباع ہی میرا فرض ہے۔

دراصل یہ تین منفی فقرے خلافت اسلامی کے اصولِ عدالت اور اموی پادشاہی کے طرز عدالت کا بنیادی فرق پوری طرح نمایاں کر دیتے ہیں۔ پہلا فقرہ کہ ''میں فیصلہ کرنے والا قاضی نہیں ہوں بلکہ بحیثیت خلیفہ ہونے کے میرا کام صرف نافذ کرا دینا ہے۔'' مروانی خلفاء اور ان کے ولاۃ کے اس طرز عمل کی تردید ہے کہ وہ شریعت کی تشریح اور واقعات پر اس کے انطباق کا اپنے کو مختار قرار دیئے ہوئے تھے۔

دوسرا فقرہ کہ ''تم میں سے کسی ایک سے بہتر نہیں ہوں'' یہ اس غلط خیال کی تردید تھی جس کے سلاطین اور ان کے حوالی موالی ہمیشہ شکار رہے ہیں۔ یعنی عام رعایا برایا سے وہ اپنے کو ایک الگ جنس قرار دیتے تھے اور اسی لیے چاہتے تھے کہ قانون ان کے

ساتھ وہ برتاؤ نہ کرے جو عام لوگوں کے ساتھ کرتا ہے۔ تیسرا فقرہ کہ ''دین اور شریعت (قانون) میں مجھے کسی کمی بیشی کتر بیونت (ابتداع) کا اختیار نہیں ہے، بلکہ میرا کام صرف شریعت کے احکام کی تعمیل و اتباع ہے۔'' یہ ان بے جا تصرفات کی طرف اشارہ تھا جو شریعت کے قوانین میں اپنے من مانے اغراض کے تحت خلفاء کر رہے تھے، اور شاید اس کا اپنے کو حق دار سمجھتے تھے۔ آپ نے اس اعلان کے ذریعہ اس بدعت شنیعہ کی بیخ کنی کرنی چاہی۔ اور واقعہ یہ ہے کہ خلافت راشدہ کے بعد اگر چہ قضا کے محکمے ہر مرکزی جگہ میں ضرور قائم تھے۔ لیکن جن لوگوں نے ''حکومت'' (جس کے لغوی معنی حکم اور فیصلہ کرنے کے ہیں) کا مقصد صرف ٹیکس وصول کرنا قرار دے رکھا تھا جس کی طرف حضرت عمر بن عبدالعزیز نے ایک بلیغ تعریفی اشارہ ان الفاظ میں فرمایا تھا کہ ''ما بعث اللہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم جابیا (اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو محصول وصول کرنے والا بنا کر نہیں بھیجا تھا (ان لوگوں کے عہد حکومت میں بتدریج اس محکمہ کی اہمیت کم ہو جاتی چلی جارہی تھی کہاں ایک وہ زمانہ تھا کہ قاضی کے تقرر کا اختیار براہ راست خلیفہ اپنے ہاتھ میں رکھتا تھا اور جیسا کہ حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے ازالۃ الخفاء میں لکھا ہے یہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ایجاد تھی کہ ہر صوبہ میں مستقلاً وہ اپنی طرف سے تین نمائندوں کو بھیجتے تھے ایک والی (وائسرائے) دوسرا قاضی' تیسرا افسر خزانہ حضرت شاہ صاحب نے لکھا کہ یہ تینوں عہدہ دار کسی ایک کے ماتحت نہیں ہوتے تھے بلکہ ہر ایک براہ راست بارگاہ خلافت کے آگے ذمہ دار تھا شاہ صاحب کے اپنے الفاظ یہ ہیں۔

درکوفہ و بصرہ وغیرھا من البلاد حاکے جدا معین فرمودہ قاضی جدا و تحویلدار بیت المال علیحدہ	کوفہ بصرہ اور دوسرے شہروں میں حضرت عمر حاکم اعلیٰ (گورنر) جدا قاضی (جج) جدا اور بیت المال کا تحویلدار جدا مقرر فرماتے تھے۔
وایں امریست کہ تازمان حضرت فاروق واقع نشدہ بود	اور یہ ایک ایسی خصوصیت ہے جس کا ثبوت حضرت فاروق اعظم سے پہلے نہیں ملتا

علاوہ دیگر مصالح کے ایک بڑا فائدہ شاہ صاحب کے خیال میں اس کا یہ تھا کہ:

''بالفرض کسی سے اگر بد دیانتی سرزد ہو تو دوسرا ٹوکنے پر آمادہ ہو' اور یہ بات کہ (تینوں کے تینوں) بد دیانتی پر اتفاق کر لیں ایسی صورت میں کہ ان کی راست بازی کا پہلے سے تجربہ بھی کر لیا گیا ہو ذرا مشکل ہے۔''

اسی نظم کا یہ نتیجہ تھا کہ کسی خاص صوبہ سے نہیں بلکہ سارے اسلامی محروسہ سے ممتاز آدمیوں کا انتخاب عمل میں آتا تھا اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ قاضیوں پر والیوں کو کسی قسم کا اقتدار چونکہ حاصل نہ تھا اس لئے بے خوف و خطر جو بات ان کی سمجھ میں آتی تھی فیصلہ کرتے تھے۔

اموی دور میں قضات پر والیوں کا اثر

لیکن جوں ہی خلافت مدینہ اور فصلِ خصوصیات کی اہمیت اس درجہ گھٹا دی گئی کہ ہر صوبہ کے والی کو اس کا اختیار دے دیا گیا کہ اپنے صواب دید سے جس شخص کو وہ چاہیں اپنے علاقوں میں قاضی مقرر کر لیں۔

انما کان ولاۃ البلدھم الذین یولون القضاع (حسن المحاضرہ ص ۸۸)

''یعنی ہر شہر کا والی خود ہی قاضی کو مقرر کر لیتا تھا۔''

کیا زیادہ دن کے بعد؟ نہیں مروان ہی کے زمانہ میں اس کا نتیجہ یہ دیکھا گیا تھا کہ جب وہ مصر کے دورہ پر پہنچا اور قاضی کو بلایا جس کا نام قاضی عابس تھا عابس کے علم و فضل کا کیا حال تھا تاریخ والے بیان کرتے ہیں حسن المحاضرہ میں بھی ہے کہ:

''قاضی عابس ان پڑھ تھا لکھنا بھی نہیں جانتا تھا۔''

مروان نے اس غیر خواندہ قاضی کو مخاطب کر کے پوچھنا شروع کیا۔

مروان:- اجمعت کتاب اللہ؟ (کیا تم نے قرآن یاد کر لیا ہے؟)

قاضی:- لا (نہیں مجھے قرآن یاد نہیں ہے)

مروان:- فاحکمت الفرائض؟ (تو کیا تم نے میراث کے مسائل کو پختہ کر لیا ہے؟)

قاضی:--لا (ان سے بھی ناواقف ہوں)

(مروان کو اس جواب پر حیرت ہوگئی اور بولا) فبما تقضی؟ آخر تم کس چیز سے فیصلہ کرتے ہو؟)

بیچارے عابس اس کا کیا جواب دے سکتے تھے۔ الغرض بجائے خلیفہ کے قاضیوں کا تقرر والیوں کے سپرد کردینے ہی کا یہ نتیجہ تھا کہ ان یدفی اغراض کے مطابق جو آدمی ہوتا اسی کا وہ تقرر کردیا کرتے تھے ان ہی قاضی عابس صاحب کے تقرر کی وجہ یہ لکھی ہے کہ حضرت معاویہؓ نے مصر کے والی مسلمہ کو لکھا کہ یزید (کربلائی) کے لئے لوگوں سے بیعت لی جائے حسب الحکم مسلمہ نے بیعت لینی شروع کی اور تو کسی طرف انکار نہیں ہوا لیکن مشہور صحابی حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ جو فاتح مصر عمرو بن عاص کے مشہور صاحبزادے ہیں اور علم وفضل اور علوِ سیرت میں لوگوں نے باپ پر بھی انہیں ترجیح دی ہے انہوں نے بیعت سے انکار کیا مسلمہ نے ان کے انکار پر اعلان کیا۔

عبداللہ کو درست کرنے لئے کون آمادہ ہے؟

کہا جاتا ہے کہ یہی عابس بن سعید کھڑے ہوئے اور بولے میں اس کام کو انجام دیتا ہوں عبداللہ بن عمرو اس زمانہ میں اپنے والد کے مشہور قصر واقع فسطاط میں قیام فرماتے تھے۔ عابس پولیس کے نوجوانوں کو لے کر پہنچا اور ان کے مکان کو گھیر لیا کہلا بھیجا کہ بیعت یزید کے متعلق اب کیا ارادہ ہے؟ انہیں پھر بھی انکار ہی پر اصرار رہا عابس نے اس کے بعد کیا کیا؟ مورخین لکھتے ہیں:- اس نے آگ اور لکڑی جمع کی تا کہ ان کے قصر میں آگ لگادے (حسن المحاضرہ)

عبداللہ بن عمرو نے اس کے بعد اپنے کو مجبور اور معذور پایا بیچارے گھر سے نکلے اور جو کچھ اس جاہل نے کہنے کے لئے کہا دہرادیا ان پڑھ عابس کا یہی سب سے بڑا کارنامہ تھا کہ ایک صحابی کو آگ میں جلادینے کی دھمکی دے کر حکومت میں سرخ روئی حاصل ہوئی تھی اسی سرخ روئی کا یہ صلہ ملا تھا کہ غریب مسلمانوں کی منڈیاں ان کی جانیں ان کے مال و جائداد حکومت نے سب قرآن وحدیث اور فرائض سے بالکل جاہل اس

شخص کے سپرد کردیئے میں نے تمثیل کے لئے یہ ایک جزئی واقعہ پیش کیا ہے ورنہ قاضیوں کے تقررات میں جو بے اعتنائیاں مختلف اثرات کے تحت میں برتی جاتی تھیں ان کی داستان طویل ہے۔

ظاہر ہے کہ ایسے قاضی جو اپنے علم وفضل تقویٰ ودیانت کی بنیاد پر نہیں بلکہ محض کسی والی کے رحم وکرم پر جیتے تھے خود تو جو کچھ کرتے ہوں گے وہ تو ظاہر ہی ہے اس کے سوا بھی ان والیوں کے دباؤ سے کہاں تک ان کے فیصلے محفوظ رہ سکتے تھے اس کا ہر شخص اندازہ کرسکتا ہے شامت کا مارا بے چارہ کوئی قاضی اپنے والی کی مرضی کے خلاف اگر کچھ کر گزرتا تھا تو پھر اس کی خیر نہ تھی سلیمان بن عبدالملک کے زمانہ کا واقعہ ہے کہ مکہ معظمہ میں قضا کا عہدہ طلحہ بن ہرم کے سپرد تھا یہ وہ زمانہ ہے جب بنی امیہ کا مشہور گورنر خالد[1] بن عبداللہ القری مدینہ کا والی تھا شیبی خاندان (جو کعبہ کے کلید بردار ہیں) کے دو آدمیوں میں کسی زمین کے متعلق جھگڑا ہوا قاضی صاحب نے ایک فریق کے حق میں جس کا نام انجم تھا فیصلہ کردیا لیکن دوسرا فریق خالد کا درباری تھا اس نے فوراً مدینہ پہنچ کر خالد سے قاضی کے خلاف حکم حاصل کرلیا قاضی طلحہ کو اس پر غصہ آ گیا اور چپ چاپ انہوں نے سلیمان بن عبدالملک بن عبدالملک کو اس واقعہ کی اطلاع دی خلفاء بنی امیہ میں سلیمان کا شمار بھی مغتنم لوگوں میں ہے قاضی صاحب کا خط جسے بصیغہ راز قاضی نے اپنے لڑکے محمد بن طلحہ کے ہاتھ بھیجا تھا سلیمان کو ملا تو وہ برہم ہوا اسی وقت اس نے ایک حکم محمد بن طلحہ کو لکھوا کر دیا کہ سیدھے مدینہ جا کر خالد کے حوالہ کرو اور کہدو کہ انجم کے معاملہ میں وہ دراندازی نہ کرے محمد بن طلحہ اس خط کو لے کر جس وقت مدینہ پہنچتے ہیں اور خالد کے حوالے کرتے ہیں تو خالد بس یہ سن کر آگ بگولہ ہوجاتا ہے اور قبل اس کے کہ سلیمان کا خط پڑھے جلاد کو حکم دیتا ہے کہ محمد بن طلحہ کو (۱۰۰) سو کوڑے لگائے محمد بن طلحہ کا اس کے بعد کیا حال ہوا اس کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ قاضی طلحہ نے اپنے بیٹے کے خون آلود لباس کو سلیمان کے پاس بھیجا سلیمان اس واقعہ کے بعد آپے سے باہر ہوگیا اور حکم دے چکا تھا کہ خالد کے ہاتھ کاٹ دیئے جائیں

---

[1] خالد کے تفصیلی حالات آگے آرہے ہیں۔۱۲

لیکن بعض امیروں کی سفارش سے معاملہ ٹل گیا (عقد الفرید ص ۲۶۰ ج ۲)

اور ایک معاملہ نہیں ہے خلفاء بنی امیہ اور خلفاء بنی عباس کے زمانہ ہارون الرشید تک ایسے واقعات مسلسل پیش آتے رہتے تھے مثالاً میں دونوں خلافتوں کے متعلق ایک ایک واقعہ درج کرتا ہوں سیوطی نے اپنی مشہور کتاب ''حسن المحاضرہ'' میں قاضی خیر بن نعیم کے ذکر بنی امیہ کے عہد کا ایک واقعہ یہ بیان کیا ہے:۔

''ایک فوجی سپاہی نے کسی آدمی کو گالیاں دیں اس نے قاضی خیر کے اجلاس میں دعویٰ دائر کر دیا اور دعوے کے ثبوت میں صرف ایک گواہ پیش کیا قاضی خیر نے سپاہی کو حوالات میں رکھنے کا حکم اس وقت تک کے لئے دیا جب تک کہ مدعی دوسرا گواہ حاضر کرے مصر کے گورنر ابوعون عبدالملک بن یزید نے اپنا آدمی بھیج کر سپاہی کو حوالات سے نکلوا دیا قاضی خیر کو جب اس کی خبر ہوئی تو قضا سے کنارہ کش ہو کر بیٹھ گئے ابوعون نے ان کے پاس آدمی بھیجا (گویا معذرت طلب کی لیکن قاضی صاحب نے کہلا بھیجا کہ جب تک سپاہی واپس نہ ہوگا میری واپسی بھی ناممکن ہے مگر ابوعون نے سپاہی کو واپس نہ کیا قاضی صاحب بھی اپنے ارادہ پر ڈٹے رہے۔''

دوسرے واقعہ کا ذکر طاش کبریٰ زادہ اپنی کتاب مفتاح السعادۃ میں مشہور قاضی حفص بن غیاث کے تذکرہ میں لکھتے ہیں کہ ہارون الرشید نے ان کو بغداد کا قاضی مقرر کیا۔ اتفاق سے ہارون کی مشہور چہیتی بیوی زبیدہ کے مرزبان (پٹیل یا نمبردار) کا ایک معاملہ قاضی صاحب کے پاس پیش ہوا مرزبان کسی کا مدیون تھا۔ دین اس پر ثابت ہو گیا قاضی صاحب نے مرزبان کے خلاف ڈگری دے دی زبیدہ کو جب یہ معلوم ہوا کہ قاضی نے یہ جاننے کے بعد کہ مرزبان میرا آدمی تھا پھر بھی اس کے خلاف فیصلہ کیا آگ بگولہ ہو گئی ہارون جب محل سرا آیا تو زبیدہ غصہ میں بھری بیٹھی تھی۔ وہ ہارون کے سر ہو گئی کہ ایسے قاضی کو معزول کر دیا جائے آخر ہارون نے قاضی حفص کو معزول کر دیا۔

ایک مرزبان پر اسلام کا اتنا بڑا عالم محض ایک عورت کی خاطر قربان کر دیا گیا۔

اگرچہ یہ ایک جزئی واقعہ ہے لیکن خصوصیت کے ساتھ اس کو یاد رکھنا چاہئے۔ آئندہ آپ کو معلوم ہوگا کہ یہی ہارون الرشید ہے اور وہی اس کی قاہرہ حکومت لیکن امام ابوحنیفہ کے تلمیذ رشید قاضی ابویوسف جن کا تقرر امام صاحب کی شہادت کے بعد ہارون ہی نے کیا اپنے زمانہ قضا میں ہارون کی بیوی یا حکام ہی کے خلاف نہیں بلکہ خود ہارون کی مرضی کے خلاف فیصلے کرتے ہیں لیکن بجز خاموشی کے وہ اپنے لئے کوئی چارہ کار نہیں پاتا۔ آخر یہ طرز عمل کیوں بدلا اور اس کے پیچھے کس کے اخلاص و قربانی کی قوت تھی؟ افسوس مورخین نے اس پر غور نہیں کیا۔ بہر حال اتنی مدت کے بعد بکھرے ہوئے واقعات کو جمع کرنے سے جو نتائج پیدا ہوتے ہیں ان کا ذکر تو آئندہ آتا ہے ابھی تو میں صرف یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ مسلمانوں کے انصاف کا جو حال ان خلفاء کے ہاتھوں ہو رہا تھا اس کی نوعیت کیا تھی؟

اربابِ صدق وامانت کا قضاءت سے انکار

خلفاء کی ان بے جا طرفداریوں ہی کا نتیجہ یہ تھا کہ امام ابوحنیفہ ہی نہیں جن کا واقعہ مشہور ہے اور بھی اس زمانہ کے کتنے ارباب صدق وامانت' تقویٰ' دیانت حکومت کے شدید اصرار کے باوجود قضا سے انکار کرتے تھے اور اگر مارے باندھے کسی نے قبول بھی کر لیا تو ہمت کر کے وہ خلفاء سے اس کا معاہدہ لیتے تھے کہ فیصلوں میں ذاتیات کو دخل نہ دیا جائے گا ان بے چاروں کی تسلی کے لئے اقرار بھی کر لیا جاتا تھا۔ لیکن زیادہ تر یہ وعدے "عرقوبی[1] مواعید" بن کر شرمندہ ایفا بہت کم ہوتے تھے اس سلسلہ میں قاضی شریک کے ساتھ جو واقعہ پیش آیا ان خلفاء کے طرز عمل پر اس سے روشنی پڑتی ہے کہا جاتا ہے کہ ابوجعفر منصور عباسی نے قاضی شریک کو بلا کر قضاء کا عہدہ پیش کیا پہلے تو انہوں نے مختلف حیلے بہانے کئے لیکن جب کوئی بات سنی نہ گئی تب قاضی صاحب نے منصور کو مخاطب کر کے فرمایا:

---

[1] ایک مشہور وعدہ خلاف یہودی کے نام کی طرف یہ انتساب ہے۔۱۲

''میں ہر آنے جانے والے وارد و صادر پر فیصلے کروں گا اور مجھے اس کی پروانہ ہوگی کہ میں کس کے خلاف فیصلہ کر رہا ہوں۔ کوئی بھی ہو میں نہ (خلیفہ) کے مقربوں کو دیکھوں گا نہ ان کو جو بارگاہ خلافت سے تعلق نہیں رکھتے:

چند الفاظ کے تلفظ میں منصور کا کیا بگڑتا تھا' بولا:

احکم علی وعلی ولدی.

''آپ میرے اور میری اولاد کے مقابلہ میں بھی فیصلے کر سکتے ہیں۔''

گویا منصور نے اپنے پیش روں کے مقابلہ میں یہ کہہ کر انتہائی انصاف پسندی کا اظہار کیا۔ ورنہ سچ یہ ہے کہ اسلام کے قانونِ عدل کے ماننے والوں کے لیے اس تصریح کی بھلا کیا ضرورت تھی۔ تاہم منصور نے بڑی کشادہ دلی کو راہ دے کر خود اپنے کو اور اپنی اولاد کو قانون کے نیچے ڈال دینے کا اعلان کیا۔ لیکن قاضی صاحب کی اسی سے بھی تشفی نہ ہوئی۔ خلفاء سے بھی زیادہ خطرہ جن لوگوں سے تھا، اور زیادہ تر اس زمانہ کا ''عدلیہ'' ان ہی کے ہاتھوں برباد ہو رہا تھا۔ کھل کر خلیفہ کے سامنے انھوں نے اس خطرہ کا اظہار ان الفاظ میں کیا اکفنی حشمک. یعنی اپنے حاشیہ نشینوں اور درباری امرا حوالی موالی) سے میری حفاظت کیجئے۔ منصور نے اس کے جواب میں بھی قاضی صاحب کو یہ کہتے ہوئے گویا مطمئن کر دیا کہ افعل (ہاں میں ایسا ہی کروں گا)

مگر سب کچھ ہو جانے کے بعد قاضی شریک جب اپنے عہدہ کا جائزہ لے کر اجلاس کے لیے بیٹھتے ہیں تو بدقسمتی سے سب سے پہلا مقدمہ جو ان کے آگے پیش ہوتا ہے وہ خلیفہ کی ''مولاۃ'' (چھوکری) کا معاملہ کسی شخص سے تھا۔ عادتیں تو عام طور پر بگڑی ہوئی تھیں۔ اجلاس میں جب فریقین حاضر ہوئے تو صرف اس لیے کہ چھوکری خلیفہ کی چھوکری تھی اپنے فریق کے برابر کھڑے ہونے میں اس نے اپنی توہین محسوس کی اور آگے بڑھ کر قاضی صاحب کے سامنے آ گئی۔ وہ مطمئن تھی کہ شاہی آدمیوں کے ساتھ عدالت میں اسی امتیاز کا رواج ہے لیکن اسے معلوم نہ تھا کہ شاہی انتساب کے جس نشہ میں وہ مخمور ہے نیا قاضی بھی خلیفہ کے معاہدہ کے نشہ سے چور ہے۔ لونڈی کے ہوش اڑ

گئے جس وقت قضاء کی گدی سے اس کے کان میں یہ آواز گونجی:

اوگندی عورت پیچھے ہٹ جا

قاضی صاحب کا مطلب یہ تھا کہ یہ اسلامی عدالت ہے جس میں حاضر ہونے والوں کو خواہ وہ مسلمانوں کا سب سے بڑا آدمی یعنی خلیفہ ہی کیوں نہ ہو، ہر ادنیٰ معمولی رعیت کے مساوی سمجھا جاتا ہے۔ اگرچہ قاضی صاحب بیچارے جانتے تھے کہ اب وہ زمانہ باقی نہیں رہا ہے۔ لیکن خلیفہ کے عہد پر ان کو غرہ تھا اس لیے شاہی لونڈی کی شان میں ان کی زبان سے یہ الفاظ نکل پڑے۔ خدا جانے چھوکری کو بھی اپنے آقا کے معاہدہ کا علم تھا یا نہیں۔ بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ جانتی تھی۔ خصوصاً جب کہ یہ ایک نئی بات تھی خلیفہ نے دین کے جوش میں بھر کر مدت کی ایک رسم کے خلاف معاہدہ کیا تھا۔ قدرۃً اس کی خبر ہر کہ ومہ کو ہونی چاہیے۔ بہرحال اگر وہ یہ جانتی بھی تھی تو اس کے ساتھ ان معاہدوں کا جو وزن تھا اس سے بھی ناواقف نہ تھی ایک کنیز دارالخلافہ کے سب سے بڑے قاضی کو مخاطب کر کے اس فقرہ کا جو جواب دیتی ہے، حقیقت یہ ہے کہ نقل کرتے ہوئے بھی قلم کانپتا ہے۔ چھوٹتے ہی چھوکری نے بوڑھے قاضی کو کہا:

بڈھے تو احمق ہے

ایک چھوکری کی زبان سے اسلام کا ایک مشہور عالم یہ جملہ سنتا ہے اور دم بخود ہو کر رہ جاتا ہے۔ اپنے کیے پر پچھتاتا ہے اور کہتا ہے:

"میں نے خلیفہ سے اپنے متعلق یہی کہا تھا (یعنی کہ میں احمق ہوں) لیکن تیرے آقا نے قبول نہیں کیا۔"

خیر یہ تو قاضی صاحب نے جواب دیا۔ لیکن شاہی عدالت کی اس صریح اہانت پر منصور نے عام عدالتی رسم کی بنیاد پر نہیں اسلامی عدالت کے اصول پر نہیں، کم از کم اپنے معاہدہ کی لاج ہی کے لیے اس چھوکری سے کوئی جواب طلب کیا؟ کس قدر عجیب ہے کہ احکم علی وعلی ولدی کا بر سر دربار معاہدہ کرنے والا منصور اپنے متعلق یا اپنی اولاد کے متعلق پاس عہد وزبان تو کیا کرتا اپنی ایک چھوکری کے متعلق بھی قاضی صاحب کے اس

برتاؤ کو برداشت نہ کر سکا اور جیسا کہ مورخین نے لکھا ہے فعزلوہ قاضی شریک کو لوگوں نے معزول کر دیا اگرچہ منصور کے بعد مہدی کے اصرار سے قاضی صاحب کو پھر یہ عہدہ قبول کرنا ہی پڑا جس کا ذکر اپنے موقعہ پر ان شاء اللہ تعالیٰ آگے آئے گا لیکن منصور کے زمانہ میں تو اس نوکری کا انجام یہ ہوا ان ہی باتوں کا یہ اثر تھا کہ جو لوگ اپنے دین و علم کی حفاظت کرنا چاہتے تھے وہ ان خلفاء کے قول و قرار پر اعتماد نہیں کرتے تھے۔ ابن خلکان میں ہے کہ عباسی خلیفہ مہدی نے حضرت سفیان ثوری کو گرفتار کرا کے اپنے دربار میں بلایا اور وہی قضاء کا عہدہ پیش کیا۔ ان کو انکار پر اصرار تھا لیکن وہ قبول کرا لینے پر مصر تھا۔ اس وقت مہدی اور سفیان ثوری میں ایک سخت گفتگو بھی ہوئی جس کا ذکر ان شاء اللہ تعالیٰ آئندہ آئے گا اور اسی وقت یہ بھی معلوم ہوگا کہ جب ان خلفاء کو اپنے ڈھب کے آدمی بکثرت مل رہے تھے تو ان بیچاروں کو پکڑ پکڑ کر وہ کیوں مجبور کرتے تھے۔ بہرحال حضرت سفیان نے نہ قبول کرنے کی وجوہ میں خلفاء اور ان کے امراء و حولی موالی کی غلط دخل اندازیوں کا ذکر کیا تو اس نے اپنے باپ منصور کی طرح زبانی نہیں بلکہ تحریری معاہدہ لکھ کر حضرت کے حوالہ کرنے کا حکم دیا۔ ابن خلکان کا بیان ہے کہ مہدی نے اپنے میر منشی کو کہا:

> کوفہ کی قضاءت کا فرمان اس شرط کے ساتھ لکھ کر انھیں دے دو کہ کوئی ان کے فیصلوں میں دخل در اندازی نہ کرے گا۔

معاہدہ لکھ کر حضرت سفیان ثوری کے حوالہ کیا گیا۔ لیکن جس آسمان کے نیچے اور جس زمین کے اوپر آدم کی وہ اولاد تھی جنھیں تم اس زمانہ کے خلفاء اور امراء کے لباس میں دیکھ رہے ہو، وہیں زندگی کی تمام ضروریات رکھنے والی وہ ہستیاں بھی تھیں کہ ایک صوبہ کے ہائی کورٹ کی ججی دی جاتی ہے، لیکن اس کا انجام کیا ہوتا ہے۔ قاضی ابن خلکان راوی ہیں:

> حضرت سفیان نے فرمان لیا اور دربار سے باہر نکل کر انھوں نے اسے دجلہ میں پھینکا اور غائب ہو گئے۔ (ص ۲۱۰ ج ۱)

آخر جب مہدی کا یہ حال تھا جیسا کہ خطیب نے قاضی عبیداللہ بن حسن کے حالات میں نقل کیا ہے کہ کسی زمین کے معاملہ میں ایک خوش باش تاجر اور مہدی کے کسی

فوجی جنرل میں جھگڑا تھا ادھر مقدمہ قاضی عبیداللہ کے اجلاس میں دائر ہوا اور دوسری طرف دارالخلافت سے خلیفہ (یعنی مہدی) کا فرمان بصیغۂ راز قاضی کے نام وصول ہوا جس میں مہدی نے قاضی کو حکم دیا۔

انظر الی الارض التی یخاصم فیھا فلان التاجر فلانا القائد فاقض بھا للقائد (ص ۳۰۹ ، ج ۱۰ تاریخ بغداد)	دیکھو فلاں تاجر اور فلاں قائد (فوجی جنرل) کے درمیان جس زمین کا جھگڑا ہے اس مقدمہ میں فیصلہ قائد کے منشاء کے مطابق دو۔

اگرچہ قاضی عبیداللہ نے مہدی کے فرمان کی پروانہ کی اور حق پر چونکہ تاجر ہی تھا۔ اس لیے فیصلہ اسی کے حق میں قاضی صاحب نے کیا۔ لیکن نتیجہ کیا ہوا، سننے کے ساتھ ہی مہدی نے قاضی عبیداللہ کو معزول کر دیا اور اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ عدل و انصاف کی درگت ان نام نہاد خلفاء کے زمانہ میں کیا بنی ہوئی تھی۔

اسلامی حکومت کے حدود:

عدل وانصاف کے اس تاریخی تبصرے کے بعد اب میں پھر اصل مضمون کی طرف متوجہ ہوتا ہوں کون نہیں جانتا کہ ''اسلامی حکومت'' مسلمانوں کی زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی ہے' امن وامان کا قیام، ملک کی آبادی سرحدوں کی حفاظت فوجوں کی تنظیم سلاطین عالم سے تعلقات، یہ اور اس قسم کی دوسری باتیں جن کا عام طور پر حکومتوں سے تعلق ہے ایک طرف اسلامی حکومت کے دائرے میں جہاں اس قسم کے امور داخل ہیں وہیں یہ مبالغہ نہیں واقعہ ہے کہ مسلمانوں کے بالوں اور ناخنوں تک کی نگرانی کی جاتی تھی۔ مسلمانوں کے پہلے بادشاہ خود ان کے پیغمبر (ﷺ) ہیں اور اس سے کون ناواقف ہے کہ پیغمبر کی نظر کن کن چیزوں پر رہتی تھی حتی الخراءۃ یعنی استنجا کرنے تک کا طریقہ بھی ہمیں پیغمبر (ﷺ) سکھاتے تھے اصحاب نبی ﷺ فخریہ اس کا اظہار دوسری قوموں کے افراد کے سامنے کرتے تھے، الجھے ہوئے بال ناصاف دانتوں کو دیکھ کر آنحضرت ﷺ جس طرح لوگوں کو تنبیہ فرماتے تھے۔ حدیث کی کتابوں میں اس کا ذخیرہ موجود ہے، حضرت

ابوایوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ایک شخص نے مصافحہ کیا جس کے ناخن بڑے ہو گئے تھے۔ آپ نے اس شخص کو خطاب کر کے بیان کیا کہ

جاء رجل الی النبی صلی اللہ علیہ وسلم یسئلہ عن خبر السماء فقال یجئی احدکم یسئال عن خبرالسماء واظفارہ کانھا اظفار الطیر یجتمع فیھا الخباثۃ والنفث (احکام القرآن حصاص ص ۷۶ حصہ)

رسول اللہ ﷺ کے پاس ایک آدمی آیا اور آسمان کی خبریں دریافت کرنے لگا۔ آنحضرت ﷺ نے اس کو دیکھ کر فرمایا کہ تم میں ایک آدمی آتا ہے اور آسمان کی خبریں دریافت کرتا ہے حالانکہ (جو چیز اس کے سامنے کی ہے یعنی) اس کے ناخن تک اس کے پرندوں کے چنگل کے مانند بڑھے ہوئے ہوتے ہیں۔ جن میں ہر طرح کی گندگی اور میل کچیل جمع رہتے ہیں۔

اور یہ باتیں کچھ پیغمبر ہی تک محدود نہ تھیں۔ آپ کے راشدین خلفاء اسی نقطۂ نظر کو سامنے رکھتے ہوئے مسلمانوں کی زندگی کے ہر شعبہ کی نگرانی کرتے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا مشہور واقعہ ہے کہ آپ کے سامنے ایک الجھی ہوئی بڑی لمبی چوڑی داڑھی لیے ہوئے ایک شخص آیا دیکھنے کے ساتھ ہی حضرت عمر اس شخص کی طرف بڑھے اور فرمایا کہ

"تم میں سے بعض لوگ میرے سامنے اس شکل میں آتے ہیں کہ گویا وہ درندوں میں سے کوئی درندہ ہے۔"

پھر آپ نے قینچی منگوا کر اس کے بال درست کئے۔ (عینی شرح بخاری)

بہر حال شخصی زندگی ہو یا خاندانی وعائلی، قومی تعلقات ہوں یا عام انسانی تعلقات یا خدا اور بندے کے باہمی تعلقات اسلام ان سب پر حاوی ہے۔ اور ہر شعبہ کے متعلق قوانین و دفعات رکھتا ہے جن کے نفاذ و تعمیل کی اسلامی حکومت ذمہ دار ٹھہرائی گئی ہے۔ لیکن خلافت راشدہ کے اختتام کے بعد جن ہاتھوں میں اسلامی حکومتوں کی باگیں آئیں وہ بتدریج اس راہ سے ہٹتے ہوئے بالآخر اس حد پر پہنچ گئے کہ آخری دو چیزیں یعنی مسلمانوں کا مال جو بیت المال میں جمع ہوتا تھا اور مسلمانوں کے باہمی معاملات کے

چکانے فیصلہ کرنے کے لیے جو قانون اسلام نے دیا تھا، ان دو آخری باتوں کی ذمہ داریوں سے بھی لاپروائیاں برتی جانے لگیں۔

عہد بنو عباس میں امام صاحب کی مکہ سے کوفہ کو واپسی

ملوک بنی امیہ ہوں یا شاہان عباسیہ اس باب میں تقریباً دونوں کا حال ایک سا تھا۔ امام ابوحفص کبیر کے صاحبزادے ابوحفص صغیر کے حوالہ سے موفق نے اپنی مناقب میں جو یہ نقل کیا ہے کہ

هرب ابو حنيفة الى مكة واقام بها الى ان ظهرت الها شمية فقدم الكوفة (ص ٢١٦ ج ١)	بھاگ گئے ابوحنیفہ مکہ معظمہ اور مکہ ہی میں ان کا قیام رہا تا ایں کہ ہاشمیوں یعنی عباسیوں نے اپنا اقتدار قائم کر لیا۔ تب امام صاحب کوفہ واپس ہوئے۔

غالباً یہی خیال کر کے حرم ربانی کی اس پناہ گاہ (مکہ معظمہ) سے وہ کوفہ تشریف لائے کہ نئی حکومت شائد اپنے اعلانات کے مطابق گذشتہ حکومت کی کوتاہیوں کی ممکن ہے تلافی کرے لیکن جو تجربات ابتدا ہی میں مسلسل اس نئے حکمراں خاندان سے امام کو ہونے لگے اس کا اندازہ کچھ ان واقعات ہی سے ہوسکتا ہے جن کا ذکر ابوجعفر، منصور، مہدی، ہارون کی مثالوں میں بھی گذرا اور عباسیوں کے متعلق تو بیرونی مثالوں سے زیادہ خود وہی واقعات کافی ہو سکتے ہیں جو خود امام ابوحنیفہ کے ساتھ عباسیوں کے دور میں پیش آئے۔

خلیفہ منصور پر امام صاحب کے احقاق حق کے چند واقعات

عباسیوں کے خلیفہ دوم ابوجعفر منصور نے امام کے پاس کچھ رقم بھیجی، لینے سے آپ نے انکار کیا۔ مشورہ دینے والوں نے کہا تصدق بھا (لے کر خیرات ہی کر دیجئے) اسی کے جواب میں امام نے جو تاریخی بات فرمائی وہ یہ تھی۔

او عندهم شئی حلال؟ اوعندهم شئی حلال؟ (ص ۲۱۶ ج ۱)
''کیا ان لوگوں کے پاس حلال بھی کچھ ہے، کیا ان کے پاس حلال بھی کچھ ہے۔''[۱]

اور اس سے بھی زیادہ دل چسپ قصہ اسی منصور دوانیقی ابو جعفر کا ہے حضرت امام کو لوگوں نے اس عام مقبرے میں دفن نہیں کیا جس میں بغداد کے لوگ دفن ہوتے تھے کہتے ہیں کہ قبر پر نماز پڑھنے منصور بھی آیا۔ اس نے پوچھا کہ یہاں کیوں دفن کیے گئے۔ اس کے اس سوال پر لوگوں نے جواب دیا کہ امام کی یہی وصیت تھی۔ لوگوں نے بیان کیا کہ اس خطۂ اراضی کو جس پر بغداد آباد کیا گیا تھا امام اس کو ارض مغصوبہ قرار دیتے تھے یعنی زبردستی مالکوں سے چھینی گئی ہے ان کا اس زمین کے متعلق یہی فتویٰ تھا اسی لیے انھوں نے وصیت کی تھی کہ مجھے اس زمین میں نہ گاڑنا جو ناجائز ذریعہ سے حاصل کی گئی

---

[۱] ظاہر ہے کہ حضرت امام کا تقویٰ وورع میں جو بلند مقام تھا یا تو یہ اس کا اقتضا تھا جو ان لوگوں سے نہ لیتے تھے یا اس کو ان کا ذاتی مذاق قرار دینا چاہئے ورنہ سچ یہ ہے کہ بنی امیہ ہوں یا بنی عباس بلکہ دنیا کی کوئی حکومت آمدنی کا کچھ نہ کچھ حصہ جائز ذرائع سے بھی اس کے خزانہ میں داخل ہوتا ہے اور ایسی صورت میں جب جائز و ناجائز مال مخلوط ہو جائے خصوصاً شاہی خزانہ میں تو نہ صرف بعد کے لوگ بلکہ بنی امیہ ہی کے خزانہ سے بعض جلیل القدر صحابیوں نے بھی لیا ہے اور ان کے بعد تابعین نے بھی۔ ابوبکر الجصاص اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں و كانوا ياخذون الازراق من بيوت اموالهم وقد كان المختار الكذاب يبعث الى ابن عباس و محمد بن الحنفية و ابن عمر باموال فيقبلونها (یعنی مختار جیسے کذاب جس کے فسق وطغیان کے واقعات سے تاریخ بھری پڑی ہے، وہی حضرت ابن عباس محمد بن الحنفیۃ ابن عمر کے پاس مال بھیجتا اور یہ حضرات اسے قبول فرماتے تھے (ص ۷۲ ج ۱) بنی امیہ کے ایک امیر نے حضرت ابن عمر کو لکھا کہ ضرورت ہو تو کچھ آپ کو بھیج دوں آپ نے جواب میں لکھا کہ نہ تجھ سے میں کچھ مانگوں گا اور حق تعالیٰ تیرے ذریعہ سے جس روزی کو بھیجیں گے نہ اسے واپس کروں گا جصاص ہی نے لکھا ہے کہ خواجہ حسن بصری، سعید بن جبیر شعبی جیسے ائمہ ان ہی ظالم سلاطین سے اپنے وظائف حاصل کرتے تھے۔ ابراہیم نخعی کے متعلق تو لکھا ہے کہ امراء کے پاس بطون کو موئی کر کے بطور تحفہ بھیجتے۔ مقصود یہ ہوتا کہ اس کے جواب میں وہ بھی کچھ سلوک کریں گے۔ امام صاحب کیوں نہیں لیتے تھے اس کی ایک وجہ آئندہ بھی آئے گی۔ فانتظر ۱۲

ہے سننے کے ساتھ ہی منصور نے کہا:

من یعذرنی منه حیا و میتا.

زندگی اور زندگی بعد بھی اس شخص کے حملوں سے مجھے کون بچا سکتا ہے۔

بعض روایتوں میں ہے کہ امام کی قبر کی طرف اشارہ کر کے ابوجعفر نے کہا:

من یعذرنی منک حیا و میتا.

زندگی اور زندگی بعد بھی تجھ سے مجھے کون بچا سکتا ہے۔

اور یہ حال تو مداخل یعنی ان کی آمدنیوں کا تھا۔ باقی مصارف تو منصور ہی سے امام صاحب کی ایک دفعہ جو گفتگو ہوئی ہے اس کو سنئے اور دیکھئے کہ امام نے اپنے خیال کا اظہار کس پیرایہ میں کیا ہے، لکھا ہے کہ منصور نے پھر کسی موقعہ پر امام صاحب کو کچھ رقم دینی چاہی، حسب دستور آپ نے انکار کیا اس نے پوچھا کہ آخر تم کیوں نہیں لیتے۔ جواب میں بجائے یہ فرمانے کے کہ ناجائز ذرائع سے تم حاصل کرتے ہو، آپ نے اس دفعہ مصارف کی بے ضابطگیوں کی طرف توجہ دلاتے ہوئے فرمایا:

''امیر المومنین نے خود اپنے ذاتی مال سے کبھی کوئی چیز مجھے کبھی نہیں عطا فرمائی جسے میں نے واپس کیا ہو۔ مگر ہوتا یہ ہے کہ آپ مسلمانوں کے بیت المال سے مجھے دیتے ہیں اور میں دیکھتا ہوں کہ بیت المال سے لینے کا کوئی حق مجھے حاصل نہیں۔ مسلمانوں کی طرف سے میدان جنگ میں لڑائی اگر کرتا تو سمجھتا کہ جیسے فوجیوں کا بیت المال پر حق ہے مجھے بھی اپنا حق ملا۔ جس طرح بیت المال سے فوجیوں کے بال بچوں، اہل و عیال کو ملتا ہے، سو میں وہ بھی نہیں ہوں۔ یا میرا اشمار مسلمانوں کے نادار اور مفلس لوگوں میں ہوتا تو فقرا کی مد سے لینے کا حق مجھے ہوتا۔ لیکن بحمد اللہ میں محتاج و فقیر بھی نہیں ہوں۔'' (ص ۲۱۵ ج ا۔ مناقب موفق)

میں سمجھتا ہوں کہ امام صاحب نے اس طریقہ سے منصور کو سمجھانا چاہا کہ آپ نہ حقدار کو دیکھتے ہیں اور نہ غیر مستحق کو بلکہ جسے جی چاہتا ہے مسلمانوں کا مال دے دیتے

ہیں، گویا اس مال میں اس قسم کا تصرف کرتے ہیں جیسے اپنے ذاتی مال میں کوئی کرتا ہوگا۔ ذاتی مال اور جس مال کا آدمی امین ہوتا ہے دونوں کے اس فرق کو سمجھا رہے تھے جسے عملاً ان سلاطین نے قریب قریب ختم کر دیا تھا۔[1]

اسی طرح مسلمانوں کی عدالت اور انصاف کا جو قانون اسلامی سلاطین کے سپرد کیا گیا تھا۔ اس کے ساتھ جو بے انصافیاں عمل میں آ رہی تھیں دوسروں کے متعلق بعض مثالیں گذر چکیں خود امام ابوحنیفہ نے اسی ابوجعفر منصور کے آگے اس کا اظہار اس وقت فرمایا تھا۔ جب قاضی بننے پر ان کو مجبور کر رہا تھا، یوں تو یہ قصہ متعدد بار جیسا کہ آئندہ معلوم ہوگا پیش آیا۔ اور خیال گذرتا ہے کہ مختلف مواقع پر امام نے مختلف جوابات دیئے ہیں۔ اسی سلسلہ میں ایک دفعہ اسی منصور عباسی خلیفہ کو مخاطب کر کے آپ نے فرمایا۔

> "امیر المومنین! آپ کے گرد و پیش میں جو لوگ ہیں، ان کو تو ضرورت ایسے حکام کی ہے۔ جو آپ کی وجہ سے ان کا اکرام کریں۔" (ص ۱۷۰ ج ۲ موفق)

عربی کے الفاظ یہ ہیں: "ان لک حاشیة یحتاجون الی من یکسرمهم لک" جس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ منصور پر امام صاحب یہ تعریض کر

---

[1] منصور کے حالات میں لکھا ہے کہ جب کسی شاہی ملازم کو ملازمت سے برطرف کرتا تو اس غریب کی ایک ایک چیز چھین لیتا اور ایک خاص مکان میں یہ چھینے ہوئے اموال الگ الگ کمروں میں جمع کئے جاتے تھے ہر کمرہ پر قفل توڑا لگا دیا جاتا تھا اور جس کا مال ہوتا اس کے نام کی چٹ دروازے پر لگا دی جاتی، جب منصور مرنے لگا تو اپنے بعد ہونے والے خلیفہ مہدی بن منصور کو منجملہ دوسری وصیتوں کے یہ وصیت بھی کی کہ چھین چھین کر عہدہ داروں سے یہ مال جو میں نے جمع کیا ہے میرے بعد تم کو چاہئے کہ جس کمرے پر جس کا نام ہے اسی کو اگر زندہ ہو یا اس کے وارثوں کو بلا بلا کر سب واپس کر دیجیو لیکن یہ فعل کیا احساس امانت کے تحت اس نے کیا تھا آگے سنیے بیٹے کو اس نے سمجھایا کہ اگر تم ایسا کرو گے تو عہدہ داروں کے خاندان کی ہمدردیاں تمہارے ساتھ ہو جائیں گی اور عام پبلک پر بھی اس طرز عمل کا گہرا اثر مرتب ہوگا۔ دیکھا آپ نے دوسروں کے مال کو اس طرح بلاوجہ چھین لینا اور مال رہتے ہوئے ان کو تکلیف میں مبتلا کرنا پھر ان ہی کے مال سے لوگوں کے قلوب کی تسخیر کا کام لینا، یہ تھی سیاست ان لوگوں کی۔ ۱۲ دیکھو کامل ابن اثیر ص ۱۰ ج ۶

رہے تھے کہ آپ کے حوالی موالی اعزا و اقربا انصاف میں مساوات کو پسند نہیں کرتے وہ سمجھتے ہیں کہ ہم بادشاہ کے متعلقین میں ہیں۔ ہمارے ساتھ قانون وہ برتاؤ نہ کرے جو عوام کے ساتھ کیا جاتا ہے، امام نے اس کے بعد خود منصور کو یہی کہا جس کا حاصل یہ ہے کہ:

''اگر کوئی مقدمہ آپ پر دائر ہو، اور آپ مجھ سے یہ چاہیں کہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کروں، اور دھمکی دیں کہ ایسا اگر نہ کرو گے تو تجھے دریا میں غرق کردوں گا، تو یاد رکھئے کہ میں دریا میں ڈوب جانے کو پسند کروں گا لیکن خلاف انصاف فیصلہ کروں، مجھ سے یہ نہیں ہوسکتا۔'' (ص ۷۰ موفق ج ۲)

ایک اور موقعہ پر منصور ہی کو آپ نے یہ بھی فرمایا تھا:

''قاضی اسی شخص کو ہونا چاہیئے جو آپ کے خلاف بھی فیصلہ کرنے کی ہمت رکھتا ہو آپ کے خلاف بھی آپ کے بال بچوں کے خلاف بھی آپ کے سپہ سالاروں اور فوجی افسروں کے خلاف بھی۔'' (ص ۲۱۵ موفق ج ۱)

خلاصہ یہ ہے کہ مسلمانوں کی یہ دونوں آخری چیزیں جن میں بہر حال حکومت کی امداد کے بغیر عوام کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ ان کے متعلق جو کچھ ہو رہا تھا۔ خود امام رحمۃ اللہ علیہ کے ان بیانات سے اس کا اندازہ ہوسکتا ہے۔ ماسوا اس کے اور جو کچھ مسلمانوں کے ساتھ ان دونوں حکومتوں کے زمانہ میں گذر رہی تھیں۔

اموی اور عباسی دور کے دو درندے:

بنی امیہ والوں نے حجاج جیسے درندے کو اور عباسیوں کی طرف سے ابو مسلم جیسا کلب عقور مسلمانوں پر جن بے دردیوں اور بے رحمیوں کے ساتھ چھوڑ دیئے گئے تھے، واقعہ یہ ہے کہ جس کے دل میں ذرہ برابر بھی رسول اللہ ﷺ کی ملت و امت کی ہمدردی کا جذبہ تھا وہ بے چین تھا کہ آخر ان مصائب کے معاملہ میں کیا کرے۔ امت محمدیہؐ کے خون کو دونوں حکومتوں کے ان دونوں نمائندوں نے اتنا ارزاں کر دیا تھا کہ شاعر نے تو ع ''ہر بات پروان زبان کٹتی ہے'' صرف شعر لکھا ہے۔ لیکن اس زمانہ میں بات پر زبان نہیں، بلکہ یہ واقعہ ہے کہ سر کٹتے تھے۔ بے محابا جس وقت جس مسلمان کا جی چاہتا تھا سر

اڑا دیا جاتا تھا، اور نہ کوئی اس کی داد تھی نہ فریاد۔ واللہ اعلم اسی دہشت اور ہراس کے پھیل جانے کا نتیجہ تھا۔ یا کیا۔ الیافعی نے اپنی تاریخ میں بنی امیہ کے عہد کا ایک واقعہ یہ بھی درج کیا ہے کہ یزید بن عبدالملک جو حضرت عمر بن عبدالعزیز کے بعد خلیفہ ہوا تھا اور حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا ہم عصر تھا، لکھا ہے کہ اسی یزید کے زمانہ میں

اتوہ اربعین شیخا شھدوالہ ان الخلفاء لاحساب علیھم ولاعذاب (ص ۲۲۴)	چالیس شیخ پیش ہوئے اور انھوں نے اس بات کی شہادت ادا کی کہ خلفاء سے قیامت کے دن نہ حساب لیا جائے گا اور نہ ان کو ان کے جرائم کی سزا ملے گی۔

امام یافعی نے اس فقرے کو نقل کرنے کے بعد جیسا کہ چاہیے تھا ارقام فرمایا ہے کہ

نعوذ باللہ مما سیلقی الظالمون من شدۃ العذاب.	ہم اللہ کی پناہ اس عذاب اور سزا سے مانگتے ہیں جس میں ظلم کرنے والوں کا یہ گروہ مبتلا ہوگا۔

لیکن کچھ بھی ہو، اس سے اس زمانہ کے حال کا تو پتہ چلتا ہے کہ لوگوں کی اخلاقی قوت ان سلاطین کے ہاتھوں کس حد تک غت ربود ہو کر رہ گئی تھی، اور خیر اس شہادت کے ادا کرنے والے "شیخ" کس معنی کے لحاظ سے تھے؟ ان کی پیری (شیخوخت) سفیدی مو والی پیری تھی یا کیا تھی۔

طبقہ حشویہ کے بعض عجیب عقائد:

بہرحال ان کو تو جانے دیجئے۔ حیرت تو اس پر ہے کہ ایک بڑا طبقہ محدثین کا ان ہی دنوں میں پیدا ہو گیا تھا، جس نے اس عقیدے کو اپنا دین بنا لیا تھا، ابوبکر جصاص اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں۔

قوم من الحشویۃ وجھال اصحاب الحدیث انکر و اقتال الفئۃ الباغیۃ والامر بالمعروف والنھی عن	الحشویہ اہل حدیث کا ایک طبقہ تھا (جو شریعت کے ظاہر الفاظ پر بے سمجھے بوجھے اصرار کرتا تھا) اور اہل حدیث میں جاہلوں کی جو جماعت شریک تھی ان لوگوں کے نزدیک اسلام سے باغی فرقہ سے

المنکر بالسلاح وسموا الامر بالمعروف والنهی عن المنکر فتنة اذا احتیج فیه الی حمل السلاح وقتال الفئة الباغية.	جنگ درست نہ تھی اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر (یعنی شریعت کے مطابق حکومت کرنے کا مطالبہ، ہتھیار کے زور سے اس کو بھی ناجائز سمجھتے تھے اور اس قسم کے امر بالمعروف نہی عن المنکر کو یہ لوگ فتنہ قرار دیتے تھے یعنی باغی طبقہ سے مقابلہ میں ہتھیار کی ضرورت جہاں پیدا ہو جائے اس کو بھی یہ لوگ فتنہ ہی خیال کرتے تھے۔

پھر چند سطروں کے بعد اسی عقیدے کی مزید تشریح ان الفاظ میں کرتے ہیں:

وذعموا مع ذلک ان السلطان لاینکر علیه الظلم والجور وقتل النفس التی حرم الله وانما ینکر علی غیر السلطان بالقول او بالیل بغیر سلاح (ص ۳۴ ج ۲)	ان لوگوں کا اسی کے ساتھ یہ خیال بھی تھا کہ ظلم و جور اور بے گناہ لوگوں کے قتل وغیرہ افعال کا صدور بادشاہ وقت سے اگر ہو تو اس کے خلاف آواز بلند کرنا شرعاً صحیح نہیں ہے ہاں بادشاہوں کے سوا عوام کو ٹوکنا درست ہے اور وہ بھی صرف زبان کی حد تک ہتھیار تو بہر حال کسی کے مقابلہ میں اٹھانا شرعاً جائز نہیں ہے۔

اس قسم کے محدثین کی کتابوں میں اس وقت تک بطور اعتراض کے خصوصاً امام ابوحنیفہ کے تذکرے میں اب تک یہ الفاظ ملتے ہیں کہ کان یری السیف (ابوحنیفہ تلوار کے قائل تھے) الخطیب نے بغداد کی تاریخ میں بے شمار محدثین کے حوالہ سے امام رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق اس اعتراض کو نقل کیا ہے جس کا مطلب یہی ہے کہ یعنی ان محدثین کے مذکورہ بالا نقطۂ نظر کے امام ابوحنیفہ منکر تھے اور اس کو غلط سمجھتے تھے اور سچ تو یہ ہے کہ حالات ہی ایسے پیدا ہو گئے تھے کہ آج گھر بیٹھے ان بیچاروں پر اعتراض کر دینا آسان ہے لیکن خدانخواستہ مبتلا ہونے کے بعد پتہ چلتا ہے کہ کون کتنے پانی میں ہے۔

حجاج کی مطلق العنانی:

ان کو تو جانے دیجئے جنھیں الجصاص نے حشویہ اور جہال اہل حدیث میں شمار کیا ہے، لیکن اسی کتاب میں دوسری جگہ ان ہی الجصاص نے جو کچھ لکھا ہے۔ میرے تو رونگٹے اس کے تصور سے کھڑے ہو جاتے ہیں انھوں نے عبدالملک بن عمر کے حوالہ سے یہ واقعہ نقل کیا ہے۔

خرج الحجاج یوم الجمعة جمعہ کے دن دوپہر کے وقت حجاج[1] باہر نکلا (اور

---

[1] حجاج کے متعلق خواجہ حسن بصری سے منقول ہے کہ فرماتے اخفش اعمش یمد یدہ قصیرة البنان (بھنچی بھنچی آنکھوں اور چوندھا مروک ایسے ہاتھ بڑھا کر باتیں کرتا تھا کہ جس کی انگلیاں چھوٹی چھوٹی تھیں) ان ہی سے دوسرے الفاظ منقول ہیں جن کا ترجمہ یہ ہے کہ حجاج پستہ قد ایک آنکھ بڑی ایک چھوٹی رکھنے والا چھوٹی چھوٹی انگلیاں اپنی اس نے نکالیں ایسی انگلیاں جن میں کبھی ایسی باگ نہیں گئی جو اللہ کی راہ میں جہاد کے پسینہ سے تر ہوئی ہو) ابن خلکان نے حجاج کے تقرر کا واقعہ عجب لکھا ہے۔ خلاصہ یہ کہ عبدالملک کو اپنی فوج کے متعلق نظم وضبط کی سخت شکایت تھی۔ روح بن زنباع جو اس کے وزیر تھے ان سے اس شکایت کا اظہار کیا۔ روح نے کہا کہ میرے فوجی اسٹاف میں ایک سپاہی حال ہی میں بھرتی ہوا ہے۔ اگر نظم وضبط کا کام اس کے سپرد کیجئے تو میں سمجھتا ہوں کہ اس شکایت کا ازالہ کر دے گا۔ یہ حجاج تھا۔ طائف میں معلم الصبیانی کے پیشے کو ترک کر کے سپاہیوں میں شریک ہو گیا تھا، عبدالملک نے بلوایا اور کام اس کے سپرد کیا حکم دیا گیا کہ امیر المومنین کی سواری جوں ہی روانہ ہو اسی وقت ساری فوج کو کوچ کرنا چاہئے۔ حجاج تعمیل حکم کا وعدہ کر کے روانہ ہوا۔ عبدالملک کی سواری اسی دن روانہ ہوئی۔ حجاج فوج میں اعلان کرتا پھرتا تھا کہ امیر المومنین کے ساتھ ہر ادنیٰ واعلیٰ کو سوار ہو جانا چاہئے۔ گھومتے ہوئے خود وزیر کے اسٹاف میں پہنچا، دیکھا کہ ابھی تو ان میں کوئی سویا پڑا ہے۔ کوئی کھانا پکا رہا ہے حجاج نے کڑک کر آواز دی کہ اب تک تم لوگ کیوں سوار نہیں ہوئے ان بیچاروں کو کیا معلوم تھا کہ یہ آدمی نہیں درندہ ہے بے تکلفی میں لوگوں نے کہا کہ "اے کیا بک بک کی لگائی ہے آ بیٹھ ہم لوگوں کے ساتھ تو بھی کچھ کھا لے" ابھی ان لوگوں کی بات شائد پوری بھی نہ ہونے پائی تھی کہ حجاج نے بے تحاشا ہر ایک کے سر پر پیٹھ پر کوڑے برسانے شروع کئے ان کے لیے یہ بالکل نیا تجربہ تھا کوئی ادھر بھاگا کوئی ادھر اکثر خون سے لت پت ہو گئے حجاج نے اسی پر قناعت نہ کی بلکہ وزیر اور اس کے رفقا کے خیموں میں اس نے آگ بھی لگا دی دربار سے جب روح واپس آئے تو اس حال کو دیکھ ☜

بالها جرة فما زال يعبر حرة عن اهل الشام و يمدحهم و مرة عن اهل العراق ويذمهم لم نرمن الشمس الا حمرة على شرف المسجد ثم امر المؤذن فاذن فصلے بن الجمعة ثم اذن فصلے بنا

خطبہ منبر پر دینے لگا پھر کبھی اس خطبہ میں شام والوں کا ذکر کر کے ان کی تعریفیں کرتا اور کبھی عراق والوں کا تذکرہ کر کے ان کی مذمت کرتا (یہ خطبہ اتنا طویل تھا اور اتنی دیر ہوگئی) کہ مسجد کے میناروں پر دھوپ کی سرخی کے سوا اور ہمیں کوئی چیز نظر نہ آنے لگی تب حجاج نے موذن کو حکم دیا۔ اس نے اذاں دی اور ہم لوگوں کو اس نے

لے کر لکھا ہے کہ رونے لگے۔ سیدھے عبدالملک سے آکر شکایت کی کہ اس سپاہی نے تو ہمارے ہی آدمیوں پر ہاتھ صاف کیا۔ عبدالملک نے حجاج کو بلایا۔ پوچھا تو نے یہ کیا کیا۔ جواب میں اس نے صاف انکار کیا۔ کہا گیا کیا تو نے کوڑے نہیں مارے آگ نہیں لگائی۔ بولا قطعاً نہیں پھر وزیر کے آدمیوں کے ساتھ یہ سلوک کس نے کیا؟ حجاج نے کہا کہ حضور نے عبدالملک نے حیرت سے پوچھا 'میں نے؟ جی ہاں آپ نے، حجاج نے کہا اور اس کے بعد کہنے لگا۔ امیرالمومنین! مجھ غریب کی کیا مجال تھی کہ یہ کرسکتا تھا، لیکن جو کچھ ہوا، آپ ہی کے حکم سے ہوا، میرا ہاتھ، میرا کوڑا، میرا کوڑا باقی نہیں رہا، اب وہ آپ کا ہاتھ ہے اور آپ کا کوڑا ہے۔ عبدالملک اس کی باتیں سن کر اچھل پڑا، کہنے لگا بس اس قسم کے آدمی کی مجھے ضرورت تھی، اسی کے بعد بتدریج حجاج بڑھتا گیا تا ایں کہ کوفہ کی گورنری تک پہنچا عبدالملک نے اس کو اتنا شوخ دیدہ بنادیا تھا کہ رسول اللہ ﷺ کے مشہور صحابی اور خادم خاص حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی بھرے دربار میں اس نے توہین کی، ان کی گردن مبارک پر وہ مہر لگائی جو مجرموں کی گردنوں پر لگائی جاتی تھی۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی قرأت اور فتووں کا مذاق جن الفاظ میں اڑاتا تھا نقل کرنا بھی ان کا دشوار ہے۔ عبدالملک نے حجاج سے ایک دفعہ خود اسی سے اس کے متعلق رائے دریافت کی تو اس نے کہا کہ سچی بات یہی ہے کہ میں سخت کینہ پرور، حاسد کاٹ کھانے والا آدمی ہوں، عبدالملک نے سن کر کہا کہ "تب تو تیرا رشتہ شیطان سے ملتا ہے، لکھا ہے کہ حجاج ولید کے زمانہ میں جب مر رہا تھا تو کہتا جاتا تھا ولید ہی کی اطاعت پر زندہ رہا اور اسی کی اطاعت پر مر رہا ہوں اور اسی کی اطاعت پر قیامت میں اٹھوں گا۔ عباسی خلیفہ ابوجعفر منصور کے دربار میں حجاج کے اس قول کا کسی نے جب تذکرہ کیا تو اس نے کہا کہ اس کو دراصل شیعہ (پارٹی) کا آدمی کہتے ہیں اس کو افسوس تھا کہ جو شیعہ (پارٹی) اس نے قائم کی تھی اس میں ایسے افراد نہ تھے۔ یہ سارے واقعات حافظ ابن عساکر کی تاریخ دمشق سے ماخوذ ہیں۔ ۱۲

العصر ثم اذن فصلے بنا المغرب.

(حجاج) نے جمعہ کی نماز پڑھائی پھر معاً اسی کے بعد عصر کی اذاں موذن نے دی اور حجاج ہی نے ہمیں عصر کی نماز پڑھائی اس کے بعد مغرب کی اذاں ہوئی، اور اس نے مغرب کی نماز پڑھائی۔

جماعت میں بڑے بڑے لوگ شریک ہیں، لیکن کچھ کہہ نہیں سکتے کہ تو کیا کر رہا ہے الجصاصؒ ہی نے خواجہ حسن بصری کا ایک طویل بیان اس سلسلہ میں نقل کرتے ہوئے آخر میں ان کے یہ الفاظ دہرائے ہیں کہ:

یصعد المنبر فیھذر حتی تفوتہ الصلوۃ لامن اللہ یتقیٰ ولا۔من الناس یستحیی فوقہ اللہ وتحتہ مائۃ الف او یزیدون لایقول لہ قائل الصلاۃ ایھا الرجل.

منبر پر چڑھ جاتا اور بک بک شروع کر دیتا، تا اینکہ نماز کا وقت جاتا رہتا۔ نہ خدا سے ڈرتا تھا اور نہ مخلوق خدا سے شرماتا تھا، بس اوپر تو اس کے خدا تھا اور نیچے ایک لاکھ اور ایک لاکھ سے زیادہ ملازمین کوئی کہنے والا نہ تھا کہ اے شخص نماز (یعنی نماز کا وقت جارہا ہے)

اشارہ ان ہی واقعات کی طرف ہے جو آئے دن پیش آتے رہتے تھے ہر شخص کے سر پر ننگی تلوار گویا لٹکی رہتی تھی، زبان سے لفظ نکلا نہیں کہ سر گردن سے جدا کر دیا جاتا تھا خود خواجہ رحمۃ اللہ علیہ کے ان الفاظ کا یعنی

ھیھات! واللہ حال دون ذالک السیف والسوط (ص ۴۸۸ ج ۲)

افسوس! اس معاملہ میں تلوار اور کوڑا حائل ہوجاتا تھا۔

اور قصہ کچھ حجاج ہی کے زمانہ تک محدود نہیں تھا اس قسم کے غیر معمولی خوف قلوب میں حکومت کی جانب سے اس نے پیدا کر دیا تھا کہ کسی میں ہمت بھی کچھ کرنے کی اگر پیدا ہوتی تو حجاجی عہد کے خونیں مناظر اور کھلے ہوئے جیل خانوں کی آہ و بکا شور و ہنگامہ کی یاد ارادوں کو پست کر دیتی تھی خود ہی سوچنا چاہیے کہ غلط ہو یا صحیح، لیکن جس زمانہ میں چالیس چالیس مشائخ نے یہ گواہی ادا کی ہو کہ حکومت کرنے والے افراد ہر قسم کی

مسئولیت سے بری ہیں ان کے جو جی میں آئے کر سکتے ہیں۔ مذہب نے ان کو اس کی اجازت دے رکھی ہے اس گواہی نے سلاطین اور شاہی حکام ولاۃ کے لیے کھیل کھیلنے کا کتنا وسیع میدان مہیا کر دیا ہوگا۔ خلافت راشدہ کی آزادیوں کی جو سنت تھی، اس کا تو عبدالملک ہی نے اپنے زمانہ میں مشہور تاریخی فقرے سے خاتمہ کر دیا تھا، یعنی خلفاء راشدین کے عہد میں مسلمانوں کو تناجری بنا دیا گیا تھا کہ بڑے بڑے حکام بلکہ خود خلیفہ وقت تک کو اتق الله يا امير المومنين (امیر المومنین خدا سے ڈریئے) کے ساتھ خطاب کرنا ایک معمولی بات تھی، اعلیٰ ہو یا ادنیٰ بغیر کسی جھجک کے ان الفاظ کے استعمال کرنے کا عادی تھا اور ان کو اس کا عادی بنا دیا گیا تھا۔

پہلا منحوس دن اور پہلا مسلمانوں کا بادشاہ:

لکھا ہے کہ جب حکومت کی باگ عبدالملک اموی کے ہاتھ میں آئی تو ایک دن مدینہ منورہ پہنچ کر رسول علیہ السلام کے ممبر سے اس نے اعلان کیا:

والله ما انا بالخليفة المستضعف يعني عثمان ولا بالخليفة المصانع يعني معاوية وانكم تامروننا باشياء تنسونها انفسكم والله لا يامرني احد بعد مقامي هذا تقوى الله الاضربت عنقه (ص ۸۲ تفسیر جصاص ج ۱)	خدا کی قسم میں کمزور خلیفہ نہیں ہوں، اشارہ حضرت عثمان کی طرف کرتا اور نہ مدارات کرنے والا سخن ساز خلیفہ ہوں اشارہ حضرت معاویہ کی طرف کرتا، تم لوگ ہم لوگوں سے (یعنی حکمرانوں سے تو) فرمائش کرتے ہو۔ لیکن اپنے آپ کو بھول جاتے ہو، خدا کی قسم آج کے دن کے بعد کسی نے اگر تقویٰ کی مجھ سے فرمائش کی یعنی اتق اللہ کہا اسی وقت اس کی گردن اڑا دوں گا۔

علامہ ابوبکر الجصاص نے لکھا ہے کہ یہی پہلا منحوس دن اور پہلا مسلمانوں کا بادشاہ تھا کہ

اول من قطع السنة الناس في الامر بالمعروف والنهي عن	جس نے عام مسلمانوں کی زبانیں کاٹ دیں، یعنی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے زبانیں

المنکر. رک گئیں۔

اور حجاج تک پہنچ کر یہ کریلا نیم پر چڑھنے کے بعد تلخی وتندی کے جن حدود تک پہنچ گیا تھا جو کچھ اس وقت تک عرض کیا گیا ہے غالباً اندازہ کرنے کے لیے کافی ہوسکتا ہے۔ اگر چہ حجاج مر چکا تھا، لیکن جس سنت سئیہ کی رسم مسلمانوں میں چھوڑ کر مرا تھا، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کی ڈھائی سال کی حکومت میں اس کا قلع قمع نہ ہوسکا۔ گو وقتی طور پر لوگوں کو رائے اور زبان کی آزادی میسر آ گئی تھی لیکن وہ صرف ایک وقتی اثر تھا۔ جصاصؒ نے خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ حجاج کی موت کے بعد منجملہ دعاؤں کے ایک اہم دعا خواجہ رحمۃ اللہ علیہ یہ بھی فرماتے رہتے تھے کہ:

اللھم انت امتد فاقطع عنا سنتہ. (ص ۴۸۷ ج ۲ احکام) اے پروردگار! تو نے جیسے اس شخص کو ختم کیا اس کے جاری ہوئے طور طریقوں کو بھی ختم فرمادے

انھوں نے لکھا ہے کہ رائے اور زبان کی آزادی کی موت بھی حجاج کی سنت تھی جو اس کے مرنے کے بعد بھی زندہ رہی دعا کرتے تھے کہ یہ بھی مر جائے۔

بنی امیہ کی تباہی کے بعد امید کی جاتی تھی کہ ان کے پیدا کئے ہوئے طریقے بھی تباہ ہو جائیں گے۔ لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا عباسیہ بھی ان سے کچھ زیادہ بہتر ثابت نہیں ہوئے۔ بلکہ بنی امیہ کے طاغیہ حجاجؔ کی جگہ ابو مسلم خراسانی عباسیوں کے طاغیہ نے سر نکالا بات بہت طول ہو جائے گی ورنہ دکھاتا کہ ابو مسلم اپنی طغیانیوں اور سرکشیوں مظالم اور بے رحمیوں میں اگر حجاج سے آگے بڑھا ہوا نہیں تھا، تو کم بھی نہیں تھا۔

بگڑے ہوئے حالات سے امام صاحب کا تاثر:

امام رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے یہی حالات تھے جیسا کہ ان کی زندگی کے دوسرے واقعات جن کا کچھ حصہ گذر چکا اور کچھ آئندہ آئیں گے۔ ان سے اتنا تو قطعاً معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے اس حال سے بے تعلق ہو کر ''گلیم خویش بدرمی برد زموج'' کے خود غرضانہ مسلک سے ان کی فطرت کو جبلۃً لگاؤ نہ تھا۔ وہ کچھ کرنا چاہتے تھے، لیکن کیا

کریں؟ گو اس سوال کے جواب میں جیسا کہ عرض کر چکا ہوں میرے پاس کوئی خاص تاریخی واقعہ نہیں ہے لیکن میں نے پہلے بھی کہا ہے اور اب بھی کہتا ہوں کہ انھوں نے جو کچھ کیا ہے اسی سے میں اس سوال کا جواب پیدا کرنا چاہتا ہوں اور اسی کو میں امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا ''سیاسی مسلک'' سمجھتا ہوں۔

امام کا سیاسی مسلک

پہلا اقدام:

سب سے پہلی بات اس سلسلہ میں ہمیں ان کی زندگی کے اندر جو نظر آتی ہے اس کی تعبیر چاہئے تو ''حکومت ظالمہ سے مقاطعہ'' یا ''ترک موالات'' کے الفاظ سے بھی کر سکتے ہیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ حکومت کے خزانے سے جس کی آس اور امید نہیں ٹوٹی ہے حکومت والوں سے ترک تعلق کی آرزو یقیناً اس شخص کی جھوٹی ہے۔ آدمی فرشتہ زادہ نہیں آدم آزاد ہے طبعی ضرورتوں کا محتاج بنا کر پیدا کیا گیا ہے۔ انسانیت کی اسی طبعی کمزوری سے ہر عہد کے جبابرہ نے فائدہ اٹھایا ہے، امام صاحب کے عہد میں بھی اٹھا رہے تھے۔ شیروں کے گلوں کا طوق اور پاؤں کی زنجیر وہی روبہ مزاجیاں ہیں جنھیں احتیاج پیدا کرتی ہے۔ امام صاحب کے سامنے ایسے کتنے شیر تھے جنھیں بنی امیہ اور بنی عباس کے سلاطین ان ہی بیڑیوں اور زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے اور سچ تو یہ ہے کہ چالیس چوروں کا وہ گروہ جس نے بادشاہ وقت کو ہر قسم کی ذمہ داریوں سے بری قرار دینے کی شہادت پیش کی تھی۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں اسی مار کے وہ ڈسے ہوئے تھے۔ دین بیچ کر وہ دنیا خرید رہے تھے۔

قاضی شریک کی ملازمت:

قاضی شریک جن کا پہلے بھی ذکر آ چکا ہے اور شائد آئندہ بھی آئے عباسیوں کے عہدۂ قضا کو انھوں نے جب قبول کر لیا، کیسے قبول کر لیا، یہ تو خیر الگ قصہ ہے، لیکن جب قبول کر کے تنخواہ کے مستحق ہوئے تو مشہور مورخ المسعودی نے لکھا ہے کہ

ولقد کتب بارزاقه الی الجهبذ[1] فضایقه فی انتقص فقال له الجهبذانک لم تبع بزا.	قاضی شریک کی تنخواہ کے لیے جھبذ کے نام (چک) لکھدیا گیا تو جھبذ ان کو کچھ کم دینے لگا قاضی شریک جھگڑنے لگے تو اس نے کہا (کہ معاوضہ تم کو کس چیز کا دیا جائے) کیا تم نے کپڑا بیچا ہے۔

اس کے جواب میں جھبذ سے جو بات قاضی شریک نے کہی خواہ بطور ظرافت اور مذاق ہی کے کہی ہو لیکن کچھ نہ کچھ حقیقت کی جھلک بھی اس میں نظر آتی ہے یعنی قاضی شریک نے جھبذ سے کہا:

بلی والله لقد بعت اکبر من البز لقد بعث دینی (ص ۹۸ المسعودی بر حاشیه کامل)	خدا کی قسم میں نے تو کپڑے سے بھی زیادہ قیمتی چیز فروخت کی ہے میں نے اپنا دین بیچا ہے (اس کی قیمت لے رہا ہوں)

قاضی صاحب جیسے متدین و متقی و ثقہ بزرگ نے واقعۃً اپنا دین بیچ دیا تھا، اس کی تو خیر ان کی ذات سے کیا توقع ہو سکتی ہے، ان کی جلالت قدر کا اسی سے اندازہ کیجئے کہ بخاری اور مسلم کے راویوں میں ہیں، لیکن حکومت کی منت پذیری کے بعد بہر حال آدمی میں وہ جرأت اور دلیری باقی نہیں رہتی جس کی توقع بے نیازی اور استغناء میں کی جا سکتی

---

[1] مالیات کا نظام اس زمانہ میں جو قائم کیا گیا تھا اس کی صورت یہ تھی کہ شہر کے بڑے بڑے سرمایہ دار جن میں یہودی زیادہ ہوتے تھے، وہ حکومت کے مصارف کی تکمیل کی ذمہ داری لے کر جتنی رقم کی ذمہ داری لیتے تھے اتنی آمدنی کے علاقے ان کے سپرد کر دیئے جاتے تھے یعنی اس علاقہ سے مال گذاری جو وصول ہوتی تھی وہ ان ہی کے یہاں داخل ہوتی تھی، حکومت کی طرف سے چک ان ہی سرمایہ داروں کے نام جاری کئے جاتے تھے، چک لانے والوں کو وہ رقم ادا کر دیتے تھے جو اس میں لکھی ہوتی گویا ان سرمایہ داروں کی کوٹھیاں ٹھیک اسی کام کو انجام دیتی تھیں جو آج کل بنک انجام دیتے ہیں، اس کاروبار میں ان کو کمیشن کی کافی آمدنی تھی جھبذ ان ہی سرمایہ داروں کو کہتے تھے، حساب و کتاب میں چونکہ یہ بڑے ماہر ہو گئے تھے بلکہ یہودی جہابذہ تو بیسوں زبانوں سے بھی واقف ہوتے تھے۔ اس لیے بعد کو جھبذ کا اطلاق ماہرین علماء پر بھی ہونے لگا۔

ہے۔[۱] اور غالباً اسی کمزوری کی تعبیر قاضی صاحب دین فروشی سے فرمارہے تھے کتابوں میں لکھا ہے کہ سفیان ثوری جو حضرت امام کے معاصرین میں ہیں ابتداءً حکومت کے بعض والیوں کی پیش کش کو انھوں نے قبول کرلیا تھا، لیکن لے لینے کے بعد اپنے اندر جس انقلاب کو انھوں نے پایا اس کے بعد طے کرلیا کہ پھر حکومت والوں سے کبھی کچھ نہ لوں گا۔ ابن سعد نے لکھا ہے:

ثم ترک ذلک فلم یقبل من احد شیئا (ص ۲۵۸ ج ۶)	پھر انھوں نے قطعی طور پر اس رویہ کو ترک کردیا اور کسی سے پھر کچھ نہ لیا۔

بقدر ضرورت آپ نے بھی تجارت کا کاروبار اختیار فرمالیا تھا جس کی صورت یہ تھی کہ اپنے چند خاص قابل اعتماد تاجر معتقدوں کو سرمایہ دے دیتے یہی لوگ کاروبار کر کے جو نفع بچتا وہ ان کے حوالہ کردیتے۔ لیکن دستور تھا کہ دوسو دینار ہمیشہ اپنے پاس بھی رکھتے پوچھنے پر لوگوں سے آپ نے مشہور فقرہ فرمایا۔

لولا هذه لتمند لنی هولاء.	اگر میرے پاس یہ نہ ہوں تو یہ لوگ (یعنی ارباب حکومت) مجھے اپنے منہ پوچھنے کا رومال بنالیں۔

دہن دوزی کا نسخہ:

حکومت والے بھی ”زر برسر سنگ نہی نرم شود“ کے راز سے خوب واقف تھے۔ دینی اور اخلاقی ذمہ داریوں کی ساری طاقت اسی زرطلبی کی راہ میں وہ خود کھو چکے تھے دوسروں کو اپنے آپ پر قیاس کرتے تھے، اور عام حالات میں ان کا قیاس زیادہ غلط بھی ثابت نہیں ہوتا تھا۔ اسی سلسلہ میں ”دہن دوزی“ کے گر کو بھی ان کے یہاں خاص اہمیت حاصل تھی۔ لوگوں نے توجہ نہ کی ورنہ تاریخ کی شہادتیں شاید یہ ثابت کرسکتی ہیں کہ بنی امیہ اور بنی عباس دونوں حکومتوں میں ”دہن دوزی“ کے اس اکسیری نسخہ کا استعمال عام

---

[۱] غالب کا مشہور شعر

غالب وظیفہ خوار ہو دو شاہ کو دعا وہ دن گئے کہ کہتے تھے نوکر نہیں ہوں میں

اس میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔۱۲

طور پر مروج تھا۔ میرا مطلب یہ ہے کہ ترلقموں سے لوگوں کی زبانوں کے بند کرنے کا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں کے یہاں خاص نظام مقرر تھا۔ شائد اس میں بھی ذاتی تجربات ہی کو دخل تھا۔ آپ تاریخ کی کتابیں اٹھا کر پڑھئے، نہ صرف سلاطین بلکہ ولاۃ (گورنرس) اور ان کے نواب تک کے دسترخوانوں کی وسعت و درازی کے قصے کثرت سے ملیں گے۔[1] کیا اس سے امراء کا یہ مقصود تھا غربا تک ان چیزوں کو پہنچایا جائے جن

---

[1] جیسا کہ میں نے عرض کیا تاریخ اسلامی کا یہ ایک دلچسپ اور اہم باب ہے، یہ تو مسلم ہے کہ ''دسترخوان'' کی اہمیت کی تاریخ کے آغاز کا تعلق امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عہد سے ہے حضرت ابوہریرہ کا مشہور فقرہ سماط معاوية دسم والصلوة خلف على افضل (الیافعی ص ۱۲۰ ج ۱) میں اسی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ یعنی خانہ جنگی کے زمانہ میں حضرت ابوہریرہؓ نے غیر جانب داری کا مسلک اختیار کر رکھا تھا اور طریقۂ عمل ان کا یہ تھا کہ نماز تو حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے پیچھے پڑھتے اور کھانا امیر معاویہ کے دسترخوان پر کھاتے وجہ پوچھی جاتی تو فقرہ بالا دہراتے یعنی معاویہ کا دسترخوان زیادہ مرغن ہے اور نماز علی کے پیچھے بہتر ہوتی ہے۔ تاریخوں میں امیر معاویہ کے متعلق اس قسم کے لطائف کا ایک ذخیرہ درج ہو گیا ہے۔ شاہی توشک خانوں میں گذشتہ امراء و سلاطین کے لباس کو بھی محفوظ کر دیا جاتا تھا، امیر معاویہ کے لباس کی علامت ہی یہ تھی کہ آستین روغن سے بھری ہوتی امیر معاویہ کے بعد اس سلسلہ میں سلیمان بن عبدالملک نے شہرت حاصل کی جس کھانے کو عام آدمی شاید دس دن میں بھی بہ مشکل کھا سکتے تھے وہ ایک دن میں کھا جاتا تھا، ابن خلکان نے لکھا ہے کہ اس کی روز کی غذا سو رطل شامی تھی، مختلف لطیفے سلیمان کی پرخوری کے مشہور ہیں اموی ولاۃ میں ابن ہبیرہ جس نے حضرت امام کو جیل اور تازیانے کی سزا دی تھی، اس راہ میں اس نے بھی خاصا نام پیدا کیا ہے۔ الیافعی نے لکھا ہے ''دودھ کا ایک بڑا پیالہ جس میں شہد ڈال کر اوپر سے دودھ نچوڑا جاتا تھا، ابن ہبیرہ کے سامنے نماز صبح کے بعد پیش کیا جاتا، اس کو چڑھا جانے کے بعد ناشتہ آتا جس میں دو بھنی ہوئی مرغیاں، دو بھنے ہوئے کبوتر کے پٹھے۔ نصف حلوان کے سوا اور بھی مختلف قسم کے گوشت ہوتے ناشتہ سے فارغ ہو کر ابن ہبیرہ کام میں نصف النہار تک مشغول رہتا۔ اس کے بعد دوپہر کا کھانا آتا۔ بڑے بڑے لقمے اٹھاتا، اور پے در پے منہ میں ڈالتا جاتا تھا ظہر کی نماز پڑھ کر جب کام میں مشغول ہوتا، عصر کی نماز کے بعد تخت بچھایا جاتا جس پر خود بیٹھتا اور دوسروں کے لیے کرسیاں اسی کے اردگرد بچھادی جاتیں پھر گلاسوں میں بھر بھر کر دودھ اور شہد اور مختلف قسم کے شربت کا دور چلتا، اتنے میں پھر لقلہ

تک اپنی محدود آمدنی کی وجہ سے ان کی رسائی نہیں ہو سکتی تھی؟

للہ دستر خوان بچھ جاتا عام لوگ تو دستر خوان پر کھاتے اور خود ابن ہبیرہ اور ان کے خاص اصحاب کے لیے چھوٹے چھوٹے پانوں کے ٹیبل بچھائے جاتے تھے جن پر کھانے چنے جاتے تھے مغرب تک کھانے کا یہ قصہ جاری رہتا۔ بنی امیہ کے عہد کے ان قصوں کو اگر جمع کیا جائے تو ایک مختصر سا رسالہ ہی مرتب ہو سکتا ہے۔ عباسی جب آئے تو اس خاندان کے پہلے حکمران سفاح کی نشاط و انبساط کا بہترین وقت دستر خوان ہی کا وقت تھا، لوگوں کا قاعدہ تھا کہ جب کوئی کام اس سے نکالنا چاہتے تو دستر خوان کے وقت کا انتظار کرتے کھانا جب شروع ہوتا تب اپنی ضرورت پیش کرتے ابراہیم بن مخرمہ ایک صاحب تھے جو تاک کر ٹھیک اسی وقت اس کے سامنے اپنی ضرورتوں کو پیش کرتے۔ جس نے ایک دن کہا بھی کہ خاص کر اسی وقت تم ایسا کیوں کرتے ہو انھوں نے کہا آپ کے انبساط و انشراح کا یہی وقت ہوتا ہے۔ ہنس کر بولا کہ تم نے خوب تاڑا۔ (ص ۴۴ مسعودی ج ۳) اور منصور جو سفاح کے بعد گدی پر آیا، اس کے متعلق تو پہلے ہی سے لوگ پیشین گوئی کرتے تھے۔ **لا یموت واللہ ابو جعفر ابدا لا بالبطن** (یعنی ابو جعفر نہیں مرے گا مگر پیٹ کے عارضہ میں) (طبری ص ۳۱۳ ج ۹) ایک ہندوستانی طبیب نے پھکی بنا کر اس کو دی تھی، اس کے بل بوتے پر بہت زیادہ کھانا کھا جاتا تھا دلچسپ لطیفہ المسعودی نے منصور ہی کے متعلق یہ نقل کیا ہے کہ محمد نفس ذکیہ کے بھائی ابراہیم سے جب اس کا مقابلہ ہو رہا تھا تو ہڈیوں کے مغز کا حلوا اسی زمانہ میں باورچی نے تیار کر کے پیش کیا منصور کو یہ حلوا بہت پسند آیا اور کہنے لگا اراد ابراهیم یحرمنی هذا واشباهه (ابراہیم چاہتا ہے کہ اس حلوے سے اور اسی قسم کی چیزوں سے مجھے محروم کر دے (ص ۸۳ ج ۸) ان ہی باتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان حکمرانوں کا بڑا مقصد حصول سلطنت سے کیا تھا۔ چونکہ خود اسی قسم کی آلائشوں کے دباؤ کے نیچے یہ خود دبے ہوئے تھے سمجھتے تھے کہ دوسروں کو بھی اسی سے دبایا جا سکتا ہے۔ گو واضح الفاظ میں مجھے اس کی تصریح تو نہیں ملی ہے۔ لیکن واقعات کے ذیل میں مورخین جن چیزوں کو نقل کرتے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ کھانے کھلانے کی راہ سے ''دہن دوزی'' کا ایک مستقل نظام ہی بنی امیہ اور بنی عباس دونوں کے زمانہ میں قائم تھا اور شاید بعد میں بھی جاری رہا، ابن القریہ جو بداوت سے امارت تک پہنچا تھا اس کے حالات میں لکھا ہے کہ حجاج کے عامل کے پاس آیا اور دروازے پر کھڑا تھا۔ الیافعی نے لکھا ہے کہ **کان عامل الحجاج یغدی کل یوم و یعشی** (لوگوں کو دن اور شام کا کھانا اپنے ساتھ کھلاتا تھا ابن قریہ نے پوچھا کہ **اکل یوم یصنع الامیر ما اری** (کیا امیر روزانہ یہی کرتا ہے) لوگوں نے للہ

اور قصوں کو تو تاریخوں میں پڑھئے، بعض چیزوں کا ذکر میں نے بھی حاشیہ میں کر دیا ہے۔ اس وقت آپ کے سامنے قاضی شریک ہی کے واقعہ کو پیش کر دیتا ہوں جس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ مطلب ان لوگوں کا کیا ہوتا تھا، یہ تو عرض کر چکا ہوں کہ قاضی شریک نے بالآخر حکومت سے ''موالات'' کا تعلق قائم کر لیا۔ گو اپنے نزدیک اس کو وہ ''دین فروشی'' بھی سمجھتے رہے لیکن یہ بات کہ انھوں نے قضاء یا شاہزادوں کی تعلیم کی خدمت کیوں قبول کر لی؟ المسعودی نے اسی سلسلہ میں لکھا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ عباسیوں کا تیسرا حکمراں مہدی جو ابو جعفر منصور کا بیٹا تھا اور ہادی و ہارون کا باپ، اسی نے ایک دن قاضی شریک کو بلوایا اور اصرار کے ساتھ اس نے ان کے سامنے تین باتیں پیش کیں۔ اسی کے ساتھ اس سے بھی اس نے مطلع کر دیا کہ ان تین میں سے کسی ایک کو بہر حال قبول کرنا ہی پڑے گا۔ تین باتیں یہ تھیں، قضاء کی خدمت میری حکومت میں قبول کر و یا میرے بچوں کو حدیث پڑھانے اور تعلیم دینے کی ذمہ داری لو، اور یہ دونوں باتیں تمھیں منظور نہ ہوں تو صرف ایک دفعہ ہمارے یاں کا پکا ہوا کھانا کھا لو۔ نوکری سے تو قاضی

لہ کہاں! آگے دوسرا قصہ ہے (دیکھو الیافعی ص ۱۷۱ ج ۱) الیافعی ہی نے مشہور جرنیل قتیبہ کے حال میں لکھا ہے طلب سماطين طول اربعين فراسخ في نظام واحد (اس نے دو دسترخوان بنانے کا حکم دیا تھا جن کی لمبائی چالیس فرسخ یعنی ایک سو بیس میل کی ہو، آگے خود الیافعی نے اس کی شرح کرتے ہوئے لکھا ہے یعنی طلب **تحصيل نسيجن مما يمد عليه السماط لاكل العساكر الممدود عليه** یعنی قتیبہ نے حکم دیا تھا کہ ایسے دو کپڑے بنے جائیں جن پر فوجیوں کے لیے کھانا چنا جا سکے (ص ۱۸۰) واللہ اعلم اس کا کیا مطلب ہے بظاہر تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ ساری چھاؤنی یا فوج کو ایک ہی دسترخوان پر کھانا کھلانے کے لیے ایک سو بیس میل لمبے اس نے دو دسترخوان تیار کرانے کا حکم دیا تھا۔ بہر حال میں نے چند متفرق اشارات جمع کر دیئے ہیں کوئی صاحب چاہیں تو اس موضوع پر کام کر سکتے ہیں۔ گویا اسلامی سلاطین کے منجملہ دوسری تدبیروں کے عام پبلک کو اپنے قابو میں رکھنے کے لیے لقمہ سے دہن دوزی کی ٹک ٹک بھی تھی۔ تاریخوں میں مسلمان بادشاہوں کے باورچی خانوں کی تفصیل کرتے ہوئے عموماً جو یہ لکھا جاتا ہے کہ اتنے ہزار بکرے اتنے مینڈھے، بیل گائے، مرغ وغیرہ ذبح ہوتے تھے تو غرض اس سے یہی تھی ورنہ بے چارے بادشاہ اور اس کے گنے چنے گھر کے لوگوں کے لیے بھلا اتنی تیاریوں کی کیا ضرورت تھی۔ ۱۲

صاحب بے زار ہی تھے، آخری بات ان کو سب سے زیادہ آسان نظر آئی۔ خیال کیا کہ وقتی کام ہے، دوامی تعلق تو اس سے پیدا نہیں ہوتا۔ اس لیے کھانا کھانے پر راضی ہو گئے۔ مہدی نے اپنے باورچی خانہ میں کہلا بھیجا خاص طور پر فرمائش کی کہ مختلف کھانوں کے ساتھ انڈے کی زردی کا حلوا طبرزد کی شکر اور شہد میں تیار کر کے قاضی شریک کے لیے حاضر کیا جائے۔ کھانا اور حلوا تیار ہو کر آ گیا، قاضی صاحب کے سامنے پیش کر دیا گیا، المسعودی نے لکھا ہے کہ کھانے سے جب قاضی صاحب فارغ ہوئے اور غالباً مہدی سے رخصت ہو کر روانہ ہوئے تو مہدی کے باورچی خانہ کا قیم (داروغہ) حاضر ہوا، سنا گیا کہ مہدی سے کہہ رہا تھا۔

یا امیر المومنین لیس یفلح الشیخ بعد ھذہ الاکلہ. (ص ۹۸ ج۸ المسعودی بر کامل ابن امیر)	امیر المومنین اس لقمہ کے بعد شیخ (یعنی قاضی شریک) اپنے مقصد میں یعنی حکومت سے ترک موالات کے نباہنے میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔

فضل بن ربیع جو اس قصہ کا راوی ہے اس کا بیان ہے کہ واقعہ آخر میں یہی پیش بھی آیا یعنی

فحدثھم واللہ شریک بعد ذلک وعلم اولادھم دولی القضاء لھم (ج۸ ص ۹۷)	قاضی شریک نے خدا کی قسم ان لوگوں کے بچوں کو حدیث بھی پڑھائی تعلیم بھی دی اور قضاء کی خدمت بھی قبول کی۔

واللہ اعلم بالصواب فضل کا یہ خیال کہاں تک صحیح ہے یعنی اس میں تو کوئی شبہ نہیں کہ قاضی صاحب نے آخر عمر میں اپنی سپر ڈال دی تھی۔ اور یہ سارے خدمات حکومت کے انھوں نے انجام دیئے۔ لیکن یہ بات کہ یہ نتیجہ اسی ''الاکلہ'' (لقمہ) کا تھا جس کے متعلق مہدی کے داروغہ مطبخ نے پیشین گوئی کی تھی۔ یا دوسرے اسباب پیش آئے بہ ظاہر قاضی شریک جیسی بلند ہستی کا صرف ''الاکلہ'' سے متاثر ہو کر اپنی عمر بھر کی آن کے توڑ دینے پر آمادہ ہو جانا بعید از قیاس ہے بلکہ زیادہ تر یہی خیال گذرتا ہے کہ آخر میں اس قسم کے کلی

ترک موالات کے متعلق ان کا خیال بدل گیا۔ یا ہوسکتا ہے کہ اس شیر بیشۂ آزادی و حریت کو رو بہ مزاجی پر اسی نے مجبور کیا ہو، جس نے خدا جانے انسانی تاریخ کے کتنے شیروں کو لومڑی بنا کر چھوڑ دیا۔ بہر حال اصل واقعہ کچھ ہی ہو، لیکن ان حکمرانوں کے خیال کا تو اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے کھلانے پلانے داد و دہش کے پیچھے درحقیقت کون سی چیزیں کارفرما تھیں۔ میرا مطلب یہ ہے کہ مہدی نے تعلیم حدیث یا عہدۂ قضا جیسی ان میل بے جوڑ بات جو پیش کی تھی اسی سے اندازہ ہوتا ہے کہ ''دہن دوزی'' کے اس نسخہ پر ان کو کتنا اعتماد تھا۔ اور یہی میں کہنا چاہتا تھا کہ حضرت امام رحمۃ اللہ علیہ دیکھ رہے تھے کہ حکومت لوگوں کو اپنے جال میں پھنسانے کے لیے کن کن ترکیبوں سے کام لے رہی ہے جب تک پوری بے نیازی اور استغنا کا انتظام نہ کرلیا جائے، ان کو نظر آ رہا تھا کہ بڑے بڑوں کے پاؤں پھسل رہے ہیں۔ قاضی شریک جیسے بزرگوں کی ضد ختم ہو جاتی ہے، عزم ٹوٹ جاتا ہے، ایسی صورت میں صرف حکومت سے ترک موالات کا ارادہ کر لینا قطعاً ناکافی تھا، اور حکومت سے اپنے آپ کو الگ تھلگ رکھنے میں قناعت یا جفاکشی وغیرہ کے مشقوں سے آدمی اگر کامیاب بھی ہو جائے۔ لیکن صرف اتنی بات حکومت سے مقابلہ کرنے کے لیے یقیناً کافی نہیں ہوسکتی۔

میں نے جیسا کہ عرض کیا خود امام صاحب کا کوئی واضح بیان، ان کے لائحہ عمل کے متعلق نہیں ملا ہے نہ ان ہی کا ملا ہے اور نہ کسی اور کا اور جو کچھ ملا ہے، اس کا ذکر کر دیا جائے گا۔ لیکن جو کام انھوں نے کیا میں اس وقت اسی کو دکھانا چاہتا ہوں۔

حضرت امام کا وسیع پیمانے پر تجارت کا کاروبار:

لکھنے کی حد تک یوں تو عام مورخین صرف اس قدر لکھ کر گذر جاتے ہیں کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ تجارت کرتے تھے بعضوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ خز کی[1] تجارت کرتے

---

[1] جہاں تک کتابوں سے معلوم ہوتا ہے یہ ایک قسم کا خاص کپڑا تھا جس کے بانے میں مختلف چیزیں مثلاً اون یا کتان روئی وغیرہ کے دھاگے استعمال کئے جاتے تھے اور تانے میں ریشم کا سوت لگایا جاتا تھا۔ دیکھو طبقات ابن سعد ترجمہ عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ۔ ہمارے یہاں کی بعض فقہ کی کتابوں میں ☜

تھے۔ یہ ایک قسم کا کپڑا تھا، جس کا رواج اسلام کے ابتدائی صدیوں میں بکثرت نظر آتا ہے۔ لیکن امام کی تجارت کس پیمانے پر تھی، لوگوں نے اس کی طرف کم توجہ کی، واقعہ یہ ہے کہ اولاً خز کی تجارت ہی کوئی معمولی تجارت نہ تھی۔ اس زمانہ یں جب عام سوتی کپڑوں کی ارزانی کا یہ حال تھا جس کا اندازہ طبقات ابن سعد کی اس روایت سے ہوسکتا ہے، ابوالعالیہ الریاحی جن کا زمانہ امام صاحب نے بھی پایا تھا یعنی جس وقت ابوالعالیہ کی وفات بصرہ میں ہوئی ہے حضرت امام کی عمر دس سال کی تھی بہرحال ان ہی ابوالعالیہ کے ترجمہ میں ابن سعد نے لکھا ہے کہ ایک واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے ابوالعالیہ نے اپنے شاگردوں سے بیان کیا کہ اس وقت میرے جسم پر کل پندرہ درم کا لباس تھا جس میں قمیص عمامہ چادر سب ہی چیزیں شریک تھیں۔ پندرہ درم کا مطلب آپ نے سمجھا؟ یہ مشکل چار سوا چار روپیہ ہوتے ہیں مشین کے زمانہ میں بھی جب یہ قیمت قابل تعجب ہے تو لوگوں کو اس زمانہ میں اگر تعجب ہو، اس پر حیرت کرنی چاہئے، یعنی ان کے شاگردوں نے پوچھا کہ آخر آپ کرتے کیا تھے؟ جواب میں انھوں نے جو بات کہی تھی۔ اسی کا پیش کرنا مقصود ہے۔ ابوالعالیہ نے بیان کیا۔

کنت اشتری کو باسة رازیة میں بارہ درم میں ایک تھان رازی[1] کر باس کا

بقیہ لکھا ہے کہ خز کسی سمندری جانور کے بال سے تیار ہوتا تھا۔ یا بعضوں نے لکھا ہے کہ سڑے ہوئے ریشم سے خز بنتا تھا۔ ان بیانات میں بھی وہی بات ہے، یعنی بانا (لحمہ) مختلف چیزوں کا استعمال ہوتا تھا لیکن سدی (تانا) ریشم کا ہوتا تھا۔ بعض زیادہ متقی حضرات خصوصیت کے ساتھ بانے میں بھی ریشم کے استعمال کو پسند نہیں کرتے تھے۔ لیکن صحابہ اور تابعین میں جیسا کہ میں نے عرض کیا مشکل ہی سے بجز چند بزرگوں کے کوئی ایسی ہستی تھی جو خز نہ استعمال کرتی ہو بہ ظاہر معلوم ہوتا ہے کہ گرمیوں میں غیر ادنیٰ اور جاڑوں میں ادنیٰ خز لوگ استعمال کرتے تھے۔ رنگ بھی اس کپڑے کے مختلف ہوتے تھے۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ ریشم کی شرکت کی وجہ سے کپڑے میں مضبوطی پیدا ہو جاتی تھی شریعت میں ریشم کا استعمال مردوں پر حرام کر دیا گیا تھا۔ لیکن اس کے جائز استعمال کی یہ مخلوط صورت نکال لی گئی تھی۔ شاید ہندوستان میں اسی کو "بافتہ" کہتے تھے۔۱۲

[1] رازی سے مراد وہ کپڑا ہوتا تھا جو شہر رے میں بنتا تھا طہران کے پاس آج کل جس کے کھنڈر بقیہ

باثني عشر درهما فاجعل منها قميصا وعمامة وكان يجزيني ازار ثلثة دراهم البسه تحت القميص (ص ۸۲ ج۷ طبقات)

خرید لیا کرتا تھا۔ اسی سے ایک قمیص اور عمامہ بنالیتا اور تین درم کی لنگی مجھے کافی ہو جاتی تھی، قمیص کے نیچے اس لنگی کو پہنتا تھا۔

اس سے اس کا بھی پتہ چلتا ہے کہ اس زمانہ کی قمیص موجودہ زمانہ کی چھوٹی قمیصوں جیسی نہیں ہوتی تھی، بلکہ اتنی لمبی ہوتی تھی کہ لنگی اس کے نیچے آجاتی تھی۔ بہرحال کپڑے کی ارزانی کے ان ہی دنوں میں امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ کا بیان کتابوں میں یہ نقل کیا جاتا ہے کہ خز کے دو تھانوں کا ذکر کرتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ:

بعت احدهما بعشرين دينارا. (مناقب موفق ص ۲۱۹ ج)

جن میں سے ایک تھان کو میں نے بیس اشرفیوں میں فروخت کیا۔

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ بیس بیس اشرفی تک عام طور پہ خز کا ایک ایک تھان بکتا تھا بلکہ متصل سند کے ساتھ ابوالفضل بن خشنام کی جس روایت کو ارباب مناقب نے نقل کیا ہے یعنی مدینہ کے ایک آدمی کے ہاتھ امام صاحب کی غیر موجودگی میں ایک شخص نے خز ہی کا ایک تھان ایک ہزار درم میں بیچ دیا تھا۔ معلوم ہونے پر شاگرد بے چارا عتاب میں ان کے اس لیے مبتلا ہو گیا تھا کہ تھان کی اصلی قیمت چار سو درم تھی۔ (دیکھو مناقب موفق ص ۱۹۹ ج ۱) اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک ایک تھان خز کا لوگ ایک ایک ہزار درم تک میں خرید لیتے تھے گویا یہ کوئی ایسی بات نہیں سمجھی جاتی تھی جس کا رواج نہ ہو۔

تجارت کی تفصیلات:

خیر یہ تو خز کی اہمیت کا حال تھا لیکن امام اس قیمتی کپڑے کی تجارت کس پیمانے پر

ﷺ میں سب سے سستا ہراۃ کا کپڑا تھا جسے کرباس ہردی کہتے تھے ابوجعفر منصور عباسی خلیفہ دوم بخالت کی وجہ سے ہردی کرباس کے کرتے پہنتا تھا اور اس میں پیوند بھی بخالت کی وجہ سے لگاتا تھا امام جعفر صادق سے کسی نے اس قصہ کو بیان کیا تو فرمایا یہ خدا کی مہربانی ہے کہ اپنی بادشاہت میں اپنی فقیری کا اس میں احساس ہے۔ (کامل ص ۸ جلد ۲)

کر رہے تھے جہاں تک کتابوں سے معلوم ہوتا ہے۔ چار چیزیں اس باب میں معلوم ہوتی ہیں (۱) پہلی بات تو یہی ہے کہ امام صرف خز کے تاجر ہی نہیں تھے بلکہ خز بافی کا کوئی بڑا کارخانہ کوفہ میں ان کا جاری تھا (۲) کوئی حانوت خاص (شاپ) بھی کوفہ میں خز کی تھی جس سے مال کی فروخت کا سلسلہ جاری تھا (۳) غلاموں سے بھی مال کی پھیری کراتے تھے۔ (۴) کوفہ سے دساور دور دراز علاقوں مثلاً بغداد، نیشاپور، مرو وغیرہ مال بھیجتے تھے اور وہاں سے منگواتے تھے۔

خز کی دکان: -خطیب بغدادی نے اپنی تاریخ میں لکھا کہ:

کان ابو حنیفه خز اذا و دکانه معروف في دار عمرو بن حريث (ص ۳۲۵ ج ۱۳)

امام ابوحنیفہ خز کپڑے کے تاجر تھے۔ ان کی دکان عمرو بن حریث کی کوٹھی میں عام طور پر مشہور معروف تھی۔

اولاً لفظ ''معروف'' ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مشہور دکان تھی، لیکن آگے عمرو بن حریث کے دار کا جو پتہ دیا گیا ہے پہلے تو خود دار کے لفظ سے اگر وہی مفہوم سمجھا جائے جو اردو میں گھر سے سمجھا جاتا ہے تو عربی کی اصطلاح سے یہ ناواقفیت کا نتیجہ ہوگا۔ ابن ہمام نے فتح القدیر میں لکھا ہے:

الدار اسم للساحة ادير عليها الحدود تشتمل على بيوت واصطبل وصحن غير مسقف وعلو (ص ۳۰۲ ج ۵)

دار اس میدان کو کہتے ہیں جس کے چاروں طرف احاطہ ہوتا ہے اسی احاطہ میں مکانات اصطبل صحن جس پر چھت نہ ہو اور دوسری منزل وغیرہ والی عمارت ہوتی ہے۔

یعنی دراصل الدار اس پورے احاطہ کی تعبیر ہوتی ہے جسے اس زمانہ میں لوگ کمپونڈ وال کہتے ہیں بعض ریاستوں مثلاً ٹونک اور رام پور وغیرہ ہی ''گھیر'' کا لفظ الدار کا مرادف ہے بیسیوں ایکڑ کی زمین کو یہ ''گھیر'' حاوی ہوتا ہے، فلاں امیر کا گھیران ریاستوں میں اسی دار کے مفہوم کو ادا کرتا ہے ماسوا اس اصطلاحی مسئلہ کے عمرو بن حریث کے اس ''دار'' کا اس کے طول وعرض اور غیر معمولی وسعت کی وجہ سے مورخین نے

خصوصیت کے ساتھ تذکرہ بھی کیا ہے، ابن سعد میں ہے کہ:

نزل عمرو بن حریث الکوفه وابتنی بها دارا الی جانب المسجد وهی کبیرة مشهورة	عمرو بن حریث صحابی کوفہ پہنچے اور مسجد کے پہلو میں میں ایک حویلی تیار کی جو بہت بڑی تھی اور مشہور ہے۔

(ص ۱۴ ج۶ طبقات)

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کوفہ کا یہ معمولی دار نہ تھا ورنہ دار کے بعد ''کبیرہ'' اور ''مشہورہ'' کے الفاظ کے بڑھانے کی ضرورت نہ ہوتی اور اس عبارت سے حضرت امام کی اس دکان کے محل وقوع کا بھی تعین ہو جاتا ہے یعنی کوفہ کی ''المسجد'' کے متصل یہ دکان تھی میرا خیال ہے کہ عمرو بن حریث کے اس کبیرہ مشہورہ دار میں امام صاحب کی ''دکان'' کی حیثیت ان دکانوں جیسی نہ تھی۔ جیسا کہ اس زمانہ میں ''دکان'' کے لفظ سے سمجھا جاتا ہے، یعنی کسی کمرے میں جس کے سامنے برآمد ہو اس میں تاجر کپڑے رکھ کر بیچتے ہیں بلکہ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عمرو بن حریث کے اس پورے ''گھیر'' میں خزبافی کا بھی کاروبار ہوتا تھا۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ ابن سعد نے مذکورہ بالا الفاظ کے بعد لکھا ہے کہ:

فیها اصحاب الخز الیوم	اس دار میں خزباف اس وقت تک رہتے ہیں۔

جس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ ''خز'' والوں کی ایک آبادی اس گھیر میں رہتی تھی ممکن ہے کہ امام صاحب کی طرف سے بطور مزدوروں کے یہ لوگ اس ''گھیر'' میں ''خزبافی'' کا کام کرتے ہوں ایسی صورت میں گویا سمجھنا چاہیے کہ حضرت امام نے یہاں خزبافی کا کوئی کارخانہ ہی کھول رکھا تھا۔ یا ہو سکتا ہے کہ انفرادی طور پر خز بنانے والے اس گھیر میں آباد ہوں اور ان ہی سے خرید خرید کر امام صاحب ان کے مصنوعات کو فروخت کرتے ہوں، احتمال دونوں کا ہے۔ بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ امام کی دوکان پر باہر سے بھی خزباف اپنا مال فروخت کے لیے ''لایا کرتے تھے، اور ایک ایک دفعہ میں کبھی کبھی آٹھ آٹھ ہزار درم کے کپڑے صرف ایک آدمی سے خریدے جاتے تھے (دیکھو مناقب موفق ص ۲۲۰ ج ۱) بلکہ میں تو خیال کرتا ہوں کہ جامع المسانید

میں ابوبکر بن عیاش کے حوالہ سے یہ قصہ جو نقل کیا گیا ہے کہ امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو حکومت کی طرف سے سزا اس لیے دی گئی کہ:

ان یکون عریفا علی الخزازین. (ص ۵۵ ج ۱) — ان سے خواہش کی گئی تھی کہ خزبافوں کے عریف (نمبرداری) کا عہدہ قبول کریں اور انھوں نے اس عہدے کو قبول کرنے سے انکار کیا تھا۔

اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ خزازوں کا ایک بڑا گروہ حضرت امام سے تعلق رکھتا تھا خواہ یہ تعلق رکھتا ہو کہ آپ کے کارخانہ میں کام کرتا ہو یا کپڑے تیار کر کر کے آپ کی دکان میں فروخت کے لیے لاتا ہو۔ کیونکہ کسی جماعت کی عرافت (نمائندگی) اسی شخص کو عموماً ملتی ہے جو اس کی تابع ہو ان معلومات کے بعد الیافعی کی تاریخ میں تو ایسے واضح الفاظ ہی مل گئے جن میں صراحتاً وہی بیان کیا گیا ہے جس نتیجہ تک ہم مختلف قرائن کی روشنی میں پہنچے تھے یعنی الیافعی نے لکھا ہے:

له دار کبیرة لعل الخز وعنده صناع الخز (ص ۳۱۰ ج ۱) — امام کی ایک بڑی کوٹھی تھی جس میں خز بنایا جاتا تھا اور امام کے پاس خزباف تھے۔

جس سے ثابت ہوا کہ امام کے پاس خزبافی کا بہت بڑا کارخانہ بھی تھا اور اس کارخانے میں خزباف مزدور کام کرتے تھے۔

خز کی کوفہ کی سب سے بڑی دکان:

بہر حال اس میں کوئی شبہ نہیں کہ امام کا یہ کاروبار قطعاً وسیع اور عظیم کاروبار تھا عام طور پر یہ بات اس زمانہ میں تسلیم کی جاتی کہ کوفہ جیسے غدار شہر میں جس کی آبادی امام رحمۃ اللہ علیہ کے زمانہ میں لاکھوں سے کم نہ ہوگی۔ سب سے بڑی دکان خز کی امام ہی کی دکان تھی خز کی بڑھیا سے بڑھیا قسم جو سارے شہر میں میسر نہیں آسکتی تھی۔ وہ حضرت امام کی دکان پر مل جاتی تھی ابن خشنام کی جس روایت کا پہلے بھی ذکر آیا ہے۔ اس کے ان الفاظ کا یعنی امام کا حال بیان کرتے ہوئے کہا گیا کہ:

کان خزازا و کان فی بیعه و — امام خز کے تاجر تھے اور خز کے خرید و فروخت میں

شرائه يستقضي ويدق النظر فيه. انتہائی تلاش و جستجو و دقت شناسی سے کام لیتے تھے۔

میرے نزدیک تو اس کا یہی مطلب ہے کہ خز کی بہترین قسموں کے مہیا کرنے میں پوری دقت نظری اور انتہائی تلاش و جستجو سے کام لیتے تھے کیونکہ اسی کے بعد قصہ یہ بیان کیا گیا ہے کہ ایک آدمی مدینہ منورہ سے مختلف قسم کی چیزوں کے خریدنے کے لیے آیا تھا۔ اسی سلسلہ میں خاص قسم کے خز کی بھی اسے تلاش تھی۔ لوگوں سے اپنی ضرورت کا جب اس نے اظہار کیا تو اسے اطلاع دی گئی۔

لا تجد مثل هذالثوب الاعند فقيه هاهنا خزاز يقال له ابو حنيه (ص ۱۹۸) تم اس قسم کا خز کہیں نہیں پا سکتے ہو مگر ایک فقیہ کے پاس جو یہاں خز کی تجارت کرتا ہے جسے لوگ ابوحنیفہ کہتے ہیں۔

بلکہ اسی کے بعد امام رحمۃ اللہ علیہ کی دکان میں بکری کا جو خاص طریقہ تھا اس کا اظہار بھی اسی مدنی مسافر سے کوفہ والوں نے ان الفاظ میں کیا۔

اذا اتيت حانونه واخرج اليک ماطلبت فخذمنه مايساومک وزن له المقدار الذي يساومک به. جب اس کے حانوت (شاپ) میں تم جاؤ اور مطلوبہ شے کو نکلواؤ تو جو بھاؤ اس کا بتایا جائے اسی قیمت پر اس کو خرید لینا اور جو قیمت تمھیں بتائی جائے اسے ادا کر دینا۔

جس سے معلوم ہوتا ہے۔ آج کل بڑی بڑی کمپنیوں اور شاپوں کا جو دستور ہے کہ بھاؤ چکانے میں وقت ضائع نہیں کیا جاتا بلکہ ہر چیز کا دام مقرر کر دیا جاتا ہے خریدار بغیر کسی لیت ولعل رگڑے جھگڑے کے چیز لے لیتا ہے، ظاہر ہے کہ اس میں گاہک اور سوداگر دونوں کا وقت بچتا ہے۔ عموماً یہ وہیں کیا جاتا ہے جہاں کام زیادہ ہو۔ ورنہ ٹٹ پونجئے تاجر جن کی دکان کم چلتی ہے۔ چند ہی چیزوں پر لڑ جھگڑ کر چاہتے ہیں کہ نفع کما لیں حالانکہ روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ امام صاحب کی دکان پر علاوہ امام کے خود ان کے صاحبزادے حماد اور تلامذہ بھی فروخت کا کام انجام دیتے تھے (دیکھو مناقب موفق

ص ۱۹۴۔۱۹۹۔ج۱) لیکن کام کی کثرت کی وجہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے دوکان کی ہر چیز کی قیمت متعین کردی تھی تا کہ لین دین میں خواہ مخواہ وقت ضائع نہ ہو ان ہی روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ علاوہ اس مال کے جو امام صاحب حانوت (شاپ) میں رہتا تھا۔ آپ لوگوں سے آرڈر بھی لیا کرتے تھے اور حسب وعدہ چاہنے والے کی خواہش کے مطابق خز مہیا کردیتے تھے۔ مال کی دوکان پر معلوم ہوتا ہے کہ اتنی آمد تھی کہ فرمائش کی تعمیل میں زیادہ دیر نہ لگتی تھی (دیکھو مناقب موفق ص ۲۱۸ ج۱)

کچھ بھی ہو محمد بن سعد کاتب الواقدی جن کی وفات ۲۳۰ھ میں ہوئی ہے، ان کا اسی عمرو بن حریث صحابی کے دار کے ذکر میں یہ بیان کہ:

فیها اصحاب الخز الیوم. اس میں خز والے لوگ اس وقت تک رہتے ہیں۔

اس بات کی دلیل ہے کہ حضرت امام رحمۃ اللہ علیہ کی وفات سے نصف صدی بعد تک عمرو بن حریث کا یہ دار خز بافوں اور خز فروشوں کا ملجا و ماویٰ بنا ہوا تھا اور اس سے بھی حضرت امام کے کاروبار کی وسعت کا اندازہ ہوتا ہے کہ جس کام کو انھوں نے اسی مکان میں شروع کیا تھا، اس کو اس مقام سے اتنی مناسبت ہوگئی تھی کہ برسوں بعد تک اس کام کی کرنے والی جماعت اس مکان میں موجود تھی۔ واللہ اعلم بالصواب

غلاموں کے ذریعہ مال کی پھیری:

جیسا کہ اس زمانہ کا دستور تھا غلاموں کو لوگ ماذون التجارۃ کر کے کاروبار کے لیے اطراف ملک میں بھیج دیا کرتے تھے۔ غلاموں کے ذریعہ سے کاروبار کرنے کا یہ عام طریقہ مروج تھا فقہاء کو اسی لیے "ماذون التجارۃ" غلاموں کے متعلق قانونی دفعات بنانے پڑے، جن سے اہل علم واقف ہیں۔ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت امام نے اپنی تجارتی کاروبار میں اس طریقہ کو بھی اختیار فرمایا تھا۔ امام الائمہ ابوبکر زنجری کے حوالہ سے ایک قصہ کو نقل کرتے ہوئے موفق نے لکھا ہے کہ

فجاء غلمانه بسبعين الف درهم. (ص ۲۰۳ ج ۱) امام کے غلام ستر ہزار درم لے کر واپس ہوئے۔

غلاموں کے ذریعہ سے امام کے تجارتی منافع کی نوعیت کیا تھی اس کا اندازہ اس سے بھی ہوسکتا ہے کہ ابوسعید سمعانی نے حافظ بن عبدہ کی سند سے یہ روایت بیان کی ہے کہ

کان لابی حنیفة عبد یتجر	امام ابوحنیفہ کا ایک غلام تھا، جو تجارت کرتا تھا،
وکان دفع الیه مالا کثیراً	امام نے مال کی کثیر مقدار اس کے سپرد کردی تھی
یتجر فربح ثلاثین الف درھم	جس کی وہ تجارت کرتا تھا تمیں ہزار درم اس میں
(ص ۲۰۳ مناقب موفق ج ۱)	اس نے نفع حاصل کیا۔

جب ایک ایک غلام تیس تیس ہزار نفع کما کر امام کی خدمت میں پیش کرتا تھا تو اسی سے سمجھنا چاہئے کہ مجموعی طور پر امام کے ماذون التجارہ ''غلمان'' کتنا کماتے ہوں گے۔ میرے خیال میں اس ذریعہ سے امام کو کافی آمدنی حاصل ہوتی تھی، گویا آمدنی کا یہ ایک مستقل ذریعہ تھا۔ اور علاوہ دوسرے ذرائع کے صرف اسی ذریعہ سے تعجب نہیں کہ سالانہ لاکھوں لاکھ روپیہ کی آمدنی ہوتی ہو۔

درآمد و برآمد کا کاروبار:

جیسا کہ میں نے پہلے بھی عرض کیا لوگوں نے امام کی زندگی کے اس پہلو کے متعلق خصوصی معلومات کے جمع کرنے کا اہتمام نہیں کیا ہے لیکن دوسرے واقعات کے تذکروں میں ضمناً اس قسم کی چیزیں مل جاتی ہیں۔ جہاں تک اس نقطۂ نظر سے میں نے امام کے متعلقہ روایات کا مطالعہ کیا ہے۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ امام رحمۃ اللہ علیہ کوفہ میں بیرونی علاقوں سے بھی مال منگوایا کرتے تھے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خلافت عباسیہ کے مشرقی علاقہ کے مرکزی شہروں میں حضرت امام کے مختلف نمائندے یا ایجنٹ رہتے تھے۔ کوفہ سے امام صاحب ان ہی لوگوں کے پاس تجارتی سامان بھیجا کرتے، اور امام کے پاس کوفہ اپنے اپنے علاقہ کی چیزیں ان کے یہ نمائندے روانہ کیا کرتے تھے۔

امام صاحب کے شریک تجارت:

اس سلسلہ میں سب سے زیادہ نمایاں نام حفص بن عبدالرحمٰن کا ہے، الخطیب نے

بغداد کی تاریخ میں علی بن حفص بزاز کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ:

کان حفص بن عبدالرحمن شریک ابی حنیفة وکان یجهز الیه (ص ۳۵۸ ج ۱۳)	حفص بن عبدالرحمٰن تجارتی کاروبار میں امام ابوحنیفہ کے شریک تھے۔ اور باہر سے مال ان کے پاس بھیجا کرتے تھے۔

بہ ظاہر معلوم ہوتا ہے کہ امام کے سرمایہ سے وہ کام کرتے تھے گویا محنت ان کی ہوتی تھی اور سامان امام کا ہوتا تھا، الموفق نے بھی ایک موقعہ پر لکھا ہے۔

کان حفص بن عبدالرحمن شریک ابی حنیفة وکان ابو حنیفة یجهز علیه فبعث فی رفقة بمتاع (ص ۱۹۳ ج ۱)	حفص بن عبدالرحمٰن تجارتی کاروبار میں امام ابوحنیفہ کے شریک تھے، اور باہر سے ان کے پاس مال بھیجتے تھے ایک دفعہ چند رفقاء کے ساتھ سامان روانہ کیا۔

آگے موفق نے دوسرا قصہ بیان کیا ہے۔

بہرحال اس کی تصریح مختلف مورخین نے بھی کی ہے کہ امام صاحب کے ساتھ حفص بن عبدالرحمٰن نے تجارتی کاروبار تیس سال تک کیا تھا موفق نے حفص کا تذکرہ درج کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

حفص هذا هو شریکه فی التجارة صحبه ثلاثین سنة.	حفص تجارتی کاروبار میں امام کے شریک تھے تیس سال تک ان کے ساتھ رہے۔
وکان من نیسابور روی عنه الحدیث والفقه وکان رجلا صالحا (ص ۳۰۰)	حفص نیشاپور کے رہنے والے تھے، امام ابوحنیفہ سے حدیث وفقہ بھی روایت کرتے تھے صالح اور نیک آدمی تھے۔

خود حفص سے براہ راست حامد بن آدم نے یہ قول نقل کیا ہے کہ:

کنت شریک ابی حنیفه ثلاثین سنة (ص ۲۴۳ ج ۱ موفق)	میں تیس سال تک امام ابوحنیفہ کی شرکت میں کام کرتا رہا (یا تیس سال تک ان کا شریک رہا)

لیکن صحیح طور پر اس کا پتہ نہیں چلا کہ امام صاحب ان کے پاس مال کہاں بھیجا

کرتے تھے چونکہ بالاتفاق علما نے لکھا ہے کہ وہ نیشاپور کے تھے، خود نیشاپور کی قضا کا عہدہ اختیار کرلیا تھا، لیکن آخر میں پچھتائے اور مستعفی ہوکر گوشہ گزیں ہوئے و اقبل علی العبادۃ (یعنی عبادت ریاضت میں مشغول ہوگئے) آخر میں ان کی بزرگی کا یہ حال تھا کہ ابن المبارک جیسے محدث جلیل جب نیشاپور تشریف لائے تو حفص کی زیارت کے بغیر نیشاپور سے روانہ نہ ہوتے'' (ص ۲۲۱ ج ا جواہر)

واللہ اعلم یہ وہی امام حنیفہ کے شریک فی التجار حفص ہیں۔ جن کے پاس امام مال بھیجا کرتے تھے یا کوئی دوسرے صاحب ہیں۔ الحاکم نے تو اپنی تاریخ میں یہ بھی لکھا ہے کہ ابوداؤد اور النسائی ان سے روایت کرتے ہیں۔ بہرحال میرا خیال ہے کہ حفص نیشاپور ہی میں امام کا مال منگوایا کرتے تھے۔

یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ پایۂ تخت خلافت عباسیہ دارالسلام بغداد جو اس وقت دنیا کی سب سے بڑی تجارتی منڈی بن گئی تھی یہاں بھی امام کا کوئی تجارتی ایجنٹ رہتا تھا۔ الخطیب نے تاریخ بغداد میں لکھا ہے کہ حسن بن ربیع کہتے تھے کہ:

کان قیس بن الربیع یحدثنی عن ابی حنیفة انه کان یبعث بالبضائع الی بغداد فیشتری بھا الا متعة ویحملھا الی الکوفہ (ص ۳۲۰ ج ۱۳)	قیس بن ربیع ہم سے امام ابوحنیفہ کے متعلق یہ روایت بیان کرتے تھے کہ ابوحنیفہ بغداد سرمایہ بھیجتے تھے اور وہاں کی چیز اس سرمایہ سے خریدی جاتی تھیں وہی کوفہ لاد کر روانہ ہوتی تھیں۔

لیکن بغداد میں امام صاحب کا نمائندہ کون تھا؟ ممکن ہے کہ مختلف تاجروں کے ساتھ کاروبار ہو خطیب کی مذکورہ بالا عبارت سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ جیسے کوفہ سے دوسرے شہروں میں امام صاحب کا مال جاتا تھا۔ اسی طرح دوسرے شہروں کا مال کوفہ بھی امام صاحب منگواتے تھے۔

علاوہ نیشاپور اور بغداد کے اور جن شہروں میں امام کے تجارتی نمائندوں کا پتہ چلتا ہے، اس میں ایک مرو بھی ہے، موفق نے اپنے مناقب میں ابو غانم یونس کو ان الفاظ ست

روشناس کراتے ہوئے کہ هو من ائمة مرو (یعنی مرو کے ائمہ میں ان کا شمار ہے)
شمس الائمہ الکروری نے ابوغانم کے متعلقہ لکھا ہے کہ

من كبار ائمة مرو ادرک عمر بن عبدالعزيز ووهب بن منبه (ص ۲۳۷ ج ۲) مرو کے بڑے ائمہ میں سے ہیں اور عمر بن عبدالعزیز اور وہب بن منبہ کی صحبت سے فیض یاب ہونے کا موقعہ بھی ان کو ملا تھا۔

مشہور امام عبداللہ بن المبارک کے یہ استاد ہیں۔ حافظ ابن حجر نے تو خود ابن المبارک سے ان کا یہ قول نقل کیا ہے کہ

هو اول من اختلفت اليه (ص ۴۴۹ تهذيب ج ۱۱) ابوغانم پہلے آدمی ہیں جن کے پاس (تحصیل علم کے سلسلہ میں پہلی دفعہ میری آمدورفت شروع ہوئی)

جس کا مطلب یہی ہوا کہ عبداللہ بن المبارک کے سب سے پہلے استاد یہی ابوغانم ہیں۔ حافظ کے بیان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے مرو کے یہ قاضی[1] بھی تھے۔ ان کے الفاظ یہ ہیں۔

يونس بن نافع الخراساني ابو غانم المروذى القاضى ان کا نام یونس بن نافع خراسانی ابوغانم المروزی تھا، اور یہ قاضی تھے۔

(ص ۴۴۹ تهذيب ج ۱۱)

سن وفات ان کی حافظ نے ۱۵۹ھ قرار دی ہے جس کے معنی یہ ہوئے کہ حضرت امام رحمۃ اللہ سے ۹ سال بعد ان کی وفات ہوئی بہر حال کہنا یہ ہے کہ متعدد مورخین نے ان ہی قاضی ابوغانم کے متعلق نقل کیا ہے کہ موفق کے مناقب میں بھی ہے۔

هو من شركاء ابى حنيفة (ص ۳۰۲ ج ۱) یہ امام ابوحنیفہ کے شرکاء میں ہیں۔

---

[1] مرو ہی چونکہ عبداللہ بن المبارک کا وطن تھا اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ سب سے پہلے زانوئے تلمذ انھوں نے ابوغانم ہی کے آگے تہ کیا۔ باقی اس زمانہ میں لوگوں کا علمی اور دینی مشغلوں کے ساتھ تجارتی کاروبار یہ عام بات تھی خود عبداللہ بن المبارک کا کیا حال تھا۔ مورخین نے لکھا ہے کہ سال کو انھوں نے تین حصوں میں تقسیم کر دیا تھا چار مہینے تجارت میں، چار مہینے تحصیل علم خصوصاً فقہ و حدیث میں اور چار مہینے جہاد میں گذارا کرتے تھے۔ آخر وقت تک اپنے اس التزام کو نباہتے رہے۔

بہ ظاہر[1] یہی معلوم ہوتا ہے کہ مرو میں امام صاحب کی تجارت کی نمائندگی کرتے تھے امام صاحب سے حدیث بھی روایت کرتے تھے اور اس سے امام صاحب کی تجارتی کاروبار کی وسعت کا اندازہ ہوتا ہے گویا کوفہ سے ہزار ہا ہزار میل دور جو شہر تھے وہاں بھی ان کا مال پہنچتا تھا، اور ان مقامات سے آپ کے پاس مال آتا تھا۔ معجم المصنفین میں تبیض الصحیفہ کے حوالہ سے یہ فقرہ نقل کیا ہے کہ

قل تواتر عنه رحمة الله عليه ان كان يتجر في الخز مسعوداً ماهراً فيه وله دكان في الكوفة وشركاء يسافرون له في شراء ذلک وبيعه (ص ۱۷۵ ج ۲ معجم مطبوعه بيروت)

امام ابوحنیفہ کے متعلق بہ تواتر یہ بات منقول ہے کہ وہ خز کے ایک بڑے کامیاب تاجر تھے اور اس میں ان کو خاص مہارت حاصل تھی، کوفہ میں ان کی دوکان بھی تھی اور تجارتی کاروبار میں ان کے بہت سے شرکاء تھے جو خز کی خرید و فروخت کے لیے سفر کرتے رہتے تھے۔

حضرت امام کے اساتذہ کی تعداد:

اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ امام صاحب کے نمائندے اور ایجنٹ ملک کے مختلف اطراف میں گشت کر کے ان کے لیے مال بھی خریدتے تھے اور بیچتے بھی تھے اور میرا خیال تو ہے کہ لوگوں نے جو یہ لکھا ہے کہ

اشتهر واستفاض ان ابا حنيفة رحمه الله تلمذ عنه اربعة الاف من شيوخ ائمة التابعين وتفقه عنده اربعة الاف (ص ۵۵ معجم ج ۲)

یہ بات عام طور پر مشہور اور ہر جگہ پھیلی ہوئی ہے کہ امام ابوحنیفہ نے چار ہزار استادوں سے استفادہ کیا جن میں تابعین کے بڑے بڑے ائمہ و شیوخ تھے اسی طرح امام صاحب سے فقہ کی تعلیم بھی جن لوگوں نے پائی ان کی تعداد چار ہزار ہی تھی۔

---

[1] بہ ظاہر کا لفظ میں نے احتیاطاً اس لیے لکھ دیا ہے کہ کبھی کبھی شرکاء کے لفظ سے درس کے شرکاء بھی مراد ہوتی ہے، ہوسکتا ہے کہ ابو غانم کی شرکت شائد درسی شرکت ہی کی حد تک محدود ہو۔۱۲

حضرت امام کے شاگردوں کی تعداد:

اگر اس کو مبالغہ بھی سمجھا جائے جب بھی ان لوگوں کے تلمذ کا انکار تو کسی طرح نہیں کیا جا سکتا جن کا نام بنام حنفی مورخین نے اپنی کتابوں میں تذکرہ کیا ہے۔ شمس الائمہ الکروری نے امام کے تلامذہ کی اسی مفصل فہرست کو پیش کرنے کے بعد لکھا ہے کہ

فهولاء سبعمائة وثلاثون رجلا من مشائخ البلدان اخذوا عن الامام.	یہ سات سو تیس آدمی ہیں، جو مختلف شہروں کے اکابر شمار ہوتے ہیں جنھوں نے امام سے علم حاصل کیا۔

صاحب معجم نے اس پر اتنا اور اضافہ کیا ہے کہ

فاذا ذدت عليه ماذكرنا من الخوارزمي وهم زهاء ماته وخمسين فالمجموع زهاء ثمانين و ثمانمائة من اصحاب	خوارزمی نے جو تعداد بتائی ہے اس پر میرے اضافہ کردہ ناموں کو بھی اگر شریک کر لوگے تو قریب قریب امام کے شاگردوں کی تعداد آٹھ سو اسی ثابت ہوتی ہے۔

الامام (ص ۱۱۶ ج ۲)

جس کا مطلب یہی ہے کہ نام ونسب وطن کی قید کے ساتھ جن تلامذہ کا علم لوگوں کو ہوا ہے ان کی تعداد آٹھ سو اسی ہوتی ہے۔

کن کن شہروں میں امام صاحب کے شاگرد تھے:

اسی کے ساتھ ہم دیکھتے ہیں کہ تلامذہ کی یہ تعداد کسی خاص شہر یا کوفہ کے قریب چند محدود شہروں ہی کی نہیں ہے بلکہ عباسی حکومت کے اکثر مرکزی مقامات کے لوگ ہیں یعنی علاوہ کوفہ، بصرہ، بغداد، واسط، موصل، مکہ معظمہ، مدینہ منورہ، دمشق وغیرہ کے جو کوفہ سے قریب کی نسبت رکھتے، ہیں یا جہاں مسلمانوں کے تعلیمی مراکز قائم تھے۔ حیرت ہوتی ہے کہ ایک طرف خلافت عباسی کے مغربی بلاد مثلاً مصر، رملہ، یمن، یمامہ، بحرین، رقہ وغیرہ کے لوگ بھی امام کے حلقہ میں موجود ہیں اور مشرقی علاقوں کا تو حال یہ ہے کہ شاید ہی کوئی بڑا شہر اس سمت کا ایسا ہوگا جہاں امام کے شاگرد نہ پائے جاتے ہوں۔ خیال تو کیجئے کوفہ

کہاں تھا اور وہاں جرجان، طبرستان، وامغان قومس، رے نہاوند، ہمدان، استراباد، حلوان، اصفہان، کرمان، مرو، بخارا، نسا، سمرقند، سرخس، کس، صغانیاں، ترمد، بلخ، ہرات، قہستان، بجستان، رم، خوارزم وغیرہ وغیرہ ہر شہر کے لوگ امام سے استفادہ کے لئے پہنچتے تھے اور علم حاصل کر کر کے اپنے اپنے علاقوں میں واپس جارہے تھے۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا گو مشرق کے علاقوں کے ساتھ مورخین نے امام کے تلامذہ میں خلافت کے مغربی شہروں کے باشندوں کا بھی ذکر کیا ہے، لیکن اس فہرست پر نظر ڈالنے کے بعد یعنی ان شہروں میں سے کس کس شہر کے کتنے طلبہ امام کے پاس آئے اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ بہ نسبت مغربی علاقوں کے امام کی طرف مشرقی ممالک ہی کے لوگوں کا رجحان زیادہ تھا۔ کوفہ اور بصرہ جو گویا امام کی وطن کی حیثیت رکھتے تھے، ان کے سوا حجاز میں امام کو بنی امیہ کے آخری ایام میں مسلسل دو ڈھائی[1] سال قیام کرنے کا موقعہ اس وقت مل گیا تھا۔ جب بنی امیہ کے گورنر ابن ہبیرہ کے مظالم سے تنگ آ کر آپ نے حرم محترم میں پناہ لی تھی اور یوں بھی ان دونوں پاک شہروں میں آپ کی آمد ورفت کا سلسلہ آخر عمر تک جاری تھا۔ ارباب مناقب نے بالاتفاق یہ روایت نقل کی ہے کہ:

حج خمسا و خمسین حجة. امام نے پچپن حج کئے تھے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ چودہ پندرہ سال کی عمر کے بعد بلا ناغہ شائد حج کرتے تھے، ورنہ ظاہر ہے کہ ستر سال کی عمر میں پچپن حج کے میسر آنے کی صورت ہی کیا ہو سکتی ہے جیسا کہ معلوم ہے اور آئندہ بھی معلوم ہو گا کہ حجاز کے قیام کا زمانہ امام نے افادہ اور استفادہ میں گذرا تھا، اسی لیے حجاز کے دونوں مقدس شہروں میں آپ کے تلامذہ کی کافی

---

[1] یہ میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ ابن ہبیرہ کے زمانہ میں امام صاحب حجاز ۱۳۰ھ میں تشریف لے گئے اور عباسیوں کی حکومت جب تک قائم نہ ہو چکی کوفہ واپس تشریف نہ لائے ظاہر ہے کہ بنی امیہ کا آخری فرماں روا مروان ۱۳۲ھ میں قتل ہو گیا۔ اور اسی کے بعد سفاح پہلا عباسی خلیفہ تخت نشین ہوا۔ امام سے سفاح کی کوفہ میں ملاقات بھی ہوئی ہے جس کا ذکر انشاء اللہ آئندہ آئے گا۔ اس مسئلہ پر تھوڑی بحث آئندہ بھی آئے گی۔

تعداد نظر آتی ہے۔[۱]

لیکن ان کے سوا یہ واقعہ ہے کہ زیادہ تر آپ سے استفادہ کرنے والوں اور شاگردوں کی بڑی تعداد خلافت عباسیہ کے مشرقی شہروں ہی کی ہے خصوصاً بخارا، سمرقند، بلخ، ہراۃ وغیرہ میں تفصیل کے لیے امام کے شاگردوں کی فہرست دیکھئے ممکن ہے کہ مشرق والوں کے اس رجحان عام میں امام رحمۃ اللہ علیہ کے عجمی ہونے کو بھی دخل ہو خصوصاً جب ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ عربی جو امام کی مادری زبان تھی اس کے سوا آپ فارسی زبان سے بھی واقف تھے۔ لوگوں سے اس زبان میں گفتگو بھی فرماتے تھے[۲] بہرحال میں یہ کہنا چاہتا ہوں جیسا کہ پہلے کہیں ذکر آیا بھی ہے کہ امام کی کوفہ کی حانوت (شاپ میں) جیسے آپ کے صاحبزادے حماد اور آپ کے تلامذہ بھی تجارتی کاروبار میں ہاتھ بٹاتے تھے کیا تعجب ہے کہ ان مشرقی ممالک میں امام کے بھی تلامذہ مال کے درآمد برآمد میں بھی واسطہ کا کام دیتے ہوں۔ آخر حفص بن عبدالرحمٰن اور ابو غانم یونس جو امام کے شریک فی التجارۃ تھے۔ یہ بھی تو امام کے تلامذہ ہی میں تھے۔ پھر کیا تعجب ہے کہ ان کے سوا بھی بخارا، سمرقند، بلخ وہرات وغیرہ میں آپ کے شاگردوں کی جو ایک بڑی تعداد پھیلی ہوئی تھی ان میں کچھ لوگ تجارتی کام میں بھی حصہ لیتے ہوں۔ حضرت امام کے متعلق تاریخ

۱۔ کوفہ میں جب صحابہ کی اتنی بڑی تعداد آ کر آباد ہوگئی تھی کہ صرف اصحاب الشجرہ کے تین سو اور بدری اصحاب میں ستر حضرات تھے، ماسوا ان کے ابن مسعود اور حضرت علی کے صحبت یافتہ بزرگوں سے مسلمانوں کی یہ چھاؤنی بھری ہوئی تھی اسی کے ساتھ اس کا خیال کیجئے کہ پچپن حج امام نے کئے اور مسلسل دو ڈھائی سال حجاز میں رہے اور اہل علم میں رہے لیکن بایں ہمہ ناسمجھوں کا ایک گروہ ہے جو اب تک اس لطیفے کو رٹا جاتا ہے کہ امام کو آنحضرت ﷺ کی کل سترہ حدیثیں معلوم تھیں حقیقت ہے کہ عقل سے دست بردار ہو جانے کے بعد آدمی سب کچھ کہہ سکتا ہے۔

۲۔ توبہ بن سعد مرو کے باشندوں میں امام کے ارشد تلامذہ میں شمار ہوتے تھے ان کا بیان ہے کہ کان لہ بصر بالفارسیہ (یعنی فارسی زبان میں امام کو اچھا درک تھا) ایک شیعہ جو امام صاحب کے پاس آتا جاتا تھا تو یہ کہتے ہیں کہ ایک دن اس کے سامنے امام صاحب نے فرمایا توبہ بدمردست ایں (ص ۱۵۶ موفق ج ۲) یعنی فارسی کا یہ فقرہ بولے۔

کی کتابوں میں ایک بحث جو یہ پائی جاتی ہے کہ آپ کے والد کا اصلی وطن کہاں تھا؟ الخطیب نے مختلف مشرقی شہروں مثلاً نساء ترمذ انبار کے نام نقل کرتے ہوئے کابل کے متعلق زیادہ اقوال نقل کیے ہیں [۱]

میرا ذہن تو ادھر جاتا ہے کہ شاید ان شہروں سے امام کے خاص تعلقات ہوں اور ان ہی تعلقات خصوصی کی بنیاد پر لوگوں نے یہ مشہور کر دیا کہ آپ کا آبائی وطن وہیں تھا۔ ہوسکتا ہے کہ ان شہروں میں امام صاحب کی رشتہ داریاں ہوں، یا یہاں کے لوگوں سے خاص تجارتی تعلقات ہوں۔

---

[۱] اگرچہ بعضوں نے امام کو عربی النسل ثابت کرنے کی خواہ مخواہ کوشش کی ہے۔ ملا علی قاری نے نقل کیا ہے کہ بعض لوگ امام کو انصار کی طرف نسباً منسوب کرتے ہیں ابواسحاق شیرازی طبقات الفقہاء کے حاشیہ میں بعضوں کا قول نقل کیا ہے کہ بنی شیبان کے سلاطین سے امام کا نسبی تعلق تھا بعضوں نے تو امام کا نسب نامہ کیقباد و کخسر و اور بعضوں نے فریدوں سے ملا دیا ہے۔ بعض ہود نبی کی اولاد میں آپ کو کہتے ہیں۔ لیکن یہ یقینی ہے کہ امام نسلاً عربی نہیں بلکہ عجمی تھے یہ بے جا طرف داری ہوگی کہ آپ کو عربی نژاد ثابت کیا جائے۔ باقی بیرون عرب آپ کا نسلی تعلق کس علاقہ کے باشندے سے تھا جیسا کہ میں نے عرض کیا ممکن ہے کہ امام کے رشتہ داران تمام عجمی شہروں میں رہتے ہوں جن کا نام لیا جاتا ہے۔ البتہ کابل کے متعلق زیادہ روایتیں ملتی ہیں اس لیے اصل آبائی وطن میرے خیال میں امام کا کابل ہی معلوم ہوتا ہے۔ بلکہ امام صاحب کے دادا کا نام زوطی جو بتایا جاتا ہے اور لوگوں نے تصریح کی ہے کہ تلفظ اس کا ز کے فتحہ کے ساتھ صحیح ہے۔ ملا علی نے لکھا ہے کہ بفتح الزاء اور ہم جانتے ہیں کہ من رجال الزط کا لفظ جو حدیثوں میں آیا ہے بعضوں نے لکھا ہے کہ جاٹ کے لفظ کا یہ عربی تلفظ ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ زوطی امام کے دادا کا نام نہ ہو بلکہ قوم زط کی طرف نسبت ہے وہ مشہور ہوں۔ بہر حال کابل سے پنجاب قریب ہے اور زط یعنی جاٹ قوم کا مسکن اس وقت تک پنجاب اور اس کے بالائی علاقہ میں پایا جاتا ہے ان امور کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ دعویٰ کہ امام کا آبائی وطن درحقیقت ہندوستان ہی تھا اور ہندوستان سے کابل اور کابل سے دوسرے خراسانی شہروں میں منتقل ہوتے ہوئے بالآخر کوفہ پہنچا اسی لیے ان تمام شہروں سے امام کے خاندان کا تعلق ہو میں تو نہیں سمجھتا کہ بالکل بے بنیاد دعویٰ ہوگا اسی قسم کا بے بنیاد جیسے عربی النسل یا کے قباد و فریدوں وغیرہ کی نسل کی طرف خواہ مخواہ آپ کو منسوب کیا جاتا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب ۱۲

بہر حال امام کی تجارت کی جن وسعتوں کا تذکرہ تاریخ کی کتابوں میں کیا گیا ہے جہاں تک قرائن کا تعلق ہے ان کے انکار کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔

امام صاحب کے غیر معمولی سرمایۂ تجارت کے متعلق تفصیل

البتہ یہاں ایک دل چسپ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اتنے بڑے کاروبار کے لیے ظاہر ہے کہ کافی سرمایہ کی ضرورت ہے۔ امام صاحب بے چارے عجمی النسل آدمی تھے۔ امارت وثروت زیادہ تر اس زمانہ میں عربی نژاد خاندانوں کے ساتھ مختص تھی پھر امام کو اتنا بڑا سرمایہ کہاں سے مل گیا، جس سے وہ مرو اور نیشاپور، بغداد اور اسی قسم سے دوسرے شہروں تک اپنے لین دین کے معاملات کو پھیلا سکے۔ قطع نظر عجمی ہونے کے اگر اربابِ مناقب کی اس روایت کو صحیح تسلیم کر لیا جائے۔ یعنی ابوجعفر منصور کے سامنے قضا سے انکار کرتے ہوئے امام کی طرف جہاں مختلف دوسرے جواب منسوب کئے گئے ہیں ان ہی میں کہا جاتا ہے کہ حضرت امام نے ایک دفعہ منصور کو یہ بھی سمجھایا تھا کہ

كان ابى خبازا واهل الكوفه لايرضون ان يكون القاضى ابن خباز (ص ١٦٢ ج ١ موفق)	میرے والد نان بائی تھے اور کوفہ والے اس کو پسند نہ کریں گے کہ ایک نان بائی کے لڑکے کو ان کا قاضی بنا دیا جائے۔

اگر چہ اسی کے ساتھ حضرت امام کے دادا کے متعلق یہ روایت بھی نقل کی جاتی ہے۔

اهدى لعلى بن ابى طالب الفالوذج فى يوم النيروز فقال نوروز ناكل يوم وقيل كان فى مهرجان فقال مهر جوناكل يوم. (الخطيب ص ٣٢٦ ج ١٣)	نوروز کے دن امام ابوحنیفہ کے دادا نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی خدمت میں فالودہ بطورِ ہدیہ کے پیش کیا تھا۔ حضرت علی نے فرمایا کہ میرے لیے ہر روز نوروز ہے بعض کہتے ہیں کہ مہرجان کے تہوار میں ہدیہ پیش کیا گیا تھا۔ حضرت علی نے فرمایا کہ میرے لیے تو ہر دن مہرجون ہے۔

اس میں شک نہیں کہ اس روایت سے اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ حضرت امام کے

دادا کچھ امتیازی حیثیت رکھتے تھے آخر خلیفہ وقت تک رسائی کچھ نہ کچھ امتیاز کو غالباً چاہتی ہے۔ لیکن امتیاز کے لیے دولت مند ہونا ضروری نہیں۔ اسی طرح فالودہ جیسی عام اور معمولی چیز کا پیش کرنا یہ بھی ان کی دولت مندی کی دلیل نہیں ہو سکتی اور اگر وہ بیچارے اتنے ہی دولت مند ہوتے جس پر امام کی تجارت کی بنیاد قائم کی جائے تو ان کے صاحبزادے ثابت کو بقول امام خبازی کے پیشے کے اختیار کرنے کی کیا ضرورت ہوتی بعض کتابوں میں لکھا ہے کہ امام صاحب کو اپنے والد سے دس ہزار درم ترکے میں ملے تھے، لیکن ظاہر ہے کہ یہ کوئی بڑی رقم نہ تھی۔ دو ڈھائی ہزار روپے ہوئے اس سے امام کے اس عظیم سرمایہ اور کاروبار کی توجیہ نہیں ہو سکتی جس کا ذکر ابھی آپ سنیں گے۔

امانتیں:

ہاں امام کی زندگی میں ہم ایک اور خاص چیز کو پاتے ہیں۔ چاہا جائے تو اسی سے اس معمہ کو حل کیا جا سکتا ہے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ ایک جگہ نہیں متعدد مقامات میں امام کے سوانح نگاروں نے اس کا تذکرہ کیا ہے کہ لوگ امام کے پاس ''ودائع'' یعنی امانتیں رکھوایا کرتے تھے۔ حضرت زید بن علی نے بنی امیہ کے مقابلہ میں خروج کا جب ارادہ کیا جس کا ذکر تفصیل کے ساتھ آئندہ آ رہا ہے اور حضرت زید نے امام کو بھی اس جہاد میں شرکت کی دعوت دی تھی تو آپ نے اس کے جواب میں بیش قرار رقمی امداد کے ساتھ چند باتیں بطور عذر جو کہلا بھیجی تھیں ان میں ایک وجہ یہ تھی کہ

حسبتنی ودائع الناس لوگوں کی امانتوں نے مجھے روک رکھا ہے۔
(الکروری ص ۲۵۵)

سچ پوچھئے تو اسی فقرے نے میرے دل میں اس سوال کو ابتداءً اٹھایا۔ خیال یہ گذرا کہ ایک ایسی شدید دینی مہم میں شرکت کے لیے امام کو دعوت دی جاتی ہے۔ دعوت دینے والی ہستی وہ ہے کہ خود حضرت امام کا قول تھا۔

خروجه یضاهی خروج رسول الله صلی الله علیه وسلم یوم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا بدر کی مہم کے لیے نکلنا اسی کے مشابہ زید بن علی کی یہ مہم ہے

بدر (ص ۲۶۰ موفق) جس کے لیے اس وقت وہ نکلے ہیں۔

اسی روایت میں ہے کہ حضرت زید کی جب شہادت اسی راستہ میں ہوئی جس کی تفصیل انشاء اللہ آگے آتی ہے تو ایک دو دفعہ نہیں بلکہ امام کے دیکھنے والوں کا بیان ہے کہ

یبکی کلما ذکر مقتلہ[۱] جب کبھی زید کی شہادت کا تذکرہ ہوتا تو امام

(ص ۲۹۱) رونے لگتے۔

ان ہی روایتوں میں یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ پہلی قسط حضرت زید کی خدمت میں امام نے جو پیش کی تھی وہ دس ہزار کی رقم تھی سوال یہی ہوتا تھا کہ امانت و دیعت کا قصہ عموماً اتفاقی طور پر پیش آتا ہے مثلاً سفر حج یا کسی دوسرے سفر میں کوئی جانے لگتا ہے تو کسی معتبر آدمی کے پاس بطور امانت کے تھوڑی بہت چیز رکھوادی جاتی ہے، امام کے پاس بھی اسی قسم کی کچھ امانتیں ہوں گی لیکن اس قسم کی معمولی امانتوں کی حفاظت کے لیے ایسی عظیم دینی مہم کی شرکت سے اپنے آپ کو محروم کر لینے کی معقول وجہ نہیں ہوسکتی۔ فرض کیجئے جیسا کہ اسی روایت میں ہے کہ امام نے فرمایا کہ قاضی ابن ابی لیلیٰ پر میں نے اصرار کیا کہ ان امانتوں کو اپنے ذمہ میں لے لیں لیکن انھوں نے قبول نہیں کیا۔ لیکن کوفہ جیسے شہر میں اور بھی بیسیوں معتبر ہستیاں مل سکتی تھیں جن کے ہاں ان امانتوں کو محفوظ کرا کے امام رحمۃ اللہ علیہ اس جہاد فی سبیل الحق میں شریک ہونے کی سعادت حاصل کر سکتے تھے۔ اسی قسم کے سوالات جب دل میں آئے تو میں نے ان ودیعتوں کے متعلق تحقیق شروع کی کہ کماً و کیفاً ان کی نوعیت کیا تھی؟ تاریخی یادداشتوں نے جس مواد کو اس سلسلہ میں میرے

---

[۱] حضرت زید کے شہید ہو جانے اور وہ بھی اس بے کسی کے ساتھ شہید ہو جانے کا خیال امام کو جب آتا تو رو دیتے تھے۔ ان لوگوں کے لیے جو حضرت زید کے جد امجد امام حسین علیہ السلام کی شہادت کے متعلق اسی کیفیت کو اپنے اندر رکھتے ہیں یعنی واقعہ کربلا جب یاد آ جاتا ہے تو بے اختیار ان پر گریہ طاری ہو جاتا ہے کیا امام ابوحنیفہ کی یہ حالت ان کے لیے نمونہ بن سکتی ہے؟ واقعہ تو یہ ہے کہ کرہاً و جبراً بلکہ بعض اشک آور عرقیات کو استعمال کر کے رونا یا رونے والوں کی صورت بنانا یقیناً قابل اعتراض ہے، لیکن واقعات کربلا سے اضطراری تاثر، پیغمبر اور پیغمبر کے اہل بیت سے قلبی تعلق کی دلیل ہے خود امام کے رجحانات کا بھی اس سلسلہ میں کچھ پتہ چلتا ہے۔

سامنے پیش کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ دیکھ کر حیران ہو گیا۔ ان ہی کے مطالعہ نے میرے دماغ کو ایک خاص خیال کی طرف منتقل کر دیا یعنی حضرت امام کے لیے اتنے بڑے پیمانے پر تجارت کی تنظیم کا امکان کیسے پیدا ہوا؟ اس سوال کے جواب کی ایک ممکنہ صورت میرے سامنے آ گئی۔

امانتوں کی مقدار:

میرا مطلب یہ ہے کہ لکھنے والے گو عام طور پر صرف اتنا لکھ کر چلے جاتے ہیں کہ امام کے پاس بعض لوگ اپنی امانتیں اور ودائع رکھوایا کرتے تھے، لیکن ان امانتوں کی مقدار کیا تھی اور امام کے پاس یہ کس حیثیت سے رکھے جاتے تھے؟ خصوصی توجہ سے یہ سوالات عموماً محروم رہے۔ لیکن سنئے پہلا سوال یعنی امام کے پاس امانت کے ان رقوم کی تعداد کہاں تک پہنچ جاتی تھی۔ بالاتفاق امام کے سوانح نگاروں نے لکھا ہے کہ:

مات ابو حنیفه وفی بیته للناس ودائع خمسین الف الف (ص ۲۳۰ ج ا موفق)	امام ابوحنیفہ کی جس وقت وفات ہوئی اس وقت ان کے گھر میں پچاس ملین (یا پانچ کروڑ) کی امانتیں لوگوں کی تھیں۔

جس کے معنی یہی ہوئے کہ وفات کے بعد امام کے گھر سے امانت کی مد کے رقوم جو نکلے ان کی تعداد (۵۰۰۰۰۰۰۰) یعنی پانچ کروڑ تھی یہ یاد رکھنا چاہئے کہ مذکورہ بالا رقم وفات کے بعد آپ کے گھر سے نکلی ہے۔ غور کرنے کی بات ہے کہ امام کی وفات جیسا کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے ستر کی عمر میں ہوئی ہے۔

امام جیسے محتاط آدمی کے متعلق اگرچہ خیال کیا جائے کہ اپنی پیرانہ سالی کا خیال کر کے انھوں نے کوشش کی ہوگی کہ زندگی ہی میں حتی الوسع لوگوں تک ان کی امانتیں پہنچا دی جائیں تو یہ بے بنیاد خیال نہیں ہو سکتا ہے۔ بڑھاپے میں عام معمولی کردار و سیرت رکھنے والی ہستیاں جب یہی کرتی ہیں تو امام کے متعلق اس قسم کی توقع بے جا توقع نہیں ہو سکتی۔ اسی بنیاد پر میرا خیال ہے کہ یہ پانچ کروڑ کی رقم امام کے پاس دینے دلانے کے بعد رہ گئی ہوگی۔ اور بالفرض اگر یہ نہ بھی ہو جب بھی اس زمانے کے لحاظ سے شہر کے ایک خوش

باش شہری کے پاس پانچ پانچ کروڑ کی امانتوں کا رہنا کیا معمولی بات ہے؟ میں تو سمجھتا ہوں کہ ہمارے زمانہ میں بھی جب روپیہ کی قیمت بہت گر گئی ہے مشکل ہی سے افراد کے پاس بدامانت اتنی رقم مرنے کے بعد نکل سکتی ہے۔

بہر حال میرا خیال تو یہی ہے کہ امام کے پاس اس سے زیادہ رقوم بطور امانت کے رکھے جاتے تھے اور یہ رقم مرنے کے بعد صرف ان لوگوں کی رہ گئی تھی جن تک کسی وجہ سے اپنی زندگی ہی میں امام ان کی امانتوں کو واپس نہ فرما سکے تھے جن کی امانتیں ہوں گی وہ کوفہ سے باہر ہوں گے یا ایسے نابالغ بچوں کی امانتیں رہ گئی ہوں جو ابھی سن رشد کو نہ پہنچے ہوں۔ آخر خیال تو کیجئے بیان کرنے والے جب یہ بیان کرتے ہیں کہ:

ان رجلا دهانا اودع عند ابی حنیفة مائة الف و سبعین الف درهم (ص ۲۲۳ موفق ج ا)

ایک تیلی نے امام ابوحنیفہ کے پاس ایک لاکھ ستر ہزار درم بدامانت جمع کی تھی۔

جب ایک تیلی ایک لاکھ ستر ہزار کی رقم امام کے پاس محفوظ کرا سکتا تھا تو اسی سے اندازہ کیجئے کہ دوسرے صاحبان حیثیت کے امانتی کھاتوں کا کیا حال ہوگا؟ افسوس ہے کہ مورخین نے اس مسئلہ کو مقصود بالبنات بنا کر واقعات کے درج کرنے کی کوشش نہیں کی ذیلی اور ضمنی طور پر کسی دوسرے واقعہ کا تذکرہ کرتے ہوئے اتفاقاً اعداد کا ذکر بھی لوگوں نے کر دیا ہے، اس قسم کے ضمنی بیانات اور بھی ملتے ہیں لیکن میرا جو مقصد ہے اس کے لیے مذکورہ بالا بیانات اور شہادتیں کافی ہیں۔ یعنی حضرت امام کے پاس ''امانت'' اور ''ودِیعت'' کی راہ سے لاکھوں ہی نہیں بلکہ کروڑوں کا سرمایہ جمع ہو گیا تھا اور جمع ہوتا رہتا تھا، مشہور امام فقہ وحدیث وکیع بن الجراح کے صاحبزادے سفیان سے جو یہ منقول ہے کہ ان کے والد وکیع کہتے تھے۔

کان ابو حنیفة عظیم الامانة. (ص ۲۲۰ موفق)

امام ابوحنیفہ بہت بڑے تھے امانت میں۔

اگر اس کا یہ مطلب بھی لیا جائے کہ بکثرت لوگوں کی امانتیں اور ودائع آپ کے

ہاں جمع ہوتے تھے واقعات سے اسی کی تائید ہوتی ہے۔

عوام کے اعتماد کی وجہ:

حقیقت تو یہ ہے کہ عام مورخین نے امام کے جو حالات بیان کیے ہیں۔ان کا عام مخلوق کے ساتھ جو برتاؤ تھا۔اگر یہ واقعات صحیح ہیں اور نہ صحیح ہونے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی بلکہ کہا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ تواتر نہیں تو شہرت کی حدود تک اس قسم کی روایتیں پہنچی ہوئی ہیں مثلاً بطور کلیہ کے امام کی یہ عام عادت بیان کی جاتی ہے۔قاضی ابویوسف کی روایت ہے کہ:

کان ابو حنیفة لایکاد یسال حاجة الاقضاها (ص۲۵۷ ج ۱ موفق)	امام ابوحنیفہ کا حال یہ تھا کہ کوئی حاجت جو ان پر پیش کرنے والے پیش کرتے،مشکل ہی سے ایسی کوئی حاجت ہوگی جسے وہ پوری نہ کر دیتے ہوں۔

خیال کرنے کی بات ہے کہ جس کا حال یہ ہو لوگوں میں ہر دل عزیزی اور اعتماد کی کیفیت جس حد تک اس کے متعلق قائم ہو کم ہے اسی طرح امام کی اس عام عادت اور فطرت کا بھی ذکر کیا جائے کہ ان کے حلقہ میں کوئی ایسا آدمی اگر بیٹھ جاتا جو عموماً آپ کے حلقہ کا آدمی نہ ہوتا،تو لکھا ہے۔

فاذا قام سال عنه فان کانت به فاقة وصله وان مرض عاده (ص۲۵۷ موفق ج ۱)	جب وہ اٹھ کھڑا ہوتا تو اس سے دریافت کرتے،اگر اس کی کوئی ضرورت ہوتی تو اسے پوری فرماتے کسی کی بیماری کا حال اس سے معلوم ہوتا تو عیادت کرتے۔

اور یہ حال تو اجنبی لوگوں کے ساتھ تھا۔

حضرت امام صاحب کے حسن سلوک کا ایک واقعہ:

بعض قصے اس سلسلہ میں تو ایسے بیان کیے جاتے ہیں کہ ان پر ''افسانہ'' ہونے کا دھوکہ ہوتا ہے لیکن ان کے تقریباً اکثر سوانح نگاروں نے اس کا ذکر کیا ہے۔قصہ تو طویل ہے،حاصل اس کا یہ ہے کہ کوفہ میں ایک صاحب پہلے خوش حال تھے،لیکن زمانہ کی گردش

میں مبتلا ہوئے، آدمی غیرت وحمیت والے تھے جس طرح گذر رہی تھی گذار رہے تھے ایک دن ان کی چھوٹی بچی تازہ تازہ ککڑیوں کو دیکھ کر چلاتی ہوئی گھر آئی۔ ماں سے ککڑی لینے کے لیے پیسے مانگے لیکن افلاس اس حد تک پہنچا ہوا تھا کہ ان ککڑیوں کے لیے بھی ماں پیسے نہ دے سکی۔ لڑکی کا باپ بیٹھا ہوا اس تماشے کو دیکھ رہا تھا آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اور طے کیا کہ کسی سے امداد حاصل کرنی چاہیے مورخین نے اس موقعہ پر لکھا ہے کہ

وقصد مجلس البركة وهو مجلس ابی حنيفة.	''مجلس البرکۃ'' کا اس نے ارادہ کیا اور ''مجلس البرکۃ'' امام ابوحنیفہ کی مجلس کا نام تھا۔

بہ ظاہر اس کا یہی مطلب معلوم ہوتا ہے کہ امام کی مجلس کوفہ میں ''برکت کی مجلس'' کے نام سے مشہور تھی جہاں سے کچھ نہ کچھ لے کر ہی آدمی اٹھتا تھا دینی یا دنیوی مادی یا روحانی نفع کچھ ہی ہو۔ بہر حال آنے کی حد تک تو بے چارا کسی طرح ''مجلس برکت'' تک وہ آ گیا لیکن جس نے کبھی کسی سے کچھ نہیں مانگا تھا، اس کی زبان کھل نہ سکی۔ بار بار کہنے کا ارادہ کرتا، لیکن طبعی شرم وحیا زبان کو روک دیتی، آخر یوں ہی اٹھ کر چلا گیا، لیکن امام کی نگاہ سے اس کے دل کی کیفیت کیسے چھپ سکتی تھی۔ لکھا ہے کہ اس کے چہرے سے امام نے تاڑ لیا کہ یہ بے چارا کوئی حاجت مند ہے۔ شرافت کی وجہ سے اپنی حاجت کہہ نہ سکا جب اٹھ کر جانے لگا تو امام صاحب بھی پیچھے پیچھے اس کے روانہ ہوئے جس گھر میں داخل ہوا تھا اس کو خوب پہچان لیا۔ جب رات بھیگ گئی تب امام صاحب اپنی آستین میں روپے کی ایک تھیلی جس میں کہا جاتا ہے کہ پانچ سو درم تھے لے کر روانہ ہوئے اور اس کے دروازے پر پہنچ کر کنڈی کھٹکھٹائی۔ اندھیرا کافی تھا۔ بے چارا باہر نکلا کہتے ہیں کہ امام صاحب اس کی دہلیز پر تھیلی رکھ کر الٹے پاؤں یہ کہتے ہوئے واپس آئے۔

''دیکھو تمہارے دروازے پر تھیلی پڑی ہوئی ہے، یہ تمہارے ہی لیے ہے۔''

تھیلی تو اس نے اٹھالی لیکن پتہ نہ چلا کہ کون تھا جو اس طرح دے کر چلا گیا۔ بیوی کے پاس گیا۔ تھیلی کھولی گئی، پانسو درم کے ساتھ ایک پرزہ ملا کہ:

هذا المقدار جاء به ابو حنيفة	ابوحنیفہ اس رقم کو لے کر تیرے پاس آیا تھا یہ

الیک من وجه حلال فلیفرغ بالک.[1] (ص ۲۶۳ موفق)	حلال ذریعہ سے حاصل کی گئی ہے چاہئے کہ اس سے اپنے قلب کی فراغت میں کام لو۔

قاضی ابو یوسف امام کی اس عام عادت کا بھی تذکرہ کیا کرتے تھے۔

کان ابو حنیفة شدید البر لکل من عرف وکان یهب للرجل خمسین دیناراً واکثر فاذا شکره بحضرة قوم غمه ذلک. (ص ۲۶۳)	اپنے جاننے والوں کے ساتھ امام ابو حنیفہ حسن سلوک کے عادی تھے لوگوں کو پچاس پچاس اشرفی یا اس سے زیادہ دیتے لیکن دوسروں کے سامنے اگر وہ امام کا شکریہ ادا کرتا، تو ان کو تکلیف ہوتی تھی۔

یہ بھی فرماتے کہ "میاں اللہ تعالیٰ نے یہ روزی تم تک پہنچاتی ہے، کہتے کہ رسول اللہ ﷺ کی حدیث تم نے نہیں سنی۔

انما انا خاذن اضع حیث امرت.	میں تو صرف خزانچی ہوں، جہاں حکم دیا جاتا ہے وہاں رکھ دیتا ہوں۔

تحائف:

یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں میں تحفے تحائف کے بانٹنے کا بھی امام کو بہت شوق تھا، سفیان بن عیینہ کا براہ راست قول لوگ نقل کرتے ہیں کہ

لقد وجه الی بهدایا استوحشت من کثرتها.	اس قدر تحفوں اور ہدیوں کی بھرمار ابو حنیفہ کی طرف سے میرے پاس ہوئی کہ اس کی کثرت سے میں گھبرا اٹھا۔

---

[1] لکھنے والوں نے اس کی توجیہ میں کہ جب امام صاحب اپنے آپ کو ظاہر کرنا نہیں چاہتے تھے تو یہ پرزہ تھیلی میں کیوں ڈالا بہت سی باتیں کہی ہیں لیکن بات تو کھلی ہوئی ہے اس قسم کے مال میں بیسیوں احتمالات ہو سکتے تھے اور ان احتمالات کی وجہ سے بے چارا ممکن تھا کہ خرچ ہی کرنے سے ہچکچاتا۔ یا خرچ کرنے کے بعد دل میں اس کے طرح طرح کے وسوسے آتے رہتے کہ کون دے گیا تھا کیوں دے گیا۔ کیا کوئی دھوکہ دینا چاہتا ہے۔ یا کسی الزام میں گرفتار کرانا چاہتا ہے؟ اس پرزے کے بعد یقیناً اس کو اطمینان ہو گیا ہوگا یا آئندہ کے لیے اس کو بتلانا مقصود تھا کہ تم حاجت لے کر آؤ گے تو نقدی کیسی ملے گی۔

کہتے ہیں کہ ابن عینیہ نے کسی سے اس کی شکایت بھی کی، سننے والے نے کہا کہ سعید بن ابی عروبہ کے پاس امام صاحب کے تحفے جو پہنچتے رہتے تھے اگر تم ان کو دیکھتے تو خدا جانے کیا کہتے، پھر اس نے کہا کہ

ماکان یدع احدا من المحدثین الاہرہ برا واسعا. (ص ۲۲۴) — سیر چشمی کے ساتھ حسن سلوک کئے بغیر امام ابوحنیفہ کسی محدث کو نہ چھوڑتے۔

ایک عام قاعدہ ان کا یہ بھی تھا کہ کوئی ہدیہ یا تحفہ ان کے پاس بھیجتا تو جواب میں کہیں زیادہ بہتر قیمتی چیز اس کو بھیجتے۔ ایک شخص نے تین درم کی کوئی چیز تحفۃً پیش کی اس کو پچاس درم کا ایک ٹکڑا خز کا آپ نے بھیجا۔

مشائخ، علماء اور محدثین کی خدمت:

امام کے سوانح نگاروں نے اس سلسلہ میں بھی کافی واقعات کتابوں میں درج کئے ہیں۔ حتیٰ کہ لکھا ہے کہ ان کی عام عادت تھی کہ

> ہر سال مخصوص رقم کا سامان کوفہ سے بغداد بھیجتے اور بغداد سے چیزیں منگوا کر کوفہ میں فروخت کراتے۔ اس لین دین سے جو آمدنی ہوتی۔ اس سے پہلے تو کوفہ کے محدثین کے کھانے پینے اور پہننے کا سامان خرید کر ان لوگوں کے پاس بھیجتے اس کے بعد سرمایہ اور منافع کی جو رقم باقی بچ جاتی، اسے بھی ان ہی لوگوں میں یہ کہتے ہوئے تقسیم فرما دیتے کہ:

انفقوا فی حوائجکم ولا تحمدوا الا اللہ فانی ما اعطیتکم من مالی شیئا ولکن من فضل اللہ علی فیکم وھذہ ارباح بضائعکم (ص ۲۶۲ موفق) — اپنی ضرورتوں میں خرچ کیجئے اور شکر و تعریف خدا کے سوا اور کسی کی نہ کیجئے کیونکہ اپنے مال سے میں نے کچھ نہیں دیا بلکہ آپ لوگوں کے متعلق مجھ پر خدا کا فضل ہوا اور آپ ہی لوگوں کے (نام زدہ) سرمایہ کے یہ منافع ہیں۔

بہ ظاہر معلوم ہوتا ہے کہ زکوٰۃ کی رقم جو نکلتی تھی ممکن ہے کہ اسی کو سرمایہ بنا کر زکوٰۃ نکالنے سے پہلے اس غرض سے کہ زیادہ بڑھ جائے، یہ ترکیب امام نے اختیار کی تھی۔

شائد اسی لیے کہتے تھے کہ تمہارے سرمایہ کے یہ منافع ہیں۔ میرا کچھ نہیں ہے اور یہ برتاؤ کچھ محدثین ہی کے ساتھ مختص نہ تھا مسعر بن کدام جو کوفہ کے صف اول کے علماء میں شمار کئے جاتے ہیں امام کے معاصرین میں ہیں۔ ابوجعفر منصور عباسی خلیفہ کے دربار میں امام صاحب کے ساتھ یہ بھی عہدہ قضا کے لیے بلائے گئے تھے جن کا ذکر آ رہا ہے ان کا بیان ہے کہ

> امام ابوحنیفہ کا یہ عام دستور تھا کہ اپنے بال بچوں کے لیے جب کوئی چیز خریدتے تو مشائخ وعلما کے لیے بھی وہی چیز ضرور خریدتے خود اپنے لیے جب کپڑا بنواتے تو علما کے لیے بھی جوڑے تیار کراتے اسی طرح جس قسم کے فواکہ اور پھلوں کا موسم آتا۔ ناممکن تھا کہ اپنے لیے اور اپنے گھر والوں کے لیے خریدتے اور علماء کو بھی وہی پھل خرید کر نہ بھیجتے۔

بلکہ خواجہ مسعر کبھی فرماتے کہ

> علما یا دوسروں کے لیے امام جو چیزیں خریدتے ان مین ہمیشہ اس کا لحاظ فرماتے کہ اچھی سے اچھی قسم کی ہوں لیکن خود اپنے یا اپنے عیال کی خریداری میں عموماً لاپروائی اور تساہل سے کام لیتے۔ (ص ۲۶۱)

فقراء اور محتاجوں کے ساتھ حسن سلوک:

علاوہ علما و محدثین کے عام گداگر فقیروں اور محتاجوں کے ساتھ ان کا حسن سلوک عام تھا اپنے بیٹے حماد کو حکم دے رکھا تھا کہ دس درم کی روٹیاں خرید کر غربا میں روزانہ تقسیم کی جائیں یہ بھی امام کی عادت بیان کی جاتی ہے کہ کھانے پر جب بیٹھتے تو روٹی اور جو سالن ہوتا اس کو روٹی پر رکھ کر فقیروں کو بھیج دیتے۔

شاگردوں کے ساتھ برتاؤ:

رہے تلامذہ اور ان کے اصحاب سو ان کے ساتھ سلوک کی کیا نوعیت تھی آج دنیا میں اساتذہ اور تلامذہ کے جو تعلقات ہیں، ان کو دیکھتے ہوئے تو ان واقعات کا باور کرنا بھی مشکل ہے لوگوں نے ان کی یہ کلی عادت لکھی ہے۔

> ہر طالب العلم سے پوشیدہ طور پر اس کے حالات دریافت کرتے۔ کوئی ضرورت ہوتی تو اس کی تکمیل فرما دیتے جو ان میں بیمار ہوتا یا طالب العلموں کے اقربا (ماں باپ وغیرہ) بیمار ہوتے تو ان کی عیادت کرتے جن کا انتقال ہو جاتا ان کے جنازے میں حاضر ہوتے کسی پر کوئی مصیبت آن پڑتی تو امداد کے لیے کھڑے ہو جاتے۔ (ص ۲۵۷)

خود ان کے تلامذہ نے امام کے حسن سلوک کے متعلق جو تذکرے کہتے ہیں پڑھ کر حیرت ہوتی ہے امام کے مشہور بصری شاگرد یوسف بن خالد السمتی ہیں، ایک لطیفہ وہی بیان کرتے تھے کہ کسی حاجی نے امام کی خدمت ایک ہزار پاپوش بطور تحفے کے پیش کئے۔ یوسف کہتے ہیں کہ ایک دن یا دو دن اس پر گذرے ہوں گے کہ میں نے امام کو دیکھا کہ اپنے صاحبزادے کے لیے بازار میں نعلین خرید رہے ہیں۔ میں نے تعجب سے عرض کیا کہ ابھی تو آپ کے پاس ہزار جوڑے تحفے میں آئے تھے اور آج بچے کے لیے جوتا خرید رہے ہیں۔ فرمایا کہ

> میرا قاعدہ ان تحفوں کے متعلق یہی ہے کہ اپنے شاگردوں اور متوسلین پر تقسیم کر دیتا ہوں۔ (ص ۲۵۸)

ان ہی یوسف بن خالد سمتی کا بیان ہے کہ امام اپنے طلبہ کے لیے ہر جمعہ دعوت فرمایا کرتے تھے۔ طریقہ یہ تھا کہ

یطنج لھم الو ان الطعام و کان لایاکل معنا ویقول انفرد بنفسی لئلا تحشموا (ص ۸۹ ج ۲)	طرح طرح کے کھانے (جمعہ) کے دن پکواتے لیکن کھانے میں طلبہ کے ساتھ شریک نہ ہوتے کہتے کہ میں اپنے آپ کو اس لیے الگ کر لیتا ہوں کہ تم لوگوں کی بے تکلفی جاتی رہے گی۔

علاوہ جمعہ کی دعوت کے بیان کیا جاتا ہے کہ اپنے ان ہی طلبہ کے ساتھ۔

یبرھم فی الاعیاد ویرسل الی کل واحد منھم علی قدر	تہواروں کے موقعہ پر سب کے ساتھ حسن سلوک اور ہر ایک کے رتبہ کے مطابق ان کے پاس

منزلتہ (ص ۲۵۹ ج ۱) چیزیں بھیجتے۔

انتہا یہ ہے جیسا کہ لوگوں کا بیان ہے۔

''طلباء میں جن لوگوں کو ضرورت ہوتی ان کی شادی بھی امام کرادیتے اور شادی کے مصارف خود ادا کرتے۔'' (ص ۲۵۹ ج ۱)

ان عام باتوں کے سوا طلبہ کے نام ماہوار وظائف بھی امام کے یہاں سے جاری تھے لکھا ہے کہ:

قد اجری علی جماعة من اصحابه کل شهر جراية سوی ماکان یواسیهم (ص ۲۶۰) ہر جماعت کے شاگردوں کو ماہوار وظیفے بھی امام کے ہاں سے ملتے تھے یہ عام حسنِ سلوک کے سوا تھا۔

انفرادی طور پر جن جن طالب علموں کے ساتھ جو سلوک امام نے کیا ہے اور بعد کو ان لوگوں نے بیان کیا ہے ان کی فہرست تو طویل ہے اسی سے اندازہ کیجئے کہ قاضی ابو یوسف کہتے تھے:

وکان یعولنی وعیالی عشرین سنة (ص ۱۷۱ معجم ج ۲) بیس سال تک میری اور میرے اہل وعیال کی کفالت امام ابوحنیفہ نے کی۔

حسن بن زیاد جو امام کے ممتاز تلامذہ میں ہیں کہتے ہیں کہ:

''میں امام صاحب کے پاس پڑھا کرتا تھا میرے والد ایک دن امام صاحب کے پاس آئے اور عرض کرنے لگے کہ حضور! میری چند لڑکیاں ہیں لڑکوں میں حسن کے سوا کوئی نہیں ہے۔ آپ ہی اس کو سمجھائیے کہ کوئی ایسا دھندا اختیار کرے جس سے مجھے کچھ سہولت میسر آئے۔''

حسن کا بیان ہے کہ جب میں حاضر ہوا تو امام نے فرمایا کہ میاں حسن! آج تمہارے والد آئے تھے اور یہ یہ باتیں مجھ سے کہہ کر گئے ہیں۔

اس کے بعد حسن سے امام نے فرمایا:

کہ میاں تم تو پڑھنے میں لگے رہو میں نے کسی عالم کو بھوک سے مرتے نہیں دیکھا ہے۔

حسن کا بیان ہے کہ امام نے اس دن سے میرے لئے کچھ ماہوار اس وقت تک مقرر کر دیا جب تک میں روزگار سے نہ لگ گیا۔ ص ۲۶۴ موفق ج ۱)

واقعہ یہ ہے کہ ہر دل عزیزی کہئے یا محبوبیت عامہ کے حصول کے لئے جود وسخا بذل وکرم سے زیادہ کارگر بے خطا نسخہ دنیا میں نہیں پایا گیا ہے اس قسم کے نفوس سے ان ہی لوگوں کو محبت واخلاص نہیں ہوتا جنہیں ان سے کچھ نفع پہنچا ہو بلکہ تجربہ تصدیق کرتا ہے اور مشاہدہ بتاتا ہے کہ ان کی محبوبیت عام ہوتی ہے نفع اٹھانے والوں کی محبت کی وجہ تو ظاہر ہے کہ آدمی فطرۃً احسان کا بندہ ہے لیکن ذاتی طور پر مستفید ہونے کا اخیا سے جنہیں موقعہ نہیں ملتا ان کی محبت کی نفسیاتی وجہ ممکن ہے لوگوں کی غیر شعوری امید اور توقع ہو سمجھا یہ جاتا ہے کہ ضرورت اگر پڑی تو سخی کی اس صفت سے میں بھی نفع اٹھا سکتا ہوں اور یہی توقع قلوب کو ان لوگوں کی طرف مائل کر دیتی ہے۔

حضرت امام کے جود وسخا کے متعلق شقیق بلخی کی ایک روایت

سینکڑوں واقعات میں سے بطور نمونے کے حضرت امام کے جود وکرم کے چند نمونے جو اوپر پیش کئے گئے ہیں ان کو پیش نظر رکھنے کے بعد اس کا سمجھ لینا بالکل آسان ہے کہ خلق اللہ کے غیر معمولی اعتماد کے حاصل کرنے میں حضرت امام کو کامیابی کیوں حاصل ہوئی تھی جس قسم کے واقعات تاریخوں میں امام کے متعلق درج کئے گئے ہیں میں تو پڑھ کر حیران ہو جاتا ہوں سوچتا ہوں کہ اعتماد اور بھروسہ کے سوا اس قسم کے آدمی کے ساتھ آخر لوگ کوئی دوسرا تعلق قائم ہی کیسے کر سکتے تھے خیال تو کیجئے کسی معمولی آدمی کی نہیں بلکہ مشہور شیخ الصوفیہ حضرت شقیق بلخی کی یہ چشم دید روایت نقل کی جاتی ہے کہتے تھے کہ میں ایک دن ابوحنیفہ کے ساتھ ساتھ جا رہا تھا اتنے میں دور سے آتا ہوا ایک آدمی ایسا معلوم ہوا کہ ہماری طرف آ رہا تھا لیکن ہم لوگوں کو دیکھ کر ایک دوسری گلی میں مڑ گیا شقیق فرماتے ہیں کہ میں نے اس کی طرف توجہ نہیں کی لیکن امام ابوحنیفہ کو دیکھا کہ اسی کو خطاب کر کے پکار رہے ہیں۔

جس راستہ پر تم آرہے تھے اسی پر چلے آؤ دوسری راہ تم نے کیوں اختیار کی۔
سننے کے ساتھ راہ گیر ٹھہر گیا اتنے میں ہم لوگ اس کے قریب پہنچ گئے دیکھا کہ کچھ شرمایا شرمایا سا کھڑا ہوا ہے اور میں نے دیکھا کہ امام اس سے کہہ رہے ہیں کہ تم نے اپنی راہ بدلی کیوں؟ جواب میں اس نے کہا کہ دس ہزار کی رقم آپ کی مجھ پر باقی ہے ادا کرنے میں غیر معمولی تاخیر مجھ سے ہوگئی ہے اور اس وقت تک مجھ میں ادا کرنے کی صلاحیت پیدا نہیں ہے آپ کو دیکھ کر مجھے سخت ندامت ہوئی نظر برابر کرنے کی استطاعت نہیں رکھتا تھا اس لئے دوسری گلی کی طرف مڑ گیا تھا شقیق کہتے ہیں کہ ادھر وہ بیچارا تو اپنا عذر پیش کر رہا تھا اور امام کو دیکھتا ہوں کہ اس سے فرما رہے ہیں:

”سبحان اللہ بس اتنی سی بات کے لئے تم نے مجھے دیکھ کر راستہ بدل دیا اور مجھ سے چھپنے کی کوشش کی۔“

خیر یہاں تک تو کوئی بات نہیں ہے آگے سنئے شقیق ہی راوی ہیں کہ میں نے اس کے بعد سنا کہ امام دس ہزار کے اسی قرض دار کو کہہ رہے ہیں:

قد وهبته منی کله. میں نے اپنی طرف سے جاؤ یہ رقم تمہیں ہبہ کردی۔
(ص ۲۶۰ ج ۱)

کیا مطلب؟ دس بیس روپیہ نہیں دس دس ہزار کے قرض کو بغیر کسی دغدغہ سوچ بچار کے ایک قلم معاف فرما دیا گیا اور قرض ہی کی معافی کی حد تک بات ختم نہیں ہوگئی۔ حضرت شقیق ہی کا بیان ہے کہ اس کے بعد امام صاحب خود ہی ان الفاظ میں اس قرضدار سے معافی چاہ رہے تھے کہ:

”بھائی! مجھے دیکھ کر تمہارے دل میں ندامت یا دہشت کی جو کیفیت پیدا ہوئی، خدا کے لئے اس کو معاف کر دو۔“

وہی نہیں جن کے ساتھ امام نے بالکل خلاف توقع برتاؤ فرمایا بلکہ میں تو سمجھتا ہوں کہ اس زمانہ میں جس کسی نے اس قصے کو سنا ہوگا اضطراراً امام کی طرف سے اس کے دل میں جو کیفیت پیدا ہوئی ہوگی اس کا اندازہ اسی سے کیجئے کہ آج بھی میں نہیں سمجھتا کہ

اس واقعہ کو سن کر سننے والے میں سنسنی نہ پیدا ہو جاتی ہو میں دوسروں کی تو نہیں کہتا خود میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

اب آپ ہی بتایئے کہ اپنی امانتوں کو محفوظ کرانے کے لئے لوگوں کو امام سے زیادہ بہتر آدمی اور کون مل سکتا تھا اور پھر اس قسم کا سلوک ان کا کسی خاص طبقہ کے ساتھ محدود نہیں تھا۔ فاسق ہو، فاجر ہو، حتی کہ عقیدے کے اتحاد کی بھی امام کے حسن سلوک کے لئے شرط نہ تھی کون نہیں جانتا کہ امام ایک پختہ اعتقاد سنی تھے لیکن کچھ دیر پہلے گزر چکا کہ ایک شیعہ کو حضرت امام فارسی میں فرماتے: ؏ توبہ! نہ بد مردست ایں

حلم:

امام کی یہی ہر دل عزیزیاں جو ان کے ان قدرتی کمالات کے لازمی نتائج تھے بعضوں کا ان کو محسود بھی بنا دیا تھا حاسدوں کا گروہ شہر کے غنڈوں شہدوں کو آمادہ کر کے کبھی کبھی امام کو بری بھلی باتیں بھی سنوایا کرتا لیکن ایسی کوئی روایت نہیں ہے جس سے معلوم ہو کہ کبھی امام نے ان لوگوں کے ساتھ سختی کا برتاؤ کیا ہو سوانح نگاروں نے معتبر ذرائع سے اس قسم کے بیسیوں واقعات کا تذکرہ کیا ہے بعض واقعات اس سلسلہ میں عجیب اور دلچسپ ہیں۔ لکھا ہے کہ ان ہی غنڈوں میں سے ایک شخص نے امام کا برسر راہ سخت سست کہتے ہوئے پیچھا کیا چاہتا تھا کہ امام بھی اس کی یاوہ گوئیوں کے جواب میں کچھ کہیں لیکن بجائے اس کے سر جھکائے امام صاحب گھر ہی کی طرف بڑھتے رہے حتی کہ گھر میں گھس گئے غنڈا امام کی اس حرکت پر کچھ کھسیانا سا ہو کر کہنے لگا کہ

"کیا مجھے کوئی کتا فرض کر لیا ہے کہ بھونک رہا ہوں اور جواب بھی نہیں دیتے ہو۔"

کہتے ہیں کہ اس کے کہنے پر ہلکی سی آواز اندر سے آئی کہ اور کیا سمجھوں؟ اس قسم کے ایک واقعہ میں بیان کیا گیا ہے کہ امام جب اپنے گھر کے دروازے پر پہنچ گئے تب خطاب کر کے اس سے فرمانے لگے۔

"لو بھائی! اب میری حویلی آ گئی اندر چلا جاؤں گا، جی اگر نہ بھرا ہو تو میں ٹھہر

جا تا ہوں‘ اپنی بھڑاس اچھی طرح نکال لو۔“

ظاہر ہے کہ اس قسم کے جوابوں کا جو نتیجہ ہوسکتا ہے وہ امام کے سامنے بھی پیش آتا تھا یعنی بسا اوقات اس قسم کے لوگ اپنے کیئے پر نادم ہو کر تائب ہو گئے۔

پڑوسیوں کے ساتھ حُسنِ سلوک:

اسی قسم کے ایک شرابی کا قصہ عام طور پر مشہور بھی ہے موچی تھا امام کے پڑوس میں رہتا تھا۔ دن بھر بازار میں کام کرتا‘ لوٹتے ہوئے پینے پلانے کا سامان لے کر گھر آتا رات بھر نشہ کی حالت میں بکواس لگایا کرتا مشہور ہے کہ اس شعر کو بکثرت نشہ کی حالت میں پڑھتا۔

اضاعونی وانی حتی اضاعوا لیوم کریھۃ وسدار ثغر

”یعنی لوگوں نے مجھے ضائع کر دیا اور کیسے گبرو جوان کو ضائع کیا کٹھن دنوں میں اور ملک کی سرحدوں کی حفاظت میں جو کام آسکتا تھا۔“

محلہ دار اس کی ان ہنگامی آرائیوں سے تنگ تھے آخر پولیس ایک دن اس موچی کو پکڑ کر لے گئی اور بے چارا جیل چلا گیا رات جب ہوئی تو امام کے کانوں میں اس کی آواز حسب دستور نہ آئی‘ دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ قید ہو گیا کہتے ہیں کہ اپنے اس فاسق و فاجر پڑوسی کی اس مصیبت سے امام اس درجہ متاثر ہوئے کہ خلاف دستور اپنے بلند مقام کا خیال کیئے بغیر سیدھے کچہری پہنچے کچہری میں کھل بلی مچ گئی کہ امام ابوحنیفہ آج یہاں کیسے آگئے ہیں حاکم کو اطلاع ہوئی اجلاس چھوڑ کر باہر نکل آیا اور جیسا کہ چاہیے بڑی تعظیم و توقیر کے ساتھ اندر لے گیا امام سے اس نے پڑھا بھی تھا بہرحال تعجب سے اس نے پوچھا کہ حضرت کے قدم رنجہ فرمانے کی وجہ کیا ہوئی سن کر بے چارے کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب امام نے فرمایا کہ میرے محلہ کا ایک موچی جو میرا پڑوسی ہے پولیس والوں نے اس کو گرفتار کر کے جیل بھجوا دیا ہے میں حاضر ہوا ہوں کہ میری ذمہ داری پر اسے اب کی رہا کر دیا جائے بھلا اس میں عذر کی گنجائش ہی کیا ہوسکتی تھی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ موچی جب جیل سے باہر آیا تو دیکھا گیا کہ امام اس کا ہاتھ پکڑے ہوئے ہیں اور فرمائے جاتے ہیں:

"کیوں بھائی! میں نے تو تمہیں ضائع ہونے نہیں دیا۔"

موچی بیچارہ آنکھیں جھکائے کہہ رہا تھا۔

لا یا سیدی ومولای لا ترانی بعد الیوم افعل شیئا تتاذی به	نہیں میرے سردار! میرے آقا! آج کے دن سے آپ مجھے ایسی حرکتوں میں جتلا نہ پائیں گے جن سے آپ کو اذیت ہوتی تھی۔

کہتے ہیں کہ توبہ میں وہ سچا ثابت ہوا امام صاحب کے حلقہ میں آنے لگا۔

الی ان صارمن فقهاء الكوفة	تا ایں کہ کوفہ کے فقہاء میں شمار ہونے لگا۔

(ج ا ص ۲۲۵)

ذمیوں کے ساتھ حسن سلوک:

اور یہ موچی تو خیر بہرحال مسلمان تھا' ہم تو دیکھتے ہیں کہ حضرت امام کے ابر کرم و حسن سلوک کی بارش کے لیے اسلام کی شرط بھی نہ تھی۔ ابن بشکوال کے حوالہ سے صاحب معجم نے نقل کیا ہے کہ امام ابوحنیفہ نے:

شفع للذمی عندالمنصور خمس مرات فی یوم واحد اربع مرات برسوله والخامسة بنفسه حتی قضيت مصلحته. (ص ۱۶۸ معجم ج ۲)	ایک ذمی (یعنی غیر مسلم جو اسلامی حکومت کا باشندہ تھا اس کی ابوجعفر منصور عباسی خلیفہ کے پاس ایک دن میں پانچ دفعہ سفارش کی چار دفعہ تو امام نے اپنے قاصد کو بھیج کر سفارش کی پانچویں دفعہ خود گئے اور سفارش کی تا ایں کہ اس کا کام ہو گیا۔

ذمی کی سفارش اور وہ اپنے اعدی عدو ابوجعفر منصور کے دربار میں حقیقت یہ ہے کہ یہ امام ہی کا کام ہو سکتا ہے نفسیاتی اصول پر سوچنا چاہیئے کہ اس قسم کی شخصیت کے ساتھ عوام میں نیاز و عقیدت کے جذبات جس حد تک بھی پیدا ہوں کیا ان پر تعجب کرنا چاہیے۔

عفوو درگذر:

خدا جانے اس زمانہ میں لوگ ان باتوں پر اعتماد کرنے کے لیے تیار بھی ہوں یا نہ

ہوں۔ مگر ایسے روات مثلاً امام الائمہ ابوبکر زنجری کے حوالہ سے امام کے سوانح نگاروں نے یہ روایت نقل کی ہے کہ

ایک صاحب نے امام صاحب سے آ کر کہا کہ حضرت مجھے ایک ضرورت پیش آ گئی تھی۔ معاف کیجئے گا میں نے آپ کی طرف سے آپ پر اعتماد کرتے ہوئے فلاں تاجر کے نام رقعہ لکھا کہ تیس اشرفیاں بطور قرض کے بھیج دو۔ اس نے بھیج دیں میں نے اس کو لے لیا ہے۔

کہتے ہیں کہ امام نے ان صاحب کی یہ بات سن کر بجائے بگڑنے اور خفا ہونے کے کہا تو یہ کہا کہ

"بھائی! میں نہیں سمجھتا کہ کسی سے نفع اٹھانے کا یہ طریقہ بھی ہوسکتا ہے۔ لیکن اگر آپ کو اس سے نفع پہنچا ہے تو مبارک ہو۔" (موفق ص ۲۶۵)

اسی قسم کی ایک روایت امام ابوالمحاسن مرغینانی کے حوالہ سے بھی مورخین نے درج کی ہے حاصل جس کا یہ ہے کہ

جرجان کے گورنر کے نام امام صاحب کے کسی ملنے والے نے ایک خط امام صاحب کی طرف سے لکھا جس میں چار ہزار درم کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ کہتے ہیں کہ خط پاتے ہی گورنر نے اسی وقت چار ہزار کی رقم روانہ کر دی۔ (ص ۲۶۵ ج ۲)

اس کی خبر بھی جب امام کو دی گئی تو وہی فرمایا جو پہلے شخص سے کہا تھا اور میں تو کہتا ہوں کہ قطع نظر اس فراخ دلی کے ثبوت کے جو ان واقعات کا لازمی نتیجہ ہے۔ ان ہی واقعات سے اس "اعتماد" کا حال بھی معلوم ہوتا ہے جو ادنیٰ اور اعلیٰ طبقات میں آپ کو حاصل تھا، آخر خیال کرنے کی بات ہے کہ محض ایک رقعہ پر تیس تیس اشرفیاں اور ان سے بھی زیادہ ایک صوبہ کے والی کا چار ہزار کی خطیر رقم کا حوالہ کر دینا کیا معمولی اعتماد کی شہادتیں ہیں۔

حسن معاملہ:

میں نے کچھ دیر پہلے امام صاحب کی تجارت کی یہ خصوصیت بیان کی تھی کہ چیزوں کی قیمت ان کے پاس مقرر تھی اسی سلسلہ میں لوگوں نے بیان کیا ہے کہ ایک دن اتفاق سے امام صاحب اپنی دکان میں موجود نہ تھے تلامذہ جو آپ کی دکان میں کام کرتے تھے ان میں کسی صاحب نے ایک گاہک کو مقررہ دام سے زیادہ میں ایک کپڑا دے دیا۔ امام صاحب جب آئے اور فروخت کے حساب کو جب دیکھا تو اس کپڑے کی مقررہ قیمت سے معلوم ہوا کہ دام زیادہ لے لیے گئے ہیں طالب علم کی طرف آپ نے غیظ کی نگاہ سے دیکھا۔ سننے والوں کا بیان ہے کہ غصہ میں فرما رہے تھے۔

تغر الناس وانت معی فی دکانی (ص ۱۹۹ ج ۱) — تم لوگوں کو دھوکے دیتے ہو، حالانکہ دکان میں میرے ساتھ رہتے ہو۔

کہتے ہیں وہ خریدار مدینہ منورہ کا باشندہ تھا، کپڑا خرید کر وہ مدینہ جا چکا تھا۔ امام کو یہ خیال رہا تھا کہ دھوکے سے یہ دام اس سے وصول کئے گئے ہیں۔ یعنی اس نے تو اس اعتماد پر کہ امام کی دکان میں ہر چیز کی مقررہ قیمت ہوتی ہے جو کچھ اس سے مانگا گیا اس نے دے دیا، اگر اس کو یہ اعتماد نہ دلایا جاتا تو یقیناً کچھ کم کرانے کی کوشش کرتا۔ بہر حال قصہ کہاں تک صحیح ہے راویوں کا بیان ہے کہ امام نے خاص کر کے مدینہ کا سفر اختیار کیا اور معاملہ کو اس سے صاف کیا (یہ واقعہ آپ کے مناقب کی عام کتابوں میں پایا جاتا ہے)

اور یہ تو خیر ایک اصول کی پابندی کا اقتضا تھا۔ ان ہی کتابوں میں لکھا ہے کہ بسا اوقات لوگ اپنا مال امام کی دکان پر بیچنے آتے۔ بیچنے والا اپنے نزدیک نفع وغیرہ رکھ کر ایک دام بتاتا۔ لیکن خود امام صاحب کے نزدیک چیز زیادہ دام کی اگر ہوتی تو بیچنے والے سے فرماتے کہ نہیں تمہارا مال زیادہ قیمت کا ہے، اور اصرار کر کے اپنی مشخصہ قیمت کے لینے پر اس کو مجبور کرتے۔[1]

---

[1] صحابہ میں یہ حال حضرت جریر بن عبداللہ البجلی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا بیان کیا جاتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے وہ یہ حدیث روایت کرتے یعنی فرماتے۔ آنحضرت ﷺ نے بعد ←

بہر حال امام کی زندگی کے ان واقعات کے دہرانے سے میرا مقصد یہ ہے کہ امانتوں اور ودیعتوں کے سلسلہ میں مورخین نے جن بڑی بڑی رقموں کا ذکر کیا ہے۔ بہ ظاہر ان پر تعجب ہوتا ہے کہ ایک عام خوش باش شہری پر لوگوں کو اتنا اعتماد کیسے تھا۔ جو اتنی بڑی بڑی رقمیں ان کے پاس رکھواتے تھے۔

لیکن میں خیال کرتا ہوں کہ جن واقعات کا ذکر آپ کے سامنے کیا گیا ہے ان کو پیش نظر رکھنے کے بعد ان شاء اللہ تعجب باقی نہیں رہے گا۔ جس شخص کے معاملات کی صفائی عام ہمدردی، سیر چشمی کا یہ حال ہو، اگر دنیا اس کی حفاظت وضمانت میں اپنے مال کو جمع کراتی تھی تو اس کے سوا ان حالات میں اور ہو ہی کیا سکتا تھا۔

اور یہ تو خیر اعتماد واطمینان کے اخلاقی وجوہ ہو سکتے ہیں، مختلف قرائن وشواہد کی روشنی میں ایک بات میری سمجھ میں جو آتی ہے، اگر وہ صحیح ہے تو علاوہ اخلاقی اعتماد کے ایک بڑی اہم وجہ قانونی اعتماد کی بھی نکل آتی ہے اور اسی سے یہ بھی سمجھ میں آ جائے گا کہ ان ودیعتوں کی نوعیت کیا تھی؟ میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں اس کے عرض کرنے سے پہلے فقہ حنفی کے ایک قانون کو سمجھ لینا چاہیے۔

امانتوں کے متعلق ایک شرعی توضیح:

اتنا تو شاید لوگ جانتے ہوں گے کہ علاوہ فصل خصومات اور عدل وانصاف کے مسلمانوں کے قاضیوں کے متعلق چند دوسرے کام بھی اسلامی عہد میں سپرد کئے جاتے

لے مسلمان ہونے کے مجھ سے ایک دفعہ اور بیعت اس بات کی لی کہ ہر مسلمان کی بہی خواہی کروں گا (النصح لکل مسلم) اسی عہد کے ایفاء کی ایک شکل یہ بھی تھی کہ کسی مسلمان سے کوئی چیز اگر خریدتے اور دام وہ اتنے بتاتا جو ان کے نزدیک چیز کی خوبیوں کے لحاظ سے کم ہوتے تو اس کو ہدایت کرتے کہ اتنے دام کم ہیں میرے نزدیک صحیح قیمت اس کی یہ ہے۔ بعض بعض دفعہ ایک ایک ہزار کی چیز کئی کئی ہزار تک اسی ردوقدح میں پہنچ گئی۔ مگر دنیا اب ان روایتوں کو افسانہ سے شاید زیادہ خیال نہ کرے۔ ۔ م قاعدہ تو یہی ہے کہ خریدار قیمت کو کم کرانے کی کوشش کرتا ہے لیکن جن لوگوں نے اپنی کوشش کا محور صرف اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایتوں کی تعمیل قرار دے رکھا تھا وہ اس عام دستور کی پابندی نہ کرتے تھے۔ ع: للناس فیما یعشقون مذاهب امام رحمۃ اللہ علیہ کا مذکورہ بالا طرز عمل مسلمانوں کے اسی بہی خواہی پر مبنی تھا۔

تھے۔ جن میں ایک کام یہ بھی تھا کہ اپنے اپنے علاقہ کے یتیموں کی جائداد کو قاضی اپنی نگرانی میں حکومت کی طرف سے لے لیا کرتا تھا۔ اس سلسلہ میں دفعات کا ایک طویل سلسلہ ہے جس کی تفصیل فقہ کی کتابوں میں مل سکتی ہے۔ مجھے اس وقت اسی سلسلہ کے ایک مسئلہ سے غرض ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ یتیموں کا جو مال قاضی کی امانت میں رکھا جاتا ہے اس مال کی حفاظت کی ایک صورت یہ بھی بتائی گئی ہے کہ

یقرض القاضی اموال الیتامی. (قدوری و ھدایہ وغیرہ) — قاضی یتیموں کے مال کو قرض پر لگا دیا کرے۔

وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ صرف بد امانت اگر مال رکھا جائے گا تو نقصان ہو جانے کی صورت میں مثلاً چور چرا کر لے بھاگے یا اس قسم کے حادثوں کا شکار ہو جائے تو قانوناً اس کا معاوضہ نہیں لیا جا سکتا، کیونکہ مد امانت میں جو چیز رکھی جاتی ہے اس کو قانوناً اس چیز کا ضامن نہیں قرار دیا گیا ہے۔ یعنی نقصان ہو جانے کی صورت میں امین سے معاوضہ یا تاوان وصول نہیں کیا جا سکتا لیکن بجائے امانت کے وہی مال بطور قرض کسی کو دے دیا جائے تو قرض لینے والا بہر حال اس مال کا ضامن بن جاتا ہے اسی لیے یتیموں کے حقوق کو اتفاقی آفات و حوادث سے محفوظ کرنے کی یہ صورت نکالی گئی ہے کہ وصولی کے متعلق ممکنہ حد تک اپنے آپ کو مطمئن کر لینے کے بعد یتیموں کے اس مال کو جو قاضی کے پاس بد امانت رکھا جاتا ہے۔ قرض پر لگا دیا کرے۔ اصلی فائدہ تو اس طریقہ کار کے اختیار کرنے میں یتیموں ہی کا مقصود ہے۔ لیکن ضمناً عام مسلمانوں کے لیے بغیر سودی قرض کی ایک صورت محکمۂ قضا میں نکل آتی تھی۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا اس مسئلہ کے مختلف دقیق پہلوؤں کے متعلق فقہ کی کتابوں میں مسائل لکھے گئے ہیں لیکن میرے لیے مسئلہ کا صرف اتنا جز کافی ہے۔ یعنی حاصل اس مسئلہ کا یہی نکلتا ہے کہ امانتوں کو حوادث و آفات سے بچانے کی صورت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے یہ نکالی تھی کہ بجائے امانت کے ان کو قرض کی شکل عطا کر دی جائے۔ ایسی صورت میں وہ شخص جس کے پاس امانت رکھوائی جاتی ہے غیر ضامن امین

نہیں بلکہ ضامن قرض دار بن جاتا ہے۔ یعنی نقصان ہو جانے کی صورت میں ایک ایک پیسے کے ادا کرنے کا وہ ذمہ دار ہے۔

خیال یہی گذرتا ہے کہ جب امام نے یتیموں کی حفاظت کا یہ قانونی طریقہ پیدا کیا تھا، تو عام مسلمانوں کی جو امانتیں امام کے پاس رکھوائی جاتی تھیں ان امانتوں کے متعلق بھی اگر حفاظت کے اسی طریقہ کو امام نے اختیار فرمالیا ہو تو جہاں تک عقل کا اقتضا ہے یہی ہونا بھی چاہئے۔

میرا مطلب یہ ہے کہ امانت رکھنے والوں سے صرف اتنی بات کہہ دینی کہ کسی کاروبار میں اگر اس رقم کو لگاؤں تو مجھے اس کی اجازت ہونی چاہئے۔ گویا ایسی اجازت کو مال کی حفاظت کا صلہ قرار دیا جائے تو یہ کہنے کے ساتھ ہی امانت بجائے امانت کے فوراً قرض کی صورت اختیار کرے گی۔ خواہ لفظ قرض کا استعمال کیا جائے یا نہ کیا جائے۔ حتیٰ کہ یہ مسئلہ ہے کہ مضاربتِ (یعنی محنت ایک کی اور سرمایہ دوسرے کا، اسی معاملہ کو مضاربت اور قراض کہتے ہیں) کا لفظ بول کر اگر سرمایہ والا کہہ دے کہ مجھے نفع سے بحث نہیں، صرف میرا اصل سرمایہ واپس ہونا چاہئے۔ یعنی مسئلہ کی صورت یہ ہو کہ

شرط رب المال للمضارب کل الربح کان المال قرضاً. (خلاصه اشباه اتحاف البصائر ص ۲۷۶)	سرمایہ دار اپنے سرمایہ کے کل منافع کو محنت والے (مضارب) کے لیے اگر مختص کردے یعنی اسی شرط پر مضاربت کا معاملہ طے پائے تو یہ سرمایہ مضارب کے ذمہ قرض قرار دیا جائے گا۔

جہاں تک میرا خیال ہے زیادہ تر امام صاحب کی ودیعتوں اور امانتوں کی یہی نوعیت معلوم ہوتی ہے۔ اور بہ ظاہر امام صاحب کی اس وسیع تجارت کا راز یہی تھا۔ اس غیر معمولی اعتماد کی بدولت جو خلق اللہ میں ان کو حاصل تھا۔ بکثرت لوگ آپ کی حفاظت میں اپنے سرمایے کو دے دیتے تھے۔ یہ خیال کر کے صرف مد امانت میں رکھنے کی وجہ سے حفاظت کی ضمانت کی کوئی صورت پیدا نہیں ہوتی۔ امام کاروبار کرنے کی اجازت عموماً امانت رکھانے والوں سے لے کر اس ضمانت کو پیدا کر کے ایک طرف ان کے مال کی

حفاظت کی انتہائی اطمینان بخش صورت پیدا کر لیتے تھے۔ اور دوسری طرف ان کو وسیع سے وسیع پیانے پر تجارت کرنے کے لیے اس راہ سے بے تحاشہ سرمایہ مل جاتا تھا۔

حضرت امام قاضی ابن ابی لیلیٰ کی عدالت میں:

شاید امام کے اسی طریقہ کو دیکھ ان کے ہم عصر رقیب عالم ابن ابی لیلیٰ جن کا تفصیلی حال آگے آ رہا ہے وہ جہاں امام پر الزام عائد کرانے کی مختلف ترکیبیں اختیار کرتے تھے۔ جن میں بعض تو ناگفتہ بہ ہیں ان ہی ترکیبوں میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک دفعہ کسی شخص سے امانت امام کے یہاں رکھوائی گئی اور یہ امانت قاضی ابن ابی لیلیٰ ہی کے توسط سے سپرد کی گئی۔ لکھا ہے کہ توڑے پر قاضی صاحب نے اپنی مہر وغیرہ بھی لگائی، اور یہ شرط لگا دی گئی کہ اس کو امانت ہی کی مد میں رکھا جائے۔ قاضی صاحب کی یا امانت رکھوانے والے کی یہ بدگمانی تھی کہ باوجود اس شرط کے حسب عادت امام اس سے ضرور استفادہ کریں گے۔ اور یہی گرفت کا موقعہ ہوگا کہ صاحب امانت کی اجازت کے بغیر اس سے استفادے کا تم کو کیا حق تھا۔ اس کے بعد جیسا کہ کتابوں میں لکھا ہے کارروائی یہ کی گئی کہ ابن ابی لیلیٰ جو اس زمانہ میں کوفہ کے قاضی تھے۔ ان کے اجلاس میں ایک صاحب نے یہ دعویٰ دائر کر دیا۔ فلاں بن فلاں کی جو امانت ابوحنیفہ کے پاس رکھوائی گئی تھی۔

دفع الی ابنه یتجر. امام نے اپنے صاحبزادے کے حوالہ امانت کی یہ رقم تجارت کرنے کے لیے کر دی ہے۔

قاضی صاحب تو فکر ہی میں تھے۔ فوراً امام کے نام وارنٹ طلبی کا جاری ہوا، امام حاضر ہوئے دعویٰ سنایا گیا۔ ظاہر ہے کہ امام جیسی محتاط ہستی اس امانت میں کیسے تصرف کر سکتی تھی۔ آپ نے صاف انکار کیا اور کہا کہ اپنا آدمی بھیج کر دیکھ لیجئے۔ آپ ہی کی تو مہر توڑے پر لگی ہوئی ہے۔ اگر تصرف اس امانت میں ہوتا تو مہر کا ٹوٹ جانا یقینی تھا قاضی ابن ابی لیلیٰ سے امام نے کہا کہ اپنا آدمی میرے ساتھ کیجئے۔ چل کر دیکھ لے کہ مہر آپ کی لگی ہوئی ہے یا نہیں۔ آدمی بھیجا گیا۔ اس کا بیان ہے کہ اس مکان میں جہاں امانت کے رقوم تھے، بے شمار تھیلیاں بھری ہوئی تھیں۔ آخر امام نے تلاش کر کے وہ توڑا نکالا دیکھنے

والے کا بیان ہے۔

فاذا هی مختومة بهنیتها (ص ۲۱۹)　　بجنسہ اپنی مہر کے ساتھ توڑا رکھا ہوا تھا۔

واپس لوٹ کر قاضی ابن ابی لیلیٰ کے اجلاس میں اس نے جو رپورٹ پیش کی اس کے الفاظ یہ تھے۔

نقد رأیت الودیعة بعینها مختومة.　　میں نے دیکھا کہ جس امانت کے متعلق تصرف بیجا کا اتہام امام پر لگایا گیا ہے وہ بجنسہ مہر توڑے کے ساتھ موجود ہے۔

خیر یہ تو اس کی شہادت اس خاص امانت کے متعلق تھی جس کے معائنہ کے لیے عدالت نے اس کو مقرر کیا تھا لیکن اسی کے ساتھ اپنی رپورٹ کے آخر میں امام کی برأت کے لیے اپنے جس مشاہدہ کو اس نے پیش کیا ہے وہ خاص طور پر قابل توجہ ہے۔ یعنی آخر میں اسی رپورٹ کے یہ بھی تھا کہ

وعنده من الاموال والودائع مالایحتاج الی هذه. (ص ۲۱۹)　　امام ابوحنیفہ کے ہاں تو مالوں کی اور امانتوں کی اتنی کثرت ہے کہ ان کو اس معمولی رقم میں تصرف کرنے کی ضرورت نہ تھی۔

گو اس کا مقصود تو ان الفاظ کے اضافہ سے یہ تھا کہ جس کے پاس کاروبار میں لگانے کے لیے اتنا بڑا عظیم سرمایہ موجود ہو، جسے دیکھ کر وہ امام کے خزانہ میں آیا تھا ایسے آدمی کو اس کی کیا ضرورت ہوگی کہ خواہ مخواہ خیانت سے کام لے کر اپنے بیٹے کو اسی کاروبار کے لیے ایسی چیز دے جس کے دینے کی نہ شرعاً اسے اجازت تھی اور نہ قانوناً۔ لیکن ہمارے لیے سچ پوچھئے تو یہ بھی ایک قسم کا اس دعویٰ کے ثبوت کا گویا وثیقہ ہے کہ عام ودائع اور امانتیں جو امام کے پاس لوگ رکھتے تھے ان کے متعلق تصرف کرنے اور اپنے کاروبار میں لگانے کی اجازت امانت رکھوانے والوں سے حضرت امام لے لیا کرتے تھے۔ اگر واقعہ کی یہ صورت نہ تھی تو ''الاموال'' کے ساتھ ''الودائع'' کے لفظ کا وہ ہرگز اضافہ نہ کرتا لیکن چونکہ اس سے واقف تھا کہ امام کے یہاں کی عام ودیعتوں

اور امانتوں کی نوعیت یہی ہوتی ہے۔ اسی لیے اس نے بیان کیا کہ کاروبار میں لگانے کے لیے جس کے پاس امانتوں اور ودیعتوں کا اتنا بڑا عظیم ذخیرہ ہو اسے قطعاً اس کی ضرورت نہ تھی کہ اس امانت میں دخل اندازی کرے جس کے متعلق اس کی اجازت امانت دار نے نہیں دی تھی۔

بلکہ میں تو کہتا ہوں کہ امام پر یہ دعویٰ جو دائر کیا گیا تھا کہ اس ''مختومہ امانت'' کو بھی تجارت میں لگانے کے لیے اپنے صاحبزادے کے حوالہ امام نے کی ہے۔ یہ دعویٰ بھی اسی کی دلیل ہے کہ لوگوں کو عام طور پر یہ معلوم تھا کہ امانتوں اور ودیعتوں کو تجارتی کاروبار میں لگانے کے چونکہ امام عادی ہیں اس لیے حسب عادت انھوں نے اس امانت کے ساتھ بھی یہی برتاؤ کیا ہوگا۔ لیکن بے وقوفوں کو یہ معلوم نہیں تھا کہ حضرت امام جیسا محتاط آدمی امانتوں کی مختلف نوعیتوں میں فرق کئے بغیر حسب دستور سب کے ساتھ ایک ہی سلوک کیسے کر سکتا تھا۔ اور سوچا جائے تو رپورٹ کے آخری الفاظ سے ایک تاریخی شہادت اس بات کی بھی مل جاتی ہے کہ حضرت امام کے پاس ایسے اموال وودائع کا بہت بڑا ذخیرہ رہتا تھا جن سے اپنے تجارتی کاروبار میں وہ مستفید ہوتے تھے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ائمۂ احناف میں امانتوں کے متعلق حفاظت وضمانت کے اس طریقے کے اختیار کرنے کا عام رواج تھا الخطیب نے تاریخ بغداد میں اگرچہ اپنی عادت کے مطابق قاضی ابو یوسف کے مثالب اور ان کی مذمت میں یہ روایت نقل کی ہے کہ ایک صاحب نے قاضی ابو یوسف پر اعتراض کرتے ہوئے کہا کہ اس شخص سے حدیث کی روایت اس لیے جائز نہیں ہے۔

انه كان يعطى اموال اليتامى مضاربة ويجعل الربح لنفسه.	یتیموں کا مال مضاربت پر لوگوں کو دیتا ہے اور نفع اس کا خود لیتا ہے۔

(ص ۵۸۲ ج ۱۴)

سچ کہا ہے کسی نے کہ ''بداندیشی'' ہمیشہ ''ہنر'' کو ''عیب'' کی شکل دے دیتی ہے۔ اگر یہ واقعہ ہے اور واقعہ ہونے میں اس کے شبہ بھی نہ کرنا چاہئے، کیونکہ خطیب نے

اس روایت کو یزید بن ہارون جیسے محدث جلیل وثقہ کی طرف منسوب کیا ہے۔ اسی لیے میں سمجھتا ہوں کہ انھوں نے خواہ مخواہ ایک غلط بات قاضی صاحب کی طرف منسوب نہ کی ہوگی۔ مگر یہ بات کہ ان کا یہ فعل یتیموں کے حق میں مفید تھا یا مضر افسوس ہے کہ عدم تفقہ کی وجہ سے وہ یہ نہ سمجھ سکے۔ بلکہ جیسے ایک عامی آدمی اس کو سن کر قاضی صاحب کے متعلق بدگمانی میں مبتلا ہو سکتا ہے۔ باوجود بڑے آدمی ہونے کے یزید بن ہارون بھی اسی غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے۔ میں عرض کر چکا ہوں کہ صرف ''امانت'' کی شکل میں اگر یتیموں کے مال کو رکھا جائے تو ضائع ہو جانے کی صورت میں تلافی کی کوئی قانونی شکل باقی نہیں رہتی بجز اس کے کہ رودھو کر آدمی بیٹھ جائے اور کچھ نہیں کر سکتا۔ اسی طرح اگر یتیموں کے ان اموال کو بطور مضاربت کے کسی کے حوالہ کر دیا جائے۔ یعنی محنت اس کی ہو، اور نفع میں محنت کرنے والا اور یتامیٰ جن کا روپیہ ہے دونوں شریک رہیں بلاشبہ نفع کی صورت میں تو یتیموں کا اس میں فائدہ ہے۔ لیکن تجارت بہر حال تجارت ہے۔

فان الربح والنقصان فی التجر

مشہور بات ہے، ہو سکتا ہے کہ تجارت میں خسارہ بھی ہو اور نفع بھی لیکن خسارے کی صورت میں نفع تو نفع کبھی اصل سرمایہ بھی ختم ہو جاتا ہے، ایسی صورت میں بیچارے یتامیٰ پر یہ کتنا بڑا ظلم ہو جائے گا یقیناً اس سے یہ بہتر ہے کہ ان کے اصل سرمایہ کو اس طور پر محفوظ کر لیا جائے کہ کم از کم اصل سرمایہ بہر حال ان کو مل جائے۔ بہ ظاہر معلوم ہوتا ہے کہ قاضی ابو یوسف یہی کرتے تھے۔ یعنی بجائے ''امانت'' کے اس کو ''قرض'' کی نوعیت دے کر کاروبار کرنے والوں کو بطور مضاربت کے دے دیا کرتے ہوں گے یعنی خود اپنے آپ کو قرض دار قرار دے کر مضارب کے حوالہ اس رقم کو کرتے تھے، ایسی صورت میں اگر نقصان بھی ہو جاتا ہوگا تو امانت نہیں بلکہ قرض ہونے کی وجہ سے یتیموں تک ان کے اصل سرمایہ کو بہر حال پہنچانا قاضی صاحب کے لیے ناگزیر تھا یعنی خود اپنے مال سے اس کی پابجائی شرعاً ان پر واجب تھی اور کھلی ہوئی بات ہے کہ نقصان کا جو ذمہ دار ہوگا، نفع کا مستحق بھی اسی کو ہونا چاہئے ورنہ نفع کا مستحق قرار دیتے ہوئے نقصان کی ذمہ داری سے

علیحدہ ہو جانا ظاہر ہے کہ یہ تو صراحتاً سود اور ربا کی شکل تھی۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ یزید بن ہارون یا ان جیسے حضرات آخر چاہتے کیا تھے۔ کیا یہ چاہتے تھے کہ یتامیٰ کے مال کو ایسی حالت میں چھوڑ دینا زیادہ بہتر ہوتا کہ کسی وجہ سے ضائع ہو جانے کی صورت میں ان کی تلافی کی کوئی شکل نہ نکلتی یا ان کا یہ خیال تھا کہ مسلمان یتیموں کو قاضی ابو یوسف سود خوار بنا دیتے بعد کو میں نے دیکھا کہ حافظ ابن حجر نے لسان المیزان میں یزید بن ہارون کے قول کو نقل کرنے کے بعد اس کی تصریح بھی کر دی ہے کہ

انه کان یقرمنها علی ذمته.	یعنی ابو یوسف یتیموں کے اموال کو خود اپنے ذمہ قرض لے کر لوگوں کو مضاربت پر دے دیا کرتے تھے۔

دیکھا آپ نے کیا یہ وہی بات نہیں ہے جسے حقیر نے عرض کیا، مگر کیا کیجئے کہ یتیموں کے اموال کی حفاظت کا ذریعہ جس طریقۂ کار کو قاضی ابو یوسف نے بنایا تھا، لوگوں نے یتیموں کے حق میں اس کو ظلم قرار دینا چاہا۔

پیداوار پر پیمانہ کبیر کا امکان:

حقیقت تو یہ ہے کہ لوگوں نے حضرت امام کی زندگی کے اس پہلو کی طرف کبھی خصوصی توجہ نہیں ڈالی۔ ورنہ نظر آ سکتا تھا کہ سود اور ربا کے بغیر حضرت امام نے بڑے سے بڑے کبیر پیمانہ پر کاروبار کے جاری کرنے کا ایک اچھا امکان اپنے عمل کے نمونہ سے پیدا کر دیا تھا کہ ایک طرف ان لوگوں کے لیے جن کے پاس مصارف کے بعد پس ماندہ سرمایہ رہ جاتا ہے ان کے لیے اپنے سرمایہ کے حفاظت وصیانت کی ایسی مستحکم قانونی ضمانت کی شکل پیدا کر دی تھی کہ چور چکار اور اسی قسم کے آفات کے کھٹکوں سے ان کا سرمایہ محفوظ ہو جاتا ہے۔ اور دوسری طرف جیسا کہ میں نے عرض کیا بڑے سے بڑے کاروبار کے لیے سرمایہ کے مہیا ہونے کی بھی صورت نکل آتی ہے۔[1]

---

[1] واقعہ یہ ہے کہ سود خواری کے اس طوفانی زمانہ میں پس ماندہ سرمایوں کی حفاظت کا مسئلہ ظاہر ہے کہ اہمیت نہیں رکھتا کیونکہ علاوہ حفاظت کی ضمانت کے موجودہ بنکوں میں ان سرمایہ داروں کو مزید براں کافی آمدنی سود کی ہوتی ہے۔ مگر بنکوں کا موجودہ نظام جس زمانہ میں نہ تھا اس وقت اس پس ماندہ بقیہ

بنک کا نظام امام نے قائم کر دیا تھا:

بلکہ ان اعداد و شمار کو جو حضرت امام کے ودائع اور امانتوں کے متعلق مورخین نے لکھے ہیں۔ جب ان کو سوچتا ہوں اور حضرت امام کی جو ساکھ قدرتاً ملک میں قائم ہو گئی تھی جب اس کو سامنے رکھتا ہوں تو یہ تصور کرنے میں مجھے کچھ مضائقہ محسوس نہیں ہوتا کہ امام کی تجارتی کوٹھی موجودہ زمانے کے بڑے سے بڑے بنک کی قائم مقامی کرتی تھی میں نے پہلے بھی کہا تھا کہ جن اعداد کا مورخین نے ذکر کیا ہے یہ ان امانتوں کی تعداد تھی جو امام کی وفات کے بعد ان کے گھر سے نکلی ایک ایسا آدمی جو ستر سال کی عمر تک پہنچ گیا ہو اور ہو وہ حضرت امام جیسا محتاط۔ یقیناً اس کے متعلق یہی باور کرنا چاہئے کہ اپنی عمر کے اس آخری زمانہ میں حتی الوسع ذمہ داریوں سے سبک دوش ہونے میں کوشش کا دقیقہ فروگذاشت نہ کیا ہوگا۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کا کاروبار اتنا پھیلا ہوا تھا کہ سمیٹتے سمیٹتے بھی آخر چار پانچ کروڑ کی امانتیں ایسی رہ گئی تھیں جو ادا نہ ہو سکیں۔ لیکن ان کے ادا کرنے کا سامان امام کر چکے تھے۔ پس اگر یہ صحیح ہے کہ وفات پانے کے بعد امام کے

لـه سرمایہ کی حفاظت کا مسئلہ کافی اہمیت رکھتا تھا بلکہ بنک کی تاریخ بتاتی ہے کہ حفاظت ہی کی اہمیت نے بتدریج بنک کی موجودہ صورت پیدا کی لیکن افسوس ہے کہ انفرادی سود خوار چوروں سے تو بنکوں نے لوگوں کو مطمئن کر دیا مگر

چوں از چنگال گرگم در ربودی ــــ ندانم عاقبت خود گرگ بودی

خود بنک کے نظام نے ایک بہت بڑے خطرناک اجتماعی ڈاکوؤں کی شکل اختیار کر لی ہے۔ یاد پڑتا ہے کہ آج سے چند سال پہلے لندن میں سرمایہ دشمن اشتراکیوں نے اپنا ایک جلوس نکالا تھا۔ اخباروں میں خبر آئی تھی۔ جلوس والے ایک فقرے کو دہراتے تھے۔ کہتے کہ چیتھڑے سے کاغذ، کاغذ سے نوٹ، نوٹ سے بنک، بنک سے افلاس، افلاس سے چیتھڑا، پس چیتھڑے سے چیتھڑا پیدا ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آج ان ہی بنکوں کی وجہ سے امکان پیدا ہو گیا ہے کہ ہر شخص سودخواری کی انجمن میں شریک ہو کر سود خوار بن سکتا ہے۔ خواہ دنیا میں وہ کوئی پیشہ کرتا ہو۔ حالانکہ انفرادی سودخواری کے زمانہ میں سودخواری کے سوا سود خواروں کا گروہ دوسرا کام مشکل ہی سے کر سکتا تھا۔ بہرحال یہ ایک الگ مسئلہ ہے جس کی بحث کا یہاں مقام نہیں ہے۔

ہاں سے پانچ کروڑ کی امانتیں برآمد ہوئیں تو یہ تسلیم کرنا چاہیے کہ عام دنوں میں ان امانتوں کی تعداد مذکورہ بالا رقم سے اضعافاً مضاعفہ کہیں زیادہ ہوگی امام کی تجارتی کوٹھی جس احاطہ میں تھی اس کا حال گذر چکا کہ کوفہ کا وہ دار کبیرہ تھا۔ خصوصیت کے ساتھ مختلف تاریخی واقعات کے ذکر میں اس مکان کا ذکر کیا جاتا ہے۔[1]

بہر حال اتنا یقینی ہے کہ امام کی تجارت کوئی معمولی تجارت نہ تھی اور نہ معمولی سرمایہ سے وہ جاری تھی۔ جس کا علاوہ مذکورہ بالا باتوں کے ایک بڑا ثبوت خود امام کے خیراتی یا دوسرے مصارف ہیں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ امام نے اتنے وسیع پیانے کے کاروبار کو جو اختیار فرمایا تھا، اس کے اندرونی محرکات کیا تھے؟

اربابِ حکومت کی امداد سے بے نیازی:

یہ سچ ہے کہ وہ حکومت کی امداد سے بے نیاز رہنا چاہتے تھے۔ اور اس کا اظہار مختلف طریقوں سے وہ خود بھی کیا کرتے تھے۔ سوانح نگاروں نے لکھا ہے الخطیب تک نے نقل کیا ہے کہ امام ابوحنیفہ بکثرت ان دو شعروں کو پڑھا کرتے۔ (ص ۳۵۹ ج ۱۳)

عطاء ذی العرش خیر من عطائکم　　وسیبه واسع یرجی وینتظر

عرش والے کی داد، تمہاری داد و دہش سے بہتر ہے۔ اس کا ابر کرم فراخ ہے جس سے امیدیں وابستہ ہیں اور جس کا انتظار کیا جاتا ہے۔

انتم یکدرما تعطون منکم　　والله یعطی بلا من ولا کدر

تم لوگ (حکومت والے) جو کچھ دیتے ہو، اس کو گدلا کر دیتے ہو اور حق تعالیٰ دیتا ہے جس میں نہ احسان جتلانے کی اذیت ہوتی ہے اور نہ کسی قسم کی کدورت اس میں ہوتی ہے۔

ظاہر ہے کہ "کم" تم لوگ سے مراد ان اشعار میں اس زمانہ کے اربابِ حکومت

---

[1] طبری میں دیکھئے زید بن علی کا مقابلہ جب بنی امیہ کے گورنر یوسف بن عمرو سے ہوا تو جہاں جہاں کوفہ کے محلوں میں لڑائی ہو۔ ایک مقام کا ذکر دارِ عمرو بن حریث سے بھی کیا گیا ہے۔ اس سے بھی اس مکان کی اہمیت ظاہر ہے۔

ہی میں وہی لوگ جن کی طرف اشارہ کر کے امام صاحب فرمایا کرتے تھے۔

لولا انی اخاف ان التجی الی هولاء ما امسکت درهما واحدا (مناقب ملا علی قاری ص ۴۹۶) ذیل جواہر المضیہ

اگر مجھے اس کا اندیشہ نہ ہوتا کہ ان لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلانا پڑے گا تو ایک درم بھی اپنے پاس میں روک نہ رکھتا۔

دوسروں نے بھی بیان کیا ہے کہ:

كان ابو حنيفة اذهد الناس في درهم يا خذه من السلطان

ابو حنیفہ حکومت سے ایک ایک درم تک کے لینے میں سب سے زیادہ محتاط تھے۔

(ص ۲۱۳ موفق ج ۱)

ان کے دیکھنے والوں نے اس کی شہادت دی ہے کہ

لم ياخذ ابو حنيفة من سلطان قد درهما ولا دينارا (ص ۲۱۳)

امام ابو حنیفہ نے حکومت والوں سے نہ کبھی ایک درم ہی لیا اور نہ اشرفی۔

لیکن اسلامی علماء (محدثین وفقہاء) کی تاریخ کا جن لوگوں نے مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ حضرت امام امراء جور سے ترک موالات کے اس مسلک میں متفرد نہ تھے۔ جس زمانہ سے "ملوکِ عضوض" کا دور شروع ہوا، تقریباً ہر قرن میں ایک کافی تعداد اہل علم وتقویٰ کے گروہ میں ان لوگوں کی پائی جاتی ہے جنھوں نے حکومت اور اس کے خزانے کی طرف نگاہِ غلط انداز ڈالنی بھی کبھی پسند نہیں فرمائی۔ گذشتہ اوراق میں سفیان ثوری اور مسعر بن کدام رحمۃ اللہ علیہما کا ذکر آ چکا ہے جو امام کے ہم وطن وہم عصر تھے۔ یہی مشرب ان دونوں کا تھا اور زندگی بھر اسی مسلک کے یہ حضرات پابند رہے۔

۔سوال یہ ہے کہ صرف اتنی بات کے لیے۔ یعنی حکومت کی امداد کے لینے پر مجبور نہ ہونا پڑے اس کے لیے امام کو اتنے بڑے طول وطویل کاروبار کے پھیلانے کی کیا ضرورت تھی۔ اس قسم کے حضرات نے ہمیشہ اس مسئلہ کو "اجملوا فی الطلب" یعنی دنیا کے طلب کرنے میں اجمال مختصر گیری سے کام لو) پر عمل کر کے حل کیا ہے۔ ان ہی مسعر

بن کدام کا ایک دلچسپ فقرہ تاریخوں میں نقل کیا جاتا ہے۔ فرمایا کرتے تھے۔

من صبر علی الخل والبقل لم یستعبد (ص ۱۷۸ ج ۱ تذکرۃ الحفاظ) جس نے سرکہ اور بھاجی پر صبر کرنے کا عادی اپنے آپ کو بنا لیا، وہ کبھی غلام نہیں بنایا جا سکتا۔

جن لوگوں پر ''آزادی'' و ''حریت'' کا یہ راز واضح ہو چکا تھا وہ حاجتوں میں مختصر ہو جانے یا ہرچہ گیرید مختصر گیرید کے فلسفہ کو چھوڑ کر خواہ مخواہ اس جال جنجال کی جھنجھٹوں میں اپنے آپ کو کیوں مبتلا کرتے خصوصاً امام کی اس عقل دور اندیش کے ساتھ جس کے چرچوں سے مسلمانوں کی علمی تاریخ کی کتابیں معمور ہیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مادی لذات کھانے پینے وغیرہ کے تکلفات کی خواہش بھی امام میں نہیں پائی جاتی تھی۔[1]

امام صاحب کے مجاہدات وریاضات اور خانگی زندگی

بہر حال کسی دنی جذبہ کا اقتضاء امام کے اس وسیع کاروبار کو قرار دینے کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی سچ تو یہ ہے کہ امام کے جن مجاہدات وریاضات کا تذکرہ کتابوں میں کیا

---

[1] زیادہ سے زیادہ کسی شوق کا انتساب امام کی طرف اگر کیا جا سکتا ہے تو وہ لباس کا شوق ہے بیان کیا جاتا ہے کہ امام کے لباس کی قیمت کبھی کبھی ہزار ہزار اور پانچ پانچ سو درہم سے زیادہ تخمینہ کی گئی ہے (دیکھو مناقب موفق ص ۳۹) لیکن اس کا راز کیا تھا۔ لوگوں نے اس کے مختلف وجوہ بیان کیئے ہیں۔ مگر ہو سکتا ہے کہ علاوہ ان وجوہ کے یعنی خدا کے دربار میں جانے کے لیے امام صاحب کا خیال تھا۔ جیسا کہ ان ہی سے نقل کیا گیا ہے کہ سلاطین کے دربار سے زیادہ تکلف کرنا چاہئے۔ بعضوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ دوسروں کو بھی حکم دیتے کہ خدا کی نعمتوں کو چاہئے کہ جنھیں بخشی جائیں انھیں ظاہر کرے۔ حدیث میں بھی اس کا حکم آیا ہے۔ پھٹے پرانے حال میں ایک شخص امام صاحب کے پاس آیا تو آپ نے اس کا حال پوچھا بولا کہ میں مال دار خوش حال آدمی ہوں اس وقت بھی امام نے اس حدیث کی تعمیل کی طرف اس کو توجہ دلائی لباس کے تکلف سے ان کا ایک مقصد شائد یہ بھی ہو۔ لیکن اگر یہ سمجھا جائے کہ ارباب حکومت کے سامنے یہ ظاہر کرنا چاہتے کہ تمہاری امداد سے بے نیاز ہو کر بھی آدمی اچھے حال میں رہ سکتا ہے۔ قاضی ابو یوسف کی سواری کے تکلفات کو دیکھ کر کسی نے اعتراض کیا۔ انھوں نے بھی یہی جواب دیا کہ میں دکھانا چاہتا ہوں کہ علم و دنیا میں بھی آدمی کو کتنی بلندی و رفعت عطا کرتا ہے۔

جاتا ہے۔ ان کو دیکھتے ہوئے تو یہی کہنا پڑتا ہے جیسا کہ پہلے کہا بھی گیا ہے کہ کان جهاده كله الى قبر. ان کی ساری کدو کاوش کا رخ قبر ہی کی جانب تھا۔ (بحوالہ مکی بن ابراہیم المعجم ص ۱۶۵)

الذہبی جو امام سے اقتداء کا تعلق نہیں رکھتے ان کو بھی یہ لکھنا پڑا کہ

"امام کی تہجد اور شب بیداری کے واقعات اتنی کثرت سے بیان کئے گئے ہیں کہ وہ حد تواتر کو پہنچے ہیں۔"

انہوں نے لکھا ہے کہ

من ثم يسمى الوتد[1] من كثرة قيامه بالليل (ص ۱۶۵ معجم) شب بیداری اور اس کے قیام ہی کی وجہ سے امام ابوحنیفہ کو لوگ وتد (میخ) بھی کہتے تھے۔

یہ مشہور امام ابو عاصم نبیل کا فقرہ ہے، الذہبی نے امام کے ختم قرآن کے عجیب و غریب واقعات کی طرف اشارے کئے ہیں جو آدمی کی سمجھ میں نہیں آتے ہیں اس حکایت کا کہ جس مقام پر امام کی وفات ہوئی وہاں پر انھوں نے سات ہزار دفعہ قرآن ختم کیا تھا، الذہبی نے بھی تذکرہ کیا ہے۔ بہرحال ممکن ہے کہ بعض واقعات میں مبالغہ ہو، عام قاعدہ یہی ہے کہ اس قسم کے قصوں میں مبالغہ سے کام عموماً لیتے ہیں، کچھ بھی ہو میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ امام کے متعلق یہ خیال کسی حد تک صحیح نہیں ہو سکتا کہ مالی جدوجہد تجارتی کاروبار کے سلسلے میں وہ جو کچھ کر رہے تھے جذبہ دنیا طلبی کی تسکین کے لیے کر رہے تھے۔ اگر دنیا طلبی ان کے پیش نظر ہوتی تو دنیا امویہ اور عباسیہ دونوں حکومتوں کے زمانہ میں منہ پھاڑے ان کے سامنے بار بار آئی لیکن امام نے استغناء کی ٹھوکروں کے سوا اس کا کوئی

---

[1] اس سلسلہ میں ایک لطیفہ کتابوں میں یہ نقل کیا جاتا ہے کہ امام کے پڑوس میں ایک صاحب کا مکان تھا۔ امام صاحب کا جب انتقال ہو گیا تو اسی پڑوسی کے چھوٹے بچے نے اپنے باپ سے پوچھا ابا! سامنے کی چھت پر ایک ستون نظر آتا تھا وہ کیا ہو گیا اب نظر نہیں آتا۔ باپ نے کہا بیٹا! وہ امام ابوحنیفہ تھے رات بھر کھڑے ہو کر وہی نمازیں پڑھا کرتے تھے۔ وہ ستون گر گیا۔ امام صاحب کی وفات ہو گئی۔ (ص ۲۵۵ موفق)

جواب نہیں دیا جس کی تفصیلات عنقریب ان شاء اللہ آ ہی رہے ہیں، اور عام طور پر تواتر اور استفاضہ کی شکل میں امام کے یہ استغنائی قصے مشہور و معروف ہیں یوں بھی مورخین کا وہی گروہ جوان کی تجارت اور دولت کے یہ قصے سناتا ہے۔ ان ہی کی زبانی ہم یہ بھی تو سنتے ہیں کہ بعض مواقع پر امام اپنے ذاتی صرفہ ماہوار کو بتاتے ہوئے خود فرماتے تھے کہ

انما قوتی فی الشھر درھمان فمرة السویق ومرة الخبز (ص ۱۶۸ معجم)	میری ذاتی خوراک مہینے میں دو درم سے زیادہ نہیں ہے کبھی ستو، کبھی روٹی۔

ارزانی کے اس زمانہ میں ان لوگوں کے لیے جنھوں نے بقل (بھاجی) اور خل (سرکہ) پر صبر کیا شائد چنداں محل تعجب بھی نہیں ہے[۲] یہی حال ان کے گھر کے ساز و سامان کا بھی بیان کیا جاتا ہے۔ سہل بن مزاحم کے حوالہ سے ارباب مناقب نے نقل کیا ہے کہ

کنا ندخل علی ابی حنیفة فلا نری فی بیته الا البواری (ص ۲۱۴ موفق)	ہم امام ابوحنیفہ کے پاس حاضر ہوتے تو ان کے گھر میں چٹائیوں کے سوا اور کچھ نہ پاتے۔

اور یوں بھی دیکھا جائے تو امام پر کسی بڑے خاندان کا بار بھی نہ تھا، ان کی اولاد میں حماد بن ابی حنیفہ رحمۃ اللہ علیہما کے سوا اور کسی لڑکے یا لڑکی کا ذکر نہیں کیا جاتا۔ جہاں تک واقعات سے معلوم ہوتا ہے اپنی پوری زندگی انھوں نے ان ہی حماد کی والدہ یعنی ایک ہی بیوی کے ساتھ گذار دی۔ بیان کرنے والوں نے تو یہاں تک بیان کیا ہے کہ عباسی خلیفہ منصور سے جب تک تعلقات زیادہ خراب نہیں ہوئے تھے اور منصور بھی امام سے بالکل مایوس نہیں ہوا تھا۔ تو ایک دفعہ امام کے پاس دس ہزار درم نقد کے ساتھ ایک

---

[۱] یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ امام بے چھنے آٹے کی روٹی عموماً کھاتے تھے۔ (موفق ص ۲۴۵ ج ۱)

[۲] جہاں تک میرا خیال ہے دو درم ماہوار والی روایت کا بظاہر کسی خاص زمانہ سے تعلق معلوم ہوتا ہے، یہ کہنا بہت سی دوسری روایتوں کی تکذیب ہوگی کہ ان کے دوامی خوراک کا ماہواری موازنہ ہمیشہ دو درم سے زیادہ نہ تھا۔

جوان جاریہ (شرعی لونڈی) بھی بطور تحفے کے بھیجی روپیہ کو جیسے مختلف حیلوں سے امام نے پہلے واپس کیا تھا، اب کی بھی واپس فرمایا دیا اور لونڈی کو واپس کرتے ہوئے آپ نے کہلا بھیجا۔

انی قد ضعفت عن النساء وکبرت فلا استحل ان اقبل جاریة لا اصل الیها ولا اجترئ ان ابیع جاریة خرجت من ملک امیر المومنین (ص ۲۱۶ موفق)

میں عورتوں کے معاملہ میں کمزور ہو چکا ہوں، بڈھا ہو گیا ہوں ایسی صورت میں جائز نہ ہوگا کہ میں اس جاریہ کو قبول کرلوں جس کے کام کا میں نہیں رہ گیا ہوں اسی کے ساتھ اس کی بھی جسارت نہیں کر سکتا کہ امیر المومنین کے ملک سے جو جاریہ نکلی ہے اسے میں فروخت کر ڈالوں۔

جیسا کہ معلوم ہے امام حیلوں میں بھی غلط بیانی سے کام نہیں لیتے تھے۔ اس لیے یقین کرنا چاہئے کہ اپنے جس حال کا تذکرہ اس بیان میں عورتوں کے متعلق فرمایا ہے وہ ایک واقعہ کا اظہار تھا۔

امام کے تجارتی مساعی کے محرکات:

بہر حال بات بہت طویل ہوتی جارہی ہے اور جو کہنا چاہتا ہوں اب تک اس کے کہنے کا موقعہ ہی نہیں آرہا ہے۔ مختصر یہ ہے کہ امام کی اس تجارتی جدوجہد کی تہہ میں جہاں تک میرا خیال ہے درحقیقت وہی جذبہ پوشیدہ تھا۔[1] جس کا ذکر ان کے ایک پرانے صحبت یافتہ بلخی تلمیذ یعنی سلم بن سالم نے کیا ہے۔ امام موفق نے سلم کے متعلق یہ ذکر کرتے ہوئے کہ

---

[1] اس قسم کے واقعات جو بیان کئے جاتے ہیں کہ معمولی معمولی شبہ پر تیس تیس ہزار بلکہ ایک دفعہ تو ستر ہزار کی رقم امام نے فوراً خیرات کر دی کہ شرعی قانون کی رو سے ان کے تجارتی نمائندے نے معاملہ صحیح نہیں کیا تھا۔ کیا ایسے آدمی کو دنیا کا طالب قرار دینا۔ بجز مجنونوں کے اور کسی کا کام ہو سکتا ہے ان کی تمام سوانح عمریوں میں آپ کو یہ واقعات مل سکتے ہیں۔ دیکھئے موفق کی مناقب ص ۲۰۳ ج ۱۔ اور ص ۱۹۴ ج ۱)

"اہل بلخ کے یہ امام ہیں، ابوحنیفہ کی صحبت میں زمانہ تک رہے اور بہت سے مسائل امام کے ان سے مروی ہیں امام کے بلخی تلامذہ ابومطیع اور مقاتل بن سلیمان کے اصحاب وتلامذہ میں ہیں۔"

بہر حال ان ہی سلم بن سالم نے یہ بڑے پتہ کی بات بیان کی ہے کہ

لقیت من لقیت المشائخ الکبار فلم اجد اشد حرمة محمد صلی الله علیه وسلم من ابی حنیفة ص ۲۴۸ موفق

میں نے بڑے بڑے علماء سے ملاقاتیں کیں، لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کے احترام کا جذبہ جتنا شدید امام ابوحنیفہ میں پایا اس کی نظیر کہیں نظر نہیں آئی۔

اہل حق مظلومین کے ساتھ امام کی ہمدردیاں:

میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ حضرت امام کی یہی جبلت اور ان کی فطرت کا یہی اقتضا تھا جس نے ان سے وہ سب کچھ کرایا ہم جس کا ذکر آگے کرنے والے ہیں۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کا درد اس پر امراء "جور" کی طرف سے جو مظالم ہو رہے تھے یہی چیز تھی، جو انھیں بے چین رکھتی تھی ہم دیکھتے ہیں کہ امت محمدیہ کی اس مصیبت کے ازالہ میں امام سے پہلے جن جن لوگوں نے کام کیا تھا اور "امراء جور" نے حکومت کے فولادی پنجے سے ان بیچاروں کے گلے گھونٹ گھونٹ کر رکھ دیئے تھے۔ بیان کرنے والوں نے بیان کیا ہے کہ حضرت امام جب ان مظلوموں کا ذکر کرتے تو بے اختیار ہو کر رونے لگتے۔ ان شہیدانِ راہِ وفا کا تفصیلی ذکر تو ان شاء اللہ آئندہ کیا جائے گا۔ لیکن ان کے ذکر پر امام کا کیا حال ہوتا تھا۔ تاریخ کی شہادتیں سن لیجئے ان کے سامنے پہلی قربانی اس راہ کی حضرت امام زین العابدین کے صاحبزادے زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے پیش کی۔ لیکن بنی امیہ کی قاہرہ فوج نے ان کا خاتمہ کر دیا۔ راوی کا بیان ہے۔ میں نے پہلے بھی اس کو نقل کیا ہے۔

کان یبکی کلما ذُکر مقتله (موفق ص ۲۶۲ ج ۱)

زید بن علی کی شہادت کا جب امام ابوحنیفہ ذکر کرتے تو رونے لگتے۔

زید کے بعد اپنے نانا کی امت کی خبر گیری کے لیے اہل بیت ہی کے خاندان سے حضرت امام حسن کے پوتے محمد بن عبداللہ جو "نفس زکیہ" کے نام سے مشہور ہیں مدینہ میں کھڑے ہوئے عباسی خلیفہ منصور کے بھائی عیسی کے ہاتھوں وہ بھی ختم کر دیئے گئے، عبداللہ بن زبیر کے صاحبزادے حسن کا بیان ہے کہ

رأیت اباحنیفه وذکر محمد بن عبدالله بن حسن بعد ما اصیب وعیناه قدمعان (ص ۸۸ ج ۲ موفق)	میں نے ابوحنیفہ کو دیکھا وہ محمد بن عبداللہ بن حسن کا تذکرہ ان کی شہادت کے واقعہ کے بعد کہہ رہے تھے اور ان کی دونوں آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔

ان ہی محمد النفس الزکیہ کے برادر حقیقی ابراہیم بن عبداللہ نے بصرہ سے جب عباسیوں کے خلاف علم بلند کیا۔ اس وقت بھی امام نے جو کچھ کیا وہ تو ان کی زندگی کا خاص واقعہ ہے جیسا کہ عنقریب اس کی تفصیل آ رہی ہے۔

پھر اسی راہ میں ان کے ایک دوست اور جیسا کہ بعضوں کا بیان ہے کہ ان کے شاگرد ابراہیم بن میمون الصائغ عباسیوں کے طاغیہ ابو مسلم کے حکم سے جب شہید ہوئے تو ابو بکر الجصاص نے حضرت عبداللہ بن المبارک کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ

لما بلغ اباحنیفة قتل ابراهیم الصائغ بکی حتی ظننا انه سیموت (ص ۳۳ ج ۲ احکام القرآن)	ابوحنیفہ کو جب ابراہیم صائغ کی شہادت کی خبر ملی تو رونے لگے اور اس قدر روئے کہ ہم لوگوں کو خیال ہونے لگا کہ عنقریب یہ مر جائیں گے۔

صاحب معجم نے تبیض الصحیفہ کے حوالہ سے یہ واقعہ درج کیا ہے کہ ایک دن امام ابوحنیفہ اور ابن المعتمر[1] کو دیکھا گیا کہ چپ چاپ کچھ باتیں کر رہے ہیں اور باتیں کرتے کرتے دونوں ابل پڑتے ہیں روتے ہیں پھر باتیں کرتے ہیں جب ان کی گفتگو ختم ہوگئی

---

[1] کوفہ کے مشہور بزرگوں میں ان کا شمار ہے حضرت امام کے معاصرین میں ہیں۔ نام ان کا منصور اور کنیت ابوعتاب تھی، امام صاحب سے آٹھ سال پہلے ۱۳۲ھ میں وفات پائی ان کے حالات میں بھی لکھا ہے کہ بنی امیہ کے اسی گورنر ابن ہبیرہ نے جس نے حضرت امام کو تازیانے کی سزا ؎

توامام کے لوگوں میں سے ایک صاحب نے پوچھا کہ آپ دونوں حضرات کس بات پر رو رہے تھے جواب میں امام نے فرمایا۔

ذکرنا الزمان وغلبة اهل الباطل علی اهل الخیر فکثر ذلک بکاءنا (ص۱۶۵ معجم)	ہم نے اس زمانے کو یاد کیا جب اہل باطل اہل خیر پر غالب تھے تو ان کے ظلم کو یاد کر کے ہم رو پڑے۔

بہرحال ان تاریخی یادداشتوں کی روشنی میں حضرت امام کے فطری رجحانات کا بآسانی پتہ چلایا جا سکتا ہے اور میرے نزدیک تو حضرت امام کی زندگی کے سارے واقعات کی توجیہ وتاویل ان کے قلب کے ان ہی کیفیات سے ہوسکتی ہے اب آپ اپنے سامنے ایک طرف تو سلم بن سالم کے گذشتہ مشاہدہ اور تجربہ کو رکھ لیجئے یعنی دنیائے اسلام کے جن جن علماء کبار سے وہ ملے کسی میں امت محمدیہ کے احترام کا جذبہ ابوحنیفہ کے مانند ان کو کہیں نظر نہ آیا اور یہی سلم بن سالم جنہوں نے امام کے ساتھ اپنی زندگی کا کافی زمانہ گذارا ہے وہ اپنا ایک دوسرا تجربہ امام ہی کے متعلق یہ نقل کرتے تھے کہ

ولم اراحدا یوافق قوله فعله	یعنی ان بڑے بڑے بزرگوں میں جن سے میری

لہ حکومت کے عہدہ کے نہ قبول کرنے کی وجہ سے دی تھی اسی نے ابن المعتمر کو بھی قضا پر مجبور کیا۔ مجبور کرنے کی وجہ سے عدالت کے کمرے میں بیٹھنے کو تو بیٹھ گئے مقدمہ پیش ہوا فریقین کا بیان سن کر کہتے، تم لوگوں کی باتیں سمجھ میں آ گئیں، لیکن یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ اب میں کیا کروں۔ ابن ہبیرہ نے یہ حال سن کر چھوڑ دیا (صفوة الصفوة ص ۶۳) ابن جوزی نے یہ بھی نقل کیا ہے کہ ان کی والدہ کو جب معلوم ہوا کہ کوفہ کا والی ان کے بیٹے کو قاضی بنانا چاہتا ہے لیکن وہ انکار کرتا ہے تو بہت بگڑیں۔ لیکن انھوں نے جواب میں فرمایا۔

"اماں جس بات کو میں جانتا ہوں، آپ نہیں جانتی ہیں" (صفوة ص ۶۳ ج ۲)

ابن سعید نے لکھا ہے کہ ابن معتمر کہتے تھے بھئی! میں نے (یہ واقعہ ہے) کہ علم کو کسی اچھی نیت سے حاصل نہیں کیا تھا، لیکن علم نے میری نیت کو درست کر دیا۔ (ابن سعد ج ۲)

بہرحال واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا مسلک بھی امام ہی کا مسلک تھا اسی لیے حکومت سے ان کی کشمکش بھی جاری تھی۔

الا ابو حنیفة (ص ۲۴۸ ج ۱ موفق)	ملاقات ہوئی کسی ایسے آدمی کو نہ پایا جس کا قول اس کے فعل سے اتنا مطابق اور موافق ہو جتنا ابوحنیفہ کا قول ان کے فعل کے مطابق تھا۔

اب اسی سے اندازہ کیجئے کہ جس شخص کے دل میں محمد رسول اللہ ﷺ کی امت مرحومہ کا اتنا درد اور اتنا احترام ہو کہ اس کے ہم عصروں میں مشکل ہی سے اس کی نظیر مل سکتی تھی اور پھر اس کا قول بھی عمل سے اتنا مطابق ہو کہ اس باب میں بھی کم از کم سلم کے تجربہ میں کوئی دوسرا آدمی اس زمانہ میں نہیں تھا۔

حضرت امام کے حلم وقار کا ایک واقعہ:

اور اسی کے ساتھ اس کو سوچئے کہ جو مظالم ملوک جور اور امراء عضوض سے محمد رسول اللہ ﷺ کی امت پر ہو رہے تھے۔ ان مظالم کی یاد جس کے دل کو تڑپا دیتی ہو کہ باوجود اس حلم وقار کے جس کے قصے ہم کتابوں میں امام کے متعلق پڑھتے ہیں، مثلاً مشہور صوفی حضرت شقیق بلخی سے لوگ یہ روایت نقل کرتے ہیں کہ

"ہم امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ مسجد میں تھے۔ مسجد لوگوں سے بھری ہوئی تھی کہ اچانک امام ابوحنیفہ جہاں پر بیٹھے تھے ٹھیک ان کے سر کے سامنے ایک سانپ نمودار ہوا۔ مسجد والوں نے بے اختیار ہو کر سانپ سانپ چیخنا شروع کیا اور کوئی ادھر بھاگا، کوئی ادھر بھاگا خود میں بھی بھاگنے والوں ہی میں تھا۔ لیکن امام ابوحنیفہ اپنی جگہ سے ہلے بھی نہیں اور نہ ان کے چہرے پر تغیر کے کچھ آثار تھے۔" (موفق وغیرہ ص ۲۶۷ ج ۱)

بلکہ یہی قصہ عبداللہ بن المبارک سے جو منقول ہے، یعنی اس واقعہ کے وقت وہ بھی تھے ان کا بیان تھا کہ

"سانپ امام کی گود میں گرا، لیکن اس پر بھی اس بندہ خدا نے نہ دائیں دیکھا نہ بائیں، کیا تو صرف یہ کیا کہ دامن جھٹک دیا اور سانپ دور جا پڑا۔"

لوگوں نے ابن مبارک سے پوچھا کہ کیا بھاگنے والوں میں آپ بھی تھے۔ انھوں

نے کہاہاں! بھائی میں سب سے زیادہ دور بھاگا البتہ میں پہلی صف میں نہ تھا۔[1]

الغرض یہ اور اسی قسم کے دوسرے واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت امام ان لوگوں میں بھی نہ تھے جو ہر واقعہ۔ یہ بہت جلد اثر پذیر ہو کر اضطرابی کیفیات کو اپنے اوپر طاری کر لیتے ہیں۔ بلکہ حد سے زیادہ ضابط اور بھاری بھرکم آدمی کی جو شان ہوتی ہے۔ امام کی زندگی کے سارے واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ اسی قسم کے شخص تھے لیکن باوجود اس کے حکومت کے ان ستم زدوں کے ذکر پر ان کا بلبلا کر رو پڑنا اور اتنا رونا کہ ابن مبارک جیسے محتاط محدث تک یہ کہتے ہوں۔

''کہ گویا روتے روتے مرجائیں گے۔''

دراصل ان واقعات سے حضرت امام کی اندرونی کیفیت کا پتہ چلتا ہے۔ اور اندازہ ہوتا ہے کہ اس سلسلہ میں ان کے تاثرات کتنے عمیق اور گہرے تھے۔

امام کے فطری میلانات کے ظہور کی ابتداء:

اس میں شک نہیں کہ حضرت امام جس شہر میں پیدا ہوئے یعنی کوفہ وہاں امام سے پہلے بھی اور خود امام کی کم سنی کے دنوں میں بھی امت محمدیہ پر مظالم توڑے جا رہے تھے ان مظالم سے یہ شہر تاریک ہو رہا تھا حجاج بنی امیہ کا طاغیہ جب مرا ہے تو اس وقت امام کی عمر پندرہ سال کی تھی۔ حجاج کے واقعات آج بھی جب ہر اس شخص میں جو رسول اللہ ﷺ کی امت سے تھوڑا بہت بھی تعلق رکھتا ہے۔ غیظ و غضب کے جذبات میں حرکت پیدا کرتے ہین۔ تو ظاہر ہے کہ خواہ کم سنی ہی کے دنوں میں سہی لیکن امام جس فطرت کو

---

[1] اسی قسم کا ایک واقعہ اور بیان کیا جاتا ہے، ایک صاحب جن کا نام ابوقطن عمرو بن الہیثم تھا اور اسماء الرجال کے امام شعبہ بن الحجاج جنھیں لوگ امیر المومنین فی الحدیث بھی کہتے ہیں کسی ضرورت سے ان کا سفارشی خط واسطہ سے لے کر کوفہ امام کے پاس آئے تھے۔ امام کی مہمان نوازیوں اور ان کی غیر معمولی شب بیداریوں کا حال بیان کرتے ہوئے ایک واقعہ سانپ کے گرنے کا وہ بھی بیان کرتے ہیں یہ صبح کا وقت تھا۔ ان کا بیان ہے کہ دیر تک امام سانپ کی منڈی کو اپنے پاؤں سے دبائے رہے تا این کہ جب لوگ آئے تب آپ نے لوگوں سے کہا کہ اسے مار ڈالو۔

لے کر پیدا ہوئے تھے کوئی وجہ نہیں ہوسکتی کہ ان واقعات سے ان کا قلب شعوری یا غیر شعوری طور پر متاثر نہ ہوا ہوگا، خصوصاً اس نے جو کچھ کیا تھا زیادہ تر اس کا تعلق کوفہ ہی سے تھا تاہم جہاں تک مورخین کے بیانات میں دیکھا جاتا ہے۔ امام کی زندگی کے ابتدائی دنوں میں ''سیاسی میلانات'' کے ثبوت کی کوئی شہادت نہیں ملتی، زیادہ سے زیادہ جو چیز اس سلسلہ میں پیش ہوسکتی ہے وہ وہی ہے جس کا ذکر شائد پہلے بھی آچکا ہے یعنی ابتدائی زندگی میں بجائے فقہ کے حضرت امام پر علم کلام کا جب غلبہ تھا اور ان لوگوں سے جو اسلام کے اعتقادی مسلمات میں رخنہ اندازیاں کرتے تھے۔ ان سے مقابلہ کے لیے آپ بار بار کوفہ سے بصرہ[1] تشریف لے جاتے تھے بعض بعض دفعہ اسی سلسلہ میں سال سال بھر یا اس سے کچھ زیادہ دن بھی امام کو بصرے میں رہنا پڑا۔ یہ ہوسکتا ہے کہ تجارتی بندرگاہ ہونے کی وجہ سے حضرت امام تجارتی کاروبار بھی بصرے میں کرتے ہوں۔ لیکن تجارت کے ساتھ ساتھ اعداء اسلام کے مقابلہ میں لسانی جہاد بھی اس زمانہ میں آپ کا دل چسپ مشغلہ تھا۔

---

[1] بندرگاہ ہونے کی وجہ سے غیر ممالک کے لوگ بصرہ بکثرت آتے تھے اور اپنے ساتھ اپنے عقائد و خیالات لاتے تھے۔ ہندوستان سے اس بندرگاہ کا تعلق جس حد تک تھا اس کا اندازہ اسی سے ہو سکتا ہے کہ بصرہ کے آباد ہونے سے پہلے اس علاقہ کو ارض الہند (ہندوستان کی زمین) ہی کہتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی عہد میں اپنے خیالات و عقائد کے اظہار کی آزادی ہر شخص کو حاصل تھی جس کی وجہ سے عوام میں طرح طرح کے اوہام و وسواس پھیل جاتے تھے ابوالہذیل العلاف کے تذکرہ میں الخطیب نے لکھا ہے کہ بصرے میں ایک یہودی آیا دکان ینقض الاسلام (یعنی اسلامی اصول پر اعتراض کرتا تھا) ابوالہذیل اس کے مقابلہ پر اسلام کی طرف سے کھڑا ہوا۔ مناظرے میں جب یہودی غالب نہ آسکا تو اس نے ابوالہذیل کو گالیاں دینی شروع کیں۔ مطلب اس کا یہ تھا کہ مسلمان اس کی اس حرکت پر مغلوب الغضب ہو کر چڑھ دوڑیں اور مجھے اس کا حیلہ مل جائے کہ دلائل کے لحاظ سے میں ہی غالب تھا لیکن مسلمانوں نے جسمانی قوت سے کام لے کر مجھے مغلوب کر دیا لیکن ابوالہذیل نے مسلمانوں کو شدت سے روکا اور کہا کہ کسی نے اس پر اگر حملہ کیا تو اس کی مراد پوری ہوگی اس پر یہودی کھسیانا سا ہو کر رہ گیا (دیکھو الخطیب ص ۳۶۶ ج ۳)۔ اگرچہ یہ ایک جزئی واقعہ ہے لیکن اس سے اس زمانہ کی مذہبی آزادی کا اور بصرے کے ماحول کا پتہ چلتا ہے۔

لیکن علم کلام سے دل چسپی جب آپ کی کم ہوئی اور اپنے استاد حماد بن ابی سلیمان کی صحبت میں فقہ سیکھنی شروع کی تو اس عرصہ میں کوئی واقعہ ایسا نہیں ملتا جس میں آپ کے ''سیاسی رجحان'' کی جھلک پائی جاتی ہو لیکن ٹھیک جس سال حماد بن ابی سلیمان امام صاحب کے استاد کی وفات ہوئی ہے۔ یعنی ۱۲۲ھ جس کے معنی یہ ہوئے کہ امام کی عمر اس وقت (۴۲) سال کی ہونی چاہیے اسی کے بعد بنی امیہ کے دور حکومت میں ایک ''سیاسی انقلاب'' کا واقعہ پیش آتا ہے اور ہم امام رحمۃ اللہ علیہ کو پہلی دفعہ اس واقعہ سے متعلق پاتے ہیں۔ لیکن اس واقعہ کی تفصیل سے پہلے کچھ اجمالی تذکرہ اس زمانہ کے ''سیاسی ماحول'' کا بھی سن لینا چاہیے۔

کوفہ کے گورنر خالد کے بے پناہ مظالم:

یہ واقعہ اس وقت پیش آیا ہے، جب بنی امیہ کی فرماں روائی کی باگ ہشام بن عبدالملک کے ہاتھ میں تھی، کوفہ کا گورنر ہشام کی طرف سے پندرہ سال تک مسلسل اموی تاریخ کی مشہور شخصیت تھی جسے عام طور پر لوگ ابن النصرانیہ کہتے تھے اور اصلی نام اس کا خالد بن عبداللہ القسری تھا۔ ۱۰۵ھ سے ۱۲۰ھ تک یہ کوفہ کا گورنر رہا۔ جس کے معنی یہی ہوئے کہ حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے پچیس سال کی عمر سے چالیس سال کی عمر تک کا زمانہ اسی ابن النصرانیہ کی ولایت کے عہد میں گزارا تھا۔ ابن النصرانیہ کیا تھا۔ تفصیلی حالات تو اس کے تاریخ میں پڑھیے۔ حاصل یہ ہے کہ باپ تو اس کا عربی قبیلہ بجیلہ سے تعلق رکھتا تھا، لیکن اس کی ماں ایک ''رومیہ نصرانیہ'' تھی یعنی یورپین عیسائیہ عورت تھی۔ یہ بھی لکھا ہے کہ ماں اس کی مرتے دم تک اپنے آبائی مذہب (عیسائیت) پر قائم رہی خود خالد تو بظاہر مسلمان تھا۔ لیکن اگر یہ واقعات صحیح ہیں جیسا کہ مورخین نے لکھا ہے کہ اس کے زمانہ میں سارا وہ علاقہ جو اس کی زیر ولایت ونگرانی تھا، وہاں غیر مسلموں کی حکومت قائم ہوگئی تھی، کامل میں ہے۔

کان الاسلام ذلیلا والحکم فیه لاهل الذمة (ص ۸۲)	اہل اسلام اس زمانہ میں ذلیل تھے اور حکومت اہل ذمہ (غیر مسلم رعایا) کے ہاتھ میں تھی۔

خالد کی معزولی کے بعد یوسف بن عمر جب کوفہ کا گورنر ہو کر آیا تو یحییٰ بن نوفل شاعر نے ایک قصیدہ لکھا تھا جس کا ایک شعر یہ بھی تھا کہ:

اتانا واهل الشرك اهل زكاتنا وحكامنا فيما نسرُّ ونجهر

یوسف بن عمر ایسے زمانہ آیا ہے جب ارباب شرک ہم سے ٹیکس وصول کرتے تھے اور کھلی ڈھکی بات میں وہی ہمارے حکام تھے۔

یہ قصہ بھی اسی کا بیان کیا جاتا ہے کہ اس نے مسلمانوں کی مسجدوں کے میناروں کے منہدم کرانے کا حکم دیا تھا وجہ یہ بتائی کہ ان پر چڑھ کر مؤذن لوگوں کی بہو بیٹیوں کو جھانکتے ہیں[1] ادھر مؤذنوں پر یہ الزام قائم کر کے کوفہ کی مسجدوں کے مینارے ڈھائے جا رہے تھے اور دوسری طرف ستم ظرفی اسی ابن النصرانیہ کی یہ تھی کہ اپنی نصرانیہ ماں کے نام سے ایک عظیم الشان گرجا بھی اس نے کوفہ میں تعمیر کرایا۔ مسلمانوں میں اس کے اس طرز عمل سے جب بے چینی پیدا ہوئی، حتیٰ کہ مشہور رند مشرب شاعر فرزدق سے بھی ضبط نہ ہو سکا اور ایک طویل قصیدہ میں اسلام اور مسلمانوں کی اسی بے کسی کا رونا روتے ہوئے اس نے کہا:

بنى بيعة فيها النصارى لامه ويهدم من كفر منار المساجد

"اپنی ماں کے لیے تو کوفہ میں اس نے گرجا بنایا۔ اور مسجدوں کے میناروں کو ڈھا رہا ہے اپنے کفر کی وجہ سے۔"

---

[1] خدا جانے خالد نے خود ہی شعر بنائے تھے یا واقعی کسی مسخرے شاعر کو جیسے بیسیوں بے بنیاد باتیں سوجھتی ہیں ان ہی میں ایک خیال یہ بھی آ گیا اور شعر کی صورت اس نے اختیار کر لی

ليتني في المؤذنين حياتي انهم يبصرون من في السطوح

فيشيرون اوتشير اليهم بالهوى كل ذات دل مليح

یعنی کاش مؤذنوں کے ساتھ میری بھی زندگی گذرتی یہ لوگ چھتوں پر رہنے والیوں کو دیکھتے ہیں پھر خود یہ موذن اشارے کرتے ہیں۔ یا ہر ناز و غمزے والی ملیح عورت محبت کا پیغام مؤذنوں کو دیتی ہے۔ (کامل ابن اثیر ص ۱۰۳ ج ۵) کہتے ہیں مناروں کے انہدام کی وجہ ان ہی اشعار کو اس نے قرار دیا تھا۔

کہتے ہیں کہ مسلمانوں کی اس شکایت کو سن کر اس نے عذر بھی جو پیش کیا تو منجملہ دوسری باتوں کے اس کا یہ تاریخی فقرہ اب تک کتابوں میں نقل کیا جاتا ہے یعنی اس نے کہا۔

لعن الله دینهم ان کان شرا من دینکم (ص ۱۰۳ ج ۵ کامل ابن اثیر) — خدا کی لعنت ہو ان کے (عیسائیوں) کے دین پر، اگر ان کا دین تمہارے دین سے بدتر ہے۔

بیان کرنے والے ایک طرف تو یہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت مرتضیٰ علیہ السلام کی شان اقدس میں اپنے آقاؤں (بنی امیہ) کو خوش کرنے کے لیے صلواتیں سنایا کرتا تھا۔ لیکن ایک لطیفہ کامل وغیرہ میں بھی یہ نقل کیا ہے کہ بنی امیہ ہی کے خاندان کے ایک صاحب نے ابن النصرانیہ سے کچھ امداد چاہی، لیکن بیچارے کو صاف جواب دیا گیا۔ چونکہ داد و دہش میں خالد کا ہاتھ کھلا ہوا تھا یہ بھی کہتے ہیں کہ بنی ہاشم والوں کے ساتھ بھی وہ حسن سلوک کیا کرتا تھا۔ اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ اس قسم کے لوگوں کا قاعدہ ہے کہ اپنے عیوب کی پردہ پوشی کے لیے "دہن دوزی" کے نسخہ پر عموماً عمل کرتے ہیں، بہر حال جہاں سب ہی کو دیتا دلاتا تھا ممکن ہے کہ بنی ہاشم کے بعض افراد کو اس نے کچھ دیا ہو، اموی سائل نے اسی واقعہ کو پیش نظر رکھ کر یعنی بنی ہاشم کی خالد مدد کرتا ہے کہا کہ

"لیکن دین کا تعلق تو خالد ہاشمیوں سے رکھتا ہے اور ہمارے لیے اس کے پاس صرف علی کی صلواتیں رہ گئی ہیں۔ (ص ۵۲ ج ۵ کامل ابن اثیر)

لطیفہ یہ ہے کہ خالد تک جب اس اموی کی یہ شکایت پہنچی تو بے ساختہ اس کی زبان سے نکلا۔

لئن احب فلنا عثمان بشیء. (کامل ص ۸۲ ج ۵) — اس کا اگر جی چاہے تو کچھ عثمان کو بھی سنا دوں۔

اسی لیے لوگوں کا خیال ہے کہ درحقیقت اس کو نہ حضرت علی ہی سے تعلق تھا اور نہ عثمان سے بلکہ صرف دنیا سازی کے لیے

کان خالد یبالغ فی سب — حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی مذمت کرنے میں مبالغہ

علی فقیل کان ذلک نفیا للتھمة تقربا الی القوم. (ص ۸۲ ج ۵)

سے کام لیتا تھا لوگ کہتے ہیں کہ اہل بیت کے ساتھ میل جول میں جو وہ متہم اور بدنام تھا اسی بدنامی کا ازالہ حضرت علی کو گالیاں دے کر کیا کرتا تھا۔

اور بات بھی کچھ یہی معلوم ہوتی ہے کہ کہاں تو ہشام کے ساتھ عقیدت کے اظہار میں غلو کو یہ ابن النصرانیہ اس حد تک پہنچا دیتا تھا کہ سننے والوں کا بیان ہے۔ نقل کفر کفر نہ باشد، وہ کبھی کبھی کہتا کہ

''اپنے اہل وعیال اور گھر والوں پر کسی کو اگر کوئی اپنا خلیفہ اور نمائندہ مقرر کرے کیا اس خلیفہ کے برابر وہ ہوسکتا ہے جسے اس شخص نے بطور ایلچی اور قاصد (رسول) کسی کے پاس بھیجا ہو۔

ابن اثیر نے لکھا ہے کہ (العیاذ باللہ) اشارہ اس کا ادھر ہوتا تھا کہ

ان الخلیفة ھشاما افضل من رسول اللہ (ص ۱۰۳ ج ۵)

خلیفہ ہشام (العیاذ باللہ) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی افضل ہے۔

مگر ابن اثیر ہی نے یہ قصہ بھی نقل کیا ہے کہ ہشام خلیفہ نے خالد کے نام بصیغہ راز یہ فرمان بھیجا کہ

''جب تک امیر المومنین یعنی (ہشام) کا غلہ فروخت نہ ہو اس وقت تک کسی دوسرے کو غلہ کے بیچنے کی اجازت نہ دی جائے۔''

خالد نے اسی کے مطابق تمام جگہ احکام نافذ کر دیئے نتیجہ ظاہر تھا کہ علاقہ میں غیر معمولی گرانی پھوٹ پڑی' لکھا ہے کہ کوفہ کے بازار میں

کیلجتھا بدرھم.

ایک کیلجہ (چھوٹا پیمانہ غلہ کا) ایک درم میں بکنے لگا۔

خلق خدا کی اس گرانی سے چیخ اٹھی۔ عوام کا الزام خالد پر تھا کہ اسی نے کاشت کاروں کو غلہ فروخت کرنے سے روک دیا ہے خالد سخت دماغی کوفت میں مبتلا تھا، ہشام کے راز کو بھی ظاہر نہیں کرسکتا تھا۔ اور صبح وشام لوگوں کی گالیاں، لعنت وملامت بھی اس کے لیے ناقابل برداشت بنی چلی جارہی تھی۔ آخر ایک دن اس نے برسر منبر دل کا بخار

ان الفاظ میں نکالنا شروع کیا۔

زعمتم انی اغلی اسعارکم فعلی من یغلیھا لعنة الله (ص ۸۱)

تم لوگوں کا خیال ہے کہ اناج کو میں نے گراں کر رکھا ہے لو میں تمہارے سامنے کہتا ہوں کہ جس کی وجہ سے یہ گرانی ہے اس پر خدا کی لعنت۔

یعنی اشارہ ہشام کی طرف کررہا تھا کہ میرا کیا قصور ہے، خود تمہارے امیر المومنین کا حکم ہی یہ ہے کہ پہلے سرکاری غلے کا ایک ایک دانہ (من مانی قیمتوں پر) فروخت ہوئے، تب بازار میں دوسرے بیچنے والوں کو مال لانے کی اجازت دی جائے اور اس سے انداز ہوسکتا ہے کہ جس ہشام کو کبھی وہ رسولوں پر بھی فضیلت دیتا تھا۔ اسی کو آج وہ برسر منبر گالیاں سنا رہا تھا، لوگوں نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ اپنی پرائیویٹ مجلسوں میں ہشام بے چارے کا نام ہی خالد نے ''ابن الحمقیٰ'' رکھ چھوڑا تھا جب اس کا نام لیتا تھا تو کہتا کہ ابن الحمقیٰ کا حکم آیا ہے' ابن الحمقی نے اب یہ نیا شوشہ چھوڑا ہے' اور گو گورنری کی مدت ابن النصرانیہ کی کل پندرہ سال ہے۔ لیکن اسی پندرہ سال میں اس نے جو کچھ لوٹا اور لٹایا اس کا اندازہ اسی سے ہوسکتا ہے کہ جب معزولی کا وقت اس کی آیا ہے تو اس نے خود اقرار کیا کہ حکومت کے خزانے کا بقایا میرے ذمہ پچاس کروڑ رہ گیا ہے۔ تنخواہ میں حالانکہ کل بیس ہزار سالانہ کی جاگیر اس کو ملی تھی۔ لیکن مسلمانوں کے بیت المال کے روپے سے اس نے اپنی جاگیر میں نہروں کا جال بچھا دیا۔ اب تک اس کی متعدد نہروں مثلاً نہر خالد، نہر باجرا، نہر تارمانا، نہر مبارک، نہر جامع کورہ، سالور کی نہر۔ نہر صلح کے نام تاریخوں میں درج ہیں۔ ان ہی نہروں کی بدولت بیس ہزار کی آمدنی کی جاگیر پندرہ

۱؎ یہ ایک واقعہ کی طرف اشارہ تھا یعنی ہشام کی ماں جس کا نام عائشہ تھا اور ہشام بن اسماعیل بن ہشام بن الولید بن المغیرۃ المخزومی کی بیٹی تھی، یعنی ابوجہل کے بھائی کے خاندان کی لڑکی تھی۔ لکھا ہے کہ حد سے زیادہ یہ عورت احمق تھی۔ اس لیے تنگ آ کر آخر میں ہشام کے باپ عبدالملک نے اس کو طلاق بھی دے دی تھی لوگ اسی وجہ سے ہشام کے پس پشت عموماً اسے ابن الحمقی ہی کہا کرتے تھے اور خالد بھی اسی لفظ کو استعمال کرتا تھا۔ بعض قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ شروع شروع میں یہ خطاب اپنے آقا کو اسی نمک حلال نوکر ابن النصرانیہ نے دیا تھا۔ بعد کو دوسرے بھی کہنے لگے۔

سال میں ایک کروڑ تیس لاکھ سالانہ کی آمدنی دینے لگی۔ ان ہی حالات نے اس کے دماغ کو بے قابو کر دیا تھا۔ کہتے یہ ہیں کہ جوش میں آکر اپنے بیٹے کو کہتا کہ ہشام کے بیٹے مسلمہ سے تو آخر کس بات میں کم ہے۔ کبھی کہتا

''بیٹا! وہ کیا مزے کا زمانہ ہوگا جب ہشام بھی تیرا محتاج بن کر رہے گا۔''

آخر میں تو سارے عراق کو وہ اپنی موروثی جائداد قرار دینے لگا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر الزام لگاتا تھا کہ میری قوم بجیلہ سے انھوں نے چھین کر زبردستی مسلمانوں کے حوالہ کر دیا۔[1] اسی لیے کہتا

انني مظلوم ماتحت قدمي شيء الاهو لي (کامل ص۸۰ ج۵) میں مظلوم ہوں یعنی میرے پاؤں کے نیچے کا کوئی حصہ بھی ایسا نہیں ہے جو میرا نہ ہو۔

کوفہ میں خالد اور خالد کے گرد و پیش میں رہنے والوں کا روز روز عید اور شب شب برات کا اندازہ اسی سے کیجئے کہ اس کے ملازم طارق نے اپنے بچے کی ختنہ کی اس تقریب میں اور تو کچھ خرچ کیا سو کیا۔ صرف اپنے آقا ابن النصرانیہ کے سامنے تقریب کے سلسلہ میں جو تحفے اس نے پیش کئے تھے۔ ان میں علاوہ قیمتی تھانوں اور دوسری چیزوں کے ایک ہزار غلام اور ایک ہزار لونڈیاں بھی تھیں (ص۸۰) الیافعی نے لکھا ہے کہ خالد کا بھائی اسد جسے اس نے اپنے علاقے کے خراسانی حصہ میں اپنا نائب مقرر کیا تھا۔ جس زمانہ میں وہ بلخ میں تھا مجوسیوں کی عید مہرجان ان ہی دنوں میں واقع ہوئی

---

[1] عراق جسے السواد بھی اسلامی تاریخ میں کہتے ہیں جب فتح ہوا اور فتح کرنے والی فوج میں زیادہ تعداد بجیلہ قبیلہ والوں کی تھی یعنی وہی قبیلہ جس کی طرف مشہور صحابی حضرت جریر بن عبداللہ البجلی رضی اللہ تعالیٰ عنہ منسوب ہیں۔ ابتداء میں فتوحات کے متعلق جب تک یہ بات طے نہیں ہوئی تھی کہ اس کو فتح کرنے والی فوج میں تقسیم کر دیا جائے یا مسلمانوں کے بیت المال کے نام ان کو روک لیا جائے اس لیے کچھ دن کے لیے سواد کے ربع (چوتھائی) علاقے پر بجیلہ والوں کا قبضہ تھا لیکن جب صحابہ کے مشورہ سے تمام مفتوحہ زمینوں کو حکومت کے قبضہ میں داخل کر کے تمام مسلمانوں کی مشترکہ جائداد کی حیثیت ان کو دے دی گئی تو بجیلہ والوں سے بھی یہ زمین واپس لے لی گئی۔ اسی کی طرف اشارہ خالد کر رہا تھا۔

ہرات کے دہقان نے جو مجوسی تھا اسد[1] کے پاس عید کی عیدی جو پیش کی تھی ابن عساکر نے تاریخ دمشق میں اس کی تفصیل دی ہے لکھا ہے۔

''ایک قصر سونے کا اور ایک قصر چاندی (شاید کاسکٹ کی شکل کے ہوں گے) ان کے پیچھے چند طلائی لوٹے اور چند نقرئی لوٹے تھے۔ ان کے بعد سیم وزر کے بڑے بڑے بادیئے اور رکابیاں تھیں اور ان سب کے بعد مروزی قوہی ہروی وغیرہ وغیرہ کپڑوں کے تھان کے تھان تھے، ان ہی تحفوں میں وہ (قاآن) اپنے ساتھ سونے کے چند کرے (گیند) بھی لایا تھا۔''

الغرض یہ تھا وہ تماشا بنی امیہ کی حکومت کا جو امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے خاص ان کے وطن اور مستقر کوفہ میں دکھایا جا رہا تھا۔ مسلمانوں پر گورنر نے کافروں کو مسلط کر رکھا ہے مسلمانوں کی مسجدوں کے مینارے ڈھائے جا رہے ہیں اور عیسائیوں کے گرجے کی تعمیر مسلمانوں ہی کے پیسوں سے ہو رہی ہے مسلمانوں کے رسول پر خلیفہ کو ترجیح دی جا رہی ہے، علی پر لعنت بھیجی جا رہی ہے۔ عثمان کو بھی بخشا نہیں جا رہا ہے۔ مسلمانوں کے دین کے ساتھ تمسخر کیا جا رہا ہے، یہ تو گورنر کر رہا ہے، خود خلیفہ اس فکر میں ہے کہ خواہ رعایا پر کچھ بھی گذر جائے۔ لیکن اس کا مال بھلے اچھے داموں میں بک کر روپیہ کی شکل میں اس کے پاس پہنچ جائے عام مسلمانوں کے گھر میں فاقہ ہے اور مسلمانوں کے امیر کا نوکر ایک ایک بچے کے ختنہ میں وہ وہ اولوالعزمیاں دکھا رہا ہے کہ شاید

---

[1] اسد کے متعلق لوگوں نے لکھا ہے کہ ایک حد تک وہ دیندار آدمی تھا۔ سب سے بڑی صفت اس کی سخاوت تھی ابن عساکر نے لکھا ہے کہ دہقان ہراۃ کے اس سارے تحفوں کو مجلس سے اٹھنے سے پہلے اسد نے بانٹ دیا۔ آدمی بڑا بہادر تھا۔ کافر ترکوں اور ان کے خاقان کی بڑی بڑی فوجوں کو اس نے شکست دی آخر میں ہرات ہی میں ایک سرطانی زخم سے جو اس کے پیٹ میں تھا بلخ ہی میں مر گیا۔ اور اسی کے بعد خالد پر بھی آفت آئی۔ پندرہ سال کا سارا خواب ختم ہو گیا۔ کہتے ہیں کہ یہی خالد جیسا کہ آئندہ آ رہا ہے معزول ہونے کے بعد شکنجے میں کسا گیا۔ پہلے پاؤں میں شکنجہ کیا گیا اور ہڈیاں تڑاتڑ ٹوٹ گئیں۔ یوں ہی آہستہ آہستہ شکنجے کو اوپر سرکاتے جاتے اور اس کی ہڈیاں توڑی جاتیں تا آنکہ دم نکل گیا لیکن بڑا سخت جان تھا۔ منہ سے اف بھی نہ نکالی۔ فاعتبروا یا اولی الابصار۔

بادشاہوں کے لڑکوں کے ختنہ میں بھی اتنی زرمستیاں نہ دکھائی جاتی ہوں مگر ساری دنیا چپ ہے بنی امیہ کی بے پناہ تلوار نے خون کی جوندیاں بہائی ہیں، اور ظلم کے جو آتش کدے جوڑ رکھے تھے، ان کو دیکھ دیکھ کر بھلا کس کا گردہ اور کس کا جگر تھا کہ آہ نیم شی کے سوا کچھ اور بھی کرنے کے لیے تیار ہو مسلسل دیکھا جا رہا تھا کہ زبان سے بات نکلی نہیں کہ سرتن سے جدا ہو گیا۔

لیکن اپنی آمدنی بڑھا بڑھا کر خالد دراصل اپنی قبر آپ کھود رہا تھا جس چیز کے عشق میں ہشام مبتلا تھا۔ اسی کا سودا اس کے سر میں بھی سمایا۔ ہشام کی بھی جاگیر خالد کی جاگیروں کے قریب تھی۔ شاہی جاگیر کے داروغہ نے بادشاہ کو اطلاع دی تھی کہ

''شاہی جاگیروں کی زمین کے بند کو خالد توڑ رہا ہے۔''

کہتے ہیں کہ یہیں سے بات کی ابتداء ہوئی جس کی انتہا خالد کی معزولی پر ہوئی اس زمانے میں یمن کا گورنر یوسف بن عمر تھا۔ راز میں ہشام نے اس کو لکھا کہ فوراً عراق پہنچ کر خالد کو گرفتار کر لے اور سرکاری مطالبے وصول کر لے۔ یوسف پہنچا' خالد گرفتار ہو گیا۔ اور مطالبے کا تقاضا یوسف نے شروع کیا۔ ہشام کا حکم تھا کہ قتل کرنے کے سوا مطالبے کے لیے جتنی اذیت تم دے سکتے ہو خالد کو دو یوسف نے بھی اذیت پہنچانے میں کوئی کمی نہیں کی۔ روزانہ نئی سزائیں تجویز ہوتی تھیں۔ پوچھا جاتا تھا کہ یہ پچاس کروڑ سرکاری خزانہ کا مال تو نے کہاں رکھا ہے۔ یہ قصہ تو یوں ہی جاری رہا۔ کوفے کے مسلمانوں کو اس کی خوشی ہوئی کہ ابن النصرانیہ سے ان کو نجات ملی۔ کہتے ہیں کہ یوسف نماز روزے کا بڑا پابند تھا۔ کامل کے الفاظ ہیں کہ:

> دیر دیر تک نمازیں پڑھتا مسجد میں زیادہ وقت گذارتا تھا۔ اپنے گردو پیش والوں اور گھر کے لوگوں کو عوام پر ظلم و زیادتی کرنے سے روکے ہوئے رہتا، نرم کلام، منکسر المزاج آدمی تھا' مصیبتوں میں دعا والحاح کا عادی تھا، اس کی عادت تھی کہ صبح کی نماز کے بعد کسی سے گفتگو نہ کرتا' جب تک کہ چاشت کی نماز نہیں پڑھ لیتا تھا' قرآن مجید کی تلاوت میں مشغول رہتا تھا

اور خدا کے سامنے گریہ وزاری کرتا۔ (ص ۸۳ ج ۵)

اسی لیے کوفہ کے شاعر یحییٰ بن نوفل نے شعر لکھا

فلما اتا نا یوسف الخیر اشرقت　　له الارض حتی کل وادٍ منور

جب بھلائی والا یوسف آیا تو زمین چمک اٹھی گویا ہر وادی جگمگا رہی ہے۔

لیکن بنی امیہ کا گورنر بہر حال بنی امیہ کا گورنر تھا۔ چند ہی دن کے بعد معلوم ہوا کہ یوسف کو جنون ہے اور نماز روزہ کا سارا قصہ یہ بھی جنون ہی کے ظہور کی ایک شکل ہے۔ جنون کے جو واقعات لوگوں میں مشہور ہوئے ان کی فہرست تو طویل ہے۔ نمونے کے لیے یہ چند مثالیں کافی ہو سکتی ہیں۔

"چار خانے بنے ہوئے کپڑے جلا ہوں سے بنواتا۔ بے چارا جلاہا بنا کر لاتا۔ اپنے سکریٹری سے پوچھتا کیوں بے کیسا ہے؟ سیکرٹری کہتا کہ خانے کچھ چھوٹے ہیں، تب جولا ہے سے کہتا سچ تو کہتا ہے، ابے الخناء کا بچہ، جولاہا کہتا حضور اس فن سے میں زیادہ واقف ہوں، تب سیکرٹری سے کہتا سچ تو کہتا ہے ابے الخناء کے بچے، سیکرٹری جواب میں کہتا کہ اس جلاہے کو سال میں ایک دو تھان بنانے کی نوبت آتی ہوگی اور میرے ہاتھ سے سیکڑوں تھان سالانہ گذرتے ہیں یہ بیچارہ اس کی خوبیوں کو کیا جانے تب جولاہے سے یوسف کہتا سچ تو کہتا ہے ابے الخناء کے بچے۔ الغرض یوں ہی اس کی بھی تصدیق کرتا اور اس کی بھی پھر اسے بھی جھٹلاتا اور اسے بھی اسی طرح مزاج میں سختی اتنی تھی کہ فرمائش سے ذرہ برابر بھی کسی چیز میں نقص رہ جاتا تو بنانے والوں پر سیکڑوں کوڑے پڑ جاتے ایک دفعہ اپنی لونڈیوں کو بلا کر اس وقت جب سفر میں جا رہا تھا پوچھا کہ کون کون میرے ساتھ چلے گی، ایک بولی کہ سرکار میں جاؤں گی۔ بس بگڑ بیٹھا اور فحش باتیں کہتا حکم غلام کو دیتا کہ لگا اس کے سر پر کوڑے، دوسری یہ دیکھ کر کہتی کہ سرکار میں گھر ہی پر رہوں گی تب کہتا کہ مجھ سے چڑتی ہے غلام! لگا اسے کوڑے، اب تیسری سے پوچھتا

کہ بتا تو کیا چاہتی ہے۔ دونوں کے حشر کو دیکھ کر کہتی کہ میں کیا بتاؤں، جو بات بھی کہوں گی اس کی سزا دیکھ چکی ہوں تب کہتا کہ کیوں ری میری بات میں نچ نکالتی ہے اور باتیں بناتی ہے، غلام! لگا اسے بھی کوڑے۔"

ظاہر ہے کہ جنون کے سوا اور ان حرکات کی دوسری توجیہ کیا ہوسکتی ہے، یہ بھی لکھا ہے کہ یوسف بہت پستہ قد تھا لیکن ڈاڑھی بڑی لمبی تھی کپڑے سلوانے کے لیے درزی کو بلاتا۔ اگر درزی کہہ دیتا کہ جو کپڑا دیا گیا ہے اس میں فاضل بچے گا تو بگڑ بیٹھتا اور فوراً کوڑے مارنے کا حکم دیتا لیکن جاننے والا درزی ہوتا تو کہتا کہ اتنا کپڑا سرکار کے بھاری بھرکم بدن کے لیے کافی نہیں ہوسکتا تو خوشی سے پھول جاتا اس ذریعہ سے درزی خوب کپڑے وصول کرتے تھے (یہ سارے واقعات ابن اثیر وغیرہ سے منقول ہیں۔

مسلمان اس کے حال کو دیکھ کر مایوس ہوئے یحییٰ بن نوفل شاعر کو پھر لکھنا پڑا

ادانا والخليفة اذرمان مع الاخلاص بالرجل الجديد
كاهل النارحين دعوا اغيثوا جميعا بالحميم وبالصديد

جس کا مطلب یہی ہے کہ خلیفہ نے گو اخلاص سے نئے آدمی سے ہم لوگوں کو مشرف فرمایا۔ لیکن واقعہ یہ ہوا کہ جہنمی جب جہنم میں فریاد کریں گے اور مانگیں گے تو ان کی فریاد رسی گرم پانی اور پیپ سے کی جائے گی۔ یہی حال ہمارا ہوا کہ فریاد تو سنی گئی۔ لیکن یوسف کو بھیج کر گویا گرم پانی اور حمیم کے ذریعہ فریاد رسی کی گئی ہے۔

خیر یہ قصہ تو طویل ہے اس کے نقل کرنے سے میری غرض یہ ہے کہ جب ان واقعات سے عام لوگ متاثر ہو رہے تھے تو اس سے اندازہ کرنا چاہئے کہ اس شخص کے دل پر کیا گذر رہی ہوگی جس کے متعلق سلم بن سالم کی شہادت گذر چکی ہے کہ

میں نے بڑے بڑے لوگوں سے ملاقات کی لیکن محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کا احترام اور اس امت کی ہمدردی ابوحنیفہ کے دل میں جتنی پائی، اس کی نظیر دیکھنے میں نہیں آئی۔

فرزدق جیسا لاابالی شاعر بھی جن واقعات پر تڑپ اٹھتا ہو تو ابوحنیفہ اور ان جیسے

اکابر اسلام کے قلوب کی کیفیت کا کون اندازہ کرسکتا ہے۔ بس سمجھنا چاہیے کہ اندر ہی اندر آگ سلگ رہی ہوگی، جہاں تک میں سمجھتا ہوں اس اندرونی آگ کو خالد سے زیادہ سمجھنے والا اور کون ہوسکتا تھا۔ میرا خیال ہے کہ اس کے دماغ میں ایک چال آئی۔

خالد کی ایک عجیب چال:

کہا یہ جاتا ہے کہ یوسف خالد پر سرکاری مطالبات کی پابجائی کے لیے جیسے روزانہ تشدد کیا کرتا تھا ایک دن جیل سے بلوا کر طرح طرح کی سزائیں دے کر دریافت کررہا تھا کہ آخر بتا تو نے مال کن لوگوں کے پاس چھپایا ہے۔ خدا جانے خالد پہلے سے سوچ کر آیا تھا یا اسی وقت اسے یہ سوجھی۔ اس نے کہنا شروع کیا کہ سچ سچ پوچھتے ہو تو اس عرصہ میں جو کچھ میں نے دولت جمع کی، اس کا بڑا حصہ میں نے مدینہ منورہ میں تین آدمیوں کے پاس محفوظ کرادیا ہے۔ یوسف نے چونک کر پوچھا: مدینہ میں؟ بولا ہاں ہاں اور اس کے بعد اس نے ان لوگوں کے نام بتاتے ہوئے جن کے پاس مدینہ میں اس نے مال محفوظ کرانے کا دعویٰ کیا تھا حضرت امام زین العابدین علیہ السلام کے صاحبزادے حضرت زید بن علی الشہید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا بھی نام لیا۔

جیسا کہ میں نے پہلے بھی بیان کیا ہے کہ خالد کے متعلق بنی امیہ کو اس کی شکایت بھی تھی کہ ہاشمیوں کے ساتھ سلوک کرتا ہے اور اس نے ہشام کو اس بات کی خبر دی کہ ہشام نے اسی وقت ان لوگوں کے متعلق کوفہ پہنچنے کا انتظام کرادیا اور یہ لوگ کوفہ پہنچ گئے، جن میں حضرت زید بن علی الشہید بھی تھے۔ یوسف نے خالد کے سامنے ان لوگوں کا اظہار لینا شروع کیا۔ خالد کو دیکھ کر حضرت زید نے فرمایا کہ ''بھلا یہ ہمارے پاس مال کیوں جمع کرانے لگا۔ صبح وشام برسر منبر میرے جدامجد حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو گالیاں سناتا ہے۔ پھر خالد سے پوچھا کہ آخر تجھے یہ کیا سوجھی؟ اس نے جو جواب دیا اس کا ذکر مقصود ہے۔ اس نے کہا۔

شدد علی العذاب	میری سزا سختیوں میں بہت شدید ہوگئی، اس لیے میں
فادعیت ذلک واملت	نے یہ دعویٰ کردیا کہ آپ لوگوں کے پاس مال میں نے
ان یاتی اللہ بفرج قبل	جمع کرایا ہے۔ غرض میری یہ تھی کہ شائد خدا اسی کو میری

قدومکم (ص ۸۴) مصیبت کے ازالہ کا سبب بنا دے (یعنی آپ لوگوں کی تشریف آوری سے میری مشکل حل ہو جائے)۔

ظاہر ہے کہ خالد جیسے آزاد آدمی کے متعلق یہ فرض کرنا کہ ان بزرگوں کے قدوم میمنت لزوم کی برکت اور غیبی لاہوتی امداد کی وہ توقع کئے ہوئے تھا کہ صحیح نہ ہوگا۔ بلکہ جہاں تک میں سمجھتا ہوں اسے بڑی دور کی اور پتہ کی سوجھی۔ خالد کے اس فقرے کا جو مطلب ہے۔ اس کو پیش کرنے سے پہلے میں چاہتا ہوں کہ حضرت زید بن علی علیہ السلام کے مختصر حالات درج کرلوں کہ اسی سے اس فقرے کا مطلب سمجھ میں آ سکتا ہے۔

حضرت زید بن علی کے کچھ اجمالی حالات:

واقعہ یہ ہے کہ دشت کربلا کی مصیبت اور اس کے بعد مسلسل بنی امیہ کے فولادی پنجوں کی آہنیں گرفتوں نے عام مسلمانوں پر اوس ڈال دی تھی۔ باطل کے مقابلہ میں اٹھنے کی تاب مسلمانوں میں عموماً باقی نہ رہی اور سب سے زیادہ خصوصیت کے ساتھ جو دنیا میں پیسے گئے، وہ فاطمہ اور علی کی اولاد تھی (رضی اللہ تعالیٰ عنہا عنہ) جب حال یہ ہوگیا ہو جیسا کہ امام زین العابدین سے منقول ہے کہ بیمار ہونے کی وجہ سے لوگوں نے ان کو قتل کرنے سے چھوڑ دیا۔ فرماتے ہیں کہ ان ہی میں سے ایک آدمی مجھے چھپا کر اپنے گھر لے گیا اور میری خاطر و مدارات کرتا' جب گھر آتا یا گھر سے جاتا تو میرے حال پر ترس کھا کھا کر روتا۔ میں نے اپنے دل میں سوچا کہ اس سے زیادہ وفادار آدمی اب کون ہو سکتا ہے۔ حضرت کے الفاظ یہ ہیں۔

إن یکن عند أحد من الناس خیر و وفاء فعند هذا. اگر بھلائی اور وفاداری کسی کے پاس ہو سکتی ہے تو اس شخص کے پاس ضرور ہوگی۔

(طبقات ج۵ ص۱۵۷)

مگر فرماتے ہیں: چند روز بھی گذرنے نہ پائے تھے ابن زیادہ نے عام اعلان کیا کہ علی بن حسینؓ (یعنی امام زین العابدین) کا جو پتہ دے گا اور لا کر حاضر کر دے گا تین سو درم اسے انعام میں دیئے جائیں گے۔ یہ سننے کے ساتھ میرے لیے ہر وقت رونے

والا وہی آدمی جس نے مجھے پناہ دی تھی۔ دیکھتا کیا ہوں کہ رسی لیے ہوئے آ رہا ہے اور میرے ہاتھ باندھ کر ان کو گردن سے باندھ رہا ہے روتا جاتا ہے اور باندھتا جاتا ہے۔ یہ بھی کہتا جاتا ہے کہ أخاف (مجھے ڈر لگتا ہے) اور اسی طرح باندھے بھاندے اس نے اطمینان سے مجھے ابن زیادہ کے پاس لا کر کھڑا کر دیا اور تین سو درم لے کر روانہ ہو گیا۔ ابن زیاد کی نظر جوں ہی کہ مجھ پر پڑی، چند باتوں کے بعد اس نے حکم دیا کہ اس کی گردن اڑا دی جائے یہ سنتے ہی میری پھوپھی زینب بنت علی چیخ اٹھیں۔

یا ابن زیاد حسبک من دمائنا أسئلک بالله ان قتلته الا قتلتني. (طبقات ج۵ ص ۱۵۷)	ہمارے گھرانے سے جتنا خون لیا گیا ہے ابن زیادہ وہ بہت کافی ہے میں خدا کا واسطہ دے کر کہتی ہوں اس بچے کو اگر قتل ہی کرنا چاہتا ہے تو پہلے مجھے قتل کر لے۔

ان کی اس چیخ سے ابن زیاد متاثر ہو گیا اور میری جان بچ گئی (دیکھو طبقات ابن سعد)

اسی لیے حضرت نے ان لوگوں سے جو اہل بیت سے محبت کے دعوے کر کر کے ان حرکات کا ارتکاب کیا کرتے تھے، فرماتے کہ

أحبو ناحب الاسلام فما هرج بنا حبكم حتى صار علينا عارا (طبقات ص ۱۵۸)	بس اسلام کی اخوت کے تعلق سے لوگو مجھ سے محبت کرو تم لوگوں کی محبت تو ہمارے لیے باعث ننگ و عار بن گئی؟

کبھی فرماتے کہ:

''تم لوگوں کی اسی محبت نے دنیا کو ہم لوگوں کا دشمن بنا دیا ہے۔''

یہ بھی فرماتے کہ:

''معروف (شرعی نیکیوں) کے کرنے اور منکر (غیر شرعی امور) سے بچنے کے حکم سے اعراض کرنا خدا کی کتاب کو پس پشت ڈالنا ہے۔''

مگر جن حالات میں وہ گرفتار تھے، ان کی طرف اشارہ کر کے فرماتے الا ان تتقوا منهم تقا (یعنی بداندیشوں سے بچنے کے لیے بچنے کی کوئی تدبیر کی جائے)

پوچھا جاتا کہ اس کا کیا مطلب ہے۔ جواب دیتے کہ

یخاف جباراً عنیداً یخاف أن یفرط علیه أو یطغی.	زبردستی کرنے والے کینہ پروروں سے آدمی ڈرے ڈرے اس بات سے کہ وہ ظلم اور زیادتی کریں گے۔

اس اندیشے سے اپنے آپ کو ان کے مظالم سے بچانے کے لیے ایسی تدبیر اختیار کی جائیں جو ظلم سے اس کو محفوظ رکھیں۔

اہل بیت کو اتنا کچل دیا گیا کہ مدینہ میں جب حرہ کا واقعہ پیش آیا۔ حالانکہ زیادہ تر اس واقعہ کے پیش آنے میں بڑا سبب حضرت امام حسین علیہ السلام کی کربلا میں شہادت ہی تھی لیکن طبقات میں لکھا ہے، خود حضرت سید زین العابدینؒ کا بیان ہے کہ

ما خرج فیها أحدمن آل أبی طالب ولاخرج من فیها من بنی عبدالمطلب لزموا بیوتهم (ص ۱۵۹)	ابوطالب کے خاندان میں سے بھی کوئی آدمی اس ہنگامے میں شریک ہونے کے لیے نہ نکلا اور نہ عبدالمطلب کے گھرانے والے نکلے سب کے سب اپنے گھروں میں پڑے رہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حادثہ کربلا کے بعد اہل بیت نبوت والوں نے سیاسی قصوں سے اپنے آپکو الگ تھلگ کر لیا تھا۔ خود امام زین العابدین علیہ السلام نے اپنی پوری زندگی عبادت و ریاضت و مجاہدے میں گذاری، مدینہ منورہ کے پاس عقیق نامی ندی کے کنارے جو محلّہ تھا وہیں آپ نے مکان بنوالیا اور اپنے بال بچوں، خاندان والوں کے ساتھ صبر و شکر کے ساتھ زندگی کے دن پورے کر رہے تھے، اگرچہ ریحانۃ النبی سیدنا حسین علیہ السلام کی اولاد ذکور میں آپ تنہا باقی رہ گئے تھے لیکن خدا نے آپ کی اولاد میں برکت دی۔ اپنے بعد کو ذکور و اناث کی شکل میں اپنی اولاد کی کافی تعداد آپ نے چھوڑی، جن میں سب سے زیادہ شہرت امام باقر محمد بن علی بن حسینؒ نے حاصل کی، آپ کی والدہ امام حسن علیہ السلام کی چونکہ صاحبزادی تھیں اس لیے دونوں بھائیوں کی نمائندگی آپ کا وجود باجود کرتا تھا۔ گو آپ کے ایک حقیقی بھائی عبداللہ بن علی بھی تھے لیکن

عظمت واحترام کا جو مقام عالی امام باقر کو حاصل ہوا یہ کچھ ان ہی کی خصوصیت تھی۔ سیدنا زین العابدینؒ کے دوسرے صاحبزادے دوسری عورتوں سے تھے جن میں ایک زید بن علی الشہید رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی ہیں۔

ہندوستان اور خاندانِ نبوت:

لکھنے والوں نے تو خود حضرت امام زین العابدینؒ تک کے متعلق اگرچہ یہ لکھ دیا ہے کہ

قیل إن أم زین العابدین یقال لھا غزالہ وقیل سلامہ من بلاد السند. (الیافعی ص۱۹۱ ج۱)	کہا گیا ہے کہ امام زین العابدین کی والدہ جن کا نام غزالہ یا بعض سلامہ بتاتے ہیں، سندھ کی رہنے والی تھیں۔

گو یہ اس عام اور مشہور روایت کے خلاف ہے کہ آپ کی والدہ محترمہ یزدجرد کی شاہزادی تھیں جن کا ایرانی نام شہر بانو اور عربی نام سلافہ رکھا گیا تھا الیافعی نے یہ بھی لکھا ہے کہ:

وأمه[1] سلافه بنت یزد جرد	حضرت زین العابدین کی والدہ کا نام سلافہ تھا

[1] الیافعی نے اسی سلسلہ میں الزمخشری کے حوالہ سے یہ عبارت نقل کی ہے جس کا ترجمہ یہ ہے کہ ''ایران کے قیدی جب مدینہ لائے گئے تو یہ معلوم کر کے کہ ان قیدیوں میں شاہی خاندان کی چند شاہزادیاں بھی ہیں۔ حضرت علیؓ نے حضرت عمرؓ کو یہ مشورہ دیا کہ شاہی خاندان کی شاہزادیوں کے ساتھ عوام کا معاملہ کرنا درست نہ ہوگا۔ آخر حضرت علیؓ نے ان تینوں شاہزادیوں کو بیت المال میں قیمت ادا کر کے لے لیا اور آپؓ ہی نے ان میں سے ایک کو حضرت عمرؓ کے صاحبزادے عبداللہؓ اور دوسری کو حضرت ابوبکرؓ کے صاحبزادے محمدؒ اور تیسری کو امام حسین علیہ السلام کو عطا فرما دیا۔ امام زین العابدین رضی اللہ تعالیٰ عنہ ان ہی شاہزادی کے بطن سے پیدا ہوئے۔ اسی طرح حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے گھر میں جو شاہزادی داخل ہوئیں ان سے سالمؒ اور محمد بن ابی بکرؓ والی شاہزادی سے قاسم بن محمدؒ پیدا ہوئے' تینوں اپنے وقت کے امام تھے۔ علم وفضل، تقویٰ وطہارت، ریاضت ومجاہدہ میں ان تینوں کے برابر مشکل ہی سے کوئی آدمی مدینہ منورہ میں اس زمانہ میں تھا۔ لکھا ہے کہ ان ہی تینوں صاحبزادوں کو دیکھ کر عربوں کا یہ خیال بدل گیا کہ عجمی عورتوں سے بچے نہ پیدا کرانا چاہیے لیکن ان کو دیکھ کر کثرت سے لوگ عجمی خواتین کو اپنے بچوں کی مائیں بنانے لگے۔ (دیکھو الیافعی ص۱۹۱ ج۱)

آخر فلوک فارس ۱؎ یزدگرد ایران کے آخری بادشاہ کی صاحبزادی تھیں۔
(ص ۱۹۰ ج ۱)

۱؎ دراصل ایک زمین کے قصے میں دونوں میں کچھ جھگڑا ہوا تھا۔ عبداللہ بن حسنؒ نے اس موقعہ پر یہ کہتے ہوئے کہ اس زمین پر تم کیسے قبضہ رکھ سکتے ہو حالانکہ تم تو ایک ہندوستانی عورت کے بطن سے ہو بعض روایتوں میں ہے کہ عبداللہ نے کہا کہ **افطمع أن تنالها وأنت لامة سنديه** (کیا تم اس زمین کی خواہش کرتے ہو حالانکہ تم ایک سندھی عورت کے بطن سے ہو (طبری ص ۲۶۳ ج ۸) بہرحال اس سے معلوم ہوتا ہے کہ غالباً آپ کی والدہ سندھ کی تھیں۔ ہند کا لفظ چونکہ سندھ کو بھی شامل تھا اس لیے ہی کبھی سندھیہ اور کبھی ان کی والدہ کو ہندیہ کہہ دیا ہو۔ واللہ اعلم بالصواب۔ اتنا یقینی ہے کہ وہ ہند بمعنی الاعم کی ضرور تھیں اب خواہ سندھ کی ہوں یا ہندوستان کے کسی دوسرے مقام کی زیادہ قرینہ سندھ ہی سے ہونے کا ہے، طبری نے یہ بھی لکھا ہے کہ اس عار دلانے پر بجائے خفا ہونے کے تضاحک زید (حضرت زید ہنس پڑے اور ایک فقرہ استعمال کیا یعنی اپنی ہندوستانی ماں کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا کہ "**فوالله لقد صبرت بعد وفات سيدها فما تعتب بابها اذا لم يصبر غيرها**" جس کا حاصل یہ ہے کہ میری ماں نے اپنے شوہر کے انتقال کے بعد صبر کیا اور کسی دوسرے آدمی سے شادی نہیں کی حالانکہ اس کے مقابلہ میں دوسری عورت نے تو صبر سے کام نہیں لیا' کہتے ہیں کہ یہ اشارہ عبداللہ بن حسن کی والدہ کی طرف تھا بعد کو زید اپنے اس قول سے پشیماں بھی ہوئے کہ میں نے ایسا کیوں کہا۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت زید کی والدہ نے ہندوستانی دستور عقد بیوگاں کے مسئلہ میں جو تھا اس کو عرب میں بھی نباہا (دیکھو طبری ص ۲۶۲ ج ۸ مطبوعہ مصر) بہرحال اگر یہ صحیح ہے کہ حضرت زید شہید کی ننہال ہندوستان تھی تو اس ملک میں جو آج کل زیدی سادات آباد ہیں وہ بھی اس کا دعویٰ کر سکتے ہیں، واقعہ بھی کچھ عجیب ہے اس میں کچھ شک نہیں کہ مختلف قرون وار میں سادات کی مختلف شاخیں ہندوستان میں آ کر آباد ہوئیں۔ لیکن جو امتیاز اس ملک میں زیدی سادات نے حاصل کیا مشکل ہی سے دوسری شاخوں میں اس کی نظیر مل سکتی ہے۔ بارسر کے سادات' بلگرام کے سادات کا ہندوستان کی اسلامی تاریخ میں جو حصہ ہے اس سے کون ناواقف ہے، جاننے والے جانتے ہیں کہ زیدی سادات ہی سے دونوں کا تعلق تھا، انگریزی عہد میں بھی سرسید علی امام سید حسن امام وغیرہ نے جو اقتدار حاصل کیا اس کا کون انکار کر سکتا ہے ان لوگوں کا تعلق بھی زیدی سادات ہی سے تھا۔ بہار میں ایک ممتاز گاؤں زیدی سادات کا آباد ہے جنہیں جاجنیری سادات کہتے ہیں اور زندگی کے ہر شعبہ میں ان کو نمایاں دیکھا جاتا ہے۔ کیا اس میں ہندوستان کے ساتھ ان کے اس نسلی تعلق کو بھی دخل ہے؟ واللہ اعلم بالصواب

حضرت زیدؒ:

بہرحال امام زین العابدین رضی اللہ عنہ کی رگوں میں ہندوستانی خون تھا یا نہ تھا۔ لیکن ان کے صاحبزادے زید کے متعلق مورخین کا اتفاق ہے کہ ان کی والدہ ہندیہ تھیں۔ طبری نے حضرت زید اور ان کے چچازاد بھائی عبداللہ بن حسن سے جس گفتگو کو نقل کیا ہے اس میں عبداللہ بن حسن نے صاف لفظوں میں زید کو کہا کہ:

یا ابن الهندکیه. اے ہندوستانی عورت کا بچہ۔(دیکھو صفحہ ۳۵)

میں تو سمجھتا ہوں کہ اگر یہ صحیح ہے یعنی حضرت زید کی والدہ تو "ہندکیہ" تھیں اور جیسا کہ کہتے ہیں کہ ان کی دادی شہر بانو ایرانیہ خاتون بلکہ شاہزادی تھیں تو اس کا مطلب گویا یہی ہوا کہ ان میں عربی، قریشی، ہاشمی، فاطمی، علوی خصوصیات کے ساتھ ساتھ ایرانی اور ہندوستانی صفات بھی موروثی طور پر منتقل ہوئے۔ شاید ہی اس زمانہ میں اس قسم کے موروثی خصوصیات کسی شخص واحد میں جمع ہوئے ہوں۔

شکل وصورت:

اسی لیے لکھا ہے کہ حضرت زید غیر معمولی طور پر حسین و جمیل تھے۔ شیخ ابو محمد یحییٰ الشافعی کے حوالہ سے "الروض الکبیر" میں جو زیدی فقہ کی کتاب ہے اس کے مقدمہ میں نقل کیا ہے کہ

كان أبيض اللون أعين مقرون الحاجبين تام الخلق طويل القامة كث اللحيه عريض الصدر أقنى الأنف أسود الراس واللحيه إلا أنه خالطه الشيب في عارضيه (ص ۴۹ مقدمه الروض النضير)

حضرت زید کا رنگ گورا تھا آنکھیں بڑی بڑی ابرو دواں ملے ہوئے تھے، جسم کی بناوٹ مکمل تھی، قد دراز تھا، داڑھی گھنی، سینہ فراخ و کشادہ، بلند بینی، داڑھی اور سر کے بال سیاہ تھوڑی سی آمیزش سفید بالوں کی دونوں رخساروں کے اطراف میں ہو چکی تھی۔

شاید حضرت زید کی ان صوری خصوصیتوں میں ان تمام چیزوں کی جھلک پائی جاتی

ہے جنھیں نسبتاً ان میں ہونا چاہئے تھا۔ اسی طرح ان کے باطنی صفات میں بھی بین طور پر موروثی آثار کے جلوے نظر آتے ہیں۔ غیر معمولی ذہین و فطین، علم دوست، معارف پرور ہونے کے ساتھ ساتھ بڑے بہادر اور نڈر تھے۔

حضرت زید کے متعلق امام کی شہادت:

دوسری شہادتوں کے ساتھ خود حضرت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی بھی شہادت اس باب میں یہ نقل کی گئی ہے یعنی حضرت امام فرماتے تھے:

شاهدت زيد بن علي كما شاهدت أهله فما رأيت في زمانه أفقه منه ولا أعلم ولا أسرع جوابا ولا أبين قولا.	میں نے زید بن علی کو دیکھا تھا جیسے ان کے خاندان کے دوسرے حضرات کے مشاہدے کا موقعہ مجھے ملا ہے، میں نے ان کے زمانے میں ان سے زیادہ فقیہ آدمی اور کسی کو نہیں پایا اور ان جیسا حاضر جواب اور واضح صاف گفتگو کرنے والا آدمی اس عہد میں مجھے کوئی نہ ملا۔

اخیر میں امام صاحب کا بیان اس لفظ پر ختم ہوا ہے۔

لقد كان منقطع القرين — درحقیقت ان کے جوڑ کا آدمی اس زمانہ نہ تھا۔

(ص ۵۰ روض)

اور امام ہی کیا اس عہد کے بڑوں میں مشکل ہی سے کوئی آدمی نظر آتا ہے جس سے حضرت شہید کے متعلق اسی قسم کے الفاظ منقول نہیں ہیں۔ الشعبی سے روایت کرنے والوں نے یہاں تک روایت کیا ہے کہ:

> زید بن علی سے بہتر بچہ شاید ہی کسی عورت نے پیدا کیا ہو، ایسا فقیہ، اتنا بہادر اور قانع عابد و زاہد مجھے کوئی دوسرا نظر نہ آیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ علمی اور دینی فہم و فراست کے ساتھ حضرت شہید کی دنیاوی سوجھ بوجھ غیر معمولی طور پر بہتر تھی۔

امام جعفر صادقؒ سے مروی ہے کہ شہید کی شہادت کی خبر جب معلوم ہوئی تو فرمایا:

ظلم ولاتهم فامرهم الصبر والكف وقال إني أقول كما قال عيسى بن مريم عليه السلام إن تعذبهم فانهم عبادک وان تغفرلهم فانک أنت العزيز الحكيم. (ص ۱۶۰ ج۵)

کیا تو حضرت والا نے ان کو صبر کی تلقین کی اور لڑائی جھگڑے سے بچے رہنے کی تاکید کی اور فرمایا کہ میں بھی ان ظالموں کے متعلق وہی کہتا ہوں جو عیسیٰ بن مریم علیہ السلام فرمایا کرتے تھے یعنی قرآن میں جو دعا حضرت عیسیٰ کی منقول ہے کہ ان تعذبهم فانهم عبادک وان تغفرلهم فانک انت العزيز الحكيم (اگر آپ ان کو سزا دیتے ہیں تو آپ کے یہ بندے ہیں، اور اگر ان کو بخش دیتے ہیں تو آپ کی ذات سب پر غالب ہے اور آپ ہی حکمت والے ہیں۔[1]

آخری فقرہ (حضرت کا یعنی امت محمدیہ کے لیے اسی دعا کو استعمال کرنا جو حضرت مسیح علیہ السلام عیسائیوں کے لیے فرمائیں گے) اس سے اس کا بھی پتہ چلتا ہے کہ اپنے نانا کی امت کے ان حالات کو دیکھ کر ان بزرگوں پر کیا گذر رہی تھی ایمان واسلام کے دعویٰ کے بعد جس قسم کے حرکات بنی امیہ کی حکومت کی سرپرستی میں مسلمانوں سے سرزد ہورہے تھے بہ ظاہر ان کے ازالہ کی امید سے مایوس ہو کر بجائے سختی کے ان کے رجحانات کچھ نرمی کی طرف مائل ہورہے تھے، بلکہ ''إرجاء'' جو فرقہ مرجیہ کا مسلک سمجھا جاتا ہے جس کا عام مطلب کتابوں میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ ایمان لے آنے کے بعد نجات کے لیے عمل صالح کی ضرورت کا یہ فرقہ انکار کرتا تھا۔ یعنی اپنے آپ کو مومن قرار دینے کے بعد جس کے جو جی میں آئے کرتا چلا جائے بہر حال وہ جنتی ہے اور دوزخ کی آگ ان

---

[1] بجائے غفور الرحیم کے اللہ تعالیٰ کی صفت عزت وغلبہ اور حکمت ودانائی کا حوالہ اپنی اس سفارشی دعا میں حضرت مسیح علیہ السلام نے کیوں دیا ہے، بڑا دلچسپ سوال ہے، بعض کہتے ہیں کہ گناہ پر سزا دینے کا قانون اللہ تعالیٰ ہی کا بنایا ہوا ہے۔ اپنے قانون کو وہ اگر اٹھالیں تو ان سے بڑا کون ہے جو پوچھے گا اور حکیم کے لفظ سے اشارہ اس سے بھی زیادہ گہری حقیقت کی طرف کیا گیا ہے۔ ۱۲

''واللہ میرے چچا ہم لوگوں میں سب سے زیادہ قرآن کے پڑھنے والے سب سے زیادہ اللہ کے دین میں سمجھ رکھنے والے اور رشتہ کا خیال کرنے والے تھے۔''

اور آخر میں فرمایا:

والله ماترک فینا لدینا ولا للآخرة مثله (روض ص ۵۰)	خدا کی قسم دنیا اور آخرت دونوں کے لیے یعنی دونوں کے متعلقہ مسائل کے لیے انھوں نے ہمارے خاندان میں اپنا جیسا آدمی نہیں چھوڑا۔

گویا حضرت زیدؒ کی اس جامعیت کا حضرت صادقؒ کی طرف سے یہ اعتراف تھا جو ان کے موروثی صفات کے منطقی نتیجہ ہونے کی حیثیت رکھتی تھی، بہر حال یہ تو ان کے فطری صفات کی طرف کچھ اشارے تھے' ان جبلی صفات کے ساتھ جن اکتسابی کمالات کو حضرت زیدؒ نے اپنے اندر جمع کیا تھا۔ اس کا اندازہ ان کی طالب علمانہ زندگی سے ہوتا ہے۔ میرے سامنے اس وقت ان کی مفصل سوانح عمری نہیں ہے، تاہم اجمالاً کچھ ان کا تذکرہ بھی ضروری ہے۔

بات یہ ہے جیسا کہ میں نے پہلے بھی عرض کیا کہ دشت کربلا کے زہرہ گداز مناظر نے اہل بیت کے افراد کو عموماً اور حضرت سیدنا امام زین العابدینؒ کو خصوصاً اتنا دل شکستہ بنا دیا تھا کہ زیادہ تر ان بزرگوں پر یک سوئی اور عزلت گزینی کے جذبات غالب آ گئے تھے۔ خصوصیت کے ساتھ سیاسی مسائل اور الجھنوں کے متعلق ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آئندہ قطعی طور پر یہ طے کر لیا گیا تھا کہ کچھ بھی گذر جائے' لیکن ان کانٹوں میں نہ الجھا جائے گا۔

طبقات ابن سعد میں حضرت امام زین العابدینؒ کے متعلقہ یہ روایت بھی نقل کی گئی۔

إن علي بن حسين كان ينهى عن القتال وأن قوما من أهل خراسان لقوه فشكوا إليه ماتلقون من	علی بن حسین یعنی حضرت امام زین العابدینؒ لوگوں کو جنگ وجدل سے منع کیا کرتے تھے۔ خراسان کے کچھ لوگ آپ سے آکر ملے اور (بنی امیہ کے حکمرانوں کے جن مظالم میں گرفتار تھے) ان کا شکوہ حضرت سے

پر حرام ہو جاتی ہے اگر چہ یہ بدترین قسم کی ارجائیت ہے، لیکن جہاں تک میرا خیال ہے ابتدا اس کی ان ہی رجحانات سے ہوئی جس کی جھلک اہل بیت ہی کے بزرگوں میں ابتداء پائی جاتی ہے۔ لکھنے والوں نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے فرزند محمد بن الحنفیہ کے صاحبزادے حسن بن محمد پہلے آدمی ہیں۔

من تکلم فی الارجاء (طبقات ص ۱۴۱ ج۵) جنھوں نے ''ارجاء'' کے مسلک پر گفتگو شروع کی۔

حضرت حسن بن محمد کی ایک کتاب:

یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ حسن بن محمد نے اپنے اس مسلک کی تائید میں کتاب بھی لکھی تھی اور مسلمانوں میں عام طور سے اس کتاب کو تقسیم کرانے کا بھی انھوں نے نظم کیا تھا۔ بہ ظاہر اس کے اسباب وہی معلوم ہوتے ہیں جو میں نے عرض کیا۔ آخر کیا سوچا جاتا۔ کیا یہ طے کرلیا جاتا کہ ایمان لانے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کی اکثریت پھر کفر کی طرف واپس ہو کر مرتد ہوگئی ہے۔ افسوس ہے کہ دنیا سے حسن بن محمد کی یہ کتاب غائب ہوگئی ہے یوں بھی خاص تاریخی چیز ہوتی اگر مل جاتی۔ کیونکہ پہلی صدی ہجری کا یہ خاص تالیفی کارنامہ ہے اب تک یا تو قرآن لکھا جاتا تھا یا رسول اللہ ﷺ کی حدیثوں کو لوگوں نے جمع کیا تھا۔ لیکن قرآنی آیات اور آثار واحادیث کو پیش نظر رکھ کر کسی خاص نظریہ کو پیدا کر کے اس پر کتاب لکھنا غالباً حسن بن محمد کا یہ پہلا کام تھا۔ اسی سے اس کا بھی پتہ چلتا ہے کہ جس ارجاء کو وہ پیش کر رہے تھے، وہ کون سا ارجا تھا۔[1]

---

[1] ارجاء کا ایک مطلب تو وہ ہے جو قرآنی آیت لها ما کسبت وعلیها ما اکتسبت (یعنی ہر شخص کو اپنے اچھے کیئے ہوئے کام کا نفع ملتا ہے اور برے کام کا وبال بھی بھگتنا پڑتا ہے) سے صراحۃً متصادم ہے عمل کا کوئی اثر ہی ان کے نزدیک نہیں ہے۔ لیکن ایک ارجاء معتزلہ وخوارج کے مقابلہ میں اہل سنت کا تھا کہ گنہ گاروں کو چاہے خدا عذاب دے' چاہے بخش دے پھر اپنے گناہوں کی سزا پانے کے بعد بالآخر مومن کے لیے نجات ہے اہل سنت کا یہ متفقہ عقیدہ ہے۔ ارباب اعتزال اس کو بھی ارجاء کہہ دیتے تھے کیونکہ ان کے نزدیک گناہ کبیرہ کے ارتکاب کے بعد آدمی مسلمان باقی نہیں رہتا ۱۲

بہر حال بجائے نفع کے چونکہ اس کتاب سے لوگوں میں اور دلیری پیدا ہو گئی۔ اس لیے لوگوں نے بیان کیا ہے کہ آخر میں حسن بن محمد کہتے تھے کہ

لوددت إنی کنت مت ولم أکتبہ (ص ۱۴۹) میری یہ آرزو ہے کہ کاش! میں مرجاتا اور میں نے اس کتاب کو نہ لکھا ہوتا۔

کچھ بھی ہو، مقابلہ اور تصادم کا خیال اہل بیت کے قلوب میں مضمحل ہو گیا تھا۔ اس کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ قدرتاً سیاسی دلچسپیوں سے الگ ہونے کے بعد زندگی کے دوسرے مشغلوں کی طرف ان کا مائل ہو جانا ضروری تھا جن میں عبادات وریاضات و مجاہدات کا جو سلسلہ تھا وہ تو خیر تھا ہی چوبیس گھنٹوں میں روزانہ ایک ایک ہزار رکعتوں کے ادا کرنے کا التزام کر لینا اور آخر وقت تک اس التزام کو نباہنا کیا معمولی بات ہے۔ لیکن اس کے علاوہ ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ خانوادۂ نبوت سے تعلق رکھنے کے باوجود علم کے طلب اور حصول میں بھی ان حضرات کا شغف غیر معمولی طور پر بڑھا ہوا تھا۔ ان فطری اور قدرتی بلندیوں کے ساتھ جو آپ کو موروثی طور پر ملی ہوئی تھیں لوگوں کو حیرت ہوتی تھی کہ حضرت امام زین العباد[1] موالی اور غلاموں کے تعلیمی اور افادی حلقوں میں شریک

لہ نجات سے ہمیشہ کے لیے محروم ہو جاتا ہے اور خوارج کبیرہ ہی نہیں صغیرہ گناہوں کے مرتکب کا یہی انجام قرار دیتے ہیں۔ امام ابوحنیفہؒ کی طرف بعضوں نے ارجاء کو جو منسوب کیا ہے وہ ثانی الذکر اہل سنت والا ارجاء ہو سکتا ہے بشرطیکہ انتساب صحیح ہو۔ ۱۲

[1] حضرت امام زین العابدین کی عبادت ومجاہدے کے حالات کتابوں میں پڑھیے' الیافعی نے بھی اس واقعہ کا تذکرہ کیا ہے کہ گھر میں حضرت کے آگ لگ گئی۔ آپ سجدے میں تھے۔ لوگ چلا رہے تھے لیکن آپ نے سجدے سے سر نہ اٹھایا۔ جب پوچھا گیا' تو فرمایا' جو آگ آنے والی ہے اس کی یاد نے اس آگ کی طرف متوجہ ہونے نہ دیا، فرزدق کا مشہور قصیدہ کتابوں میں حضرت کی شان میں جو لکھا گیا ہے نقل کیا جاتا ہے جس کا ایک شعر یہ ہے۔

هذا ابن خير عباد الله كلهم هذا التقى النقى الطاهر العلم

هذا الذى تعرف البطحاء وطائة والبيت يعرفه والحل والحرام

لیکن ہمارے محدثین اہل السنت کو اس شخص پر جس نے حضرت زید کے اجتہادات ومسائل کو جمع کر لہ

ہوتے ہیں۔ حضرت عمر کے آزاد کردہ غلام سالم جن کا علم میں اس زمانہ میں ممتاز مرتبہ تھا۔لوگوں نے امام کو ان کے حلقہ میں پاکر تعجب سے پوچھا کہ تدع قریشیا و تجالس عبدبنی عدی (قریش کے علماء کو چھوڑ کر بنی عدی کے غلام کے پاس بیٹھتے ہیں) جواب میں فرمایا:

انما یجلس الرجل حیث منتفع (طبقات ص ۱۶۱) آدمی وہیں بیٹھتا ہے جہاں سے نفع اٹھا سکتا ہے۔

حضرت زید کا علم و فضل:

اور اسی کا اثر ہم حضرت امام کے صاحبزادوں خصوصاً حضرت زید بن علیؒ میں پاتے ہیں۔یعنی اس زمانہ میں جن جن چیزوں کو علم سمجھا جاتا تھا اور ان کے ماہرین جہاں کہیں پائے جاتے تھے۔حضرت زید کے سوانح حیات سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے ان تمام علوم میں ان کے ماہرین سے دست گاہ حاصل کرنے کی کوشش کی حتیٰ کہ بیان کرنے والوں نے یہاں تک لکھا ہے کہ واصل[1] بن عطا جو اپنے بعض اعتزالی عقائد کی وجہ سے بدنام بھی تھا،

بقیہ کے دنیا میں پیش کیا اعتماد نہیں ہے۔اس شخص کا نام ابو خالد عمرو بن خالد الوسطی تھا۔اسماء الرجال کی کتابوں میں اس شخص پر جرح کی گئی ہے۔سب سے بڑا الزام اس پر یہ ہے کہ عطاروں کی دکان سے ردی کے کاغذ خرید لیتا اور جو حدیثیں ان کاغذوں میں ملتیں ان کو اپنی طرف منسوب کر کے روایت کرتا تھا۔تفصیل کے لیے میزان ذہبی اور لسان المیزان ابن حجر وغیرہ دیکھیے۔۱۲

[1] بصرہ کا نور باف (غزال) تھا عقلیت کا عارضہ جس فرقہ سے اسلام میں شروع ہوا یعنی معتزلہ کے قدیم سربرآوردہ لوگوں میں سمجھا جاتا ہے، گناہ کبیرہ کا ارتکاب مسلمان کو مسلمان باقی نہیں رکھتا۔لیکن وہ کافر بھی نہیں ہوتا یہ درمیانی منزل اسی کی تراشی ہوئی ہے۔جمل کے دونوں فریق میں سے ایک کو برسر غلطی سمجھتا تھا،لیکن کون غلطی پر تھا؟ اس کو متعین کرنے سے پرہیز کرتا تھا۔حضرت عائشہ، حضرت طلحہ،حضرت زبیر رضی اللہ عنہم صحابیوں کے متعلق بدبخت کہتا تھا کہ ایک دستہ بھاجی پر شہادت بھی ان لوگوں کی قابل قبول نہیں ہوسکتی۔لطیفہ یہ تھا کہ راء کا حرف اس کی زبان سے ادا نہیں ہوتا تھا۔لیکن الفاظ کا اتنا بڑا عظیم سرمایہ اس کے پاس تھا کہ ساری عمر لمبے لمبے خطبے دیتا رہا۔سب میں ایسے الفاظ استعمال کرتا تھا۔جن میں رے نہیں ہوتی تھی مثلاً بر (گیہوں) کو قمح،مطر (بارش) کو غیث کہتا۔بقیہ

آپ اس سے بھی استفادہ کرنے میں نہ جھجکے اور اسی چیز نے اس زمانہ کے مروجہ علوم (قرآن حدیث، فقہ و کلام) میں آپ کے پایہ کو اتنا بلند کر دیا تھا کہ گویا ان تمام علوم میں بذات خود وہ اجتہاد کا مقام رکھتے تھے آج بھی فرقہ زیدیہ کا خیال ہے کہ وہ ان ہی کے اجتہاد کے مقلد ہیں، حضرت کی طرف متعدد کتابیں اس فرقہ میں منسوب ہیں۔ جن میں بعض طبع بھی ہوگئی ہیں۔

قرآن سے تعلق:

خیر فرقہ زیدیہ اور ان کے خیالات سے اس وقت بحث نہیں لیکن اتنا مسلم ہے کہ خانوادہ نبوت میں حضرت زید نے طلب علم میں جتنی کوشش کی' اس خاندان میں اس کوشش کی نظیر نہیں ملتی۔ خصوصاً قرآن کے ساتھ آپ کا جو تعلق تھا، اس کا اندازہ اسی سے ہوسکتا ہے۔ جو خود آپ سے منقول ہے:

خلوت بالقران ثلاث عشر سنة (ص ۵۰ روض) — تیرہ سال تک قرآن کے مطالعہ کے لیے میں نے خلوت اختیار کی۔

تیرہ سال تک ہر چیز سے الگ ہو کر قرآن میں آپ کا یہ استغراق کس لیے تھا جہاں تک قرائن سے معلوم ہوتا ہے بات وہی تھی کہ امت اسلامیہ میں مختلف ملل وادیان

لہ واصل خواجہ حسن بصری کے حلقہ میں بھی بیٹھا تھا۔ اگر خدا کی توفیق رفیق ہوتی تو کسی مستقل کتاب میں اس قصے کی تفصیل کی جائے گی' اتنی بات اس وقت بھی لوگوں کے گوش گذار کر دیتا ہوں کہ سب سے پہلا فرقہ اسلام میں قدریوں کا پیدا ہوا۔ صحیح مسلم وغیرہ سے بھی معلوم ہوتا ہے، معبد بن خالد جہنی نے اس مسئلہ کو چھیڑ کر فرقہ بندی کی ابتدا کی، مقریزی نے لکھا ہے کہ معبد نے اساورہ کے ایک آدمی جس نے اپنی کنیت ابو یونس رکھ لی تھی اس مسئلہ کو اخذ کیا تھا۔ اسی لیے ابو یونس الاسواری کہلاتا تھا۔ اساورہ کون تھے ان کے تفصیلی حالات البلاذری وغیرہ میں ملیں گے۔ خلاصہ یہ ہے کہ ایران کے شاہی باڈی گارڈ یا شاہی جیش کا نام اساورہ تھا، ایرانی حکومت کی شکست کے بعد اس پوری ایرانی فوج نے حضرت سعد فاتح ایران سے خواہش کی کہ مسلمانوں کو جو رعائتیں حاصل ہیں اگر ہمیں عطا ہوں تو ہم مسلمان ہو کر اسلامی آبادیوں میں آباد ہو جاتے ہیں۔ ان کی شرط منظور کر لی گئی اور بصرہ پھر کوفہ وغیرہ میں آباد ہوئے۔ بلاذری نے تفصیل کے ساتھ ان کے حالات لکھے ہیں۔ اسلام سیاسی منافع کے لیے انھوں نے قبول کیا تھا۔

کے لوگ فوج درفوج جو داخل ہوئے، اور ہر ایک اپنے ساتھ کچھ اپنے موروثی عقائد و خیالات کے جراثیم بھی لایا مسلمان ہونے کے بعد شعوری اور زیادہ تر غیر شعوری طور پر ان میں بعضوں نے یہ کوشش کی کہ اسلامی عقائد ومسلمات اور اپنے موروثی عقائد وخیالات میں مصالحت وموافقت کی شکل پیدا کریں اور سچ پوچھیے تو پہلی صدی ہجری میں بیسیوں فرقوں کی اسلام میں جو بھرمار ہوگئی۔ تو اس کی ایک بڑی وجہ یہ واقعہ بھی تھا دوسری طرف حکومت قائمہ کے ساتھ مسلمانوں کو کیا تعلق رکھنا چاہئے۔ اس باب میں جیسا کہ گذر چکا طرح طرح کے خیالات لوگوں میں پھیلے ہوئے تھے چالیس چوروں کی جماعت مشائخ کی تھی اس نے تو سلاطین وقت کو ہر قسم کی مصلحت سے آزادی ہی بخش دی تھی۔ ان ہی کے بالمقابل خوارج اور ان کے بوقلموں خیالات رکھنے والے فرقے تھے جو بات بات پر مسلمانوں کی گردنیں اڑا دینا، ان کے جان و مال کو حلال سمجھ لینا عورتوں اور بچوں کو لونڈی اور غلام بنا لینا اسی کو بطور پیشہ کے اختیار کئے ہوئے تھے جن کی جرأتیں اس حد تک پہنچی ہوئی تھیں کہ حضرت مرتضیٰ علیہ السلام تک سے توبہ کرنے کا مطالبہ کرتے ہوئے کہتے کہ تب کما تبنا (تم بھی اسی طرح توبہ کرو جس طرح ہم نے توبہ کی ہے) اسی طرح آپ دیکھ چکے کہ خود اہل بیت کے اراکین سیاسی معاملات سے یک سوئی اور قطعی علیحدگی کا طریقہ اختیار کیے ہوئے تھے۔ الغرض یہی سوال کہ پراگندگی اور انتشار کے اس حال میں ''حق'' کیا ہے، جہاں تک میں سمجھتا ہوں، تیرہ سال تک قرآن کے استغراق میں اسی سوال کا شائد جواب حضرت زید تلاش کر رہے تھے۔ پھر اس کا جواب ان کو کیا ملا میری بحث کے دائرے سے اس کی تفصیل خارج ہے۔

حضرت زید کی ایک تقریر:

اجمالاً ان کی اس تقریر کا تذکرہ کرسکتا ہوں جو اس زمانہ کے مختلف اعتقادی فرقوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا جاتا ہے، حضرت شہید نے فرمایا تھا کہ میں ان لوگوں سے بھی بری ہوں جو حق تعالیٰ کو اس کے مخلوقات جیسی ہستی خیال کرتے ہیں [1] اور ان جبریوں سے بھی

---

[1] اشارہ ان لوگوں کی طرف تھا جو خداوند تعالیٰ کے لیے آدمی کی طرح آنکھ' کان' ہاتھ وغیرہ ثابت کرتے بلکہ بعض ان میں کہتے کہ بجز داڑھی اور شرم گاہ کے خدا میں وہ سارے اجزا پائے جاتے تھے

بری ہوں جنھوں نے بدکاروں اور شریروں کے دل میں یہ توقع پیدا کردی ہے کہ خدا ان کو یوں ہی چھوڑ دے گا (یعنی صرف ایمان کا دعویٰ کافی ہے نجات کے لیے عمل صالح کی ضرورت نہیں جو مرجیہ کا عقیدہ ہے) اور میں ان دین باختوں سے بھی بری ہوں جو حضرت علیؓ کو کافر کہتے ہیں اور ان رافضیوں سے بھی جدا ہوں جو ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کی تکفیر کرتے ہیں۔ مگر خیر ان باتوں کا تعلق تو دینی اور مذہبی عقائد و خیالات سے تھا، حکومت مسلطہ جن ناکردنیوں کا ارتکاب کر رہی تھی اور اس کے حکام جن ناگفتنیوں پر مسلمانوں کے حق میں جری ہو گئے تھے ان کے مقابلہ میں کیا طریقہ عمل اختیار کرلیا جائے۔ یقیناً اس خلوت بالقران کے تیرہ سالوں میں یہ سوال بھی ان کے سامنے تھا اور میں سمجھتا ہوں کہ اسی سوال کا جواب تھا جو کوفہ کی گلیوں میں آپ کے خون سے لکھا گیا بیان کیا جاتا ہے کہ اپنی شکست کا جب آپ کو یقین ہوگیا۔ تو اس وقت فرمایا کہ:

> ''شکر ہے اس خدا کا جس نے مجھے اپنے دین کو حد کمال تک پہنچانے کا اس وقت موقعہ عطا فرمایا۔''

اس کے بعد فرمایا اور یہی فقرہ خاص طور پر قابل توجہ ہے، یعنی فرمایا:

> ''جب کہ میں رسول اللہ ﷺ سے سخت شرمندہ تھا کہ ان کی امت کو معروف کا حکم میں نے کیوں نہیں دیا اور منکر سے کیوں نہیں روکا۔''

دوسری روایت کے الفاظ اسی کے قریب قریب ہیں یعنی آپ نے فرمایا:

> ''خدا کی قسم مجھے یہ چیز سخت ناگوار تھی کہ میں محمد رسول اللہ ﷺ سے ملاقات کروں اور اس حال میں ملاقات کروں کہ ان کی امت کو نہ معروف کا میں حکم دیئے ہوتا اور نہ منکر سے منع کیے ہوتا۔''

اسی روایت میں یہ بھی ہے کہ:

بقیہ ہیں جو آدمی کے جسد میں ہیں۔ ان کا یہ بھی خیال تھا کہ عرش کی جسامت اللہ میاں کی جسامت سے چار انگل زیادہ ہے کیونکہ عرش کی صفت قرآن میں عظیم آئی ہے کم از کم چار انگل تو اس تخت کو بڑا ہونا چاہیے جس پر خدا بیٹھا ہے۔ (العیاذ باللہ)

''خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اللہ کی کتاب اور رسول کی سنت کو جب میں نے
درست کرلیا تو اس کے بعد مجھے اس کی قطعاً پرواہ نہیں ہے کہ میرے لیے آگ
جلائی جائے اور مجھے اس میں جھونک دیا جائے۔'' (مقدمہ روض النفیر)

میرے خیال میں تو شائد ان کا یہی جذبہ تھا جس کی چنگاری ان کے اندر سلگتی اور بھڑکتی رہتی تھی مشہور محدث ابوعوانہ نے حضرت شہید کے متعلق جو یہ لکھا ہے کہ:

كان زيد بن علي يرى الحياة	زید بن علی کے لیے زندگی ایک بوجھ بن گئی تھی
غراماً و كان ضجراً بالحياة	اور زندگی سے وہ تنگ آ چکے تھے۔

(ص ۵۵ مقدمہ روض النضیر)

یہی خیال کہ اپنے نانا محمد رسول اللہ ﷺ کو کیا منہ دکھاؤں گا، اسی چیز نے شاید ان کی زندگی کو ان پر دوبھر کردیا تھا۔ حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ جو کچھ اندر تھا، وہ باہر کیسے آئے اسی فکر میں زندگی کے ایک بڑے حصہ میں وہ سرگرداں اور پریشان تھے کہ اچانک ابن النصرانیہ کو بات سوجھی یا سجھائی گئی۔ وہ حضرت کے پاس مال کے رکھوانے کا دعویٰ کرتا ہے اور ہشام کے لیے ''مال'' کی آواز سے زیادہ دلچسپ آواز کوئی نہ تھی۔ المسعودی نے اس کی خصوصیت ہی یہ لکھی ہے کہ كان يجمع الأموال (یعنی مال جمع کرنے کا اس کو بہت ڈھب تھا) حتیٰ کہ اسی کا بیان ہے کہ

''ہشام کے عہد میں لوگ اسی کی روش پر چلنے لگے جس کے پاس جو کچھ تھا
اس کے دبا لینے کی فکر میں ڈوب گیا حسن سلوک کے راستے مسدود ہوگئے
اور مہمان نوازی کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔'' (المسعودی برحاشیہ کامل ج ۷ ص ۱۴۴)

بھلا جس بادشاہ کا حال یہ ہو کہ رعایا پر خواہ کچھ ہی گذر جائے لیکن اپنے غلہ کی فروخت کی فکر دوسروں کے غلوں کی بکری سے پہلے ہو' یہ بادشاہ ہوا یا کوئی اور......

بہرحال ہوا یہی جیسا کہ پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ سننے کے ساتھ ہشام نے اسی وقت مدینہ کے والی کے نام فرمان روانہ کیا کہ زید اور جن جن لوگوں کا نام خالد نے اس سلسلہ میں لیا ہے ان کو میرے پاس دمشق بھیج دو' فرمان مدینہ آتا ہے والی ان سب کو

واقعہ سے مطلع کرتا ہے۔ حضرت زید حیرت میں رہ جاتے ہیں کہ کہاں خالد اور کہاں اس کا مال' والی نے بھی سن کر یہی کہا کہ آپ لوگ سچ کہتے ہیں مگر میں مجبور ہوں دمشق جانا پڑے گا۔ ولے برندش روانہ ہوئے دمشق پہنچے، ہشام نے پہلے خود پوچھ گچھ کی، طبری نے لکھا ہے کہ بیان سننے اور کافی جرح وسوال کے بعد ہشام کو حالانکہ اطمینان بھی ہوگیا خود اس نے اعتراف کیا کہ:

إنما عندی أصدق من ابن النصرانیه (ص ۲۶۱)	نصرانیہ کے لڑکے (خالد) سے آپ لوگ میرے نزدیک زیادہ سچے ہیں۔

حضرت زید کوفے میں:

چاہئے تھا کہ اب ان حضرات کو مدینہ منورہ واپس کر دیتا۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مال کی محبت میں اسے وسوسہ ہوا کہ شاید برسرزمین خالد کے روبرو ہونے کے بعد کوئی ایسی بات معلوم ہو جس سے مال کا پتہ چلے، اس نے دونوں کو حکم دیا کہ:

"آپ دونوں یوسف (گورنر کوفہ) کے پاس جایئے، تاکہ یوسف خالد سے آپ کے سامنے معاملہ دریافت کرے اور منہ پر اس کے دعوے کو جھٹلائے۔" (ص ۲۶۱ کامل)

اور یوں خود ہشام نے کوفہ پہنچنے کا حضرت زید کے لیے ایک ذریعہ پیدا کر دیا تقدیر اسی کا نام ہے۔ امراء بنی امیہ ہمیشہ اس کی نگرانی رکھتے تھے کہ اہل بیت کا کوئی آدمی کوفہ پہنچنے نہ پائے۔ یا پہنچے بھی تو اس کی باضابطہ نگرانی رکھی جاتی تھی، لیکن مال کی محبت میں ہشام کچھ ایسا اندھا ہو رہا تھا کہ خود ہی قدغن کر کے باصرار تمام حضرت شہید اور ان کے ساتھ عبداللہ بن عباس کے پوتے داود بن علی کو زبردستی کوفہ پہنچا دیا جیسا کہ عرض کر چکا ہوں خالد اور حضرت زید کی دوبدو گفتگو جب ہوئی تو خود خالد نے اعلان کیا کہ میں نے مال ان حضرات کے پاس نہیں رکھوایا ہے اور حضرت زید کے یہ دریافت کرنے پر کہ پھر تو نے ہمارا نام کیوں لیا؟ اس نے جوبات جواب میں کہی تھی کہ آپ کے آنے سے مجھے توقع ہے کہ شاید نجات کی کوئی راہ نکل آئے۔ وہی بات سامنے آ گئی۔

کوفہ جہاں گذشتہ دنوں میں جو کچھ گذر چکا تھا وہ تو گذر ہی چکا تھا لیکن مسلمانوں کی مسجدوں کے منارے جو ڈھائے گئے تھے اور ان کے مقابلہ میں عیسائیوں کے لیے گرجا بنایا گیا تھا۔ ایمان والوں پر شرک وکفر کا تسلط قائم کیا گیا تھا' بادشاہ کی آمدنی میں تاکہ کمی نہ ہو رعایا کو بھوکوں مرنے پر مجبور کیا جا رہا تھا' خالد کے ہٹنے کے بعد جو دوسرے صاحب گورنر بن کر آئے وہ بھی سگ زرد کے بھائی شغال ہی نکلے صدق ابن اللخناء جس کا تکیہ کلام تھا' سچ بھی ان کے نزدیک جھوٹ تھا اور جھوٹ بھی جھوٹ تھا، دن کو رات کہنا بھی جرم تھا اور دن کہنا بھی گناہ، یہ اور اسی قسم کے بیسیوں ہرے زخم تھے جن میں کوفہ والے تڑپ رہے تھے۔ ظاہر ہے کہ ظلم وستم کی ان ہی تاریکیوں میں اچانک خانوادہ نبوت کے ایک چشم وچراغ کا ان تمام ظاہری وباطنی کمالات کے ساتھ ان لوگوں میں آ جانا جن کی ہر مومن قلب کو تلاش رہتی ہے' رحمت کے ایک فرشتہ ہی کا آ جانا تھا۔ نہ صرف عوام بلکہ کوفہ میں خواص کا جو طبقہ تھا، اس میں بھی ایک ہلچل پیدا ہو گئی۔ اتفاق کی بات دیکھئے کہ احمق یوسف نے بجائے کوفہ کے ایسے خطرناک دنوں میں حیرہ کو اپنا مستقر بنالیا۔ حضرت زید چونکہ خود خلیفہ کی طرف سے کوفہ تشریف لائے تھے۔ اس لیے اہل بیت کی آمد ورفت پر جو نگرانی حکومت کی رہتی تھی، اس نگرانی میں بھی قدرتاً نگرانوں نے تساہل سے کام لیا۔

کوفہ میں حضرت زید کے معتقدین:

بہر حال نتیجہ ان باتوں کا جو کچھ ہو سکتا تھا' وہی سامنے پیش آیا، عوام کو تو جانے دیجئے جیسا کہ میں نے عرض کیا۔ خواص کے طبقات میں بھی یہ بات محسوس ہونے لگی کہ حضرت زید کا اتفاقی طور پر کوفہ آ جانا ایک مغتنم موقعہ ہے۔ خواص سے میری مراد اہل علم و تقویٰ کا گروہ ہے جن کی کوفہ میں ایک بہت بڑی تعداد تھی۔ پھر ان میں بعض جو زیادہ جوشیلے تھے انھوں نے تو علانیہ حضرت زید کی طرف سے لوگوں سے بیعت تک لینی شروع کر دی۔ اس طبقہ کے سرکردہ وہی منصور بن المعتمر تھے جن کے متعلق کچھ دیر پہلے یہ تذکرہ کیا گیا تھا کہ حضرت امام ابوحنیفہؒ اور ابن معتمر خلوت میں مل مل کر باتیں کرتے اور روتے تھے۔ لکھا ہے کہ

كان منصور بن المعتمر يدور علي الناس ياخذ البيعة لزيد بن علي (ص ۵۵ روض)

منصور بن معتمر گشت کر کر کے لوگوں سے حضرت زید بن علی کے لیے بیعت لیتے تھے۔

بہ ظاہر ابن معتمر اور ان ہی جیسے بزرگوں کی کوششوں کا نتیجہ جیسا کہ تاریخوں میں بیان کیا جاتا ہے کہ چالیس ہزار انسانوں نے حضرت زید کے ساتھ مل کر بنی امیہ کی حکومت سے مقابلہ کرنے کا عہد کیا اور حضرت کے ہاتھ پر بیعت کی۔

اسی کے مقابلہ میں خواص ہی کا ایک دور اندیش طبقہ تھا جس کے سامنے کوفہ کی گذشتہ تاریخ کے اوراق کھلے ہوئے تھے، کوفہ والوں ہی نے ان ہی زید کے دادا حضرت امام حسین اور امام حسن رضی اللہ عنہما بلکہ خود حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے ساتھ جو کچھ کیا تھا وہ سب ان کے سامنے تھا اس طبقہ کے سرخیل مشہور محدث سلمہ بن کہیل تھے[1] انھوں نے صحابہ کی بھی آنکھیں دیکھی تھیں اور اہل بیت کے ساتھ خاص تعلق رکھنے کی وجہ سے کچھ تشیع میں بدنام بھی تھے۔ انھوں نے حضرت زید کو بہت سمجھایا پچھلے تاریخی واقعات یاد دلائے، لیکن سلمہؒ گفتگو کامیابی اور ناکامی کے نتائج کو پیش نظر رکھ کر کر رہے تھے اور شہید کے سامنے صرف ایک بات تھی۔ حضرت کی زبان مبارک پر چند اشعار بھی اس زمانہ میں جاری تھے ایک مصرعہ یہ بھی تھا!

انی امرء ساموت ان لم اقتل

میں ایک شخص ہوں بہر حال مروں گا اگر قتل نہ ہو سکا

کہتے ہیں کہ سلمہ بن کہیل نے جب دیکھا کہ حضرت اپنے ارادہ پر مستقل ہیں تو عرض کیا کہ مجھے کوفہ سے باہر نکلنے کی اجازت دیجئے شاید کوئی ایسا حادثہ پیش آ جائے جو

---

[1] منصور ابن المعتمر اور سلمہ بن کہیل کا مقام کوفہ میں کیا تھا۔ اس کا اندازہ اسی سے ہو سکتا ہے کہ عبد الرحمٰن بن مہدی مشہور ناقد و محدث کا قول تھا۔ لم یکن بالکوفة اثبت من اربعة منصور و عمرو بن مره و سلمه و ابو حصين (تہذیب) یعنی منصور اور سلمہ عمرو بن مرہ اور ابو حصین سے حدیث میں استوار ترین محدث کوئی دوسرا کوفہ میں نہ تھا۔

مجھ سے دیکھا نہ جاسکے (کامل ص ۸۷ ج ۷) اور واقعی کوفہ سے نکل کر یمامہ چلے گئے، لیکن جیسا کہ طبقات میں ہے۔

''سلمہ بن کہیل کا ۱۲۲ھ میں انتقال اسی زمانہ میں ہوا، جس زمانہ میں حضرت زید بن علی کوفہ میں شہید ہوئے۔'' (ص ۲۲۱)

اور حضرت شہید کی وہی بات:

انی امرء ساموت ان لم اقتل میں ایک شخص ہوں، بہر حال مروں گا اگر قتل نہ ہوسکا۔

پوری ہوئی۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ موت کے معمہ کا حل ''شہادت'' کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔

جاں بجاناں وہ وگرنہ از تو بستاند اجل
خود تو منصف باش اے دل ایں مکن یا آں مکن

مگر ظاہر ہے کہ یہ دونوں طبقہ مخلصین ہی کا تھا[۱] یعنی جو کچھ بھی یہ لوگ کہہ رہے تھے

---

[۱] میں نے مخلص کا لفظ اس لیے لکھا ہے کہ ان ہی کوفہ والوں میں ایک اور گروہ بھی تھا جو اہل بیت کے محبت کے دعوے میں سب سے آگے تھا۔ حضرت کے ارادے سے مطلع ہونے کے بعد ان کی خدمت میں حاضر ہو کر دریافت کیا کہ آپ کس چیز کی دعوت دیتے ہیں؟ جواب میں فرمایا ''اللہ کی کتاب کی طرف اور اللہ کے رسول کی سنت کو زندہ کیا جائے اس کی طرف تم لوگوں کو بلاتا ہوں اور یہ کہ دین میں جو نئی باتیں پیدا ہوگئی ہیں ان کا ازالہ کیا جائے۔ اگر میری بات سنتے ہو تو سعادت حاصل کرو گے اور انکار کرتے ہو تو میں تم پر داروغہ مقرر نہیں کیا گیا ہوں۔'' کہتے ہیں کہ اس پر ان لوگوں نے سوال اٹھایا کہ ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے؟ جواب میں ارشاد فرمایا کہ اس کے سوا اور کیا کہہ سکتا ہوں کہ رسول اللہ ﷺ کی صحبت و رفاقت میں ان حضرات نے زندگی گذاری اور صحبت و رفاقت کا حق ادا کر دیا۔ دونوں نے اللہ کی راہ میں جہاد کیا۔ کوشش کی جتنی کوشش بھی ممکن تھی اور میں نے اپنے گھر کے لوگوں میں کسی سے نہیں سنا کہ ان دونوں سے تبرا اور جدائی انھوں نے اختیار کی بلکہ جس کسی سے سنا ہمیشہ خیر اور بھلائی کے سوا کچھ نہ سنا۔ تب ان لوگوں نے کہا کہ پھر تم اپنے خاندان کے خون کا اور ظلم کا بدلہ لینا نہیں چاہتے۔ ابوبکر و عمر نے تمہارے خاندان کی حکومت پر قبضہ جمالیا اور دنیا کو تم لوگوں کی پیٹھ پر سوار کر دیا جس کا سلسلہ آج تک جاری ہے کہ لوگ تم لوگوں کو قتل کر رہے ہیں مار رہے ہیں۔ حضرت زید نے سن کر فرمایا: بلاشبہ ان لوگوں کے وہ حکم ہوئے اور ہم لوگوں کے بھی لیکن کتاب اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اور طریقے پر عمل کرنے میں ان لوگوں نے قطعاً

اخلاص وصداقت، وفاداری ہی کے تحت کہہ اور کر رہے تھے۔ پھر ان ہی مخلصین میں ایک اور طبقہ نظر آتا ہے جو ایک طرف کوفہ والوں کی تاریخی بے وفائیوں کو دیکھتے ہوئے کھل کر مقابلہ کا مشورہ دیتا ہے، اور چونکہ بنی امیہ کے مظالم کا پانی لوگوں کے سر سے اونچا ہو چکا تھا اس لیے اس مغتنم موقعہ کے ضائع ہو جانے پر اپنے آپ کو اس نے راضی نہیں پایا۔ اس گروہ کے سرخیل جہاں تک میرا خیال ہے کوفہ کے محدث جلیل اور امام نبیل الاعمش میں تاریخوں میں ان کا قول نقل کیا جاتا ہے کہ ایک طرف وہ یہ بھی کہتے جاتے تھے کہ

لے کسی قسم کی کوتاہی نہیں کی تب ان لوگوں نے کہا کہ اگر ابوبکر و عمرؓ نے تم لوگوں پر ظلم نہیں کیا تو پھر بنی امیہ بھی ظلم نہیں کر رہے ہیں اور جب واقعہ یہی ہے تو بنی امیہ سے مقابلہ کرنے کی دعوت ہم لوگوں کو کیوں دیتے ہو۔ کیونکہ ایسی صورت میں تو وہ بھی ظالم نہیں ہیں کیونکہ بنی امیہ والے تو ابوبکر و عمرؓ ہی کے طریقے کی پیروی کر رہے ہیں۔ اس پر حضرت زید نے فرمایا کہ بنی امیہ والے قطعاً ابوبکر و عمرؓ جیسے نہیں ہیں، بنی امیہ والے تو تم پر بھی ظلم کر رہے ہیں، اور خود اپنے آپ پر ظلم کر رہے ہیں۔ اور رسول اللہ کے گھرانے والوں پر ظلم کر رہے ہیں، یہی موقعہ تھا جس پر ان لوگوں نے مشہور لفظ استعمال کیا۔ یعنی بولے کہ ان بورئت منھما والا رفضناک (یا تو ابوبکر و عمر سے بیزاری کا تم اعلان کرو ورنہ ہم تمہارا ساتھ چھوڑ دیں گے) یہ سننے کے ساتھ کہا جاتا ہے کہ حضرت زید نے زور سے اللہ اکبر کی صدا بلند کرتے ہوئے فرمایا کہ میرے والد فرماتے تھے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت علی سے کہا تھا کہ ایک قوم ہوگی جو ہم لوگوں (اہل بیت سے محبت کرے گی، لیکن ان کا ایک لقب ہوگا، اسی سے وہ پہچانی جائے گی، جاؤ تم لوگ "الرافضہ" ہو (مقدمہ روض بحوالہ مقریزی وغیرہ)۔ کہتے ہیں کہ یہی پہلا دن تھا جس دن سے "رافضہ" کا لفظ دنیا میں چل پڑا، یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ حضرت زید سے ان لوگوں نے یہ بھی کہا کہ تم ہمارے امام نہیں ہو، انھوں نے پوچھا کہ پھر کون تمہارے امام ہیں؟ بولے کہ تمہارے چچا زاد بھائی جعفر ہمارے امام ہیں۔ حضرت زید نے کہا کہ بے شک اگر جعفر اس کا دعویٰ کریں کہ وہی امام ہیں۔ تو وہ سچ کہیں گے۔ خط لکھ کر ان لوگوں نے کہا کہ راستہ مدینہ منورہ کا آج کل بند ہے کوئی قاصد چالیس اشرفی سے کم میں خط لے جانے پر آمادہ ہی نہیں ہوتا۔ حضرت نے چالیس اشرفیاں اسی وقت حوالہ کیں اور فرمایا: قاصد روانہ کرو، لیکن صبح کو آ کر ان لوگوں نے کہا کہ جعفر تمہاری خاطر کرتے ہیں۔ مدارات سے کام لیتے ہیں اس پر زید نے فرمایا: افسوس تم لوگوں پر۔ کیا امام سخن سازی سے کام لیتا ہے، یا حق کو چھپاتا ہے۔ اس پر وہ لوگ چلے گئے۔ ۱۲

والله ليخذلنه والله ليسلمنه كما فعلوا بجده وعمه. خدا کی قسم یہ لوگ زید کو چھوڑ دیں گے، دشمنوں کے سپرد کر دیں گے جیسے ان کے دادا اور چچا کے ساتھ بھی ان ہی کوفہ والوں نے یہی سلوک کیا۔

لیکن اسی کے ساتھ بے چارے یہ بھی کہتے کہ:

والله لو لا ضرارة لي لخرجت معه (مقدمه روض) خدا کی قسم اگر (آنکھ میں) میرے ہرج نہ ہوتا تو ان کے ساتھ میں بھی نکل کھڑا ہوتا۔

یہ اعمش کے شاگردِ رشید امیر المومنین فی الحدیث شعبہ[۱] کی روایت ہے، کچھ یہی حال کوفہ کے دوسرے امام سفیان ثوریؒ کا معلوم ہوتا ہے یعنی حضرت کے ساتھ جنگ میں بھی شریک نظر نہیں آتے۔ لیکن اسی کے ساتھ ابوعوانہ کی روایت ہے کہ:

اذا ذكر زيد بن علي يقول بذل مهجته لربه وقام بالحق لخالقه والحق بالشهداء المرزوقين من آبائه (مقدمه روض. ص ۵۵) جب سفیان ثوری حضرت زید کا ذکر کرتے، تو کہتے اپنی جان اللہ کی راہ میں نثار کر دی اور اپنے خالق کی مرضی کی پابندی میں حق کو لے کر کھڑے ہوئے اور اپنے ان گذشتہ آباء واجداد میں شریک ہو گئے۔ جنھیں خدا نے شہادت روزی کی تھی۔

امام کی حضرت زید سے عقیدت:

مخلصین کے اسی طبقہ میں مجھے حضرت امام ابوحنیفہ بھی نظر آتے ہیں، لیکن اسی کے ساتھ امام کے متعلق بعض خصوصی واقعات بھی اسی سلسلہ میں بیان کئے جاتے ہیں، جن میں سب سے بڑی بات تو یہ نظر آتی ہے کہ امام ابوحنیفہ کو خود حضرت شہید رحمۃ اللہ علیہ نے یاد فرمایا اور اپنا ایک خاص قاصد جس کا نام فضیل بن زبیر تھا اس کو حضرت امام کے پاس روانہ فرمایا۔ یہ ایک ایسی خصوصیت ہے جو امام کے سوا اکابر کوفہ کے ساتھ جہاں تک روایات کا تعلق ہے حضرت شہید نے غالباً اختیار نہیں فرمائی۔ خود فضیل بن زبیر کا بیان ہے۔

---

[۱] الاعمش اور شعبہ حدیث ورجال کے ائمہ میں ان کے حالات کی تفصیل موجب تطویل ہوگی۔ اہل علم سے ان کے حالات پوشیدہ نہیں ہیں۔۱۲

کنت رسول زید بن علی الی ابی حنیفة. (ص ۵۵ روض)	میں امام ابوحنیفہ کے پاس حضرت زید کا قاصد بن کر گیا تھا۔

فضیل کا بیان ہے کہ امام ابوحنیفہ نے سب سے پہلے سوال اس سلسلہ میں مجھ سے جو کیا تھا وہ یہ تھا کہ

فقہاء (جو اس زمانہ میں طبقہ اہل علم کی تعبیر تھی) ان لوگوں میں سے حضرت زید کے پاس کن کن لوگوں کی آمد و رفت ہے۔

فضیل نے چند ممتاز ہستیوں کے نام گنوائے۔ نہیں کہا جا سکتا کہ امام ابوحنیفہ کی غرض اس سوال سے کیا تھی؟ بہ ظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان لوگوں کے ذریعہ سے تحریک کے انجام کے متعلق کچھ رائے قائم کرنا چاہتے تھے۔

حضرت زید کی حمایت میں حضرت امام کا ایک تاریخی بیان:

اور غالباً فضیل کے اسی جواب کے بعد امام نے اپنا وہ تاریخی بیان دیا جو چند معمولی الفاظ کے رد و بدل کے ساتھ حضرت امام کے سوانح عمریوں میں نقل ہوتا چلا آ رہا ہے مختلف مواقع پر اس بیان کے بعض اجزاء کا ضمنی ذکر میں نے پہلے بھی کیا ہے۔ لیکن وقت آ گیا ہے کہ حضرت امام کے اس ''بیان'' پر اب ذرا تفصیلی نظر ڈالی جائے۔ اس بیان کے چند اجزاء ہیں۔

(۱) پہلا جز تو یہ ہے کہ امام ابوحنیفہ نے یہ فتویٰ دیا کہ

خروجه یضاهی خروج رسول الله صلی الله علیه وسلم یوم بدر (ص ۲۶۰)	حضرت زید کا اس وقت اٹھ کھڑا ہونا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بدر میں تشریف بری کے مشابہ ہے۔

بہ ظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ فضیل بن زبیر کو ایلچی بنا کر حضرت شہید نے امام کے پاس جو بھیجا تھا تو گو لکھنے والوں نے صرف یہی لکھا ہے کہ

ارسل اعلی ابی حنیفة یدعوه الی نفسه (ص ۲۶۰)	حضرت زید نے فضیل کو ابوحنیفہ کے پاس اس لیے بھیجا تھا کہ اپنی ذات کی طرف امام ابوحنیفہ کو دعوت

دینا چاہتے تھے (یعنی میرے ہاتھ پر بیعت کرو)

لیکن جہاں تک میرا خیال ہے۔ ممکن ہے کہ اسی کے ساتھ امام سے اس باب میں حضرت شہید نے اگر یہ شرعی مشورہ بھی حاصل کیا ہو کہ موجودہ حالات میں بنی امیہ کی حکومت کے مقابلہ میں کھڑا ہونا شرعاً آپ کے نزدیک کس قسم کی بات ہے؟ تو اس کی بھی گنجائش ہے۔ ہوسکتا ہے کہ اسی کا جواب امام نے ان الفاظ میں دیا یعنی قریش کے مقابلہ میں آنحضرت ﷺ کا صف آرا ہو جانا جیسے ایک غیر مشتبہ فیصلہ تھا۔ اسی طرح گو اس وقت مقابلہ میں بجائے کافروں کے وہ لوگ ہیں جو اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں۔ لیکن اپنے طریقۂ عمل سے بنی امیہ کی حکومت جن نتائج تک پہنچ چکی ہے' ان کو دیکھتے ہوئے اس حکومت کے الٹ دینے کی کوشش قطعاً ایمان و اسلام کا اقتضاء ہے' گویا امام نے ان الفاظ میں حضرت زید کے خروج کی شرعی تصحیح فرمائی ہے جیسا کہ آئندہ معلوم بھی ہوگا کہ اس قسم کے مواقع میں حضرت امام کا جو مسلک تھا اسی مسلک کا اظہار ایک خاص قسم کی تعبیر کے ذریعہ فرمایا ہے' بلکہ اگر اسے خوش اعتقادی نہ قرار دیا جائے تو ایک طرح سے ان ہی الفاظ سے حضرت امام نے اس انجام کی پیش گوئی بھی کردی تھی جو آخر حضرت شہید کے سامنے آیا۔ مطلب یہ ہے کہ جس وقت فضیل حضرت شہید کا پیغام لے کر امام ابوحنیفہؒ کے پاس آئے تھے۔

حضرت زید کی دعوتِ جہاد:

جیسا کہ کتابوں سے معلوم ہوتا ہے، بجز ''الرافضہ'' کے قریب قریب سارے اہل کوفہ امام کے ساتھ ہو کر حکومت سے مقابلہ اور مقاتلہ کے لیے تیاری کا وعدہ کر چکے تھے' بلکہ لکھا ہے کہ چالیس ہزار آدمیوں نے تو حضرت شہید کے ہاتھ پر اس معاہدے کے متعلق باضابطہ بیعت بھی کی تھی جو حضرت شہید لوگوں سے لے رہے تھے یعنی حضرت زید فرماتے تھے۔

> ''ہم تم لوگوں کو اللہ کی کتاب اور رسول اللہ ﷺ کی سنت کی طرف دعوت دیتے ہیں اور تمھیں بلاتے ہیں کہ آؤ اور ظالموں سے جہاد کرو' جو کمزور ہو

گئے ہیں ان کو ظلم سے بچاؤ، اپنے حقوق سے جو محروم کئے گئے ہیں ان کے حقوق ان تک پہنچاؤ اور مسلمانوں کا یہ مال جو بیت المال میں جمع ہوتا ہے اس کو مساوی طور پر مسلمانوں میں تقسیم کرایا جائے۔"

لوگ جواب میں جب نعم (ہاں) کہتے تب آپ ہر بیعت کرنے والے کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر پھر فرماتے کہ:

"یہ خدا اور اس کے رسول کے ساتھ معاہدہ ہے کہ تم میرے ساتھ وفادار ہو گے اور میرے دشمن سے لڑو گے اور ظاہر و باطن، خلوت و جلوت میں میری بہی خواہی کرو گے۔"

جب اس کے جواب میں بھی نعم (ہاں) کی آواز آتی تب آپ ہاتھ پر ہاتھ کو پھیر کر فرماتے: اللھم اشھد. (اے اللہ گواہ رہ)۔

بعضوں نے اگرچہ لکھا ہے کہ اس طریقہ سے باضابطہ بیعت پندرہ ہزار آدمیوں نے کی تھی لیکن عام روایت چالیس ہزار ہی کی ہے۔ خود سلمہ بن کہیل کے مکالمہ میں یہ دریافت کرنے پر کہ اب تک کتنے آدمی آپ کے ہاتھ پر بیعت کر چکے ہیں۔ حضرت شہید نے اربعون[1] الفا فرمایا تھا، مگر جیسا کہ آخر میں ثابت ہوا کہ لڑنے کے لیے حضرت شہید

---

[1] سلمہ بن کہیل نے حضرت کو مقابلہ کے ارادے سے روکنے کے لیے جو مکالمہ کیا تھا اسی کی طرف اشارہ ہے۔ لکھا ہے کہ سلمہ نے حضرت شہید سے پوچھا: آپ کے ہاتھ پر اس وقت تک کتنے آدمی بیعت کر چکے ہیں؟

شہید:- "چالیس ہزار"

سلمہ:- اور آپ کے دادا حسینؓ کے ہاتھ پر بیعت کرنے والوں کی کتنی تعداد تھی؟

شہید:- اسی ہزار

سلمہ:- لیکن وقت پر حسینؓ کے ساتھ کتنے رہ گئے تھے؟

شہید:- تین سو۔

سلمہ:- خدا کا حوالہ دے کر عرض کرتا ہوں کہ آپ بہتر ہیں یا آپ سے زیادہ بہتر آپ کے دادا تھے؟

شہید:- میرے دادا بہتر تھے۔

سلمہ:- موجودہ دور کے لوگ زیادہ بہتر اور اچھے ہیں یا آپ کے دادا کے زمانے کے لوگ زیادہ اچھے تھے؟ بقیہ

جب باہر نکلے تو آپ کے ساتھ قریب قریب وہی تعداد رہ گئی تھی جو بدر میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھی۔ یعنی بعض روایتوں میں تو آپ کے ساتھ کل دوسو اٹھارہ[1] آدمی رہ گئے اور بعضوں میں بجائے دوسو کے تین سو کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ بدر کی تشبیہ سے امام ابوحنیفہ نے اس پیش آنے والے انجام کی طرف اشارہ نہ کیا تھا۔

(۲) دوسرا جزء امام کے بیان کا جوان کی طرف منسوب کیا گیا ہے وہ یہ ہے یعنی حضرت شہید کے پیامی (قاصد) سے امام ابوحنیفہؒ نے کہا:

لو علمت ان الناس لایخذلونہ   اگر میں جانتا کہ لوگ آپ کو وقت پر چھوڑ نہ دیں

شہید:- دادا کے زمانہ کے لوگ زیادہ بہتر تھے۔

سلمہ:- پھر جب آپ کے دادا کے ساتھ لوگوں نے وفاداری نہ کی تو کیسے خیال کرتے ہیں کہ یہ لوگ وفادار رہیں گے؟

اس کے جواب میں حضرت شہید نے جو بات کہی اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ باوجود سب کچھ جاننے کے وہ کچھ طے کئے ہوئے تھے۔ بعض روایتوں میں ہے کہ آپ نے بیعت کا عذر کیا یعنی لوگوں سے بیعت لے کر میں بھی گویا معاہدہ کا پابند ہو چکا ہوں اب تو بہر حال اس کو نباہنا پڑے گا بعض روایتوں میں اسی سوال کے جواب میں ایک دلچسپ بات حضرت شہید سے یہ منقول ہے کہ میرے دادا حسین (علیہ السلام) نے یزید سے اس وقت مقابلہ کیا جب بنی امیہ آگے کی طرف بڑھ رہے تھے اور میں ان کے مقابلہ میں اس وقت اترا ہوں جب یہ گر رہے ہیں۔

[1] قصہ تو طویل ہے تفصیل عام تاریخی کتابوں میں پڑھئے۔ حاصل یہ ہے کہ یوسف بن عمرو جو اس وقت کوفہ سے باہر حیرہ میں تھا۔ کوتوال شہر کے نام اس نے حکم بھیجا کہ لوگ صبح کی نماز میں جب مسجدوں میں داخل ہوں تو فوراً مسجدوں کے دروازے بند کر کے ان کا محاصرہ کر لیا جائے اور کسی کو مسجدوں سے نکلنے کا موقعہ نہ دیا جائے۔ اسی طرح ہر ہر محلہ کے دروازے بھی بند کر دیئے جائیں۔ صبح کو حضرت زید اپنے ساتھیوں کے ساتھ جب معرکہ آرائی کے لیے نکلے تو اس تھوڑی تعداد کو دیکھ کر فرمایا کہ لوگ کہاں گئے؟ جواب دیا گیا کہ مسجدوں میں بند کر دیئے ہیں۔

حضرت نے فرمایا: قد جعلوھا حسینیۃ (لوگوں نے اس واقعہ کو بھی حسینی واقعہ بنا لیا) لیکن آپ نے ہمت نہیں ہاری۔ اتنے ہی آدمیوں کے ساتھ جنگ کرتے رہے۔ یہ سارے واقعات کامل ابن اثیر طبری وغیرہ سے ماخوذ ہیں۔۱۲

ویقومون معه قیام صدق لکنت اتبعه واجاهد معه من خالفه. (ص ۲٦٠)	گے، اور واقعی راست بازی اور سچے عزم کے ساتھ ان کی رفاقت میں کھڑے ہوں گے' تو میں ضرور ان کی پیروی کرتا۔ اور ان کے مخالفوں سے جہاد کرتا۔

اس سے بھی وہی بات معلوم ہوتی ہے کہ امام کے نزدیک جہاں یہ فیصلہ غیر مشتبہ تھا کہ حضرت زید کا اقدام صحیح اور شرعی اقدام ہے' اسی کے ساتھ کوفہ والے خصوصاً حضرت شہید کے گرد وپیش میں جو لوگ تھے ان کے کردار وحالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے امام کو اندازہ ہو چکا تھا کہ جو صورت پہلے پیش آئی وہی پیش آ کر رہے گی' گویا اس حد تک امام ابوحنیفہ بھی مخلصین کے اس گروہ کے ساتھ تھے جس کے سرکردہ سلمہ بن کہیل تھے۔ لیکن سلمہ بن کہیل نے اسی انجام کا اندازہ کر کے حضرت زید کے مقابلہ سے جو روکنا چاہا تھا ہم دیکھتے ہیں کہ امام اس طریقہ کو اختیار نہیں فرماتے یعنی جو مشورہ سلمہ حضرت شہید کو دے رہے تھے کسی روایت سے ثابت نہیں کہ امام ابوحنیفہ نے بھی اس مشورہ کو پیش کیا ہو۔ بلکہ ہوسکتا ہے کہ ''بدر'' والی تشبیہ سے امام کا اشارہ اس کے خلاف ہو یعنی بدر میں بھی اقلیت قلیلہ کو ساتھ لے کر رسول اللہ ﷺ اس جماعت سے ٹکرا گئے تھے جو رسول اللہ ﷺ کے ساتھیوں کے لحاظ سے بہت بڑی اکثریت تھی' ایک اور تین کی نسبت تھی اگر یہاں بھی حضرت زید کے ساتھ یہی صورت پیش آ جائے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ پیغمبر کی سنت سامنے موجود تھی اور اس باب میں تو خود قرآن کی نص بھی۔

کم من فئة قلیلة غلبت فئة کثیرة باذن الله والله مع الصابرین. (البقرہ: ۲۴۹)	کتنے چھوٹے گروہ بڑے گروہ پر اللہ کے حکم سے غالب آئے ہیں اور اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہوتا ہے۔

موجود تھا۔

لیکن یہ عجیب بات ہے کہ ایک طرف حضرت زید کو اس اقدام سے روکتے بھی نہیں اور اس اندیشہ سے کہ لوگ آپ کو چھوڑ دیں گے ساتھ بھی نہیں دیتے پوچھئے تو اسی

سوال کا جواب حضرت امام ابوحنیفہؒ کا صحیح سیاسی مسلک ہے۔ وقت آ گیا ہے کہ اب اس پر بحث کی جائے۔

حضرت امام کے سیاسی مسلک کی توضیح:

قانونی اور فقہی نقطۂ نظر سے اس مسئلہ کی تعبیر ''الامر بالمعروف والنہی عن المنکر'' کے الفاظ سے کی جاتی ہے یعنی دوسرے واجبات کے ساتھ مسلمانوں پر ایک فرض یہ جو عائد کیا گیا ہے کہ ''المعروف'' کا دنیا کو حکم دیں اور ''المنکر'' سے لوگوں کو روکیں۔ جس کا حاصل یہ ہے کہ اسلامی زندگی پر لوگوں کو قائم رکھنا اور اسی کی طرف دعوت دینا مسلمانوں کے ان فرائض میں ہے جن کا بار بار مطالبہ قرآن میں مختلف حیثیتوں سے کیا گیا ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ قرآن کی مشہور آیت یہ بھی ہے۔

یاایھا الذین آمنوا علیکم انفسکم لا یضرکم من ضل اذا اھتدیتم. (المائدہ: ۱۰۵)	اے ایمان والو! تم پر اپنے ذات کی نگرانی واجب ہے جو گمراہ ہوا تمھیں ضرر نہیں پہنچاتا جب تم سیدھی راہ پر چلے۔

جس کا حاصل یہی ہے کہ لوگوں کو اپنی اپنی ذاتی ذمہ داریوں ہی کا خیال کرنا چاہیے دوسرے اگر گمراہ ہو رہے ہوں تو ان کی گمراہی کا اثر ان لوگوں پر نہیں پڑے گا جو اپنی ذاتی ذمہ داریوں کی تکمیل میں اپنی استطاعت کی حد تک مشغول ہیں۔

جب حکومت جابرہ اور ملک عضوض کا دور شروع ہوا تو جن لوگوں کا یہ خیال تھا کہ ان ظالم سلاطین کے مقابلہ میں خاموشی اختیار کرنی چاہیے۔ ان کا استدلال اسی آیت سے تھا۔ تائید میں آثار کا بھی ایک ذخیرہ پیش کیا جاتا تھا جس کی تفصیل کا یہاں موقعہ نہیں ہے۔ لیکن سوال یہی پیدا ہوتا تھا کہ اگر اسی آیت کو اصل قرار دے دیا جائے تو معنی اس کے یہی ہوں گے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا جو فرض مسلمانوں پر عائد کیا گیا تھا' گویا وہ منسوخ ہو گیا۔ حالانکہ اس کا بھی کوئی مدعی نہیں ہے۔ جواب دینے والوں میں ایک گروہ تو ان لوگوں کا ہے' جو اسی آیت کے آخری لفظ ''اذا اھتدیتم'' پر توجہ دلاتا ہے' یعنی ان کا مطلب یہ ہے کہ خداوند تعالیٰ نے جو یہ فرمایا ہے کہ دوسروں کی گمراہی سے

تمھیں ضرر نہیں پہنچے گا۔ یہ ایک شرط کے ساتھ مشروط ہے اور وہ شرط یہی ہے کہ "تم اگر سیدھی راہ پر ہو" جو اذا اهتدیتم کا ترجمہ ہے جس کا مطلب یہی ہے کہ اپنے متعلقہ فرائض صحیح طور پر اگر تم ادا کر رہے ہو جب دوسروں کی گمراہیوں سے تمھیں ضرر نہیں پہنچے گا' اور ظاہر ہے کہ مسلمانوں کے متعلقہ فرائض میں جب المعروف کا امر اور المنکر کی نہی بھی ہے تو اس فرض کا تارک ہدایت یافتہ ہی کب ہوا۔ مقصد ان بزرگوں کا یہ ہے کہ اس فرض سے سبک دوشی کے بعد بھی اگر گمراہیوں سے کوئی باز نہیں آتا تو اس وقت اس کی گمراہی دوسروں کے لیے ضرر رساں نہیں ہے اسی لیے کسی حال میں بھی یہ لوگ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے سکوت اختیار کرنے کو جائز نہیں سمجھتے' البتہ حدیثوں میں اس فرض کی ادائیگی کے متعلق چند مدارج جو مقرر کیے گئے ہیں' یعنی آنحضرت ﷺ کا مشہور ارشاد ہے کہ "منکر" اور غیر اسلامی چیز کو دیکھ کر چاہیے کہ آدمی ہاتھ سے اس کو روک دے۔ اگر اس کی سکت نہ ہو تو زبان سے روکے اور اس کی گنجائش بھی نہ ہو تو دل سے برا جانے' فرمایا گیا کہ ایمان کا یہ ضعیف ترین درجہ ہے۔ نص قرآنی کی اسی نبوی تشریح کو پیش نظر رکھتے ہوئے ان لوگوں کا فیصلہ ہے کہ ان مدارج میں سے کسی درجہ کی حد تک حکم کی تعمیل فرض سے سبک دوشی کے لیے اور ہدایت یافتہ ہونے کی شرط کی تکمیل کے لیے کافی ہے۔ اگرچہ بڑا درجہ اسی کا ہے جس کی ایمانی قوت ہاتھ سے بدل دینے کی جرأت پر اس کو آمادہ کرے۔ گویا ان حضرات کے نزدیک الامر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فرض میں اس فرض کی تعمیل ہی کامیابی ہے۔

حضرت امام کے نقطۂ نظر سے امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی توضیح:

لیکن حضرت امام ابوحنیفہ کے مختلف اقوال و اعمال سے بعد کو لوگوں نے جو نتیجہ نکالا ہے' اس کا حاصل یہ ہے کہ امام صاحب نہ تو ان لوگوں کے ساتھ ہیں جنھوں نے علیکم انفسکم والی آیت کو سامنے رکھتے ہوئے سکوتِ مطلق یا اعراض مطلق کے مسلک کو اختیار کر لیا تھا' جس کا مآل شاید یہی ہو سکتا ہے کہ معروف کے امر اور منکر کی نہی کا فرض قرآنی گویا منسوخ حکم کی حیثیت اسلام میں رکھتا ہے' خصوصاً "جابرہ" اور حکومت جابرہ

کے مقابلہ میں ان لوگوں نے اسی مسلک کو اختیار کر لیا تھا اور ان لوگوں پر معترض ہوتے تھے جو ان ظالم سلاطین کو معروف کا حکم یا منکر سے روکنے پر آمادہ ہو جاتے تھے۔ محدثین کا ایک بڑا طبقہ اسی خیال کا قائل تھا حتیٰ کہ الذہبی جو اسی گروہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ انھوں نے ہشام کے مقابلہ میں حضرت زید شہید کے مقابلہ کے قصے کو بیان کرتے لکھا ہے۔

خرج علی هشام فلیته لم یخرج (روض ص ۷۴)　　ہشام کے مقابلہ میں زید نکل کھڑے ہوئے کاش نہ کھڑے ہوتے۔

لیکن اسی کے ساتھ امام کا خیال یہ بھی تھا کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا حکم محض اس لیے نہیں دیا گیا ہے کہ حالات کا اندازہ کئے بغیر صرف اس کی تعمیل ہی کو فرض قرار دے دیا جائے بلکہ قرآن کی دوسری آیتوں آنحضرت ﷺ کی حدیثوں صحابہ کے طرز عمل کو پیش نظر رکھ کر اس مجموعہ سے نتیجہ پیدا کرنا چاہئے، آخر قرآن ہی میں یہ بھی تو ہے۔

فذکر ان نفعت الذکری.　　لوگوں کو نصیحت کرو اگر نصیحت فائدہ پہنچا رہی ہو

پھر قرآن ہی سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ہر حال میں ہاتھ سے منکر کو بدلنا فرض نہیں ہے ورنہ آخر اس قسم کی آیتوں کا کیا مطلب ہوگا جن میں ہے۔

فذکر انما انت مذکر لست علیهم بمسیطر (الغاشیه: ۲۲)　　تم لوگوں کو نصیحت کرو، تم صرف نصیحت کرنے والے ہو تم کو ان پر داروغہ نہیں مقرر کیا گیا ہے۔

نیز حضرت ابوثعلبۃ الخشنی کی یہ روایت جو ہے کہ قرآن کی اسی آیت کے متعلق یعنی

یاایها الذین امنوا علیکم انفسکم لا یضرکم من ضل اذا اهتدیتم. (المائده: ۱۰۵)　　ایمان والو! تم پر اپنی ذات کی نگرانی واجب ہے جو گمراہ ہوا تمھیں ضرر نہیں پہنچا تا اگر تم سیدھی راہ پر چلے۔

کے متعلق خود رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا گیا تھا تو آپ نے ارشاد فرمایا کہ معروف (یعنی اچھی باتیں) کرتے رہنا اور منکر (بری باتوں سے) بچتے رہنا۔ پھر جب دیکھو کہ لوگ اپنی حرص و ہوا کے بندے بن گئے اور اپنی خواہشوں کی پیروی میں لگ گئے، دنیا کو انھوں نے اختیار کر لیا اور ہر شخص اپنی اپنی رائے پر ناز کرنے لگے تو یہی وہ وقت ہے جس

میں تمھیں صرف اپنی ذات کی خبر لینی چاہیے اور یہی کیا بکثرت ایسی روایتیں صحاح میں موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسا وقت بھی آئے گا۔ جس میں رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں کو حکم دیا کہ اپنے اپنے گھروں کے ٹاٹ بن کر رہ جائیں۔ فرمایا گیا کہ بیٹھنے والا ان دنوں میں کھڑے ہونے والوں سے بہتر ہوگا اور کھڑا ہونے والا چلنے والوں سے' چلنے والا دوڑنے والوں سے' خلاصہ یہ ہے کہ مذکورہ بالا قرآنی آیات اور پیغمبر کے روایات سے بھی قطع نظر نہیں کیا جا سکتا نیز جلیل القدر صحابہ کا ایک طبقہ بنی امیہ کی حکومت جابرہ کے زمانہ میں موجود تھا۔ خود ان کا طرز عمل بھی ''الامر بالمعروف اور نہی عن المنکر'' کے قانون کے سمجھنے اور اس قانون کے استعمال کرنے میں راہ نمائی کر رہا تھا۔

مشہور حنفی امام ابوجعفر طحاویؒ نے اسی بنیاد پر تمام روایتوں کو جمع کرنے کے بعد حنفی نقطۂ نظر کو ان الفاظ میں پیش کیا ہے

ففيما ذكرنا توكيد الامر بالمعروف والنهى عن المنكر يكون الزمان الذى ينقطع ذلك فيه هو الزمان الذى وصفه رسول الله صلى الله عليه وسلم فى حديث ابى ثعلبة الخشى الذى لامنفعة فيه بامر معروف ولا بنهى منكر ولا قوة مع من ينكره على العام بالواجب فى ذلك فسقط الفرض عنه ورجع امره فيه الى خاصة نفسه فلا	امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی تاکیدوں کے متعلق جو باتیں میں نے بیان کیں (معلوم ہوا) کہ ایک زمانہ آئے گا جس میں اس کی تاکید کا سلسلہ منقطع ہو جائے گا۔ اور یہ وہی زمانہ ہوگا جس کی رسول اللہ ﷺ نے وہ خصوصیتیں بیان کی ہیں جن کا ذکر ابو ثعلبہ خشنی کی روایت میں کیا گیا ہے۔ یعنی وہی زمانہ جس میں معروف کے امر اور منکر کی نہی، کا کوئی فائدہ نہ ہوگا اور جن لوگوں کو روکنے کی ضرورت ہو گی ان سے مقابلہ کی طاقت روکنے والے میں نہ ہوگی' پس یہی وہ وقت ہوتا ہے جب فرض ساقط ہو جاتا ہے اور بات صرف اپنی اپنی ذات کی حد تک محدود ہو کر رہ جاتی ہے۔ اسی زمانہ کے متعلق کہا گیا ہے کہ گمراہوں کی گمراہی (ان

یضرہ ذلک من ضل.	لوگوں کو جو اپنی ذاتی ذمہ داریوں کے پوری کرنے
(مشکل الآثار ص ٦٦ ج ١)	میں کمی نہ کریں گے ضرر نہ کرے گی۔

مطلب طحاوی کا وہی ہے کہ جیسے دوسرے فرائض صوم وصلوٰۃ، حج وغیرہ کی حالت ہے کہ فرض ہونے میں ان کو کون شک کرتا ہے، لیکن ظاہر ہے کہ وہی روزہ جسے قرآن نے فرض کیا ہے حالت مرض وسفر میں اس کی فرضیت ساقط ہو جاتی ہے۔ استطاعت سبیل نہ ہو تو حج جیسا فرض باقی نہیں رہتا۔ کچھ یہی حال امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی فرضیت کا ہے اور قرآن کی ان دونوں آیتوں یعنی جن میں اس فرض کا مطالبہ کیا گیا ہے، ان میں اور اس آیت میں جس میں ہر شخص کو اس کی شخصی ذمہ داری کی طرف توجہ دلاتے ہوئے اعلان کیا گیا ہے کہ دوسروں کی گمراہی سے تم کو ضرر نہیں پہنچے گا ان دونوں احکام میں تطبیق کی یہی شکل ہے کہ ہر حکم کو ایک خاص زمانے کے ساتھ محدود قرار دیا جائے، باقی رہی یہ بات کہ ان دونوں زمانوں کے پہچاننے کا کیا معیار ہے۔ طحاویؒ نے اسی کی طرف اشارہ کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے ابو ثعلبہ کی روایت میں اس کو خود ہی متعین فرما دیا ہے جس کا حاصل یہی ہے کہ جس غرض کے لیے امر و نہی کا یہ کام مسلمانوں پر فرض کیا گیا ہے۔ جب دیکھا جا رہا ہو کہ وہ غرض حاصل نہیں ہو رہی ہے یعنی قبول کرنے کے لیے لوگ تیار بھی نہ ہوں اور کہنے والا بیچارا اپنے اندر ان سے مقابلہ کی قوت بھی نہ پاتا ہو تو پہچان لینا چاہیے کہ علیکم انفسکم (تم پر صرف تمہاری ذمہ داری ہے) کے قانون پر عمل کرنے کا وقت آ گیا ہے۔ اور معروف کے امر، منکر کی نہی کی فرضیت ساقط ہو گئی۔

ابراہیم الصائغ والا قصہ جس کا کچھ ذکر اجمالاً پہلے بھی آیا ہے اور تفصیل ان شاء اللہ تھوڑی دیر بعد کی جائے گی اس قصہ کو بیان کرتے ہوئے عبداللہ بن المبارکؒ نے امام ابو حنیفہؒ سے براہ راست یہ نقل کیا ہے کہ ابراہیم کو فہمائش کرتے ہوئے امام نے فرمایا کہ ایسے لوگ جن کے متعلق معلوم ہو چکا کہ ہماری نہیں سنیں گے اور مقابلہ کی طاقت چونکہ امر بالمعروف کرنے والے میں نہ تھی اس لیے وہ بے چارہ جباروں کے ہاتھ

قتل ولم یصلح للناس امر.	مارا گیا اور عام لوگوں کے لیے کوئی اصلاحی کام

بھی ان سے بن نہ پڑا۔ (احکام القرآن ج ۲ ص ۳۳)

جس کا مطلب یہی ہوا کہ ایسوں کی جان بھی جاتی ہے اور مسلمانوں کو ان کی اس قربانی کا کوئی نفع بھی نہیں پہنچتا بلکہ بجائے نفع کے بعض حالات میں جیسا کہ امام نے اسی کے بعد بعض دوسری باتوں کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ:

واذا قتل الرجل لم یجتری غیرہ ان یعرض نفسه.	اور جب امر بالمعروف کرنے والا قتل ہو جاتا ہے، تو دوسروں میں بھی آگے بڑھنے کی جرأت باقی نہیں رہتی۔

یعنی اس کو قتل ہوتا ہوا دیکھ کر دوسروں کی ہمت بھی چھوٹ جاتی ہے اور دوسرے سے لوگ اس قصے سے ہی اپنے آپ کو الگ کر لیتے ہیں۔ امام نے فرمایا کہ بلاشبہ ایسی صورت میں کہ

ان وجد علیه اعوانا صالحین ورجلا یرأس علیهم مامونا علی دین الله لایحول.	ہاں! ایسے آدمی کو صالح رفقاء میسر آ جائیں اور ایک آدمی ان کی سرداری کرے یہ ایسا آدمی ہو جو اللہ کے دین میں قابل اعتماد ہو اور اپنے مسلک سے نہ پلٹے۔

تب اس وقت اس آدمی کے ساتھ مقابلہ کے لیے کھڑا ہو جانا چاہیے۔ امام نے آگے وضاحت کی

هذه فریضة لیست کسائر الفرائض لان سائر الفرائض یقوم بها الرجل وحده.	امر بالمعروف نہی عن المنکر کا شمار ان فرائض میں نہیں ہے، جن کی تعمیل میں تنہا ہر شخص کی ذات کافی ہے۔

مطلب آپ کا یہ تھا کہ یہ اجتماعی فرائض میں ہے اور اپنے ساتھ کچھ شروط رکھتا ہے جب تک ان پر تحقق نہ ہوگا فرض بھی عائد نہ ہوگا۔

لیکن یہ گفتگو تو صرف فرضیت تک تھی، یعنی خود نص قرآنی اور پیغمبر علیہ السلام کے بیان سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ خاص حالات میں یہ فرض ساقط بھی ہو جاتا ہے۔ مگر فرضیت

کے ساقط ہونے کے باوجود سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر کوئی اس فرض کی بجا آوری پر آمادہ ہی ہو جائے تو پھر اس باب میں امام کا کیا خیال تھا' علامہ بدرالدین عینیؒ نے اپنی شرح ہدایہ میں اس سوال کو اٹھاتے ہوئے حنفی نقطۂ نظر سے اس کا جواب یہ دیا ہے۔

لو علم انه يصبر على من ضربهم ولم يشك الى احد فلا باس به وهو مجاهد. (عيني جلد ۳)	اگر سمجھتا ہے کہ مخالفین کی مار دھاڑ پر صبر کر سکے گا اور کسی کے آگے اس کا گلہ شکوہ نہ کرے گا' تو پھر امر بالمعروف نہی عن المنکر کرنے میں ایسے آدمی کے لیے مضائقہ نہیں ہے بلکہ اس کو مجاہد قرار دیا جائے گا۔

فقہاء حنفیہ اس کی تائید میں علاوہ ان مشہور حدیثوں کے مثلاً ابوداؤد اور ترمذی وغیرہ میں ہے

ان من اعظم الجهاد كلمة عدل عنه سلطان جائر (ص ۱۵۱)	سب سے بڑا جہاد یہ ہے کہ ظالم بادشاہ کے سامنے انصاف کا اظہار کیا جائے۔

اس حدیث کو بھی پیش کرتے ہیں جسے خود امام ابوحنیفہ اپنی سند سے ایک خاص طریقہ سے روایت کرتے تھے اور اسی بنیاد پر اصول حدیث اور رجال کی کتابوں میں ان کی طرف بعض خاص مسائل غالباً منسوب کئے گئے ہیں یعنی

انا حدثت ابراهيم الصائغ عن عكرمة عن ابن عباس قال النبي صلى الله عليه وسلم سيد الشهداء حمزة بن عبدالمطلب ورجل قام الى امام جائر فامره ونهاه فقتله (احكام القرآن جصاص ص ۳۴ ج ۲)	میں نے ابراہیم صائغ سے عکرمہ کے حوالہ سے یہ روایت بیان کی تھی کہ ابن عباسؓ سے عکرمہ روایت کرتے تھے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ شہداء کے سید (سردار) حمزہ بن عبدالمطلبؓ ہیں۔ اور وہ شخص ہے' جو ظالم امام یعنی حاکم کے سامنے کھڑا ہوا اور معروف کا حکم دیا (یا منکر سے منع کیا) پھر اس امام نے اس کو قتل کر دیا۔

جس کا حاصل یہی معلوم ہوتا ہے کہ الامر بالمعروف نہی عن المنکر کی بنیاد صرف افادہ ہی پر نہیں ہے بلکہ ابتلا بھی ایک بڑا مقصد اس قانون کا ہے یعنی محض یہی غرض نہیں ہے کہ حکم کر کے لوگوں کو معروف اور اچھی باتوں کا پابند بنایا جائے اور منکر (بری باتوں) سے روکا جائے۔ بالفاظ دیگر غیروں کو صرف فائدہ پہنچانے ہی کے لیے حق تعالیٰ نے بندوں پر یہ فرض نہیں عائد کیا ہے' بلکہ جن پر یہ فرض عائد کیا گیا ہے خود ان کا بھی امتحان اور ان کے ایمان کی جانچ بھی مقصود ہے۔

لیکن فرضیت قانون کی جب ساقط ہی ہو چکی تھی۔ تو جہاں تک میں سمجھتا ہوں حضرت امام کے نزدیک فوراً ابتلائی نصب العین کی تعمیل پر آمادہ ہو جانا ضروری نہیں تھا۔ ورنہ فرضیت کے سقوط کے معنی ہی کیا ہوں گے' بلکہ لوگوں کے سننے اور ماننے سے مایوسی کے بعد بھی مسلمانوں کو معروف پر قائم رکھنے اور منکر سے دور رکھنے کے امکانات اگر نظر آتے ہوں تو امام کے نزدیک ابتلائی نصب العین کی تکمیل پر آمادہ ہو کر اپنے آپ کو قتل کرا دینے یا اسی قسم کے نقصان میں مبتلا کر لینے سے یہ بہتر ہے کہ ان امکانات سے نفع اٹھانے کی حتی الوسع کوشش کی جائے جن کی طرف عقل راہ نمائی کرتی ہو، یہی مطلب ہے ان کے اس فقرے کا۔

> ''امر بالمعروف نہی عن المنکر کا کرنے والا ایسی صورت میں اگر قتل ہو گیا تو عام لوگوں (یعنی مسلمانوں) کے لیے تو کوئی فائدہ بخش بات یہ نہ ہو گی۔''

بلکہ قتل ہونے والے کا ذاتی فائدہ ہو گا' گو بجائے خود یہ بھی ایک بڑا فائدہ ہے اور اس سے بڑا فائدہ بھلا اور کیا ہو سکتا ہے کہ ''شہداء'' کی جماعت کی سیادت اور سرداری اسے حاصل ہوتی ہے۔ لیکن کچھ بھی ہو' ہے یہ ذاتی ہی فائدہ۔ عام مسلمانوں کے لیے اس میں کوئی حصہ نہیں ہے بلکہ جیسا کہ میں نے کہا ہے امام صاحب کا خیال یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بعض مواقع میں دوسروں کی ہمت شکنی اور حوصلہ کسلی کی وجہ یہ ابتلائی تعمیل بن جاتی ہے۔ بہر حال فرضیت کے سقوط کے بعد ابتلائی نصب العین کی تعمیل پر آمادگی امام صاحب کے نقطۂ نظر سے بہ ظاہر اقدام کی آخری شکل معلوم ہوتی ہے۔ اور اسی کو میں امام ابوحنیفہ

کا سیاسی مسلک قرار دیتا ہوں۔

حضرت امام کے حضرت زید کے ساتھ جہاد میں نہ شریک ہونے کے وجوہ:

لیکن اب سوال حضرت زید شہید کے مسئلہ میں پیدا ہوتا ہے یعنی امام کے نزدیک اقدام کے لیے جو یہ شرط تھی کہ صالح اور اچھے لوگ امداد پر اگر آمادہ ہو جائیں اور ان کی سرداری کے لیے ایسی ہستی مل جائے جس پر اللہ کے دین کے لحاظ سے بھروسہ کیا جا سکتا ہو اور توقع ہو کہ دین کے حدود سے وہ تجاوز نہ کرے گا تو اس وقت امام صاحب کا بھی فتویٰ تھا کہ اس وقت فرض کی تعمیل کے لیے کھڑا ہو جانا چاہیے مگر باوجود اس فتویٰ کے امام ان کے ساتھ اربابِ ظلم سے مقابلہ کرنے کے لیے میدان میں کیوں نہیں اترے؟

دراصل اسی سوال کا وہ جواب تھا جو امام نے ان الفاظ میں دیا تھا، یعنی

''اگر میں یہ جانتا کہ لوگ حضرت کو چھوڑ نہ دیں گے اور یہ کہ حضرت کے ساتھ واقعی سچائی کے ساتھ لوگ کھڑے ہوں گے تو میں ضرور آپ کی ہم رکابی اختیار کرتا، اور آپ کے مخالفین کے ساتھ جہاد کرتا کیونکہ امام برحق ہیں''

چالیس سال امام صاحب کے کوفہ میں گذر چکے تھے ان سے بڑھ کر وہاں کے باشندوں کے حالات سے کون واقف ہو سکتا تھا جیسا کہ میں نقل کر چکا ہوں فضیل بن زبیر حضرت شہید کے پیام لانے والے سے امام نے جو یہ پوچھا تھا کہ حضرت کے پاس بڑے لوگوں میں (جن کی تعبیر امام نے فقہاء سے کی تھی) کن کن لوگوں کی آمد و رفت ہے، اس سے کچھ غرض اسی کا پتہ چلانا تھا انھوں نے اندازہ کر لیا تھا کہ جو لوگ کھڑے ہوتے ہیں وقت پڑنے پر قطعاً بیٹھ جائیں گے اور حضرت کا ساتھ چھوڑ دیں گے اور یہ خیال کچھ امام ہی کا نہیں تھا ابھی گذر چکا کہ کوفہ کے مسلم عند الکل امام اعمش تو قسم کھا کر کہتے تھے کہ:

''خدا کی قسم لوگ حضرت شہید کو قطعاً ضرور چھوڑ دیں گے خدا کی قسم لوگ ان کو دشمنوں کے سپرد قطعاً ضرور کر دیں گے۔''

سلمہ بن کہیل جیسے وفادار تجربہ کار مخلص سرد و گرم چشیدہ آدمی نے بھی یہی پیش گوئی کی تھی خود حضرت زید کے ساتھ اسی خالد ابن النصرانیہ کے قصہ میں عبداللہ بن عباس کے

پوتے داؤد بن علی نے بھی حضرت شہید سے انتہائی لجاجت و ساجت سے عرض کیا تھا کہ

''میرے چچا کے بیٹے (یا ابن عم) یہ کوفے والے آپ کو دھوکہ دے رہے ہیں کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ آپ سے بھی زیادہ جن کا مقام بلند تھا۔ یعنی آپ کے دادا علی بن ابی طالبؓ کو ان لوگوں نے چھوڑ دیا حتیٰ کہ حضرت والا شہید ہو گئے اور (امام) حسن (علیہ السلام) کے ساتھ بھی ان لوگوں نے یہی کیا پہلے بیعت کی پھر ان ہی پر چڑھ دوڑے ان کی چادر چھین لی' ان کو زخمی کیا اور کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ آپ کے جد امجد (امام) حسین (علیہ السلام) کو یزید کے مقابلہ میں ان ہی لوگوں نے کھڑا کیا' ان کے سامنے حلف اٹھایا مگر ان کو ان ہی لوگوں نے چھوڑ دیا اور دشمنوں کے سپرد کر دیا۔ حتیٰ کہ اس پر بھی انھوں نے بس نہیں کیا۔ لیکن بالآخر آپ کو بھی ان لوگوں نے قتل ہی کر دیا۔'' (ص ۸۶)

اور سب سے بڑا وثیقہ اس سلسلہ میں خود خانوادۂ نبوت کے ایک بڑے رکن رکین عبداللہ بن حسن بن الحسن کا تاریخوں میں پایا جاتا ہے۔ حضرت عبداللہ کو جب زید شہید کے ارادے اور کوفہ کی تیاریوں کا حال معلوم ہوا تو بڑے جوش کے ساتھ ایک بلیغ خط حضرت زید کے نام انھوں نے لکھا جس کا ترجمہ یہ ہے:

''اما بعد! کوفہ والے بظاہر بہت پھولے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن اندر سے یہ بالکل کھوکھلے ہیں' جب امن اور ارزانی و اطمینان کا زمانہ ہوتا ہے تو اس وقت یہ شورش پسند ہیں' لیکن جب مقابلہ کی گھڑی آ جاتی ہے تو اس وقت یہ گھبرا اٹھتے ہیں چیخنے چلانے لگتے ہیں' ان کی زبانیں آگے آگے چلتی ہیں۔ لیکن ان کے قلوب زبانوں کا ساتھ نہیں دیتے۔''

انھوں نے لکھا تھا:

''میرے پاس پیہم اور مسلسل خطوط آتے رہے جن میں مجھے بھی یہ کوفہ بلاتے رہے لیکن ان کی پکار سے میں نے اپنے آپ کو بہرا بنا لیا ہے۔ میں نے اپنے

دل پر ان لوگوں کی یاد اور ان کے خیال سے پردہ ڈال دیا ہے۔ میں نے ان لوگوں سے قطع نظر کر لیا ہے' ان کا حال وہی ہے جو علی بن ابی طالب (کرم اللہ وجہہ) فرمایا کرتے تھے یہ اگر چھوڑ دیے جائیں تو گھس پڑتے ہیں اور لڑائے جائیں تو سست بن کر بیٹھ جاتے ہیں' کسی ایک امام پر لوگ جمع ہو جائیں تو اس پر فوراً اعتراض لے کر کھڑے ہو جائیں اور کسی محنت و مشقت کے کام کی طرف ان کو بلایا جائے تو اپنی ایڑیوں پر پلٹ جاتے ہیں۔'' [1]

بجنسہٖ یہی رائے امام کی تھی' بلکہ قرب و نزدیکی' ذاتی تجربات پھر جس فہم و فراست کے قدرتاً وہ مالک تھے اس کے زیادہ مستحق تھے کہ جو واقعہ بعد کو پیش آیا۔ اس کی پیش قیاسی وہ پہلے ہی سے کر لیتے۔ اگرچہ بعض لکھنے والوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ امام نے کچھ عذر بھی پیش کیا۔ یعنی کہا

لبسط عذری عنده (موفق ص ۲۶۰) حضرت زید کے سامنے میرے عذر کو بیان کرنا

لیکن یہ عذر کیا تھا' موفق نے ایک دوسری روائت کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے کہ:

اعتذر بمرض یعتریه فی الأیام حتی تخلف عنه (ص ۲۶۰) آپ نے اپنی ایک بیماری کا عذر کیا' جس کا دورہ وقتاً فوقتاً پڑ جاتا ہے اسی وجہ سے حضرت زید کا ساتھ نہ دے سکے۔

واللہ اعلم امام پر کس مرض کا دورہ پڑتا تھا ہو سکتا ہے کہ یہ وجہ بھی ہو یا ممکن ہے کہ جہاد کے شرائط میں والدین کی اجازت جو شرط ہے اور خود رسول اللہ ﷺ نے ایک صاحب سے یہ دریافت کرنے کے بعد کہ تمہارے والدین زندہ ہیں اثبات میں جواب پانے کے بعد ارشاد ہوا تھا کہ

ففیهما فجاهد. جاؤ' تو ان ہی دونوں (ماں باپ کی خدمت میں) جا کر جہاد کرو۔

شاید امام کے لیے ان کی والدہ بھی عذر ہوں۔ جیسا کہ واقعات سے معلوم ہوتا

---

[1] یہ سارے وثائق طبری' کامل وغیرہ میں موجود ہیں۔

ہے۔ امام کو اپنی ان والدہ کا خیال اتنا رہتا تھا کہ ابن ہبیرہ نے جب تازیانے سے حضرت کو پٹوایا' تو اپنی تکلیف سے زیادہ فرمایا کرتے تھے۔

کان غم والدتی اشد علی من الضرب. (ص ۲ ج)	مار کی تکلیف سے زیادہ مجھے اپنی والدہ کے غم کا خیال زیادہ تکلیف دہ تھا۔

بعض روایتوں میں ہے کہ

"امام کے سر خصوصاً چہرے پر جب کوڑے پڑے تو امام رو پڑے' پوچھا گیا تو فرمایا: میری ماں مجھے یاد آئیں خیال گذرا کہ وہ بے چاری میرے چہرے کے ان نشانوں کو جب دیکھیں گی تو ان کو کتنا دکھ ہوگا۔"

اور آخر میں فرمایا:

"ان تمام مصائب سے سب سے سخت ترین مصیبت میرے میری والدہ کا غم اور دکھ ہے۔"[۱]

بہرحال ممکن ہے کہ یہ باتیں بھی کہی ہوں' لیکن حقیقی وجہ وہی معلوم ہوتی ہے کہ یہ فربہی نہیں بلکہ ورم ہے جو کوفیوں کی شکل میں حضرت شہید کے اردگرد جمع ہو گیا ہے۔ اس یقین کے بعد ظاہر ہے کہ فرضیت تو ساقط ہی ہو چکی تھی چاہتے تو جیسے اسی طبقہ کے

---

[۱] حضرت امام کو اپنی والدہ کا کتنا خیال تھا اس کا ایک دلچسپ لطیفہ بھی کتابوں میں بیان کیا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ زرعہ نامی کوفہ میں ایک واعظ تھے۔ امام صاحب کی والدہ ان کے مواعظ میں معلوم ہوتا ہے کہ بہت شریک ہوتی تھیں اسی لیے "زرعہ" کی خاص معتقد تھیں۔ کسی مسئلہ میں ایک دفعہ ان کو پوچھنے کی ضرورت ہوئی پہلے تو اپنے بیٹے ابوحنیفہ ہی سے پوچھا: امام صاحب نے مسئلہ کا جو جواب تھا بتا دیا' لیکن ان کو اطمینان نہیں ہوا اور بولیں: زرعہ واعظ جب تک توثیق نہ کرے گا مجھے اطمینان نہ ہوگا۔ امام صاحب اپنی والدہ کو لے کر زرعہ واعظ کے پاس پہنچے۔ بیچارا حیران ہوا۔ امام نے کہا کہ یہ میری ماں ہیں تمہاری معتقد ہیں۔ تم سے مسئلہ پوچھنے آتی ہیں۔ بیچارہ واعظ مسئلہ کیا جانے' اس نے کہا کہ بھلا میں کیا مسئلہ بتاؤں آپ ہی بتایئے کہ کیا ہے۔ امام نے کہا کہ بھائی میں نے تو یہ جواب دیا تھا۔ زرعہ نے تب امام صاحب کی والدہ سے کہا: جی ہاں! مسئلہ وہی ہے جو آپ کے صاحبزادے نے بتایا' اس پر بڑی بی کو اطمینان ہو گیا اور گھر آ گئیں۔ (ص ۳۰ جلد ۲ موفق وغیرہ)

دوسرے بزرگوں یعنی اعمش' سفیان ثوری وغیرہ نے جو طرزِ عمل اختیار کیا تھا وہی آپ بھی اختیار کر لیتے۔ یعنی نہ منع کرتے اور نہ شریک ہوتے اور حضرت شہید کے متعلق وہی خیال کر لیتے کہ ابتلائی نصب العین کی تکمیل کر کے شہدا کی سیادت کا مقام اپنے اجداد کی طرح حاصل کیا جیسا کہ سفیان ثوری کہا بھی کرتے تھے۔

لیکن اب یہ امام کی دقتِ نظری کہئے یا اسے جو کچھ قرار دیجئے کہ انجام اور باطن کے لحاظ سے کوفہ کا یہ مجمع کچھ ہی ہو مگر بظاہر وہ ایک ایسی ہستی پر سمٹ کر جمع ہو گیا تھا کہ بقول حضرت اعمش

لو وفی له من بائعه لاقامهم علی المنهج الواضع (روض بحواله مقریزی ص ۵۰)

اگر ساتھ دینے والے حضرت زید کے ساتھ وفادار رہتے تو ان کو سیدھی راہ پر لا کر وہ کھڑا کر دیتے۔

جہاد کے لیے امام کی حضرت زید کو مالی امداد:

میں تو سمجھتا ہوں کہ اسی ظاہر کے اقتضا کی رعایت کا نتیجہ تھا کہ سب کچھ کہنے کہلانے کے بعد آخر میں حضرت امام نے دس بیس روپے نہیں بلکہ ان ابتدائی دنوں میں جب بظاہر ان کے کاروبار کا آغاز ہی ہوگا' کیونکہ اس وقت تک زیادہ وقت ان کا حماد بن ابی سلیمان اپنے استاد کے پاس حصول علم ہی میں گذرتا تھا۔ ہزار ہزار روپے کی دس تھیلیاں گھر سے لا کر فضیل بن زبیر کے حوالہ کیں اور فرمایا:

اعینه بمالی فیتقوی به علی من خالفه. (ص ۲۶۰ ج ۱ موفق)

میں حضرت کی خدمت اس مال سے کرتا ہوں' حضرت سے عرض کرتا کہ اپنے مخالفوں کے مقابلہ میں اس سے بھی فائدہ حاصل کریں۔

اور سمجھا جائے تو حضرت امام کے تجارتی کاروبار کے سلسلہ میں یہ سوال جو اٹھایا گیا تھا کہ اتنے وسیع پیمانے پر اپنے اس کاروبار کو وہ کیوں پھیلا رہے تھے۔ اس کا جواب امام کے اس طرزِ عمل سے نکالا جا سکتا ہے۔ مطلب میرا یہ ہے کہ امر بالمعروف نہی عن المنکر کی فرضیت کے سقوط کے بعد ابتدائی نصب العین کی تعمیل پر آمادہ ہونے سے پہلے

اسی معروف ومنکر کے متعلق امکانات سے حتی الوسع نفع اٹھانے کی کوشش کرنا کہ ممکنہ حد تک عام مسلمانوں تک فائدہ پہنچنے کی کوئی صورت اگر نکل سکتی ہوتو نکالی جائے یہ جوامام صاحب کا مسلک اس باب میں منقح ہوا تھا اسی کی ایک تفصیلی شکل یہ تھی۔

بہ ظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اپنی پیش قیاسی پر کامل اعتماد کے بعد بھی امام کے دل میں یہ خیال ضرور گذرتا ہوگا کہ جوانجام ابھی سامنے نہیں ہے' صرف قرائن وقیاسات کی بنیاد پر اس کے متعلق قطعی فیصلہ کر لینا بھی شائد احتیاط کا اقتضا نہ ہو شاید یہی کچھ سوچ کر گو جانی شرکت پر آمادہ نہ ہوئے لیکن بالکلیہ شرکت سے محرومی بھی ان کے لیے غالباً ناقابل برداشت تھی۔ اور اس وقت کی مالی استطاعت کے لحاظ سے بڑی سے بڑی مالی قربانی جو وہ پیش کر سکتے تھے اسے پیش کر دی۔ بلکہ اسی سلسلہ میں خود حضرت شہید کے صاحبزادے محمد بن زید بن علی سے جو یہ روایت ہے کہ مالی امداد پیش کرتے ہوئے امام ابوحنیفہؒ نے عرض کیا تھا کہ

استعن به علی حرمک وما انت فيه واعن به ضعفاء اصحابک (موفق ص ۸۳ ج ۲)	اپنے گھر کے لوگوں کی خبر گیری میں اس سے کام لیجئے۔ اور آپ کے رفقاء میں جو ضعیف لوگ ہیں۔ ان کی اس سے امداد فرمایئے۔

اس کا آخری فقرہ یعنی

> آپ کے ساتھیوں میں جو کمزور ہیں (بہ ظاہر مالی کمزوری کی طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے۔ یعنی سامانِ حرب ہتھیار گھوڑے وغیرہ کا سامان جو نہیں کر سکتے) ان کی اس مال سے مدد فرمائی۔

اس میں یہی نکتہ معلوم ہوتا ہے کہ ان ضعفا کی مالی امداد کر کے امام صاحب نے بھی اپنے آپ کو گویا اس جہادی مہم میں شریک کرا دیا' شاید انھوں نے حج وغیرہ فرائض پر اس کو کچھ قیاس کیا جس میں بصورت عجز نیابت جسے ''حج بدل'' کہتے ہیں جاری ہوتی ہے' گویا بجائے حج بدل کے امام صاحب نے ''جہاد بدل'' کا طریقہ اختیار کر کے جیسے حج بدل کرانے والے کرحج کا ثواب بھی مل جاتا ہے اور حج کی فرضیت بھی ساقط ہو جاتی ہے۔ اسی

طرح شاید انسوں نے خیال کیا کہ اگر میری پیش قیاسی غلط نکلی تو ''جہاد بدل'' کے طور پر تو شرکت کی سعادت سے محروم نہیں رہوں گا اور میں تو سمجھتا ہوں کہ ابوجعفر سے کتابوں میں یہ جو نقل کیا جاتا ہے کہ امام ابوحنیفہ کو انھوں نے یہ کہتے سنا کہ وہ فرمایا کرتے تھے کہ:

استغفر الله من ترکی الامر بالمعروف والنهی عن المنکر (ص ۸۳ ج ۲ موفق)

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے باب میں اپنی کوتاہیوں پر میں حق تعالیٰ سے مغفرت چاہتا رہتا ہوں۔

کیا تعجب ہے کہ اس ترک میں حضرت شہید کی رفاقت جسمانی کے ترک کا خیال بھی امام کے سامنے ہو' کیونکہ مسئلہ بہرحال اجتہادی تھا۔ آخر یہ طے کرنا کہ الامر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فرض کے سقوط کا جو واقعی وقت ہے وہ درحقیقت آ گیا کچھ آسان نہیں ہے۔ خصوصاً ایسی صورت میں جو حضرت شہید کے ساتھ پیش آ گئی تھی کہ لوگ بھی امداد پر آمادہ ہیں اور قیادت و ریاست کے لیے بہتر سے بہتر ہستی اس وقت جو مل سکتی تھی وہ مل گئی تھی۔ باوجود اس کے محض اپنے ذاتی معلومات اور احساسات کی بنیاد پر جسمانی شرکت سے تقاعد کا فیصلہ کیا آسان تھا؟

حقیقت یہ ہے کہ امام کے لیے یہ بڑی کش مکش اور ایمانی قوت کی آزمائش کی گھڑی تھی' ایک طرف وہ اس ساز و سامان کو دیکھ رہے تھے جس کے صرف ظاہر پر اگر نظر رکھی جاتی تو شرکت سے یک سوئی کی کوئی وجہ ہی نہیں ہو سکتی تھی۔ لیکن دوسری طرف آپ کے چالیس سالہ تجربات و معلومات ان تاریخی وثائق کے ساتھ جو کوفہ اور کوفہ والوں کے متعلق حد تواتر تک پہنچے ہوئے تھے بلکہ گویا چشم دید واقعات کی حیثیت رکھتے تھے' ان بینات کی بنیاد پر امام کو انجام کا بھی یقین تھا اور اس کا بھی کہ اگر علانیہ ذاتی طور پر اس مہم میں شریک ہو جاتا ہوں تو جو انجام ہونے والا ہے اس کے بعد بنی امیہ کے جباران سارے امکانات کو ختم کر دیں گے' جو اسی سلسلہ میں سقوط فرضیت کے بعد عام مسلمانوں کے متعلق امام اپنے دماغ میں رکھتے تھے۔ بعض مورخین نے جو یہ نقل کیا ہے کہ:

کان ابو حنیفه یفتی سرالو جوب امام ابوحنیفہ پوشیدہ طور پر حضرت زید کی امداد

نصرة زيد وحمل المال إليه کے فرض ہونے کا فتویٰ دیتے تھے اور ان کے پاس پوشیدہ طور پر مالی امداد بھی بھیجتے تھے۔ (ص ۴۶ مقدمہ روض)

اس کا مطلب یہی معلوم ہوتا ہے کہ اپنی ساری امداد کو امام سرأ یعنی پوشیدہ طور پر پیش کر رہے تھے، اس کی مصلحت مجھے تو یہی نظر آتی ہے کہ جس انجام کا اس "زیدی جہاد" کے متعلق ان کو یقین تھا اور اس انجام کے بعد جن نتائج کے خطرات ان کے سامنے تھے ان ہی کے سدباب کے لیے امام نے بطور پیش بندی اس سری طریقے کو اختیار فرمایا۔ لیکن جیسا کہ کہا گیا ہے۔ع

"نہاں کے ماند آں رازے کزو سازند محفلہا"

امام صاحب کے سیاسی رجحانات حکومت کی نگاہوں سے اوجھل نہ رہ سکے اور گو حضرت شہید کا قتل بنی امیہ کی حکومت کے "مرگ" کا پیغام بن چکا تھا۔ اور سال کے ایک ہفتہ کے اندر اندر اس حکومت کا مشرق میں خاتمہ ہو گیا[1] لیکن اس مختصر مدت میں بھی حضرت

---

[1] میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اشخاص کے لیے جو حیثیت ایک دن کی ہوتی ہے حکومتوں کے لحاظ سے ایک سال کو ایک دن ہی کے مساوی سمجھنا چاہیے۔ اس اعتبار سے اگر دیکھئے تو حضرت شہید کی شہادت کے بعد کل سات سال کے اندر اندر بنی امیہ کی حکومت جس کا پایۂ تخت دمشق تھا۔ ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہو گیا اس عرصہ میں ہشام ولید، یزید، ابراہیم، مروان پانچ بادشاہ یکے بعد دیگرے بنی امیہ کی گدی پر بیٹھے جن میں بعضوں کو چند مہینے سے زیادہ حکومت کرنے کا موقعہ نہ ملا گویا فی بادشاہ ایک سال کچھ مہینے کا اوسط پڑتا ہے اور یہ سب کچھ جو ہوا' جہاں تک میرا خیال ہے اسی ابن الحمقا، ہشام بن عبدالملک کی حماقتوں کا نتیجہ تھا ایک مدت سے اہل بیت کے لوگوں کو سلاطین بنی امیہ نے مدینہ منورہ میں گویا نظر بندوں کی حیثیت سے محصور کر رکھا تھا۔ لیکن محض ابن النصرانیہ خالد کے ایک بے بنیاد دعویٰ سے متاثر ہو کر تھوڑے سے روپیہ کے لیے شیر کو ہشام نے پنجرے سے باہر نکلنے کا خود ہی موقعہ دیا اور خود ہی اس کو اپنے جنگل میں پہنچا دیا۔ ابن النصرانیہ جانتا تھا کہ کوفہ پہنچے کے بعد حضرت زید یوں ہی واپس نہیں چلے جائیں گے اور یہی ہوا' لیکن اس حمقاء کے لڑکے ہشام نے اسی پر بس نہیں کیا۔ کوفہ والوں کے عادتی غدر کی وجہ سے حضرت زید شہید ہو گئے۔ بنی امیہ کی شتر کینگی کا خیال کر کے لوگوں نے راتوں رات حضرت شہید کی لاش مبارک کو بہتے ہوئے پانی کے ایک راج باہے میں دفن کر کے اس ☜

امام کو اپنے قابو میں لانے کے لیے حکومت سے جو کچھ ممکن ہو سکا اس میں اس نے کی

ﷺ پر آبی نباتات کے بیلیں چڑھادیں۔ لیکن اپنے آقا ہشام کی خدمت میں محمد رسول اللہ ﷺ کے نواسہ کا سرتحفہ بھیجنے کے شوق میں یوسف گورنر کوفہ نے حضرت کی لاش کا بڑی جدوجہد کے بعد پتہ چلا لیا۔ اور سر کاٹ کر دمشق بھیجا گیا۔ ابن الحمقاء نے ایک طرف دمشق کے دروازے پر اس سر کو لٹکانے کا حکم دیا اور واپسی ڈاک سے یوسف کو لکھا کہ کسی نمایاں مقام پر عریاں کر کے حضرت زید کی لاش لٹکا دی جائے۔ چودہ مہینے تک یہ لاش بمقام کناسہ کوفہ میں بحالت عریانی لٹکی رہی اس عرصہ میں ہشام تو خیر مر گیا' لیکن اس کے جانشین ولید کے عہد میں حضرت زید کے صاحبزادے یحییٰ بن زید بلخ کے قریب جوز جان ضلع کے ایک گاؤں ارعونہ نامی میں شہید ہوئے اور جوز جان شہر میں ان کی لاش اسی طرح لٹکا دی گئی جیسے ان کے والد کی کوفہ میں لٹکی ہوئی تھی۔ گویا خراسان، عراق، شام تک مسلسل ایک تماشا کھڑا کیا گیا تھا۔ حکومت کی جباریت سے لوگ خواہ کچھ نہ بول سکتے ہوں لیکن نفسیاتی طور پر محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت پر اس دردناک دوامی منظر کا جو اثر پڑ سکتا تھا حکومت کے نشہ میں وہ بنی امیہ والوں کی سمجھ میں نہ آیا اور میرا خیال ہے کہ خراسان میں عباسیوں کے داعی ابو مسلم کو جو کامیابی ہوئی اس کامیابی میں بہت زیادہ دخل اسی عجیب وغریب تماشے کو تھا۔ اسی سے خراسانی مسلمانوں کے تاثر کا اندازہ کیجئے کہ جب عباسیوں کا اقتدار خراسان میں قائم ہوا تو پہلا کام یہی کیا گیا کہ جوز جان میں حضرت یحییٰ کی لاش سولی سے اتاری گئی۔ نماز جنازہ پڑھی گئی اور سات دن تک خراسان کے ہر ہر گاؤں میں ماتم منایا گیا۔ یہی نہیں بلکہ اکثر مورخین نے لکھا ہے کہ **ولم یولد فی تلک السنة بخراسان مولود الاوسمی بیحیی او بزید** (اس سال خراسان میں جہاں کہیں جو بچے بھی پیدا ہوئے ان کا نام یحییٰ یا زید رکھا گیا۔ (المسعودی ص ۱۵۴) چودہ ماہ کے بعد حضرت زید کی ننگی لاش کو اتروا کر ولید نے جلا کر دریا برد کرنے کا حکم دیا تھا۔ اسی کے انتقام میں اقتدار حاصل کرنے کے بعد عباسیوں کے ولاۃ وحکام نے تلاش کر کر کے بنی امیہ کے تمام حکمرانوں کی لاشیں (باستثناء عمر بن عبدالعزیزؒ) قبر سے نکال نکال کر جلائیں۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ صرف ہشام کی لاش چھ سات سال کے بعد بالکل صحیح وسالم حالت میں نکلی صرف ناک کا بانسہ غائب ہوا تھا۔ قبر سے نکال کر اسی کوڑے اس کی لاش پر لگائے گئے اور زید شہید کی لاش جیسے جلائی گئی تھی ہشام کی لاش بھی جلائی گئی۔ لکھا ہے کہ یزید بن معاویہ کی قبر سے صرف ایک ہڈی نکلی اور کچھ توجیہ اس کی نہ ہو سکی۔ کہ ایک سیاہ دھاری طولاً اس کی قبر میں پائی گئی۔ یوسف بن عمر کا انجام یہ ہوا کہ اس کی ڈاڑھی نوچی گئی اور تڑپا تڑپا کر مارا گیا۔ اس کے جسم کا ایک ایک حصہ دمشق کے مختلف مقامات میں لٹکایا گیا۔ بنی امیہ کے اسی شاہزادوں کو باندھ کر قتل

نہیں کی۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دمشق تک یہ خبر پہنچی اور وہاں کے نہ صرف اربابِ سیاست بلکہ اہل علم کی محفلوں میں بھی امام ابو حنیفہ کے اس مسلک پر تنقیدیں کی گئیں۔ ابو بکر الجصاص نے شام کے مشہور محدث وفقیہہ مجتہد، امام اوزاعیؒ کا جو یہ قول نقل کیا ہے۔

بقیہ اوران پر فرش بچھا کر لوگوں نے کھانا کھایا۔ اور پھر ایک ایک کی گردن مار مار کر گھوڑوں پر ان کی لاش پھینک دی گئی۔ آخری حکمران بنی امیہ مروان مصر میں جب مارا گیا اور اس کی گھر کی عورتوں نے جو شور و بکا کیا ہے تاریخ میں یہ مقامات پڑھے نہیں جاتے۔ ایک دلچسپ لطیفہ اس سلسلہ میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ مروان کو جب اپنی موت کا یقین ہو گیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چند تبرکات (رداء مبارک اور عصا مبارک وغیرہ) کو اس نے بالو میں گاڑ دیا تھا تاکہ عباسیوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ میراث ہاتھ نہ لگ سکے لیکن اس کے ایک غلام نے بعد کو بتا دیا۔ بہر حال میرا خیال یہی ہے کہ یوں تو تقدیر میں جو لکھا تھا وہ پورا ہوا لیکن عالم اسباب میں اسی ابن الحمقاء ہشام بن عبدالملک کی حرص اور حماقت کی شکار امویوں کی دولت قاہرہ ہوئی ہشام کی لاش کے ساتھ عباسیوں نے تو کئی سال بعد وہ ناگفتہ بہ حرکتیں کیں، لیکن اس کے مرنے کے ساتھ ہی خود اس کے بھائی بندوں نے جو کچھ کیا وہ کیا کم حیرت انگیز ہے۔ افاقۃ الموت کے طور پر مرنے سے کچھ پہلے ہوش آیا۔ ہشام نے کوئی چیز مانگی لیکن ولید کے نمائندے آچکے تھے جو اس کے بعد خلیفہ ہوا تھا۔ انھوں نے صاف انکار کر دیا۔ اس پر یہ آخری الفاظ انا للہ کنا خزاناً لولید (انا للہ کیا ہم صرف ولید کے خزانچی تھے؟) کہتے ہوئے مر گیا۔ لکھا ہے کہ لکڑی کا برادہ غسل کے پانی گرم کرنے کے لیے مانگا گیا نہ ملا۔ کفن کے لیے کپڑے بھی اس کے غلام غالب نے دیئے۔ اور انیس سال نو مہینے تک جو صرف مال جمع کرنے کی دھن میں مشغول رہا تھا۔ انجام آخری اس کا یہی ہوا۔ اس سلسلہ میں ایک بات تاریخ کی عجیب ہے کہ حضرت زید کے صاحبزادے یحییٰ اور ان کے بعد ابراہیم جن کا ذکر آگے آ رہا ہے۔ تینوں حضرات کی وفات اچانک تیر کے لگنے سے ہوئی۔ حضرت زید کی پیشانی میں، حضرت یحییٰ کی کنپٹی میں، حضرت ابراہیم کی پیشانی میں تیر اچانک آ کر لگے اسی سے سب کی وفات ہوئی۔ ورنہ ہزاروں ہزار کی فوج بھی ان حضرات کے قریب آنے کی ہمت نہیں کر سکتی تھی۔ اگر بے سان و گمان یہ تیر ان حضرات کو نہ لگتے تو ان پر قابو پانا بلکہ شکست دینا آسان نہ تھا۔ اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ کچھ خدا کی مشیت بھی یہ تھی کہ ظاہری ناپاک سیاست والی حکومت خاندانِ نبوت کے لوگوں کو نہ مل سکی۔

احتملنا ابا حنیفة علی کل شیء حتی فما جانا بالسیف (یعنی قتال انطلة نحتمله (ص ۸ ج ۱)	ابوحنیفہ کی ساری باتیں ہم برداشت کرتے رہے تاآنکہ بالآخر یہ شخص تلوار لیکر آ گیا (یعنی ظالم حکمرانوں کے خلاف تلوار اٹھا لینے کا فتویٰ اس نے دے دیا) ہم نے اس کی بات کو برداشت نہ کیا۔

اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ جن لوگوں کو اس زمانہ میں اہل السنت والجماعت میں سمجھا جاتا تھا۔ ان کے ایک مستند فقیہ و عالم کی طرف سے بنی امیہ کی حکومت کے مقابلہ میں امام ابوحنیفہ کا اقدام تعجب اور انکار کی نظروں سے دیکھا گیا۔[1]

---

[1] میں نے اس سلسلہ میں جستہ جستہ طور پر مختلف مقامات میں اس مسئلہ کا ذکر کیا ہے اور سچ تو یہ ہے کہ بجائے خود اسلام کے سیاسی شعبہ کا یہ بڑا اہم مسئلہ ہے محض اشاروں اور کنایوں سے اس کے تفصیلات سمجھ میں نہیں آ سکتے۔ خدا کرے کہ اسلامی سیاسیات پر ایک مستقل کتاب لکھنے کا جو ارادہ کر رہا ہوں۔ اس ارادے کی تکمیل کا موقعہ اگر دیا گیا تو اس پر تفصیل سے گفتگو ہو سکتی ہے یہاں پر مجملاً اتنا اور کہہ دیتا ہوں، ابن حزم نے کتاب ''ملل والنحل'' میں لکھا ہے کہ اس پر متفق ہو جانے کے بعد کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر فرض ہے آگے اس مسئلہ میں کہ فرض کی نوعیت کیا ہے۔ اہل السنت میں امام احمد بن حنبل کا مذہب یہ ہے کہ دل سے برا جاننا اس حد تک فرض ہے اور زبان سے بھی قدرت ہو لیکن حکومت کے مقابلہ میں خواہ ظالم ہی کیوں نہ ہو ہاتھ اٹھانا یا تلوار کھینچ لینا جائز نہیں ہے۔ ابن حزم کا بیان ہے کہ بالاتفاق شیعوں کا بھی یہی مذہب ہے۔ یعنی جب تک امام مہدی جن کے وہ منتظر ہیں نہ نکلیں تلوار اٹھانا ان کے ہاں ممنوع ہے خواہ دنیا کے تمام شیعہ قتل ہی کیوں نہ ہو جائیں۔ ابن حزمؒ نے لکھا ہے کہ دوسرا طبقہ جس میں اہل السنت کا بھی ایک گروہ شریک ہے اور تمام معتزلہ اور خارجی فرقہ کے لوگ نیز زیدیہ سب کا یہی مذہب ہے کہ جب منکر اور ظلم و جور کے ازالہ کی شکل تلوار نکالنے کے سوا اور کچھ باقی نہ رہے تو اس وقت تلوار کھینچ لینا امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے لیے فرض ہو جاتا ہے بشرطیکہ باطل کے مقابلہ میں کامیابی کا غالب گمان ہو۔ لیکن ضعف کی وجہ سے کامیابی سے اگر مایوسی ہو تو اس وقت فرضیت تلوار نکالنے کی ساقط ہو جاتی ہے۔ ابن حزم کا بیان ہے کہ امام ابوحنیفہ، مالک، شافعی داؤد ظاہری سب کا یہی مذہب ہے۔ پھر دونوں فرقوں کے دلائل کا تفصیلی ذکر کر کے آخری مسلک کو ابن حزم نے ترجیح دی ہے۔ الجصاص نے بھی لکھا ہے جس کا میں نے شاید پہلے بھی کہیں تذکرہ کیا ہے ان کے بیانات سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ محدثین کی ایک جماعت حکومت کے مقابلہ ؎

اور صورت حال بھی کچھ یہی رہی کہ حضرت زید شہید کی مہم میں خفیہ مالی شرکت کے بعد اس باب میں امام کا قدم بجائے پیچھے ہٹنے کے آگے ہی کی طرف بڑھتا چلا گیا گویا یوں سمجھنا چاہئے کہ چالیس سال کی عمر سے ستر سال کی عمر تک یعنی کامل تیس سال امام ہمام رحمۃ اللہ علیہ کے بالواسطہ اور آخر میں بلاواسطہ ان ہی قصوں میں گذرے حتیٰ کہ بالآخر اسی راہ میں اس منزل سے بھی ان کو گذرنا پڑا۔ جس سے گذرنے کی تیاری تو وہ سالہا سال سے کر رہے تھے۔ بلکہ جہاں تک میرا خیال ہے اترے تھے تو اس میدان میں اسی نیت سے لیکن جب تک دوسرے امکانات سے نفع اٹھانے کا موقعہ ان کو ملتا رہا ان سے استفادے میں بھی انھوں نے کوئی کمی نہیں کی اور آخر میں انسانی زندگی کے سب سے بڑے مشکل سوال کا جو آسان ترین حل ہے' اسی حل سے وہ بھی اپنی اس مشکل کے حل کرنے میں کامیاب ہوئے۔ بالفاظ دیگر سلطان جائر کے سامنے کلمۂ حق کا اظہار کر کے شہادت یا قریب قریب شہادت کے جام کو نوش کر کے موت جیسے مشکل سوال کو انھوں نے اپنے لیے آسان بنا دیا' اور اب آپ کے سامنے اسی اجمال کے تفصیلات پیش ہوں گے۔

لئے میں تلوار اٹھانے کی کسی حال میں اجازت نہیں دیتی تھی۔ خواہ وہ کچھ بھی کر رہی ہو۔ بلکہ ہاتھ یا زبان سے امر بالمعروف نہی عن المنکر کا حکم صرف عوام سے متعلق ہے۔ بظاہر امام اوزاعی بھی ان ہی لوگوں میں معلوم ہوتے ہیں۔ اور اہل السنۃ میں فقہی طور پر اس مسئلہ کو منقح امام ابوحنیفہ نے شروع شروع میں کیا۔ اسی لیے ان پر محدثین کی طرف سے اظہار تعجب بھی کیا گیا اور لعن طعن بھی۔ لیکن بقول الجصاص ان ہی کمزوریوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ فساق و فجار کے ہاتھوں میں حکومت چلی گئی اور پھر کفار نے حکومت چھین لی۔ مسلمانوں کی سرحدیں کمزور ہو گئیں۔ **خربت البلاد و ذهب الدين والدنيا وظهرت الزندقة والغلو و مذاهب الثنوية والخرمية والمزدكيه** (احکام ص ۳۴۷ ج ۲) یعنی مسلمانوں کی آبادیاں کھنڈر بن گئیں کہ دین بھی رخصت ہو گیا اور دنیا بھی ختم ہو گئی...... زندقۃ الحاد بے دینی' خیالات میں انتہا پسندی نیز مجوسیوں کے عقائد رکھنے والے ''بابک خرمی'' کے ماننے والے مزدک مشہور اشتراکی کے ہم نوا دنیا پر چھا گئے۔

کوفہ کے ظالم گورنر کے سامنے پہلی مرتبہ حضرت امام کا احقاقِ حق

جیسا کہ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ حضرت زید شہید کی مہم سے پہلے کسی ایسے واقعہ کا پتہ نہیں چلتا جس سے امام کے سیاسی رجحان کا سراغ مل سکتا ہو' الا یہ کہ تاریخوں میں ایک واقعہ کا سرسری طور پر لوگوں نے ذکر کیا ہے۔ یعنی کہا جاتا ہے کہ جن دنوں کوفہ میں ابن النصرانیہ خالد بن عبد اللہ القسری کی حکومت تھی' جمعہ کی نماز جسے اس زمانہ کے دستور کے مطابق گورنر ہی پڑھایا کرتا تھا[1] خالد خطبے کے لیے منبر پر چڑھنے کو تو چڑھ گیا۔ لیکن منبر پر چڑھ چکنے کے بعد حکومت کے مراسلات کے پڑھنے میں کچھ اس طرح مشغول ہوا کہ

كاد يدخل وقت العصر   قریب تھا کہ عصر کا وقت داخل ہو جائے۔

(ص ۱۷۲ ج ۱ موفق)

بیان کرنے والے کہتے ہیں کہ مجھے یاد نہیں یہ بھی الفاظ راوی نے کہے تھے یا کہا تھا کہ

دخل وقت العصر.   عصر کا وقت داخل ہو چکا تھا۔

بہر حال روایت کے راوی جن کا نام ابوالملیح ہے وہ کہتے ہیں کہ میں اسی جمعہ کے دن کوفہ پہنچا تھا' وہاں کے لوگوں سے واقف بھی نہیں تھا۔ دیکھا کہ ساری مسجد خاموش ہے'

---

[1] اور یہ مسئلہ بھی بہ ظاہر کسی نیک نیتی پر مبنی نہ تھا' بلکہ جہاں تک میرا خیال ہے محدثین بیچارے جو یہ روایت بیان کرتے تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ ارشاد فرمایا تھا کہ تمہارے بہترین حکمراں وہ لوگ ہوں گے جو تمہارے بھی محبوب ہوں اور تم بھی ان کی نگاہوں میں محبوب رہو گے' تم ان سے محبت کرو گے اور وہ تم سے محبت کریں گے اور بدترین حکمراں تمہارے وہ ہوں گے جن سے تم کو بغض ہوگا وہ تم سے بغض رکھیں گے' تم ان پر لعنت کرو گے اور وہ تم پر لعنت کریں گے۔ صحابہ کہتے ہیں کہ ہم لوگوں نے دریافت کیا: یارسول اللہ! کیا ایسے حکمرانوں کو ہم الگ نہ کر دیں گے؟ آپ نے فرمایا کہ نہیں جب تک تم میں وہ نماز قائم کرتے رہیں نہیں جب تک وہ تم میں نماز قائم کرتے رہیں' نہیں جب تک وہ تم میں نماز قائم کرتے رہیں۔ الغرض لا ما اقاموا فيكم الصلواة کے فقرہ کو تین بار دہرا دہرا کر رسول اللہ نے فرمایا۔ یہ روایت صحاح کی کتاب صحیح مسلم میں بھی پائی جاتی ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ نماز پر ان کا قبضہ محض اسی لیے تھا۔ (واللہ اعلم بالصواب)

اچانک ان میں سے ایک آدمی کھڑا ہوا اور

الصلوة الصلوة خرج الوقت و دخل وقت آخر. نماز جمعہ کا وقت نکل گیا اور عصر کا وقت داخل ہو گیا۔

ابوالملیح کہتے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ فوراً اس شخص کی گرفتاری کا حکم دیا گیا اور وہ گرفتار ہو گیا۔ میں نے ان لوگوں سے جو میرے قریب تھے پوچھا کہ یہ کون ہیں؟ تب کسی نے کہا کہ نعمان ابوحنیفہ۔ ان ہی ابوالملیح سے بعض راویوں نے یہ بھی نقل کیا ہے کہ کنکریاں ہاتھ میں لیے اسی شخص نے منبر کی طرف پھینکنا شروع کیں جو نماز نماز کا لفظ پکار رہا تھا۔ اس کے بعد نماز تو خالد نے پڑھ لی پھر اس نے حکم دیا کہ نعمان کو پکڑ لو وہ پکڑ لیے گئے۔ اور خالد کے سامنے حاضر کئے گئے۔ خالد نے پوچھا کہ اس حرکت پر جو تم سے ابھی سرزد ہوئی سچ سچ بتاؤ کس چیز نے آمادہ کیا؟ میں نے دیکھا کہ جواب میں وہ کہہ رہا تھا۔

"نماز کسی کا انتظار نہیں کرتی' اللہ تعالیٰ نے قرآن میں فرمایا ہے اور تم زیادہ مستحق ہو کہ قرآن کی پیروی کرو۔ پھر انھوں نے یہ آیت پڑھی۔ یعنی اضاعوا الصلوة واتبعوا الشهوات (انھوں نے نمازیں ضائع کر دیں اور اپنی خواہشوں کے پیچھے لگ گئے۔"

خالد نے یہ بیان سن کر پھر اصرار سے پوچھا کہ خدا کی قسم کھا کر کہتے ہو کہ نماز کے سوا اور کوئی دوسری چیز تمہارے پیش نظر نہ تھی۔ انھوں نے کہا: ہاں (یعنی نماز کے سوا اور کوئی دوسرا محرک اس فعل کا میرے دل میں نہ تھا) خالد نے یہ سن کر ان کو چھوڑ دیا۔[۱]

بہر حال لے دے کر حضرت زید شہید کے واقعہ سے پہلے یہی ایک موقعہ ہے جس میں ہم امام کو حکومت کے ایک افسر پر اعتراض کرتے ہوئے پاتے ہیں۔ خالد کا معمولی سوال و جواب کے بعد چھوڑ دینا' یہ خود اس بات کی دلیل ہے کہ امام کے اندرونی رجحانات کا اظہار اس وقت تک لوگوں پر نہیں ہوا تھا۔ ایک اچھے عالم اور اچھے مال دار تاجر سے زیادہ اس وقت تک شاید وہ اور کچھ نہیں سمجھے جاتے تھے۔ مگر حضرت زید شہید

---

۱ دیکھو موفق کے مناقب ص ۲۷۱ ج ۱

کے واقعہ میں شرکت کے بعد خواہ خفیہ شرکت کیوں نہ تھی لیکن حکومت کی نگاہوں میں آپ چڑھ گئے۔

بنی امیہ کی حکومت اور حضرت امام کے تعلقات کی نوعیت اس کے بعد کیا رہی' افسوس ہے کہ تفصیلات کا تذکرہ تاریخوں میں بہت کم کیا گیا ہے لیکن حجاج بنی ثقیف کی جس قبیلہ سے تعلق رکھتا تھا۔ اسی قبیلہ کے ایک آدمی جن کا نام حکم بن ہشام ثقفی تھا ان سے مجمل الفاظ میں ایک روایت کتابوں میں پائی جاتی ہے۔ الفاظ اگرچہ مختصر ہیں۔ لیکن اسی اجمال سے تفصیل کا پتہ چلایا جا سکتا ہے جس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ حکم بن ہشام کے متعلق ایک طرف تو لوگوں نے یہ لکھا ہے جیسا کہ ابن عساکر میں ہے۔

كان صديقا لابی حنيفة (ص ۴۱۳ ج ۴) امام ابوحنیفہ کے دوست تھے۔

اور شاید اسی وجہ سے محدثین حسب دستور کچھ اسی بیچارے سے زیادہ خوش نظر نہیں آتے یعنی باوجودیکہ ابوزرعہ، یحییٰ بن معین، ولید بن مسلم وغیرہ ناقدین رجال نے حکم کی توثیق کی ہے۔ لیکن پھر بھی ابوحاتم رازی سے یہ الفاظ نقل کئے جاتے ہیں۔

يكتبُ حديثه ولا يحتج به. حکم بن ہشام کی حدیث لکھ لی جائے لیکن اس کو دلیل میں پیش کرنا صحیح نہ ہوگا۔

بہرحال کچھ بھی ہو امام صاحب سے ان کے تعلقات گہرے معلوم ہوتے ہیں۔ لکھا ہے کہ ان کا پیشہ بھی تجارت ہی تھا۔

كان يتجر الى الشام. شام کے علاقے کی طرف تجارتی کاروبار کرتے تھے۔

جس سے ہم پیشگی بھی امام صاحب سے ثابت ہوتی ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ بنی امیہ کی حکومت سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ حکم بن ہشام کے اچھے تعلقات تھے ابن عساکر ہی کا بیان ہے۔

يتردد الى الشام ياخذ عطائه شام جایا کرتے تھے' اور وہیں سے اپنی تنخواہ ... هناك وصول کرتے تھے۔

... ت بھی ان کے ایسے تھے کہ بنی امیہ والوں کو ان سے خوش ہی رہنا

چاہئے تھا[1] اگر چہ جو بنی امیہ کے مخالف تھے ان کو بھی ناراض رکھنا نہیں چاہتے تھے۔ بہرحال ان ہی حکم بن ہشام سے کہتے ہیں کہ ایک شخص نے امام ابوحنیفہ کا حال دریافت کیا جواب میں اس مشہور فقرے کو دہراتے ہوئے یعنی

علی الخبیر سقطت — جاننے والے کے پاس تم آ کر گرے ہو۔ یعنی جاننے والے سے تم نے پوچھا ہے۔

انھوں نے امام ابوحنیفہ اور بنی امیہ کی حکومت جسے وہ اپنی حکومت کے لفظ سے تعبیر کرتے تھے ان دونوں کے تعلقات کو بیان کرتے ہوئے امام صاحب کی عام اخلاق و عادات کی تعریف کرنے کے بعد پتہ کی جو بات کہی وہ یہ تھی کہ

براده سلطاننا علی ان یتولی مفاتیح خزائنه او یضرب ظهره فاختار عذابهم علی عذاب الله عزوجل. — ہماری حکومت نے چاہا کہ اپنے خزانے کی کنجیاں ان کے حوالہ کرے (یعنی اس خدمت کو وہ قبول کریں یا) اپنی پیٹھ کو کوڑے سے پٹوائیں، پس اس شخص نے (یعنی ابوحنیفہ) نے حکمرانوں کے عذاب کو اختیار کرلیا، اللہ تعالیٰ کے عذاب پر۔

حکم سے ان الفاظ کو سننے کے بعد پوچھنے والے نے کہا کہ

"آپ نے تو ابوحنیفہ کے متعلق ایسی بات بیان کی جو کسی دوسرے سے میں نے نہیں سنی۔"

---

[1] یعنی ان سے پوچھا گیا کہ حضرت عثمان کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے؟ تو بڑے قلق سے تصریح کی کہا کہ کان والله خیار الخیره امیر البرره قتیل الفجر منصور والنصره مخذول الخذله اما خاذله فقد خذله الله اما قاتله فقد قتله الله پوچھا گیا کہ حضرت علی اچھے تھے یا معاویہ تو بیچارے سے حق چھپایا نہ گیا، کہا کہ اچھے تو معاویہ سے علی ہی تھے۔ تب دریافت کیا گیا کہ خلافت کا حق دار دونوں میں کون زیادہ تھا؟ حکم نے جواب میں کہا کہ خدا نے جس کو خلیفہ بنادیا اسی کو زیادہ حق دار سمجھنا چاہئے اس سے بھی ان کی طبیعت کا رنگ معلوم ہوتا ہے یعنی ہر دو جانب کو خوش رکھتے ہوئے زندگی بسر کرنا چاہتے تھے۔ اسی لیے دونوں سے ان کے تعلقات تھے۔ ۱۲

حکم نے اس پر کہا:

ھو کما قلت لک. بات وہی ہے جو میں نے تم سے کہی۔

دیکھنے میں تو حکم کا یہ بیان چند لفظوں سے زیادہ نہیں ہے۔ لیکن جہاں تک میں خیال کرتا ہوں اگر حکم کے اس بیان پر اعتماد کیا جائے اور نہ اعتماد کرنے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔ نیز اس بیان کو اتنی ہی اہمیت دی جائے جتنی اہمیت کہ خود حکم نے اپنے بیان کو دی ہے۔ اور سننے والے نے بھی سن کر جو کچھ کہا' اگر ان ساری باتوں کو سامنے رکھ لیا جائے اور سمجھا جائے کہ امام کے سوانح نگاروں نے بنی امیہ کے گورنر ابن ہبیرہ کی طرف جن واقعات کو منسوب کیا ہے، درحقیقت یہ ابن ہبیرہ کا نہیں بلکہ حکم کے "سلطاننا" یعنی براہِ راست بنی امیہ کی حکومت کی پالیسی تھی۔ البتہ اظہار اس پالیسی کا ابن ہبیرہ کے ذریعہ سے ہوا تو حکم کے بیان سے یہ باتیں ثابت ہوتی ہیں جس کا مطلب یہی معلوم ہوتا ہے کہ شروع شروع میں جیسا کہ حکومتوں کا قاعدہ ہے امام کے سامنے مال اور مال کے ساتھ جاہ کی رشوت پیش کی گئی اور کیسی رشوت؟ حکومت کے خزائن کی کنجیاں امام کے سپرد کر دی جائیں اس کا تک فیصلہ کیا گیا' نہیں کہا جا سکتا کہ یہ فیصلہ صرف عراق و خراسان کے خزانہ تک محدود تھا' یعنی کوفہ کے بیت المال کی افسری تک بات محدود تھی یا طے کیا گیا تھا کہ امام اگر راضی ہوں تو پایۂ تخت (دمشق) کے مرکزی خزانہ کی کنجیاں ان کے حوالہ کر دی جائیں گویا مرکز کے وزیر فینانس بنا دیئے جائیں' آئندہ جو تفصیلات پیش ہوں گے ان سے تو کوفہ ہی کی حد تک یہ تجویز محدود معلوم ہوتی ہے۔ لیکن حکم کا بیان چونکہ عام ہے اس لیے کچھ تعجب نہیں کہ بات وہاں تک پہنچی ہو مگر جیسا کہ واقعات نے ثابت کیا اور آئندہ ان کی تفصیل آتی ہے جب امام اس پر راضی نہیں ہوئے تو پھر رغبت کے طریقہ کو چھوڑ کر رہبت' دھمکی اور دباؤ سے کام لیا گیا' ان شاء اللہ تفصیلات جس کی اب کئے جائیں گے۔ مجھے کہنا یہ ہے کہ یہ ہو یا وہ ہو یعنی رغبت ہو یا رہبت کی کارروائیاں اگرچہ بہ ظاہر بنی امیہ کے عہد میں ابن ہبیرہ ہی کی طرف منسوب کی گئی ہیں۔ لیکن حکم کے بیان سے یہ راز واضح ہوتا ہے کہ یہ جو کچھ بھی ہوا مرکزی حکومت کے اشارے سے ہوا۔

حکومت بنی امیہ اور امام ابو حنیفہ کے تعلقات کی داستان

جیسا کہ میں نے عرض کیا حضرت زید کی شہادت کے بعد بنی امیہ کی حکومت حوادث و آفات کے طوفانی تھپیڑوں میں مسلسل ہچکولے کھاتی چلی جا رہی تھی۔ خلفاء پر خلفا بدلتے چلے جا رہے تھے بغاوتوں اور فتنوں کا ایک نہ ٹوٹنے والا سلسلہ تھا جو ملک کے ہر گوشہ میں پھوٹ پڑا تھا اور طرفہ ماجرا یہ کہ خلفا بھی جو اس عرصہ میں گذرے ان میں ایک ایک سے بڑھا ہوا تھا[1] چونکہ نام کی تصریح نہیں کی گئی ہے اس لیے نہیں کہا جا سکتا کہ یہ واقعہ کس

---

[1] تفصیلات تو تاریخ کی کتابوں میں پڑھیے، لیکن مختصر یہ ہے کہ ہشام کے بعد ولید نامی خلیفہ گدی پر جو بیٹھا تو گو حکومت کرنے کا موقعہ ایک سال دو مہینے بائیس دن سے زیادہ اس کو نہیں ملا لیکن اس وقت کو بھی اس نے صرف گانے بجانے اور شراب خواری میں ختم کر دیا۔ بدمستی کا اس کے یہ حال تھا کہ قوال نے ایک غزل سنائی جس سے اتنا مسرور ہوا کہ قوال سے لپٹ پڑا اور اس کے ہر ہر عضو کو چومنا شروع کیا تا اینکہ شرم گاہ کے چومنے پر بھی مصر ہوا قوال بے چارہ ران میں چھپائے چلا جاتا تھا اور وہ تھا کہ اصرار کر رہا تھا کہ ضرور چوموں گا۔ نشہ ہی میں ایک دن قرآن کھول بیٹھا آیت لگی و خاب کل جبار عنید (ناکام ہوا ہر زبردستی کرنے والا کینہ پرور) اس کو خیال گذرا کہ یہ اشارہ قرآن کا میری طرف ہے۔ اسی وقت قرآن کو لٹکا کر تیروں سے چاند ماری (العیاذ باللہ) شروع کر دی۔ تیر پر تیر چلاتا اور کہتا جاتا تھا (اتوعد کل جبار عنید. فها انا ذاک جبار عنید. اذا ما جئت ربک یوم حشر. فقل: یا رب! خرقنی الولید) اے قرآن تو زبردستی کرنے والے کینہ پرور کو دھمکاتا ہے، تو لے میں وہی زبردستی کرنے والا کینہ پرور ہوں۔ قیامت کے دن اپنے خدا کے پاس جب تو جائے تو کہہ دینا کہ ولید نے مجھے پھاڑ دیا۔ ظاہر ہے کہ یہ سارا تماشا ام الخبائث کا تھا' اگرچہ اس کی طرف بعض ایسے اشعار بھی منسوب ہیں جن میں رسول اللہ ﷺ تک پر اس نے تعریض کی ہے۔ ولید کے بعد یزید تخت نشین ہوا کل پانچ مہینے دو راتیں حکومت کے لیے ملیں' یہ اعتقاداً کٹر معتزلی تھا اور سب سے بڑا سرمایۂ ناز اس کا یہ تھا جسے ایک شعر میں اس نے ادا کیا ہے۔ انا ابن کسری و ابی مروان و قیصر جدی و جدی خاقان (میں کسریٰ کا بیٹا ہوں میرا باپ مروان تھا اور قیصر بھی میرا دادا ہے اور خاقان بھی میرا دادا ہے) کہتے ہیں کہ اس کی ماں جس کا نام شاہ فراز تھا یزدجرد کے بیٹے فیروز کی بیٹی تھی اور فیروز کی ماں کا نسلی تعلق کچھ ساسانیوں سے بھی' کچھ قیصر سے بھی اور کچھ خاقان ترک سے تھا

خلیفہ کا ہے۔ لیکن جہاں تک میں خیال کرتا ہوں۔ حضرت امام ابوحنیفہ سے براہِ راست جو یہ واقعہ منقول ہے اور راوی بھی اس کے حسن بن زیاد[1] لولوئی ہیں۔ جن کا شمار امام کے ارشد تلامذہ میں ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں نے ابوحنیفہ سے خود یہ قصہ سنا۔ فرماتے ہیں کہ بنی امیہ کے گورنروں کا قاعدہ تھا کہ موالی (غیر عربی) مسلمانوں میں جو علما تھے۔ ان کو فتویٰ وغیرہ کے لیے اپنے دربار میں نہیں بلاتے تھے۔ حسن بن زیاد کا بیان ہے کہ اس کے بعد امام نے فرمایا:

اول من دعا بالموالي فلان ذكر رجلا منهم سماه.	سب سے پہلے موالی کو اس کام کے لیے جس نے بلایا وہ فلاں تھا امام ابوحنیفہ نے اس کا نام بھی لیا

لے تھا۔ اسی کی طرف اشارہ کرتا تھا وا أسفاه وحسرتا کہتے کہتے دم یزید کا نکل گیا۔ پھر ابراہیم بیٹھا چار مہینے میں اس کی خلافت بھی ختم ہوگئی تب آخری اموی حکمران مروان گدی پر آیا مروان کو گو کہنے کے حد تک پانچ سال کچھ اوپر حکومت کرنے کا موقعہ ملا۔ لیکن خود اپنی قبر اپنے ہاتھ سے یوں کھودی کہ اس کے باپ دادا تو صرف عربی تعصب رکھتے تھے۔ غیر عربی مسلمانوں کی ہمت شکنی ان کا عام شیوہ تھا۔ حضرت امام زین العابدین علیہ السلام نے اپنی ایک صاحبزادی کا نکاح ایک مولیٰ (آزاد کردہ عجمی غلام) سے کیا اور اپنی ایک عجمی لونڈی کو آزاد کر کے خود اس سے عقد فرمایا' اس پر عبدالملک نے بڑے طعن وتشنیع کے خطوط حضرت کو لکھے کہ تم نے قریش کی ناک کٹوادی۔ حضرت نے جواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نمونوں کو لکھ کر بھیج دیا کہ ایک یہودن عورت کو آزاد کر کے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے نکاح کیا یعنی صفیہ بنت حیی ام المومنین رضی اللہ تعالیٰ عنہا اور زید اپنے غلام کو آزاد کر کے اپنی پھوپھی زاد بہن زینب رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا ان سے نکاح کر دیا۔ لیکن عربیت کا غرور بنی امیہ کے سر سے نہ نکلا اور مروان نے تو حد کر دی کہ یمن کے قحطانی النسل عربوں کی بھی اس نے تحقیر شروع کی اور یہی چیز اس کی اور اسکی حکومت کی بربادی کی آخری وجہ بن گئی۔ ۱۲

[1] امام کے چند برگزیدہ تلامذہ میں ان کا شمار ہے۔ اگر چہ بعد کو بھی انھوں نے قاضی ابو یوسف اور زفر سے استفادہ کیا۔ کوفہ کے مدتوں قاضی رہے۔ اتباع سنت کا غلبہ اس درجہ تھا کہ اپنے غلاموں کو وہی کھانا کھلاتے جو خود کھاتے اور وہی کپڑے پہناتے جو خود پہنتے تھے ۲۰۴ھ میں وفات ہوئی۔

حکومت کی جانب سے حضرت امام سے پہلا استفتاء:

مگر معلوم نہیں کہ حسن نے نام کی تصریح کیوں نہ کی، بہر حال میرا خیال ہے کہ زید کی شہادت کے بعد غالب قرینہ یہی ہے کہ ہشام کے اشارے سے یوسف بن عمرو ہی نے امام کو اپنے دربار میں فتوے کے لیے بلایا۔ بہ ظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت امام کی اندرونی امداد کی خبر جب حکومت کو ہوئی تو ابتدا ہی میں ارادہ کیا گیا کہ امام کو حکومت کا ہمنوا بنالیا جائے۔ اور اسی لیے موالی کے متعلق جو قدیم دستور تھا اور حکومت بنی امیہ اس کی پابند چلی آ رہی تھی، اس کو توڑنے پر مجبور ہونا پڑا۔ بہر حال اس کے بعد گورنر نے عربی النسل فقہا کے مجمع میں امام کو شریک کر کے فتویٰ پوچھا اور یہ پہلا موقعہ تھا جس میں نہ صرف اجتہاد و تفقہ بلکہ امام ابو حنیفہ کی وسعت معلومات کا اندازہ حکومت کو بھی ہوا۔ اور ان عربی النسل علماء کو بھی ہوا جو عجمی لوگوں کو آنکھ نہیں لگاتے تھے۔[1]

---

[1] حقیقت یہ ہے کہ حکومت ملنے کے ساتھ ہی عربی قبائل سے تعلق رکھنے والے جتنے سربرآوردہ امراء تھے وہ سیاست میں الجھ کر رہ گئے تھے۔ موالی یعنی عجم کے نومسلموں کا حکومت سے چونکہ زیادہ تعلق نہیں تھا، اس لیے دین اور علم میں ترقی کرنے کا فراخ میدان کو مل گیا۔ مشہور قصہ ہے کہ ہشام ہی کے متعلق کہتے ہیں کہ اس کے دربار میں عطا پہنچے۔ اس نے پوچھا کہ عطا، اسلامی شہروں میں اس وقت جو علما ہیں ان سے تم واقف ہو؟ انھوں نے کہا: کیوں نہیں۔ ہشام نے دریافت کرنا شروع کیا کہ بتاؤ۔ مدینہ کا فقیہ آج کل کون ہے؟ بولے: نافع یعنی ابن عمر کے مولی۔ اس نے پوچھا اور مکہ کے؟ کہا کہ عطا ابن ابی رباح، اس نے کہا کہ یہ عربی ہیں یا مولی، عطا نے کہا: مولیٰ، ہشام نے پوچھا اور یمن کا فقیہ؟ عطا نے کہا کہ طاؤس بن کیسان۔ ہشام، عربی ہیں یا مولی۔ عطا: مولی۔ ہشام اور یمامہ کے؟ عطا یحییٰ بن کثیر ہشام عربی ہیں یا مولی۔ عطاء مولی۔ ہشام اور شام کے؟ عطا: مکحول ہشام عربی ہیں یا مولی؟ عطاء: مولی۔ ہشام الجزیرہ (موصل وغیرہ) کا فقیہ کون ہے عطاء میمون بن مہران ہشام عربی ہیں یا موئی۔ عطا مولی۔ ہشام خراسان کا فقیہ کون ہے؟ عطاء ضحاک بن مزاحم۔ ہشام عربی ہیں یا مولیٰ۔ عطاء: مولیٰ۔ ہشام بصرہ کے؟ عطاء الحسن البصری و ابن سیرین۔ ہشام دونوں عربی ہیں یا مولیٰ؟ عطاء مولیٰ۔ ہشام کوفہ کا فقیہ کون ہے؟ عطاء: ابراہیم النخعی۔ ہشام عربی یا مولیٰ؟ عطاء: نہیں یہ مولیٰ نہیں ہیں عربی النسل عالم ہیں۔ ہشام اس گفتگو کے بعد بے اختیار ہو کر بولا۔ قریب تھا کہ میری تلی

میرے نزدیک یہ پہلی خوراک تھی جو امام ابو حنیفہ کے سامنے بنی امیہ کی حکومت کی طرف سے پیش کی گئی اس سے اور کچھ ہوا یا نہ ہوا لیکن ایک غیر اسلامی رسم اس راہ سے ٹوٹی جیسا کہ میں نے عرض کیا بنی امیہ کی حکومت پیہم انقلابات کے چکروں میں اس وقت مبتلا تھی۔ دمشق میں خلفا پر خلفاء بدلتے چلے جا رہے تھے اور اس کا اثر صوبجات کے ولاۃ اور گورنروں پر بھی قدرتاً پڑ رہا تھا۔ ہشام اور ولید تک تو کوفہ کی حکومت یوسف بن عمرو ہی کے ہاتھ میں رہی لیکن ولید جب قتل ہوا۔ اور اس کی جگہ یزید تخت نشین ہوا تو یوسف بن عمرو پر مصیبت کا پہاڑ ٹوٹا اور مرنے سے پہلے اپنے اعمال کے خمیازوں کو بھگت کر دنیا سے روانہ ہوا[1] یوسف کے بعد منصور بن جمہور کو کوفہ کی ولایت سپرد ہوئی۔ لیکن بہت جلد اس

بقیہ روح پرواز کر جائے۔ اگر آخر میں تم ایک عربی النسل عالم کا نام نہ لے دیتے (موفق ص ۸) اس سے دونوں چیزوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ ایک تو عربی النسل لوگوں کی علم سے کنارہ کشی اور دوسرے ہشام کے نسلی جذبہ کی شدت کہ اس خبر سے شدت رشک و حسد سے خود کہتا ہے کہ میری روح نکل پڑتی۔ امام ابو حنیفہ جو موالی سے تعلق رکھتے تھے پہلی دفعہ دربار میں جب بلائے گئے تھے تو اس وقت بھی ایک عجیب پیچیدہ صورت پیش آئی 'یعنی امام رحمۃ اللہ علیہ نے مسئلہ کا جو جواب دیا تھا اور جو پسند کیا گیا تھا یہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا قول تھا۔ امام صاحب کا بیان ہے کہ بنی امیہ کے دربار میں حضرت علی کے نام لینے کی اجازت نہ تھی فرماتے ہیں کہ مشائخ اور علماء کا اس زمانہ میں دستور تھا کہ جب حضرت علی کے ذکر کی ضرورت ہوتی تو کہتے کہ "شیخ نے یوں کہا ہے" اور مراد شیخ سے حضرت کی ذات ہوتی۔ حسن بصری کا قاعدہ تھا کہ بجائے علی کے کہتے کہ ابو زینب کا یہ قول ہے۔ امام صاحب کے آخری الفاظ حسن بن زیاد کے یہ ہیں کہ **من کان یذکر باسمه یعاقبه مروان** (ص ۱۷۱) یعنی حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا جو نام لیتا مروان اسے سزا دیتا تھا۔

[1] حضرت زید کے ظالموں کو اپنے اپنے مظالم کے جن خمیازوں کو بھگتنا پڑا اس کا ذکر کسی نوٹ میں پہلے بھی آ چکا ہے۔ یوسف کے متعلق لطیفہ یہ ہے کہ یزید ابن الولید بن عبد الملک کے تخت نشین ہونے کے بعد جب کوفہ کی گورنری بدلی تو یوسف وہاں سے بھاگا راستہ میں ایک کھیت میں چھپا۔ لوگوں کے تعاقب کا خطرہ وہاں بھی ہوا تو لکھا ہے کہ جوتیوں کو چھوڑ کر ننگے پاؤں کھیت سے بھی فرار ہوا لوگ تلاش میں تھے آخر اس حال میں گرفتار ہوا کہ ایک چادر کے نیچے دبکا ہوا تھا۔ اور چند سر برہنہ عورتیں چادر کے کناروں پر بیٹھی ہوئی تھیں گویا ایسا باور کرا رہی تھیں کہ غلہ دار کی کسی ڈھیری پر چادر بقیہ

کو بھی رخصت ہونا پڑا۔ بظاہر ان شورشوں کے دبانے میں منصور بھی کامیاب نہ ہو سکا جن سے کوفہ لبریز ہو رہا تھا۔ لکھا ہے کہ یزید نے آخر حضرت عمر بن عبد العزیز کے صاحبزادے عبد اللہ ابن عمر بن عبد العزیز کو بلا کر کہا کہ

سر إلى العراق فان أهله يميلون إلى ابيك. (ص ۲۱۱ کامل ج ۴)

تم ہی عراق کی حکومت کی باگ اپنے ہاتھ میں لے لو' وہاں کے باشندے تمہارے باپ کی طرف میلان رکھتے ہیں۔

لیکن کوفہ میں انقلاب کی آگ بھڑک چکی تھی۔ عبد اللہ بن عمر کو بھی مختلف فتنوں کا مقابلہ کرنا پڑا' جس میں سب سے بڑا فتنہ عبد اللہ ابن معاویہ بن عبد اللہ بن جعفر بن ابی طالب کا تھا۔[۱] بڑے مقابلہ اور مقاتلہ کے بعد یہ فتنہ فرو ہوا۔

لے اڑھا کر۔ یہ عورتیں بیٹھی ہیں مگر واقعہ کا لوگوں کو علم تھا۔ ٹانگ پکڑ کر چادر کے نیچے سے گھسیٹا گیا اسی وقت اس کی ڈاڑھی جو غیر معمولی طور پر بہت بڑی تھی نوچی گئی اور یزید کے سامنے اسی حال میں پیش ہوا۔ لکھا ہے کہ بدحواسی میں یزید کے سامنے ڈاڑھی پکڑے کھڑا رو رہا تھا اور کہہ رہا تھا کہ امیر المومنین لوگوں نے میری ڈاڑھی اکھاڑ دی ایک بال بھی باقی نہ رکھا۔ (ص ۱۱ ج ۴)

[۱] حضرت جعفر طیار جو حضرت علی کے بڑے بھائی تھے۔ ان کے خاندان سے ان کا تعلق تھا۔ عبد اللہ بن عمر بن عبد العزیز کی گورنری کے زمانہ میں شیعوں نے یہ قرار دے کر کہ یہ بھی تو اہل بیت ہی کے خاندان کے آدمی ہیں ان کے ہاتھ پر بیعت شروع کی۔ بڑے جھگڑے پیش آئے۔ کوفہ چھوڑ کر یہ ایران چلے آئے اور ایران سے خراسان کی طرف بھاگے وہاں ابو مسلم عباسیوں کا داعی اپنا اقتدار قائم کر چکا تھا۔ چونکہ ابو مسلم اہل بیت ہی کے نام سے کام کر رہا تھا۔ عبد اللہ بن معاویہ نے اس سے پناہ چاہی۔ لطیفہ یہ ہے کہ ابو مسلم نے کہلا بھیجا کہ تمہارے نسب نامہ میں معاویہ نام کیسے ہے۔ اہل بیت والوں میں آج تک یہ نام نہیں سنا گیا۔ جواب میں انھوں نے لکھا کہ امیر معاویہ نے زبردستی کر کے میرے والد کا نام معاویہ رکھوایا تھا۔ اور میرے دادا اس پر راضی ہو گئے تو ایک لاکھ درہم انعام بھی دیا تھا۔ اس لیے مجبوراً یہ نام میرے نسب نامہ میں گھس گیا۔ ابو مسلم نے جواب میں کہا کہ تمہارے خاندان والوں نے بہت سستے داموں میں اس نام کو خریدا پھر ابو مسلم ہی نے گرفتار کر کے ان کو قتل کرا دیا۔ (کامل ص ۱۳۹ ج ۴)

کوفہ پر ضحاک خارجی کا قبضہ:

اس عرصہ میں کل پانچ مہینے کچھ دن حکومت کر کے یزید بن الولید بھی مر گیا۔ تخت کے چند مدعیوں میں قتال و جدال کا بازار خوب گرم رہا۔ چند آدمیوں کے ہاتھوں پر بیعت کی گئی اور توڑی گئی۔ بالآخر مروان بن محمد بن مروان غالب آیا اور آخری خلیفہ ہونے کی حیثیت سے یہی بنی امیہ کی گدی پر قابض ہو گیا۔ لیکن خاندانی جھگڑوں سے فارغ ہونے کے ساتھ ہی مختلف گوشوں سے خوارج ابل پڑے۔

حضرت امام کی گرفتاری:

اسی سلسلہ میں ضحاک نامی خارجی بھی تھا، جس نے عبداللہ بن عمر والی کوفہ کو شکست دے کر کوفہ پر قبضہ کرنے کے ساتھ ہی امام ابوحنیفہ کو گرفتار کرنے کا حکم دیا۔ اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ امام کے سیاسی رجحانات اب پوشیدہ نہیں رہے تھے۔ اسی لیے خارجیوں نے امام کی گرفتاری غالباً ضروری قرار دی۔ لکھا ہے کہ جب امام خارجیوں کے قائد کے پاس آئے تو لوگوں نے توجہ دلائی کہ **هذا شيخهم** (یعنی کوفہ کے مسلمانوں کا یہ مذہبی پیشوا ہے) یہ سن کر بیان کیا جاتا ہے کہ ان کے لیڈر نے امام کو سامنے بلوایا اور جیسا کہ خارجیوں کا دستور تھا، ہر مسلمان سے توبہ کراتے تھے۔ جب حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے ان بدبختوں نے **تب كما تبنا** (تم بھی اسی طرح توبہ کرو جیسے ہم نے توبہ کی) کا مطالبہ کیا تھا تو بے چارے امام ابوحنیفہ کس شمار میں تھے۔ ان پر بھی اسی توبہ کرنے کا مطالبہ پیش کیا گیا۔ کہا گیا کہ

تب يا شيخ من الكفر. بڑے میاں کفر سے توبہ کرو۔

کہتے ہیں کہ جواب میں امام نے اپنے ہوش و حواس کو قائم رکھتے ہوئے فرمایا کہ

انا تائب من كل كفر. میں ہر کفر سے تائب ہوں۔

یہ سن کر خارجیوں نے امام کو چھوڑ دیا لیکن کسی کو پھر شرارت سوجھی۔ اس نے خارجیوں کو باور کرایا کہ کفر سے مراد ان کے نزدیک تم لوگوں کے عقائد ہیں، انھوں نے تمہارے عقائد سے توبہ کی ہے۔ خارجی گنوار تو تھے ہی۔ پھر امام واپس بلائے گئے اور

پوچھا گیا کہ

"شیخ ہم نے سنا ہے کہ جس کفر سے تم نے توبہ کی ہے اس سے مراد ہمارے عقاید اور ہمارا طریقہ کار ہے۔"

خارجیوں نے اپنا اصول یہ مقرر کر رکھا تھا کہ ہر چیز سے الگ ہو کر صرف قرآن کے سامنے جھکنا چاہیے۔ وہی حکم اور فیصلہ ہے۔ حضرت امام نے دیکھا کہ ان جاہلوں سے خلاصی کی صورت اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ قرآن ہی سے ان پر الزام قائم کیا جائے آپ نے فرمایا:

"یہ جو تم کہہ رہے ہو' کیا یہ صرف ظن اور گمان کے سوا اور بھی کچھ ہے۔ کیا آپ لوگوں کو یقین ہے کہ کفر سے میں نے وہی مراد لیا ہے جسے میری طرف تم منسوب کرتے ہو۔"

ان کے لیڈر نے کہا کہ

"ہاں! صرف گمان اور ظن ہے' یقین سے یہ کیسے کہا جا سکتا ہے۔"

رہائی:

امام صاحب نے تب قرآن کی آیت **ان بعض الظن اثم** (بعض گمان گناہ ہوتا ہے) تلاوت کر کے فرمایا کہ بدگمانی کر کے تم نے گناہ کا ارتکاب کیا۔ اور گناہ کے متعلق تم لوگوں کا خیال ہے کہ وہ کفر ہے۔ ہر آدمی کو اسلام سے خارج کر دیتا ہے۔ یہ تقریر کر کے امام نے زور دے کر خارجیوں کے اسی لیڈر سے کہا کہ جناب! پہلے آپ اس کفر سے توبہ کیجئے' یہ سن کر خارجی لیڈر بولا کہ ہاں! یہ تم نے سچ کہا اور میں اس کفر سے توبہ کرتا ہوں۔ لیکن ابوحنیفہ تم بھی کفر سے توبہ کرو' امام نے اس کے جواب میں پھر اپنے پہلے جملے کو دہرایا کہ

"میں ہر قسم کے کفر سے اللہ تعالیٰ کی درگاہ میں توبہ کرتا ہوں۔"

کہتے ہیں کہ خارجیوں نے یہ سن کر امام کو چھوڑ دیا۔[1]

---

[1] بطور طعن کے بعض تاریخوں میں امام کی طرف یہ منسوب کیا گیا ہے کہ کفر سے امام ابوحنیفہ کی توبہ کرائی گئی ہے۔ لیکن اس توبہ کی اصل حقیقت یہی ہے لوگوں نے واقعہ کے ان اجزاء کو حذف کر کے صرف یہ مشہور کر دیا کہ ابوحنیفہ سے توبہ کفر سے کرائی گئی۔ دیکھو موفق ص ۱۷۷ ج ۱۔

اہل کوفہ کے قتل عام کا حکم:

لیکن یہ تو شخصی مصیبت تھی جس سے امام کو نجات ملی۔ خارجی اب شہر کے عام باشندوں کی طرف متوجہ ہوئے' یہ طے کر کے کہ کوفہ والے عموماً شیعی عقائد رکھتے ہیں۔ یا کم از کم خارجی عقائد ان کے نہیں ہیں۔ اس لیے وہ کافر ہیں اور کافروں کا خون بھی حلال ہے اور ان کے بال بچوں کو غلام اور لونڈی بنا لینا ہم سچے مسلمانوں کا دینی حق ہے۔ یہ طے کر کے بیان کیا گیا ہے کہ مردود ضحاک خارجی کوفہ کی جامع مسجد میں تلوار نکال کر بیٹھ گیا اور عام اعلان اس نے کر دیا کہ ''کوفہ والوں کو قتل کر دیا جائے' اور ان کی عورتوں بال بچوں کو لونڈی غلام بنایا جائے۔''

ضحاک خارجی سے حضرت امام کی گفتگو:

امام ابوحنیفہ کی زندگی میں کوفہ کی تاریخ کا یہ نازک ترین وقت تھا۔ کسی میں اتنی جرأت نہ تھی کہ ان وحشی گنوار خارجیوں کے پاس جا کر کچھ کہہ سکے' بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شخصی طور پر امام کو ایک دفعہ ملنے کا موقعہ ان لوگوں سے چونکہ مل چکا تھا گفتگو بھی ہو چکی تھی۔ اسی لیے جان پر کھیل کر اس دن ابوحنیفہ ہی آگے بڑھے اور ضحاک کے سامنے پہنچ کر کہا کہ میں کچھ کہنا چاہتا ہوں' اس نے اجازت دی۔ امام نے ضحاک سے پوچھا کہ یہ مردوں کے قتل اور عورتوں اور بچوں کو لونڈی غلام بنا لینے کو حلال کس بنیاد پر قرار دیا گیا ہے۔ ضحاک نے کہا کہ یہ لوگ مرتد ہیں۔ اس کی اس تعبیر نے امام کے لیے موقعہ پیدا کیا۔ ضحاک سے آپؒ نے فرمایا کہ:

> ''مرتد ہونے کا مطلب ہے؟ کیا ان لوگوں کا پہلے کچھ اور دین تھا اور اس دین کو ترک کر کے مرتد ہونے کے بعد اب کوئی نیا دین انھوں نے قبول کیا ہے۔ یا جس دین پر پہلے سے چلے آ رہے ہیں وہی دین اس وقت بھی ان کا ہے۔''

ضحاک امام کے ان الفاظ کو سن کر کچھ چوکنا سا ہوا اور بولا کہ

اعد علی به. تم نے جو بات کہی اسے ذرا پھر دہراؤ۔

امام نے بات دہرادی کہتے ہیں کہ دیوانے کی سمجھ میں خدا جانے کیا آیا اور زور سے اس نے اخطاء نا (ہم سے غلطی ہوئی) کا اعلان کرتے ہوئے خود اپنی تلوار میان میں کرلی اور اس کے بعد دوسروں نے بھی اس کی تقلید کی۔[1]

بہرحال کچھ بھی ہو۔ حق تعالیٰ کی رحمت نے کوفہ والوں کو اس دن امام ابوحنیفہ کے ذریعہ سے بچالیا۔ اسی لیے بطور لطیفہ کے ابومعاذ البلخی کا یہ فقرہ نقل کیا جاتا ہے۔ کبھی کبھی وہ کہتے کہ

اهل الكوفة كلهم موالي ابى حنيفة لانه سبب عتقهم (ص ۱۷۴ ج ۱ موفق)	سارے کوفہ والے امام ابوحنیفہ کے آزاد کردہ موالی (غلام) ہیں کیونکہ وہی ان کی آزادی کا سبب تھے۔"

خارجیوں کا استیصال اور ابن ہبیرہ کی گورنری:

لیکن کوفہ پر خارجیوں کا اقتدار بھی زیادہ دن تک باقی نہ رہا، ضحاک، مثنیٰ بن عمران العاندی کو کوفہ کا حاکم بنا کر خود مروان کے مقابلہ میں پہنچ کر مارا گیا اور مثنیٰ بن عمران کے مقابلہ میں مروان نے اپنے اس افسر کو مقرر کیا جس کا امام ابوحنیفہ کی سوانح عمریوں میں بکثرت ذکر آتا ہے۔ (یعنی یزید بن عمرو بن ہبیرہ) ابن ہبیرہ نے عراق پہنچ کر خوارج کا اس علاقے سے استیصال کردیا۔ اس میں شک نہیں کہ ابن ہبیرہ اپنی زندگی کے دوسرے پہلوؤں کے لحاظ سے کچھ بھی ہو۔ لیکن عراق سے خارجیوں کو نکالنے کے بعد ۱۲۹ھ سے

---

[1] اصل یہ ہے کہ سرپھروں اور دیوانوں کے ایک گروہ کا نام "خوارج" تھا، زود فربہی اور زود لاغری ان کی خصوصیت تھی۔ اسی لیے قتل کا فتویٰ بھی بہت جلد دے دیتے تھے اور توبہ پر بھی بہت جلد آمادہ ہوجاتے تھے، ورنہ سمجھ نہیں آتا ہے کہ حضرت امام کے ان الفاظ سے اس کی تسلی کیسے ہوگئی اور اپنی غلطی کا اعتراف کیسے کرلیا بجز اس کے کہ مرتد ہونے کا لفظ جو بولتا تھا اس لفظ کے صدق کے لیے جس چیز کی ضرورت تھی امام نے اس پر واضح کیا کہ یہ بات ان میں نہیں پائی جاتی یعنی کوفہ والوں کا دین بجائے خود کچھ بھی ہو۔ کفر ہو یا اسلام۔ لیکن "ارتداد" کا الزام ان پر قطعاً غلط ہے کیونکہ ایک دین کو چھوڑ کر دوسرے دین کو قبول کرنا ارتداد کی تعریف تو یہ ہے۔ اور کوفہ والوں نے یہ کبھی نہیں کیا بلکہ جس دین پر بھی ہیں ہمیشہ سے ہیں۔۱۲

۱۳۲ھ یعنی کم وبیش چار سال تک اپنے علاقہ میں اس نے امن وامان قائم کر دیا تھا۔ جیسا کہ میرا خیال ہے امام ابوحنیفہ کے متعلق حکومت بنی امیہ نے جو اپنی پالیسی مقرر کی تھی۔ اس پر عمل کرنے کا موقعہ ابن ہبیرہ کو اپنی حکومت کے زمانہ میں ملا۔ اسی لیے جتنے واقعات اس سلسلہ میں بیان کئے جاتے ہیں ان میں اسی ابن ہبیرہ ہی کا نام لیا جاتا ہے۔

امام ابوحنیفہ اور ابن ہبیرہ:

امام کے سوانح نگاروں نے اس سلسلہ میں واقعات کو غیر مرتب طور پر بیان کیا ہے۔ لیکن قرائن وقیاسات سے کام اگر لیا جائے تو شاید ہم ان میں ایک قسم کی ترتیب بھی پا سکتے ہیں۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا تھا' حکومت کی پالیسی امام ابوحنیفہ کے متعلق یہ تھی کہ پہلے نرمی سے کام لیا جائے اور نرمی میں جس حد تک مبالغہ ممکن ہے اس میں کمی نہ کی جائے۔ لیکن نرمی سے جب کام نہ چلے۔ تب گرمی کے طریقوں کو اختیار کیا جائے۔

ابن ہبیرہ اور حضرت امام کی ملاقاتیں:

اس سلسلہ میں ہم ابوحنیفہ کو ابن ہبیرہ کے دربار میں اس شان کے ساتھ پاتے ہیں کہ ایک شخص کو ابن ہبیرہ قتل کی دھمکیاں دے رہا ہے اور قریب ہے کہ اس بیچارے کو جلاد کے سپرد کر دے۔

اچانک امام ابوحنیفہ ابن ہبیرہ کے دربار میں داخل ہوتے ہیں۔ اس کا ذکر مورخین نے نہیں کیا ہے کہ کیوں آئے تھے۔ خود آئے تھے یا بلائے گئے تھے' لیکن میرا خیال ہے کہ بلائے ہی گئے تھے[1] بہرحال لکھا ہے کہ غریب ملزم کی نظر جوں ہی امام ابوحنیفہ پر

---

[1] زیادہ تر وثائق کی تیاری کے لیے امام کو بلایا جاتا تھا یا کبھی کوئی مشکل مقدمہ پیش ہوتا تب آپ کو دعوت دی جاتی' کہتے ہیں کہ شروع شروع میں ابن ہبیرہ امام کی قابلیت سے ایک وثیقہ کے لکھنے کے بعد ہی واقف ہوا۔ پہلے اس نے شہر کے عربی النسل علماء ابن ابی لیلیٰ اور ابن شبرمہ سے مسودہ لکھوایا۔ لیکن پسند نہ آیا۔ تب امام کو بلوایا۔ ان دونوں کے مسودوں کو دیکھ کر امام نے فرمایا کہ اللہ کے نام کے سوا ان میں جو کچھ لکھا گیا ہے سب غلط ہے، تب ابن ہبیرہ نے آپ سے مسودہ لکھنے کی خواہش کی۔ آپ نے فرمایا کیا ابھی چاہتے ہو۔ بولا: ہاں ابھی۔ فرمایا: کسی کاتب کو بلواؤ، کاتب آیا اور اسی وقت آپ نے مسودہ لکھوایا۔ اس دن سے امام کی عظمت ابن ہبیرہ کے قلب میں جاگزیں ہوگئی۔ (ص ۲۱ موفق ج ۲)

پڑی بدحواسی یا جان بوجھ کر اس نے ابن ہبیرہ سے کہا کہ آپ کو میرے متعلق اگر شبہات ہیں تو یہ صاحب جو آپ کے پاس ابھی آئے ہیں ان سے میرا حال دریافت کرسکتے ہیں (اور واقعہ یہ تھا کہ امام صاحب نے اس کو نہ کبھی دیکھا تھا اور نہ اس کے حال سے واقف تھے) لیکن یہ محسوس کر کے کہ اس بے چارے نے مجھ سے گویا امداد چاہی ہے۔ اس مظلوم کو بچانے کی کوئی صورت پیدا کرنی چاہئے۔ خدا نے جس قسم کا ذہن رسا اور ثاقب طبیعت آپ کو عطا کی تھی فوراً ایک خیال سامنے آیا یعنی امام کی طرف مخاطب ہو کر ابن ہبیرہ نے جب پوچھا کہ آپ کیا اس شخص کو پہچانتے ہیں؟ جھوٹ تو بول نہیں سکتے تھے۔ اس لیے آپ نے ملزم کی طرف خطاب کر کے پوچھا کہ ''تم وہی آدمی ہو جو اذان دیتے ہوئے لا الہ الا اللہ کے کلمہ کو خاص طور پر کھینچا کرتے ہو۔ اس نے بھی کہہ دیا: جی ہاں! امام نے فرمایا کہ اچھا اذان دو۔ اس بے چارے نے اذان دی۔ اذان جب ختم ہوئی تو امام صاحب نے کہنا شروع کیا یہ تو اچھا آدمی ہے مجھے تو اس میں کوئی بات اعتراض کی معلوم نہیں ہوتی' کہتے ہیں کہ امام کے یہ فرمانے کے ساتھ ہی ابن ہبیرہ نے ملزم کو چھوڑ دیا۔ جن لوگوں نے امام کے اس واقعہ کو نقل کیا ہے آخر میں انھوں نے اس کا اضافہ بھی کیا ہے کہ:

انما کان غرض ابی حنیفه ان یسمع الرجل یقربالشهادتین لیتوصل الی خلاصه فامره بالاذان لذلک. (ص ۱۸۷ ج ۱)

بات کو کاٹ کر اذان کا قصہ امام نے اس لیے چھیڑا کہ اس کی تعریف کی گنجائش پیدا ہو جائے یعنی کلمہ شہادت ادا کر کے اس کی خلاصی کی وجہ امام نے نکال لی۔ اس کو اذان پکارنے کا حکم دیا گیا۔

گویا امام کا مطلب یہ تھا کہ جو آدمی توحید کا مقر ہے' رسالت کو مانتا ہے اس کے متعلق اگر یہ کہا جائے کہ یہ تو اچھا آدمی ہے' یہ جھوٹ نہ ہوگا۔ مگر میرا خیال ہے کہ اسی کے ساتھ ابن ہبیرہ کو اپنے طرز عمل سے یہ بھی ثابت کرنا تھا کہ حضرت امام کی اس کے دل میں کتنی عزت اور کتنا احترام ہے گویا محض ان کو معمولی توثیق سے ایسے مجرم کو جو واقع میں مجرم تھا یا نہ تھا' لیکن ابن ہبیرہ تو اس کو واجب القتل قرار دے چکا تھا۔ اس کو چھوڑ دیا' اگر

یہ سمجھا جائے کہ اس طرز عمل سے نفسیاتی طور پر وہ امام کو متاثر کرنا چاہتا تھا تو بعید نہیں ہے البتہ بجائے قول کے اس دفعہ اس نے صرف عمل سے کام لیا اسی قسم کا ایک قصہ امام کردری نے بھی ابن ہبیرہ کے متعلق نقل کیا ہے کہ امام صاحب کے نام سے ایک جعلی سفارش نامہ لکھ کر کسی شخص نے ابن ہبیرہ کے پاس پیش کیا تھا۔ اتفاقاً تھوڑی دیر بعد امام بھی ابن ہبیرہ کے پاس آئے۔ اس نے پوچھا کہ آپ ہی نے یہ سفارش کی تھی۔ یہ امام کی نیک نفسی تھی کہ دیکھا کہ اس کا کام بنتا ہے۔ ابن ہبیرہ سے کہا: جزاک اللہ وہ خوش ہو گیا اور سمجھا کہ امام نے تصدیق کی ہے۔ بہر حال مقصود ان باتوں سے امام کو قابو میں لانا تھا۔

نگینہ کا واقعہ:

اسی سلسلہ میں چند ہی دنوں کے بعد ایک اور لطیفہ پیش آیا۔ جس میں ابن ہبیرہ کو کھل کر اپنے منشا کے اظہار کا موقعہ فوراً ہی امام کے سامنے مل گیا موفق نے اپنی مسلسل سند کے ساتھ اس قصے کو بیان کرتے ہوئے ابتداء ان الفاظ سے کی۔

ابن ہبیرہ نے امام ابوحنیفہ کو اپنے پاس بلایا ان کی رائے کسی مسئلہ میں لینا چاہتا تھا۔	ابن هبيره دعا يوما بابى حنيفة لامر احتاج الى رائه.

(ص ۱۷۲)

اس سے بھی یہی معلوم ہے کہ امام رحمۃ اللہ علیہ خود اس کے دربار میں نہیں جایا کرتے تھے بلکہ اپنی ضرورت سے وہی ان کو بلایا کرتا تھا۔ بہر حال امام جب ابن ہبیرہ کے پاس پہنچے تو دیکھا کہ ایک ''نگینہ'' اس کے سامنے پڑا ہوا ہے اور کچھ سوچ رہا ہے۔ امام نے دریافت کیا کہ آپ کیا سوچ رہے ہیں۔ اس نے کہا مجھے یہ نگینہ پسند آ گیا ہے میں اس کو چاہتا ہوں کہ استعمال کروں لیکن مصیبت یہ ہے کہ اس پر دوسرے آدمی کا نام کھدا ہے۔ امام صاحب نے یہ سن کر فرمایا کہ لائیے مجھے دیجئے' کیا لکھا ہوا ہے دیکھوں تو نگینہ امام صاحب کو دیا گیا' امام نے دیکھا کہ اس میں ''عطا بن عبداللہ'' کے الفاظ کندہ ہیں۔ ان کا ذہن فوراً منتقل ہوا۔ ابن ہبیرہ سے انھوں نے اجازت لی اور سامنے ایک شخص بیٹھا ہوا تھا اس کے حوالہ کرتے ہوئے کہا کہ حکاک کے پاس لے جا کر صرف اتنی

ترمیم اس میں کرادو کہ ''بن'' کے لفظ کو وہ ''من'' بنا دے۔ یعنی ''بن'' کے ب کو ذرا زیادہ گھس کر میم کا منہ بنا دے اور عبداللہ کی ب کے نقطہ کو مٹا کر اس کے اندر نون کا نقطہ لگا دے۔ وہ گیا اور فوراً اس ترمیم کو کرا کے واپس لے آیا۔ امام نے ابن ہبیرہ کے سامنے پیش کرتے ہوئے کہا کہ اب اس کو آپ اطمینان سے پہن سکتے ہیں۔ تعجب سے اس نے پوچھا کہ کیا ہوا۔ فرمایا: اب پڑھئے۔ پڑھا تو عطا بن عبداللہ کی جگہ ''عطا من عنداللہ'' لکھا ہوا تھا یعنی خدا کی طرف سے دی ہوئی چیز ہے۔ اب اس کا یہ مطلب ہو گیا امام کی اس ذہنی انتقال کی اس غیر معمولی تیزی و سرعت پر ابن ہبیرہ اچھل پڑا۔ جوش مسرت میں اسی وقت نگینہ سنار کے یہاں بھیجا گیا کہ انگوٹھی میں جڑ کر فوراً واپس کرے خیر یہ تو لطیفہ تھا۔

حضرت امام سے ابن ہبیرہ کی ایک استدعا:

اسی لطیفہ کے ساتھ ابن ہبیرہ جو اپنے عہد کا ممتاز ترین سیاسوں میں تھا یہ پا کر کہ حکومت کی پالیسی کو امام کے سامنے پیش کرنے کا یہ بہترین موقعہ ہے' لکھا ہے کہ امام جب اٹھنے لگے تو اصرار کر کے بٹھا لیا اور کہنا شروع کیا۔

ايها الشيخ لو اكثرت غشياننا وزيادتنا لافدتنا ونفعتنا. (ص ۱۷۲)

اے شیخ! اگر آپ اپنی آمد و رفت کو ہمارے ہاں ذرا بڑھا دیں تو آپ سے ہم فائدہ اٹھائیں اور ہمیں آپ سے نفع پہنچے۔

آج ان بے جان الفاظ کا ظاہر ہے کہ وزن محسوس کیا جا سکتا ہے' لیکن ذرا اپنے خیال کو ماضی کی طرف منتقل کر کے یہ سوچتے ہوئے کہ اس زمین میں زمین کی سب سے بڑی قاہرہ حکومت کا سب سے بڑا گورنر ایک معمولی خوش باش شہری سے آرزو کی شکل میں اس استدعا کو پیش کرتا ہے جس کے خیال سے بھی بدن پر لوگوں کے جھرجھری طاری ہو جاتی ہے۔ ابن ہبیرہ کے ان الفاظ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ضرورت کے سوا اور وہ بھی جیسا کہ میں نے عرض کیا خود ابن ہبیرہ ہی کی ضرورت سے امام اس کے دربار میں کبھی کبھی تشریف لے جایا کرتے تھے۔ لیکن اب وہ کھل کر پینگ بڑھانے کی درخواست جو اس کی حکومت کی پالیسی تھی اس کو پیش کرتا ہے۔

حضرت امام کا جواب:

امام نے انتہائی سنجیدگی اور متانت سے جواب اس وقت دیا تھا وہ آج بھی امیروں کے قرب تلاش کرنے والوں کے لیے سرمایۂ عبرت وبصیرت ہے فرمایا کہ

ما اصنع عندک ان قربتنی فتنی وان اقصیتنی اخزیتنی. (ص ۱۷۳)

تمہارے پاس آ کر میں کیا کروں گا' اگر مجھے تم نزدیکی اور قرب عطا کرو گے تو فتنہ میں مبتلا کرو گے اور اگر ہمیں تم نے دور رکھا' یا قرب عطا کرنے کے بعد نکال دیا تو خواہ مخواہ کے غم میں مجھے مبتلا کرو گے۔

اگر چہ یہ مختصر الفاظ ہیں لیکن سیاسی اقتدار رکھنے والوں کی مجلسوں میں آمد ورفت رکھنے والوں کی یہ صحیح تصویر ہے پہلا فقرہ کہ قرب بخشی کی صورت میں ''تم فتنہ میں مجھ کو مبتلا کردو گے۔'' اس کا مطلب یہی ہے کہ اولاً دربار کے دوسرے ارکان عموماً ایسی حالت میں اس بے چارے قرب حاصل کرنے والے کے ساتھ رقابت کے تعلقات پیدا کر کے ہمیشہ اسے زک دینے کی فکروں میں داؤ پیچ کرتے رہتے ہیں۔ اور یہ فتنہ تو دوسروں کی طرف سے ہوتا ہے نیز قرب حاصل کرنے والا ان امکانات کو محسوس کر کے جو اس قسم کے اقتدار والوں کی نزدیکی کے بعد آدمی کے دل میں قدرتاً جھانکنے لگتے ہیں بجائے خود یہ ایک مستقل فتنہ ہوتا ہے جو اسی کے سینے سے اٹھتا ہے اور اسی پر شب و روز فوارے کی طرح گرتا رہتا ہے ماسوا اس کے سلاطین وامراء وحکام کی نگاہوں کی ہلکی ہلکی سی بے التفاتیاں قرب حاصل کرنے والوں کے جگر کو جس طرح خون بنا بنا کر پگھلاتی رہتی ہیں اس کا اندازہ وہی کر سکتے ہیں جنھیں اس راہ کے کچھ تجربات حاصل ہوئے ہیں۔ یہ تو امام کی حقائق شناس فطرت ہی تھی جس نے تجربے سے پہلے اس قرب کے نتائج ان پر واضح کر دیئے تھے۔ خیر یہاں تک تو ایک واقعہ کا اظہار تھا اور گو اپنے علاقے کے مطلق العنان' حاکم اعلیٰ کے سامنے اتنا کہنے کی جرأت بھی آدمی کو مشکل ہی سے ہوتی ہے لیکن اس کے بعد امام نے جو فرمایا' وہ ان کی بے لاگ اور بے باک طبیعت کی ایک زندہ

شہادت ہے فرمایا کہ

ولیس عندک ماارجوہ ولا عندی ما اخافک علیہ.	تمہارے پاس کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس کی مجھے آرزو ہو اور نہ میرے پاس کوئی ایسی چیز ہے جس کی وجہ سے میں تم سے ڈروں۔

مطلب یہ تھا کہ تمہارے پاس مال ہے یا جاہ مال کے لحاظ سے خدا نے حضرت امام کو ان امراء کے آگے ہاتھ پھیلانے سے پہلے ہی مستغنی کر دیا تھا رہا جاہ کا مسئلہ تو عام دنیا داروں کی نگاہوں میں جو چیزیں سرمایہ عزت و آبرو سمجھی جاتی ہیں امام پر اگر ان کی حقارت واضح نہ ہوتی تو کس پر ہوتی۔ رہا دوسرا جملہ کہ میرے پاس کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس کی وجہ سے تمہارا ڈر میرے دل میں پیدا ہو۔ میرے خیال میں تو یہ ان شکوک و شبہات کے ازالہ کی طرف اشارہ تھا' جن سے حضرت زید کی خفیہ معاونت کے بعد حکومت حضرت امام کو متہم کر رہی تھی۔

بہر حال مطلب جو کچھ بھی ہو الفاظ جو مورخین نے نقل کئے ہیں وہ یہی ہیں۔ یہ نہیں بیان کیا گیا ہے کہ ابن ہبیرہ نے اس کے جواب میں کیا کہایا کیا کیا' بہ ظاہر اس نے گفتگو ختم کر دی اور معاملہ کو کسی دوسرے موقعہ کے لیے اس نے ملتوی کر دیا۔[1]

نرمی کے بعد گرمی کی ابتداء:

اگرچہ امام کے ان الفاظ کو سن کر ابن ہبیرہ خاموش ہو گیا لیکن اس قسم کے فریب خوردہ امراء پر امام کے استغنائی طرز عمل اور بے باکانہ گفتگو سے جو اثر مرتب ہو سکتا تھا وہ ظاہر ہے۔ گو امام نے یہ فرما کر جس کی وجہ سے میں تم سے ڈروں میرے پاس بھی کوئی

---

[1] موفق وغیرہ میں لکھا ہے کہ ان ہی الفاظ کو لوگوں نے امام کی طرف اس وقت بھی منسوب کیا ہے۔ جب اسی قسم کی گفتگو کے بعد امام نے عباسی حلیفہ ابوجعفر منصور اور اس کے والی عیسیٰ بن موسیٰ سے کہا تھا۔ میرا خیال ہے کہ امام صاحب کا یہ طے شدہ فیصلہ تھا۔ جو سیاسی اقتدار والوں کے ساتھ تعلق قائم کرنے کے متعلق انھوں نے طے کر لیا تھا۔ اور کوئی تعجب نہیں جیسا کہ موفق نے بھی لکھا ہے کہ ان یخاطب بھا الکل۔

ایسی چیز نہیں ہے۔ اس کو مطمئن کرنا چاہا لیکن اسی چیز نے جہاں تک میرا خیال ہے اس کو اور غیر مطمئن کر دیا ہوگا۔ ان جراثیم کا اس کو پتہ چل گیا ہوگا جو امام کی فطرت میں پوشیدہ تھے اور سیدنا زید شہید کے ایام خروج میں وجود کا انھوں نے خواہ جس درجہ بھی مخفی شکل میں ہو ثبوت دیا بھی تھا۔

امویوں اور عباسیوں کی کش مکش:

جیسا کہ میں نے پہلے بیان کیا ہے ۱۲۹ھ میں ابن ہبیرہ کوفہ میں عراقین کے والی ہونے کی حیثیت سے داخل ہوا اور یہی وہ سال ہے جس میں عباسیوں کے داعی ابو مسلم خراسان کے باشندوں کی اکثریت کو عباسیوں کی بیعت میں داخل کرنے میں غیر معمولی کامیابی حاصل کرتا چلا جا رہا تھا[1] خراسان کا والی نصر بن سیار مسلسل ابن ہبیرہ کو حالات

---

[1] یہی ۱۲۹ھ کا سال ہے جس میں خراسان کے مشہور تجربہ کار لیکن آخر میں ناکام والی نصر بن سیار نے بنی امیہ کے آخری خلیفہ مروان کے نام عباسیوں کی خراسان میں جو اندرونی کامیابیاں ابو مسلم کے زیر قیادت حاصل ہو رہی تھیں ان کی تفصیل کرتے ہوئے مشہور اشعار لکھے تھے۔

اری بین الرماد و میض جمر　　　واخشی ان یکون له ضرام

میں راکھ کے ڈھیر کے نیچے چنگاریوں کی چمک پا رہا ہوں۔ مجھے اندیشہ ہے کہ یہ آگ بن کر بھڑک نہ اٹھے۔
اور بھی چند اشعار کے بعد ایک شعر تھا۔

اقول من التعجب لیت شعری　　　ایقاظ امیة ام نیام

میں نے تعجب سے کہا کہ ہو کیا گیا ہے کیا امیہ والے سب کے سب سو گئے ہیں۔

ففری عن رحالک ثم قولی　　　علی الاسلام والعرب السلام

پس اے عورت اپنے ڈیرے سے بھاگ اور کہتی جا کہ اسلام اور عرب پر سلام ہے۔

آخری مصرعہ اسلام اور عرب پر سلام ہے بہت پر معنی ہے۔ اسلام کا لفظ تو خیر یوں ہی داخل کیا گیا ہے۔ اسلام اور اسلامی قوانین کی پروا بنی امیہ کب کرتے تھے تو پھر عباسیوں سے اس کی کیا شکایت لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ دولت بنی امیہ جو عربی عصبیت پر قائم تھی عباسیوں نے بنی امیہ کو توڑنے کے لیے عربوں کو بھی ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا۔ عباسیوں کا پہلے امام ابراہیم نے ابو مسلم کو جب خراسان کے بعض سربرآوردہ عربوں کو اس نے چھوڑ دیا تھا سخت سست لکھتے ہوئے آخر میں لکھا تھا کہ ان لا یدع بخراسان متکلما بالعربیة الا قتله (کامل ص ۱۳۷ ج ۴) یعنی خراسان میں جو بھی عربی بولتا ہو قتل
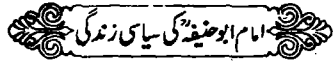
کی اطلاع دیتے ہوئے فوجی امداد طلب کرتا تھا' لیکن حالات ایسے تھے کہ پایۂ تخت خلافت سے مدد نہیں مل رہی تھی اور ابن ہبیرہ بھی ایسی مقامی الجھنوں میں گرفتار تھا کہ اس سلسلہ میں وہ بھی نصر کی زیادہ پشت پناہی نہ کر سکا عبداللہ بن معاویہ بن عبداللہ بن جعفر کے خروج کی وجہ سے وہ ایرانی علاقوں میں الجھا ہوا تھا تا ایں کہ آخر میں اپنے بیٹے داؤد کو اصطخر کے مقام پر عبداللہ بن معاویہ سے مقابلہ کے لیے بھیجا۔ اور یہ فتنہ کسی طرح فرو ہوا اس کے بعد ابن ہبیرہ نے نصر بن سیار کی امداد کے لیے نباتہ ابن حنظلہ کی سرکردگی میں ایک فوج خراسان کی طرف بھیجی لیکن جرجان کے مقام پر عباسیوں کے مشہور جنرل حسن بن قحطبہ کے مقابلہ میں خود نباتہ اور اس کے ساتھ ابن ہبیرہ کی بھیجی ہوئی فوج جس کی تعداد دس پندرہ ہزار تھی اس میں بھی دس ہزار آدمی مارے گئے' ابن ہبیرہ کے لیے یہ بدترین ذلت اور کوفت کی خبر تھی اور اب ہبیرہ عباسیوں کے ساتھ آخری مقابلہ کی تیاریوں میں مشغول ہو گیا۔ نصر کو اسی زمانہ میں اس نے ایک تاریخی خط لکھا جس میں وعدہ کیا گیا تھا کہ ایک لاکھ فوج تمہاری امداد کے لیے عنقریب روانہ کرتا ہوں۔ تھوڑے صبر اور استقلال سے کام لو[1] سمجھا جاتا ہے کہ اسی زمانہ میں ابن ہبیرہ نے کوفہ کے تمام

---

[1] اسے قتل کر دو۔ اللہ اللہ کچھ ہی دن بعد منصور عباسی کے زمانہ میں یعنی کل سات آٹھ سال بعد محمد نفس زکیہ کے خلاف جو فوج مدینہ منورہ پر چڑھائی کرنے کے لیے عباسیوں نے بھیجی تھی اور محمد نفس زکیہ کا ایک سپاہی ابن خضیر جو بے جگر لڑنے والا تھا جب عباسی فوج کی طرف پلٹتا تو متفقہ آواز آتی۔ "ابن خضیر آمد ابن خضیر آمد" (دیکھو طبری وغیرہ)

[1] کہا جاتا ہے کہ اسی موقعہ پر نصر نے ابن ہبیرہ کو لکھا تھا کہ

بھائی! ایک لاکھ فوج تو بعد کو بھیجنا۔ ارے کم از کم دس ہزار آدمی تو سردست روانہ کر دو۔ خراسان والوں کے سامنے میں جھوٹا بنا جا رہا ہوں اگر اس وقت تم دس ہزار آدمی بھی نہ بھیج سکے تو آئندہ ایک لاکھ والی فوج کچھ نہ کر سکے گی۔ (ص ۱۴۷ ج ۴ کامل)

لیکن بجائے جواب دینے کے ابن ہبیرہ نے نصر کے خط اور قاصدوں کو روک لیا۔ گھبرا کر نصر بن سیار نے پایۂ تخت خلافت کی طرف آدمی دوڑایا۔ نصر نے خلیفہ سے ابن ہبیرہ کے اس تغافل اور بے رخی کی شکایت لکھی۔ اسی خط میں نصر نے لکھا تھا۔ میرا حال اس شخص کے مانند ہو گیا ہے جسے اپنی کوٹھری سے

سر برآوردہ لوگوں کو جمع کیا۔ بہ ظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اندر اندر عباسیوں کے کارندے خود عراق میں بھی کام کر رہے تھے اور لوگ فوج میں بھرتی ہونے سے گریز کر رہے تھے صاحب معجم نے نقل کیا ہے کہ

ان ابن هبيرة كان واليا بالعراق من بنی امية فظهرت الفتنة بالعراق فجمع فقهاء العراق فولی كلا منهم شيئا من عمله. (ص ۱۷۷)	بنی امیہ کی طرف سے عراق کا والی (گورنر) ابن ہبیرہ تھا عراق میں جب فتنوں نے سر اٹھایا تو اس نے عراق کے فقہاء کو اکٹھا کیا اور اپنی حکومت کے مختلف شعبوں میں سے ایک ایک شعبہ ہر ایک کے حوالہ کیا۔

حضرت امام کے سامنے وزارت پیشی کی پیشکش:

میرے خیال میں یہ وہی فتنہ ہے جو ۱۳۰ھ میں پیش آیا۔ ابن ہبیرہ بڑی تیاریوں میں مصروف تھا اور عباسیوں پر آخری فیصلہ کن ضرب لگانے کا انتظام کر رہا تھا۔ اس وقت اس نے دیکھا کہ عوام کی لیڈری جن جن لوگوں کے ہاتھوں میں ہے' ان سب کو حکومت میں شریک کر کے عوام کی ہمدردی حاصل کی جائے ابن ہبیرہ کا ایک معتمد علیہ جس کا نام عاصم بن ربیع تھا اسی کا بیان ہے کہ امام ابوحنیفہ کو راضی کر کے لانے کے لئے ابن ہبیرہ نے مجھ ہی کو مقرر کیا تھا امام کو ربیع کے ذریعے پیغام دیا گیا تھا کہ:

يكون على خاتمه ولا ينفذ كتاب ولا يخرج شیء من بيت المال الا من تحت يده. (معجم ص ۱۷۷ ج ۲)	(گورنر کی مہر) ان کے سپرد کی جائے گی تا کہ جو کوئی حکم نافذ ہو اور کوئی کاغذ جو حکومت کی طرف سے صادر ہو اور خزانہ سے کوئی مال برآمد ہو وہ سب امام ابوحنیفہ ہی کی نگرانی ہی میں ہو اور ان ہی کے ہاتھ کے نیچے سے نکلے۔

قلعہ سے نکال کر لوگ دالان میں لے آئے ہوں اور دالان سے سائبان میں سائبان سے صحن میں اور صحن سے نکل کر اب وہ مکان کے آخری احاطہ میں کھڑا ہے۔ اگر اس وقت اس کی مدد کی گئی تو ممکن ہے کہ پھر اپنے گھر میں واپس ہو جائے۔ ورنہ احاطہ سے نکال کر اگر لوگوں نے اسے باہر راستے کی طرف کھدیڑ دیا تو اس مکان میں واپسی اس کے لیے ناممکن ہو جائے گی' نہ اس کے لیے گھر ہی باقی رہے گا اور نہ احاطہ۔ (ص ۱۴۷ ج ۴ کامل)

اگر یہ واقعہ صحیح ہے تو اس کے یہ معنی ہیں کہ امام کو صرف اپنی ولایت کے خزانہ ہی کا وزیر نہیں بنانا چاہتا تھا۔ بلکہ امام کی خدمت میں اس نے اپنی پیشی کی وزارت بھی پیش کی تھی آخر اس کا کیا مطلب ہوسکتا ہے کہ بیت المال ہی سے نہیں۔ بلکہ جس قسم کا کاغذ ابن ہبیرہ کے پاس سے نکلے امام کے دستخط کے بغیر وہ نافذ نہیں ہوسکتا۔ میرے خیال میں گورنری کے بعد جیسا کہ اس زمانہ کا دستور تھا یہ آخری عہدہ تھا جو کسی کو دیا جاسکتا تھا خصوصاً ایسے گورنر کی وزارت مطلقہ جو عراق' ایرن وخراسان جیسے عظیم صوبوں کا مطلق العنان حاکم تھا' لکھا ہے کہ امیر معاویہ کے زمانہ میں یہ امتیاز یعنی العراقین کی گورنری زیاد بن ابیہ کو ملی تھی یا آخر میں یہ امتیاز ابن ہبیرہ کو حاصل ہوا تھا' الیافعی کا بیان ہے۔

وھو معدود من جملة من جمع له العراقان فکان اولھم زیاد بن ابیة[1] استخلفه معاویة و آخرھم یزید المذکور ولم یجمعھا لاھد بعده۔ (الیافعی ص ۲۷۸)

ابن ہبیرہ کا شمار ان لوگوں میں ہے جن کے لئے دونوں عراق (عراق عرب و عراق عجم) کی گورنری جمع کی گئی' اس طبقہ میں پہلا آدمی زیاد بن ابیہ ہے جس کا امیر معاویہ نے اس عہدہ پر تقرر کیا گیا تھا اور دوسرا آدمی یہی یزید بن ہبیرہ ہے ان دونوں علاقوں کی گورنریاں کسی ایک شخص کے سپرد ان دونوں کے سوا کسی کے نہیں ہوتیں۔

---

[1] ابتداء اسلام کی چند خاص شخصیتوں میں زیاد بھی ہے امیر معاویہ نے اپنے زمانے میں اس کو اپنا بھائی بنالیا تھا جس کا قصہ طویل ہے۔ کہتے ہیں کہ ایک ایرانی ''دہقان'' بیمار ہوا تھا۔ طائف کے طبیب حارث بن کلدہ نے اس کا علاج کیا تو انعام میں ایک ایرانی لونڈی اس نے عطا کی جس کا نام حارث نے سمیہ رکھا تھا' حارث نے سمیہ سے اولاد بھی پیدا کی اور آخر میں ایک رومی غلام جس کا نام عبید تھا سمیہ کا عقد کردیا تھا لیکن سمیہ ایک بدچلن عورت تھی۔ کہتے ہیں کہ امیر معاویہ کے والد ابوسفیان کفر کے زمانے میں طائف کسی ضرورت سے گئے تھے وہاں کے بھٹی خانے میں شراب پی اور بھٹی خانہ کے کلال جس کا نام ابومریم تھا اس سے عورت کی خواہش ظاہر کی ابومریم نے سمیہ کا نام لیا' بیان کیا گیا ہے کہ یہ سن کر ابوسفیان نے کہا تھا علی طول ندیھا وریح البطیھا (اسی کو لے آؤ خواہ اس کی چھاتی دراز ہی کیوں نہ ہو اور بغل سے اس کے بدبو ہی کیوں نہ آتی ہو) یوں ابوسفیان نے سمیہ سے مقاربت کی

بہر حال کچھ بھی ہو امام کے پاس ایک عہدہ پیش ہوا اور ایک ایسی عرب پرست متعصب حکومت کی طرف پیش ہوا جو معمولی مسئلوں کو پوچھنے میں بھی دیکھ لیتی تھی کہ جس سے پوچھا جارہا ہے وہ عرب ہے یا غیر عرب اور آج وہ کچھ ایسے حالات میں اپنے آپ کو پارہی ہے کہ بادشاہ اور حکمران کے بعد اس زمانہ میں اموی دولت کی جو سب سے بڑی ذمہ دار ہستی تھی یعنی ابن ہبیرہ وہ اپنی نیابت اور اپنا سارا خزانہ امام کے سپرد کرتا ہے۔ پڑھنے والوں کے لیے تو اس واقعہ کا پڑھ لینا آسان ہے لیکن امام ابوحنیفہ کی تقلید پر ناز کرنے والوں کے لیے سوچنے کا مقام ہے تقلید کے ساتھ ساتھ اگر یہی صورت حال ان کے سامنے پیش آجاتی یا آج بھی پیش آجائے تو ان میں کتنے ہوں گے جو امام کی اس سنت کے اقتدا پر آمادہ ہوں۔ اور آج ہی کیا اگر امام کے حنفی سوانح نگاروں کے اس بیان کی بلاوجہ تردید نہ کی جائے یعنی ان لوگوں نے لکھا ہے کہ ابن ہبیرہ نے امام کے ساتھ اور جن فقہا کو حکومت کی کسی نہ کسی خدمت کو قبول کرنے کے لیے مدعو کیا تھا تو لکھا ہے:

لے کی اور کہتے ہیں کہ اسی کے کچھ دن بعد زیاد پیدا ہوا۔ چونکہ سمیہ باضابطہ عبید رومی کی بیوی تھی اس لئے زیاد بن عبید ہی کے نام سے مشہور تھا لیکن زیاد جب جوان ہوا تو اس سے غیر معمولی صلاحیتوں کا اظہار ہونے لگا۔ حضرت عمر ہی کے زمانہ میں اس کے ہوش و گوش خطابت و نظم و تدبیر کی شہرت ہو چکی تھی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ جب زیاد کی تعریف ہونے لگی تو ایک دن قریش کے بڑے بوڑھوں کے مجمع میں زیاد کا ذکر ہو رہا تھا اس وقت ابوسفیان نے کہا: انی لا عرف اباه و من وضعه فی رحم امه (میں زیاد کے باپ کو جانتا ہوں جس نے اس کی ماں کے رحم میں اس کو ڈالا اسے بھی جانتا ہوں) اور یوں بھی ابوسفیان اشارے کنائے سے کبھی کبھی زیاد کے باپ ہونے کا دعویٰ کرتے تھے۔ جب حضرت علی اور امیر معاویہ میں جنگ ہوئی اور زیاد حضرت علی کے طرف داروں میں تھا امیر معاویہ نے اپنے والد کے ان کنایوں اور اشاروں سے نفع اٹھاتے ہوئے آخر زیاد کو اپنا بھائی بنا کر اپنا ہم نوا بنالیا' اس کے بعد لوگ زیاد کو زیاد بن ابی سفیان کے نام سے موسوم کرنے لگے ابن عمر وغیرہ زیاد بن ابیہ کہتے تھے۔ عمر بن عبدالعزیز زیاد صاحب البصرۃ کے نام سے موسوم کرتے تھے اسی زیاد کے بیٹے عبیداللہ کے حکم سے حضرت امام حسین علیہ السلام کی شہادت کربلا میں ہوئی۔ بہر حال زیاد کی شخصیت دلچسپ شخصیت ہے اس کی خطابت اور سیاست اس کی مستحق ہے کہ کوئی مستقل مقالہ اس پر لکھ سکتا ہے ابن عساکر نے تاریخ دمشق میں اس کے حالات کا ذکر تفصیل سے کیا ہے۔ (ص ۴۱۹ ج ۵)

جمع فقهاء العراق ببابه فيهم ابن ابی لیلی و ابن شبرمه وداؤد بن ابی هند و عدة منهم. (ص ۲۳ ج ۲)

اپنے دروازے پر عراق کے فقہاء کو ابن ہبیرہ نے جمع کیا جن میں ابن ابی لیلیٰ اور ابن شبرمہ اور داؤد بن ابی ہند اور بھی ان ہی میں سے چند لوگ تھے۔

حضرت امام کا انکار:

ابن ابی لیلیٰ کو تو خیر جانے دیجئے محدثین کو ان سے کچھ شکایت ہے۔ لیکن ابن شبرمہ اور داؤد بن ابی ہند تو صحاح کے راویوں میں ہیں لیکن واقعہ کیا پیش آیا۔ کوفہ کے ایک خباز یا خزاز کے لڑکے کو اتنا بڑا امتیاز حاصل ہوتا ہے۔ لیکن بالاتفاق راویوں کا بیان ہے دوست اور دشمن سب کی شہادت ہے کہ "ابی و امتنع" یعنی امام ابوحنیفہ نے دولت بنی امیہ کے اس جلیل منصب کے قبول کرنے سے انکار اور قطعی طور پر انکار کر دیا۔ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ چانس کی تاک میں رہنے والوں کو امام کی سبک مغزی پر کتنی حیرت ہوتی ہوگی، سمجھانے والے نے کیا کیا نہ سمجھایا ہوگا اور کس کس طرح کن کن پہلوؤں کو نہ پیش کیا ہوگا۔ ایسے زرین مواقع کیا ہمیشہ ہاتھ آتے ہیں؟ اس سوال کو کس کس رنگ میں امام کے سامنے پیش کرنے والوں نے نہ پیش کیا ہوگا۔ قصہ کیا صرف رغبت ہی کا تھا۔

حضرت امام کی تفہیم کے لیے فقہاء کی کوشش:

ان ہی سوانح نگاروں نے لکھا ہے کہ جن جن فقہا کو بلا کر ابن ہبیرہ نے خدمتیں سپرد کی تھیں ہر ایک کو طوعاً یا کرہاً یعنی رضامندی کے ساتھ یا جبراً قبول کرنے پر مجبور ہونا پڑا تھا۔ یہ بھی لکھا ہے کہ علاوہ دوسروں کے ان ہی فقہاء کا ایک وفد بھی حضرت امام کے پاس آیا اور بالاتفاق لوگوں نے سمجھانا شروع کیا کہ

انا ننشدک لله ان تهلک نفسک فانا اخوانک و کلنا کاره لهذا الامر ولم نجد بدامن ذلک (ص ۲۴ ج ۲

ہم لوگ خدا کی تمہیں قسم دیتے ہیں، کہ اپنے آپ کو تم تباہی میں نہ ڈالو ہم لوگ آخر تمہارے بھائی ہیں' اور حکومت کے اس تعلق کو ہم میں ہر ایک ناپسند ہی کرتا ہے لیکن کوئی چارہ کار اس

موافق) وقت قبول کر لینے کے سوا نظر نہیں آتا (پس
چاہیے کہ تم بھی انکار پر اب اصرار نہ کرو)

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ انکار کی صورت میں ابن ہبیرہ نے اپنے تمام اختیارات کے استعمال کی طرف اشارہ کر چکا ہوگا۔ ورنہ لم نجد بدامن ذالک (ہم لوگوں کو کوئی چارہ کار بجز قبول کر لینے کے نہ پایا) کا مطلب کیا ہوگا۔ کوئی ایسی ہی مجبوریاں ہوں گی کہ داؤد[1] بن ابی ہند اور ابن شبرمہ[2] جیسے بزرگوں کے سامنے بھی گریز کی راہ باقی نہیں رہی۔

---

[1] یہ بھی سلف کے ان ہی اکابر میں ہیں جنھوں نے حکومت کی امداد سے اپنے آپ کو بے نیاز رکھنے کے لیے خیاطی کا پیشہ اختیار کر لیا تھا۔ تہذیب میں لکھا ہے کہ کان خیاطاً ابن سعد نے ان کا عجیب تجربہ نقل کیا ہے زندگی کے ابتدائی زمانہ میں کہتے تھے کہ طاعون کا ان پر حملہ ہوا غشی طاری ہوگئی۔ اسی حال میں کہتے ہیں کہ دو شخص میرے پاس آئے۔ ایک نے زبان کا کنارہ پکڑ لیا دوسرے نے تلوے کے درمیانی حصہ پر ہاتھ رکھ کر ایک دوسرے سے پوچھا کیا پاتے ہو؟ جواب میں کہا کہ کچھ تکبیر کچھ تہلیل اور کچھ مسجدوں کی طرف آمد و رفت اور کچھ تھوڑا بہت قرآن بھی۔ داؤد کہتے ہیں کہ اس وقت تک میں نے قرآن یاد نہیں کیا تھا اسی بیماری کے زمانہ میں ان کا بیان ہے کہ قضا حاجت کے لیے جاتا ہوں تو اس کا خیال ہوتا ہے کہ کاش! یہ وقت جلد ختم ہو تو ذکر کا موقعہ ملے۔ بیماری سے شفایاب ہونے کے بعد داؤد بن ابی ہند نے پہلا کام قرآن یاد کرنے کا کیا (ص ۲۰ ج ۷ حصہ دوم)

[2] قاضی ابن شبرمہ جن کا نام عبداللہ قبیلہ ضبہ سے تعلق رکھتے تھے حکومت کی ملازمت ہی میں ان کی زندگی گذری' بنی امیہ کے عہد میں بھی یہ اور قاضی ابن ابی لیلی قاضی رہے اور بنی عباسیہ کا دور جب آیا' جب بھی دونوں اس عہدے پر رہے ابن سعد نے قاضی ابن شبرمہ کے متعلق مشہور یمنی محدث معمر کے حوالہ سے یہ قصہ نقل کیا ہے کہ معمر کہتے تھے کہ ابن شبرمہ یمن کے والی تھے اس عہدے سے جب معزول ہوئے اور گھر جانے لگے تو رخصت کرنے کے لیے میں بھی کچھ دوران کے ساتھ گیا۔ لوگ جب چھٹ گئے اور میں ہی ان کے پاس تنہا رہ گیا تو میری طرف دیکھ کر انھوں نے کہا کہ ''میں خدا کا شکر کرتا ہوں کہ جس قمیص کو پہن کر یمن آیا تھا اس کے بدلنے کا موقعہ نہ ملا'' یعنی دوسری قمیص میں نے نہیں بنوائی۔'' معمر کہتے ہیں کہ یہ کہہ کر چپ ہو گئے پھر کہنے لگے کہ میں ''یہ حلال کا ذکر کر رہا ہوں' باقی حرام کی تو گنجائش ہی نہ تھی (ابن سعد ص ۲۴۴ ج ۶) یہ تھا تقوی ان لوگوں کا جنھوں نے حکومت کی ملازمت اختیار کر لی تھی۔'' ۱۲

حضرت امام کا دوبارہ انکار:

لکھا ہے کہ علماء کا یہ وفد ناصحانِ مشفق کی شکل میں امام کے پاس جب آیا تو آپ نے اس وقت فرمایا کہ یہ ملازمت تو خیر بڑی بات ہے' اگر یہ شخص مجھ سے چاہے کہ واسط[1] شہر کی مسجد کے دروازے صرف گنا کروں تو میں یہ بھی نہیں کروں گا۔''

آخر میں امام نے فرمایا کہ

فکیف وھو یرید مني ان یکتب بضرب عنق رجل و اختم علي ذلک.

پھر خیال کرنا چاہئے کہ میں اس کی پیش کردہ اس خدمت کو کیسے قبول کر سکتا ہوں جس میں وہ کسی گردن مارنے کا حکم دے گا اور میں اس حکم پر مہر لگاؤں گا

---

[1] روایتوں میں واسط ہی کا لفظ ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ابن ہبیرہ نے آخر دفعہ فقہاء عراق کو جمع کر کے حکومت کے مختلف شعبے ان کے سپرد کرنے کا جو ارادہ کیا تھا اور ان ہی میں امام ابو حنیفہ بھی تھے۔ اس زمانہ کا واقعہ ہے جب کوفہ چھوڑ کر مختلف معرکوں میں شکست کھاتے ہوئے بالآخر ابن ہبیرہ شہر واسط میں محصور ہو گیا تھا حصار کی یہ مدت کافی طویل ہے۔ گیارہ مہینے کے قریب قریب عباسیوں کی فوج واسط کا محاصرہ کئے پڑی رہی' آخر میں سفاح نے اپنے بھائی ابو جعفر منصور ہی کو ابن ہبیرہ کے مقابلہ میں بھیج دیا تھا' بڑے طویل قصے پیش آئے۔ دجلہ اور فرات کے آبی راہوں سے ابن ہبیرہ کے پاس امداد اور رسد آتی تھی' عباسی کشتیوں میں لکڑی بھر کر آگ لگا دیتے تھے اور جو چیزیں دریا کی راہ سے آتیں ان کو جلا دیتے تھے ابن ہبیرہ اس کے مقابلہ میں ایک خاص قسم کی جنگی کشتی حراقات میں زنجیر اور قلابے وغیرہ لگا کر دریا میں چھوڑتا آگ سے بھری ہوئی عباسیوں کی کشتیوں کو وہی کھینچ کر ساحل پر پہنچا دیتے تھے آخر میں ابن ہبیرہ نے ابو جعفر منصور کو کہلا بھیجا کہ آؤ! ہم دونوں شخصی طور پر مقابلہ کر کے فیصلہ کر لیں لیکن ابو جعفر تیار نہ ہوا کہلا بھیجا کہ تمہاری مثال تو جنگلی سور کی ہے جو شیر سے مقابلہ کرنا چاہتا ہے مارے گئے تو ایک سور مرا اور مجھ پر غالب آئے تو میری سخت سبکی ہوگی کہ سور کے ہاتھ مارا گیا۔ آخر صلح کا پیغام دیا گیا۔ صلح ہو گئی۔ لیکن بعد کو عباسیوں نے ابن ہبیرہ سے عہد شکنی کی اور بیچارے کو بے دردی کے ساتھ قتل کرا دیا گیا جس وقت قتل ہو رہا تھا۔ لکھتے ہیں کہ گود میں اس کے اس کا ایک بچہ تھا اس کو الگ کیا اور خود سجدے میں گر گیا' کل ۴۵ سال کی عمر تھی عرب کے بہت بڑے فوجی اور کشوری آدمیوں میں شمار کیا گیا ہے۔ ۱۲

اور بار بار اس جملہ کو دہراتے

فواللہ لا ادخل فی ذلک ابداً. خدا کی قسم میں اس میں اپنے آپ کو کبھی شریک نہیں کرسکتا۔

گویا امام نے قسم کھائی علماء حیران تھے۔ اس انکار کے عواقب اور خطرناک نتائج ان کے سامنے تھے۔ لیکن جناب امام نے قسم کھائی تو سب چپ ہو گئے۔ کہتے ہیں کہ ابن ابی لیلیٰ نے صرف اتنا کہا کہ

دعوا صاحبکم فھو المصیب وغیرہ المخطی. (ص ۲۴ ج ۲) چھوڑ دو اپنے رفیق کو حق پر وہی ہیں' ان کے سوا دوسرے غلط راستہ پر ہیں۔

قید:

بعضوں کا بیان ہے کہ اسی انکار کے بعد ابن ہبیرہ امام کو تازیانے کی سزا دینے پر آمادہ ہو گیا لیکن جہاں تک قرائن کا اقتضا ہے ابن ہبیرہ نے غالباً عجلت سے کام نہیں لیا بلکہ بعض ارباب مناقب نے جو یہ لکھا ہے کہ

فحبسه صاحب الشرطة جمعتین ولم یضربه (ص ۲۴ ج ۲ موفق) پولیس کے افسر اعلیٰ نے تو جمعہ تک ابوحنیفہ کو جیل میں رکھا اور مارا نہیں۔

جیل میں دوسرے عہدوں کی پیش کش:

اس سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے کہ تازیانے کا حکم اس انکار کے فوراً ہی بعد ابن ہبیرہ نے نہیں دے دیا تھا بلکہ قید کر کے جہاں تک میں خیال کرتا ہوں پندرہ دن تک ابن ہبیرہ نے کوشش کی کہ یہ خدمت نہ سہی کوئی اور خدمت حکومت کی وہ قبول کرلیں اس سلسلہ میں چند خدمات کا تذکرہ کیا گیا ہے لیکن ترتیب کا لحاظ بیان کرنے والوں نے نہیں رکھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ خز کی تجارت کی وجہ سے ممکن ہے کہ اس عہدہ کے بعد غالباً ابن ہبیرہ نے اس خدمت کو پیش کیا جس کا ذکر مورخین نے ان الفاظ میں کیا ہے۔

ارادہ ابن هبیرة ان یدخل فی الطراز (ص ۲۱ ج ۲ موفق) ابن ہبیرہ نے ان سے خواہش کی کہ ''طراز'' کی نگرانی قبول کریں۔

موفق نے خدا جانے کس بنیاد پر ''الطراز'' کی شرح میں لکھ دیا ہے کہ اس سے مراد بیت المال ہے گویا طراز والی خدمت اور جو خدمت پہلے پیش کی گئی تھی موفق کے نزدیک ایک ہی ہے۔ لیکن میرے نزدیک اس سے وہی مراد ہے جو عام تاریخوں میں اس سے مراد لیتے ہیں یعنی شاہی خانوادے اور بڑے بڑے حکام ولاۃ کے خصوصی لباس' فرش و فروش خیمے وغیرہ جس کارخانے میں تیار ہوتے تھے اسی کو ''الطراز'' کہتے تھے۔ منتہی الارب میں لکھا ہے:

''طراز معرب است جائے بافتن جامہائے نیکو وجید و گسترونی و جامہ است کہ برائے سلطان بافند۔''

اور مسلمانوں میں آخر آخر وقت تک عام دستور تھا کہ نہ صرف سلاطین بلکہ عام امراء کے لوازم میں چند کارخانے ہوتے تھے مثلاً آب دار خانہ جہاں پانی کی تیاری کا کام ہوتا تھا اسی طرح ایک مستقل کارخانہ ہر امیر کے پاس کپڑوں کے بننے اور بنانے کا بھی ہوتا تھا۔ بہر حال میرا خیال یہی ہے کہ کوفہ میں جو ''الطراز'' تھا ابن ہبیرہ نے چاہا ہو گا کہ اسی کی نگرانی قبول کر لیجئے۔ کیونکہ کپڑوں کی تجارت تو آپ کرتے ہی ہیں۔ لیکن امام نے اس سے بھی انکار کر دیا۔

امام پر عہدۂ قضا قبول کر لینے پر حکومت کا اصرار:

آخر میں کہتے ہیں کہ اس زمانہ کے اہل علم کا جو عام پیشہ تھا یعنی قضا یہ پیش کیا گیا۔ لیکن امام تو طے کر چکے تھے کہ کسی قسم کا کام ہو دینی ہو یا دنیوی میں اس کو قبول کر کے اس ظالم حکومت کے ساتھ موالات کا تعلق نہیں قائم کروں گا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پندرہ دن جیل میں امام کے جو گذرے ان میں یہی رد و بدل اور گفتگو ابن ہبیرہ اور امام کے درمیان ہوتی رہی۔ لکھا ہے کہ جب قضا کی خدمت قبول کرنے سے بھی امام نے صاف انکار کر دیا تب ابن ہبیرہ کے غصہ کی حرارت اپنے آخری درجہ پر پہنچ گئی سننے کے ساتھ ہی انتہائی غیظ میں معمور ہو کر قسم کھاتے ہوئے اس نے اعلان کیا کہ

ان لم یفعل لنضربنه بالسیاط　　اگر اس خدمت کو بھی اس نے قبول نہیں کیا تو میں

علے راسه (ص ۲۲) ان کے سر پر کوڑے مار کر رہوں گا۔

سننے کے ساتھ لوگ کانپ اٹھے۔ امیر نے قسم کھائی' اب وہ یہ کر گذرے گا اسی کا لوگوں کو اندیشہ تھا جو سامنے آ گیا' امام تک ابن ہبیرہ کی اس ہولناک قسم کی خبر پہنچائی گئی خدا جانے لوگوں کا کیا خیال تھا کہ امام پر کیا حال طاری ہو گا مگر آپ نے سن کر اطمینان کے ساتھ فرمایا:

ضربه لی فی الدنیا اسهل علی من مقامع الحدید فی الاخرة. دنیا میں اس کے مار لینے کو آخرت کے آہنیں گرزوں کی مار سے میں آسان خیال کرتا ہوں۔

اور جیسے ابن ہبیرہ اپنی امارت کے گھمنڈ میں قسم کھا بیٹھا تھا اسی طرح جو دین کے نشہ میں مخمور تھا اور ابن ہبیرہ کے تازیانے سے زیادہ آخرت کی آہنیں گرز کی چمک جس کی یقین آنکھوں کے سامنے کوندر ہی تھی اس نے بھی اسی لب ولہجہ میں کہا کہ

والله لا فعلت ولو قتلنی. خدا کی قسم میں ہرگز نہیں کروں گا خواہ مجھے ابن ہبیرہ قتل ہی کیوں نہ کر دے۔

امام کی اس قسم کی خبر ابن ہبیرہ کو پہنچائی گئی' سننے کے ساتھ ہی غصے سے اس کا منہ تمتما اٹھا اور کہنے لگا۔

بلغ من قدره ان یعارض یمینی یمینه (ص ۲۲) اب اس کا (ابو حنیفہ) کا درجہ اتنا بلند ہو گیا کہ میری قسم کا مقابلہ وہ اپنی قسم سے کرتا ہے۔

حضرت امام کی استقامت:

وہ اس وقت اپنے آپ کو اونچا سمجھ رہا تھا اتنا اونچا کہ کرۂ زمین پر اس کے آقا مروان کے بعد اسی کا درجہ تھا امام کی جوابی قسم اس کی رفعت کے مینارے کی کلہاڑی تھی۔ وہ اپنی بلندی کو محفوظ کرنے کے لیے اب امام کے گرانے پر آمادہ ہوا' لیکن تاریخ مسکرا رہی تھی چند ہی سالوں کے بعد دنیا جسے بھولنے والی تھی وہ اس سے ہاتھ ملانا چاہتا تھا جس کی یاد کا قیامت تک کے لیے کروڑ ہا کروڑ انسانوں کے قلوب میں مرتکز ہونا مقدر ہو چکا تھا ابن ہبیرہ کے

احساس برتری پر یہ ایسی چوٹ تھی کہ تلملا اٹھا' اسی وقت اس نے امام کو اپنے سامنے حاضر کرنے کا حکم دیا جیل سے وہ ابن ہبیرہ کے سامنے لائے گئے۔ ابن ہبیرہ کے سپاہی امام کو اس کے سامنے لیے کھڑے ہوئے تھے اور وہ قسمیں کھا کھا کر ان کے منہ پر کہہ رہا تھا۔

ان لم یل لیضربن علی راسه حتی یموت. اگر اس نے حکومت کی خدمت قبول نہ کی تو اس کے سر پر اس وقت تک کوڑے لگائے جائیں گے جب تک کہ اس کا دم نہ نکل جائے اور مر نہ جائے۔

لیکن امام کی سکینت و استقامت میں کسی قسم کی کوئی جنبش نہیں پیدا ہوئی۔ ابن ہبیرہ جہنم کی طرح بھڑک رہا تھا۔ اپنے اختیارات کی وسعتوں کو اس نے موت تک پہنچا دیا تھا' لیکن سنتے ہو کتنی بے نیازی سے امام اس سے فرما رہے تھے۔

انما هی میتة واحدة. صرف ایک ہی موت تک (اس کا اقتدار ہے)

سزا کے وقت امام کا ایک تاریخی فقرہ:

ابن ہبیرہ ان کی اس ادا اور اس جواب پر جس کا اس سے پہلے اسے کبھی تجربہ نہیں ہوا تھا آپے سے باہر ہو گیا۔ جلواز جلواز کے ساتھ چیخنے لگا۔ یہ کوڑے مارنے والوں کو کہتے تھے جو تازیانہ بدست حکام کے سامنے کھڑے رہتے تھے جلواز دوڑ پڑے۔

''بیس کوڑے اس شخص کے سر پر مسلسل لگائے جائیں۔''

یہ حکم ابن ہبیرہ نے ان کو دیا' امام کا سر کھلا ہوا تھا اور ایک دو تین کوڑے تھے جو پے در پے اس سر پر پڑ رہے تھے جس میں خدا کی بڑائی کچھ اس طرح سما گئی تھی کہ کسی مخلوق کی بڑائی کی گنجائش ہی اس میں باقی نہیں رہی تھی چند کوڑوں تک امام خاموش رہے آخر میں یہ تاریخی فقرہ زبان مبارک سے نکلا جواب تک نقل کیا جاتا ہے۔ ترجمہ جس کا یہ ہے۔ ابن ہبیرہ کو خطاب کر کے فرما رہے تھے۔

یاد کر! اس وقت کو جب اللہ تعالیٰ کے سامنے تو بھی کھڑا کیا جائے گا اور آج تیرے سامنے میں جتنا ذلیل کیا جا رہا ہوں اس سے کہیں زیادہ ذلت کے ساتھ تو خدا کے دربار میں پیش کیا جائے گا۔''

ابن ہبیرہ! مجھے تو دھمکاتا ہے۔ حالانکہ دیکھ میں شہادت دے رہا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے۔ اقرار کرتا ہوں کہ

(لا الہ الا اللّٰہ)

''دیکھ! میرے متعلق تو بھی پوچھا جائے گا اس وقت بجز سچی بات کے کوئی جواب تیرا سنا نہیں جائے گا۔'' کوڑے پڑ رہے تھے اور امام کی زبان سے یہ الفاظ نکل رہے تھے۔ کہتے ہیں کہ آخری فقرہ کو سن کر ابن ہبیرہ کا چہرہ فق پڑ گیا اور اشارہ سے جلاد کی طرف اشارہ کیا کہ

''بس''

لکھا ہے کہ پولیس (شرطہ) والے امام کو جیل خانے پھر واپس لے گئے' رات وہیں جیل خانہ میں گذری' صبح کو لوگوں نے دیکھا کہ مظلوم امام کا چہرہ سوجا ہوا تھا اور سر پر مار کے نشان پڑے ہوئے تھے۔[1]

کہتے ہیں کہ اسی زمانہ میں جب امام کو جیل سے جارہے تھے یا جیل پہنچنے کے بعد امام رحمۃ اللہ علیہ پر گریہ کی حالت طاری ہوئی لوگوں نے دریافت کیا۔ تو فرمایا کہ

''اس مار کا مجھے خیال نہیں بلکہ مجھے اپنی ماں کا خیال ہے' میرے اس حال کو دیکھ کر ان بے چاری کا کیا حال ہوگا۔''

جیل سے رہائی:

کہتے ہیں کہ ابن ہبیرہ کا غصہ اب کچھ دھیما پڑا۔ لیکن راج ہٹ جس کا ترجمہ اس زمانہ میں ''وقار حکومت'' کے الفاظ سے کیا جاتا ہے وہ اس پر اب بھی سوار تھا۔ آخر گھبرا کر اس نے کہا کہ

الاناصح لھذا لرجل المحبوس ان یستاجلنی فاوجلہ فینظر فی امرہ. کیا کوئی ایسا آدمی نہیں ہے جو اس قیدی کو یہ سمجھائے کہ مجھ سے یہ مہلت چاہے تاکہ میں اس کو اپنے معاملہ میں غور کرنے کا موقعہ دوں۔ (ص ۲۴ موفق ج ۲)

---

[1] الفاظ کی کمی بیشی کے ساتھ یہ روایت امام کی عام سوانح عمریوں میں درج ہے میں نے امام موفق کے مناقب ص ۲۲ ج ۲ سے اس کو نقل کیا ہے۔ ۱۲
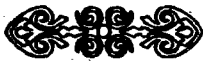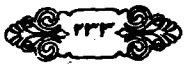
بیان کیا گیا ہے کہ امام تک ابن ہبیرہ کی اس خواہش کی خبر پہنچائی گئی۔ اس پر آپ نے فرمایا کہ:

''اچھا! مجھے چھوڑ دیا جائے میں اپنے احباب اور اپنے بھائیوں سے مشورہ کرتا ہوں اور جیسا کہ اس نے کہا ہے غور کرتا ہوں۔''

یہ نہیں بیان کیا گیا ہے کہ یہ رہائی ضمانت اور مچلکہ کے ساتھ ہوئی یا بغیر مچلکہ اور ضمانت کے بہ ظاہر معلوم ہوتا ہے کہ امام کی طرف سے اس منظوری کی خبر ابن ہبیرہ تک جوں ہی پہنچائی گئی۔ اتنی سی خوراک بھی امام جیسی کردار والی شخصیت سے اس کے کبر کے لیے کافی ہوئی۔[1] رہائی کا حکم اسی وقت اس نے دے دیا۔

رہا ہونے کے بعد امام نے کیا کیا۔ اگرچہ امام کے عام سوانح نگاروں نے اس واقعہ کا ذکر نہیں کیا ہے۔ لیکن الکردری کے مناقب سے معلوم ہوتا ہے کہ جیل سے نکلنے کے بعد حسب وعدہ امام نے اپنے اخوان و احباب سے مشورہ فرمایا اور قاضی ابو یوسف کے حوالہ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ لوگوں نے امام کو آخر میں مشورہ دیا کہ جب والی قسم کھا چکا ہے تو صرف اس کی قسم کی تکمیل کے لیے کوئی سی بھی خدمت قبول فرما لیجیے ورنہ قسم ہی کا حیلہ کر کے پھر وہ گرفتار کرے گا۔ اور جیسا کہ وہ حلفیہ اعلان کر چکا ہے کہ اس وقت تک پٹواتا رہوں گا۔ جب تک کہ موت نہ آ جائے اسی کو پیش کر کر کے امام سے لوگوں نے عرض کیا کہ **لا تعن علی قتل نفسک.** اپنی خودکشی پر اس کی اعانت نہ کیجیے۔

(ص ۲۸)

---

[1] بعضوں نے لکھا ہے کہ ابن ہبیرہ اپنے کسی خواب سے بھی متاثر ہوا لیکن جس خواب کو اس کی طرف منسوب کیا جاتا ہے دل راضی نہیں کہ اتنی دولت بیدار سے وہ مشرف ہوا ہو یہ میرا ذاتی احساس ہے مگر ہو سکتا ہے کہ عالمین کے لیے جس کی ذات والا رحمت تھی اپنے دین کے ایک وفادار خادم کے طفیل میں اس کو سرفراز کیا گیا ہو دل یہ بھی کہتا ہے کہ **لقد تحجرت واسعاً** (تو نے بڑی وسیع رحمت کو مختصر کر دیا) واللہ اعلم۔ ۱۲

[2] اسی روایت میں قاضی ابو یوسف سے مروی ہے کہ کوڑوں کی مار سے امام کے جسم سے گوشت کے ٹکڑے کٹ کٹ کر گرتے تھے۔ ۱۲

مگر سوال یہی تھا کہ کس قسم کی خدمت قبول کی جائے۔ بعض روایتوں میں ہے کہ الخزازین کے عریف ہونے کا عہدہ بھی پیش کیا گیا۔ لیکن اس سے بھی امام نے انکار کیا بالآخر بحث ومباحث کے بعد امام صاحب اس پر راضی ہو گئے کہ شہر میں اطراف و جوانب سے انجیر انگور وغیرہ فواکہ جو آتے ہیں۔ ان کے گننے کی خدمت اگر میرے سپرد کی جائے تو خیر اس کو قبول کر سکتا ہوں۔ ابن ہبیرہ تک امام کی اس منظوری کی خبر پہنچائی گئی وہ خود تنگ آ گیا تھا۔ محض ''وقارِ حکومت'' کا پاس امام کو بالکل چھوڑ دینے میں مانع آ رہا تھا۔ آخر بات اس کی رہ گئی اور امام کو اس کے پنجۂ استبداد وظلم سے رہائی ملی۔

کوفہ سے حرم محترم کی طرف وقتی ہجرت:

امام چھوڑ دیے گئے یہ معلوم نہ ہو سکا کہ اس خدمت کو کب تک امام نے انجام دیا لیکن بالاتفاق آپ کے سوانح نگاروں نے لکھا ہے کہ ابن ہبیرہ کے اس جور وتعدی ظلم وستم کے بعد

ھرب الی مکۃ و اقام بھا فی سنۃ مائۃ وثلاثین (ص ۲۷ کردری)	امام رحمۃ اللہ علیہ مکہ معظمہ کی طرف بھاگ گئے اور ۱۳۰ھ تک مکہ معظمہ ہی میں آپ کا قیام رہا۔

بعض روایتوں میں ہے کہ ''رکب ودابہ''[1] یعنی اپنی سواریوں پر لد کر امام مکہ معظمہ کی طرف روانہ ہو گئے۔

میرا خیال ہے کہ غالباً اس وقتی ہجرت کا ارادہ اور حرم محترم میں پناہ لینے کا ارادہ امام پہلے ہی کر چکے تھے اور شاید اسی مصلحت سے انھوں نے ایک ایسی خدمت قبول کی کہ شہر سے باہر آنے جانے پر لوگوں کو تعجب نہ ہو' گویا ایک طرح سے کروڑ گیری کے محکمہ کی یہ ملازمت تھی اور اس محکمہ کے ملازموں کا ظاہر ہے کہ شہر کے ناکوں اور راستوں ہی سے تعلق ہوتا ہے' امام نے سواریوں کا انتظام کر لیا ہوگا۔ یوں جس قدر بھی ساز وسامان کی ضرورت ہو گی اس کو اونٹوں اور گدھوں' خچروں پر لدوا کر حجاز کی طرف روانہ ہو گئے ہوں گے خود ابن ہبیرہ بھی یہی چاہتا ہو گا کہ اس قسم کے سخت وکرخت آدمی سے شہر جہاں تک جلد خالی

---

[1] دیکھو موفق ص ۲۴ ج ۲

ہو بہتر ہے خطرہ ہوتا ہوگا کہ اس کو دیکھ دیکھ دوسرے نہ بگڑ جائیں۔ اور یہ خطرہ کچھ بے جا بھی نہ تھا' میں تو سمجھتا ہوں کہ آج اعلیٰ معیاری کردار کے نمونوں کے لیے دیکھا جاتا ہے کہ مسلمانوں کے سامنے غیر اقوام کے ابطال (ہیروز) کی مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔ حالانکہ اسلامی تاریخ کا ورق ورق' صفحہ صفحہ اس قسم کے اعلیٰ اخلاقی اسباق کے مواد سے بھرا ہوا خود امام ابوحنیفہ ہی کی زندگی اپنے اندر کن کن نمونوں کو نہیں رکھتی؟ کام کرنے والے زندگی کے ہر دور میں امام کی سوانح عمری کو اپنے لیے شمع راہ اور حوصلہ کی بلندی وقوت کا ذریعہ بنا سکتے ہیں آخر یہ لوگ بھی آدم زاد ہی تھے جنوں یا فرشتوں کی اولاد تو نہ تھے۔

بنی عباس کی حکومت:

بہر حال بنی امیہ کی حکومت کے ساتھ امام کی کشمکش کے متعلق جو واقعات تاریخ میں بیان کئے گئے ہیں' ان کا اختتام اسی ابن ہبیرہ کے واقعہ پر ہو جاتا ہے اس کے بعد جیسا کہ امام کے سوانح نگاروں نے امام کی ہجرت کے تذکرے کے بعد عموماً یہ بھی لکھ دیتے ہیں کہ

اقام بمكة حتى صارت الخلافة للعباسية (ص ۲۴ ج ۲ موفق)	مکہ معظمہ ہی میں وہ اس وقت تک مقیم رہے جب تک کہ خلافت پر عباسیوں نے قبضہ نہ کر لیا۔

انقلاب حکومت کا یہ واقعہ ظاہر ہے کہ اسلامی تاریخ کا بڑا اہم باب ہے یوں بھی تفصیلات سے لوگ ناواقف نہیں ہیں کہ اس انقلاب میں سب سے بڑا ہاتھ ابومسلم خراسانی عباسیوں کے داعی کا تھا جس نے عربوں میں پھوٹ پیدا کر کے بنی امیہ کی حکومت کا تختہ الٹ دیا۔ اسی سال یعنی ۱۳۰ھ میں ابومسلم مرو میں داخل ہوتا ہے اور بہت سی سازشوں کے بعد آخر میں اس نے اپنی جماعت جسے وہ شیعۂ اہل بیت کہتا تھا۔ یہ مژدہ سنایا کہ:

ان يبنوا المساكن فقد اغناهم من اجتماع كلمة العرب عليهم. (کامل ابن اثیر ص ۱۴۱ ج ۴)	اب اطمینان سے اپنے گھر بناؤ اور آباد ہو جاؤ۔ اب یہ بات کہ عرب پھر (مسئلہ حکومت) میں کسی ایک نقطہ پر جمع ہوں گے' خدا نے اس سے فارغ البال بنا دیا۔

اس کا تو کوئی ثبوت اس وقت تک نہیں ملا ہے کہ دولت بنی امیہ کے خلاف جس سازش کا جال اندر اندر ابومسلم سارے ممالک اسلامیہ میں پھیلا رہا تھا۔ اس میں امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی بھی بالواسطہ یا بلاواسطہ شرکت تھی۔ لیکن ابراہیم بن میمون جن کا مختلف حیثیتوں سے ذکر گذر چکا ہے اور آخر میں ابومسلم ہی کے حکم سے ان کو شہید بھی ہونا پڑا ہے۔ ان کے متعلق ابن سعد نے طبقات میں لکھا ہے۔

کان هو و محمد بن ثابت العبدی صدیقین لابی مسلم الداعیة بخراسان یجلسان الیه ویسمعان کلامه (ص ۱۰۳ ج۷ حصه دوم)	ابراہیم بن میمون الصائغ اور محمد بن ثابت عبدی یہ دونوں ابومسلم کے دوست تھے جو عباسیوں کا خراسان میں داعی تھا دونوں کی ابومسلم کے پاس نشست و برخاست تھی اور اس کی باتیں سنا کرتے تھے۔

چونکہ ابراہیم بن میمون اور امام ابوحنیفہ میں خاص تعلقات تھے خود امام صاحب سے ابن المبارک یہ روایت نقل کیا کرتے تھے کہ ابراہیم ابن میمون میرے پاس آیا کرتے تھے دونوں میں تنہائی کی ملاقاتیں بھی ہوتی تھیں' امام صاحب پر بھی ان کا بہت اثر تھا آخر میں جب ابراہیم نے ابومسلم کے ظالمانہ حرکات کو دیکھ کر اس سے مقابلہ کا ارادہ کیا تو اس باب میں انھوں نے امام ابوحنیفہ سے نہ صرف مشورہ ہی لیا بلکہ امام کے ہاتھ پر ابومسلم کی مخالفت کے سلسلہ میں باضابطہ بیعت[1] کرنی چاہی۔ اور جیسا کہ میں پہلے بھی لکھ چکا ہوں کہ امام نے اس کو خلاف مصلحت قرار دیتے ہوئے بیعت سے انکار کیا۔ لیکن اس سے ابراہیم اور امام کے باہمی سیاسی تعلقات کا پتہ چلتا ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ جیسے ابراہیم' ابومسلم کی مخالفت میں امام سے مدد کے طالب ہوئے تھے۔ اسی طرح جب ابومسلم سے ان کی موافقت تھی۔ اس معاملہ میں کوئی گفتگو نہ ہوئی ہوگی۔ لیکن ظاہر ہے کہ تاریخ میں جب اس کی صراحت نہیں ملتی۔ اس لیے قطعی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ عباسیوں کی تحریک میں امام نے بھی عملاً کوئی حصہ لیا تھا جو کچھ معلوم ہوتا ہے وہ صرف اس

---

[1] تفصیلی قصہ آگے آ رہا ہے۔ ۱۲

قدر ہے کہ ٹھیک جن دنوں میں عباسیوں کی اندرونی تحریک اندر سے باہر آ گئی اور ملک کے مختلف حصوں میں بنی امیہ کے خلاف عباسیوں کے اشارے سے ابو مسلم نے بغاوتیں برپا کرانی شروع کیں...... حضرت امام نے ان ہی دنوں میں مجاورت حرم کی زندگی اختیار کر لی اور اس وقت تک جب تک کہ عباسی تحریک بنی امیہ کی حکومت کا خاتمہ کر کے تخت خلافت پر عباسیوں کو قبضہ دلانے میں کامیاب نہ ہوئی' امام حرمین ہی میں گھومتے رہے۔ باوجود تلاش کے کوئی ایسی چیز بھی نہیں ملتی جس سے ثابت ہو کہ امام کو کسی زمانہ میں عباسیوں کی تحریک سے ہمدردی تھی۔

حضرت امام کی کوفہ کو واپسی:

اور سچ تو یہ ہے کہ اس تحریک کی ابتداء ہی جن غیر اسلامی بنیادوں سے ہوئی تھی ان کے نتائج کا دوسروں کو اندازہ ہوا ہو یا نہ ہوا ہو۔ لیکن امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی دور رس نگاہوں سے وہ کیسے اوجھل رہ سکتے تھے۔ بہر حال کچھ بھی ہو امام کو الگ تھلگ حجاز میں زندگی گذارتے ہوئے ہم اس وقت تک پاتے ہیں جب تک کہ عباسیوں کا پہلا خلیفہ ابو العباس السفاح کوفہ میں پہنچ کر اپنی خلافت اور حکومت کا اعلان جمعہ کی نماز کے بعد بحالت بخار اپنے مشہور تاریخی خطبہ کے ذریعہ سے کرتا ہے۔[1]

---

[1] تاریخوں میں ابو العباس کی اور اس کے بعد اس کے چچا زاد بھائی داؤد بن علی کی تقریریں لوگوں نے نقل کی ہیں جن سے اس زمانہ کے مسلمانوں کی خطابت اور قوت بیانی کا بھی اندازہ ہوتا ہے اور اس سے زیادہ حیرت اس پر ہے کہ لوگوں نے ان تقریروں کو یاد کیے رکھا' ممکن ہے کہ الفاظ میں کچھ ردوبدل ہوا ہو۔ لیکن پھر بھی مختصر نویسی کا زمانہ جب نہ تھا پوری پوری تقریروں کے نقل کرنے کا مسلمان مورخین میں خاص ذوق پایا جاتا ہے۔ ابن اثیر کے تقریباً دو صفحے میں یہ تقریریں درج ہوئی ہیں اسی سے ان کی طوالت کا اندازہ کیجئے پوری تقریریں تو کتابوں میں پڑھئے بعض خاص فقروں کا ترجمہ درج کیا جاتا ہے۔ ابو العباس نے تقریر کا آغاز ان الفاظ میں کیا۔

شکر ہے اس خدا کا جس نے اسلام کو اپنے لیے شرف و عظمت کے لیے انتخاب فرمایا اور اسلام کو پھر ہمارا دین قرار دیا اسی سے ہماری خدا نے مدد کی اور اس کا محافظ' اس کا قلعہ' اس کی پناہ گاہ ہم لوگ بنائے گئے۔ ہمارا فرض قرار دیا گیا ہے کہ اسلام کو لے کر کھڑے ہو جائیں اور جو

لئے اس پر حملہ کرے اس کی مدافعت کریں۔ تقویٰ کے کلمہ کو ہمارے لیے لازم کیا گیا اور ہم لوگوں کو تقویٰ کا سب سے زیادہ حق دار بنایا' اور رسول اللہ ﷺ کی رشتہ داری کے شرف سے ہمیں نوازا' ہم لوگوں کو ایک ہی آباؤ اجداد سے پیدا کیا۔ جس درخت سے رسول اللہ ﷺ نکلے اسی سے ہم بھی پھوٹے۔ رسول اللہ ﷺ کو خدا نے ہمارے اندر پیدا کیا۔ ان پر وہ چیزیں گراں تھیں جن سے ہم لوگوں کو دکھ پہنچتا ہو' وہ ہم لوگوں کی فلاح و بہبود کے چاہنے والے تھے۔ عام ایمان والوں پر مہربان اور رؤف و رحیم تھے۔ خدا نے ہم لوگوں کو اسلام میں اور اسلام والوں میں بلند مرتبہ عطا کیا اور خود قرآن میں اس کے متعلق آیتیں نازل ہوئیں۔

ابوالعباس نے اس کے بعد قرآن کی ان آیتوں کی تلاوت کی جن میں اہل بیت اور رسول اللہ ﷺ کے اقربا کا ذکر ہے۔ پھر اس نے کہا کہ

فئی اور غنیمت کو ہمارے لیے مختص فرمایا۔ یہ خدا کی ہم لوگوں پر مہربانی ہے اور خدا بڑے فضل والا ہے۔ آخر میں بنی امیہ کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے اس نے کہا کہ:

گمراہ شامیوں نے یہ خیال قائم کرلیا کہ ریاست سیاست اور خلافت کے حق دار ہم لوگ نہیں بلکہ ہمارے اغیار ہیں' پھر خدا نے ان کے منہ کالے کیے لوگو! گمراہی کے بعد خدا نے ہدایت کی راہ تم لوگوں کو ہمارے ذریعہ سے کھولی ہے۔ جہالت کے بعد لوگوں میں اب سوجھ واپس آئی۔ تباہی کے بعد نجات ان کے سامنے آئی ہے' حق ہمارے ذریعہ سے واضح ہوا باطل پھسل کر گر پڑا' جو باتیں بگڑ گئی تھیں ہمارے ذریعہ سے وہ سلجھ گئیں بکھرنے کے بعد لوگ پھر سمٹ گئے' اب ہم سب بھائی بھائی ہیں۔ محمد رسول اللہ ﷺ کی روح خوش ہو رہی ہے۔

پھر خلفاء راشدین اور ان کے طرز عمل کو سراہنے کے بعد اس نے کہا:

جس راہ سے تم پر بھلائی آئی ہے اسی سے اب برائی نہ آئے گی' ہم رسول اللہ کے گھرانے والوں کا بھروسہ بس صرف اللہ پر ہے۔

کوفہ والوں کو خطاب کر کے اس نے کہا:

کوفہ والو! ہماری محبت کے تم ہی مرکز ہو۔ تم ہمارے ساتھ وفادار رہے' اگرچہ ظلم والے ظلم کرتے رہے' آخر ہماری دولت سامنے آ گئی تم میں ہر ایک کے وظائف میں میں نے سو سو درم کا اضافہ کیا۔

بخار کی وجہ سے السفاح بیٹھ گیا اس کا چچا داؤد منبر پر پہنچا اور ایک لمبی تقریر اس نے کی جو السفاح کی تقریر سے زیادہ بہت زیادہ طویل بھی ہے اور فصیح و بلیغ بھی۔ المسعودی نے لکھا ہے کہ بنی امیہ کی بدعتوں لئے

اس عرصہ میں کوفہ میں بیسیوں انقلابات آتے رہے' بالآخر ابن ہبیرہ کوفہ چھوڑ کر واسط میں محصور ہو جاتا ہے[1] اور عباسیوں کے شیعہ کوفہ پر اپنا کامل اقتدار قائم کر لیتے ہیں۔

کوفہ کے علماء کے سامنے سفاح کی تقریر:

اسی زمانہ میں یعنی ۱۳۲ھ میں ابوالعباس کوفہ میں داخل ہوتا ہے اور جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے باشندگانِ کوفہ کے سامنے مشہور تاریخی تقریر کرتا ہے عام تاریخ کی کتابوں میں لوگ ابوالعباس اور اس کے بعد ابوالعباس کے چچا داؤد بن علی کی تقریر کا تذکرہ کرتے ہیں۔ لیکن ابوالعباس نے آیا کوفہ کے فقہا اور علما کو بھی علیحدہ جمع کر کے کوئی علیحدہ تقریر کی تھی اس کا ذکر ہم ان عام تاریخی کتابوں میں نہیں پاتے' لیکن امام ابوحنیفہ کے حنفی سوانح نگاروں نے معمولی سند سے نہیں بلکہ قاضی ابویوسف نے داؤد طائی[2] کے

لہ میں ایک بدعت یہ بھی تھی کہ بجائے کھڑے ہونے کے جمعہ کا خطبہ بیٹھ کر پڑھا کرتے تھے۔ السفاح نے پہلی دفعہ سنت کے مطابق کھڑے ہو کر خطبہ شروع کیا۔ لوگوں نے بڑی تعریف کی کہ ایک مردہ سنت کو پہلی دفعہ اس نے زندہ کیا' السفاح نے جمعہ کے خطبہ کو مختصر طور پر پڑھ کر نماز پڑھائی اور اس خطبہ کو جس کا ترجمہ کیا گیا ہے نماز کے بعد دیا تھا۔

[1] ابن ہبیرہ کے حالات میں واسط کے محاصرے کا اور اس کے قتل ہونے کے واقعات کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔

[2] داؤد طائی کا شمار اسلام کے اکابر اولیاء اللہ میں ہے۔ یہ امام کے قدیم تلامذہ میں تھے۔ ابتداء خراسان سے کوفہ زرد رنگ کی عبا پہن کر آئے تھے کوفہ والے اس پر ہنستے تھے۔ مگر بتدریج اس زمانے کے سارے علوم میں کمال حاصل کیا۔ عربیت۔ قرأۃ' حدیث سے فارغ ہونے کے بعد امام کے پاس فقہ کی تعلیم مدت تک حاصل کرتے رہے۔ ایک دن امام صاحب نے کہا کہ داؤد! آلات تو تمہارے مکمل ہو گئے۔ داؤد نے کہا: تو پھر کچھ چیز باقی بھی رہی' فرمایا کہ علم پر عمل کرنا باقی رہ گیا ہے۔ اسی وقت اٹھے اور وراثت میں کچھ زمین کوفہ میں ملی تھی اس کو چار سو درم میں فروخت کر کے دنیا سے الگ ہو گئے' تیس سال اسی چار سو درم پر گذارے' جماعت اور عام مسلمانوں کی راہوں سے چلنے کو پسند نہیں کرتے تھے۔ لوگوں سے بہت کم ملتے جلتے تھے۔ فضیل بن عیاض ملنے آئے دروازہ نہ کھولا' فضیل باہر بیٹھے بیٹھے رونے لگے۔ داؤد اندر بیٹھے رو رہے تھے۔ فضیل نے کہا کہ آخر کہاں جاؤں مجھے آدمی کی تلاش ہے۔ فرمایا: یہی تو وہ گم گشتہ شے ہے جو نہیں ملتی۔ ان کا تذکرہ تفصیل سے کتابوں میں کیا گیا ہے۔ ۱۲

حوالہ سے یہ نقل کرنے کے بعد کہ جب ابوالعباس السفاح کوفہ پہنچا تو اس نے علماء شہر کو جمع کرنے کا حکم دیا' علماء جب جمع ہو گئے تو ان کے سامنے بھی ابوالعباس کھڑا ہوا اور حسب ذیل تقریر کی جس کا ترجمہ یہ ہے۔

آخر یہ چیز (خلافت) تمہارے پیغمبر کے گھر والوں تک پہنچ گئی' خداوند تعالیٰ کی طرف سے فیصلہ صادر ہو گیا' حق کو خدا آخر کھڑا کر کے رہا۔

ابوالعباس نے ان تمہیدی فقروں کے بعد علما کو مخاطب کرتے ہوئے کہنا شروع کیا۔

''اور آپ لوگ جو علما کے طبقے سے تعلق رکھتے ہیں اس کے زیادہ مستحق ہیں کہ اس حق کی اعانت کے لیے آگے بڑھیں' اعلان کیا جاتا ہے کہ اس کے صلے میں آپ کے ساتھ داد و دہش کی جائے گی۔ آپ کی عزت بڑھائی جائے گی اور اللہ کے مال سے آپ لوگوں کی خواہش کے مطابق مہمان نوازی کی جائے۔

پس چاہئے کہ اس کی (یعنی خلافت کے لیے جس کا انتخاب ہوا ہے) اس کے ہاتھ پر بیعت کیجئے' ایسی بیعت جو آپ لوگوں کے امام (خلیفہ) کے سامنے حجت و دلیل کا کام دے۔ یہ بیعت حجت ہوگی آپ لوگوں کے حقوق کی بھی اور آپ کے فرائض کی بھی (یعنی تم لوگوں پر بھی حجت ہوگی اور تمہارے لیے بھی حجت ہوگی) اسی میں آپ لوگوں کے انجام اور امن کی ضمانت ہے' آخرت میں اسی سے آپ کو پناہ ملے گی۔ چاہئے کہ تم میں خدا سے جو بھی ملے وہ امام (خلیفہ) کے بغیر نہ ملے' کیونکہ اگر ایسا ہوگا تو تم لوگ ان لوگوں میں سے ہو جاؤ گے جو اپنے پاس اپنے متعلق کوئی وثیقہ نہیں رکھتے۔''

آخر میں یہ جتلاتے ہوئے کہ یہ بیعت اخلاص کی بیعت ہونی چاہئے محض خوف اور ہیبت کی وجہ سے نہ ہو' کہا: جس کا خلاصہ یہ ہے کہ:

''اور دیکھو! محض خوف اور ہیبت کھا کر کوئی مجھے امیر المومنین نہ کہے اور نہ حق کے کہنے سے ڈرے۔''

قاضی ابو یوسف داؤد طائی کی زبان اسی روایت کو نقل کرنے کے بعد ان ہی کی زبانی

ناقل ہیں کہ علماء کی جس جماعت کو ابوالعباس نے اس وقت خطاب کیا تھا اس میں ابوحنیفہ بھی تھے اور مورخین کا جب یہ اتفاقی بیان ہے کہ ابوالعباس ۱۳۲ھ میں کوفہ پہنچا تو اس کے یہی معنی ہوئے کہ حجاز سے حضرت امام ابوحنیفہ ۱۳۲ھ میں ہی کوفہ واپس آ چکے تھے۔

علماء کی طرف سے حضرت امام کا جواب:

قاضی ابویوسف کی اسی روایت میں اس کے بعد یہ بیان کیا گیا ہے کہ ابوالعباس جب اپنی تقریر سے فارغ ہو چکا تو علماء کی نگاہیں امام ابوحنیفہ کی طرف اٹھیں، امام نے اس حال کو دیکھ کر لوگوں سے کہا کہ آپ لوگوں کی اگر خواہش ہو تو میں اپنی طرف سے بھی اور آپ لوگوں کی طرف سے بھی جواب دوں۔ لکھا ہے کہ تھوڑی دیر کے لیے لوگ خاموش رہے، آخر میں بالاتفاق علماء کی طرف سے امام ہی کو جواب دینے کی وکالت سپرد کی گئی[1] امام کھڑے ہوئے اور حسب ذیل تقریر جواب میں آپ نے فرمائی۔

الحمد للہ کہ حق ان لوگوں تک پہنچ گیا جن کی رسول اللہ ﷺ سے قرابت ہے خدا کا شکر ہے کہ اس نے ظالموں کے مظالم کا گلا گھونٹ دیا اور ہماری زبانوں کو اب اس کی گنجائش ملی کہ ہم حق کا اظہار کریں۔

ان تمہیدی فقرات کے بعد امام نے بیعت کے متعلق یہ دو مختصر فقرے فرماتے ہوئے۔

قد بایعناک علی امر اللہ خدا کے حکم اور امر پر ہم نے تمہاری بیعت کی اور **والوفاء لک بعھدک الی** اس بیعت کے ساتھ ہم "قیام الساعۃ" تک

---

[1] جیسا کہ مختلف طریقے سے اس کا ذکر کرتا چلا آ رہا ہوں کہ عباسیوں کے متعلق ممکن ہے کہ ابتداء میں لوگوں کو خصوصاً اہل بیت نبوت سے قرب کی وجہ سے حسن ظن ہو لیکن جوں ہی کہ اقتدار کا کچھ ہی حصہ ان کے ہاتھ میں آیا انھوں نے ان ہی حرکات کا اعادہ شروع کر دیا جس کی وجہ سے لوگ بنی امیہ سے بیزار ہو رہے تھے۔ سفاکیوں اور خون ریزیوں کے اسی منظر کو انھوں نے بھی ہر جگہ پیش کرنا شروع کیا، حتیٰ کہ ابوالعباس کا لقب ہی السفاح (خوں ریز) (یا خون کا بہانے والا) مشہور ہو گیا۔ بلکہ اسی کوفہ والی تقریر کو ختم کرتے ہوئے "کامل" میں لکھا ہے کہ ابوالعباس نے خود اعلان کیا کہ انا السفاح المبیح والثائر المنیح یعنی میں ہی خون بہانے والا اور لوگوں کی جان و مال کو حلال کرنے والا ہوں، میں ہی پراگندگی پھیلانے والا اور خوب داد و دہش کرنے والا ہوں۔ (کامل ابن اثیر ص ۱۵۴ ج ۴)

قیام الساعة. وفادار رہیں گے۔

آخر میں بطور دعا کے کہا کہ:

''پس خدا سے دعا ہے کہ اب اس معاملے (خلافت) کو اللہ تعالیٰ ان لوگوں سے خالی نہ رکھے جو رسول اللہ ﷺ سے قرابت کا رشتہ کہتے ہیں۔''

بس ان ہی چند جملوں پر امام اپنی تقریر کو ختم کر کے بیٹھ گئے۔ ابوالعباس نے امام کی تقریر سن کر کہا کہ

''علما کی طرف سے تمہارے ہی جیسے آدمی کو تقریر کرنا چاہئے تھا علما نے بہت اچھا کیا جو تمہارا انتخاب کیا۔ تم نے خوبی کے ساتھ اپنے مقصد کو ادا کیا۔''

(ص ۱۵۱۔ ج ا موفق)

مجلس ختم ہو گئی، جب ابوالعباس کے سامنے سے اٹھ کر علما باہر نکلے تو سبھوں نے امام کو چاروں طرف سے گھیر لیا اور پوچھنا شروع کیا کہ

''قیام الساعۃ'' تک وفادار رہیں گے۔

تمہارا مقصد اس سے کیا تھا۔ امام نے فرمایا کہ:

'تم لوگوں نے بات میرے حوالہ کی، پس میں نے خود اپنے لیے بھی ایک راہ نکال لی اور تم لوگوں کو بھی مصیبت سے بچا لیا۔''

لکھا ہے کہ اس جواب کو سن کر لوگ چپ ہو گئے اور باہم کہنے لگے کہ امام نے جو کچھ کیا ٹھیک کیا۔ (ص ۱۵۲)

اگرچہ موفق نے اس قصہ کو نقل کر کے آگے کسی تشریحی اضافہ کا ذکر انھوں نے نہیں کیا ہے، لیکن الکردری جن کے مناقب امام موفق ہی کے مناقب سے ماخوذ ہیں انھوں نے اسی قصہ کا تذکرہ کرنے کے بعد لکھا ہے۔

يحتمل ان يرادبه الى قيام الساعة من المجلس فحذف الباء واكتفى بالكسرة والى

اس کی بھی گنجائش ہے کہ امام ابوحنیفہ نے ''قیام الساعۃ'' کے الفاظ کا بیعت میں جو اضافہ کیا تھا ان سے مقصد ان کا یہ ہو کہ اس مجلس کی گھڑی

قیام الساعة. (الکروری ص ۲۰۰ ج ۱) تک ہم تمہارے وفادار رہیں گے (کردری نے نحوی قاعدے سے الفاظ میں یہ گنجائش نکالی ہے اس کی آگے توجیہہ بھی کی ہے۔

مقصد یہ ہے کہ ابوالعباس کو امام نے جو جواب دیا اس کا مطلب کیا تھا؟ بہ ظاہر ان کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ خود انھوں نے اپنی طرف سے بھی اور علماء کی طرف سے بھی جن کے وہ وکیل تھے ابوالعباس کی بیعت قبول کر لی۔ لیکن بعد کو امام اور دوسرے کوفی علماء کے طرزِ عمل سے ثابت ہوتا ہے کہ بنی عباس نے ظہور کے بعد جن مظالم کا اعادہ مسلمانوں کے ساتھ شروع کیا اور مسلمانوں کے مال کے ساتھ جس طرز عمل کو بنی امیہ نے اختیار کر لیا تھا' اسی طرز عمل کو انھوں نے بھی اپنے عہد میں جاری رکھا ان چیزوں کو دیکھ کر عباسیوں سے بھی وہ اسی طرح ناراض رہے جیسے بنی امیہ سے ناراض تھے حضرت امام کے متعلق تو آئندہ جو کچھ بیان کیا جائے گا۔ زیادہ تر وہ اسی کش مکش کی داستان ہی ہو گی جو ان میں اور عباسی حکومت میں آخر وقت تک جاری رہی' سوال ہوتا ہے کہ جب صورت حال یہی تھی تو انھوں نے اتنے واضح اور موکد الفاظ میں بیعت کیسے قبول کر لی۔

بہ ظاہر اسی کا جواب کردری نے دینا چاہا کہ امام رحمۃ اللہ نے اس وقت ایک خاص طریقہ عمل کو اختیار فرمایا جس کی اجازت ایسے حالات میں اسلام میں دی گئی ہے۔[1]

---

[1] عام طور پر لوگوں نے اس کی تعبیر "الحیل" کے لفظ سے مشہور کر دی ہے۔ لیکن ائمہ احناف نے شدت سے اس لفظ کا انکار کیا ہے۔ لکھا ہے قال ابوسلیمان کذبوا علی محمد لیس له کتاب الحیل (اتحاف البصائر والابصار خلاصہ اشباہ ص ۲۶۵) جن لوگوں نے مشہور کیا ہے کہ امام محمدؒ نے کتاب الحیل نامی بھی کوئی کتاب لکھی ہے' یہ ان پر افترا ہے' البتہ حضرت شعیب علیہ السلام کی قسم کے قصے میں قرآن نے جو یہ بیان کیا ہے کہ بجائے سو لکڑیوں کے گٹھے سے ایک دفعہ مار دینے کو قسم کی تکمیل کے لیے کافی قرار دیا گیا تھا۔ اسی طرح حضرت یوسف علیہ السلام کے قصہ میں شاہی قانون کی تکمیل کے لیے حضرت یوسف نے اپنے بھائی کو روک لینے کے لیے جو تدبیر قرآن میں جس کے لیے کذلک کدنا لیوسف کے الفاظ استعمال کیے ہیں ان نظائر کو پیش نظر رکھ کر اس کی اجازت دی گئی ہے کہ کسی صحیح مقصد کے حاصل کرنے میں اگر اس قسم کی تدبیروں سے مدد مل سکتی ہو تو مسلمانوں کو للہ

یعنی ایک صحیح مقصد کو حاصل کرنے کے لیے اگر بعض ایسی وسیع لفظی تعبیروں سے کام لیا جائے جس کے چند پہلو ہوں تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ مقابلہ یہاں السفاح جیسے خوں خوار کا تھا جس میں مخالفت کے برداشت کرنے کی تاب نہیں تھی۔ بلا وجہ ان علماء کی گردن اڑا دینے کا حکم دے دیتا' اگر اس لفظی تعبیر سے امام فائدہ نہ اٹھاتے یعنی السفاح نے تو سمجھا کہ وفاداری کا یہ معاہدہ قیامت تک کے لیے کیا گیا ہے' لیکن امام کی غرض یہ تھی کہ اس مجلس سے اٹھنے تک ہم لوگوں کا تم سے یہ معاہدہ ہے' الفاظ میں دونوں کی گنجائش تھی ابوالعباس نے اپنے منشا کے مطابق مطلب لیا اور امام نے اپنے مطلب کے موافق لیا۔

بہر حال امام کی تقریر کے اس فقرے کا جو مطلب بھی ہو زیادہ تر اس واقعہ کے ذکر سے میرا مقصود یہ ہے کہ اس واقعہ کو اگر صحیح مان لیا جائے تو اس کے معنی یہ ہوں گے۔ حجاز سے اپنے وطن کوفہ امام ابوحنیفہ ابوالعباس السفاح کے زمانہ ہی میں واپس آ گئے تھے۔ لیکن امام کے جن سوانح نگاروں نے السفاح کے اس مکالمہ کو نقل کیا ہے مشکل یہ ہے کہ ابالاتفاق ان ہی لوگوں نے یہ روایت بھی نقل کی ہے کہ

قدم ابو حنیفه الكوفة فی زمن أبي جعفر المنصور (ص ۲۴ موفق وغیرہ)	امام ابوحنیفہ کوفہ ابوجعفر منصور کے زمانہ میں آئے (یعنی سفاح کے بعد جو عباسیوں کا جو دوسرا خلیفہ تھا)

جس کا مطلب یہی ہوا کہ السفاح کی حکومت کا پورا زمانہ (چار سال نو مہینے) یہ بھی امام نے کوفہ سے باہر حجاز ہی میں بسر کیے۔ ایسی صورت میں السفاح کے مکالمہ کی مجلس میں امام کے پائے جانے کی کیا صورت ہو سکتی ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہی کہا جا سکتا ہے

لئے اس قسم کی امداد سے محروم نہ کرنا چاہیے۔ لیکن کسی غیر شرعی حرام و باطل مقصد کے لیے قانون سے ناجائز نفع اٹھانا بالاتفاق یہ حرام ہے' الکردری نے لکھا ہے المفتی الذی یعلم الناس الحیل هو الماجن الذی یستحق الحجر علیه فی جمیع المذاهب یعنی شریعت اور قانون کے ساتھ تمسخر کرنے والے مفتی اس قسم کی تدبیریں بتانے والے قرار دیئے گئے ہیں۔ واجب ہے کہ قانوناً اس قسم کے مفتیوں کو فتویٰ دینے سے روک دیا جائے اس پر تمام مذاہب کا اتفاق ہے۔ ۱۲

کہ کوفہ میں مستقل قیام کے لیے تو امام صاحب منصور کے زمانہ میں آئے اور اس سے پہلے ضرور تا آمد و رفت ان کی ہوتی رہتی ہوگی، السفاح جب کوفہ پر آ کر قابض ہوا تو اتفاقاً امام وہاں موجود تھے۔ البتہ امام موفق نے ابو حفص الکبیر البخاری کے حوالہ سے ان کی ایک طویل روایت کا ذکر کرتے ہوئے یہ بیان کرنے کے بعد

> ''امام ابو حنیفہ ابن ہبیرہ کے ظلم سے تنگ آ کر مکہ جب چلے گئے تھے تو ان کا قیام مکہ معظمہ میں اس وقت تک رہا جب تک کہ ظاہر ہوا کہ ہاشمیوں نے حکومت پر قبضہ کر لیا اور اسی کے بعد یعنی ہاشمیوں کے ظہور اور حکمراں ہونے کے بعد امام کوفہ واپس تشریف لائے۔''

لکھا ہے کہ

فارسل اليه ابو جعفر يقمه الى بغداد. (ص ۲۱۶)	پھر ابو جعفر نے امام ابو حنیفہ کے پاس آدمی بھیجا کہ ان کو بغداد لے آئے۔

اگر اس روایت کو سامنے رکھ لیا جائے تو ہو سکتا ہے کہ پہلی روایت میں لوگوں نے بغداد کی جگہ غلطی سے کوفہ کا لفظ استعمال کیا ہو یعنی وہاں بھی یہی سمجھا جائے کہ ابو جعفر منصور نے کوفہ سے بغداد اپنے زمانہ میں امام کو بلایا۔ ورنہ حجاز سے کوفہ امام عباسیوں کی حکومت کے قائم ہونے کے ساتھ ہی آ گئے تھے۔

کچھ بھی ہو امام کی واپسی کوفہ کسی زمانہ میں ہوئی ہو لیکن یہ واقعہ ہے کہ عباسی حکومت سے امام کے تعلقات کی ابتداء ابو جعفر منصور ہی کے زمانہ سے ہوئی ہے۔ السفاح کی حکومت جس کی مدت کل چار سال نو مہینے تھی اس میں بجز مکالمہ کے اس واقعہ کے جس کا ذکر ابھی گذرا مورخین نے امام کے متعلق اس سلسلہ میں اور کسی چیز کا ذکر نہیں کیا ہے۔

میرا ذاتی خیال تو یہی ہے کہ مستقل طور پر السفاح کے زمانہ تک امام کوفہ قیام کرنے کے لیے تشریف نہیں لائے۔ السفاح کے مکالمہ کا واقعہ اگر صحیح ہے اور چونکہ قاضی ابو یوسف اور داؤد طائی جیسے بزرگوں کی طرف اس روایت کو لوگوں نے منسوب کیا ہے اس نے بلاوجہ اس کو مسترد بھی ہم مشکل ہی سے کر سکتے ہیں۔ اس لیے مناسب یہی ہے کہ دونوں روایتوں

میں تطبیق کے لیے یہی کیا جائے کہ السفاح کے زمانہ میں اتفاقاً امام کسی وجہ سے کوفہ آئے ہوئے تھے اور مکالمے کے اس واقعہ کے بعد پھر حجاز تشریف لے گئے صورت حال کا اقتضاء بھی کچھ یہی ہے السفاح کے زمانہ تک سچ پوچھیے تو عباسی حکومت کی جڑیں جیسا کہ چاہیے مضبوط بھی نہیں ہوئی تھی۔ وقتی طور پر السفاح نے انبار کو اپنا مستقر بنالیا تھا' عموماً وہ بیمار رہتا تھا۔ کہہ چکا ہوں کہ حکومت کا پہلا خطبہ جامع کوفہ کے منبر سے اس نے بحالت بخار دیا تھا' پوری تقریر اسی لیے کر بھی نہ سکا اور تھک کر بیٹھ گیا جس کی تکمیل بعد کو اس کے چچا داؤد بن علی نے کی' کچھ عمر بھی السفاح کی زیادہ نہ تھی۔ المسعودی نے تو لکھا ہے کہ

کل (۲۹) سال کی عمر میں اس کا انتقال ہو گیا اور عام مورخین بھی (۳۴) سال سے زیادہ اس کی عمر نہیں بتاتے۔[1]

بس سچ یہی ہے کہ عباسیوں کا پہلا حقیقی خلیفہ ابوجعفر[2] منصور ہی ہے اسی نے چن چن

---

[1] ابوالعباس سفاح بڑا خوش رو حسین وجمیل آدمی تھا۔ ہشام بن عبدالملک کی بیوہ ام سلمہ جو ابوجہل کے بھائی کے خاندان کی لڑکی تھی خلافت سے پہلے سفاح پر فریفتہ ہو گئی اور نکاح کر لیا۔ سفاح نے ساری زندگی بس ایک عورت کے ساتھ گذاری' اسلامی سلاطین میں اس کی مثالیں کم ہیں۔ خلافت کے بعد کچھ دن تو لوگوں سے ملتا جلتا رہا لیکن سال بھی گذرنے نہ پایا کہ بعض ایرانی سلاطین اردشیر کی اتباع کرتے ہوئے پس پردہ رہنے لگا' قوالی تک پردے کے پیچھے سے سنتا وہیں سے داد دیتا۔ قوالوں مغنیوں کو خوب لیتا دیتا تھا اور کھانے کا خاص طور پر جیسا کہ گذر چکا بے حد شوقین تھا سب سے زیادہ بشاش رہنے کا وقت السفاح کے دسترخوان ہی کا وقت تھا۔ انبار ہی میں بے چارے کو چیچک ہوئی اور

روئے گل سیر ندیدیم بہار آخر شد

۱۳۶ھ میں ختم ہو گیا۔ اسی کے بعد ابوجعفر منصور نے عباسی حکومت کی باگ اپنے ہاتھ میں لی اور اسی نے اس حکومت کو دنیا کی مایۂ ناز حکومتوں کی شکل میں بدل دیا۔ جو کسی نہ کسی شکل میں تقریباً پانچ سو سال تک دنیا میں قائم رہی' تاتاریوں کے ہاتھ خاتمہ ہوا اگرچہ عباسیوں کا خیال تھا کہ اپنی قائم کردہ حکومت کا جائزہ وہ قیامت کے قریب حضرت مسیح علیہ السلام ہی کو دیں گے۔ کامل' ابن اثیر وغیرہ میں ان کے اس عجیب وغریب خیال کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ واللہ اعلم

[2] نہ صرف سلاطین اسلام بلکہ دنیا کے بادشاہوں میں ابوجعفر منصور نے ایک خاص امتیازی مقام حاصل کر لیا ہے۔ المسعودی نے لکھا ہے کہ منصور کی ماں جس کا نام سلامہ تھا یہ بیان کرتی تھی کہ

کر اپنی حکومت کی راہ کے ایک ایک کانٹے کو صاف کیا یہی بغداد اور مدینۃ السلام کا بانی ہے حکومت کرنے کا وقت بھی اس کو کافی ملا' ضبط و نظم کے سلسلہ کو اسی نے مستحکم بنیادوں پر تمام ملک میں قائم کیا اور میرے نزدیک ہی کیا بلکہ تمام مورخین کے نزدیک دولت عباسیہ کا معمارِ اول یہی ابوجعفر الدوانیقی ہے اور اسی کے ساتھ امام ابوحنیفہ کی کشمکش دراصل امام کی سیاسی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔ میں جہاں تک خیال کرتا ہوں کوفہ چھوڑ دینے کے بعد کامل امن و امان' نظم و ضبط کے قیام سے پہلے امام نے حجاز سے واپسی کو غیر مناسب خیال کیا ہوگا یہ ممکن ہے جیسا کہ عرض کر چکا ہوں بہ ضرورت وہ کوفہ آتے جاتے رہتے ہوں اور اسی سلسلہ میں سفاح کی مجلس مکالمہ میں شرکت کا موقعہ آپ مل گیا۔ لیکن مستقل قیام کے لیے غالباً ابوجعفر منصور ہی کے حکمراں ہونے کے بعد ہی کوفہ واپس تشریف لائے۔ جس کے یہ معنی ہوں گے کہ ہجرت کے بعد حجاز میں قریب قریب

لہ کہ جب میں منصور سے حاملہ ہوئی تو خواب میں میں نے دیکھا کہ میرے اندر سے شیر نکل پڑا اور جیسے دونوں ہاتھوں پر ٹیک لگا کر شیر بیٹھتا ہے وہ بیٹھ گیا اور دہڑو کے لگانے لگا۔ دم بھی پٹکتا جاتا تھا۔ اتنے میں دیکھا کہ ہر طرف سے نکل نکل کر بہت سے شیر اس کے اردگرد جمع ہو گئے لیکن جوں ہی میرے اندر سے جو شیر نکلا تھا اس کے قریب آتے' سجدے میں گر جاتے۔ سچ پوچھئے تو ابوجعفر منصور کی پوری زندگی کی یہ تصویر ہے۔ لوگوں نے منصور کو بخالت میں بہت بدنام کیا ہے طرح طرح کے لطیفے اس سلسلہ میں مشہور ہیں۔ تاہم اگر یہ صحیح ہے کہ مرنے کے بعد ابوجعفر کے خزانے سے چھ ارب درہم اور ایک کروڑ چالیس لاکھ اشرفیاں برآمد ہوئیں جو دوسرے ساز و سامان کے سوا تھیں' تو ظاہر ہے کہ جزرسی کے بغیر اتنی بڑی دولت خصوصاً کوئی بادشاہ مشکل ہی سے جمع کر سکتا ہے۔ الدوانیقی کا لفظ اس کے نام کے پیچھے اسی بخالت کی وجہ سے یاروں نے اضافہ کیا ہے۔ دوانیق دانق کی جمع ہے مراد جبہ یعنی پیسہ ہے شاید دانہ سے دانق معرب ہوا' اسی سے بس کی جزرسی کا اندازہ کیجئے کہ اس نے شاہی شیخ کے ملازموں کو حکم دیا تھا کہ شاہی مطبخ کے لیے جتنے جانور ذبح ہوتے ہوں ان کی کھالیں اور سری پایہ تم لے لیا کرو اور ان کے معاوضہ میں توابل (یعنی مال' مسالہ' روغن وغیرہ) کا مہیا کرنا یہ تمہارے ذمہ ہوگا۔ المسعودی نے لکھا ہے کہ ابوجعفر کا عمل زیادہ تر اس قول پر تھا کہ سو اونٹ بھی میرے پاس ہوں اور ان میں کوئی اونٹ بیمار ہو جائے تو اس بیمار اونٹ کی نگہداشت میں اس شخص کی طرح کروں گا جس کے پاس اس بیمار اونٹ کے سوا کوئی دوسرا اونٹ نہ ہو' حج کے سفر میں جاتے ہوئے منصور کا انتقال ہو گیا۔

چھ سال امام صاحب نے گذارے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس عرصہ میں امام حجاز میں کیا کرتے رہے یہ تو پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ امام ابوحنیفہ کے استاذ حماد بن ابی سلیمان کی وفات ۱۲۰ھ میں ہوئی اور ان کی وفات کے بعد لوگوں نے امام کو مجبور کیا کہ حماد کی جگہ افتاء اور درس کا کام انجام دیں' تھوڑی ردو کد کے بعد امام نے اس خدمت کو قبول کر لیا۔ لکھا ہے کہ پہلے تو لوگوں نے حماد کے صاحبزادے اسماعیل کو ان کا جانشین بنانا چاہا۔ لیکن بجائے تفقہ کے تجربہ سے ثابت ہوا کہ ان پر شعر اور افسانہ و تاریخ کا ذوق غالب ہے اس لیے ان کو ترک کر کے حماد کے چند دوسرے تلامذہ ابوبکر نھشلی' ابو بردہ محمد بن جابر الجعفی کا نام لیا گیا۔ لیکن بعض بڑے بوڑھوں نے مشورہ دیا کہ:

ان هذا الخزاز حسن المعرفة و ان كان حدثا (ص ۱۷ موفق)	یہ خز کا تاجر اچھا علم رکھتا ہے' اگرچہ نوجوان اور نوعمر ہے۔

لوگوں کا یہ حسن ظن سچا ثابت ہوا اور حماد کی صحیح نمائندگی امام کرنے لگے۔ لیکن امام کی زندگی کا یہ پہلا دور تھا[1] اس دور میں حجاز سے واپسی کے بعد امام کے خدمات کا سلسلہ نئے انداز میں جو شروع ہوا' دونوں میں بڑا فرق تھا۔ مشہور امام فن رجال یحییٰ بن سعید القطان کا یہ تاریخی فقرہ خاص طور پر لائق توجہ ہے یعنی امام ابوحنیفہ کا ذکر کرتے ہوئے وہ کہتے کہ:

كان فى اول امره لم يكن كل ذلك ثم استفحد امره بعد ذلك و عظم (ص ۴۵ ج ۲ موفق)	امام ابوحنیفہ کا یہ حال جو اب دیکھتے ہو پہلے یہ کچھ نہ تھا اس شخص کی گرم بازاری' بعد کو ہوئی اور بات بہت بڑی ہوگئی۔

یہ ایک عینی شہادت ہے اس بات کی کہ امام کے خدمات کا دو مختلف دوروں سے تعلق ہے ابتدائی دور کی زیادہ سے زیادہ حیثیت صرف یہ تھی کہ حماد بن ابی سلیمان کی وفات سے کوفہ میں جو کمی محسوس ہو رہی تھی اس کی کمی کی تلافی حضرت امام کے خدمات سے ہوگئی تھی اور ان ہی خدمات کی شہرت نے ابن ہبیرہ کو آپ کی طرف متوجہ کیا تھا۔ لیکن

---

[1] خود ان الفاظ سے کہ "اگرچہ وہ جوان نوعمر ہے" سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ امام کی زندگی کا یہ ابتدائی زمانہ تھا۔

ابن ہبیرہ کے پنجہ ستم سے آزاد ہونے کے بعد امام جب حجاز پہنچے تو اس میں شک نہیں کہ اصل مقصود تو آپ کا حریم حرم میں پناہ لینا ہی تھا نہ صرف ''البلد الامین'' جس میں پناہ لینے والوں کے امن وامان کی ضمانت قرآن میں لی گئی ہے۔ بلکہ ابن ابی فدیک سے جو یہ قصہ کتابوں میں منقول ہے۔ یعنی وہ کہتے تھے کہ میں نے امام مالک کو دیکھا کہ امام ابوحنیفہ کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے مسجد نبوی کی طرف جا رہے ہیں۔ جوں ہی کہ دونوں حضرات مسجد نبوی کے دروازے پر پہنچے۔ میں نے دیکھا کہ امام ابوحنیفہ ''بسم اللہ'' کے ساتھ ساتھ

هذا موضع الامان. (ص ۴۴ موفق ج ۲) یہ امان کا مقام ہے۔

کہتے ہوئے مسجد کے اندر داخل ہوئے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اپنے محبوب پیغمبر کے دامن اقدس میں امام امان ہی کی نیت سے داخل ہوئے تھے۔ دنیاوی مصائب سے بھی امان اور آخرت کے مصائب سے امان کی جگہ بیت اللہ الحرام کے بعد ان کے نزدیک پیغمبر ﷺ کی یہی مسجد تھی اور سچ تو یہ ہے کہ مومن کے لیے ''پناہ گاہ'' دنیا میں ہو یا آخرت میں اللہ اور اللہ کے رسول کے سوا اور کہاں ہے' بہرحال سوال یہی ہے کہ پناہ گزینی کے سوا چھ سال کی اس طویل مدت میں امام نے حجاز میں کیا کیا؟

حجاز میں امام کے مشاغل:

ظاہر ہے جیسا کہ اس زمانہ کا دستور تھا۔ امام کے لیے حجاز کے علماء اور محدثین کے حلقوں میں شریک ہونے کا یہ مغتنم موقعہ مل گیا تھا۔ کوئی وجہ نہیں ہو سکتی تھی کہ امام اس سنہرے موقعہ سے نفع نہ اٹھاتے بلکہ امام ابوحفص الکبیر البخاری کی طرف اس روایت کا انتساب اگر صحیح ہے یعنی ایک موقعہ پر ان کو ضرورت پیش آئی کہ امام ابوحنیفہ کے مشائخ اور اساتذہ کا شمار کیا جائے تو کہا جاتا ہے

قالوا انهم بلغوا اربعة الاف شيخ (معجم ص ۲۸ ج ۲) امام کے اساتذہ کی تعداد چار ہزار تک پہنچتی ہے۔

اور حافظ ابن حجر کی کتاب ''خیرات الحسان'' کے حوالہ سے صاحب معجم نے اس پر مزید اضافہ کیا لوگوں کا قول یہ بھی ہے کہ

له اربعة الاف شيخ من التابعين فما بالک بغیرھم (معجم ص ۲۸ ج ۲) — یہ چار ہزار اساتذہ تو امام ابو حنیفہ کے تابعین کے طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں (یعنی صحابہ کے دیکھنے والے اور صحابہ کے تلامذہ تھے۔ پھر اسی سے اندازہ کرنا چاہئے کہ تابعین کے علاوہ ان کے اور کتنے استاد ہوں گے۔

لوگوں نے حروف ''ہجا'' کی ترتیب سے امام صاحب کے ان ہزار ہا ہزار اساتذہ کی فہرست بھی دی ہے مطولات میں جس کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔

جس کی علمی جستجو اور تشنگی کا یہ حال ہو اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ حرمین کے اساتذہ سے استفادے میں اس نے کیا کمی کی ہو گی لیکن ظاہر ہے کہ امام اپنی اس ہجرت کے سفر میں حجاز نہ صرف عالم بلکہ معلم ہونے کے بعد گئے تھے' اسی کا نتیجہ تھا کہ نہ صرف عوام بلکہ حرمین کی مرکزی ہستیوں میں امام کا علمی وقار بہت جلد قائم ہو گیا۔ امام کا جو مقام تھا وہ پہچان لیا گیا۔ انتہا یہ ہے کہ حجاز کے ایسے اساتذہ جن کے استاذ بنانے پر امام کو بھی ناز تھا مثلاً عطا ابن ابی رباح[1] جن کا امام جب نام لیتے تو کہتے کہ

ما لقيت افضل من عطاء (معجم ص ۳۹ ج ۲) — عطاء بن رباح سے بہتر آدمی سے میری ملاقات نہ ہوئی۔

کبھی یہ بھی فرماتے کہ

ما رائت اجمع لجميع العلوم من عطاء بن ابی رباح (ص ۸۸ موفق) — سارے علوم (جو اس زمانے میں علوم سمجھے جاتے تھے) ان کی جامعیت جیسی عطاء میں میں نے پائی کسی میں نہیں پائی۔

---

[1] حضرت عمر یا حضرت عثمان کے عہد میں پیدا ہوئے۔ حضرت عائشہ ابو ہریرہ' ابن عباس وغیرہم صحابہ کرام کے تلمذ سے سرفراز ہیں۔ مفتی اہل مکہ و محدثہم ان کا خطاب ہے' حبشی تھے مگر عربی فصیح بولتے تھے' ابن جریج ان کے شاگرد کا بیان ہے کہ بیس سال تک مسجد کا فرش ان کا فرش تھا' علم و فضل کا اندازہ اسی سے ہو سکتا ہے کہ صحابہ کرام مثلاً ابن عباس سے کوئی مکی مسئلہ پوچھتا تو کہتے کہ میرے پاس کیوں آئے ہو کیا تمہارے ہاں عطاء نہیں ہیں؟ ابن عمر بھی یہی کہتے کہ میرے پاس کیوں آئے ہو کیا عطاء تمہارے لیے کافی نہیں؟ کبار تابعین میں ان کا شمار ہے۔ مستحق ہیں کہ ان کی مستقل سوانح عمری لکھی جائے۔

ان کا بھی حال یہ تھا جیسا کہ ان کے شاگرد حارث بن عبدالرحمٰن ناقل ہیں کہ

کنا نکون عند عطاء بن ابی رباح بعضا خلف بعض فاذا جاء ابو حنیفة او سع له وادناه (ص ۶۷ ج ۲ موفق)

ہم لوگ جب عطاء بن ابی رباح کے پاس بعض بعض کے پیچھے بیٹھے ہوتے پھر جب ابوحنیفہ آ جاتے، تو عطاء مجلس والوں کو پھیل جانے کا حکم دیتے اور ابوحنیفہ کو اپنے قریب بلا کر بٹھاتے۔

اسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ استفادے کے ساتھ حجاز میں بھی لوگوں نے امام کو افادہ مجلس کے قائم کرنے پر مجبور کر دیا۔ وزیر بن عبداللہ کا بیان ہے کہ

سمعت یاسین الزیات بمکة وعنده جماعة عظیمة وهو یصیح باعلی صوته ویقول یاایها الناس اختلفوا الی ابی حنیفة واغتنموا مجالسة وخذوا من علمه فانکم لم تجالسوا مثله ولن تجدوا اعلم بالحلال والحرام منه فانکم ان فقد تموه فقدتم علماً کثیرا. (موفق ص ۳۸)

میں نے مکہ معظمہ میں یٰسین زیات کو دیکھا کہ سامنے ایک بڑی جماعت ہے اور وہ چلا چلا کر کہہ رہے ہیں کہ لوگو! ابوحنیفہ کے پاس آیا جایا کرو (یعنی ان کے حلقہ میں جا کر بیٹھو) اور ان کے ساتھ بیٹھنے کو غنیمت شمار کرو، ان کے علم سے فائدہ اٹھاؤ، کیونکہ ایسا آدمی پھر بیٹھنے کے لیے نہیں ملے گا اور حلال و حرام کے ایسے عالم کو پھر نہ پاؤ گے، اگر اس شخص کو تم نے کھو دیا تو علم کی بہت بڑی مقدار کو کھو بیٹھو گے۔

اسلام کے اس سب سے بڑے مرکز میں جہاں مشرق و مغرب شمال و جنوب کے مسلمان جمع ہوتے ہوں ایک ممتاز و مشہور[1] عالم و محدث کی طرف سے اس قسم کے اعلان کا

---

[1] یٰسین الزیات، الزہری کے تلامذہ میں شمار کئے جاتے ہیں۔ اگرچہ پایہ ان کا اتنا بلند نہ تھا، لیکن مشرب محدثانہ ہی رکھتے تھے۔ ان کا پہلے قول تھا کہ اصحاب الرائے سنت کے دشمن ہیں لیکن امام ابوحنیفہ کی باتیں سن کر اتنے مسحور ہوئے کہ کہنے لگے کہ امام ابوحنیفہ کی رائے تو سنت سے ماخوذ ہے۔ (ص ۴۶ ج ۲ موفق) اسی کے بعد امام کے معتقد ہو کر حرم میں یہ اعلان کرنے لگے۔ ۱۲

جو اثر مرتب ہو سکتا تھا ظاہر ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ امام پر مکہ میں دنیا ٹوٹ پڑی عمار بن محمد کے حوالہ سے امام الموفق نے ان کی یہ روایت نقل کی ہے

كان ابو حنيفة جالسا في المسجد الحرام وعليه ذحام كثير من كل الآفاق قد اجتمعوا عليه من كل جانب فيجبهم ويفتيهم (ص ۱۲۰)	ابو حنیفہ حرم کعبہ کی مسجد میں بیٹھے ہوئے تھے اور ان پر خلقت کا ہجوم تھا ہر علاقے اور آفاق کے لوگ جن میں ہوتے تھے، سب کو جواب دیتے اور فتوے بتاتے۔

جوں جوں امام کے تبحر و احاطہ تفقہ کے تجربہ کا ذکر حجاز میں پھیلتا جاتا تھا، لوگوں کی توجہ بھی بڑھتی چلی گئی حتی کہ آخر میں نہ صرف عوام بلکہ ابن مبارک نے مکہ معظمہ میں اس تماشے کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا، جسے ان الفاظ میں وہ خود بیان کرتے تھے کہ

رأيت اباحنيفة جالسا في المسجد الحرام ويفتي اهل المشرق والمغرب ص ۵۷ ج ۲ مو)	میں نے حرم کعبہ کی مسجد میں ابوحنیفہ کو دیکھا کہ بیٹھے ہوئے ہیں اور مشرق و مغرب کے باشندوں کو فتوے دے رہے ہیں۔

ابن المبارک نے اس کے بعد یہ ظاہر کرتے ہوئے کہ امام کی اس مجلس میں کس قسم کے لوگ شریک رہتے تھے۔ آخر میں یہ اضافہ بھی کرتے تھے۔

والناس يومئذ ناس (ص ۵۷ ج ۲ موفق)	اور یہ زمانہ تھا جب لوگ لوگ تھے۔

الموفق نے ابن المبارک کے ان الفاظ کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ

يعني الفقهاء الكبار و خيار الناس حضور.	بڑے بڑے فقہاء اور چیدہ برگزیدہ نفوس ابوحنیفہ کی اس مجلس میں موجود رہتے تھے۔

گویا خدا کی طرف کی بات تھی کہ امام ابوحنیفہ جن کے استفادے اور افادے کا دائرہ صرف کوفہ یا زیادہ سے زیادہ کوفہ کے قرین بصرہ تک محدود تھا اچانک ابن ہبیرہ کے پیدا کئے ہوئے ایک ''شر'' سے اس ''خیر'' سے متمتع ہونے کا موقعہ ان کو مل گیا جو حجاز کے سوا انھیں اور کسی جگہ میسر نہیں آ سکتا تھا۔

اس میں شک نہیں کہ امام حج کے لیے بکثرت حجاز آتے جاتے رہتے تھے لیکن سالہا سال تک مستقل قیام کا موقعہ ان کو حجاز میں یقیناً ابن ہبیرہ کے ظلم ہی کی بدولت میسر آیا اسلام کے مختلف علاقوں کے مسلمانوں کی ضروریات ان کے ہاں کے مقامی خصوصیات کا علم جہاں تک میں سمجھتا ہوں ان معلومات سے جو غیر معمولی فائدہ امام کو پہنچا اس کا اندازہ وہی کرسکتا ہے جس نے حنفی فقہ کی جامعیت اور احتوایت کو پیش نظر رکھ کر اس کا مطالعہ کیا ہے۔

حجاز میں مختلف علماء سے مکالمہ ومناظرہ:

یہی نہیں بلکہ جہاں تک واقعات سے پتہ چلتا ہے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اسی زمانہ میں مختلف ممالک واقطار کے اہل علم واجتہاد کے نقاطِ نظر اور ان کی حد پرواز کے اندازہ کرنے کا بھی براہِ راست موقعہ مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ ہی میں ان کو ملا حجازی فقہاو ائمہ تو خیر حجاز ہی میں رہتے تھے اور دوسرے ممالک کے علماء ومجتہدین حج کے لیے یہاں آتے تھے۔ قیام کی مدت چونکہ کافی تھی، اس لیے اس زمانہ کے اکثر اہل علم سے امام کی ملاقات ہوئی اور جیسا کہ قاعدہ ہے اہل علم کی اہل علم سے ملاقات صرف خشک ملاقات نہیں ہوتی' امام کی ملاقاتیں بھی صرف رسمی اور خشک نہیں تھیں مکہ معظمہ کے مشہور امام ابن جریج[1] کے متعلق الموفق نے لکھا ہے:

بینه و بین ابی حنیفة ان میں اور ابو حنیفہ میں مناظرے ہوتے رہے۔ مناظرات (ص ۸۷ ج ۱)

ان مناظرات کا امام کے سوانح نگاروں نے تذکرہ بھی کیا ہے۔ تفصیل کے لیے مطولات کا مطالعہ کیجئے اور جس طرح مکہ کے اس امام بلا مدافع سے امام کے متعدد مناظرے نقل کیے جاتے ہیں اسی طرح امام طحاوی کی سند سے موفق نے امام مالک کے

---

[1] ان کا نام عبدالعزیز تھا والد کا نام عبدالملک تھا، موالی (آزاد کردہ غلاموں سے تعلق تھا) لکھا ہے کہ وہ رومی تھے یعنی یورپ کے کسی علاقہ کے تھے، جریج شاید جارج کے لفظ ہی کی کوئی صورت ہے، ابن جریج پہلی صدی ہجری کے ان علماء میں ہیں جن کے ہاتھوں نے علم وحدیث وفقہ قراۃ تفسیر کی بنیاد قائم کی۔۱۲

متعلق یہ روایت نقل کی ہے کہ ابن وراوردی کہتے تھے۔

رئت مالکاً وابا حنیفة فی مسجد رسول الله صلی الله علیه وسلم بعد صلوة العشاء الاخرة وهما یتذکران ویلد ارسان.

میں نے مالک اور ابوحنیفہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مسجد مبارک میں دیکھا کہ عشاء کی نماز کے بعد دونوں باہمی علمی مذاکروں میں اور مباحثوں میں مصروف ہیں۔

اور ''مذاکرہ ومدارسہ'' کا یہ سلسلہ جو عشاء کی نماز کے بعد شروع ہوتا تھا، کب تک جاری رہتا تھا ابن الدراوردی ہی کا بیان ہے کہ

فلم یزالا کذلک حتی صلیا الغداة فی مجلسهما ذلک. (ص ۱۶۴ ج ۲)

یہ سلسلہ (مناظرے ومباحثے کا) مسلسل جاری رہتا تا ایں کہ صبح کی نماز بھی وہیں پر ادا کرتے جہاں پر عشاء کی نماز کے بعد دونوں بیٹھ کر بحث ومباحثہ میں مشغول ہوتے۔[۱]

اسی سے اندازہ کیجئے کہ جب مکہ کے امام ابن جریج اور دارالہجرت کے امام مالک سے امام کے مناظروں کا یہ حال تھا۔ تو حجاز کے دوسرے علما کے ساتھ امام کے مباحثوں کی نوعیت کیا ہوگی، اس روایت کے راوی اگرچہ واقدی ہیں لیکن تاریخی روایات میں بھی اگر واقدی بے چارے پر لوگ اعتماد نہ کریں گے تو پھر تاریخ کا کتنا حصہ قابل اعتماد باقی رہے گا۔ بہرحال واقدی امام مالک کی زبانی یہ فقرہ نقل کیا کرتے تھے یعنی امام مالکؒ واقدی سے براہ راست ایک دن امام ابوحنیفہؒ کے ذکر پر فرمانے لگے:

---

۱ مالکی مذہب کے مشہور مورخ قاضی عیاض جن کی طبقات مالکیہ میں سب سے پہلی اور بڑی معتبر کتاب ''مدارک'' ہے اس سے یہ واقعہ نقل کیا گیا ہے کہ امام مالک اور ابوحنیفہ میں مناظرے اور مباحثے جو ہوتے تھے تو مصر کے امام لیث بن سعد کا بیان ہے کہ ایک دفعہ میں نے امام مالک کو پسینے سے شرابور دیکھا جب مجلس سے اٹھے میں نے کہا کہ آپ تو پسینے پسینے ہو رہے ہیں امام مالک نے یہ سن کر کہا کہ انہ فقیہ یا مصری (یعنی امام ابوحنیفہ فقیہ آدمی ہے اے مصری) بلوغ الامانی ص ۱۱۸ اس سے ان مباحث کی گہرائیوں کا اندازہ ہوتا ہے۔

رائته يكلم فقيها من فقهائنا حتى رده الى رای نفسه ثلاث مرات وقال هذا ايضا خطاء. (ص ۱۱۳)	میں نے ابوحنیفہ سے اپنے یہاں کے فقہاء (یعنی حجازی فقہاء میں سے) ایک فقیہ کو بحث کرتے ہوئے دیکھا کہ تین دفعہ حجازی فقیہ کو۔ابوحنیفہ نے اپنی رائے کے ماننے پر مجبور کیا اور اخیر میں تیسری رائے جس کے ماننے پر اس کو مجبور کیا تھا' ابوحنیفہ نے ثابت کر دیا کہ یہ بھی درست نہیں ہے۔

اگر واقدی کی یہ روایت صحیح ہے تو اس سے اس کا بھی پتہ چلتا ہے کہ ان مناظروں سے امام ان لوگوں کی حد پرواز کا بھی اندازہ کرنا چاہتے تھے جو مسلمانوں میں شرعی دینے کا کام کیا کرتے تھے۔امام مالک کی طرف ابوحنیفہ کے متعلق یہ فقرہ جو منسوب کیا گیا ہے کہ مسجد کے اس ستون کے متعلق ابوحنیفہ اگر دعویٰ کر لیں کہ وہ سونے کا ہے تو اس کو بھی وہ ثابت کر کے رہیں گے شائد ان ہی مشاہدات نے ان میں اس اعتقاد کو پیدا کیا تھا اور جو خیال حجاز کے علما کا تھا حجاز کے سوا دوسرے اسلامی ممالک کے علماء سے بھی ہم امام کو علمی مباحث میں مشغول پاتے ہیں شام کے مشہور امام فقہ و حدیث امام اوزاعی کے متعلق ابن مبارک کا بیان ہے۔

التقى ابوحنيفة والاوزاعی بمكة وكان بينهما اجتماع فرئته يجاری ابا حنيفة (ص ۲۷ ج ۲)	مکہ معظمہ میں امام ابوحنیفہ کی ملاقات اوزاعی (شام کے امام) سے ہوئی دونوں جب اکٹھے ہوئے تو میں نے دیکھا کہ اوزاعی ابوحنیفہ سے بحث و مباحثہ کر رہے ہیں۔

امام اوزاعی اور امام ابوحنیفہ کے بعض باہمی مناظروں کا کتابوں میں لوگوں نے تفصیلی ذکر بھی کیا ہے ابن مبارک ہی یہ بھی کہتے تھے کہ اوزاعی کا خیال امام کے متعلق پہلے کچھ اچھا نہ تھا لیکن اس ملاقات کے بعد جب اوزاعی سے میں ملا' تو کہتے تھے کہ

"مجھے تو اس شخص کے علم اور عقل پر رشک سا ہوا' میں خدا سے اپنی غلط فہمی کی معافی چاہتا ہوں میں فاش غلطی میں مبتلا تھا بلاوجہ اس شخص کو الزام دیتا تھا'

واقعہ یہ ہے جو باتیں ان کی مجھ تک پہنچائی گئی تھیں میں نے ان کو اس کے برعکس پایا۔" (ص ۲۸ ج ۱)

اسی طرح مصر کے اس زمانہ میں جو امام الائمہ تھے یعنی لیث بن سعد نے خاص کر کے ان سے ملنے کے لیے سفر حج کیا لیث کا بیان ہے کہ

"میں نے دیکھا کہ لوگ ان کو گھیرے ہوئے ہیں۔"

مختلف سوال و جواب کا سلسلہ جاری تھا لیث کہتے ہیں کہ ایک مشکل سوال اس سلسلہ میں پیش کیا گیا۔ امام نے اتنی آسانی کے ساتھ بہترین جواب اس کا دیا کہ میں حیران ہو کر رہ گیا ان کے الفاظ ہیں:

فواللہ ما اعجبنی صوابه کما اعجبنی سرعه جوابه. (ص ۱۶۳) مجھے ان کے صحیح جواب پر اتنی حیرت نہیں ہوئی، جتنا تعجب ان کی زود جوابی پر تعجب ہوا۔

ان سے یہ بھی مروی ہے کہ میں نے امام سے مختلف ابواب مثلاً جنایات قتل خطا، شبہ عمد کے متعلق سوالات کیے۔[1] اس سلسلہ میں لوگوں نے واقعات ایک ذخیرہ جمع کر دیا ہے

---

[1] اس موقعہ پر کہتے ہیں کہ امام کی زبان سے وہ مشہور فقرہ نکل گیا تھا جس میں ان کی عربیت پر اعتراض کیا گیا ہے یعنی قتل عمد کے لیے امام کے نزدیک آلۂ جارحہ کا ہونا ضروری تھا اسی کو سمجھاتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ غیر جارحہ آلہ سے کوئی کسی کو اگر مار ڈالے خواہ سر ماہ بابا قبیس یعنی ابوقبیس پہاڑی اٹھا کر کیوں نہ مار دے جب بھی قانوناً وہ قتل عمد نہ ہوگا' جو عربی زبان کی ابتدائی واقفیت بھی رکھتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ بجائے بابا قبیس کے بابی قبیس کہنا چاہیے تھا لیث نے اس قصہ کو جب بیان کیا تو امام کے حاسدوں کو موقعہ مل گیا اور ایک سرے سے دوسرے سرے تک اسلامی ممالک میں اس کو پھیلا دیا گیا۔ حتیٰ کہ آج تک کتابوں میں لوگ اس کا ذکر کرتے چلے آرہے ہیں حالانکہ اس قسم کی غلطی جو سبقت لسانی کی غلطی ہوئی ہے بڑے بڑے آدمی سے ہو سکتی ہے۔ امام موفق نے سچ لکھا ہے کہ اس واقعہ کا تذکرہ اور چرچا خود اس بات کی دلیل ہے کہ لوگوں کو اس ایک غلطی کے سوا امام کے کلام میں کوئی غلطی نہیں ملی یقیناً یہ قدح بلکہ ابوحنیفہ کی مدح ہے بعض لوگوں نے اس کی تصحیح کی بھی کوشش کی ہے کہتے ہیں کہ حضرت علیؓ نے بھی دستخط کرتے ہوئے لکھا تھا شہد علی بن ابوطالب ہمارے دوست ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کو جو کتبہ خندق کے سلسلہ میں ملا ہے یہ عجیب بات ہے کہ اس میں بھی علی بن ابوطالب ہی لکھا ہوا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا خیال ہے کہ یہ تحریر ۵ ہجری کے قریب قریب کی ہے۔ ۱۲

میری غرض ان مثالوں کے پیش کرنے سے یہ ہے کہ امام کو دوسرے تجربات کے ساتھ ساتھ حرمین کی اس طویل زندگی میں اس بات کا اندازہ کرنے کا بھی موقعہ ملا کہ حجاز میں ہو یا حجاز کے باہر شریعت اسلامی پر کام کرنے والے جس طرح کام کر رہے ہیں یہ کام نہ صرف نا کافی ہے بلکہ مختلف وجوہ سے اسلام اور مسلمانوں کے لیے مضرت رساں بھی ہے امام کے اقوال لوگوں نے جو جمع کئے ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس راہ میں ان کو بڑی شکایت ان محدثین سے تھی جو اپنا فرض صرف

نحن نردی کما سمعنا. ہم تو جیسا سنتے ہیں' اسی کو روایت کر دیتے ہیں۔

قرار دیتے تھے یعنی گرد و پیش کے حالات اور یہ کہ ان حدیثوں میں مقدم کون ہے' مؤخر کون ہے، کس وقت کے لیے آنحضرت ﷺ نے کیا حکم دیا تھا الغرض ناسخ و منسوخ اور اسی قسم کے دوسرے اہم مباحث سے بے تعلق ہو کر بڑے بڑے حلقے قائم کر کے لوگوں کو حدیثیں سنایا کرتے تھے امام سے مروی ہے کہ ان کے اس حال کا تذکرہ کرتے ہوئے فرماتے

فویح لھم ما اقل اھتمامھم بامر عاقبتھم حیث یتصبون للناس فیحدثونھم (ص ۹۹ ج ۱ مو)

افسوس ہے کہ ان لوگوں پر اپنے انجام کی ان لوگوں میں بہت کم اہمیت پائی جاتی ہے کہ عوام کے سامنے کھڑے ہو جاتے ہیں (اور بے سوچے سمجھے) حدیثیں بیان کرنا شروع کر دیتے ہیں۔

ہراۃ کے عالم ابو رجاء جن کا شمار امام کے تلامذہ میں ہے اور ان ہی سے تعلق مشہور ہے کہ امام کی میت کو غسل دیتے ہوئے پانی بھی ڈال رہے تھے۔ وہی کہا کرتے تھے کہ امام ابوحنیفہ عموماً فرماتے کہ

''حدیث کو تفقہ کے بغیر جو حاصل کر رہے ہیں' ان کی مثال اس عطار کی ہے جو صرف دوائیں جمع کرتا ہے' لیکن کس مرض میں کون سی دوا کام آتی ہے، اس سے ناواقف ہے۔'' (ص ۹۱ ج ۲)

ایک صاحب جن کا نام محمد تھا، اور حدیث کے طلب کا ذوق ان پر غالب تھا۔ امام

صاحب نے ایک حدیث کا مطلب ان سے پوچھا جسے صحیح طور پر نہ بتا سکے امام نے صحیح مطلب کو بیان کرنے کے بعد ان کو سمجھانا شروع کیا:

محمد! جو لوگ صرف حدیث کی طلب میں مشغول ہیں، لیکن اس کی تفسیر اور حدیث کا جو مطلب ہے اس کی تلاش سے لاپروائی اختیار کرتے ہیں تو یقین کرو کہ اپنی کوشش کو وہ ضائع کر رہے ہیں۔

آخر میں تو یہاں تک اپنی رائے کی شدت کو ظاہر کرتے ہوئے فرمایا کہ

وصار ذلک العلم وبالاً علیه. (ص ۱۶۱ ج ۲) اور یہ علم ان کے لیے وبال جان بن جاتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ امام ابوحنیفہ صرف حدیثوں کے جمع کر لینے کو چنداں اہمیت نہیں دیتے تھے اور واقعہ بھی یہی ہے کہ آثار و احادیث کا وہ ذخیرہ جس کا تعلق مسلمانوں کے روزمرہ کے اعمال و افعال عبادات و معاملات سے ہے اس کی حیثیت خصوصاً جس زمانہ میں امام ابوحنیفہ تھے۔ قریب قریب ان اخباری خبروں کی تھی جن کا تعلق اس زمانہ کے کسی اہم حادثہ یا وقت کے کسی خصوصی مسئلہ سے ہوتا ہے تقریباً ہر اخبار میں ان خبروں سے جیسے عموماً لوگ واقف رہتے ہیں کچھ یہی حال حدیث و آثار کے اس ذخیرے کا تھا کہ خواص تو خواص عوام میں دین داروں کا جو طبقہ تھا مشکل ہی کوئی ایسی چیز اس سلسلہ کی ہوگی جس سے وہ واقف نہ ہوتے تھے اس قسم کی باتوں کے باور کرنے والے یا کرانے والے کے امام ابوحنیفہ کی رسائی حدیث کے اس عام ذخیرہ تک بھی نہ تھی وہی لوگ ہو سکتے ہیں جو گرد و پیش کے حالات سے بے تعلق ہو کر چیزوں کو سوچا کرتے ہیں۔ بہر حال یہ ایک دلچسپ مسئلہ ہے جس کی تفصیل ان شاء اللہ تدوین فقہ والی کتاب میں کی جائے گی۔ سردست مجھے تو یہ کہنا ہے کہ حدیثوں سے زیادہ ان حدیثوں کی تاریخ کو وہ اہمیت دیتے تھے۔ یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی طرف جو قول و فعل منسوب کیا گیا ہے اس کے متعلق یہ پتہ چلانا چاہیے کہ کس زمانہ میں کس وقت کن لوگوں میں کن حالات میں آنحضرت صلی اللہ علیہ والہ وسلم نے یہ بات کہی تھی یا اس فعل کو کیا تھا' بتانے والوں نے

امام کی جو یہ خاص عادت بتائی ہے کہ:

كان شديد الفحص عن الناسخ من الحديث والمنسوخ (ص ۹۰ ج ۱ مو) حدیثوں میں ناسخ ومنسوخ کی تلاش میں ابوحنیفہ سخت سرگرداں رہتے تھے۔

دراصل اس کا یہی مطلب ہے۔ امام کا خیال تھا کہ جن لوگوں نے تاریخی ترتیب سے آثار واحادیث کا مطالعہ نہیں کیا ہے وہ اسلامی شریعت کی صحیح ترتیب وتدوین پر بھی قادر نہیں ہو سکتے۔

مشہور محدث وفقیہ یحیٰی بن آدم سے لوگوں نے جو یہ نقل کیا ہے کہ امام ابوحنیفہ کی خصوصیتوں کا تذکرہ کرتے ہوئے ان کی بڑی خصوصیت اسی تاریخی ترتیب کی جستجو وہ قرار دیتے تھے اور کہتے کہ:

> آخری بات جس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی، امام ابوحنیفہ کی نظر اسی پر رہتی تھی اور اسی کو وہ اختیار کرتے تھے۔ (ص ۹۳ ج ۱ موفق)

وقوع سے پہلے شرعی حکم:

ایک اور خیال جس کے متعلق میں سمجھتا ہوں کہ حجاز کے تجربات نے ان کو امام میں اور پختہ کر دیا وہ یہ تھا کہ اس زمانہ تک لوگوں کا عام دستور یہ تھا کہ واقعہ کے واقع ہو جانے اور اس کے متعلق پوچھنے والوں کے پوچھنے کے بعد یہ سوچا کرتے تھے کہ شریعت کے رو سے اس کا حکم کیا ہونا چاہئے۔ فتویٰ دینے والوں کا بھی یہی حال تھا اور حکومت جن لوگوں کو قضا کے عہدے پر مقرر کرتی وہ یہی کیا کرتے کوئی مدون قانون جو قرآن و حدیث آثار صحابہ وغیرہ کو پیش نظر رکھ کر مرتب کیا گیا ہو۔ لوگوں کے پاس نہیں تھا۔ نتیجہ اس کا یہ ہوتا تھا کہ عین وقت پر سوچنے کی وجہ سے اطمینان سے مسئلہ کے تمام پہلوؤں پر غور وفکر کا لوگوں کو موقعہ نہیں ملتا تھا بسا اوقات اس کی وجہ سے اچھے اچھوں سے لغزشیں ہو جاتیں مشہور ہے کہ بصرہ کے مشہور امام قتادہ امام ابوحنیفہ کے ابتدائی زمانہ میں کوفہ آئے ان کے علم کی شہرت سن کر اوروں کی طرح وہ امام ابوحنیفہ کے پاس بھی آئے۔ باتوں

بات میں ایک مسئلہ کا ذکر چھڑا۔ امام ابوحنیفہ نے مسئلہ کی دقتوں کو قتادہ پر واضح کیا۔ بجائے اس بات کے قتادہ دشواری کو حل کرتے امام سے پوچھنے لگے کہ بھائی! آیا ایسی صورت کوئی پیش بھی آئی یا یوں ہی ایک فرضی بات پوچھ رہے ہو امام صاحب نے کہا کہ نہیں ابھی پیش تو نہیں آئی ہے یہ سن کر قتادہ نے کہا کہ

''مجھ سے ایسی باتیں نہ پوچھا کرو جو ابھی واقع نہیں نہیں ہوئی ہیں۔''

اس موقعہ پر امام نے اپنے جس خیال کو ظاہر کیا تھا اس سے بھی ان کے فطری رجحان کا اور اس بات کا کہ یہ خیال ایک زمانے سے ان کے دماغ میں گردش کر رہا تھا۔ آپ نے قتادہ سے فرمایا:

علم والوں کو چاہئے کہ جن باتوں میں لوگوں کو مبتلا ہونے کا امکان ہے ان کے حل کے لیے وہ پہلے سے آمادہ ہو جائیں واقع ہونے سے پہلے ان سے بچنے کی جو صورتیں ہیں ان کو سوچ لینا چاہیے اور خدانخواستہ اگر واقع ہی ہو جائے تو اس وقت کوئی ایسی چیز نہ ہونا چاہئے جس سے لوگ پہلے سے واقف نہ ہوں بلکہ معلوم ہونا چاہیے کہ ان امور میں کسی کو مبتلا ہی ہونا پڑے تو شرعاً ابتلا کے وقت کیا کرنا چاہیے۔ اور مبتلا ہونے کے بعد شریعت نے اس سے خلاصی کی کیا صورت بتائی ہے۔ (ص ۱۶۰ ج ۱ مو)

قتادہ کی وفات چونکہ ۱۱۸ھ یا ۱۱۷ھ میں ہوئی اس لیے ہمیں یہ تسلیم کر لینا چاہیے کہ امام نے ان کے سامنے اپنے اس خیال کو اس زمانہ میں ظاہر کیا تھا جب حماد بن ابی سلیمان کے حلقہ میں وہ ابھی طالب علمی ہی کر رہے تھے اور اسی سے ان کے جبلی رجحان کا پتہ چلتا ہے سچ پوچھیے تو یہی دو باتیں یعنی ایک تو احادیث و آثار کی تاریخی جستجو کی اہمیت اور دوسری یہی چیز یعنی اچانک مسئلہ کے پیش آ جانے کی صورت میں نہیں بلکہ وقوع سے پہلے انسانی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو سوچنا اور ہر پہلو کے لحاظ سے ممکنہ پیش آنے والے واقعات کے متعلق وقوع سے پہلے کا بلکہ آئندہ ہر زمانہ کے لیے مسلمانوں کا ان کو امام بنا دیا۔ قیس بن ربیع جن کا شمار حفاظ حدیث میں ہے۔ الذہبی نے اپنے تذکرۃ الحفاظ میں

ان کو بھی جگہ دی ہے۔[1] امام ابوحنیفہ کے متعلق ان سے جب پوچھا جاتا کہ ان کی خصوصیت کیا ہے تو جواب میں یہی کہتے۔

اعلم الناس بما لم یکن — جو حوادث ابھی وقوع پذیر نہیں ہوئے ہیں، ان کے متعلقہ احکام کے وہ سب سے بڑے عالم تھے۔ (ص ۴۰ ج ۱ مو)

جہاں تک میرا خیال ہے ان دونوں ضرورتوں کا احساس تو امام میں ابتداء ہی سے تھا لیکن حجاز میں مختلف اقالیم اور علاقوں کے اہل علم اور عام مسلمانوں کے ساتھ میل جول نے اس احساس کو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تیز سے تیز تر کر دیا۔

کوفہ کی واپسی اور مجلس وضع قوانین کی تاسیس

اور شاید احساس کس اسی شدت کا نتیجہ تھا کہ بنی امیہ کی حکومت کے اختتام کے بعد حضرت امام جب مستقل قیام کے لیے پھر دوبارہ کوفہ واپس لوٹے تو ہم ان کو ایک جدید مشغلے میں مصروف پاتے ہیں، ایسا مشغلہ جس کی نظیر اسلام تو اسلام شائد غیر اسلامی تاریخوں میں بھی مشکل ہی سے مل سکتی ہے، اور سچ پوچھئے تو اسی چیز نے امام کی زندگی کے پچھلے دور کو جیسا کہ یحییٰ بن سعید القطان کے حوالہ سے نقل کر چکا ہوں پہلے دور سے ممتاز کر دیا۔ پہلے دور میں امام کے کام کی نوعیت قریب قریب وہی تھی جو دوسرے کر رہے تھے لیکن حجازی تجربات کے بعد جس نظام کو کوفہ میں آ کر انھوں نے قائم کیا سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ یہ خیال ان کے دماغ میں کہاں سے پیدا ہوا۔ بجز اس کے اس کو ایک ''لاہوتی الہام'' کا نتیجہ سمجھا جائے۔ کم از کم میرے نزدیک تو اس کی کوئی دوسری معقول توجیہ آسان نہیں ہے میرا اشارہ اس مشہور مجلس شوریٰ کی طرف ہے جسے امام نے جہاں تک میرے تتبع و تلاش کا

---

[1] ابن سعد نے تو لکھا ہے کہ لوگ ان کو ''قیس الجوال'' کہتے تھے لکثرۃ سماعہ و علمہ یعنی حدیث وہ آثار کی تلاش و جستجو میں اتنے گھومے اور پھرے تھے کہ لوگوں نے جوال (گردش کرنے والا) ان کا نام ہی رکھ دیا تھا۔ الذہبی نے لکھا ہے کہ انھوں نے حکومت کی ملازمت کر لی تھی اور مجرموں کو سزا دینے میں حد سے زیادہ سخت تھے۔ انتہا سختی کی یہ تھی کہ عورتوں کو چھاتیوں کے ساتھ لٹکا دیتے تھے اور مجرموں کو بھڑوں سے کٹواتے تھے ان کے اسی قسم کے طرز عمل سے لوگ ان کے شاکی تھے۔۱۲

نتیجہ ہے عباسیوں کے دور میں بمقام کوفہ کتاب وسنت کی روشنی میں وضع قوانین کے لیے قائم کیا امام کی اس ''مجلس شوریٰ'' کا ذکر مجھ سے پیشتر اردو زبان کے مصنفین امام ابوحنیفہ کی سوانح عمریوں میں کر چکے ہیں تھوڑے بہت حالات جن کی اس کتاب کے موضوع کے لحاظ سے ضرورت ہے میں یہاں بھی ذکر کروں گا لیکن قبل اس کے کہ اس مجلس کے خصوصیات کا ذکر کیا جائے چند چیزوں کا ذکر اگر پہلے ہی کر دیا جائے تو مناسب ہے۔

مطلب یہ ہے کہ مقصد تو اس مجلس کے قائم کرنے سے جیسا کہ عرض کر چکا ہوں یہی تھا کہ آنحضرت ﷺ کی طرف منسوب کر کر کے محدثین جن باتوں کی اشاعت مسلمانوں میں کر رہے تھے۔ ان میں تاریخی ترتیب قائم کر کے مسلمانوں کو عمل کے لیے آخری فیصلہ کی صورت میں مسئلہ کو متعین کر دیا جائے۔ یہ تو پہلا مقصد تھا اور دوسری بات وہی تھی کہ حوادث ونوازل جو ابھی پیش نہیں آئے ہیں۔ ان کے متعلق عین وقت پر کتاب وسنت سے حکم پیدا کرنے کے بجائے ممکنہ حد تک پہلے ہی سوچ سمجھ کر تمام حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے احکام لگائے جائیں۔

واقعہ یہ ہے کہ عمومی طور پر اس پیمانے پر تو نہیں جو امام کی مجلس کے کام کا پیمانہ تھا، لیکن اس کا انکار نہیں کیا جا سکتا کہ امام رحمۃ اللہ علیہ کے عہد تک ان دونوں شاخوں پر کچھ نہ کچھ کام کرنے کی ابتداء ہو چکی تھی، اگرچہ زیادہ تر اس کام کو لوگ انفرادی طور پر انجام دے رہے تھے۔ خود امام کے معاصرین سفیان ثوری، امام اوزاعی، ربیعۃ الرائے اور ان کے بعد امام ہی کے ہم عصر امام مالک کے خدمات کی نوعیت بھی یہی تھی۔ لیکن جہاں تک تاریخ کی شہادت ہے ان لوگوں کے خدمات کی حیثیت بالکل انفرادی خدمات کی تھی۔

امام کے دل میں پہلی دفعہ یہ خیال آیا کہ انفرادی طور پر اتنے بڑے کام کو کامیابی کے حدود تک صحیح معنوں میں پہنچانا ناممکن ہے۔ صرف یہی نہیں کہ اس کے لیے اجتماعی سعی کی ضرورت انھوں نے محسوس کی بلکہ میں تو یہ پڑھ کر حیران رہ گیا۔ یعنی ایک دفعہ امام ابوحنیفہ سے آ کر ایک شخص نے بیان کیا کہ ''فلاں مسجد میں حلقہ بنا کر لوگ فقہی مسائل کے متعلق بحث ومباحثہ کر رہے ہیں'' کہتے ہیں کہ جواب میں امام نے دریافت فرمایا:

لهم راس. کیاان کا کوئی ''سر'' بھی ہے یعنی ''صدر مجلس'' بھی کوئی ہے۔

جواب میں کہا گیا کہ نہیں حلقہ کا صدر کوئی نہیں ہے۔ یہ سننے کے ساتھ ہی امام نے فرمایا اور عجب لہجہ میں فرمایا۔ یعنی کہا کہ

لا یفقه هو لاء ابداً (موفق ص ۹۱ ج ۲) تو یہ لوگ کبھی فقیہ نہیں بن سکتے۔

ذرا ''ابداً'' کے لفظ کے زور کا اندازہ کیجئے کہ ایک طرف بجائے ''انفراد'' کے ''اجتماع'' کے فوائد اگر امام پر روشن تھے تو اسی کے ساتھ غیر منظّم اجتماع کے انجام کا بھی کتنا صحیح علم ان کے سامنے گویا کھڑا ہوا تھا کہ دوٹوک فیصلہ کن الفاظ میں اس کی ناکامی کا آپ نے اعلان کر دیا۔

نظم کے ساتھ سوال کی آزادی:

اجتماعی مساعی اسی وقت بارآور ہوتے ہیں جب ضبط ونظم کے تحت ان کو انجام دیا جائے۔ امام پر جہاں یہ راز واضح ہو چکا تھا۔ اسی کے ساتھ وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ مجلس کے تمام اراکین کو جب تک کامل آزادی اپنے خیالات کے اظہار میں نہیں دی جائے گی' اجتماع کا جو مقصد ہے وہ پورا نہیں ہوسکتا آزادی کے اس دائرے میں امام نے کتنی وسعت دے رکھی تھی اس کا اندازہ اسی واقعہ سے ہوسکتا ہے جس کو امام کے مختلف سوانح نگاروں نے نقل کیا ہے۔ الجرجانی کہتے ہیں کہ میں امام کی مجلس میں حاضر تھا کہ ایک نوجوان جو اسی حلقہ میں بیٹھا ہوا تھا، امام سے اس نے کوئی سوال کیا تھا جس کا امام صاحب نے جواب دیا لیکن جوان کو میں نے دیکھا کہ جواب کو سننے کے ساتھ ہی بے تحاشا وہ امام کو مخاطب کر کے **اخطات** (آپ نے غلطی کی) کہہ رہا ہے جرجانی کہتے ہیں کہ جوان کے اس طرز گفتگو کو دیکھ کر میں تو حیران ہو گیا اور حلقہ والوں کی طرف خطاب کر کے میں نے کہا کہ

> ''بڑے تعجب کی بات ہے کہ استاد (شیخ) کے احترام کا تم لوگ بالکل لحاظ نہیں کرتے۔''

جرجانی ابھی اپنی اس نصیحت کو پوری کرنے بھی نہ پائے تھے کہ وہ سن رہے تھے خود امام ابوحنیفہ فرما رہے ہیں۔

دمهم فانی قدعودتهم ذلک من نفسی (ص ۱۵۴ معجم)

تم ان لوگوں کو چھوڑ دو، میں نے خود ہی اس طرز کلام کا ان کو عادی بنایا ہے۔

جس سے معلوم ہوا کہ اس آزادی کا قصداً وارادتاً امام نے اپنی مجلس کے اراکین کو کہیے یا تلامذہ کو عادی بنا رکھا تھا اور یہ جان کر بنا رکھا تھا کہ جو مقصد ہے اس آزادی کے بغیر وہ حاصل نہیں ہوسکتا۔

بہرحال جیسا کہ معلوم ہوا کہ امام نے شریعت اسلامی کو باضابطہ قانون کے قالب میں ڈھالنے کے لیے وضع قوانین کے لیے ایک منظم ''مجلس شوریٰ'' قائم کی تھی جس کے راس (صدر) وہ خود تھے۔ اس مجلس کے تفصیلات جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں مجھ سے پیشتر مختلف مصنفین اردو زبان میں بیان کر چکے ہیں۔ اسی لیے بجز چند اجمالی اشاروں کے اس مجلس کے متعلق میں زیادہ لکھنا نہیں چاہتا اس سلسلہ میں ضرورت ہو تو مولانا شبلی نعمانی کی سیرۃ النعمان اور پچھلے دنوں میرے برادر عزیز ڈاکٹر حمید اللہ نے جو مقالہ اسی عنوان پر لکھا ہے اس کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ کتاب ''تدوین فقہ'' جو زیر ترتیب ہے اگر اس کی تکمیل کا جیسا کہ ارادہ ہے موقعہ میسر آیا تو اس میں اس مجلس کی پوری تفصیل اور اس کے سارے خط وخال نمایاں کیے جائیں گے۔ **والامر بیده سبحانه تعالی**

بہرحال میرا خیال ہے کہ اس مجلس کی تاسیس امام نے ہجرت حجاز سے واپسی کے بعد اس زمانہ میں فرمائی جب عباسیوں کی حکومت کا دور شروع ہو چکا تھا۔

مطلب یہ ہے کہ ایک سلسلہ امام کے درس و تدریس کا تو وہ تھا جو حماد بن ابی سلیمان اپنے استاد کی جانشینی کے ساتھ ہی انھوں نے شروع کر دیا تھا۔ داؤد طائی جن لوگوں کا تذکرہ کرتے ہوئے کہتے کہ **هی الطبقة العلیا**. بہ ظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس طبقہ علیا کی تعلیم کا طریقہ وہی تھا جو ان کے استاذ حماد کا یا ان کے معاصرین کا تھا۔ لیکن امام کے سوانح نگاروں نے یہ لکھتے ہوئے کہ

فوضع ابوحنیفه مذهبه شوری بینهم لم یستبد فیه

پھر امام نے اپنے مذہب کو شوریٰ (باہمی مشورہ) پر مبنی کر دیا یعنی مجلس شوری کے اراکین سے الگ

بنفسه دونهم (موفق ص ۱۲۳ ج ۲)

ہو کر فقہ کی تدوین کو خود اپنی انفرادی ذات کے ساتھ وابستہ نہیں کیا۔

اور جس کے متعلق طریقۂ بحث کی تفصیل کو بیان کرتے ہوئے ان لوگوں نے لکھا ہے

كان يلقي مسئلة مسئلة يقلبهم و يسمع ماعندهم ويقول ماعنده ويناظر هم شهرا او اكثر من ذلك حتى يستقر احد الاقوال فيها. (ص ۱۳۳ ج ۲)

ایک ایک مسئلہ کو پیش کرتے، اور لوگوں کے خیالات کو الٹتے پلٹتے جو کچھ مجلس کے اراکین کے پاس معلومات ہوتے انھیں سنتے، اور جو علم امام کا ہوتا اسے ظاہر کرتے اور مجلس والوں سے مناظرہ کرتے یہ مناظرہ (کسی ایک مسئلہ پر) مہینہ مہینہ بھر یا اس سے بھی زیادہ زمانہ تک جاری رہتا تا اینکہ مسئلہ کا کوئی پہلو متعین ہو جاتا۔

اور جس مجلس شوریٰ کے اعضاء و ارکان کے متعلق وکیع بن الجراح لوگوں سے یہ کہا کرتے تھے۔

كيف يقدر ابوحنيفه ان يخطى و معه مثل ابى يوسف و زفرد محمد فى قياسهم واجتهادهم ومثل يحيى بن ابى زائده وحفص بن غياث و حبان و مندل ابنا على فى حفظهم للحديث و معرفتهم به والقاسم بن معن يعنى ابن عبدالرحمن بن عبدالله بن مسعود رضى الله تعالى عنه فى معرفته باللغة والعربية وداود بن نصير الطائى و فضيل بن عياض

امام ابوحنیفہ کے کام میں غلطی کیسے باقی رہ سکتی ہے، جب واقعہ یہ تھا کہ ان کے ساتھ ابو یوسف، زفر، محمد، جیسے لوگ قیاس و اجتہاد میں (مدد دینے والے موجود تھے اور حدیث کے باب میں یحییٰ بن زکریا بن ابی زائدہ۔ حفص بن غیاث حبان و مندل (علی کے بیٹے) جیسے ماہرین حدیث ان کی مجلس میں شریک تھے اور لغت و عربیت کے ماہرین میں قاسم بن معن یعنی عبدالرحمٰن بن عبداللہ بن مسعود کے صاحبزادے جیسے حضرات شریک تھے اور داؤد بن نصیر طائی فضیل بن

في زهد حماد و رعهما. (ص ۳۳ ج ا جامع المسانيد) عیاض جیسے لوگ تقویٰ و طہارت و زہد اور پرہیز گاری رکھنے والے موجود تھے۔

اور ان ناموں کو گنانے کے بعد وکیع کہتے:

من كان اصحابه هولاء وجلسائه لم يكن ليخطى لانه ان اخطاء ردوه الى الحق. جس کے رفقاء کار اور ہم نشین اس قسم کے لوگ ہوں، وہ غلطی نہیں کر سکتا، کیونکہ غلطی کی صورت میں صحیح امر کی طرف یہ لوگ یقیناً واپس کر دیتے۔

کہتے ہیں کہ وکیع نے یہ فرمانے کے بعد امام ابوحنیفہ کے مدونہ قوانین پر اعتراض کرنے والوں کے متعلق یہ فیصلہ بھی صادر کیا تھا۔

والذى يقول مثل هذا كالانعام بل هم اضل (ص ۳۴ جامع) ان کی طرف اس قسم کی باتیں منسوب کرنے والے (یعنی فقہ ابی حنیفہ بے بنیاد ہے) جانور ہیں یا ان سے بھی زیادہ گم کردہ راہ ہیں۔

وضع قوانین کی اسی مجلس کے متعلق میں سمجھتا ہوں کہ اس کام کو حجاز سے واپسی کے بعد امام نے شروع کیا کیوں کہ عموماً اس مجلس کے اعضا زیادہ تر وہی حضرات ہیں جن کی شرکت کا امکان خصوصاً اس حیثیت سے جس کا ذکر ان لوگوں نے کیا ہے اسی زمانہ میں ممکن ہے جب امام نے حجاز سے واپس آکر دوبارہ کوفہ میں نئے طور سے وضع قوانین کا کام شروع کیا۔ وضع قوانین کی اس مجلس کے خصوصیات کا امام کے سوانح نگاروں نے تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ عبداللہ بن ممیز کے حوالہ سے موفق نے لکھا ہے کہ:

امام جب بیٹھتے تو ان کے اردگرد اصحاب بیٹھ جاتے جن میں قاسم بن معن عافیہ بن یزید داؤد طائی، زفر بن ہذیل اور اسی قسم کے لوگ ہوتے۔ اس کے بعد کسی مسئلہ کا ذکر چھیڑا جاتا پہلے امام کے تلامذہ اپنے اپنے معلومات کے لحاظ سے بحث کرتے اور خوب بحث کرتے یہاں تک کہ ان کی آواز بلند ہو جاتی۔ جب باتیں بہت بڑھ جاتیں تب آخر میں امام اپنی تقریر شروع کرتے، امام کی تقریر جس وقت شروع ہوتی لوگ خاموش ہو جاتے اور

جب تک امام تقریر فرماتے رہتے۔ کوئی کچھ نہیں بولتا (ص ۱۵۰ ج ۲ مو)

اسی قسم کی رپورٹ ابوسلیمان جوز جانی سے بھی منقول ہے وہ کہتے تھے کہ:

"جب ابوحنیفہ اپنی تقریر شروع کرتے تو سب چپ ہو جاتے ایسا معلوم ہوتا کہ گویا کوئی اس مجلس میں موجود ہی نہیں ہے حالانکہ اس مجلس میں رتوت (بڑے بڑے گھاگ) حاضر رہتے۔"

امام محمد بن حسن الشیبانی امام کی اس مجلس کا تذکرہ کرتے ہوئے کہتے

ابوحنیفہ کی عادت تھی کہ وہ اپنے تلامذہ سے مناظرہ کرتے، تلامذہ کبھی تو امام کی بات مان لیتے اور کبھی امام کے دلائل کے مقابلہ میں اپنے دلیلیں پیش کرتے۔ (ص ۹۰ ج ا موفق)

گذر چکا کہ اعتراض کرنے کی یہ آزادی امام ابوحنیفہ نے خود ان لوگوں کو عطا کی تھی۔ خود ہی فرماتے کہ میں نے ہی ان کو اس کا عادی بنا دیا ہے۔

علی بن مسہر جو امام کی اسی مجلس وضع قوانین کے ممتاز منبروں میں ہیں۔ ان ہی کا بیان ہے۔

امام کی مجلس میں چند حدیثوں کے متعلق بحث ہو رہی تھی کہ ان کے اسناد کیا ہیں۔ مسعر کا بیان ہے کہ اتفاق سے ان کے اسناد مجھے معلوم تھے، میں نے عرض کیا۔ امام اس سے بہت خوش ہوئے اور فرمایا:

احسنت یافتی بجلہ شاباش بجلہ کے جوان (بجلہ ان کے قبیلہ کا نام تھا)

(ص ۲۱۸ ج ۲)

خلاصہ یہ ہے کہ ہر رکن کو جیسے آزادی کے ساتھ رائے دینے کا اختیار تھا اسی طرح ہر شخص کی اس کوشش کے مطابق حوصلہ افزائی بھی کی جاتی تھی اور خواہ اسے حوصلہ افزائی خیال کیجئے یا امام کی اس احتیاط وانصاف کا نتیجہ قرار دیجئے کہ اسی حلقہ کے ایک رکن جن کا نام عافیہ بن یزید تھا اور بعد کو مشاہیر قضاۃ میں شمار ہوئے ان کے تذکرے میں بالاتفاق لوگوں نے یہ لکھا ہے کہ وضع قانون کی اس مجلس سے اتفاقاً کسی دن قاضی عافیہ اگر غائب

ہوتے تو گو مسئلہ پر بحث جاری رہتی تھی اور مجلس کسی نتیجہ پر پہنچ بھی جاتی۔ لیکن امام ارشاد فرماتے کہ ابھی یادداشت کی کتاب میں اس فیصلہ کو درج نہ کیا جائے جب تک عافیہ کی نظر سے گذر نہ جائے۔ مورخین نے لکھا ہے کہ

فاذا حضر عافیه ووافقهم قال اثبتوها (جواهر مفیه ص۲۲۷ ج ۱)	جب عافیہ حاضر ہو جاتے اور تصفیہ سے اتفاق کر لیتے تب امام صاحب فرماتے کہ مسئلہ کو یادداشت کی کتاب میں اب درج کرلو۔

مذکورہ بالا اجمالی خصوصیتوں ہی سے اندازہ کیجئے کہ ان حالات میں جو نتائج بھی اس مجلس میں منقح ہوتے ہوں گے ان کی کیا اہمیت ہوگی ابن مبارک کے حوالہ سے موفق نے نقل کیا ہے کہ خود ان کے سامنے کی بات ہے کہ مسئلہ پیش آیا اور

فخاضوا فیها ثلثه ایام (ص ۵۴)	تین دن تک ارکان مجلس اس میں غور و خوض کرتے رہے۔

بحث و مباحثہ کے اس طریقہ سے قوانین کی تدوین اگرچہ اس زمانہ کی ایک عام بات ہے۔ لیکن اس عہد کے حساب سے سوچنا چاہیے جب امام نے "وضع قوانین" کی یہ نئی راہ نکالی تھی، کوفہ کے مشہور محدث اعمش نے امام کی اس مجلس اور اس کے خصوصی طریقہ کار کو بیان کرتے ہوئے کتنے اچھے الفاظ میں تصویر کھینچی ہے۔

اذا وقعت لهم مسئلة یدیرونها حتی یضیولها (ص ۳ کر)	جب اس مجلس کے سامنے کوئی مسئلہ آتا تو باہم یہ لوگ اس مسئلہ کو گردش دیتے ہیں اور یوں گردش دیتے ہوئے بالآخر اس کو روشن کر لیتے ہیں۔

جہاں تک میرا خیال ہے حجاز سے واپسی کے بعد امام کی زندگی کے آخری سالوں تک وضع قوانین کا یہ کام جاری رہا ہے گو اس عرصے میں جیسا کہ آئندہ معلوم ہوگا امام کو مختلف حوادث سے گذرنا پڑا۔ لیکن یہ کسی روایت سے نہیں معلوم ہوتا کہ امام نے اس کام کو کسی زمانہ میں بند کر دیا ہو بلکہ محدث جلیل عبداللہ بن المبارک کے حوالہ سے یہ الفاظ موفق نے جو نقل کئے ہیں کہ

کتبت کتب ابی حنیفہ غیر مرة کان یقع فیھا زیادت فاکتبھا (ص ۶۸ ج ۲ مو)	میں نے ابوحنیفہ کی کتابیں ایک سے زیادہ دفعہ نقل کی ہیں' ان کتابوں میں اضافے ہو جاتے تھے، تو ان کو بھی لکھ لینا پڑتا تھا۔

ان سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس مجلس کے مرتبہ قوانین کی کتاب کو لکھوا کر کام نہیں بند کر دیا گیا تھا اس پر اضافے بھی ہوتے رہتے تھے اور اضافہ کا یہ کام برابر جاری رہا، امام کی وفات کے بعد بھی لکھا ہے کہ عبداللہ بن المبارک امام کے حلقہ کے مشہور رکن زفر سے عاریۃً ان کی کتابیں لے کر نقل کیا کرتے تھے عطیہ بن اسباط جو ابن المبارک کے بہنوئی تھے یہ ان ہی کا بیان ہے وہ کہا کرتے تھے کہ کتبہا مرارا (یعنی متعدد مرتبہ نقلیں ابن مبارک نے کی تھیں[1]) اور سچ تو یہ ہے کہ امام کی اس مجلس میں جتنے قانونی دفعات مرتب ہوئے تھے ان کی تعداد کے متعلق پانچ لاکھ[2] والی روایات مان بھی لی جائے کہ مبالغہ ہو اور صحیح وہی ہو جو خوارزمی سے منقول ہے کہ

وضع ثلاثة آلاف و ثمانین الف مسئلة (مناقب قاری ص ۴۷۲)	کہ (۸۳) ہزار مسئلے اس مجلس میں طے کئے گئے۔

تو اس کے لیے بھی پندرہ سے بیس سال کی مدت اسی وقت کافی ہو سکتی ہے جب امام اور ان کے تلامذہ کی غیر معمولی صلاحیتوں کو ان میں دخیل پایا جائے بے چارے عوام جو "فقہ" کے متعلق سمجھتے ہیں کہ اس میں کچھ نماز روزہ حج زکوٰۃ جیسے ابواب ہی کے صرف مسائل بیان کیے گئے ہیں وہ اس کام کی صحیح نوعیت کا اندازہ بھی نہیں کر سکتے۔ ان کو کیا معلوم کہ آج دنیا کے بڑے بڑے مستقل فنون۔ مثلاً معاشیات و سیاسیات و منزلیات وغیرہ وغیرہ ان سارے علوم کو فقہ اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے اور ان علوم کے متعلق جو قوانین مدون کئے گئے ہیں یہی نہیں کہ ان کی بنیاد صرف کتاب وسنت اجماع وقیاس واستحسان ہی

---

۱ موفق ج ۲ ص ۶۸

۲ پانچ لاکھ کا مطلب ممکن ہے کہ یہ ہو کہ امام کے کلیات سے پانچ لاکھ مسائل بعد کے لوگوں نے پیدا کئے چونکہ بنیاد ان کی امام ہی کے کلیات پر قائم تھی اس لیے ان کو بھی منسوب کرانے والوں نے امام کی طرف منسوب کر دیا۔۱۲

پرمبنی ہے بلکہ قانون سازی کے اس مرحلے میں لغت نحو صرف حساب وغیرہ علوم سے بھی کافی مدد لی گئی ہے موفق نے بالکل سچ لکھا ہے کہ امام کے مدونہ قوانین کا مجموعہ

مشتملة علی وقائق النحو (الحساب) ما تبعت فی استخراجها الی اهل العلم بالعربیة واهل العلم بالجبر والمقابلة[1] (ص ۱۳۸)	وہ مشتمل ہے نحو اور حساب کے ایسے دقیق مسائل پر جن کے سمجھنے کے لیے عربیت (یعنی ادب عربی اور اس کے متعلقہ فنون) اور جبرو مقابلہ کے ماہرین کی ضرورت ہے۔

اور ایک عربیت یا جبرو مقابلہ ہی کیا واقعہ یہ ہے کہ فقہ کہیے یا قانون اور وہ بھی مسلمانوں کا یہ فقہی قانون اس کے مرتب کرنے والوں کو تو اور بیسیوں ہی طرح کے معلومات کی ضرورت ہوتی ہے۔[2]

---

[1] قرآن کی فقہی تفسیر کے مصنف امام ابوبکر حصاص نے شرح جامع صغیر کی شرح میں لکھا ہے کہ میں نے مدینۃ السلام (بغداد) میں ایک بہت بڑے نحوی کو اس کتاب کے بعض مسائل سنائے نحوی کا نام حسن بن عبدالغفار تھا جصاص نے لکھا ہے کہ جیسے جیسے وہ مسائل سنتے جاتے تھے حیرت سے میری طرف دیکھتے آخر میں بولے ان نتائج کو وہی پیدا کرسکتا ہے جو علم نحو میں خلیل وسیبویہ کا ہم رتبہ ہو۔۱۲

[2] قاضی ابویوسف کے تذکرے میں ایک لطیفہ کا ذکر کیا گیا ہے کہ خنفساء (سیاہ کیڑا جو راتوں کو روشنی پر گرتا ہے) لکھا ہے کہ ہارون رشید کے دربار میں جو فرش بچھا ہوا تھا اس پر رینگ رہا تھا غالباً ہارون کا حکم تھا کہ فرش پر کیڑے مکوڑے اگر دیکھے جائیں گے تو فراشوں کو سخت سزا ملے گی ہارون کی کیڑے پر جو نظر پڑی تو آپے سے باہر ہوگیا فراش غریب بدترین عتاب میں مبتلا ہوا قاضی ابویوسف موجود تھے انھوں نے عرض کیا کہ امیرالمومنین اس قسم کے کیڑوں کی عادت ہے کہ لاکھ ان کو دور کیا جائے پھر پلٹ کر آجاتے ہیں اور کہا کہ آپ خود تجربہ کرلیجئے تجربہ کیا گیا بات صحیح ثابت ہوئی جس سے معلوم ہوا کہ فراش نے صفائی میں کمی نہیں کی تھی اس کیڑے کی عادت ہی یہ ہے کہ پلٹ پلٹ کر آتا ہے۔ ہارون کا غصہ دھیما ہوا اور قاضی صاحب کا بہت ممنون ہوا کہ اس فراش کو اس کے غصے کی آگ میں جلنے سے انھوں نے روک لیا۔ ان ہی باتوں کی بنیاد پر لوگوں نے لکھا ہے کہ فقہاء کو اس قسم کے عام معلومات کی بھی ضرورت ہوتی ہے مثلاً یہ علم حیوانات کا مسئلہ ہے بسا اوقات قانون ان ہی معلومات کو پیش نظر رکھ کر بنایا جاتا ہے۔

حضرت امام کی مجلس کے مرتبہ قوانین کی دفعات کی تعداد

خوارزمی نے امام ابوحنیفہ کی مجلس کے مرتبہ قوانین کے دفعات کی جو گذشتہ بالا تعداد بتائی ہے ان ہی کا بیان ہے کہ

ان (۸۳) ہزار دفعات میں صرف (۳۸) ہزار مسائل کا تعلق عبادات (یعنی خالص دینیات) سے ہے اور باقی یعنی (۴۵) ہزار دفعات کا براہ راست معاملات یعنی انسان کے دنیاوی کاروبار کے متعلقہ آئین و دستور سے تعلق ہے۔ (۲۷۴ قاری)

جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے معاملات کے اس لفظ کے نیچے وہ سارے معاملات درج ہیں جن کا آدمی کے انفرادی، عائلی، قومی، عام انسانی مسائل سے تعلق ہے درحقیقت اس سلسلہ میں فقہ کا ہر باب صرف مستقل کتاب ہی نہیں بلکہ مستقل فن ہونے کی حیثیت رکھتا ہے دنیا جب مسلمانوں کے صدہا سال کی ان محنتوں کی جانچ پڑتال چھان بین کرے گی تو انسانی زندگی کے بے شمار مشکلات کو پائے گی کہ پہلے ہی سے ان کا حل ان میں موجود ہے۔

خیر امام کے وضع قوانین اور اس کی مجلس کے اس قصے کو تو سردست یہیں چھوڑ یئے یہ بات کہ اپنے اس کام کے سامنے امام کا نصب العین کیا تھا؟ کن محرکات نے ان کو اس مہم کی سرانجامی پر آمادہ کیا تھا؟ اب میں اس پر بحث کرنا چاہتا ہوں اگرچہ ضمناً کچھ اشارے ان کی طرف مختلف حیثیتوں سے مختلف مقامات میں کرتا چلا آ رہا ہوں۔ لیکن بجائے اشاروں کے وقت آ گیا ہے کہ جو کچھ کہنا چاہتا ہوں اسے ''اب کھل کر کہہ دوں۔''

اس کے تو شاید کہنے کی بھی ضرورت نہیں کہ سب سے بڑا مقصد جیسا کہ اس زمانہ کا دستور تھا اور امام جیسی ہستیوں سے اس کے سوا اور کسی بات کی توقع بھی نہیں کی جا سکتی کہ سب سے بڑا مقصد ان کا اپنے مالک کی خوشنودی تھی ان کے شاگردوں سے سوانح نگاروں نے نقل کیا ہے کہ

امام کا دستور تھا کہ مجلس میں جس وقت بحث و مباحثہ کا سلسلہ شروع ہو جاتا تو

بار بار بیچ بیچ میں ان کی زبان پر قرآنی آیت **فبشر عبادی الذین یستمعون القول یتبعون احسنہ** پس بشارت سنادو میرے ان بندوں کو جو بات کو سنتے ہیں اور سب سے اچھی بات کی پیروی کرتے ہیں' جاری ہو جاتی تھی۔ (ص ۴۷۳ قاری وغیرہ)

دراصل یہی احسن القول (یعنی تمام پہلوؤں میں سب سے بہتر پہلو قرآن و حدیث کی عبارتوں کا جو نکل سکتا ہو اسی پہلو کی جستجو اور تلاش یہی ان کی اس خدمت کا سب سے بڑا نصب العین تھا اور یہی مطلب ہے ان کے اس مشہور قول کا جو اپنے اجتہادی مسائل کے لیے متعلق فرمایا کرتے تھے۔

ھو احسن ما قدرنا علیہ (ص ۴۱۲ قاری) سب سے بہتر پہلو جہاں تک پہنچنا میرے بس میں تھا وہ یہی ہے۔

امام کی ان مجلس کے اختتام کا یہ دستور جو نقل کیا جاتا ہے کہ ہر مجلس کے ختم پر تلامذہ کو خطاب کر کے ان کا قاعدہ تھا کہ ان الفاظ کے ساتھ رخصت فرماتے۔

"خدا تم لوگوں کی باہمی اخوت اور برادری کو ایمان کے رشتہ سے مضبوط فرمائیے اور تمہاری باہمی محبت و الفت میں اپنی رحمت شریک فرمائے اور تمہارے دلوں کو علم اور قرآن سے صحت مندی عطا فرمائے۔" (موفق ص ۲۵۴ ج ۱)

اس سے بھی ان کے نقطہ نظر کا اندازہ ہوتا ہے۔ بلکہ عبداللہ بن المبارک نے اسی مجلس کا یہ عجیب دستور بھی جو بیان کیا ہے یعنی جب کوئی مشکل اور پیچیدہ مسئلہ بحث و تمحیص کے بعد آخری فیصلہ کی صورت اختیار کرتا تو وہ فرماتے ہیں کہ

کبروا جمیعاً قالوا اللہ اکبر. (ص ۵۴ ج ۲ مو) سب لوگ تکبیر بلند کرتے یعنی اللہ اکبر کہتے۔

گویا موجودہ زمانے کے مجالس کا جو دستور ہے کہ پسندیدگی اور اطمینان کا اظہار تصفیق (چیرز) کی تالیوں سے کیا جاتا ہے امام کی مجلس جس کا کاروبار للّٰہیت پر مبنی تھا اس

میں بجائے چیرز کے تکبیر کا رواج تھا۔[1]

بہر حال جیسا کہ میں نے کہا یہ مسئلہ تو شائد قابل بحث بھی نہیں ہوسکتا بھلا جو علانیہ اپنے تلامذہ کو کہتا ہو۔

ان لم تریدوا لهذا لعلم بخير اگر علم سے آخرت کی بھلائی تمہارے سامنے نہیں ہے تو تمھیں توفیق نہیں بخشی جائے گی۔
لم تولقوا (ص ۸۹ ج مو)

بعض لوگ جنھیں ان کے کام کی اہمیت کا صحیح اندازہ نہ تھا کبھی ان پر معترض ہوتے تو اس وقت فرماتے۔

بھائی اس سے بڑی نیکی اور کیا ہوگی کہ حلال وحرام کا فیصلہ کیا جائے خدا کی طرف کوئی غلط بات منسوب کرنے والے نہ منسوب کر دیں اور خدا کی مخلوق لاعلمی کی وجہ سے خدا کی نافرمانیوں میں نہ مبتلا ہو جائے۔اس کا ذریعہ اس کے سوا اور کیا ہوسکتا ہے۔(ص ۹۳)

امام کے نصری شاگرد خالد سمتی کہا کرتے تھے کہ بکثرت امام کی زبان مبارک پر بے ساختہ عموماً یہ شعر جاری رہتا تھا جس کا حاصل یہ ہے۔[2]

''غم والم کے لیے یہ دو باتیں کافی ہیں۔ایک تو یہ کہ زندگی آدمی کی ناخوش گوار گذرے اور دوسرے یہ کہ انسان ایسے عمل میں مشغول ہو جس سے خوشنودی حق مطلوب نہ ہو۔''(ص ۸۱ ج ۲ موفق)

لیکن سوال یہ ہے کہ علاوہ اس علمی کام کے کوئی دوسری غرض بھی امام صاحب کے اس قانونی کاروبار کے پیچھے کیا پوشیدہ تھی؟ میں واقعات پیش کرتا ہوں نتائج خودبخود آپ کے سامنے آجائیں گے۔

---

[1] اس سے بھی یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ پچھلے چند دنوں سے تصفیق کی جگہ ایسے مواقع پر تکبیر کے نعرے کا جو طریقہ مسلمانوں کے عوام نے اختیار کیا ہے یہ کوئی نئی بات نہیں ہے بلکہ قدیم دستور ہے جس کا رواج جاتا رہا تھا اور پھر کسی طرح وہ زندہ ہوگیا ہے۔۱۲

[2] اصل عربی شعر یہ ہے **كفى حزفان ان لاحياة هينة + ولا عمل يرضى به الله صالح**

لیکن واقعات کے پیش کرنے سے پہلے یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ عباسی حکومت کے قائم ہو جانے کے بعد حجاز سے امام رحمۃ اللہ علیہ جب کوفہ واپس ہوئے اور وضع قوانین کی مجلس کے اس کاروبار کو آپ نے شروع کر دیا ان ہی دنوں میں اچانک ایک بڑی سیاسی آزمائش میں جوان کو مبتلا ہونا پڑا تھا اس کا ذکر کرلوں۔

ابراہیم بن میمون اور امام:

یعنی وہی ابراہیم بن میمون بن الصائغ المروزی کا واقعہ جس کا مختلف مقامات میں اب تک اجمالاً تذکرہ کیا گیا ہے وعدہ کرتا چلا آیا ہوں کہ تفصیلاً آئندہ اس واقعہ کو بیان کروں گا۔

قصہ یہ ہے کہ مروانیوں نے تو زید شہید اور ان کے صاحبزادے یحیٰ وغیرہ کے ساتھ ناعاقبت اندیشانہ اعمال کا ارتکاب کر کے اپنی قبر آپ کھود لی تھی۔ ضرورت صرف کسی ایسے بے جگر آدمی کی تھی جو ذرا ہمت کر کے انھیں ان کی بنائی ہوئی قبروں میں ڈھکیل دے جیسا کہ معلوم ہے عباسیوں کے داعیہ ابومسلم خراسانی نے اس کام کو انجام دیا یہ ایک عجیب وغریب طلسمی شخصیت عباسیوں کو خوش قسمتی سے مل گئی اور بنی امیہ کی حکومت کی تجہیز وتکفین بلکہ تدفین کے کام کو اسی نے پورا کیا۔[1]

---

[1] نہ صرف اسلامی تاریخ بلکہ غالباً دنیا کی سیاسی تاریخ میں ابومسلم کا وجود خاص اہمیت کا مالک ہے۔ مامون الرشید کے دربار میں دنیا کے چند جلیل القدر فاتحوں کا ذکر آیا تو لکھا ہے کہ خود مامون نے ابومسلم کا نام بھی پیش کیا تھا۔ خدا ہی جانتا ہے کہ اس کی پراسرار ہستی کیا تھی اگرچہ بعد کو اس کے متعلق بڑے بڑے افسانے تراشے گئے کبھی وہ عربی النسل قرار دیا گیا اور کبھی عجمی النسل قرار دینے والوں نے اس کے نسب نامے کو مشہور ایرانی دانشور حکیم بزرجمہر سے ملا دیا تھا تاہم جہاں تک واقعات کا تعلق ہے وہ عجمی النسل ہی تھا اس کا باپ دراصل مرو ہی کے قریب قصبہ ماخوان کا رہنے والا مویشیوں کی پھیری کا کام کرتا تھا اسی سلسلہ میں کوفہ بھی کبھی کبھی آیا آخر زمانے میں رستاق (تعلقہ) فریدین جو عراق کا تعلقہ تھا اس کے گاؤں سنجرہ میں زمین کاشت کاری شروع کر دی لیکن مال گذاری حکومت کی اس پر باقی رہ گئی ادا کرنے کی استطاعت نہ تھی وشیکہ نامی جو اس کی عورت تھی اس کو لے کر آذربائیجان کی طرف بھاگ گیا عورت حاملہ تھی۔ ابومسلم اپنے باپ کے مرنے کے بعد پیدا ہوا بعض فارغ البال اسلامی خاندانوں میں اس کو پناہ دی گئی جہاں اچھی تعلیم وتربیت کا اس کو موقعہ ملا وہ عربی اور فارسی دونوں تلے

زبانوں کا غیر معمولی خطیب تھا رنگ گورا آنکھیں بڑی بڑی چوڑی پیشانی گٹھا ہوا بدن دیکھ کر اس کی شخصیت ہی سے لوگ متاثر ہوتے تھے۔ کہتے ہیں کہ ابتدائی جوانی ہی سے اس کے دماغ میں طرح طرح کے خیالات موج زن رہتے تھے ان ہی دنوں میں بعضوں نے دیکھا کہ رات رات بھر ٹہلتا رہتا ہے نیند نہیں آتی۔ پوچھا گیا کہ کیا حال ہے۔ اس نے کہا کہ کیا پوچھتے ہو میرا دماغ ہر وقت شدید تنگ و دو میں مبتلا رہتا ہے۔ حد سے زیادہ میرا ذہن صاف ہے نتیجے تک فوراً پہنچ جاتا ہے۔ ارادے میں حد سے زیادہ بلندی پیدا ہوگئی ہے چوبیس گھنٹے یہی خبط دماغ پر مسلط رہتا ہے کہ کوئی بڑا کام مجھے کرنا چاہیے۔ لیکن سادہ زندگی کے ساتھ یہی خیال مجھے بے چین رکھتا ہے جانتا ہوں کہ صرف بیداری سے دل کی بے چینی کا ازالہ نہیں ہوسکتا۔ لیکن آخر کروں کیا؟ کہا گیا کہ تو جو جی میں تیرے آرہا ہے اسے کر گذر۔ بولا سلطنت کے حصول کے بغیر مجھے تسلی نہیں مل سکتی کہا گیا کہ تو اسی راہ میں کوشش کر۔ بولا ہائے ہائے یہی تو مشکل ہے یہ میری بدبخت عقل مجھے آگے بڑھنے نہیں دیتی۔ خطرات میں گھسے بغیر حکومت مل نہیں سکتی اور عقل خطرے میں اپنے آپ کو ڈالنے سے مانع ہے۔ لوگوں نے کہا کہ بھائی تو پھر یوں ہی گھٹ گھٹ کر تو مر جائے گا۔ تب اس نے کہا کہ میں اس کی تیاری کر رہا ہوں کہ اپنی عقل کے کچھ حصہ کو جہل و ناعاقبت اندیشی سے بدل دوں اور جس نصب العین کی تکمیل جہالت اور مصلحت سوزی کے بغیر نہیں ہوسکتی۔ اس کو میں اسی جہل سے حاصل کر کے رہوں گا۔ اس کے بعد پھر عقل سے ان چیزوں کو سلجھاؤں جو عقلی تدبیروں کے بغیر سلجھ نہیں سکتیں۔ آخر میں اس نے کہا کہ میں ایک ایسی زندگی گذارنا چاہتا ہوں جو موت نہ معلوم ہو گم نامی اور نیستی ایک ہی چیز ہے اور عالم کا باپ وہی ہے جس نے شہرت حاصل کی (نویری) ابو مسلم اس کے بعد تیار ہوا اور عباسی جو بنی امیہ کے زوال سے فائدہ اٹھانے کی فکر میں تھے۔ ان سے ملتا ہے، عباسیوں نے تو سمجھا کہ وہ ہمارا آلۂ کار ہے۔ اور میرا خیال ہے کہ ابو مسلم عباسیوں کو اپنے آلۂ کار کی حیثیت سے استعمال کرنا چاہتا تھا۔ مختلف حالات سے گذرتے ہوئے اپنے آبائی وطن مرو پہنچا اور یہیں سے سارے خراسان میں اس نے آگ لگا دی ابتداء میں اپنے حسین و جمیل چہرے فصیح و بلیغ گفتگو سے لوگوں پر اس نے یہی ظاہر کیا کہ بنی امیہ کے ظلم سے نجات حاصل کر کے پیغمبر کے خاندان والوں میں اسلامی حکومت کا لانا یہی میرا مقصد ہے لیکن اقتدار پر قابو پانے کے ساتھ ہی اس نے بے دردی کے ساتھ مسلمانوں کا قتل عام شروع کر دیا فوجی مقابلوں کے سوا انفرادی طور پر اپنے سامنے کھڑا کر کے جن لوگوں کو اس نے قتل کیا ہے بالاتفاق مورخین ان کی تعداد پانچ لاکھ بتاتے ہیں۔ حالت یہ تھی کہ مرو ہی میں کسی نے اس کے سیاہ لباس کے متعلق پوچھا کہ اس رنگ کو آپ نے کیوں اختیار کیا ہے جواب تو اس نے دے دیا کہ رسول اللہ ﷺ کے سر پر فتح مکہ کے وقت سیاہ عمامہ تھا۔ لیکن صرف اس جرم میں کہ پوچھا کیوں اضرب یا غلام عنقہ (یعنی اے غلام پوچھنے والی کی

ابومسلم خراسانی:

ابومسلم نے اپنے کام کا آغاز ۱۲۹ھ میں مرو (خراسان کے مشہور شہر سے کا' جو اس کا آبائی وطن تھا یہ اسلام کا معجزہ ہے کہ کل صدی ڈیڑھ صدی کے اندر دور دراز ممالک اور شہروں میں بڑے بڑے لوگ پیدا ہو چکے تھے۔ مرو جو عرب سے سینکڑوں میل دور تھا۔ لیکن غیر معمولی ایمانی اور علمی و عملی شخصیتوں سے معمور تھا۔[1] ان ہی شخصیتوں میں ایک بڑی

بقیہ گردن اڑادے) (خطیب ص ۲۰۸ ج ۱۰) غریب پوچھنے والا ختم کر دیا گیا۔ یہی نہیں بلکہ عربیت کے مقابلہ میں عجمی عصبیت کی پرورش میں پوری طاقت اس نے خرچ کر دی اور آخر میں تو معلوم ہوتا ہے کہ عباسیوں کو الٹ کر حکومت ہی پر قبضہ کرنے کا پختہ ارادہ کر چکا تھا۔ منصور عباسی خلیفہ نے اس کو قتل کرنے سے پہلے خود اس کے منہ پر جو الزامات لگائے تھے ان میں یہ الزامات بھی تھے چونکہ تحریری تھے اس لیے اس نے انکار بھی نہیں کیا صرف معافی چاہتا تھا۔ یعنی اپنے آپ کو عبداللہ بن عباس کے صاحبزادے سلیط کی اولاد سے ہونے کا مدعی ہوا تو نے میری پھوپھی زاد بہن آسیہ سے نکاح کا پیغام خود مجھے لکھ کر بھیجا تو اپنے خطوط میں ہمارے نام سے پہلے اپنے نام کو درج کرنے لگا (ابن خلکان) منصور نے ان چیزوں کو دیکھ کر سب سے بڑا دشمن اپنا اور اپنی حکومت کا یقین کر کے انتہائی دانش مندی سے اگر اس کو ختم کر دیا تو اس کے سوا وہ اور کیا کرتا جہاں تک معلوم ہوتا ہے۔ اسلامی حکومت کا تختہ الٹ کر عجمی ابومسلم ہی کی تھی۔ لیکن ابوجعفر منصور پر اور جتنے الزامات بھی ہوں مسلمانوں پر اس کا یقیناً ایک بڑا احسان ہے خواہ اس کی نیت میں کچھ ہی ہو واللہ اعلم بما فی الصدور۔ ابومسلم سے کتابوں میں بڑے عجیب و غریب مدبرانہ فقرے منقول ہیں۔ بنی امیہ کے زوال کے اسباب کو بیان کرتے ہوئے ایک سبب یہ بھی بیان کرتا تھا کہ دوستوں پر اعتماد کر کے انھوں نے دور دراز علاقوں میں ان کو بھیج دیا اور دشمنوں کو مانوس کرنے کے لیے اپنے پاس رکھا۔ لیکن دشمن دشمن ہی رہے اور دور ہونے کی وجہ سے دوستوں کی بھی نیت بدل گئی۔ دشمن بن گئے۔ کسی نے اس سے پوچھا کہ بہادر قوم کون ہے؟ اس نے کہا کہ ہر وہ قوم جو برسر اقبال آتی ہے۔ بہادر ہو جاتی ہے۔ اب اس کا فیصلہ کون کرے کہ بہادری اقبال کو پیدا کرتی ہے یا اقبال سے بہادری پیدا ہوتی ہے۔۱۲

[1] حافظ ابن حجر نے لکھا ہے کہ احمد بن سیار نے مرو کی ایک مستقل تاریخ لکھی ہے مسلمانوں کی کتابوں کا یہ سلسلہ بھی عجیب تھا یعنی قریب قریب ہر بڑے مرکزی شہر کی انھوں نے تاریخ لکھی مگر افسوس کہ بلاد و مصار کی ان تاریخوں میں اس وقت تک صرف خطیب اور ان کی تاریخ بغداد اور ابن عساکر کی تاریخ دمشق کا خلاصہ طبع ہوا ہے۔ ابن عساکر کی اس کتاب کے متعلق لکھا ہے کہ اسی جلدوں میں تھی بصرہ کوفہ بخارا، سمرقند، مرو، اصفہان، نیشاپور وغیرہ وغیرہ سب ہی کی مستقل تاریخیں لکھی گئی ہیں۔

ہستی ابراہیم بن میمون کی تھی۔ امام بخاری نے تاریخ کبیر میں لکھا ہے کہ میمون ابراہیم کے والد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے موالی میں تھے۔ حافظ بن حجر کا بیان ہے کہ یہی میمون تھے جن کا نام مہران بھی بتایا جاتا ہے چند خاص حدیثوں کے میمون راوی بھی ہیں۔ بہرحال ابراہیم نے مرو کو وطن بنالیا تھا ان کے نام کے ساتھ الصائغ کے لفظ کا اضافہ کیا جاتا ہے اس سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ زرگری کا کام کرتے تھے اسی لیے صائغ کے نام سے مشہور ہوئے حافظ ابن حجر نے ان کے حالات میں جو یہ فقرہ ابن معین کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ

کان اذا رفع المطرقة فسمع النداء لم یردھا (ص ۱۷۳ ج ۱ تھذیب)

ان کا حال تھا کہ ہتھوڑی اٹھائے ہوئے ہیں اگر اذان کی آواز آتی تو اس ہتھوڑی کو پھر دوبارہ نہیں واپس کرتے (یعنی کام ختم کردیتے اور نماز کی تیاری میں مصروف ہوجاتے تھے۔

اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ زرگری ان کا معاشی شغل تھا۔ لیکن اسی کے ساتھ حدیث میں بڑے بڑے جلیل ائمہ مثلاً عطاء بن ابی رباح نافع ابواسحاق ابوزبیر سے روایت کرتے تھے نسائی، ابوداؤد صحاح کی کتابوں میں ان کی حدیثیں میں تعلیقاً صحیح بخاری میں بھی ان کی روایت پائی جاتی ہے اور یہی حال ان کا فقہ میں بھی تھا۔ حنفی طبقات کی کتابوں میں ان کا ''ائمہ مرو'' کے نام کی ذیل میں ذکر کیا جاتا ہے موفق نے ابوحمزہ[۱] اسکری کے حوالہ سے نقل کیا ہے:

---

[۱] یہ وہی ابوحمزہ اسکری ہیں جن کی ایک روایت ابوحنیفہ کے اجتہاد کی بنیاد کی حیثیت سے عام طور پر مشہور ہوگئی ہے وہ کہتے تھے کہ میں نے براہ راست امام سے یہ سنا کہ وہ فرماتے تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے صحیح حدیث جب مجھے مل جاتی ہے تو اس کو میں اپنا مذہب بناتا ہوں اور جب صحابہ سے مختلف اقوال نقل کئے جاتے ہیں تو ان میں سے کسی کو ترجیح دیتا ہوں اور کوشش کرتا ہوں کہ صحابہ کے فتووں سے باہر نہ جاؤں لیکن جب صحابہ کے بعد والے لوگ یعنی تابعین کے اقوال کا مرحلہ آتا ہے تو زاعمناھم (تو پھر ہم بھی مقابلہ کرتے ہیں) مطلب یہ ہے کہ تابعین کے اقوال میں خود بھی اجتہاد کی کوشش کرتا ہوں۔ (ص ۲۵۰ ج ۲ جواہر صفیہ)

''ابراہیم صائغ نے مجھے امام ابوحنیفہ کے پاس کچھ پونجی (یعنی زادراہ دے کر ایک ہزار فقہی سوالات کے ساتھ روانہ کیا تا کہ میں امام سے ان کے جوابات حاصل کر کے ان تک پہنچادوں۔'' (ص ۱۶۰)

اس سے ابراہیم کے فقہی ذوق کا اندازہ ہوتا ہے اور سچ تو یہ ہے کہ جس شخص کے متعلق عبداللہ بن المبارک جیسے ثقہ حجت محدث امام ابوحنیفہ کے یہ الفاظ نقل کیا کرتے تھے کہ

کان شدید الورع شدید البذل لنفسه فی طاعة الله. (ص ۴۹ جواهر وغیره)

یعنی امام ابوحنیفہ ابراہیم کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے کہ وہ بڑے سخت پرہیزگار اور حق تعالیٰ کی فرماں برداری میں اپنی جان چھڑکنے والوں میں تھے۔

تو ان کے تقویٰ اور ربانی قوت کی بلندی میں شک کی کیا گنجائش ہو سکتی ہے عبداللہ بن المبارک کی اسی روایت میں امام صاحب کے یہ الفاظ بھی منقول ہیں۔

''کہ وہ میرے پاس آیا کرتے تھے اور مجھ سے پوچھا کرتے تھے۔''

جس سے معلوم ہوا کہ ابوحمزہ اسکری کے ہزار سوالات کے علاوہ براہ راست ابراہیم صائغ کو بھی امام سے استفادہ کا موقعہ ملا تھا، اس روایت میں یہ بھی ہے کہ امام ابوحنیفہ کہتے تھے۔

ابراہیم کے تقویٰ کا حال یہ تھا کہ جب میرے پاس آتے تو میں ان کے سامنے کچھ کھانے کی چیز پیش کرتا وہ مجھ سے پوچھتے (یہ غایت تقویٰ کی بات تھی کہ امام ابوحنیفہ سے بھی پوچھا جائے کہ یہ کھانا کس ذریعہ سے آیا ہے) پھر کبھی ناپسند کرتے اور چکھتے بھی نہیں یوں ہی واپس کر دیتے اور کبھی پسند کرتے تو کھا لیتے۔ (ص ۴۹ ج ا موفق)

شاید شدتِ تقویٰ کا یہ نتیجہ تھا کہ انھوں نے معاش کے لیے زرگری کے پیشے کو اختیار کر لیا تھا۔ ورنہ اپنے علم و فضل کے لحاظ سے ظاہر ہے کہ بڑے سے بڑا عہدہ حکومت کا ان سے زینت حاصل کر سکتا تھا۔

بہر حال ابومسلم جس وقت اپنی دعوت لے کر مرو پہنچا تو جیسا کہ ابن اثیر نے لکھا ہے

سارع الیه الناس وجعل اھل مرو یاتونه. (ص ۱۳۷ ج ۵) لوگ اسکی طرف پل پڑے اور مرو کے باشندوں کی آمدورفت اس کے پاس شروع ہوگئی۔

جس کی وجہ وہی تھی کہ کان یدعوا لی خلع مروان (یعنی بنی امیہ کا حکمراں اس زمانے میں مروان تھا اس کو تخت خلافت سے اتارنا) اسی نصب العین کو لوگوں کے سامنے ابومسلم پیش کرتا تھا۔ بنی امیہ کے مظالم سے دنیا تنگ آ چکی تھی اتنی تنگ آ چکی تھی کہ کھلی بغاوت کی ابومسلم حالانکہ لوگوں کو دعوت دے رہا تھا۔ لیکن لکھا ہے کہ

''اپنے خیمہ میں ابومسلم بغیر کسی پہرے اور دربان کے رہتا تھا۔''

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عام مسلمانوں میں ابومسلم کے متعلق یہی مشہور ہوگیا تھا یا کر دیا گیا تھا جیسا کہ کامل ہی میں ہے کہ

''بنی ہاشم سے ایک آدمی ظاہر ہوا ہے جو بڑے وقار و وزن والا بھاری بھرکم آدمی ہے۔'' (ص ۱۳۷ ج ۵ کامل)

اور صرف یہی نہیں بلکہ اس کے علم و فضل کا چرچا بھی عوام میں پھیلا دیا گیا تھا کہ کامل ہی میں ہے کہ

''مرو کے نوجوان ابومسلم کے پاس فقہ اور دینی مسائل کا علم حاصل کرنے کے لیے حاضر ہونے لگے۔''

لیکن جب اس سے کوئی مسئلہ پوچھا جاتا تو کہتا کہ

''بھائیو! یہ وقت مسئلوں کے پوچھنے کا ہے؟ ضرورت تو اس کی ہے کہ پہلے معروف (شرع کے مطابق قوانین) کو نافذ کرنے کی اور منکر (خلاف شرع امور) کو روکنے کے ذرائع مہیا کیے جائیں۔''

آخر میں کہتا کہ:

''اس وقت آپ کے ان مسئلوں سے زیادہ ضرورت اس کی ہے کہ مجھ کمزور کی جو حق کو قائم کرنے کے لیے کھڑا ہوا ہے مدد فرمائی جائے۔''

کبھی کبھی لوگ اس کے نسب کے متعلق بھی پوچھ بیٹھتے جواب میں کہتا کہ

''میری زندگی میرے نسب سے زیادہ غالباً آپ لوگوں کے سامنے میری خوبیوں کو ظاہر کر سکتی ہے۔''

ابراہیم اور ابو مسلم کے دوستانہ تعلقات:

خلاصہ یہ ہے کہ کچھ ایسے انداز سے مرو میں اس نے آپ کو نمایاں کیا تھا کہ بڑے بڑے لوگ اس کے جال میں گرفتار ہو گئے ان ہی لوگوں میں یہ بے چارے ابراہیم الصائغ بھی تھے میں نے کسی موقعہ پر طبقات ابن سعد سے نقل کیا ہے کہ ابراہیم صائغ اور ابو مسلم میں دوستانہ تعلقات پیدا ہو گئے تھے۔ اس میں یہ بھی ہے کہ ابراہیم اور ایک دوسرے محدث محمد بن ثابت ابو مسلم کے خاص لوگوں میں تھے۔ ابن سعد کی روایت میں ہے کہ

یجلسان الیه ویسمعان کلامه (ص ۱۰۳ ج ۷ قسم دوم) یہ دونوں (یعنی ابراہیم صائغ اور محمد بن ثابت) ابو مسلم کے پاس بیٹھا کرتے تھے اور اس کی باتیں سنا کرتے تھے۔

لیکن ظاہر ہے کہ اس کی شاطرانہ کارروائیوں کا راز کب تک چھپا رہتا جوں ہی کہ اقتدار کی باگ اس کے ہاتھ میں آنے لگی جو کچھ اس کے اندر تھا وہ باہر آ گیا۔ کھل گیا کہ یہ بھی شغال کا بھائی سگ زرد ہی ہے گویا

چو از چنگال گرگم در ربودی ندانم عاقبت خود گرگ بودی

کا قصہ لوگوں کے سامنے پیش آ گیا۔

ابراہیم اور ابو مسلم کی مخالفت:

ارباب اخلاص و دیانت میں سے جو اس کے مغالطوں کے شکار ہو گئے تھے۔ حقیقت جب بے نقاب ہو کر ان کے سامنے آئی تو اپنے اپنے ظرف اور ایمانی ذکاوت حسی کے لحاظ سے ہر ایک پر اپنی اس غلطی کا ردعمل ہوا۔

ابراہیم صائغ جس طبیعت کے آدمی تھے ان کے تھوڑے بہت حالات جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے۔ انہی سے اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اپنی اس فاش غلطی کی ندامت کا ان پر کیسا کچھ اثر مرتب ہوا ہو گا۔ البر والتقوی کی نیت سے جس تعاون کو انھوں نے پیش

کیا تھا۔ اب معلوم ہوا کہ یہ تو بالکلیہ الاثم والعدوان پر میں نے اس کے دست و بازو کو قوت پہنچائی پھر اس غلطی کی تلافی کیسے کی جائے جہاں تک ان کے حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ آگ کی طرح ان کے اندر اس سوال کا شعلہ بھڑکنے لگا۔

ابراہیم کا ابومسلم کے متعلق حضرت امام سے مشورہ:

یہ عجیب بات ہے کہ اس کے بعد ہم ابراہیم کو بجائے مرو کے کوفہ میں پاتے ہیں یعنی امام ابوحنیفہ سے ابومسلم کے متعلق مشورہ کر رہے ہیں ابراہیم اور امام ابوحنیفہ کے درمیان اس مسئلہ میں جو گفتگو ہوئی اس کا ذکر تو خیر آ ہی رہا ہے لیکن یہاں سوچنے کی بات یہ ہے کہ مرو سے لے کر کوفہ تک کے درمیانی علاقے میں مسلمانوں کی بڑی بڑی آبادیاں تھیں، ماسوا اس کے باہر ہی کے کسی آدمی سے اگر ابراہیم کو اس مسئلہ میں مشورہ کرنا تھا تو اسلامی دنیا کے طویل و عریض علاقے میں ان کی نظر انتخاب ابوحنیفہ ہی پر کیوں پڑی؟ میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ امام ابوحنیفہ کے سیاسی رجحانات ہی نے اتنے لمبے چوڑے سفر پر ان کو آمادہ کیا اس زمانے میں جب مسلمانوں کی سیاست میں ارباب اغراض نے عام طور پر تشیع[1] کا رنگ بھر دیا تھا۔ دوسرے خیال کے لوگ یعنی جو مسلمانوں کی حکومت کو شوریٰ

---

[1] تشیع سے یہاں مراد وہ نہیں ہے جو آج کل سمجھا جاتا ہے بلکہ ابتدا ہی سے مسلمانوں میں سیاسیات کے دو مکتب خیال جو پیدا ہو گئے تھے ایک گروہ تو یہ سمجھتا تھا کہ سیاسی اقتدار جس کی تعبیر امامت اور خلافت کے الفاظ سے کی جاتی تھی یہ کسی خاص خاندان کے موروثی حق ہے مگر کس خاندان کا ہے اور اس خاندان میں کس کا حق ہے اس باب میں اتنے خیالات اور مسالک بنتے چلے گئے کہ شاید ان کا شمار کرنا بھی مشکل ہے۔ کسی خاندان پر متفق ہو جانے کے بعد آگے کی شاخوں میں اختلاف کا پیدا ہو جانا ناگزیر تھا ابومسلم حضرت عباس اور ان کے خاندان کو مسلمانوں کی سیاسی امامت کا حق دار ثابت کرنا چاہتا تھا۔ کہتا تھا کہ رسول اللہ ﷺ کے عصبہ (چچا) وہی تھے اسی لیے وہی حقیقی وارث تھے لیکن اسی کے مقابلہ میں شروع ہی سے مسلمانوں کا ایک طبقہ ان لوگوں کا تھا جن کا خیال بقول المسعودی یہ تھا کہ ''سیاسی امامت یہ خود امت کے اختیار کی چیز ہے یعنی مسلمانوں کی رائے کے حوالہ اس مسئلہ کو کر دیا گیا ہے اس لیے قرآن میں کسی شخص یا خاندان کی تخصیص نہیں کی گئی ہے۔ مسلمان جس کا چاہیں انتخاب کر سکتے ہیں صرف اس میں امامت کے صفات ہونے چاہئیں ص ۱۶۵ ج ۴ بر کامل۔ لیکن جس زمانہ کا

اور رائے عامہ سے وابستہ سمجھتے تھے بہت کم پائے جاتے تھے۔ ابن سعد نے تو صاف طور پر لکھا ہے کہ ابو مسلم سے ابراہیم کی مخالفت کی ابتدا اسی وقت سے شروع ہوئی جب اس نے اظہر الدعوة بخراسان وقام بهذا الامر (ص ۱۰۳) اس نے عباسی دعوت کا اعلان شروع کیا اور اس مہم پر وہ کھڑا ہوا۔[1]

بہر حال ابراہیم مرو سے روانہ ہوئے کوفہ پہنچے آگے قصہ جس شکل میں پیش آیا ہے عبداللہ بن المبارک نے خود امام ابو حنیفہ سے اس کو سنا ہے اور ابو بکر جصاص نیز القریشی صاحب طبقات حنیفہ وغیرہ سب ہی نے اس قصے کو نقل کیا ہے۔

حاصل یہ ہے کہ جب ابو مسلم اور ابراہیم صائغ میں اختلاف پیدا ہوا تو جہاں تک

لہ یہ قصہ ہے اس میں ارباب اغراض نے پہلے خیال ہی کو زیادہ تر پھیلا دینے کی کوشش کی ''تشیع'' سے اس وقت میرا یہی مقصود ہے عوام جو ایک زمانہ سے موروثی بادشاہوں کی عادی تھے اس قدیم ذہنیت کے لیے اسی کا ماننا زیادہ آسان تھا یہ تو اسلام کے بعد بتدریج دنیا اس نقطہ پر پہنچی ہے کہ حکمرانوں کا انتخاب ان ہی لوگوں کا حق ہے جن پر حکومت کی جاتی ہے دنیا کا اسلام سے پہلے اس باب میں کیا حال تھا اسی سے اندازہ کیجئے کہ ابو مسلم کے ماننے والوں کا ایک طبقہ راوندیہ کے نام سے مشہور ہے ان کا مذہب یہ تھا کہ خلیفہ وقت ابو جعفر منصور بهم الذى يطعمهم ويسقيهم (یعنی ان کا خدا منصور ہے وہی ان کو کھلاتا پلاتا ہے) آخر منصور ہی کے ہاتھوں اس فرقہ کا قلع قمع ہوا میرے خیال میں چنداں تعجب کی بات نہیں ہے اس وقت تک ہندوستان میں بڑی اکثریت اپنے راجوں مہاراجوں کو ان داتا مہاراج کے نام سے یاد کرتی ہے ان ہندی میں روزی اور رزق کو کہتے ہیں بجنسہ ان ہی الفاظ کا ترجمہ ہے جنھیں راوندیہ منصور کی طرف منسوب کرتے تھے۔۱۲

[1] حالانکہ مرو میں ابو مسلم شروع شروع میں بیعت لوگوں سے جن الفاظ میں لیتا تھا ان کا ترجمہ یہ ہے کہ میں اللہ کی کتاب اور رسول اللہ ﷺ کی سنت پر بیعت کرتا ہوں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اہل بیت کی رضامندی و فرماں برداری کا معاہدہ کرتا ہوں اور اپنے حکمرانوں سے کسی قسم کی تنخواہ یا خوراک کا مطالبہ خود میں نہ کروں گا بلکہ وہی جو کچھ مناسب سمجھ کر دیں گے اس پر راضی رہوں گا، بیعت میں یہ شرط بھی لگا رہتا کہ اس عہد کو اللہ کا عہد سمجھتا ہوں، نیز میری بیبیوں کو طلاق اور میرے غلام آزاد ہو جائیں، اگر عہد شکنی کروں اور مکہ تک پیادہ پا حج کرنا مجھ پر لازم ہوگا۔ (ص ۴۲ کامل۔ ج ۵) لیکن قابو پانے کے ساتھ ہی اس نے عباسی دعوت یہ کہتے ہوئے شروع کہ وہ بھی اہل بیت ہی سے ہیں۔۱۲

معلوم ہوتا ہے ابراہیم مرو سے روانہ ہو کر سیدھے امام ابوحنیفہ کے پاس کوفہ پہنچے یاد رکھنا چاہیے کہ یہ عباسیوں کی خلافت کا ابتدائی عہد ہے بغداد کا نقشہ زمین پر کیا ابھی دماغوں میں بھی نہیں آیا ہے کیونکہ اس کی تعمیر تو منصور عباسی نے کی اور ہم جس زمانہ کا قصہ لکھ رہے ہیں یہ عباسیوں کے پہلے خلیفہ ابوالعباس سفاح کا زمانہ ہے گو سفاح نے اپنی زندگی کے آخر دنوں میں انبار کو پایہ تخت خلافت بنالیا تھا جو کوفہ سے اگرچہ زیادہ فاصلے پر نہ تھا لیکن خود کوفہ نہ تھا، مگر انبار سے پہلے اس نے اپنی قیام گاہ ابن ہبیرہ کے قصر ہی کو قرار دیا تھا'' جس کا مطلب یہ ہوا کہ خود کوفہ ہی میں رہتا تھا اور جہاں تک سنین کے ملانے اور دوسرے قرائن سے پتہ چلتا ہے امام کے پاس ابراہیم صائغ اسی زمانے میں آئے ہیں جس زمانہ میں عباسی خلیفہ اسی ابن ہبیرہ کے قصر یا قصر ہی کے قریب ہاشمیہ نامی گڑھی[1] میں رہتا تھا۔

---

[1] مطلب یہ ہے کہ بنی امیہ کو ختم کر کے جب عباسیوں نے عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لی تو قدیم پایہ تخت یعنی دمشق میں رہنا مصلحت کے خلاف سمجھا گیا اور عراق کو مختلف وجوہ سے ترجیح دی گئی کوفہ میں ابن ہبیرہ جس کا بار بار ذکر گذر چکا ہے ایک مستحکم اور خوبصورت محل اس کا بنا ہوا تھا اسی میں سفاح نے قیام اختیار کیا اور جلد جلد بہت سے مکانوں کا اس کے ساتھ اضافہ کر کے شاہی آبادی کا نام ''ہاشمیہ'' رکھا گیا لیکن لوگوں کی زبان پر ''قصر ابن ہبیرہ'' مدتوں کا چڑھا ہوا تھا لاکھ کوشش کی گئی کہ ''ہاشمیہ'' کا نام اس کی جگہ چلے، مگر نہ چلا، تب ابن ہبیرہ کے قصر کو چھوڑ کر اس کے سامنے زمین میں ایک جدید آبادی قائم کی گئی جس میں اپنے لاؤ لشکر کے ساتھ خلیفہ نے بھی اپنا محل تعمیر کیا اور اب اس جدید آبادی کا نام ''ہاشمیہ'' رکھا گیا زمانہ تک سفاح اسی میں رہا لیکن پھر مناسب معلوم ہوا کہ کوفہ سے ہٹ کر انبار نامی مقام جو فرات کے ساحل پر تھا اور ایرانی سلاطین کا غلہ خانہ یا انبار خانہ تھا اسی شہر میں پایہ تخت خلافت کو سفاح نے منتقل کر کے بڑی بڑی عمارتیں اس نے اپنے زمانے میں خود بنوائیں اسی میں اس کا چیچک سے انتقال ہوا۔ اس کے بعد منصور جب گدی پر بیٹھا تو کچھ دن وہ بھی انبار ہی کی تعمیر و تجدید میں مصروف رہا۔ لیکن حالات نے اس کو بالکل جدید شہر کی تعمیر پر مجبور کیا بغداد جہاں آباد ہے اسی زمین کا انتخاب کیا گیا اور مدینۃ السلام کے نام سے منصور نے دنیا کے اس شہر کی بنیاد ڈالی جس کا نام عالم کے معاملات میں شاید سب سے زیادہ دلچسپ ہزار ہا ہزار روایات کا سرچشمہ ہے دس ہزار مزدور بغداد کی تعمیر میں کام کرتے تھے والقصہ ایلو مہا

ابو مسلم کی مخالفت پر حضرت امام اور ابراہیم کا اتفاق:

بہر حال ابراہیم امام کے سامنے پہنچتے ہیں جہاں تک معلوم ہوتا ہے سارا قصہ ابتداء سے انتہا تک امام کے سامنے دہراتے ہیں اور جس خطرے کو ابو مسلم اسلام کے سامنے لا رہا تھا۔ اس سے آگاہ کرتے ہیں امام کا بیان ہے کہ اس کے بعد اس شخص نے مجھ سے اس مسئلہ پر بحث کرنی شروع کی کہ جو کچھ ہو رہا ہے کیا اس کا مقابلہ مسلمانوں کا فرض نہیں ہے؟ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دونوں میں اس مسئلہ پر دیر تک بحث ہوتی رہی، کیونکہ آخر میں امام کے الفاظ ہیں کہ:

الی ان اتفقنا علی انه فریضة من الله تعالی. ہم دونوں نے اس پر اتفاق کر لیا کہ (مقابلہ کے لیے کھڑا ہونا) خدا کی طرف سے فرض ہے۔

ابراہیم کا حضرت امام سے بیعت جہاد کے لیے ہاتھ بڑھانا

کلام کا یہ طرز بتا رہا ہے کہ رد و قدح کا کوئی طویل سلسلہ اس کے پیچھے چھپا ہوا ہے امام فرماتے ہیں کہ اس مسئلہ کو طے کر لینے کے بعد میں نے دیکھا کہ ابراہیم اپنا ہاتھ بڑھائے ہوئے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ

مدیدک حتی ابایعک. ہاتھ بڑھایئے تاکہ میں بیعت کروں۔

یہ مرید ہونے کی بیعت نہیں تھی بلکہ اس وقت کرۂ زمین کی کہیے یا کم از کم اس علاقے میں سب سے بڑی قہرمانی طاقت جس کی حکومت بن چکی تھی ابراہیم اسی طاقت سے ٹکرانے کے لیے امام ابو حنیفہ کے ہاتھ پر بیعت کرنا چاہتے تھے۔ مطلب ان کا یہ تھا کہ جب یہ طے ہو چکا کہ خدا کی طرف سے فرض عائد ہو چکا ہے تو اب اٹھیے اور خدا کے فرض کو پورا کیجئے۔ یاد رکھنا چاہیے کہ یہ سارا معاملہ کوفہ میں ہو رہا تھا۔ اسی کوفہ میں جس کا ہاشمیہ گویا ایک محلّہ تھا اور نئی نئی قائم ہونے والی حکومت کے خفیہ کارندے ہر گھر میں آنکھیں پھاڑے پھاڑے دیکھ رہے ہیں کہ کہاں کیا ہو رہا ہے۔ امام ابو حنیفہ زید شہد کے ایام خروج ہی میں سیاسی دلچسپی اور رجحانات کے معاملہ میں کافی بدنام ہو چکے تھے اور نئی

قائم ہونے والی حکومت کے متعلق گو امام کے رویہ کا ابھی لوگوں کو پتہ نہیں چلا تھا بلکہ سفاح کی تقریر کے بعد امام نے جو الفاظ علماء کوفہ کی طرف سے فرمائے تھے جن کا ذکر گذر چکا ہے ان کی بنیاد پر بھی حسن ظن قائم کیا جا سکتا تھا کہ موجودہ حکومت سے مطمئن ہیں اور یوں بھی جہاں تک قیاس کا اقتضا ہے بعد کو امام نے جس طرز عمل کو بھی حکومت عباسیہ کے مقابلہ میں اختیار کیا ہو لیکن اس زمانہ میں ابراہیم نے موجودہ حکومت کے مقابلہ میں اس مہم کے لیے آمادہ کرنا چاہا جو عباسیوں کی حکومت کا ابتدائی دور تھا اس زمانے میں وہ فرصت کے اوقات کو غنیمت شمار کر کے ان سے فائدہ اٹھانا چاہتے تھے بہ ظاہر ان کی نیت یہ تھی کہ پہلے وضع قوانین کے مسئلہ سے فراغت حاصل کر لی جائے دل میں ان کے کون کون سے ارادے تھے اس کا پتہ تو بعد کو چلا لیکن سر دست ہر چیز سے الگ ہو کر معصومانہ ماحول میں ایک ایسے پر امن شہری کی زندگی گذار رہے تھے جو ایک طرف تجارتی کاروبار اور دوسری طرف حلقہ بنا کر طلبہ کو فقہ کی تعلیم دینے میں مصروف نظر آ رہا ہو۔

لیکن ابراہیم الصائغ کے حسن ظن اور اپنی روشنی طبع نے اچانک ان کو ایک عجب مخمصے میں مبتلا کر دیا۔ امام پر جو حال ابراہیم کے ہاتھ بڑھانے کے بعد طاری ہوا۔ خود اس کا اظہار ان الفاظ میں کیا کرتے تھے کہ

فاظلمت الدنيا بيني و بينه. میرے اور ابراہیم کے سامنے دنیا گویا تاریک ہو گئی۔

کیا جان کے خوف سے امام کی یہ حالت ہوئی؟ میں اس کا خود کیا جواب دے سکتا ہوں جس نے "حق پژوہی" اور راست بازی ہی کی راہ میں جان دی، اسی کے متعلق یہ خیال ظاہر ہے کہ منطقی تناقض ہے جہاں تک میں سمجھتا ہوں اور جیسا کہ آئندہ امام کے بیان سے معلوم بھی ہوتا ہے کہ اچانک سخت کش مکش کی حالت میں مبتلا ہو جانے کی وجہ سے ان پر یہ حالت طاری ہوئی۔ ایک طرف ابراہیم کی صداقت و اخلاص ان کے دلائل کی قوت ضرورت کی شدت کا تقاضا یہ تھا کہ ابراہیم کی درخواست کو بغیر رد و کد کے فوراً قبول کر لیں اور جس حال میں تھے کھڑے ہو جائیں لیکن اس کا انجام بھی سامنے تھا۔ اس

انجام کو دیکھ کر امام خیال کرتے ہوں گے کہ جو پروگرام میں نے بنایا ہے وہ خاک میں مل جائے گا۔ کامیابی نہ اس راہ سے ہوگی اور جو راہ میں ۔نے سوچی ہے وہ بھی ہمیشہ کے لیے بند ہو جائے گی۔ دل کی حالت کا جاننے والا تو علام الغیوب علیم بذات الصدور ہی ہے لیکن بہ ظاہر میری سمجھ میں یہی بات آئی ہے۔

حضرت امام کا جواب:

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک فوری حال تھا جس میں اچانک وہ مبتلا ہو گئے تھے تاہم اپنے آپ کو امام نے سنبھالا اور سنجیدگی کے ساتھ ابراہیم کو مخاطب فرماتے ہوئے کہا کہ آخر میں تمہاری بیعت کس لیے لوں۔

معلوم ہوتا ہے کہ ابراہیم نے پھر کوئی طویل تقریر کی خلاصہ اس کا امام نے اپنے الفاظ میں یہ بیان کیا ہے کہ

دعا لی الی حق من حقوق الله.	اللہ کے حقوق میں سے ایک حق کی طرف ابراہیم نے پھر مجھے دعوت دی۔

تب امام نے ابراہیم کو سمجھانا شروع کیا اس تقریر کے بعض اجزاء کا ذکر پہلے ہی کچھ کیا جا چکا ہے اس وقت پوری تقریر نقل کی جاتی ہے امام نے فرمایا کہ

> "میں نے بیعت لینے سے انکار کیا اور کہا کہ اس حق کو ادا کرنے کے لیے ایک دو آدمی اگر کھڑے ہوں گے تو قتل کر دیئے جائیں گے اور مخلوق خدا کے لیے کام کی کوئی بات انجام نہ دے سکیں گے۔"

اس کے بعد اس قسم کی مہم کے لیے جس تنظیمی و اجتماعی قوت کی قدرتی ضرورت ہے اس کی طرف توجہ دلاتے ہوئے آپ نے فرمایا:

ولكن ان كان وجد عليه اعوانا صالحين ورجل يرء س عليهم ملعونا على دين الله. (ص ۵)	البتہ اگر اس کام کی سرانجامی میں کچھ اچھے صالح لوگ مددگار بن جائیں اور ان لوگوں کا کوئی سر دھرا ایسا آدمی ہو جس کے دین پر بھروسہ کیا جا سکتا ہو۔

یعنی تین چیزوں کی ضرورت امام نے جتائی۔

(۱) پہلی بات تو یہی ہے کہ اس قسم کے کام میں افراد کامیاب نہیں ہو سکتے بلکہ اچھے صالح رفقا اور مددگاروں کی ضرورت ہے۔

(۲) صرف عوام کے غیر منظم گروہ سے بھی کام نہیں چلتا کسی وحدت کے ساتھ کثرت کی شیرازہ بندی کے بغیر بھی کامیابی نہیں ہو سکتی ہر شخص دماغ بن جائے یا انجن بن جائے اور اپنی اپنی رائے پر اصرار کرنے لگے تو خواہ کتنا ہی بڑا اجتماع ہو کثرتوں کے ایک پراگندہ مجموعہ سے زیادہ اس کی اور کوئی حیثیت نہ ہوگی۔ ضرورت ہے کہ دماغ کے ساتھ دوسرے لوگ ہاتھ پاؤں بنیں یا کسی کو انجن بنا کر لوگ اپنے آپ کو گاڑی بنا کر اس انجن کے ساتھ اپنے آپ کو جوڑ دیں۔

(۳) ایمانی اور دینی حالت اس کی درست ہو یعنی دین میں منافق یا کمزور نہ ہو راست باز اور پختہ ہو۔

جس کا حاصل یہی ہوا کہ باطل کا مٹانا اور حق کو آگے بڑھانا یا امر بالمعروف نہی عن المنکر اگرچہ ہر مسلمان کا قرآنی فریضہ ہے۔ لیکن تمام فرائض قرآنی کی نوعیت یکساں نہیں ہوتی۔ آخر نماز بھی فرض ہے اور حج بھی۔ لیکن حج کے لیے استطاعت سبیل کی شرط ہے جو نماز کے لیے نہیں ہے۔ امام ہی کے الفاظ اس کے بعد یہ بھی ہیں کہ:

هذه فريضة ليست كالفرائض	بلاشبہ یہ بھی فرض ہے لیکن ایسا فرض نہیں ہے
يقوم لها الرجل وحده (ص	جس کے لیے تنہا ایک آدمی کھڑا ہو جائے۔

پھر ایک خاص شبہ کا جیسا کہ میرا خیال ہے امام نے جواب دیا ہے' مطلب یہ ہے کہ حضرات انبیاء علیہم السلام کو تو دیکھا گیا ہے کہ باطل کے مقابلہ میں وہ تن تنہا کھڑے ہو گئے امام کی فہمائش کے یہ الفاظ

هذا الامر لا يصلح لواحد ما	تنہا کسی آدمی کے بس کی بات نہیں ہے پیغمبروں کے
اطاقته الانبياء حتى عقدت	لیے بھی یہ صورت حال اسی وقت قابل برداشت
عليه من السماء (ص ۵۰)	ہوئی جب آسمان پر ان کے لیے عہد باندھا گیا۔

امام صاحب کا بہ ظاہر مقصد یہی معلوم ہوتا ہے کہ الوالعزم پیغمبروں کو بھی دیکھا گیا ہے کہ اپنے آپ کو باطل کے مقابلے میں تنہا پا کر اس خطرے کو انھوں نے پیش کیا ہے جس کا اندیشہ بہر حال ایسی صورت میں کیا جاتا ہے مثلاً موسیٰ علیہ السلام کو جب فرعون کے مقابلہ میں بھیجا جا رہا تھا حالانکہ بھیجنے والا قادر مطلق تھا۔ پھر بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے بشری احساس کا اظہار بارگاہِ رب العزت میں بایں الفاظ فرمایا کہ:

ربنا اننا نخاف ان یفرط علینا او یطغی (طه) — موسیٰ اور ہارون نے کہا کہ پروردگار ہمیں اندیشہ ہے کہ فرعون ہم پر زیادتی کرے اور سرکشی سے کام لے۔

جب حق تعالیٰ کی طرف سے بایں الفاظ کہ

قال لاتخافا اننی معکما اسمع واری. — تم دونوں کسی قسم کا اندیشہ نہ کرو میں تم دونوں کے ساتھ سن رہا ہوں اور دیکھ رہا ہوں۔

امام کے الفاظ کو پیغمبروں کے لیے یہی یہ صورت حال اسی وقت قابل برداشت ہوئی جب آسمان پر ان کے لیے عہد باندھا گیا اس میں میرے نزدیک یہ یا اسی قسم سے دوسرے واقعات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

امام صاحب کی غرض یہ ہے کہ پیغمبروں کو تو خیر اس کا موقعہ بھی تھا لیکن ایک عامی آدمی جس کے پاس اس قسم کا کوئی آسمانی وثیقہ نہیں ہے۔ کیسے ایسے کام کی جرأت کر سکتا ہے اسی کے ساتھ امام نے ابراہیم کے سامنے وہ باتیں بھی دہرائیں جن کا ذکر امام کے سیاسی مسلک کی تنقیح کرتے ہوئے میں پہلے کر چکا ہوں یعنی بغیر تنظیمی قوت کے فراہمی کے اس قسم کے خطرات میں پل پڑنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک بڑا قیمتی سرمایہ (جان عزیز) مفت کسی قیمت کے بغیر ضائع ہو جاتی ہے جب اتنی بڑی قربانی پر آدمی آمادہ ہی ہو گیا ہے تو کچھ قیمت حاصل کر کے مرنا یہ زیادہ مفید ہے عربی کے الفاظ یہ ہیں کہ

وهذا امتی امر به الرجل وحده اشاط بدمه (ص) — اور جب تنہا کوئی آدمی اس کے لیے اٹھ کھڑا ہوگا تو بے قیمت اپنے خون کو رائیگاں کرے گا۔

اشاط بدمه عربی زبان کا محاورہ ہے منتہی الارب میں ہے شاط دمه (رائیگاں رفت خوں لو) اسی کے ساتھ آپ نے یہ بھی فرمایا کہ

وعرض نفسه مقتل. اور اپنے آپ کو خود قتل کے لیے پیش کرتا ہے۔

جیسا کہ پہلے عرض کر چکا ہوں کہ اس قسم کے مواقع میں قتل ہو جانے کی وجہ سے گو آدمی خودکشی کا مجرم تو نہیں قرار دیا جاتا ہے بلکہ ہمارے حنفی فقہاء کا فتویٰ ہے کہ باطل کے مقابلہ میں تنہائی اور ضعف کی وجہ سے اگر باطل والوں کے مظالم کے سہنے کی صلاحیت ہو اور اپنے دل پر اعتماد ہو کہ جو تکلیفیں اس راہ میں پہنچیں گی، ان کی شکایت لوگوں سے کرنا نہ پڑے گی تو ایسی صورت میں مقابلہ کے میدان میں اترنا اور ظالموں کو ان کے ظلم پر ٹوکنا صرف یہی نہیں کہ جائز ہے بلکہ "هو مجاهد" سمجھا جائے گا کہ اس نے جہاد کے فریضہ کو ادا کیا۔ ظالم بادشاہ کے سامنے حق بولنا سب سے بڑا جہاد ہے'' اس حدیث سے جو ترمذی، ابوداؤد وغیرہ میں ہے، فقہاء حنفیہ نے استدلال کیا ہے۔ بلکہ دلچسپ لطیفہ اس سلسلہ میں یہ ہے کہ ان ہی ابراہیم الصائغ کے حوالہ سے امام ابوحنیفہ کی طرف ایک روایت فقہ وحدیث کی کتابوں میں منسوب کی گئی ہے میں نے شاید پہلے بھی اس کو نقل کیا ہے حاصل جس کا یہی ہے کہ ابن عباس رسول اللہ ﷺ کا فرمان اس حدیث کو قرار دیتے تھے کہ '' ظالم حکمراں کے سامنے معروف کے امر اور منکر کی نہی کے لیے جو کھڑا ہوا وہ اور حمزہ بن عبدالمطلب یہ دونوں شہداء کے سردار ہیں'' بہ ظاہر اس کا مطلب یہی ہے کہ اس مہم میں جو قتل کر دیا جائے گا اس کو شہادت کا وہی مقام حاصل ہوگا جو سیدنا حضرت حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو عطا کیا گیا ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسی گفتگو کو موقعہ پر ابراہیم الصائغ نے امام کے سامنے یہ روایت جو عکرمہ مولی ابن عباس سے انھوں نے سنی تھی پیش کی تھی۔ بہرحال اخروی انعام واکرام یہ دوسری بات ہے سورۂ یٰسین میں اس شخص کا جو رسولوں کے پاس شہر کے کنارے (یعنی اقصی المدینہ) سے آیا تھا مفسرین جس کا نام حبیب نجار بتاتے ہیں ان کے قصے سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے قرآن میں ان کا یہ قول نقل کیا گیا ہے۔

يا ليت قومي يعلمون بما غفرلي ربي وجعلني من المكرمين.   کاش! میری قوم جانتی کہ خدا نے مجھے بخش دیا اور عزت والوں میں مجھے شریک فرمادیا۔

اور ظاہر ہے کہ یہ بیچارے حبیب نجار بھی پیغمبر نہ تھے۔ بلکہ ابھی تازہ ایمان لانے والوں میں تھے فرعون نے حضرت موسیٰ کے مقابلہ میں جن جادوگروں کو پیش کیا تھا اور حضرت موسیٰ کے معجزے کو دیکھ کر ایمان لے آئے تھے۔ ان کو بھی دیکھا جاتا ہے کہ قتل پر آمادہ ہو گئے اور ان کی یہ آمادگی قرآن میں محل ستائش قرار پائی۔

پس بات وہی ہے جو پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ جہاد کے اسلامی قانون کی بنیاد صرف افادے ہی پر مبنی نہیں ہے بلکہ افادے کے ساتھ ابتلاء پر بھی مشتمل ہے ایسی صورتوں میں اپنے آپ کو قتل کرا دینے سے فائدہ تو کچھ حاصل نہیں ہوتا لیکن

جان دی دی ہوئی اسی کی تھی   حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

کے نصب العین کی تکمیل کر کے جان دینے والا اخلاص وصداقت کی امتحان گاہ میں یقیناً کامیابی حاصل کر لیتا ہے۔

لیکن امام کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ جب جان ہی دینے کی ٹھیری تو اس کے معاوضہ میں بڑی سی بڑی جس قیمت کا حصول ممکن ہو اس کو حاصل کر کے اسلام اور مسلمانوں کو جو فائدہ پہنچایا جا سکتا ہے اس کو خواہ مخواہ قتل ہو کر ضائع نہ کرنا چاہئے ابن المبارک سے روایت کے نقل کرنے والوں میں سے بعضوں نے امام کی طرف یہ بھی منسوب کیا ہے کہ خلافت آدم کے قرآنی قصے میں ملائکہ نے انسان پر اعتراض کرتے ہوئے خدا سے جو یہ کہا تھا کہ "آپ زمین میں کیا اس مخلوق کو پیدا کرنا چاہتے ہیں جو اس میں فساد برپا کریں گے اور خون بہائیں گے" امام نے ابراہیم کو یہ قرآنی آیت یاد دلائی اگر واقعی امام ابوحنیفہ نے یہ آیت بھی آخر میں تلاوت کی تھی تو بظاہر ان کا منشا یہ معلوم ہوتا ہے کہ جب قتل ہو جانے اور نہ ہو جانے، دونوں کا شرعاً اختیار دیا گیا ہے تو مذکورہ بالا آیت کی رو سے بھی قتل کے پہلو کو بلاوجہ اختیار کر لینا مناسب نہیں ہے اور گو قرشیؒ کے طبقات میں یہ اضافہ نہیں ہے۔ لیکن علامہ ابوبکر الجصاص نے اپنی تفسیر میں امام کے بیان کو جن الفاظ میں درج کیا ہے

ان میں آخری فقرہ یہ بھی ہے میں نے پہلے بھی اس کا ذکر کیا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ

"اپنے آپ کو جابرہ سے ٹکرا کر قتل کرا دینے میں ایک اور مصلحت بھی مانع ہے وہ یہ کہ اس قتل کے بعد اندیشہ ہے کہ دوسروں کے حوصلے بھی باطل کے مقابلہ پست ہو جائیں گے۔"

بلاشبہ یہ ایک عام نفسیاتی مسئلہ ہے، تڑپتی ہوئی لاش اور بہتے ہوئے خون کو دیکھ کر فطرتاً انسان غیر معمولی طور پر متاثر ہوتا ہے گویا فائدہ تو الگ رہا امام نے توجہ دلائی کہ اس جسارت بے جا میں ایک نقصان کا پہلو بھی مضمر ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ ابومسلم کے مقابلہ میں ابراہیم کا ایمانی جوش جس خونی تماشے کے پیش کرنے پر ان کو آمادہ کر رہا تھا امام نے اپنی پوری ذہانت سے اس ارادے سے ان کو باز رکھنے پر خرچ کی لیکن ابراہیم کچھ طے کر چکے تھے امام کی فہمائش ان کو متاثر کرنے میں کامیاب نہیں ہو رہی تھی اسی روایت میں امام ہی کی زبانی یہ بھی منقول ہے یعنی امام فرماتے تھے کہ

وکان یتقاضی ذلک کلما قدم علی تقاضی الفریم الملح وکلما قدم علی تقاضانی.

مجھ سے اس مہم میں شریک ہو جانے کے لیے ابراہیم تقاضا کرتے ایسا سخت تقاضا جیسے کوئی قرض خواہ اصرار و تشدد کے ساتھ قرض دار سے تقاضا کرتا ہو جب کبھی ابراہیم میرے پاس آتے اسی کا تقاضا کرتے۔

صاحب طبقات اور علامہ جصاص دونوں نے اپنی اپنی کتابوں میں ان الفاظ کو درج کیا ہے ان ہی الفاظ کو دیکھ کر میں تو اس نتیجہ تک پہنچا ہوں کہ امام ابوحنیفہ اور ابراہیم الصائغ کو درج کیا ہے یہ قصہ ایک ہی دفعہ پیش نہیں آیا ہے بلکہ بہ ظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ امام رحمۃ اللہ علیہ کے سمجھانے بجھانے سے وقتی طور پر ابراہیم کا خیال شاید کچھ بدل جاتا تھا۔ لیکن مرو پہنچ کر ابومسلم کے حرکات پر ان کی نظر جب پڑتی تو پھر آپے سے باہر ہو جاتے ایمانی جوش ان کو پھر ادائے فرض پر آمادہ کر دیتا تھا مرو سے پھر مشورہ کرنے اور اپنا ہم نوا

بنانے کے لیے وہ امام ابوحنیفہ کے پاس آتے تھے چونکہ ابومسلم نے اپنے کاروبار کا آغاز خراساں میں ۱۲۹ھ رمضان سے شروع کیا تھا کچھ دن تو مخالف قوتوں کو زیر کرنے میں خرچ ہوئے۔ لیکن مادہ پکا ہوا تھا[1] نصر بن سیار جو بنی امیہ کی طرف سے خراسان کا گورنر تھا شکست کھا کر شہر بہ شہر مارا پھرتا تھا آخر رے پہنچ کر بے چارا مارا گیا اور سارے خراسان کا حاکم مطلق ابومسلم بن گیا۔ نصر بن سیار کا انتقال ۱۳۱ھ میں ہوا۔ گویا سمجھنا چاہیے کہ ابومسلم بس اسی سال سے سارے خراسان پر ۱۳۶ء تک حکمراں رہا۔ ۱۳۶ء میں عباسی خلیفہ اول السفاح کی دعوت پر بڑی مشکلوں سے وہ عراق گیا۔ گویا چھ ساڑھے چھ سال کے بعد واپس ہوا اس عرصے میں گو سمرقند، بخارا، رے اور خراسان کے دوسرے شہروں کا بھی دورہ کرتا رہتا تھا۔ لیکن مستقر اس نے مرو ہی کو قرار دیا تھا جہاں پہلے بھی بنی امیہ کے گورنر رہتے تھے۔ یہی وجہ ہے جو ابراہیم الصائغ کو اس کے ظاہری اور باطنی کارروائیوں سے واقف ہونے کا اور بہت قریب سے موقعہ ملتا رہا اور وہی چیز[2] جس کا احساس بعد کو خود عباسی خلفاء

---

[1] حتی کہ ابوجعفر منصور جس کے ہاتھ سے وہ قتل ہوا ایک دفعہ السفاح کو بھی ابومسلم کے قتل پر آمادہ کرتے ہوئے اس سے کہا تھا کہ ان کامیابیوں میں ابومسلم کا کوئی کمال نہیں ہے منصور نے کہا کہ ولعشت سنورأ مقام مقامہ (طبری ج۹ ص ۱۵۳) یعنی آپ کسی بلے کو بھی اس موقعہ پر خراسان بھیج دیتے تو جو کام ابومسلم نے کیا وہی کام آپ کا بھیجا ہوا بلا بھی انجام دے سکتا تھا' کچھ بھی ہو ابومسلم کی کامیابیاں خراسان میں غیر معمولی تھیں اپنی گورنری اور حکمرانی کے اس چھ سال میں دور دور کے سرحدی ممالک سے بھی اس کا مقابلہ ہو حتیٰ کہ چین والوں سے بھی اس کی فوج لڑی کامل میں ہے کہ چینی ظروف جن پر سونا چڑھا ہوا تھا اور چین کے ریشمی تھان فتوحات میں ابومسلم کے پاس جب پہنچے تو بڑا مسرور ہوا۔ (ص ۱۷۰ ج ۵)

[2] مطلب یہ ہے کہ دشمنوں اور مخالف قوموں سے خراسان کو خالی کرنے کے بعد ابومسلم کو مسلمانوں پر مظالم توڑنے کا کھلا میدان مل گیا رے کے شہر والوں پر الزام لگا کر کہ یہ سب کے سب سفیانی یعنی بنی امیہ کے شیعہ ہیں قتل کیا حتیٰ کہ جو بیچارے حج کے لیے گئے ہوئے تھے۔ ان تک کی جائداد اراضی اور اموال کے ضبط کر لینے کا حکم دیا جب مکہ سے لوٹ کر حاجیوں کا یہ قافلہ کوفہ پہنچا۔ تب ان کو اس عام ضبطی کا حال معلوم ہوا بے چارے کوفہ ہی میں ٹھہر گئے۔ یہ ۱۳۲ھ کا واقعہ ہے السفاح کے پاس ابومسلم کے اس ظلم کی دادرسی چاہی لکھا ہے کہ سفاح کو ان حاجیوں پر رحم آ گیا اور ابومسلم کے نام لکھا

(السفاح اور منصور) کو ہوا ابراہیم کی آنکھیں براہ راست اس کا مشاہدہ کر رہی تھیں۔

میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ ابراہیم امام کے پاس اس مسئلہ کو لے کر کتنی دفعہ آئے لیکن جتنی دفعہ بھی آئے ہوں ان کے بار بار پلٹ کر آنے سے یقیناً اس کا اندازہ ہوتا ہے کہ امام کی طرف سے ایک دفعہ جواب پالینے کے بعد بھی ابراہیم ان سے مایوس جو نہیں ہوتے تھے اس کی وجہ وہی تھی کہ اختلاف دونوں میں جو کچھ تھا وہ صرف طریقۂ کار میں تھا ورنہ باطل کے مقابلہ میں فرض کے احساس کی آگ دونوں میں برابر لگی ہوئی تھی موجودہ حکومت سے بیزاری اور ممکنہ حد تک اس سے مقابلہ کی کوشش میں دونوں کا سیاسی مذاق ایک یہی تھا مذاق اور طبیعت کی یہی وحدت ابراہیم کو بار بار مایوس ہو جانے کے بعد بھی ان میں اس کی امید پیدا کرتی تھی کہ شاید اب نہیں تو تب امام ابوحنیفہ میری ہم نوائی اور پشت پناہی پر آمادہ ہو جائیں جیسے کسی پر قرض باقی ہو اور قرض خواہ اس سے تقاضا کرتا ہے اسی طرح بقول امام ابوحنیفہ ابراہیم کا امام سے تقاضا کرنا یہ بھی اس اعتماد کی دلیل ہے جو نفس

لے فرمان بھیجا کہ حاجیوں کے مال سے ضبطی اٹھائی جائے لیکن اس پر بھی اس نے سفاح کو لکھ بھیجا کہ یہ لوگ قابل رعایت نہیں ہیں۔ مگر سفاح نے جب دوبارہ اصرار کے ساتھ واپسی کا حکم دیا تو قہراً جبراً اس کی تعمیل کی۔ (کامل ابن اثیر ص ۱۴۸) لکھا ہے کہ السفاح کے فرامین کا مضحکہ اڑاتا تھا' اٹھا کر پھینک دیتا تھا آخر عباسی چونکے خود السفاح نے ۱۲۵ھ میں خراسان کے ایک فوجی جنرل زیاد بن صالح کو یہ راز لکھا کہ جس طرح ممکن ہو ابو مسلم کو قتل کر دو لیکن وہ کامیاب نہ ہو سکا۔ اسی کے بعد السفاح نے اس کو اپنے پاس بلایا اور ابو مسلم نے السفاح کو لکھا کہ حج کی اجازت ہو تو حاضر ہو سکتا ہوں اس کا ارادہ تھا کہ فوج کے ساتھ عرب روانہ ہو اور خراسان کے فتوحات سے جو دولت جمع کی تھی عربوں میں تقسیم کر کے ان کو اس ذریعہ سے ہم نوا بنایا جائے السفاح نے اس کی بدنیتی کا اندازہ کر لیا اپنے بھائی منصور کو جو بعد کو خلیفہ ہوا اور اس وقت موصل کا گورنر تھا خط لکھا کہ ابو مسلم کے پہنچنے سے پہلے تم حج کا اعلان کر دو تا کہ امیر الحاج بننے کا موقعہ ابو مسلم کے لیے باقی نہ رہے بہر حال یہی ہوا جس کا ابو مسلم کو آخر وقت تک صدمہ تھا السفاح نے فوج کو ساتھ لانے کی بھی ممانعت کر دی کہتے ہیں کہ ابو مسلم کو جب معلوم ہوا کہ منصور نے بھی حج کا اعلان کیا ہے تو بار بار کہتا تھا کہ اس سال کے سوا اور کوئی سال حج کے لیے منصور کو نہیں ملتا تھا لاکھوں لاکھ روپے کی داد و دہش عربوں کے ساتھ اس نے کی اور اسی حج سے واپسی کے درمیان ہی میں السفاح کی وفات کی وجہ سے منصور خلیفہ ہو گیا جس نے ابو مسلم کا خاتمہ کیا۔۱۲

مسئلہ کی حد تک ابراہیم امام پر رکھتے تھے۔

کچھ بھی ہو اندر دونوں کا سچ پوچھئے تو ایک ہی تھا البتہ بے چارے ابراہیم میں صرف ایمانی جوش تھا اس جوش کو عقل اور تدبیر کی راہ نمائی میں استعمال کرنے سے وہ معذور تھے لیکن امام چاہتے تھے کہ ایمان کی اس حرارت سے اگر کسی چیز کے تیار کر لینے کا امکان ہو خواہ وہ کوئی معمولی ہنڈیا ہی کیوں نہ ہو تو اس موقعہ کو کیوں کھویا جائے اسی بیان کی بعض روایتوں میں ہے کہ امام نے ابراہیم کو سمجھانے بجھانے کے بعد آخر میں اپنے مسلک کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا کہ

ولکنه ینتظر الجصاص (ص ۳۳ ج ۱) لیکن چاہئے کہ انتظار کیا جائے۔

جس کا مطلب جیسا کہ امام کی آئندہ طرز عمل سے پتہ چلتا ہے یہی معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی کسی باضابطہ اجتماعی تنظیم میں شریک ہو کر مقابلہ کا موقعہ اگر مل گیا تو میں اس میں شریک ہو کر فرض سے سبک دوشی حاصل کر لوں گا ورنہ انتظار کی ان گھڑیوں میں جس حد تک حق کو آگے بڑھانے اور باطل کو پیچھے ہٹانے کے امکانات ملتے چلے جائیں گے ان امکانات سے نفع اٹھانے کی کوشش کرنے میں زندگی کے اوقات گذاروں گا اور یہ عجیب اتفاق ہے کہ امام کے سامنے دونوں صورتیں آئیں جس کی تفصیل ابھی آپ کے سامنے آئے گی۔

ابراہیم کا ابومسلم کے سامنے احقاق:

لیکن اس سے پہلے بے چارے ابراہیم الصائغ کا جو انجام ہوا ہے اسے بھی سن لینا چاہئے اس سلسلے میں ایک روایت تو وہ ہے جو امام ابوحنیفہ کے حوالہ سے کتابوں میں درج کی گئی ہے اور دوسرے اجزاء طبقات ابن سعد کی روایتوں میں ملتے ہیں ساری روایتوں کو ملانے کے بعد واقعہ کی جو ترتیب میرے دماغ میں آئی ہے وہ یہ ہے کہ بالآخر بار بار عرض کرنے کے بعد جب امام رحمۃ اللہ علیہ سے ابراہیم کو مایوسی ہوگئی تو آخری فیصلہ کر کے وہ کوفہ سے مرو روانہ ہوئے اور ابومسلم جو مرو کی آخری اقتداری طاقت کے قالب ہیں وہاں حکمرانی کر رہا تھا ذرا ذرا سی بات پر گردنیں اڑوا رہا تھا۔ ابھی کچھ دیر پہلے کہیں میں

نے نقل کیا ہے کہ سیاہ لباس کیوں اختیار کیا گیا ہے۔صرف اس سوال پر پوچھنے والے کی گردن اڑادی گئی خود ہی سوچنا چاہیے کہ صبرا (یعنی فوجی مقابلے میں نہیں بلکہ سامنے کھڑا کرکے) اس کے حکم اور ہاتھ سے قتل ہونے والوں کی تعداد باتفاق مورخین چھ لاکھ تک بتائی گئی ہے ایسے شخص کی جباریت اور قہرمانیت کا کیا حال ہوگا لیکن ایمان ویقین کے نشہ میں مست احساس فرض کے جذبہ سے بے چین ابراہیم اپنے طے شدہ ارادے کے ساتھ مروا کرسید تھے اس کے دربار میں پہنچتے ہیں جیسا کہ معلوم ہو چکا ابومسلم اور ابراہیم میں دیرینہ تعلقات تھے ان کے علم وفضل دیانت وتقویٰ سے خوب واقف تھا اس لیے ابومسلم کے دربار میں ان کا آنا کسی اجنبی دیوانے خبطی آدمی کا آنا نہ تھا لیکن خلاف معمول پہنچنے کے ساتھ ہی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابراہیم نے ابومسلم کے سامنے ایک تقریر کی افسوس ہے کہ بیان کرنے والوں نے تقریر کے الفاظ نقل نہیں کیے ہیں ابن سعد نے صرف اتنا لکھا ہے

ان ابراهيم الصائغ اتى ابا مسلم فوعظه (ص ۱۳ ج۷) قسم دوم)	ابراہیم صائغ ابومسلم کے پاس آئے اور اس کو نصیحت کرنے لگے۔

چاہیے تو یہی تھا کہ اسی تقریر کے بعد جس انجام کو سوچ کر انھوں نے تقریر کی تھی وہ سامنے آجاتی یعنی قتل ہو جاتے لیکن ابراہیم کوئی معمولی آدمی نہ تھے ان کے دین وتقویٰ کا سارے خراسان بلکہ اس زمانے کے عام اسلامی ممالک پر اثر تھا لکھا ہے کہ تقریر کو ابومسلم نے بڑے ضبط وسکون کے ساتھ سنا اور بجائے اپنے اظہار غیظ وغضب کے اس نے ان سے صرف یہ کہا کہ

''آپ کی رائے مجھے معلوم ہوگئی اچھا تو اپنے مکان تشریف لے جایئے۔''

(ص ۱۰۳۔ابن سعد)

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پہلی دفعہ وہ واپس ہو گئے لیکن جیسا کہ امام ابوحنیفہ کے بیان سے معلوم ہوتا ہے وقفہ کے بعد پھر پہنچے اور اس دفعہ کلمہ بکلام غلیظ (ذرا تیز وتند لہجہ میں ابومسلم کو آپ نے خطاب کیا) اس دفعہ بھی قتل کا حکم ابومسلم نہ دے سکا۔ بلکہ صرف گرفتار کرلیا امام ابوحنیفہ کا بیان ہے کہ ابراہیم کی گرفتاری کی خبر جس وقت مرواور

اس کے اطراف میں مشہور ہوئی تو

فاجتمع علیه فقهاء اهل خراسان و عبادهم.

خراسان کے علماء اور مشائخ ابومسلم کے پاس جمع ہوئے۔

بالآخر اہل علم و دین کے اس مجمع کے اصرار پر ابراہیم کو اس نے اس دفعہ بھی چھوڑ دیا ممکن ہے کہ لوگوں کے کہنے سننے سے کچھ دن ابراہیم رک گئے ہوں لیکن امام ابوحنیفہ ہی کا بیان ہے کہ پھر پہنچے اور تند و تیز لہجہ میں اس کے حرکات پر متنبہ کرنا شروع کیا واللہ اعلم کیا صورت پیش آئی کہ اس دفعہ بھی ابومسلم نے صرف ڈانٹ ڈپٹ جھڑکیوں سے کام لیتے ہوئے ان کو چھوڑ دیا۔

ابومسلم کا ابراہیم کے قتل کے لیے قانونی حیلہ:

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تیسرے حملے کے بعد ابومسلم کی نیت بدل گئی اور ابراہیم کے متعلق وہ دوسری فکریں کرنے لگا۔

ابن سعد کے روایت سے پتہ چلتا ہے کہ قانونی گرفت میں لاکر ان کے خاتمہ کے لیے اس نے ایک مسودہ تیار کیا گذر چکا کہ اختلاف سے پہلے ابراہیم کے ساتھ محمد بن ثابت العبدی نامی صاحب بھی ابومسلم کے پاس آمد و رفت رکھتے تھے اب واللہ اعلم ابومسلم نے ان کو سازش میں شریک کرلیا تھا یا وہ بھی ناواقف ہی تھے۔ بہرحال قصہ یہ ہے ایک رومی کو ابومسلم نے تیار کیا کہ خفیہ طور پر تم ان دونوں (یعنی ابراہیم الصائغ اور محمدؒ بن ثابت سے) یہ مسئلہ دریافت کرو کہ ابومسلم کے فتک کا اگر ارادہ کیا جائے تو شرعاً اس کا کیا حکم ہے اچانک رو در رو ہوکر کسی پر قاتلانہ حملہ کرنا اسی کو عربی میں فتک کہتے ہیں اس زمانے میں بھی اس کا دستور تھا کہتے ہیں کہ اس کی ہدایت کے مطابق ابومسلم کا گوئندہ دونوں حضرات کے پاس پہنچا اور اسی سوال کو اس نے پیش کیا محمدؒ بن ثابت کے متعلق تو کہا جاتا ہے کہ انھوں نے جواب دیا۔

لا اری ان یفتک به لان الایمان قید الفتک. (ص ۱۰۳)

اچانک قاتلانہ حملہ کرنا میرے نزدیک ابومسلم پر صحیح نہ ہوگا کیونکہ ''ایمان'' اس قسم کے قتل سے مانع ہے۔

''الایمان'' کے لفظ کے متعلق بعضوں کا خیال ہے کہ یمین کی جمع ہے یعنی قسمی معاہدہ کے بعد جس شخص سے پرامن رہنے کا معاہدہ کرلیا گیا ہو اس پر قاتلانہ حملہ کرنا جائز نہ ہوگا یہ محمد بن ثابت نے فتوی دیا لیکن دوسرا احتمال یہ بھی ہے کہ بجائے جمع کے اس کو ''ایمان یعنی مصدر کا صیغہ قرار دیا جائے اور مطلب یہ ہو کہ ایمان کا جو دعویٰ کرتا ہو اس کے قتل کی شریعت کیسے اجازت دے سکتی ہے۔ کچھ بھی ہو محمد بن ثابت نے اس حملہ کو ناجائز قرار دیا۔ لیکن وہی آدمی جب ابراہیم کے پاس آیا اور اسی سوال کو ان پر پیش کیا تو انھوں نے فتویٰ دیا کہ

اری ان یفتک به و یقتل. لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ابومسلم پر اچانک قاتلانہ حملہ بھی کرنا چاہیے اور اس کو قتل کر دینا چاہیے۔

یہ نہیں لکھا ہے کہ یہ فتویٰ زبانی لیا گیا یا تحریری دستخط کے ساتھ ابومسلم نے اس کو حاصل کیا ابن سعد کا بیان ہے کہ اسی فتوے کو وثیقہ اور سند بنا کر ابومسلم نے حضرت ابراہیم کے قتل کا حکم نافذ کیا۔ ہوسکتا ہے کہ یہی واقعہ ہو اور ایمان اگر یمین کی جمع ہے تو ابراہیم کے نزدیک معاہدہ کی پابندی اس لیے ضروری نہ رہی ہوگی کہ جن امور کی پابندی کا اس نے معاہدہ کیا تھا ان کا ارتکاب کر کے معاہدہ کو اس نے توڑ دیا اور ایسی صورت میں مسلمانوں پر بھی معاہدے کی پابندی ضروری نہیں رہتی [1] اور اگر ''ایمان'' کا لفظ سمجھا جائے تو

---

[1] خود قرآن کی متعدد آیتیں اس پر دلالت کرتی ہیں مثلاً **و ان نکثوا ایمانهم بعد عهد هم والعنوانی فی دینکم فقاتلوا** الآیت جس کا مطلب یہ بھی ہے کہ معاہدہ کرنے کے بعد جب معاہدہ کی پابندی انھوں نے نہ کی تو مسلمانو! تم پر بھی تکمیل معاہدہ واجب نہ رہا اور ان سے لڑو معاہدے کے بعد قریش نے بنی خزاعہ کے مقابلہ میں بنی بکر کی خفیہ امداد کر کے معاہدے کو چونکہ توڑ دیا تھا اس لیے آنحضرت ﷺ نے قریش پر چڑھائی فرما دی۔ علامہ ابوبکر الجصاص مذکورہ بالا آیت کے تحت میں لکھتے ہیں کہ **فیه دلالة علی ان اهل العهد متی خالفوا شینا مما عوهدوا علیه وطعنوا فی دیننا فقد نقضو العهد** (یعنی جن سے مسلمانوں کا معاہدہ ہوا اگر ان باتوں میں سے جن کی پابندی معاہدے میں لازم کی گئی ہو کسی ایک بات کی پابندی نہ کریں اور ہمارے دین پر طعنہ کریں تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ معاہدہ انھوں نے توڑ دیا جس سے معلوم ہوا کہ معاہدے کے شرائط میں کسی ایک شرط کے توڑنے سے معاہدہ ختم ہو جاتا ہے۔ ۱۲

ابراہیم پر واضح ہو چکا تھا کہ در پردہ اسلامی حکومت کی الٹنے کی فکر میں ہے۔

بہر حال یہ تو جب ہے کہ ہم یہ مان لیں کہ واقع میں ابراہیم نے یہ فتویٰ دیا تھا۔ لیکن میرا خیال ہے کہ یہ فتویٰ سرے سے جعلی تھا اور صرف ابراہیم کے قتل کے جواز کی قانونی سند حاصل کرنے کے لیے ابومسلم نے کسی کو آمادہ کر کے ان کی طرف اس فتوے کو منسوب کرا دیا اور یہ میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ امام ابوحنیفہ نے ابراہیم کے قتل کے قصے کو جو بیان کیا ہے اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ابراہیم کی طرف جو فتویٰ منسوب کیا گیا ہے وہ ان کا مسلک نہ تھا۔

شہادت سے پہلے ابراہیم کا ابومسلم کے سامنے اپنی تمنا کا اظہار

امام ابوحنیفہ کا بیان یہ ہے کہ ابراہیم ابومسلم کے پاس آخری دفعہ جب آئے تو اس نے کہنا شروع کیا۔

"حق تعالیٰ کی رضا مندی کے لیے اس وقت سب سے بڑی چیز میرے نزدیک یہ ہے کہ میں تجھ سے جہاد کروں کوئی کام اس وقت اس سے بہتر خدا کو خوش کرنے کے لیے میرے نزدیک باقی نہیں رہا ہے۔

اس تمہید کے بعد ان کے آخری الفاظ جو بجنسہ نقل کئے جاتے ہیں یہ تھے کہ

ولاجاهدنک بلساني ليس لي قوة بيدي ولكن يراني الله وانا بغضک فيه (الجصاص والقريشي)

میں قطعاً تجھ سے اپنی زبان سے جہاد کروں گا میرے ہاتھ میں (ہاتھ سے فیصلہ) کا اقتدار نہیں ہے مگر میں تو صرف یہ چاہتا ہوں کہ (میرا مالک) مجھے اس حال میں دیکھے کہ محض اسی اللہ کی وجہ سے میں تجھ سے بغض رکھتا ہوں (صرف اسی کا ثبوت پیش کرنا مقصود ہے)

جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ہاتھ سے ایسے مواقع پر جہاد اور حملہ کرنا جیسا کہ امام ابوحنیفہ کا مذہب ہے یہ عوام کا نہیں بلکہ ان لوگوں کا کام ہے جو صاحب امر

ہوں[1] یہی مسلک ابراہیم کا بھی تھا' البتہ عدم افادہ اور قتل کے اندیشہ کی وجہ سے امر بالاسان (یعنی زبان سے بھی) کہنے کی فرضیت گو ساقط ہو چکی تھی۔ لیکن انھوں نے امام ابوحنیفہ کے سمجھانے کے باوجود عزیمت ہی پر عمل کرنے کا فیصلہ کیا در حقیقت افادہ سے زیادہ اس ایمانی حال کے لحاظ سے جو ان پر طاری تھا ابتلا کے میدان میں کامیابی نے ان کی نگاہوں میں زیادہ اہمیت حاصل کر لی تھی وہ اپنے مالک کے قدموں پر اپنی جان نثار کرنا چاہتے تھے اور ''موت'' جیسے لاینحل عقدے کا حل انھوں نے یہی نکالا تھا کہ خدا کی دشمن کی تلوار ان کو خدا کے پاس پہنچا دے ان کے الفاظ

''میں تو صرف یہ چاہتا ہوں کہ (میرا مالک) اللہ دیکھے کہ صرف اسی اللہ کی وجہ سے میں تجھ سے بغض رکھتا ہوں۔''

---

[1] یہ ہدایہ کے متن کا مسئلہ ہے کہ الامر بالمعروف بالید الی الامراء و باللسان الی غیرہم ص ۴۷۲ کتاب الغصب جس کا مطلب یہی ہے کہ حکومت کا اقتدار جو رکھتے ہیں ان ہی سے اس حکم کا تعلق ہے کہ بزور لوگوں کو حق پر قائم کرنے اور باطل سے ہٹانے کی کوشش کریں لیکن ایک عامی آدمی جو حکومت کے اقتدار سے محروم ہے اس پر صرف زبان سے معروف کا امر اور منکر کی نہی واجب ہے حتیٰ کہ اسی بنیاد پر امام ابوحنیفہ کا فتویٰ ہے کہ گانے بجانے کے آلات جو ممنوعات شرعیہ میں سے ہیں اگر کسی مسلمان کے پاس ہوں اور دوسرا مسلمان اس کو غیر شرعی چیز قرار دیتے ہوئے توڑ دے گا تو اس کو تاوان ادا کرنا پڑے گا کیونکہ اس نے ان حدود میں تصرف کیا ہے جو اس کے فرائض کے دائرہ سے خارج تھے قریب قریب مختلف الفاظ میں مالکی اور شافعی علماء کی کتابوں میں بھی یہی لکھا ہوا ہے یعنی مارنے پیٹنے پر یا قتل و قتال پر آمادہ ہو جانا یہ عام لوگوں کا کام نہیں ہے دیکھئے احکام القرآن ابوبکر بن العربی مالکی اور احیاء العلوم غزالی وغیرہ بہرحال امام ابوحنیفہ کا صحیح مسلک وہی ہے جو جسے صاحب ہدایہ نے نقل کیا ہے اگرچہ اس قسم کے مواقع میں جہاں شدید جسمانی اور جانی ضرر وغیرہ کا اندیشہ ہو جہاد باللسان کی فرضیت بھی ساقط ہو جاتی ہے اور خاموش رہنے کی بھی اجازت ہے صرف دل سے برا جاننا کافی ہے قرآن میں الا ان تتقوا منہ تقاۃ سے جس تقیہ کا ثبوت ملتا ہے وہ یہی ہے عہد نبوت میں مختلف نظائر ملتے ہیں کہ بعض لوگوں نے تقیہ سے کام لیا جیسے عمار بن یاسر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور بعضوں نے اس قصہ پر بھی زبان سے حق کے اظہار پر اصرار کیا تا اینکہ شہید ہو گئے جیسے خبیب بن عدی رضی اللہ تعالیٰ عنہ لیکن عمار پر آنحضرت ﷺ نے کوئی اعتراض نہیں کیا ان ؟ کا عمل تقیہ کے حدود کو متعین کرتا ہے ۱۲۔

ابراہیم کی شہادت:

ان ہی الفاظ سے ان کے دل میں جو ارادہ تھا وہ ظاہر ہو رہا ہے پھر کیا ہوا؟ امام ابوحنیفہ کی روایت میں تو صرف اسی قدر ہے کہ فقتله (پس ابومسلم نے ابراہیم کو قتل کر دیا) لیکن ابن سعد نے اسی واقعہ کو ذرا زیادہ تفصیل سے لکھا ہے یعنی آخری دفعہ یہ سمجھ کر کہ اب کی ابومسلم مجھے زندہ نہ چھوڑے گا تحفظ (یعنی میت کو جو خوشبو وغیرہ لگائی جاتی ہے ابراہیم نے اپنے کپڑوں کو ان سے باسا) اور تکفن (کفن کا کپڑا بھی پہن لیا) اس کے بعد ابومسلم کے سامنے اس وقت آئے جب وہ بھرے دربار میں بیٹھا ہوا تھا ابن سعد کے الفاظ اس کے بعد یہ ہیں کہ

فوعظه وكلمه بكلام شديد فاهر به فقتل وطرح في البسير. (ص ۱۰۳)	ابراہیم نے ابومسلم کو خطاب کر کے نصیحت و وعظ کہنا شروع کیا اور سخت الفاظ استعمال کیئے اسی پر ابومسلم نے حکم دیا بے چارے قتل کر دیئے گئے اور کسی بادل میں ان کی لاش پھنکوادی گئی۔

اور یوں ع: نہ کہیں جنازہ اٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا۔ شاعر کی اس شاعرانہ تمنا کو انھوں نے واقعہ بنا کر دکھا دیا، فرضی اللہ تعالیٰ عنہ

یہاں دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ ابراہیم صائغ نے حالانکہ امام کے مشورے کو نہیں مانا اور جو دھن ان پر سوار تھی اس پر ان کا اصرار باقی رہا لیکن آپ دیکھ رہے ہیں اس اختلاف کا ثمرہ کہ عبداللہ بن مبارک ہی راوی ہیں۔ پہلے بھی ذکر کر چکا ہوں کہ جب ابراہیم کا تذکرہ امام کی مجلس میں آتا رونے لگتے اور کیسا رونا؟ یہ شاعر کی نہیں ایک جلیل وثقہ محدث کی خبر ہے کہ

حتى ظننا انه سيموت (ص ۴۹)	ہم خیال کرنے لگے کہ شاید امام ابوحنیفہ عنقریب مرجائیں گے۔

بات وہی تھی کہ اختلاف صرف راہ میں تھا منزل دونوں کی ایک تھی ابراہیم ابتلاء کی راہ سے پہنچے اور بالآخر امام ابوحنیفہ اپنے آپ کو اس منزل تک پہنچا کر رہے لیکن

افادے کی راہ سے اور اب آپ کے سامنے اسی کی تفصیل آتی ہے۔

مگر قبل اس کے ایک سوال یہاں پیدا ہوتا ہے اس کے جواب پر بھی غور کر لینا چاہئے۔ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ عباسی حکومت کا اس زمانہ میں جو سب سے بڑا معمار بلکہ اساسی ستون بنا ہوا تھا یعنی ابومسلم اس کے مقابلہ میں ایک دفعہ نہیں بار بار ابراہیم کا ابوحنیفہ کے پاس آنا اور پھر جانا اور آمد و رفت کا یہ سلسلہ جاری بھی کہاں تھا کوفہ میں کہہ چکا ہوں کہ قصر بن ہبیرہ ہو یا ہاشمیہ جو اس زمانے میں عباسیوں کا مرکزی مقام بلکہ پایہ تخت ہونے کی حیثیت رکھتے تھے یہ کوفہ کے مفصلاتی محلے تھے زیادہ تر قرینہ یہی ہے کہ ابراہیم کی آمد و رفت کے اس زمانے تک ابھی انبار پایۂ تخت نہیں بنا تھا اور مان لیجئے کہ انبار ہی ہو تو انبار بھی کوفہ سے کتنا دور تھا حیرہ (جو سلاطین مناذرہ کا قدیم پایۂ تخت تھا) اسی کے مقابل سمت میں دریائے فرات کے ساحل پر انبار تھا اور حیرہ کا فاصلہ کوفے سے کتابوں میں بتایا گیا ہے کہ کل چھ میل تھا۔

ابومسلم خراسانی کے ہاتھوں بیکس مقتولوں کی تعداد:

یہ خیال بھی صحیح نہ ہوگا کہ ابومسلم کے چھ لاکھ بے کس اور گمنام مقتولوں میں ایک ابراہیم بھی تھے جن کی حکومت کی نگاہوں میں کوئی اہمیت نہ تھی قطع نظر اپنی ذہنی اور علمی منزلت کے جس کا ادنیٰ ثبوت یہ ہے کہ پہلی دفعہ جب ابومسلم نے ان کو گرفتار کیا تو امام ابوحنیفہ ہی کا یہ بیان گذر چکا ہے کہ

فاجتمع علیه فقهاء اهل خراسان و عبادهم حتی اطلقوه	ابومسلم کے یہاں خراسان کے علماء اور مشائخ جمع ہوئے تا اینکہ ابراہیم کو چھڑا لیا۔

(ص ۵۰ و جصاص جواهر)

صرف مرو نہیں بلکہ عام طور پر خراسان کے فقہا اور عباد کا ابراہیم کی رہائی کے لیے جمع ہو جانا خود ظاہر کر رہا ہے کہ اپنے زمانے میں ان کا مسلمانوں میں کیا مقام تھا۔

علاوہ اس کے ہم دیکھتے ہیں کہ ابراہیم کی شہادت کے برسوں بعد تقریباً چالیس پچاس سال بعد ایک خراسانی محدث جن کا نام نصر بن باب تھا بغداد پہنچتے ہیں حسب

دستور لوگ ان سے حدیث سننے کے لیے جمع ہو جاتے ہیں جن میں دوسروں کے ساتھ امام احمد بن حنبل بھی ہیں۔

بیان یہ کیا جاتا ہے کہ جب تک دوسرے محدثین کی روایتیں نصر سناتے رہے لوگ سنتے رہے لیکن جوں ہی کہ ابراہیم الصائغ کے حوالہ سے انھوں نے ایک دو حدیثیں بیان کیں بجز چند خاص لوگوں کے سارا مجمع اٹھ گیا کسی معمولی آدمی کی نہیں بلکہ خود امام احمد بن حنبل کی چشم دید شہادت ہے الذہبی نے ان ہی کے حوالہ سے نقل کیا ہے یعنی لکھا ہے

قال احمد ما كان به باس انما انكرو عليه حين حدث عن ابراهيم الصائغ (ميزان الاعتدال ص۲۸ه ج۲)	امام احمد نے فرمایا کہ نصر میں کوئی خرابی نہ تھی بلکہ محض ابراہیم سے جب حدیث نصر نے بیان کی تو لوگ اٹھ کھڑے ہوئے۔

یقیناً یہ دلیل ہے اس بات کی کہ ابراہیم صائغ کی حیثیت عام مقتولوں کی نہیں تھی جیسا کہ اس وقت ہوا چل رہی تھی ابو مسلم نے سفاکانہ کرتوتوں کا نہیں بلکہ ابراہیم کو یقیناً حکومت عباسیہ کا دشمن مشہور کرا دیا ہوگا۔ جس کے دوسرے معنے یہ تھے کہ بنی امیہ کے شیعوں میں وہ بھی شریک کر لئے گئے ہوں گے اور ظاہر ہے کہ بغدادی جو عوام: جس کا کھاتے ہیں اس کا گاتے ہیں...... عمومی طور پر اپنے آپ کو عباسیوں کے شیعہ سمجھتے تھے ان کے لیے بھلا یہ بات قابل برداشت ہو سکتی تھی کہ عباسی شہر میں بنی امیہ کے حامی کی حدیثوں کو بیان کرنے کا موقعہ دیں اور اطمینان سے ان کو سنیں ایسے لوگ جو اس عہد کے سیاسی تشیع و تحزب سے جدا رہ کر صرف اللہ اور اس کے رسول کے دوست کو دوست اور ان کے دشمنوں کو دشمن سمجھنے والے ہوں بجز امام احمد جیسے بزرگوں کے بہت کم تھے اور اس زمانہ میں کیا عوام کا حال ہر زمانہ میں قریب قریب یہی رہا ہے۔

میرا خیال ہے کہ عباسی حکومت سے ابراہیم اور امام ابو حنیفہ کے تعلقات پوشیدہ نہ ہوں گے مگر کوئی ایسی روایت نہیں ملتی کہ اس جرم میں امام ابو حنیفہ کی طرف بھی حکومت نے کوئی توجہ کی اور ایک یہی کیا میں پوچھتا ہوں کہ ابھی ابھی تو بنی امیہ حکومت ختم ہوئی

تھی۔ عباسی ان ہی کے تو جانشین تھے پھر زید شہید کے زمانہ میں امام نے اپنے جس سیاسی رویہ کا اظہار کیا تھا اس سے عباسی کیا ناواقف ہوں گے جن وجوہ واسباب نے امام کو بنی امیہ والوں کے مقابلہ میں حضرت زید شہید کی حمایت پر آمادہ کیا تھا عباسیوں میں جب وہ ساری باتیں پائی جارہی تھیں تو امام ابوحنیفہ سے نہ کھٹکے رہنے کی کوئی وجہ ہوسکتی تھی؟ لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا۔ جہاں تک واقعہ کا تعلق ہے ایک مدت تک عباسیوں کو ہم امام اور ان کے سیاسی رجحانات سے کچھ بے تعلق سا پاتے ہیں' کم از کم السفاح جس نے قریب قریب پانچ سال تک حکومت کی اس پانچ سال کے عرصے میں کسی ایسے واقعہ کا پتہ نہیں چلتا جس سے امام ابوحنیفہ اور اس نئی قائم ہونے والی حکومت کا موافقۃً یا مخالفۃً تعلق ثابت ہوتا ہو' یہ بھی تو نہیں تھا کہ امام حکومت کے کسی دور دراز گوشہ میں مقیم تھے وہ تو کوفہ ہی میں تھے اسی کوفہ میں جہاں سے عباسیوں نے سر اٹھایا اور ایک مدت تک اسی کے آس پاس میں بغداد کی تعمیر سے پہلے اپنے دارالخلافت کو انھوں نے رکھا' بلکہ یہ لطیفہ تاریخ کا اگر صحیح ہے جس کا ذکر متعدد کتابوں میں کیا گیا ہے یعنی لکھتے ہیں کہ

"خلیفہ منصور ابوجعفر کے پاس ایک آئینہ تھا جس میں دوست دشمن سے الگ ہوکر اس کو نظر آجاتے تھے۔"

مختلف مواقع پر اسی آئینہ میں دیکھ کر منصور نے اپنے دشمنوں کا پتہ چلایا ہے اس کا بھی اس آئینہ سے پتہ چل جاتا تھا کہ دشمن کہاں مقیم ہے[1] کہتے ہیں کہ بعض قدیم سلاطین کے خزانے سے یہ چیز منصور کو ملی تھی واللہ اعلم بالصواب۔

میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ کیا چیز تھی؟ جمشید کے ساغر جہاں نما کا افسانوی روایات میں جیسے ذکر آتا ہے کچھ اسی قسم کی چیز تھی یا یہ آئینہ کیا تھا؟ بہر حال اگر کوئی ایسی چیز ان عباسیوں کو مل گئی تھی تو امام ابوحنیفہ کیا ان کی نگاہوں سے پوشیدہ رہ سکتے تھے خصوصاً جب ان کے دارالخلافہ کے زیر سایہ ہی بے چارے کا مکان تھا۔

---

[1] دیکھو کامل ابن اثیر ص ۲۰۸ ج ۵

دستور لوگ ان سے حدیث سننے کے لیے جمع ہو جاتے ہیں جن میں دوسروں کے ساتھ امام احمد بن حنبل بھی ہیں۔

بیان یہ کیا جاتا ہے کہ جب تک دوسرے محدثین کی روایتیں نصر سناتے رہے لوگ سنتے رہے لیکن جوں ہی کہ ابراہیم الصائغ کے حوالہ سے انھوں نے ایک دو حدیثیں بیان کیں بجز چند خاص لوگوں کے سارا مجمع اٹھ گیا کسی معمولی آدمی کی نہیں بلکہ خود امام احمد بن حنبل کی چشم دید شہادت ہے الذہبی نے ان ہی کے حوالہ سے نقل کیا ہے یعنی لکھا ہے

قال احمد ما كان به باس انما انكرو عليه حين حدث عن ابراهيم الصائغ (میزان الاعتدال ص ۵۲۸ ج ۲)	امام احمد نے فرمایا کہ نصر میں کوئی خرابی نہ تھی بلکہ محض ابراہیم سے جب حدیث نصر نے بیان کی تو لوگ اٹھ کھڑے ہوئے۔

یقیناً یہ دلیل ہے اس بات کی کہ ابراہیم صائغ کی حیثیت عام مقتولوں کی نہیں تھی جیسا کہ اس وقت ہوا چل رہی تھی ابومسلم نے سفاکانہ کرتوتوں کا نہیں بلکہ ابراہیم کو یقیناً حکومت عباسیہ کا دشمن مشہور کرا دیا ہوگا۔ جس کے دوسرے معنے یہ تھے کہ بنی امیہ کے شیعوں میں وہ بھی شریک کر لئے گئے ہوں گے اور ظاہر ہے کہ بغدادی جورع: جس کا کھاتے ہیں اس کا گاتے ہیں...... عمومی طور پر اپنے آپ کو عباسیوں کے شیعہ سمجھتے تھے ان کے لیے بھلا یہ بات قابل برداشت ہو سکتی تھی کہ عباسی شہر میں بنی امیہ کے حامی کی حدیثوں کو بیان کرنے کا موقعہ دیں اور اطمینان سے ان کو سنیں ایسے لوگ جو اس عہد کے سیاسی تشیع و تحزب سے جدا رہ کر صرف اللہ اور اس کے رسول کے دوست کو دوست اور ان کے دشمنوں کو دشمن سمجھنے والے ہوں بجز امام احمد جیسے بزرگوں کے بہت کم تھے اور اس زمانہ میں کیا عوام کا حال ہر زمانہ میں قریب یہی رہا ہے۔

میرا خیال ہے کہ عباسی حکومت سے ابراہیم اور امام ابوحنیفہ کے تعلقات پوشیدہ نہ ہوں گے مگر کوئی ایسی روایت نہیں ملتی کہ اس جرم میں امام ابوحنیفہ کی طرف بھی حکومت نے کوئی توجہ کی اور ایک یہی کیا میں پوچھتا ہوں کہ ابھی ابھی تو بنی امیہ حکومت ختم ہوئی

اپنی تلوار پر ٹیک لگائے مہدی کے سر پر کھڑا ہوا تھا سفیان کے اس بے باکانہ جواب سے اس کے رونگٹے کھڑے ہوگئے غصہ سے مبہت ہوگیا اور مہدی کو خطاب کر کے کہنے لگا حضور اس گنوار جاہل کی یہ مجال کہ برسر دربار آپ کی شان میں آپ کے سامنے ایسی گستاخانہ بات کرے مجھے اجازت دیجئے اس کی گردن مار دیتا ہوں۔

اسی موقعہ پر ربیع کو جواب دیتے ہوئے مہدی نے جو بات کہی تھی اسی کو میں پیش کرنا چاہتا ہوں ربیع سے اس نے کہا کہ

اسکت ویلک مایرید هذا و امثاله الا ان نقتلهم فنشقی بلسعادتهم (المسعود ص ۱۱۲ بر کامل)	بدبخت چپ رہ! یہ اور اس قسم کے لوگ یہی تو چاہتے ہیں، کہ ہم ان کو قتل کر کے ان کی کامیابی کو اپنی بدبختی اور بدنامی کا ذریعہ بنائیں۔

جس سے معلوم ہوا کہ حسین کے قتل میں ہر زمانہ کے یزیدوں کو اپنی موت کی تصویر نظر آئی ہے بلکہ سمجھنے والے اگر سمجھنا چاہیں تو اپنے زمانہ کے سب سے بڑے حکمراں (یعنی مہدی) کی مذکورہ بالا شہادت سے یہ نتیجہ بھی پیدا کر سکتے ہیں کہ حسینی نمونے کی اقتداء کرنے والوں نے بھی برعکس اس کے اپنی موت ہی میں اپنی زندگی کی ضمانتوں کو مستور پایا ہے۔

بہر حال قطعی طور پر کوئی بات نہیں کہی جا سکتی' لیکن ہوسکتا ہے کہ اپنے قیام کے ابتدائی چند سالوں تک امام ابوحنیفہ سے عباسی حکومت کی بے تعلقی میں بھی کچھ اسی قسم کے اسرار پوشیدہ ہوں یا یوں سمجھئے کہ قدرت کو امام سے اسلام کا ایک کام لینا تھا ایسا کام کہ بقول یزید بن ہارون کے

> ''فقہ امام ابوحنیفہ کا خاص ہنر تھا' میں نے نہیں دیکھا کہ فقہ کے متعلق ان سے کسی نے گفتگو کی ہو اور امام سے وہ مغلوب نہ ہو گیا ہو۔''

آخر میں انھوں نے کہا کہ

فھو صناعته و صناعة اصحابه	یہ تو ان کا اور ان کے شاگردوں کا خاص ہنر اور

کانھم خلقوا لھا (ص ٦٥ موج ٢) فن ہے گویا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسی کام کے لیے یہ لوگ پیدا کئے گئے ہیں۔

اور سچ تو یہ ہے کہ حنفی فقہ ہی نہیں بلکہ مسلمانوں کے پاس فقہ کا آج جو کچھ بھی سرمایہ ہے وہ شافعی فقہ ہو یا حنبلی بلکہ مالکی فقہ تک کسی نہ کسی حیثیت سے سب کی بالآخر امام ابوحنیفہ ہی کی ان دیدہ ریزیوں سے آبیاری ہوئی ہے[1] جن کا موقعہ قدرت نے ان کو عطا فرمایا تھا۔

خلاصہ یہ ہے کہ حجاز سے واپسی کے بعد ''وضع قوانین'' کے اس مشغلہ میں جو منہمک ہوئے تو جہاں تک میرا خیال ہے ۱۴۵ھ تک ابراہیم صائغ کی اس آزمائش کے سوا جس کے متعلق ان کا خود اقرار ہے کہ مجھ پر دنیا اندھیری ہوگئی تھی، کوئی ایسا واقعہ نہیں پیش آیا جو ان کے اس اطمینان اور جمعیت خاطر میں خلل انداز ہوتا جس کی ضرورت ایک ایسے عظیم مہم کی سرانجامی کے لیے ناگزیر ہے۔

عباسی حکومت کے ابتدائی دور میں حضرت امام کی خاموش جدوجہد

وقفہ کی اس مدت میں جو تقریباً تیرہ چودہ سال سے کم نہ تھی جہاں تک واقعات سے معلوم ہوتا ہے امام کے سامنے دو ہی باتیں تھیں یعنی مسلمانوں کی کوئی تنظیمی قوت اگر فراہم ہوجائے تو اس میں شریک ہوکر حق کی حمایت اور باطل کے ازالہ کے جس فرض کو وہ ادا کرنا چاہتے تھے اسے ادا کریں اور جب تک یہ ممکن نہ ہو اس وقت تک بجائے ابتلائی راہ کے ممکنہ مواقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے جس حد تک حق کی اقامت اور باطل کے مغلوب کرنے میں آگے بڑھنے کا امکان ملتا جائے۔ بڑھے چلے جانا چاہیے۔

یہ خدا کی طرف کی بات تھی کہ عباسی حکومت کے قیام کے ابتدائی سالوں میں یعنی ۱۴۵ھ تک تو ثانی الذکر مقصد کے متعلق پورے انہماک اور توجہ کے ساتھ کام کرنے کا کھلا میدان ان کو ملا اور جب کام ایک ایسی حد پر پہنچ گیا کہ دوسرے بھی اس کو آگے بڑھانے

---

[1] اس دعوے کو کتاب ''تدوین فقہ'' میں ان شاء اللہ دلائل وشواہد کی روشنی میں پیش کیا جائے گا اس وقت صرف اشارہ کافی ہے۔

میں امام کی نمائندگی کر سکتے تھے، قدرت نے امام کو دوسرے حوصلہ کی تکمیل کا بھی موقعہ عطا فرمادیا۔

میں جو کچھ لکھنا چاہتا ہوں اس کے پیش کرنے سے ایک غلط فہمی کا ازالہ مقصود ہے یعنی ۱۴۵ھ تک حکومت سے بے تعلقی کا جو دعویٰ میں نے کیا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ عباسی حکومت اور امام میں کشمکش کے جو تعلقات بعد کو پیدا ہوئے ان مخالفانہ تعلقات سے امام کی زندگی کے یہ چند سال خالی رہے ہیں، ورنہ جیسا کہ ابھی آپ کو معلوم ہوگا السفاح جس کی وفات ۱۳۶ھ میں ہوئی اس کے عہد حکومت میں تو نہیں، لیکن سفاح کے بعد جوں ہی کہ ابوجعفر منصور خلیفہ ہوا اس نے اپنی خلافت کے چند ہی دنوں کے بعد امام ابوحنیفہ سے اچھے خاصے خوش گوار تعلقات قائم کر لیے تھے لیکن بہ مشکل یہ خوش گواری ۱۴۵ھ تک قائم رہی اس کے بعد تو ہوا جو کچھ ہوا تفصیل خود آگے آرہی ہے۔

جدوجہد کی تفصیل:

امام ابوحنیفہ وقفہ کے اس زمانے میں کیا کرتے رہے اور جو کچھ بھی کرتے رہے کیوں کرتے رہے۔ اس سوال کے جواب کا ایک حصہ تو گذر چکا یعنی ''وضع قوانین'' کی مجلس قائم کر کے انسانی زندگی کے ان تمام شعبوں کے متعلق جن کے کلیات اسلام میں پائے جاتے تھے خصوصاً جن کا آدمی کے عملی زندگی سے تعلق ہے اسلامی آئین کی روشنی میں جزئیات پیدا کرتے رہے امام کی خدمت کے اس حصہ کے متعلق اس رسالہ کی گنجائش کی حد تک میں بحث کر چکا ہوں دراصل صحیح مقام اس کی تفصیلی بحث کا کتاب تدوین فقہ ہے پڑھنے والوں کو اسی کتاب کا انتظار کرنا چاہئے۔

اس وقت اس سلسلے میں اب جن چیزوں کو پیش کرنا چاہتا ہوں وہ مذکورہ بالا سوال کے جواب کے دوسرے اجزاء ہیں۔

محکمہ عدلیہ کے متعلق اپنے شاگردوں کی صحیح تربیت

(۱) سب سے پہلی بات اس سلسلہ میں جو نظر آتی ہے وہ قضا کے متعلق اپنے تلامذہ

میں خاص قسم کے جذبات کی پرورش ہے۔

مطلب یہ ہے کہ امام جس کام کو اپنے تلامذہ کی امداد اور رفاقت میں انجام دے رہے تھے یہ کام ہی ایسا تھا کہ اس میں کمال حاصل کرنے والوں کے لیے حکومت کے سب سے بڑے اور سب سے اہم شعبہ میں داخل ہونے کا قدرتی موقعہ پیدا ہو جاتا تھا اور کچھ اسی زمانے میں نہیں۔ آج بھی دنیا کی حکومتوں میں اگر دیکھا جائے تو پارلیمان سے تحتانی تعلقہ داری کچہریوں تک میں اس کے سوا اور کیا ہوتا ہے جسے اسلامی حکومتوں کے زمانے میں قضاۃ اور مفتی وغیرہ انجام دیتے تھے وہی قانون بنانا ان کو حوادث و واقعات پر منطبق کرنا اور ان ہی کی روشنی میں "امن و امان" دادرسی جو حکومتوں کا سب سے بڑا اور سب سے پہلا فرض ہے اب بھی موجودہ زمانہ کی حکومتوں کا سب سے بڑا مشغلہ ہے اور اس زمانے میں بھی یہی تھا بلکہ عربی زبان میں باہمی جھگڑے جو لوگوں میں ہوتے رہتے ہیں ان کے چکانے ہی کو حکومت کہتے تھے جس کا مطلب یہی ہوا کہ حکومتوں کا اصلی کام یہی ہے۔

بہر حال امام صاحب چاہتے تھے کہ ان کی مجلس کے ارا کین اور شرکاء جس علمی کمال کو اپنے اندر پیدا کر رہے ہیں یہی کمال ان کو حکومت کے اس شعبہ میں شریک و دخیل ہونے کا مستحق بنا رہا ہے چونکہ اسلامی قانون جس کی تدوین کا کام ابوحنیفہ انجام دے رہے تھے صرف قانون ہی نہ تھا بلکہ وہی مسلمانوں کا دین بھی تھا جس کے معنی یہ ہوئے کہ دنیا کے دوازے بھی ان لوگوں پر دین کی راہ سے کھل رہے تھے۔ ظاہر ہے کہ دین کے لیے جس اخلاص اور راست بازی' استقامت وغیرہ کی ضرورت ہے دنیا میں مبتلا ہونے کے بعد دین کے ان اقتضاؤں کی تکمیل ہر معمولی آدمی کا کام نہیں ہو سکتا۔

حضرت امام کو ایک طرف جو دیکھا جاتا ہے کہ اسلامی آئین کے باریک سے باریک دقیق سے پہلوؤں پر اپنے تلامذہ کو متنبہ کر رہے ہیں لیکن اسی کے ساتھ جب کبھی موقعہ ملتا ہے تو اس جذبہ کی یعنی اس علم کو حکومت کے محکمہ عدلیہ میں داخل ہونے کا ذریعہ بنایا جائے سخت حوصلہ شکنی کرتے ہیں' نوحؒ[1] بن دراج جو بعد کو حکومت عباسیہ کے ممتاز قضاۃ

---

[1] الخطیب وغیرہ نے لکھا ہے کہ نوح کے والد نبطی حائک تھے یعنی عراق کے دیسی نوربافت تھے ۱۲

میں شمار کیے گئے وہ خود اپنا ذاتی قصہ بیان کرتے تھے کہ امام ابو حنیفہ سے میں ایسے بعض خاص مسائل خصوصیت کے ساتھ دریافت کیا کرتا تھا جن کا تعلق ''قضا'' سے ہوتا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابتداء میں امام ان کے سوالوں کا جواب دیتے رہے آخر ایک دن ان سے نہ رہا گیا اور نوح کو خطاب کر کے فرمانے لگے۔

نوح میں تم کو دیکھ رہا ہوں کہ تم زیادہ تر قضا کے ابواب کے متعلق سوال کرتے رہتے ہو میں دیکھ رہا ہوں کہ تمہارے اندر قاضی بننے کی آرزو پرورش پا رہی ہے' نوح دیکھو! تمہاری ذکاوت تمہاری سمجھ بوجھ مجھے پسند ہے لیکن کہیں ایسا نہ ہو کہ ان خداداد عطیوں کو تم بگاڑ نہ بیٹھو۔'' (ص ۹۰)

تلامذہ کی اسی مجلس میں کبھی فرماتے کہ:

جو قاضی بنایا گیا سمجھ لینا چاہیے کہ سمندر میں وہ ڈوبا' تیرنا بھی اگر کوئی جانتا ہو تو سمندر میں کب تک تیرتا رہے گا اور ہاتھ پاؤں پھینکتا رہے گا۔ (ص ۹۰ ج ۲ موفق)

خالد بن صبیح جو امام کے ممتاز طلبہ میں شمار ہوتے ہیں مروہی کے باشندے تھے انھوں نے تو اسی سلسلہ میں امام صاحب سے یہ عجیب روایت نقل کی ہے یعنی ایک دن امام ابو حنیفہ اپنے اصحاب و رفقاء کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمانے لگے:

ان میں سب سے بہتر تو وہ ہیں جنھوں نے فقہ کے علم کو حاصل تو کر لیا لیکن فتویٰ دینے کے پیشے کو اختیار نہیں کیا ان کے بعد درجہ ان لوگوں کا ہے جو فتویٰ دینے کا کام بھی کریں گے اور سب سے کم تر درجہ ان لوگوں کا ہے جو قاضی بنیں گے۔ (ص ۱۵۹ ج ۲ مو)

امام کے بجنسہٖ الفاظ یہ ہیں کہ

لہ لیکن خدا کی شان چار بیٹے دراج کے قاضی ہوئے لکھا ہے کہ قاضی شریک بن عبداللہ اپنے بچوں کی تربیت اور نگرانی میں زیادہ توجہ سے کام نہیں لیتے تھے جس پر لوگ ان کو ٹوکا کرتے جواب میں جھنجلا کر قاضی شریک کہتے کہ دراج نورباف (حائک) نے کیا اپنے بچوں کی تربیت کی تھی کہ سب کے سب عباسی حکومت کی ججی کے عہدے پر سرفراز ہوئے۔ ۱۲

اخسھم القضاۃ . سب سے کم تر درجہ ان کا ہے جو قاضی بنیں گے۔

حصولِ علم کے صحیح مقصد کے متعلق شاگردوں کی ذہنی تربیت

ظاہر ہے کہ یہ پیش گوئی نہیں تھی جو امام پر یہ اعتراض کیا جائے کہ ان شاگردوں میں جو سب سے بڑے تھے یعنی ابو یوسف وہی تو قاضی بنے بلکہ درحقیقت اپنے تلامذہ کی تربیت کا ایک طریقہ تھا مقصود ان الفاظ سے یہی تھا جیسے امام بھی کبھی ان الفاظ میں ادا کرتے ابوشہاب نحاط امام کی زبانی یہ نقل کیا کرتے تھے کہ:

علم کو جس نے دنیا کے لیے سیکھا وہ علم کی برکت سے محروم کر دیا جاتا ہے' ایسے آدمی کے دل میں علم جاگزیں نہیں ہوتا اور اس کے علم سے لوگوں کو زیادہ فائدہ بھی نہیں پہنچتا۔ لیکن جس نے دین کے لیے علم حاصل کیا اس کے علم میں برکت دی جاتی ہے اور دل میں اس کے علم راسخ ہو جاتا ہے اور لوگ اس کے علم سے زیادہ نفع اٹھاتے ہیں۔ (ص ۹۰ ج ۲ موفق)

یہ اور اس قسم کے بیسیوں اقوال امام صاحب سے کتابوں میں منقول ہیں' امام کے نقطہ نظر کو سمجھنے کے لیے غالباً یہ چند مثالیں کافی ہو سکتی ہیں۔

اب ایک طرف امام کے ان اقوال کو رکھئے اور دوسری طرف ان ہی سے اس باب میں جو دوسری باتیں منقول ہیں وہ بھی سن لیجئے ان کے تلمیذ رشید جن پر محدثین کو بھی اعتماد ہے یعنی قاضی ابو یوسف ہی کی روایت ہے کہ:

''امام کی مجلس میں اگر کوئی ادھر ادھر کی باتیں کرتا جب اس کی گفتگو طویل ہو جاتی تو امام سے پھر رہا نہ جاتا اور اس کی بات کاٹ کر کچھ مسئلہ مسائل کا ذکر چھیڑ دیتے پھر تلامذہ کی طرف خطاب کر کے فرماتے خبردار! جو بات ناگوار گذرتی ہو' خواہ مخواہ اس سے لوگوں کو مطلع کرنے کی ضرورت نہیں (بہ ظاہر لوگ امام تک یہ تذکرے بھی پہنچاتے کہ فلاں آپ کو یہ کہتا ہے وہ کہتا ہے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) آخر میں فرماتے کہ بھائی جو میرے

متعلق بری باتیں کہتے ہیں خدا ان کو معاف فرمادے اور جو اچھے خیالات رکھتے ہیں خدا ان پر رحم فرمائے

اس کے بعد ''گر'' کی بات امام کا یہ آخری فقرہ ہوا کرتا تھا کہ

تفقهوا في دين الله وذر والناس وماصنعو الانفسهم فيحوجهم اليكم (ص ۹۵ ج ۲ مو)	''تم لوگ اللہ کے دین کی سمجھ پیدا کئے چلے جاؤ اور لوگ جو کچھ کر رہے ہیں ان کو ان ہی کے حوالہ کرو' اگر تم ایسا کرو گے تو تمہارا علم لوگوں کو تمہارا محتاج بنا کر رہے گا۔

بس امام کے ان ہی الفاظ کی طرف میں توجہ دلانا چاہتا ہوں کہ ایک طرف اپنے تلامذہ میں ''قضا'' وافتا کی حوصلہ شکنی بھی کرتے رہتے تھے اور دوسری طرف ان ہی شاگردوں کو اس کے لیے بھی تیار کرتے تھے کہ تم اپنے اندر ایسا کمال پیدا کرو کہ خواہ مخواہ لوگوں کو تمہارا محتاج ہونا پڑے۔

ظاہر ہے کہ جس علم کو ان کے تلامذہ حاصل کر رہے تھے اس کی طرف احتیاج افتاء اور قضاء کے سوا اور کس مسئلہ میں ہو سکتی تھی۔ وہ طلب کا علم تو حاصل نہیں کر رہے تھے کہ اپنے جسمانی امراض میں لوگ ان کے محتاج ہوتے اور اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ امام ابوحنیفہ قضا[1] یا افتا کے باب میں اپنے شاگردوں جو ہمت شکنی کیا کرتے تھے اس سے غرض

---

[1] پہلے بھی مفتی اور قاضی کے الفاظ آتے ہیں اور یہاں بھی افتاء اور قضاء کے الفاظ کا ذکر کیا گیا ہے عوام کو شاید ان دونوں چیزوں میں جو فرق ہے معلوم نہ ہوگا عام مسلمانوں کو مذہبی زندگی میں جو ضرورتیں پیش آتی ہیں اور مولویوں سے پوچھ کر اپنے مذہب کا حکم معلوم کرتے ہیں اسی کا نام استفتاء ہے' اور اہل علم کا جو طبقہ عوام کی راہ نمائی اس باب میں کرتا ہے ان ہی کو مفتی کہتے ہیں مفتیوں کا کام صرف مسئلہ بتانا ہے لیکن کسی پر اپنے بتائے ہوئے مسئلہ کو نافذ نہیں کر سکتے بخلاف قضاء کے وہ حکومت کا محکمہ ہے' ہر فیصلہ جو قاضی کرتا ہے حکومت ذمہ دار ہے اس کے نافذ کرانے کی البتہ اسلامی عدالتوں میں قاضیوں کی مدد کے لیے یعنی ضرورت کے وقت قاضی کو علمی مشورے دینے کے لیے کچھ لوگ ملازم رکھے جاتے تھے۔ ان کو بھی مفتی کہتے تھے مفتیوں کا یہ گروہ حکومت کا ملازم ہوتا تھا لیکن فیصلوں کے نفاذ کا حق اس کو بھی حاصل نہ تھا۔

یہی تھی کہ دنیا کے لیے دین کے اس علم کو اس طور پر استعمال نہیں کرنا چاہیے کہ دین کے احترام کا جو اقتضاء ہے وہ ہاتھ سے جاتا رہے۔

آخر آپ اس کو کیا کہیے گا امام ہی کے ایک اور بڑے شاگرد سہل بن مزاحم جن پر مامون الرشید نے خراسان کی گورنری کے زمانہ میں شدید اصرار کیا تھا کہ قضاء کا عہدہ قبول کرلیں لیکن وہ انکار پر مصر رہے جیل کی سزا بھی اسی انکار کی وجہ سے ان کو بھگتنی پڑی لیکن مامون کی بات نہیں مانی تنگ آ کر اس نے ان کو چھوڑ دیا۔ بہر حال وہی راوی ہیں کہ

> ایک دن امام صاحب اپنے تلامذہ کا ذکر کرتے ہوئے فرمانے لگے کہ میرے اصحاب میں تیس آدمی خاص اہمیت رکھتے ہیں جن میں دس آدمی تو نیک لوگ ہیں اور فقیہ ہیں اور دس ہی ان میں ایسے ہیں جو فتویٰ دینے کے قابل ہو چکے ہیں لیکن دس ایسے ہیں جو قاضی بن سکتے ہیں۔'' (ص ۸۹)

سہل بن مزاحم نے اس کے بعد امام کی طرف یہ الفاظ منسوب کیے کہ آخری جماعت جو قاضی بننے کے قابل ہو چکی ہے؟ ان کے ذکر کے بعد امام نے فرمایا کہ:

وھم احسن اصحابی (ص ۸۹) یہی لوگ ہمارے شاگردوں میں سب سے بہتر ہیں

امام کے اس بیان کو جس میں قاضی بننے والوں کو تیسرے درجے کا آدمی قرار دیا گیا تھا اس بیان سے ملائے جس میں اپنے ان شاگردوں کو جو قاضی بننے کے قابل ہو چکے تھے اپنے بہترین تلامذہ میں شمار فرما رہے ہیں بہ ظاہر دونوں میں تضاد معلوم ہوتا ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ پہلی گفتگو کی حیثیت ایک نظریہ کی تھی جس کا مال گویا یہ تھا کہ فقہ کی تعلیم قاضی بننے کے لیے جو حاصل کرتے ہیں وہ ادنیٰ درجے کے آدمی ہیں امام کے نزدیک اس سے ذلیل اور کمینہ کوئی نہ تھا جو دنیا کے لیے دین کو آلہ بنائے یہ حاصل تو ہے ان کے پہلے قول کا تھا باقی سہل بن مزاحم نے دوسری بات جو ان سے نقل کی ہے اس میں واقعہ کا اظہار فرمایا گیا ہے آخر وہ کیا کرتے جن جن لوگوں میں قاضی بننے کی قابلیت پیدا ہو چکی تھی جب وہی ان کے تمام شاگردوں میں اچھے ثابت ہوئے تھے تو اس واقعہ کا انکار کیسے کر دیتے اس روایت پر اس کا بھی تو شبہ نہیں کیا جا سکتا کہ جن

لوگوں نے قضا کا عہدہ قبول کرلیا تھا وہ اپنے طرز عمل کی تصحیح کے لیے امام کی طرف اس قسم کی روایتوں کو منسوب کر دیا کرتے تھے کیونکہ یہ روایت تو بے چارے سہل بن مزاحم کی ہے جنھوں نے عرض کر چکا ہوں کہ مامون الرشید کے انتہائی اصرار پر بھی اس عہدے کو قبول نہیں کیا اور جیل جانا پسند فرمالیا۔

عہدۂ قضا کے متعلق حضرت امام کا تاثر:

بہر حال کچھ بھی ہو امام اپنے شاگردوں کو جس کام کے لیے تیار کر رہے تھے اس کا اندازہ ان کے اسی قسم کے اقوال سے ہوتا ہے امام صاحب کے پوتے اسماعیل بن حماد جو اپنے وقت کے مشہور قاضی تھے ان سے بھی قریب قریب اسی قسم کی روایت ہے فرق اتنا ہے کہ بجائے تیس کے حماد کی روایت میں چھتیس آدمیوں کا ذکر ہے امام نے ان کے متعلق فرمایا کہ:

> اٹھائیس تو ان میں قاضی بننے کے قابل ہو چکے ہیں اور چھ فتوے دینے کی صلاحیت رکھتے ہیں لیکن دو (یعنی ابو یوسف اور زفر) یہ دونوں قاضی اور مفتی بننے ہی کے نہیں بلکہ دوسروں کو قضا و افتاء سکھانے کی بھی صلاحیت پیدا کر چکے ہیں (ص ۲۴۶ ج ۲)

اب خود ہی سوچنا چاہیے کہ قضا کے متعلق طلبہ کی حوصلہ شکنی بھی اور پھر اپنے جلیل تلامذہ کے متعلق یہ اعلان بھی کہ فلاں فلاں قاضی و مفتی بننے اور فلاں فلاں قاضی و مفتی بنانے کی صلاحیت پیدا کر چکے ہیں ان کے دونوں اقوال کا حاصل اس کے سوا اور کیا ہوسکتا ہے کہ در حقیقت امام صاحب قاضی اور مفتی بننے کے مخالف نہ تھے بلکہ قاضی اور مفتی بننے کے لیے فقہ کی تعلیم حاصل کرنے والوں کی ہمتوں میں بلندی پیدا کرنا چاہتے تھے۔

اور واقعہ یہ ہے کہ قضا کے اس عہدے کی جو اہمیت امام کی نظر میں اگر اسی قدر تھی۔ جسے لوگوں نے ان کی طرف منسوب کیا ہے تو اس کو دیکھتے ہوئے ان کے اس طرز عمل پر تعجب بھی نہیں ہوتا۔

نوح بن دراج جن کا پہلے ذکر گذر چکا ہے ان کے سوا امام کے ممتاز تلامذہ میں نوح ہی نام کے ایک اور صاحب بھی تھے مشہور نوح بن ابی مریم کے نام سے ہیں عام طور پر کتابوں میں لوگ ان کو نوح الجامع بھی کہتے ہیں۔

ان کا مشہور بیان کتابوں میں نقل کیا جاتا ہے وہ بھی کہتے تھے کہ بعض خاص مسائل کے دریافت کرنے پر مجھے بھی امام نے ڈانٹتے ہوئے فرمایا تھا۔

یا نوح تدق باب القضا. (ص ۱۱۰ ج۲ موفق) نوح تم قضا کا دروازہ کھٹکھٹار ہے ہو۔

ان کا وطن بھی مرو تھا کہتے ہیں کہ فارغ ہو کر کوفہ سے جب وطن واپس لوٹا تو قضا کی مصیبت میں مجھے مبتلا ہونا پڑا' امام ابوحنیفہ ابھی بقید حیات تھے ڈرتے ڈرتے اپنے اس قصور کی اطلاع میں نے امام کو دی۔ جواب میں امام نے ان کو ایک خط لکھا ہے جس کا شمار امام کے تاریخی خطوط میں ہے کتابوں میں عموماً اس خط کو لوگ نقل کرتے ہیں' بہر حال اسی خط کی ابتداء امام نے ان الفاظ سے کی تھی۔

''ابوحنیفہ کی طرف سے ابوعصمہ (یہ نوح کی کنیت تھی) کے نام تمہارا خط پہنچا جو کچھ اس میں تم نے لکھا ہے اس سے واقف ہو۔''

وقلات امانة عظيمة يعجز ضها الكبائر من الناس وانت كاالغريق فاطلب لنفسک مخرجاً. (ص ۱۱۰ ج۲ موفق) تمہارے سپرد بہت بڑی امانت کی گئی ہے' اتنی بڑی امانت جس کے اٹھانے سے بڑے بڑے لوگ عاجز ہیں تم اب ایک ایسے آدمی ہو جو ڈوب رہا ہو چاہیے کہ نجات کی راہ اپنے لئے پیدا کرو۔

ان الفاظ میں جو قوت بھری ہوئی ہے' لوگوں کو اس کا صحیح اندازہ نہیں ہو سکتا جب تک کہ عہدۂ قضا کی ان چند ذمہ داریوں کا ذکر نہ کر لیا جائے جو امام کے نزدیک ضروری تھیں اس قسم کی باتیں مثلاً کسی سے قاضی کو مرعوب نہ ہونا چاہیئے خواہ وہ بادشاہ ہی کیوں نہ ہو۔ (ص ۱۱۵ ج۲ موفق)

عدالت کی ذمہ داریوں کے متعلق حضرت امام کا نقطہ نظر

عدل وانصاف وغیرہ جیسی عام چیزیں تو ان ہی کے نزدیک کیا انصاف وعدالت کے متعلق سارے عالم کا یہی خیال ہے خواہ اس پر عمل ہوتا ہو یا نہ ہوتا ہو لیکن میں تو دیکھ کر دنگ ہو گیا جب اس وصیت نامہ میں جو قاضی ابو یوسف کے نام ہے ایک فقرہ امام کا یہ بھی پایا جاتا ہے۔

"اگر امام (مسلمانوں کے باشادہ اور حکمراں) سے کوئی ایسا جرم سرزد ہو جس کا تعلق مخلوق خدا سے بادشاہ کو ہو تو اس جرم کی سزا اس قاضی کو دینی چاہیے جو اس زمانہ میں بادشاہ سے قریب تر ہو۔ (ص ۱۰۰ موفق)

میں نے امام کے الفاظ کا ترجمہ کیا ہے میری سمجھ میں تو اس کا یہی مطلب آیا جو لکھا ہے خود الفاظ کو بھی درج کر دیتا ہوں۔

وان اذنب ذنبابینه وبین الناس اقامه علیه اقرب القضاة علیه.

مسلمانوں کا حکمراں کسی ایسے جرم کا اگر مرتکب ہو جس کا تعلق عام لوگوں سے ہو تو اس حکمراں کو وہی قاضی سزا دے گا جو اس سے قریب تر ہو۔

عدالت کے اقتدار کی بلندی:

اگر امام کے نزدیک قضا کا درجہ اتنا بلند ہے تو اس کے صاف معنی یہی ہوتے کہ حکومت کے اقتدار سے بھی قضا کے اقتدار کو وہ بالاتر یقین کرتے تھے۔

ابوبکر الجصاص نے اپنے تفسیر میں جو یہ مسئلہ لکھا ہے کہ مسلمانوں کے جس علاقے میں ان کی حکومت باقی نہ رہے تو مسلمانوں کی جماعت جس شخص کو اپنا قاضی انتخاب کر لے گی اس کے فیصلے اسی طرح واجب النفاذ ہوں گے جیسے حکومت کی طرف سے مقرر کردہ قاضیوں کے فیصلے واجب التعمیل ہوتے ہیں۔[1] اس سے بھی یہی سمجھ میں آتا ہے کہ

---

[1] الجصاص کے اپنے الفاظ یہ ہیں:۔ لو ان اهل بلد لاسلطان علیهم لواجتمعوا علی الرضا تبو لیة رجل عدل منهم القضا حتی یکونوا عوانا له علی من تنع من قبول

قضا کے اس عہدے کے لئے حنفی مذہب میں حکومت کی بھی چنداں ضرورت نہیں ہے اور قاضی حکومت کے بغیر بھی اقتدار کا مالک بنایا جاسکتا ہے۔

شاگردوں کو نصیحت:

پس بات وہی ہے کہ یہ جو کچھ بھی کیا جارہا تھا دراصل مسلمانوں کے لیے صحیح قاضیوں کے پیدا کرنے کی ممکنہ کوشش تھی پہلی ضرورت تو اس کے لیے یہ تھی کہ خود اسلامی قانون کو ممکنہ غور وفکر کے ذریعہ سے مدوں کرلیا جائے۔ اس کام کو تو وہ اپنی مجلس وضع قوانین کے ذریعہ انجام دے رہے تھے اور دوسری قدرتی ضرورت یہ تھی کہ جن لوگوں کے ہاتھ میں یہ قانون دیا جائے وہ صحیح معنوں میں جو چیز لے بے پروا ہو کر اس کے نفاذ کی ہمت اور جرأت اپنے اندر رکھتے ہوں اپنے شاگردوں کو جیسا کہ ان سے منقول ہے بار بار اس کی تاکید کرتے کہ:۔

> خدا نے تم لوگوں کو علم کا جتنا حصہ بھی عطا کیا ہو خدا کے لئے اس علم کے احترام کو باقی رکھنے کی کوشش کیجیو اور آخر میں فرماتے کہ میں خدا ہی کا حوالہ دے کر تم لوگوں سے کہتا ہوں کہ کسی امیر کی رضامندی کی ذلت سے اس کو محفوظ رکھیو۔ (ص۱۰۰)

آخر ان کی غرض مذکورہ بالا باتوں سے اگر یہ نہ ہوتی تو پھر امام ہی کے اس قول کا کیا مطلب ہے کہ:

> ''حکومت کی ملازمت اس وقت تک تم لوگوں کو قبول نہ کرنی چاہیے جب تک کہ تم کو اس کا یقین نہ ہو جائے کہ اہم اس عہدے کو اگر نہیں قبول

احکامه فکان قضاءه نافذا وان لم یکن له دلایته من جهت امام و سلطان (ص۸۱ ج۱) یعنی ایسا علاقہ جہاں کے لوگوں پر کوئی حکمراں بادشاہ نہ ہو اگر وہاں کے لوگ اپنی رضامندی سے کسی نیک کردار آدمی کو قضا کا عہدہ سپرد کریں اور اس کے حکم کو جو نہ مانے تو منوانے میں اس کے مددگار بن جائیں اس قاضی کے احکام نافذ ہوں گے خواہ کسی امام اور باشادہ کی طرف ہے یہ عہدہ قاضی کو نہ ملا ہو۔

کرتے ہیں تو اس پر اس قسم کے لوگ قبضہ کر لیں گے جن سے خدا کی مخلوق کو ضرر پہنچے گا۔ (ص ۱۱۶)

صاف ظاہر ہے کہ جہاں یہ صورت حال ہو وہاں حکومت میں شریک ہو جانے کا وہ مشورہ دے رہے ہیں اور میرا تو خیال ہے کہ امام کی صلح جو نرم طبیعت کے خلاف ان کی زندگی میں ایک خاص پہلو جو ایسا پایا جاتا ہے جو بظاہر ان کی فطری افتادہ طبع کے مخالف ہے یعنی وضع قوانین کی مہم کے ساتھ تلامذہ میں مذکورہ بالا جذبات کو پیدا کرتے ہوئے ہم ان کو پاتے ہیں کہ حکومت کی طرف سے کوفہ میں جن قضاۃ کا تقرر ہوا تھا ان کے متعلق ان کا ایک خاص رویہ یہ تھا کہ ان کے اجلاس میں جو مقدمات فیصل ہوتے تھے امام صاحب ان کو معلوم کر کے چند ایسے سخت اعتراضات کر دیتے تھے کہ بے چارے قضاۃ حیران ہو جاتے تھے اس سلسلہ میں ایک ہی نہیں بیسیوں واقعات ہیں جن میں زیادہ تر واقعات کا تعلق تو کوفہ کے قاضی ابن ابی لیلیٰ سے ہی اور کبھی ابن شبرمہ بھی اس لپیٹ میں آ جاتے تھے۔

امام کے انکسار و تواضع کے جو حالات اب تک عرض کئے جا چکے ہیں وہی اس بدگمانی کی تردید کے لیے کافی ہیں کہ اس میں امام کی رعونت ونخوت یا خودنمائی جیسے ذلیل صفات کو دخل نہ تھا۔

حضرت امام کا انکسار:

علاوہ ان اخلاقی واقعات کے جن کا ذکر مختلف مقامات میں گذر چکا ہے خود اپنے علم کے متعلق امام کے جو احساسات تھے ان کا پتہ خود ان کے بعض بے ساختہ اقوال سے چلتا ہے کہتے ہیں کہ کوفہ کے بازار میں ایک آدمی یہ پوچھتے ہوئے داخل ہوا کہ ابوحنیفہ فقیہ کی دکان کہاں پر ہے؟ اتفاقاً یہ سوال خود امام ہی سے اس نے کیا آپ نے فرمایا:

لیس هو بفقیه انما هو مفت متکلف. (ص ۹۴ ج ۲ موفق) وہ فقیہ نہیں ہے بلکہ زبردستی مفتی (یعنی فتویٰ دینے والا) بن بیٹھا ہے۔

جعفر الاحمر ایک بزرگ گذرے ہیں ان کا بیان ہے کہ میں نے امام ابوحنیفہ سے

ایک مسئلہ پوچھا جس کا جواب انہوں نے دیا میں نے عرض کیا کہ جب تک آپ اس شہر میں موجود ہیں اس وقت تک خیر و بہتری سے یہ شہر کبھی خالی نہ ہوگا۔ جعفر ہی کہتے ہیں کہ یہ سن کر بے ساختہ امام کی زبان پر یہ شعر جاری ہوا۔

خطت الدیار فسدت غیر مسود ومن الشقاء تفردی بالسود (ص ۸۴ ج ۲)	آبادیاں اجڑ گئیں تو سردار ہونے کی صلاحیت کے بغیر میں سردار ہو گیا یہ بڑی بدبختی کی بات ہے کہ آج میں تنہا پیشوا اور سردار سمجھا جاتا ہوں۔

حکم بن ہشام کا بیان ہے میں نے امام ابو حنیفہ سے پوچھا کہ آپ لوگوں کو جو فتویٰ دیا کرتے ہیں کیا آپ کو یقین ہے کہ وہی صحیح ہے' امام نے سننے کے ساتھ فرمایا کہ ہو سکتا ہے کہ غلط ہونے کے سوا وہ اور کچھ نہ ہو۔ (ص ۱۵۴)

حسن بن صالح جن کا شمار اکابر علماء میں ہے۔ خود اپنا واقعہ لوگوں سے بیان کیا کرتے تھے کہ شہر کے والی نے مجھے اور ابن ابی لیلیٰ اور امام ابو حنیفہ تینوں کو بلا کر ایک مسئلہ دریافت کیا حسن کہتے ہیں کہ میں نے جو جواب دیا وہ امام اور ابن ابی لیلیٰ کے جواب سے مختلف تھا۔ والی نے حکم دیا کہ امام ابو حنیفہ اور ابن ابی لیلیٰ ہی کے فتویٰ کے مطابق عمل کیا جائے ہم نے دیکھا کہ امام ابو حنیفہ کچھ سوچ میں غرق ہو گئے اور اس کے بعد والی کو مخاطب کر کے فرما رہے ہیں۔

> ''صاحب! میں نے جو جواب دیا تھا صحیح نہیں ہے' صحیح مسئلہ وہی ہے جو اس نے بتایا ہے (ص ۲۰۹ موفق)

اور ایسے متعدد واقعات نقل کئے جاتے ہیں کہتے ہیں کہ امام صاحب ایک صاحب سے گفتگو کر رہے تھے کہ اچانک اس نے امام سے کہا اتق اللہ (خدا سے ڈر) اس لفظ کا اس کے منہ سے نکلنا تھا کہ امام کا چہرۂ زرد پڑ گیا سر جھکا لیا اور کہتے جاتے تھے۔

> ''بھائی! خدا آپ کو جزائے خیر دے علم پر ناز جس وقت کسی کو ہونے لگے اس وقت اس کا وہ بہت محتاج ہوتا ہے کہ کوئی اسے خدا یاد دلا دے۔'' (ص ۹۵ ج ۲ موفق)

بھلا جس کی ذکاوت حسی کا حال یہ ہو کہ راستہ میں اچانک ان کا پاؤں کسی لڑکے کی ٹانگ پر پڑ گیا۔ لڑکا چلا کر بولا! بڑے میاں! قیامت کے دن اس کا بدلہ جو لیا جائے گا۔ اس سے تم نہیں ڈرے مسعر بن کدام جو اس وقت امام کے ساتھ تھے کہتے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ امام ابوحنیفہ چکرا کر گر پڑے' میں کھڑا ہو گیا اور ان کو سنبھالنے لگا جب ہوش میں آئے تو میں نے کہا کہ اس لونڈے کی بات کا آپ نے اتنا اثر لیا۔ امام نے فرمایا کہ بھائی۔! مجھے خطرہ ہوا کہ خود نہیں بولا ہے بلکہ شاید بلوایا گیا ہو۔ (ص ۱۴۸)

اور یہی کیا میں تو کہتا ہوں کہ امام کی پوری زندگی اس بات کی زندہ شہادت بن سکتی ہے کہ ان کے سوانح نگاروں نے یہ واقعہ جوان کی طرف منسوب کیا ہے کہ:۔

ما ذال ابو حنیفه یخطی ابن ابی لیلیٰ فی مسائله وقضایاه ویظهر ذلک.(ص ۱۲۲ ج موفق)

امام ابوحنیفہ ابن ابی لیلیٰ (کوفہ کے سب سے بڑے قاضی) کے مسائل اور فیصلوں میں بیشتر غلطیاں نکالتے رہتے تھے اور لوگوں پر ان غلطیوں کو ظاہر کرتے رہتے تھے۔

اگر یہ واقعہ ہے اور کوئی ایک ہی بیان کرنے والا ہو یا ایک ہی روایت ہو تو شک کی گنجائش بھی ہو سکتی ہے اجمالاً وتفصیلاً اتنے مختلف ذرائع سے امام کے اس طرز عمل کو لوگوں نے نقل کیا ہے کہ مشکل ہی سے اتنے راویوں کی طرف غلط بیانی کے انتساب کی اجازت عقل دے سکتی ہے۔

کوئی شبہ نہیں کہ نفسانیت یا خودنمائی وغیرہ کے ذلیل جذبات کے سوا اگر اس کی توجیہ کی کوئی دوسری شکل نہ ہوتی تو امام کی پوری زندگی کو سامنے رکھتے ہوئے شاید ان روایتوں کو مسترد کرنے کی ایک وجہ نکل سکتی تھی۔

لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ امام کے سامنے جو کام تھا اس کی تکمیل میں در حقیقت اس منزل سے گذرنا ناگزیر تھا انہوں نے ممکنہ جدوجہد فکر و تامل تحقیق و تدقیق کے سارے ذرائع کو خرچ کر کے اسلامی آئین کے تمام شعبوں کو مدون کر لیا تھا اور ایسے لوگ بھی اپنی صحت اور تربیت میں رکھ کر تیار کر چکے تھے جن میں وہ محسوس کرتے تھے کہ نفاذ کا

اختیار اگر ان کے ہاتھ دے دیا جائے گا تو وہ اس مدونہ آئین کے دفعات کو ہر چیز سے بے پروا ہو کر حوادث و واقعات پر منطبق کرنے میں کامیاب ہوں گے۔

قضاء فصل خصومات میں حکومت کے نظام کی اصلاح

لیکن اسی کے ساتھ قضاء فصل خصومات' کے اس نظم کو جواب تک حکومت نے قائم کر رکھا تھا اس کے نقائص بر سر عام جب تک ظاہر نہ کئے جائیں گے امام کے''لائحہ عمل'' کی طرف حکومت اور عوام کو توجہ کرنے کی ضرورت ہی کیا ہوگی۔

اس ماہ کا یہی سوال تھا کہ خاموشی اور مروت سے اگر کام لیا جاتا ہے تو امام دیکھ رہے تھے کہ سارا کیا کرایا یوں ہی دھرا کا دھرا رہ جائے گا اور جن بے تمیزیوں سے اس وقت اس معاملہ میں حکومت کام لے رہی ہے ان کے اصلاح کی کوئی صورت پیدا نہ ہوگی۔

جن میں مروت و سماجت کے جذبات کی نوعیت وہی ہو جو امام میں تھی وہی کچھ اندازہ کر سکتے ہیں کہ اس کٹھن منزل کو طے کرنے کے لیے اپنے سینے پر ان کو کتنی بڑی چٹان رکھنی پڑی ہوگی' حقیقت تو یہ ہے کہ محمد رسول اللہ علیہ کے دین اور آپ کی امت مرحومہ کے فلاح و صلاح کا جو بے پناہ ولولہ اور تڑپ امام میں تھی۔ اگر وہی ان پر غالب آ کر مروت و مدارات کے جذبات پر غالب نہ آ جاتی تو میں نہیں سمجھتا کہ ان جیسے آدمی سے یہ جرأت تقریباً ناممکن تھی۔ خیال کرنے کی بات ہے کہ جو بچوں کی ڈانٹ سے ڈر جاتا ہو اتنا ڈر جاتا ہو کہ چکرا کر گر پڑتا ہو بازاریوں کے سخت و سست سننے کا خاموشی کے ساتھ عادی ہو' والی کے بھرے دربار میں اپنی غلطی کے اعتراف پر جری ہو۔ اسی آدمی کے متعلق یہ کیسی عجیب بات ہے کہ ایک اچھے لکھے پڑھے عالم کی غلطیوں کی جستجو میں لگ جائے ایک وہ دفعہ نہیں بلکہ اسی کو اپنا مشغلہ بنالینا اور اسی پر بس نہ کرنا بلکہ کوچہ و بازار میں ان غلطیوں کی تشہیر اور کسی اجنبی کے ساتھ نہیں بلکہ اپنے ہم شہر ملنے جلنے والے آدمی کے ساتھ یہ معاملہ کیا شدید ترین دینی ضرورت کی احساس کے بغیر امام ابوحنیفہ جیسے آدمی سے

ممکن ہے؟

حکومت کی عدالتوں کے فیصلوں پر حضرت امام کی بے لاگ تنقیدیں

پس واقعہ وہی ہے کہ یہاں کسی کی شخصیت کا سوال ہی نہیں تھا بلکہ جو ان کا نصب العین تھا اس کی تکمیل کی اس کے سوا کوئی صورت ہی نہ تھی کہ اس طریقے سے حکومت کو نقائص کی اصلاح کی طرف متوجہ کیا جائے اور جب وہ متوجہ ہو تو اپنی ساری زندگی اور زندگی کے سارے وسائل کو کھپا کر جو صحیح چیز انہوں نے تیار کی تھی اس کے قبول کرنے پر قدرتاً وہ مجبور ہو جائے۔

یقیناً ابن ابی لیلیٰ کی شخصیت سے ان کو بحث نہیں تھی۔ اس راہ میں جو بھی ان کے سامنے آتا وہ اس کے ساتھ یہی معاملہ کرتے بلکہ میرا خیال ہے کہ ابن ابی لیلیٰ کی جگہ امام کے اکلوتے صاحبزادے حماد ہی کیوں نہ ہوتے جب بھی وہ وہی کرتے جو ابن ابی لیلیٰ کے ساتھ انہوں نے کیا۔

ابنِ ابی لیلیٰ کے مسائل اور قضایا جن میں امام مسلسل غلطیاں نکالتے رہے میرا خیال تو یہ ہے کہ قانون کے اصلاحی سلسلے کی وہ عجیب چیز ہوگی لیکن اس کا افسوس ہے کہ امام کے سوانح نگاروں نے جیسا کہ میں نے عرض کیا بیسیوں واقعات نقل کئے ہیں۔ مگر زیادہ تر یہ ایسی چیزیں ہیں جنھیں ہم تک بجائے قانونی اصلاحات کے گویا گرمی بزم کے لطائف سے زیادہ مشابہ پاتے ہیں ابن ابی لیلیٰ زمانے تک کوفہ میں قاضی رہے اور امام بھی کوفہ ہی میں موجود تھے خدا ہی جانتا ہے کہ یہی قصہ اگر وہاں چھڑ گیا تھا تو کتنے مقدمات اور مسائل ایسے ہوں گے جن پر امام کی طرف سے نکتہ چینی کی گئی ہوگی میرے خیال میں علم کا وہ ایک ذخیرہ ہوگا۔ بہرحال اس سلسلہ میں امام کے سوانح نگاروں نے جن لطائف کا ذکر کیا ہے چند کا تذکرہ تو مجھے کر ہی دینا چاہئے مثلاً وہی دریچہ کا مقدمہ

روشن داش کا مقدمہ:

کہتے ہیں کہ ابن ابی لیلیٰ کے اجلاس میں ایک شخص نے یہ عرضی پیش کی کہ اپنے

مکان میں ایک شبقہ یا روشن دان بنانا چاہتا ہوں لیکن میرا پڑوسی بنانے نہیں دیتا اور روکتا ہے پڑوسی بلایا گیا۔ اس نے کچھ وجوہ پیش کیے ابن ابی لیلیٰ نے فیصلہ کر دیا کہ روشن دان نہ کھولا جائے مسئلہ کو لے کر وہ امام ابوحنیفہ کے پاس پہنچا امام نے کہا کہ تم بجائے روشن دان کے عرضی دو کہ میں اپنے مکان کی ایک دیوار گرا دینی چاہتا ہوں اور جس دیوار میں روشن دان قائم کرنا چاہتے ہو اسی کو گرانے کا ارادہ کرو اس نے یہی کیا۔ ابن ابی لیلیٰ نے فیصلہ کیا کہ ہر شخص کو اپنے مکان کی دیوار کے گرا دینے کا حق ہے تم اس دیوار کو ڈھا سکتے ہو وہ اس فیصلہ کے ساتھ گھر آیا اور امام کی ہدایت سے دیوار کے گرانے کا اعلان کیا۔ پڑوسی گھبرایا ہوا ابن ابی لیلیٰ کے پاس پہنچا کہ جناب اب تو روشن دان ہی نہیں وہ پوری دیوار ہی کو گرا رہا ہے میرے لیے روشندان دیوار کے گرنے سے زیادہ آسان تھا۔ ابن ابی لیلیٰ خاموش ہو گئے اور سمجھ گئے کہ ابوحنیفہ کا اس مشورے میں ہاتھ ہے۔

مجنونہ کا مقدمہ

اسی طرح دوسرا مقدمہ مجنونہ کا یہ بیان کیا جاتا ہے کہ کسی محلہ میں ایک بڑھیا رہتی تھی لوگوں نے اس کا ایک خاص نام رکھ چھوڑا تھا جہاں اس نام سے اسے پکارتے بے تکان نام لینے والوں کو گالیاں سنانی شروع کرتی۔ حسب عادت کسی نے اسی نام سے بڑھیا کو پکارا اس نے صلواتیں سنانی شروع کیں جن میں اس کے باپ ماں کے نام کی بھی گالیاں تھیں یہ صاحب جنھوں نے بڑھیا کو چھیڑا تھا۔ تھے غضبناک آدمی آپ نے فوراً ابن ابی لیلیٰ کے اجلاس میں قذف (گالیاں دینا یا ازالۂ حیثیت عرفی کا دعویٰ بایں الفاظ دائر کر دیا کہ میری ماں اور باپ کو اس بوڑھی نے گالیاں دی ہیں۔ قذف جیسا کہ معلوم ہے اسلام نے ان جرائم کے ذیل میں اس کو شریک کر دیا ہے۔ جس پر حد جاری ہوتی ہے۔ یعنی قذف کے مرتکب کو کوڑے لگائے جاتے ہیں ابن ابی لیلیٰ نے تحقیقات کے بعد قذف کے ثابت ہو جانے کی وجہ سے بوڑھی پر حد جاری کر دی چونکہ اس نے مدعی کی ماں کو بھی گالیاں دی تھیں اور باپ کو بھی اس لیے بجائے ایک حد کے دو حدوں کے قائم کرنے کا فیصلہ کیا اور مسجد جو اسلام کے ابتدائی زمانہ میں (عدالت گاہ) کے لیے بھی

استعمال ہوتی تھی وہیں اس بڈھی پر دونوں حدیں جاری کر دیں گئیں واقعہ یہ تھا کہ مدعی کے ماں باپ کو بڈھی نے گالیاں دی تھیں وہ اس وقت تک بقید حیات تھے۔ امام تک ابن ابی لیلیٰ کے اس فیصلے کی خبر پہنچائی گئی آپ نے فرمایا کہ ایک ہی نہیں اس مقدمہ میں قاضی نے متعدد غلطیاں کی ہیں پہلی بات تو یہی ہے کہ وہ بڈھی مشہور ہے کہ مجنونہ ہے اس کی تحقیق ہونی چاہیے تھی کہ واقعۃً اس کو جنون ہے یا نہیں دوسری بات یہ ہے کہ جب ماں باپ مدعی کے زندہ ہیں تو قذف کے دعوے کے پیش کرنے کا حق اس مدعی کو تھا ہی نہیں بلکہ یہ حق تو اس کے ماں باپ کا تھا' انھوں نے دعوے کو قبول ہی کیسے کیا' جب کہ ان لوگوں کی طرف سے دعویٰ پیش نہیں ہوا تھا جن کے ساتھ قذف کا ارتکاب کیا گیا ہے۔ تیسری بات یہ ہے کہ مسجد میں انھوں نے حد لگوائی۔ حالانکہ مسجد سزا دینے کی جگہ نہیں۔ چوتھی بات یہ ہے کہ قانون یہ ہے کہ بہت سے لوگوں کو شریک کر کے ایک ہی مجمع میں اگر کوئی گالیاں دے تو گالی دینے والے کو ایک ہی سزا دی جائے گی نہ کہ ہر ہر شخص کی طرف سے وہ علیحدہ علیحدہ سزاؤں کا مستحق ہوتا ہے۔

اسی طرح امام نے اور بھی چند نقائص نکال کر دکھائے جن کی تعداد کافی دراز تھی۔ خطیب بغدادی نے بھی اس واقعہ کا اپنی تاریخ میں ذکر کیا ہے آخر میں یہ اضافہ ہی ان کی روایت میں ہے کہ ابن ابی لیلیٰ کو جب امام کے ان اعتراضوں کی خبر ہوئی تو اپنے حاکمانہ اختیار سے کام لے کر یہ حکم دے دیا کہ شرعی معاملات میں امام ابوحنیفہ کسی قسم کی گفتگو نہ کریں یعنی فتویٰ وغیرہ نہ دیا کریں اس قانون کا نام قانونِ حجر ہے لیکن کچھ ہی دن کے بعد خطیب نے لکھا ہے کہ ولی عہد حکومت کی طرف سے چند سوالات کوفہ آئے ولی عہد کا حکم تھا کہ امام ابوحنیفہ سے بھی ان مسائل کے متعلق فتویٰ لیا جائے قاصد نے ان سے دریافت کیا جس کے جواب میں انھوں نے فرمایا کہ مجھے قاضی شہر نے فتویٰ دینے سے حکما منع کر دیا ہے قاصد نے ولی عہد کو خبر سنائی فرمان ہوا کہ حجر امام سے اٹھا لیا جائے۔ آئندہ ابن ابی لیلیٰ کے لئے یہ اختیار بھی باقی نہ رہا امام نے آزادی کے ساتھ اعتراضات کا سلسلہ شروع کر دیا۔ کتابوں میں ایک ذخیرہ ان اعتراضات اور تنقیدوں کا نقل کیا گیا ہے

جو سرکاری قاضیوں کے فیصلوں پر امام کی طرف سے آئے دن ہوتے رہتے تھے سب کا نقل کرنا دشوار بھی ہے اور غیر ضروری بھی ہے نمونے کے لیے غالباً ان چند لطیفوں کا تذکرہ کافی ہے۔

گواہوں پر جرح کے متعلق حضرت امام کا نقطۂ نظر

عجیب بات ہے کہ گواہوں پر جرح کے سلسلے میں اعداد و شمار اور محل وقوع کے فاصلہ وغیرہ کے متعلق سوال کر کر کے شہادت کے کمزور کرنے کی کوشش وکلاء کی طرف سے موجودہ زمانہ کی عدالتوں میں جو مروج ہے امام کی سوانح عمری میں بھی ایک واقعہ اسی قسم کا نقل کیا گیا ہے۔ لیکن اس قسم کے لغو جرح کو امام نے مسترد کر دیا تھا کہتے ہیں کہ کسی باغ کا مقدمہ تھا' گواہ ابن ابی لیلیٰ کے سامنے جو پیش ہوا۔ اس سے دریافت کیا گیا کہ باغ میں کتنے درخت ہیں کیا تم بتا سکتے ہو؟ گواہ نے کہا کہ جناب میں نے درختوں کے گننے کی کوشش کبھی نہیں کی ابن ابی لیلیٰ نے محض اسی کو جرح قرار دے کر اس کی شہادت مسترد کر دی۔ قصہ امام تک پہنچا امام نے گواہ کو یہ تعلیم کر کے واپس کیا کہ قاضی صاحب سے جا کر یہ دریافت کرو کہ جناب کوفہ کی جامع مسجد میں اتنے زمانہ سے اجلاس کر رہے ہیں اور نماز بھی پڑھتے ہیں کیا بتا سکتے ہیں کہ اس کے ستونوں کی تعداد کیا ہے[1]؟ قاضی صاحب نے کہا میں نے تو کبھی ستونوں کو اس کے نہیں گنا گواہ نے کہا کہ تو پھر درختوں کی تعداد نہ بتانے کی وجہ سے آپ نے یہ فیصلہ کیسے کر دیا کہ میں اس باغ سے واقف نہیں ہوں[2]

---

[1] کوفہ کی جامع مسجد کی وسعت کے لحاظ سے یہ معمولی سوال نہیں تھا۔

[2] اس موقعہ پر بانی دارالعلوم دیوبند حضرت مولینا محمد قاسم قدس اللہ سرہ العزیز کا وہ واقعہ یاد آتا ہے کہ جب شاہ جہاں پور کے قریب ایک ندی کے کنارے ''میلہ خداشناسی'' میں پنڈت دیانند سرسوتی نے اسلام کی جنت کی نہروں پر اعتراض کرتے ہوئے پوچھا کہ مولوی قاسم بتا سکتے ہیں کہ جنت کی ان نہروں کا طول و عرض کیا ہے؟ مولینا جب جواب کے لئے کھڑے ہوئے تو فرمایا کہ ''جنت'' تو عالم ؎

الغرض یہ اور اسی قسم کے اعتراضات کا ایک سلسلہ تھا جو حکومت کے مقرر کردہ قاضیوں ابن ابی لیلیٰ اور ابن شبرمہ پر امام کی طرف سے مسلسل جاری تھا' ابن ابی لیلیٰ کی طرف یہ فقرہ جو منسوب کیا گیا ہے کہ:

من هذا الخز از لا يزال يا تيني منه الصواعق. (ص ۲۲۵) یہ خزاز (خزباف یا خز فروش) کون ہے جس کی طرف سے یہ بجلیاں مجھ پر ٹوٹتی رہتی ہیں۔

مگر بے چارے بجز اس کے سٹ پٹا کر رہ جائیں اور کر کیا سکتے تھے اعتراضات اور وہ بھی امام ابوحنیفہ کے اعتراضات بھلا ان کا جواب وہ کیا دے سکتے تھے زیادہ سے زیادہ یہی کہ ''خزاز یا حائک (جولاہے) وغیرہ الفاظ کا امام کی طرف انتساب کر کے دل کی بھڑاس نکال لیا کرتے تھے۔

حائک کا لطیفہ:

ایک دلچسپ لطیفہ اس سلسلہ میں یہ نقل کیا جاتا ہے کہ موسیٰ بن عیسیٰ مکہ کا عباسیوں کی طرف سے والی تھا حج کے زمانے میں وہاں ابن ابی لیلیٰ اور ابن شبرمہ سرکاری قضاۃ بھی پہنچے ہوئے تھے اور حضرت امام ابوحنیفہ بھی وہیں تھے کسی وثیقہ کے لکھوانے کی ضرورت موسیٰ بن عیسیٰ کو پیش آئی پہلے اس نے دونوں سرکاری قاضیوں کو بلوا کر لکھنے کی فرمائش کی لیکن جو لکھتا دوسرا اس میں نقائص نکال کر رکھ دیتا اسی جھگڑے میں وثیقہ تیار نہ ہوسکا آخر یہ دونوں حضرات تشریف لے گئے تھوڑی دیر میں امام ابوحنیفہ بھی کسی ضرورت سے موسیٰ کے پہنچے۔ دیکھ کر بہت خوش ہوا اور وثیقہ کا قصہ امام کے سامنے دہرایا امام نے تو

لے غیب کی ایک چیز ہے یہ ندی جس کے کنارے کھڑے ہو کر پنڈت جی نے ابھی تقریر فرمائی ہے کیا بتا سکتے ہیں کہ اس ندی کا طول عرض کیا ہے۔ پنڈت جی چپ تھے مولانا نے تب تنبیہ فرمائی کہ اس قسم کے صفات کے نہ جاننے سے یہ نتیجہ نکال لینا کہ ایسی شے موجود نہیں ہوسکتی محض مغالطہ ہے ندی سب کے سامنے موجود ہے لیکن طول وعرض کا علم سوا اس کے کسی کو نہیں ہے۔ کیا اس سے یہ لازم آئے گا کہ ندی موجود نہیں ہے یا جو لوگ یہاں موجود ہیں ان کو اس ندی کا علم نہیں ہے یہ کہ پرانی فرسودہ جرح اس زمانہ کی عدالتوں میں بھی اب تک مروج ہے شاید سمجھا جاتا ہے کہ یہ بھی اس زمانے کے نئے اکتشافوں میں ایک اکتشاف ہے۔۱۲

اسی قسم کے مواقع کی تلاش میں رہتے تھے فرمایا کہ کاتب کو بلوایئے میں لکھواتا جاتا ہوں وہ لکھے یہی ہوا کاتب آیا وہیں بیٹھے بیٹھے امام نے وثیقہ لکھوا دیا۔ اور موسیٰ کے حوالہ کیا جیسا چاہتا تھا ٹھیک اس کی مرضی کے مطابق تھا جب امام صاحب چلے گئے تب دونوں سرکاری قاضیوں کو اس نے بلا کر وثیقہ خود پڑھ کر سنایا دونوں سنتے رہے اور کوئی نقص اول سے آخر تک نہ نکال سکے موسیٰ نے بتایا کہ یہ امام ابو حنیفہ کا لکھوایا ہوا وثیقہ ہے ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔ لکھا ہے کہ جب باہر نکلے تو ایک نے دوسرے سے کہا کہ:۔

اما تری هذا الحائک جاء فی ساعة فکتبه (ص ۱۷۰ ج ۱ موفق)[1] تم نے اس جولاہے کو دیکھا کہ اسی وقت اس نے لکھ دیا۔

کہتے ہیں کہ تب دوسرے نے کہا بھائی! جولاہہ بھی کہیں ایسی عبارت لکھ سکتا ہے۔ الغرض جواب میں یہی ''الخزاز'' الحائک' صاحب الرائے قیاس وغیرہ الفاظ کے سوا بیچاروں کے بس میں کوئی دوسری چیز نہیں تھی اگرچہ بعضوں نے لکھا ہے کہ ابن ابی لیلیٰ نے بعض مقدمات میں امام کو پھنسانا چاہا۔ لیکن میرے خیال میں شاید یہ بعد کی بنائی ہوئی باتیں ہیں اور اصل واقعات سے جو ناواقف ہیں انہوں نے امام اور ابن ابی لیلی یا کوفہ کے دوسرے قضاۃ کے ساتھ حضرت امام کی اس طرز عمل کو مولویانہ چھیڑ چھاڑ کی چیزیں

---

[1] ایک واقعہ اس سلسلہ میں جو میرا چشم دید ہے اب تک یاد ہے میرے گاؤں ''گیلانی'' میں ایک بڑے عالم تھے واعظ تھے مصنف تھے نام ملا عبداللہ تھا پنجاب کے تھے گیلانی میں رہ پڑے تھے مسلک اہل حدیث کا کہتے تھے مفتی عبداللطیف صاحب سابق پروفیسر جامعہ عثمانیہ نے امام ابو حنیفہ کی سوانح عمری میں ایک مفید اور دلچسپ کتاب ''تذکرۂ اعظم'' کے نام سے لکھی ہے میں نے اپنے چچا صاحب مرحوم کو یہ کتاب دیکھنے کے لئے دی انہوں نے ان ہی اہل حدیث عالم صاحب کے پاس خود مطالعہ کرنے کے بعد بھیج دیا یہ میری آنکھوں کی دیکھی ہوئی بات ہے اہل حدیث صاحب نے کتاب کو دیکھ کر ایک رقعہ کے ساتھ واپس کیا جس میں لکھا ہوا تھا ''سچی بات ہے کہ ابو حنیفہ جولاہہ تھے' بزاز تھے' فلاں فلاں کتاب میں یہی لکھا ہوا ہے شاید میری اس کتاب پر وہ رقعہ چسپاں بھی کر دیا گیا تھا گویا بارہ سو سال تک ایک یہ لفظ ہے جس سے امام پر لوگ حملہ کر رہے ہیں۔ ۱۲

منسوب کی گئی ہیں جو ان کی شان کے مناسب نہیں اور جواباً امام کی طرف بھی ان میں ملایانہ مزاج والوں کی جانب سے ایسے اقوال منسوب کئے گئے ہیں جو میرے نزدیک تو کسی طرح امام ابو حنیفہ کے منہ پر پھبتے نہیں'' کہتے ہیں کہ ابن ابی لیلیٰ کی طرف سے اس قسم کی خبریں امام تک پہنچائی جاتیں کہ آپ کو اس قسم کے خطابوں سے وہ مخاطب کرتے ہیں یا دھمکیاں دیتے ہیں تو جواب میں امام نے فرمایا کہ:

فلیجتهد فانی افا اشجا فی حلقه (ص ۲۲۶ ج ۱)	ان کو کہو جتنا چاہیں اپنا زور خرچ کرلیں لیکن میں تو اس شخص کے حلق کا کانٹا بن کر رہوں گا۔

گویا اس کے یہ معنی ہیں کہ امام صاحب میں ابن ابی لیلیٰ کے متعلق کوئی ذاتی کاوش پیدا ہو گئی تھی جہاں تک امام کی مجموعی زندگی سے ان کی فطرت اور جبلی نہاد کا پتہ چلتا ہے اس میں ابن ابی لیلیٰ تو خیر ایک بڑے آدمی تھے کسی معمولی آدمی کے متعلق ذلیل جذبات کی پرورش اپنے اندر وہ کر ہی نہیں سکتے تھے افسوس ہے کہ ان کی پوری زندگی اس وقت میں نہیں پیش کر رہا ہوں تاہم دوسرے مسائل کے ضمن میں جو چیزیں اب تک گذر چکی ہیں پڑھنے والوں کے قلوب خود فیصلہ کر سکتے ہیں کہ اس قسم کی معمولی ملایانہ نفسانیتوں کی کیا امام صاحب کے سینے میں گنجائش پیدا ہو سکتی ہے۔

زیادہ سے زیادہ ان روایتوں میں ایسی باتیں مثلاً کبھی کبھی ابن ابی لیلیٰ کے حملوں کو سن کر امام فرما دیتے کہ:[1]

---

[1] مثلاً کہتے ہیں کہ ایک دن بطور سیر کے ابن ابی لیلیٰ کسی باغ میں گئے ہوئے تھے تھوڑی دیر میں امام ابو حنیفہ بھی پہنچے اتفاقاً باغ میں دوسری طرف کچھ عورتیں تھیں جو گا رہی تھیں گاتے گاتے جب وہ گانے کو اپنے انہوں نے ختم کیا تو بے ساختہ امام ابو حنیفہ کی زبان سے یہ فقرہ نکل گیا احسن (خوب کیا تم عورتوں نے) بہ ظاہر جس سے معلوم ہوتا تھا کہ امام نے عورتوں کے گانے کی تعریف کی ابن ابی لیلیٰ نے کہا کہ تم پر فسق کے سراہنے کا مقدمہ چلا کر میں تمہیں مردود الشہادۃ قرار دوں گا۔ امام نے کہا میں نے کیا کیا بولے تم نے غیر شرعی گانے کی تعریف کی امام نے کہا کہ کس وقت بولے جب وہ چپ ہوئیں امام نے کہا۔ میں نے تو اس کی تعریف کی کہ فسق کے فعل کو ترک کر کے تم نے خاموشی اختیار کی یہ اچھا کام تم نے کیا' ابن ابی لیلیٰ کھسیانے سے ہو کر رہ گئے اور بھی بعض واقعات ہیں مگر مجھے ان پر اعتماد نہیں ہے۔۱۲

''میرے متعلق یہ شخص ان حدود تک چلا جاتا ہے کہ میں شاید اس کے بلے اور اس کے گدھے کے متعلق بھی باتیں نہیں کہہ سکتا ص ۱۳ ج ۲۔

اور اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ ابن ابی لیلیٰ اور ان کے ہم پیشہ دوسرے سرکاری قضاۃ امام کو خواہ کچھ کہہ دیتے ہوں۔ جولاہہ' خزاز' خباز وغیرہ لیکن امام کی شرافت دیکھئے کہ ابن ابی لیلیٰ تو ابن ابی لیلیٰ ہی تھے وہ ان کے بلے اور ان کے گدھے کے متعلق بھی ایسی باتیں پسند نہیں کرتے تھے۔

یہ سچ ہے کہ امام صاحب میں تمام خوبیوں کے ساتھ جیسا کہ دوسری شہادتوں سے بھی تائید ہوتی ہے مزاج میں کچھ ظرافت اور مزاح کا عنصر بھی شریک تھا بالکل ممکن ہے کہ بطور مذاق کے انہوں نے کبھی کچھ کہہ دیا ہو۔ بلکہ بعض لوگوں نے یہ بھی لکھا ہے۔

مثلاً کہتے ہیں کہ آخر زمانہ میں تنگ آ کر ابن ابی لیلیٰ نے چند آدمیوں کو مقرر کر لیا تھا جو اپنی طرف سے امام ابوحنیفہ سے ان مسائل کے متعلق پہلے ہی رائے دریافت کرا لیتے جن کے متعلق ان کو شبہ ہوتا تھا کہ امام ان پر اعتراض کریں گے مگر سائل کے طرز سوال ہی سے امام صاحب تاڑ جاتے کہ یہ خود سوال نہیں کر رہا ہے بلکہ پس پشت خود قاضی صاحب ہیں بیان کیا جاتا ہے کہ بے ساختہ اس وقت امام کی زبان پر یہ شعر جاری ہو جاتا کہ:

اذا تکون عظیمة ادعی لها
واذا یحاس الحیس یدعی جندب.

جب کوئی کڑی گھڑی آ پڑتی ہے تب یہ بندہ بلایا جاتا ہے اور جب حلوے انڈے پر ہاتھ پھیرنے کا معاملہ ہوتا ہے تب ''جندب'' کی طلبی ہوتی ہے۔

شاعر نے تو یہ شعر ''جندب'' نامی کے لئے لکھا تھا امام ابوحنیفہ اس کو ابن ابی لیلیٰ پر منطبق کرتے تھے۔

خلاصہ یہ ہے کہ امام کے سامنے جیسا کہ بار بار عرض کرتا چلا آ رہا ہوں جہاں تک میرا خیال ہے قطعاً کسی کی شخصیت نہیں تھی حکومت اسلامی میں ''قضا'' اور ''فصل

خصومات'' کے مسئلہ کو وہ اس بلندی پر دیکھنا چاہتے تھے جس کا وہ قرار واقعی طور پر مستحق تھا۔ لیکن جن لوگوں کے ہاتھ میں حکومت تھی وہ اس باب میں اپنی ذمہ داریوں جیسا کہ چاہیے تھا نہیں محسوس کر رہے تھے۔ بعض مثالوں کا ذکر میں پہلے کر چکا ہوں اور گذشتہ واقعات جن کا ابن ابی لیلیٰ کے سلسلے میں تذکرہ کیا گیا ہے۔ اسی سے اندازہ کیجئے کہ کس قسم کے لوگوں کا انتخاب حکومت اس اہم اسلامی فرض کی تعمیل کے لئے کر رہی تھی یہ حال کسی معمولی گاؤں یا قصبہ تعلقہ کے قاضی کا نہ تھا بلکہ اس مختلف وجوہ واسباب کی بنیاد پر جو قبۃ الاسلام'' تھا بلکہ جیسا کہ آپ مجھ ہی سے سن چکے کہ بغداد سے پہلے عباسیوں نے اپنا دارالخلافہ کوفہ یا اطراف کوفہ کو بنا رکھا تھا جہاں لاکھوں لاکھ آدمی کی اس وقت آبادی تھی اور بڑے بڑے لوگ جہاں مقیم تھے وہاں کے قاضی صاحب کا تصفیہ مقدمات میں یہ حال تھا۔

برسرِ عدالت حضرت امام کی ایک فیصلہ پر تنقید

ان واقعات کی حیثیت تو شاید لطائف کی ہو لیکن ایک مقدمہ تو خود امام ابوحنیفہ کے سامنے کا ہے۔ چونکہ اس واقعہ سے صرف اس زمانہ کے سرکاری قاضیوں ہی کا حال نہیں معلوم ہوتا ہے بلکہ امام اسلامی عدالت میں جن بلندیوں کو پیدا کرنا چاہتے تھے۔ ان کی بھی ایک ہلکی سی جھلک نظر آتی ہے اس لئے میں چاہتا ہوں کہ اس قصے کو نقل ہی کر دوں اس قصے کے راوی کوئی معمولی آدمی نہیں ہیں بلکہ حسن[1] بن ابی مالک راوی ہیں جو قاضی ابو

---

[1] محمدؒ بن شجاع البلخی کے استاد اور قاضی ابو یوسف کے شاگرد ہیں، امام طحاوی نے ان کے حالات میں لکھا ہے کہ ان کے استاد ابن ابی عمران بیان کرتے تھے کہ محمد بن شجاع البلخی جب حسن بن ابی مالک سے پڑھتے تھے تو لوگوں کا یہ عام خیال تھا کہ جیسی تدقیق وتحقیق سے کام لیتے ہیں اتنی تدقیق قاضی ابو یوسف بھی مسائل کی چھان بین نہیں کرتے تھے۔ صمیری نے لکھا ہے کہ ثقہ فی روایۃ روایت کرتے ہیں فقہ میں علم ان کا گہرا تھا نظر وسیع تھی۔ قاضی ابو یوسف ان کو دیکھ کر کہتے کہ یہ بار شتر کو اٹھائے ہوئے ہے یعنی اپنی طاقت سے زیادہ علم کا بوجھ اپنے اوپر محض اپنی محنت سے اٹھائے ہوئے ہیں۔ ۱۲ طبقاتؒ۔

یوسف کے مشہور تلامذہ میں شمار کئے جاتے ہیں غالباً خود قاضی ابو یوسف سے انہوں نے اس واقعہ کو سنا تھا اور حسن سے ان کے تلمیذ شہید محمد بن شجاع البلخی اس قصے کو نقل کرتے تھے بہر حال قصہ یہ ہے کہ امام ابوحنیفہ ایک دن قاضی ابن ابی لیلیٰ کے اجلاس میں پہنچے۔ امام کے ساتھ قاضی ابو یوسف بھی تھے بیان کیا جاتا ہے کہ اس وقت ابن ابی لیلیٰ کو اس کا خیال ہوا کہ مقدمات کے تصفیہ میں جس تحقیق و تدقیق سے کام لیتا ہوں۔ امام ابوحنیفہ کو دکھاؤں آدمی کو انہوں نے حکم دیا کہ ارباب معاملہ کو اندر بلا لیا جائے اتفاق دیکھئے کہ اس وقت بھی پہلا مقدمہ جو پیش ہوا وہ قذف ہی کا تھا مدعی نے دعویٰ دائر کیا تھا کہ فلاں آدمی نے (جو حاضر تھا) مجھے ابن الزانیہ کہا ہے ابن ابی لیلیٰ نے سن کر مدعی علیہ کی طرف رخ کر کے پوچھا کہ کہو! تم کیا کہنا چاہتے ہو امام ابوحنیفہ نے قاضی صاحب کے اس طرز عمل کو دیکھ کر کہا کہ جناب قاضی صاحب پہلے آپ نے یہ بھی تنقیح کی کہ دعویٰ پیش کرنے والا اس دعویٰ کو پیش بھی کر سکتا ہے یا نہیں انہوں نے کہا کہ کیوں؟ امام صاحب نے فرمایا کہ زنا کی نسبت مدعیٰ علیہ نے اس کی ماں کی طرف کی ہے دعوے کا حق اس کی ماں کو ہے نہ اس کو آپ کو یہ دریافت کرنا چاہیے کہ اس کی ماں نے اپنی طرف سے کیا وکیل بنا کر آپ کے اجلاس میں اس کو بھیجا ہے؟ مدعی نے کہا کہ نہیں میری ماں نے وکیل نہیں بنایا ہے بلکہ میں نے خود اپنی طرف سے دعویٰ دائر کیا ہے امام ابوحنیفہ نے ابن ابی لیلیٰ کو سمجھایا کہ ایسے موقعہ پر آپ کو چاہیے تھا کہ مدعی سے یہ دریافت کرتے کہ اس کی ماں زندہ ہے یا مر چکی ہے اگر زندہ ہے تو ظاہر ہے کہ دعویٰ اس مدعیہ کی طرف سے وکالتہً دائر ہو سکتا ہے اور اگر مر چکی ہے تو اس کا مسئلہ دوسرا ہے۔

ابن ابی لیلیٰ نے یہ سن کر مدعی کو خطاب کر کے پوچھنا شروع کیا کہ تمہاری ماں زندہ یا مر چکی ہے۔ مدعی نے کہا کہ مر چکی ہے ابن ابی لیلیٰ نے کہا کہ اس دعویٰ کے ثبوت میں کیا تم کوئی شہادت پیش کر سکتے ہو گواہ موجود تھے ان کو اس نے پیش کر دیا۔ اب ابن ابی لیلیٰ پھر مدعی علیہ کی طرف متوجہ ہوئے اس کا کیا جواب ہے یہ دریافت کرنا چاہا ابوحنیفہ نے پھر ... اور کہا کہ ابھی بات پوری نہیں ہوئی ہے آپ کو مدعی سے یہ بھی پوچھنا چاہیے کہ اس

کی ماں جو مر چکی ہے وارث اس کا صرف مدعی ہی ہے یا اور ورثہ بھی ہیں کیونکہ اگر اس کے بھائی ہیں تو اس دعویٰ کا حق اس میں اور اس کے بھائیوں میں مشترک ہو گیا اور اگر اکیلا وہی وارث ہے تو یہ دوسری بات ہو گی ابن ابی لیلیٰ نے مدعی سے بھی بات پوچھی جواب میں اس نے کہا کہ نہیں اکیلا میں ہی اس کا وارث ہوں۔ قاضی صاحب سمجھے کہ اب مدعی کی بات صاف ہو چکی اور پھر مدعیٰ علیہ کی طرف متوجہ ہوئے۔ امام ابوحنیفہ نے کہا جناب! آپ کو مدعی سے یہ بھی پوچھنا چاہیے کہ اس کی ماں آیا حرہ (آزاد عورت) تھی یا امت (شرعی لونڈی) تھی قاضی صاحب نے مدعی سے یہی سوال کیا جواب میں اس نے کہا کہ حرہ تھی اس پر شہادت طلب کی گئی جو گذار دی گئی قاضی صاحب نے پھر چاہا کہ مدعیٰ علیہ کو مخاطب کریں مگر امام نے روک کر کہا کہ آپ کو پوچھنا چاہیے کہ اس کی ماں آیا مسلمان عورت تھی یا ذمیہ (یعنی اسلامی حکومت کی غیر مسلم رعایا تھی) مدعی نے کہا کہ مسلمان عورت تھی فلاں مشہور خاندان سے اس کا تعلق تھا اس پر بھی شہادت طلب کی گئی جو پیش ہوئی امام ابوحنیفہ نے تب ابن ابی لیلیٰ کو خطاب کر کے کہا کہ ان تنقیحات کے بعد۔ شانک الان. اب وقت آیا ہے۔ کہ مدعیٰ علیہ سے دریافت کیجئے کہ وہ جواب میں کیا کہتا ہے اس نے انکار کیا مدعی سے شہادت طلب کی گئی اس نے کوفہ کے مشہور لوگوں میں سے چند کے نام پیش کیے آگے مقدمہ جاری رہا امام ابوحنیفہ اٹھنے لگے ابن ابی لیلیٰ نے چاہا کہ ان کو بٹھائیں لیکن وہ اٹھ کر چلے آئے۔

فقہ حنفی سے تھوڑا بہت بھی جو لگاؤ رکھتے ہیں وہ سمجھ سکتے ہیں کہ امام ابوحنیفہ کی قانونی موشگافیوں اور آئینی نکتہ بخیوں کا جو حال ہے اس کے لحاظ سے اس مقدمہ کے متعلق مذکورہ بالا تنقیحوں کی حیثیت بالکل معمولی ہے لیکن پھر بھی ان لوگوں کے لئے جو فقہ سے ناواقف ہیں ان دونوں باتوں کے اندازہ کرنے میں ایک حد تک مدد مل سکتی ہے یعنی حکومت قاضیوں کے مقرر کرنے میں کتنے تساہلی سے کام لے رہی تھی؟ اتنے معمولی تنقیحی سوالات جن کی حیثیت گویا بالکل ابتدائی سوالوں کی کسی مقدمہ کے لحاظ سے ہوسکتی ہے لیکن قانونی مناسبت کے نہ ہونے کی وجہ سے ان تنقیحوں کے پیدا کرنے کی بھی ان میں

صلاحیت نہ تھی اسی کے ساتھ اس کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ اسلامی عدالتوں کو امام ابوحنیفہ کس بلند معیار پر لانے کے خواہش مند تھے اور یہ سارے پاپڑ جو بیل رہے تھے اس کا مقصد کیا تھا؟

عدالت پر حکومت کا اثر:

اور یہی نہیں قاضی ابن ابی لیلیٰ اپنی سیرت و کردار کے اعتبار سے حالانکہ ایک امتیازی حیثیت کے مالک تھے میرا مطلب یہ ہے کہ ان کے والد یعنی عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ تو خیر جلیل القدر تابعی ہیں ہی خود کہتے تھے کہ صرف انصاری صحابیوں کی تعداد جن کو انہوں نے پایا تھا۔ ایک سو بیس تھی حضرت عمرؓ حضرت علیؓ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے روایت کیا کرتے تھے اس لحاظ سے بڑے باپ کے بیٹے تھے نام ان کا محمدؒ تھا۔ لیکن جس نام سے والد ان کے مشہور تھے اسی نام سے یہ بھی مشہور ہوئے والد کا کم سنی ہی میں انتقال ہو گیا تھا خود کہتے تھے کہ اپنے والد کے متعلق اس سے زیادہ یاد نہیں ہے کہ میرے والد کی دو بیویاں تھیں اور دو سبز رنگ کے خم گھر میں تھے جس میں نبیذ بنتی تھی۔[1]

بہر حال گو محدثین کے طبقہ میں ان کے حافظہ کی سخت شکایت پھیلی ہوئی ہے لیکن ان کی سیرت اور کردار پر کسی نے اعتراض نہیں کیا ہے بلکہ قاضی ابو یوسف کے حوالہ سے منجملہ اور باتوں کے یہ مدحی الفاظ بھی نقل کیے گئے ہیں کہ میں نے ابن ابی لیلیٰ سے زیادہ لوگوں کے مالیات کے متعلق محتاط کسی کو نہیں پایا (میزان ذہبی)

---

[1] کھجوروں کو پانی میں ڈال کر تھوڑی دیر کے لئے چھوڑ دیتے تھے مثلاً دس بارہ گھنٹے اس عرصہ میں اس کی مٹھاس پانی میں منتقل ہو جاتی تھی۔ عربوں کا یہ ایک مرغوب مشروبہ تھا' گویا ایک قسم کا شربت تھا' لیکن کبھی اس کے پینے سے سرور کی کیفیت بھی پیدا ہو جاتی تھی اس لئے بعض لوگوں نے اس کے استعمال کو بھی ناجائز قرار دے رکھا تھا اور دوسری طرف بے باکوں کا بھی ایک طبقہ تھا جو واقعی نشہ کی کیفیت پیدا کرنے کے بعد بنام نبیذ اس کو پیتا تھا حالانکہ نشہ پیدا کرنے کی خاصیت پیدا ہو جانے کے بعد وہ نبیذ نہیں شراب بن جاتی تھی' لیکن لفظی تعبیر سے فائدہ اٹھایا جاتا تھا۔ کوفہ کے علماء نفس نبیذ کو حلال کہتے تھے جس میں امام ابوحنیفہ بھی شریک ہیں۔ ابن ابی لیلیٰ کے بارے میں تو لکھا ہے کہ جو نبیذ کو حلال نہیں سمجھتا تھا اس کی شہادت قبول نہیں کرتے تھے (دیکھو میزان ذہبی)

مگر مشہور مورخ الیافعی کی یہ روایت اگر صحیح ہے کہ عباسیوں کے طاغیہ چھ لاکھ مسلمانوں کا خونی سفاک ابومسلم کا سامنا جب قاضی ابن ابی لیلیٰ سے ہوتا۔

فقبل یدہ (ص ۲۸۷ ج ۱) تو اس کے ہاتھ کو بوسہ دیتے۔

اس پر لوگوں نے ان کوٹو کا بھی جواب میں کہنے لگے کہ حضرت عمر کے ہاتھ کو ابو عبیدہ بن الجراح بھی تو بوسہ دیتے تھے' کہنے والا بھی ذرا دلیر تھا اس نے کہا قاضی صاحب! ابومسلم کا نام حضرت عمر کے مقابلہ میں لیتے ہیں۔ جواب میں بولے کہ تو پھر تم لوگ بھائی مجھے ابوعبیدہ سمجھتے ہو' مطلب یہ ہے کہ ابومسلم اگر عمر نہیں ہے تو بندہ ابوعبیدہ کب ہے جیسی روح ہے ویسے ہی تو فرشتے بھی ہوں گے۔

اس بحث کو چھوڑیئے کہ ابن ابی لیلیٰ کا یہ جواب کس حد تک واقعی جواب بننے کی صلاحیت رکھتا ہے بلکہ مان بھی لیا جائے کہ بے چارے قاضی صاحب نے ابومسلم جیسے شترکینہ سیاہ سینہ انسان کے ظلم وزیادتی سے بچنے کے لئے بطور تقیہ یا مدارات کے اس طرز عمل کو اختیار کیا ہو!

لیکن یہاں سوال مطلقاً جواز وعدم جواز سے نہیں ہے بلکہ امام ابوحنیفہ عہدۃ قضا کی ذمہ داریوں کو جس بلند معیار پر پہنچانا چاہتے تھے اس لحاظ سے دیکھئے کہ اس قسم کے مثالوں کو دیکھ کر ان کا کیا حال ہوتا ہوگا۔

بلاشبہ وہ چاہتے تھے کہ دین دنیا کے سامنے' علم جہل کے سامنے' انصاف بے انصافی کے سامنے کبھی نہ جھکے جھکانے کا اگر ارادہ کیا جائے تو خواہ انکار کرنے والے پر کچھ ہی گذر جائے جھکنے سے اس کو قطعاً انکار کر دینا۔ یہی وہ اس عہدے کی علمی اور عملی دونوں ذمہ داریوں کو چاہتے تھے کہ جس حد تک بلندی اس میں پیدا ہوسکتی ہے پیدا کی جائے۔ علمی حیثیت سے وہ جو کچھ کر رہے تھے آج بھی اس کے نتائج دنیا کے سامنے ہیں اور کردار وعمل کی راہ میں ان کی تربیت وتعلیم سے جن آثار کا ظہور ہوا ان کا اندازہ ان بزرگوں کی سوانح عمریوں سے ہوسکتا ہے' جنہوں نے امام کے بعد قضا کے خدمات انجام دیئے ہیں۔ یہ ایک مستقل کتاب کا مضمون ہے لیکن اس وقت قاضی ابن ابی لیلیٰ کے اس

قصے کے مقابلہ میں بے ساختہ جی چاہ رہا ہے کہ امام ابوحنیفہ کی تربیت نے جس انقلاب کو پیدا کیا تھا اس کی کم از کم ایک مثال کا ذکر کر ہی دوں۔

حضرت امام کی جدوجہد کے نتائج

آپ دیکھ رہے ہیں کہ جس کا ہاتھ چوما گیا وہ خود بادشاہ یا خلیفہ نہیں ہے بلکہ حکومت کا ایک افسر ہے اگرچہ بہت بڑا مطلق العنان افسر ہے لیکن پھر بھی بادشاہ اور فرماں رواں تو نہیں ہے۔ دیکھئے اسی کے مقابلہ میں اسی عباسی حکومت کا سب سے بڑا حکمران ہارون الرشید ہے یہ کسی حنفی مورخ کی نہیں بلکہ خطیب بغدادی کی روایت ہے جن کی کتاب میں حنفی ائمہ اور اکابر کے متعلق بمشکل انصاف سے کام لیا گیا ہے لیکن وہی مشہور کتاب الاموال کے مصنف ابوعبید قاسم بن سلام کے حوالہ سے یہ واقعہ نقل کرتے ہیں۔ ابوعبید کہتے ہیں کہ ہم لوگ محمد بن الحسن (یعنی امام ابوحنیفہ کے شاگرد) کے ساتھ تھے کہ اتنے میں الرشید (ہارون) سامنے سے گذر رہا تھا' رشید کو دیکھتے ہی مجلس میں جتنے آدمی تھے سروقد کھڑے ہو گئے۔

الا محمد بن الحسن فانه لم یقم. لیکن ایک محمد بن الحسن تھے جو نہ کھڑے ہوئے۔

اور جیسے بیٹھے ہوئے تھے بیٹھے کے بیٹھے رہے صرف نہ کھڑا ہونا بھی نہیں بلکہ فقام الیه الناس کلهم (رشید کے لئے سب کے سب کھڑے ہو گئے' اس واقعہ کے بعد مجلس میں کسی ایک آدمی کا بیٹھے رہنا یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے' ابوعبید کہتے ہیں کہ رشید اندر داخل ہو گیا اور تھوڑے سے وقفہ کے بعد الاذن (یعنی باریابی کی اجازت دینے والا) باہر نکلا اور آواز دی کہ محمد بن الحسن یعنی محمد بن الحسن کی خلیفہ کی پیشی میں طلبی ہے ابوعبید کہتے ہیں کہ اس آواز کے سنتے کے ساتھ ہی لوگوں کا یعنی امام محمد کے شاگرد جو وہاں بیٹھے ہوئے تھے سب کا خون خشک ہو گیا لیکن امام محمد اطمینان کے ساتھ اٹھے خلیفہ کے پاس تشریف لے گئے اور تھوڑی دیر بعد واپس ہوئے چہرہ بشاش تھا خوش نظر آ رہے تھے اور

خود ہی فرمانے لگے کہ خلیفہ نے بلا کر مجھ سے پوچھا کہ لوگوں کے ساتھ تم کیوں کھڑے نہیں ہوئے میں نے کہا کہ:

مجھے یہ کچھ اچھا معلوم نہیں ہوا کہ آپ نے جس طبقہ میں مجھے رکھا ہے اس طبقہ سے نکل کر دوسرے گروہ میں داخل ہو جاؤں' آپ نے مجھے اہل علم کی جماعت میں داخل کیا ہے یہ بات مجھے پسند نہ آئی کہ اہل علم کی جماعت سے باہر ہو کر ان لوگوں میں شریک ہو جاؤں جو آپ کی خدمت کے لیے ملازم ہیں۔

امام نے اس کے بعد کہا کہ:

''رشید سے میں نے یہ بھی کہا کہ آپ کے چچا کے بیٹے (رسول اللہ ﷺ کی طرف اشارہ تھا) نے فرمایا ہے کہ جو اس کی توقع رکھتا ہو کہ اس کی تعظیم کے لئے لوگ کھڑے ہوا کریں چاہیے کہ اپنا ٹھکانا وہ جہنم میں بنائے۔''

امام محمد کہتے ہیں:

''میں نے رشید سے یہ بھی کہا کہ ایسی صورت میں جو بیٹھا رہا اس لئے سنت کی پیروی کی یعنی وہی سنت جو آپ ہی کے خاندان سے منتقل ہو کر ہم لوگوں تک پہنچی ہے۔

ان ہی کا بیان ہے کہ رشید میری اس گفتگو کو سنتا رہا اور آخر میں اس نے کہا کہ:

صدقت یا محمد. محمد! تم نے سچی بات کہی۔

دین اور علم کی ایک شان یہ ہے کہ اور اسی کا دوسرا انجار وہ تھا وہی ہارون جس کی زبان پر النطع[1] اور السیف کے الفاظ چڑھے ہوئے تھے اس کے سامنے بھی امام ابوحنیفہ کا چڑھایا ہوا رنگ پھیکا نہیں پڑتا ہے' بلکہ ہارون ہی کو امام کے پیدا کئے ہوئے کردار کی تختی

---

[1] نطع چمڑی فرش کا نام تھا جس پر قتل ہونے والے کو بٹھلا کر قتل کیا جاتا تھا۔ سیف کے معنی تو ظاہر ہے کہ تلوار ہیں جس عہد کا یہ قصہ ہے غصہ میں سلاطین اور حکمران کی زبان پر یہ دونوں لفظ چڑھے ہوئے تھے۔

نرم پڑ جانے پر مجبور کر دیتی ہے۔

حقیقت تو یہ ہے کہ اس معاملہ میں اپنے تلامذہ کے اندر امام نے جس قسم کی حسی ذکاوت پیدا کر دی تھی۔ اس کے یہ لازمی نتائج تھے لیکن اس حسی ذکاوت کے پیدا کرنے میں وہ کیسے کامیاب ہوئے بلاشبہ ہم اسے ان کی کرامت ہی قرار دے سکتے ہیں۔

عدلیہ پر حضرت امام کے لائے ہوئے انقلاب کا اثر

قاضی عافیہ جن کا ذکر کسی موقعہ پر آ چکا ہے یعنی امام کی مجلس کے طے شدہ مسائل جب تک عافیہ نہ دیکھ لیں۔ امام صاحب کا حکم تھا کہ یادداشت کے رجسٹر میں وہ درج نہ کئے جائیں۔ ان ہی قاضی عافیہ کا ایک قصہ خطیب ہی نے نقل کیا ہے حاصل یہ ہے کہ مہدی عباسی خلیفہ نے ان کا تقرر عہدہ قضا پر کیا تھا۔ کچھ دن کام کرتے رہے' ایک دن خلاف معمول خلیفہ کے دربار میں حاضر ہو کر باریابی کی اجازت چاہی مہدی نے بلا لیا یہ دیکھ کر کہ کاغذوں کا بستہ (قمطر) بھی بغل میں دبا ہوا ہے۔ مہدی نے خیال کیا کہ معلوم ہوتا ہے کہ حکومت کے کسی عہدہ دار یا میرے رشتہ داروں نے ان پر کچھ دباؤ ڈالا ہے اسی کی شکایت کرنے آتے ہیں خود ہی پیش قدمی کر کے بولا کہ کیا کوئی ایسی صورت پیش آئی ہے بولے کہ امیر المومنین اس قسم کی کوئی بات نہیں ہے' بلکہ قصہ دوسرا ہے اور وہ یہ ہے کہ ادھر دو مہینے سے دو امیر فریقین کا مقدمہ ہمارے ہاں چل رہا ہے مقدمہ تھا ذرا پیچیدہ اور دشوار شہادت اور گواہیاں دونوں طرف سے پیش ہو رہی تھیں اور ایسی گواہیاں جن میں ایک کو دوسرے پر ترجیح دینے کی کوئی صورت سمجھ میں نہیں آ رہی تھی میں اس خیال میں تھا کہ دونوں میں صلح کرا دوں یا اس عرصے میں خدا ترجیح کی کوئی وجہ سمجھا دے اسی میں کچھ تاخیر ہوئی اس عرصے میں فریقین میں سے ایک شخص نے اس کا پتہ چلایا کہ مجھے تازہ رطب (کھجور) سے خاص رغبت ہے حالانکہ ابھی کھجوروں کے موسم کا آغاز ہے لیکن خدا جانے اس بندہ خدا نے کہاں سے ان کو مہیا کیا اور میرے دربان کو رشوت دے کر راضی کیا کہ کھجوروں کے طبق کو لے کر قاضی صاحب کے پاس جانے کی اجازت دے دے'

خواہ قاضی صاحب میرے ہدیہ کو قبول کریں یا نہ کریں' بہرحال کھجوروں کو لے کر میرے مکان پر وہ پہنچا دیکھنے کے ساتھ ہی میں نے اسے واپس کیا اور سخت ناگواری کا اظہار کیا' دربان جس نے آنے کی اجازت دے دی تھی اسے بھی میں نے نکال باہر کیا وہ کھجوروں کے طبق کو لے کر واپس ہو گیا بات ختم ہو گئی لیکن دوسرے دن جب میں اپنے اجلاس پر پہنچا فریقین میرے سامنے حاضر ہوئے تو امیر المومنین! میں نے یہ محسوس کیا کہ دونوں نہ میرے دل کے آگے برابر باقی رہے تھے اور نہ میری آنکھوں میں دونوں یکساں تھے۔

قاضی عافیہ نے سارے ماجرے کو سنانے کے بعد مہدی سے عرض کیا کہ امیر المومنین! رشوت کے نہ لینے کی صورت میں جب میرے نفس کی یہ حالت ہو گئی اسی سے اندازہ کرتا ہوں کہ رشوت کے قبول کرنے کے بعد کیا حال ہو سکتا ہے۔ میں ڈر رہا ہوں کہ اس راہ میں اپنے دین کو برباد کر کے خود اپنے آپ کو میں تباہ نہ کر دوں۔[1] آپ دیکھ رہے ہیں امام ابوحنیفہ کے انقلابی تاثیرات اور ان کے نتائج کو اور کیا یہ کوئی ایک دو واقعے ہیں جیسا کہ میں نے کہا امام کی ترتیت و پرداخت نے جن لوگوں کو پیدا کیا اور پھر ان لوگوں کی صحبتوں میں جو لوگ بنے اسی طرح صدیوں اس کا سلسلہ باقی رہا ایک مستقل کتاب کا وہ مواد ہے۔

اس وقت گفتگو تو دراصل امام ابوحنیفہ کے اس طریقہ کار کے متعلق ہو رہی تھی' جو حکومت کی طرف سے مقرر کئے ہوئے قاضیوں کے فیصلوں کے سلسلے میں انہوں نے اختیار کر رکھا تھا۔ کھلی ہوئی بات ہے کہ اس قسم کے فیصلوں پر جو اعتراض کئے جاتے ہیں وہ یوں ہی مشہور ہو جاتے ہیں اور یہاں آپ سن چکے کہ اعتراض بھی کرتے جاتے تھے اپنے ان اعتراضوں کو لوگوں پر امام ظاہر بھی کرتے رہتے تھے اگر اس کا نتیجہ یہ ہوا ہو جیسا کہ ان کے سوانح نگاروں نے یحییٰ بن آدم جیسے ثقہ ثبت حجت سے ان کا یہ قول نقل کیا ہے:

کوفہ فقہ سے معمور تھا اور فقہاء کی اس شہر میں کثرت تھی مثلاً ابن شبرمہ ابن

---

[1] خطیب بغدادی ج ۱۱ ص ۳۰۹۔۱۲

ابی لیلیٰ، حسن بن صباح، شریک اوران ہی جیسے لوگ لیکن ابوحنیفہ کے اقوال کے سامنے سب کا بازار سرد پڑ گیا۔ (ص ۱۴۱ ج ۲ موفق)

اور امام کو جو اصل مقصود تھا وہ آخران کے سامنے اس شکل میں جلوہ گر ہوا جیسا کہ حماد بن سلمہ کا بیان ہے کہ:

گوابن ابی لیلیٰ اور ابن شبرمہ، شریک، سفیان وغیرہ امام سے اختلاف کرتے رہے لیکن بالاخر امام ابوحنیفہ ہی کی بات نے استواری حاصل کی اور امراء امام ابوحنیفہ کے محتاج ہو گئے خلفاء کے درباروں میں ان کا ذکر ہونے لگا۔ (ص ۱۷ ج ۲ موفق)

امراء ابوحنیفہ کے محتاج ہو گئے اور خلفاء کے درباروں میں ان کا ذکر ہونے لگا۔

"یہی چیز دیکھنے کی اور غور کرنے کی ہے امراء سے الگ رہنا حکومت اور حکومت سے استعفاد ے کر سارے ذرائع سے قطعی طور پر بے نیاز ہو کر زندگی گذارنا موج خون کو سر سے گذرتے ہوئے دیکھتے رہنا، لیکن آستان یار سے نہ اٹھنے پر اصرار کو جاری رکھنا اپنی آخری سانس تک جاری رکھنا یہ واقعہ ہے کہ اس حد تک امام ابوحنیفہ کے ساتھ اکابر اسلام کا ایک بڑا گروہ شریک تھا، تاریخ کے اوراق میں ان بزرگوں کے اسماء گرامی زرین حروف میں لکھے ہوئے ہیں۔

لیکن یہ بات کہ امراء سے دور بھی رہنا اور ان ہی امراء کو اپنا محتاج بنانے کی کوششوں کو بھی جاری رکھنا خود اپنی مجلس کو خلفاء اور سلاطین کے ذکر سے پاک بھی رکھنا لیکن ان کی مجلسوں تک زبردستی اپنے ذکر کو بزور پہنچانا اور صرف ذکر ہی نہیں بلکہ امام نے اپنی تدبیروں سے ایک ایسی صورت حال پیدا کر دی کہ بالآخر بقول یحییٰ بن آدم۔

قضی به بخلفاء والائمة والحکام واستقر علیه الامر. (ص ۱۴۱ ج ۲ موفق)	خلفاء اور ائمہ (یعنی مسلمانوں کے سیاسی حکمرانوں کا طبقہ اور حکام ابوحنیفہ کے مدونہ قوانین سے فیصلہ کرنے لگے اور بالآخر اسی پر سلسلہ ختم ہوا۔

سچ پوچھئے تو ترک موالات کی سلبی کوششوں کے ساتھ حکومت میں شریک و دخیل ہونے کی ایجابی و اثباتی جدو جہد حضرت امام ابو حنیفہ کا ایک ایسا خصیصہ اور علمی و عملی زندگی کا ایسا طغرائے امتیاز ہے جس میں جہاں تک میں جانتا ہوں کم از کم ان کے عہد میں ان کوئی شریک وسہیم نہ تھا۔

امام کے سوانح نگاروں نے قاضی ابو یوسف کے نام سے جس وصیت نامہ کو امام ابوحنیفہ کی طرف منسوب کیا ہے منجملہ دوسری باتوں کے اس میں ایک فقرہ یہ بھی ہے کہ:

حکومت تمہارے سامنے جب کوئی خدمت پیش کرے تو تم ہرگز اس کو اس وقت تک قبول نہ کرنا جب تک اس کا پورا اطمینان نہ ہو جائے کہ تمہارے علمی اجتہادات اور تمہارے فیصلوں پر وہ اتنا اعتماد کرتی ہے کہ ان کے بعد وہ کسی دوسری کی طرف اس باب میں توجہ نہ کرے گی۔

(ص ۱۱۳ ج ۲ موفق)

اب اس کا مطلب سمجھ میں آتا ہے۔

درحقیقت ایسے حالات ہی انہوں نے پیدا کر دیئے تھے جس کا لازمی نتیجہ یہی ہو سکتا تھا کہ اپنی مرضی کا تابع بنا کر نہیں بلکہ اہل وعلم و دین کی مرضی کے خود تابع ہو کر حکومت ان سے امداد لینے پر کم از کم اس خاص شعبہ (یعنی عدل وانصاف فصل خصومات) میں مجبور ہوگئی تھی عثمان بن عفان نے جو حدیثوں کے بھی راوی ہیں اپنے والد عفان کے حوالہ سے ان کی چشم دید شہادت یہ نقل کی ہے۔

''عراق کا ہمارے زمانے میں یہ حال تھا کہ لوگ مسائل میں ایک دوسرے سے جھگڑتے رہتے اور باتیں کرتے رہتے تھے:

پھر وہی کہتے ہیں کہ آخر میں یہ حال ہو گیا کہ:

''جہاں ابوحنیفہ کی رائے کا ذکر کیا گیا تو اس کے سوا اور کسی دوسری رائے کو قطعی فیصلہ نہیں سمجھا جاتا تھا لوگ امام ابوحنیفہ سے اختلاف کرنے میں ڈرنے لگے ان کے قلوب ابوحنیفہ کے قول کے سوا اور کسی بات سے مطمئن

ہی نہیں ہوتے تھے۔ (ص ۱۲۷ ج ۲ موفق)

اور واقعہ بھی یہی ہے کہ عوام تو عوام جس کی تنقیدی چاند ماریوں سے سرکاری قاضیوں کے فیصلے محفوظ نہ تھے بلکہ بقول قاضی ابن ابی لیلیٰ الصواعق (کڑکتی ہوئی بجلیوں) کی طرح امام ان پر ٹوٹ رہے تھے اور جس قسم کی جان دار تنقیدیں ان کی ہوتی تھیں کسی میں ان تنقیدوں کے رد کی تاب بھی نہ تھی امام کے مشہور تلمیذ جو طبقہ صوفیہ کے رئیسوں میں شمار کئے جاتے ہیں یعنی داؤد طائی امام اور ان کی کوششوں کی روئداد بیان کرتے ہوئے آخر میں مجلس وضع قوانین اور اس کے کارناموں کے تذکرے کے بعد کہا:

> ''گو بعض لوگ مثلاً ابن ابی لیلیٰ ثوری شریک وغیرہ نے امام کا کچھ دن مقابلہ کیا اور چاہتے تھے کسی طرح امام کو زک پہنچائیں' لیکن ان کے حالات ہی ایسے تھے کہ روز بروز ان کا مقام بلند سے بلند تر ہوتا چلا گیا تلامذہ کا حلقہ وسیع ہو گیا' بلکہ کوفہ کی جامع مسجد میں سب سے بڑا حلقہ آخر میں امام ہی کا ہو گیا تھا:

پھر تلامذہ کے ساتھ امام کے سلوک اور برتاؤ کی جو کیفیت تھی داؤد طائی نے اس کی طرف اشارہ کرنے کے بعد کہا کہ:

> بالآخر لوگوں کا رخ آپ کی طرف پھر گیا۔ بڑے بڑے امرا اور حکام آپ کی عزت کرنے لگے مشکلات کے حل میں امام نے ہمیشہ اپنے آپ کو آگے آگے رکھا۔ لوگ آپ کے مداح ہو گئے ایسا کام کر کے امام نے مسلمانوں کے سامنے پیش کیا جو دوسروں[1] سے بن نہ آیا۔ (ص ۲۷ ج ۱ موفق)

اور گو داؤد طائی نے امام کی ان غیر معمولی کامیابیوں کے اسباب کو بیان کرتے ہوئے یہ صحیح بات کہی ہے کہ

---

[1] موفق کی کتاب میں بجائے دوسروں کے ''مغرب'' کا لفظ ہے یعنی عربی النسل علماء سے جو کام نہ بن پڑا وہ اس عجمی مسلمان نے انجام دیا لیکن داؤد کی یہی روایت دوسری کتابوں میں جو پائی جاتی ہے اس میں عرب کا لفظ نہیں ہے میرے نزدیک صحیح تو دوسری ہی بات ہے۔
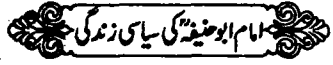
قوی علی ذلک بالعلم الواسع واسعد نه	ان کے وسیع علم نے بھی اور تقدیر نے بھی ان کی مدد کی جو اتنی قوت امام کو حاصل ہوئی۔

المقاد (ص ۲۷)

لیکن علم واسع عقل و تدبیر اور ان کے بخت بلند کے سوا جہاں تک میں سمجھتا ہوں ان کی کامیابیوں کا ایک بڑا راز کچھ اور ہی تھا اور اب میں اسی کے متعلق کچھ کہنا چاہتا ہوں۔

مطلب یہ ہے کہ وقت کے امراء اور ان کے بخت بلند کے سوا جہاں تک میں سمجھتا ہوں ان کی کامیابیوں کا ایک بڑا راز کچھ اور ہی تھا اور اب میں اسی کے متعلق کچھ کہنا چاہتا ہوں۔

مطلب یہ ہے کہ وقت کے امراء اور حکمرانوں کو جب اپنے اور اپنے علمی کارناموں کی طرف متوجہ کرنے میں خدا ان کو اس حد تک کامیاب کر چکا تھا اور مجھ ہی سے آپ امام کے اس قول کو بھی سن چکے ہیں جو اپنے شاگردوں سے فرمایا کرتے تھے کہ حکومت کی ملازمت میں اس وقت تک تم لوگوں کو شریک نہ ہونا چاہیے جب تک کہ اس کا یقین نہ ہو جائے کہ اس جگہ پر اگر ہم نہیں قبضہ کرتے ہیں' تو ناکارہ اور نالائق لوگوں سے وہ جگہ بھر جائے گی اور خلق خدا ان کی وجہ سے تکلیف میں مبتلا ہو جائے گی۔

جیسا کہ واقعات کی روشنی میں آپ دیکھ چکے کہ صورت حال امام کے زمانے میں قریب قریب یہی ہو چکی تھی پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ باوجود اس کے حکومت کی شرکت انہوں نے جیسا کہ معلوم ہے اور آئندہ تفصیل کے ساتھ اس کا ذکر آ رہا ہے امام صاحب نے کیوں قبول نہ کی حالانکہ حکومت کی طرف سے ان کے سامنے وہ سب کچھ پیش کر دیا گیا جو کچھ وہ چاہتے تھے یا چاہ سکتے تھے مگر وہ انکار ہی پر اصرار کرتے رہے تا ایں کہ اسی اصراری انکار کی حالت میں جان جان آفریں کے سپرد کی۔

میرے مضمون کا ابتدائی سوال یہی تھا اب وقت آیا ہے کہ اس سوال کے جواب پر غور کیا جائے لیکن جواب سے پہلے مناسب ہے کہ امام کی زندگی کے آخری مرحلہ یعنی

حکومت عباسیہ کے ساتھ ان تعلقات کی جو ایک طویل داستان ہے اس کا خلاصہ پیش کر دیا جائے۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا امام نے قصداً ایسے حالات ہی پیدا کر دیئے تھے کہ حکومت اپنے تعاون اور اپنے ساتھ اشتراک پر امام کو آمادہ کرنے پر مجبور ہو چکی تھی علاوہ اس کے دوسری عام وجہ یہ بھی تھی خود امام ہی نے اس کا اظہار اپنی اس گفتگو میں کیا ہے جو خلیفہ ابوجعفر سے ایک دفعہ ان کی ہوئی تھی۔

کہتے ہیں کہ اپنی خلافت کی ابتدائی دنوں ہی میں ابوجعفر نے غالباً جب وہ مدینہ میں تھے امام مالک اور ابن ابی ذئب کے ساتھ امام ابوحنیفہ کو بھی دربار میں طلب کیا اور تینوں حضرات کو مخاطب کر کے اس نے پوچھا کہ:

> ''اس امت (یعنی مسلمانوں) کی حکومت کی باگ ہمارے ہاتھ میں خدا نے جو دی ہے' آپ لوگوں کا اس کے متعلق کیا خیال ہے' آیا ہم لوگ اس کے واقعی اہل ہیں۔''

اپنے اپنے مذاق کے مطابق ہر ایک نے جواب دیا جس کی تفصیل کی یہاں ضرورت نہیں البتہ امام نے جو جواب دیا تھا اس میں دوسری چیزوں کے ساتھ آپ نے منصور کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا۔

> اپنے دین کی بھلائی کے چاہنے والے کو چاہیے کہ غصہ اور غضب سے اپنے آپ کو خالی کرے۔

اس تمہیدی فقرے کے بعد امام نے کہا کہ:

> اگر آپ اپنے واقعی بہی خواہ ہیں تو آپ یقیناً یہ جانتے ہیں کہ ہم لوگوں کو اس وقت آپ نے اپنے دربار میں جو جمع کیا ہے قطعاً یہ کام آپ کا اللہ کے لئے نہیں ہے۔''

اس کے بعد یہ الفاظ امام کی زبان سے ادا ہوئے کہ:

> درحقیقت آپ عوام الناس کو یہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ ہم لوگ بھی آپ

کے متعلق وہی خیال رکھتے ہیں جو خود آپ لوگوں کا اپنے متعلق ہے۔" (ص ۱۶ ج ۲)

مطلب امام کا یہ تھا کہ مسلمانوں کی حکمرانی کا حق دار اپنے آپ کو جو آپ لوگ سمجھتے ہیں اور یہی دنیا کو باور کراتے پھرتے ہیں چاہتے ہیں کہ ہم بھی اس مسئلہ میں آپ کی ہم نوائی کریں تاکہ اس ذریعہ سے رائے عامہ کا اعتماد حاصل کریں۔

جس سے معلوم ہوا کہ رعایا کے ممتاز افراد کو ہم نوا بنا کر رائے عامہ کے اعتماد حاصل کرنے کا عام رواج جیسا کہ اس زمانہ میں ہے امام کے بیان سے ثابت ہوتا ہے کہ حکومتوں کی یہ بھی پرانی اور قدیم رسم ہے اس سلسلہ میں جو کچھ آج کیا جا رہا ہے۔ کل بھی دنیا یہی کرتی تھی۔

جہاں تک میرا خیال ہے وہ حال جس کا امام کے سوانح نگاروں نے ذکر کیا ہے یعنی امراء وقت کے حکمرانوں کا امام اور امام کے علمی خدمات کی طرف متوجہ ہو جانا یہ تو بعد کی بات تھی اور ابن پیہم مسلسل کوششوں سے بتدریج پیدا ہوئی تھی جن کے جاری رکھنے کا موقعہ بغیر کسی مزاحمت کے باطمینان تمام ۱۴۰ھ تک عباسی حکومت کے قیام کے بعد امام کو ملا۔

لیکن عباسی حکومت سے امام کے تعلقات اس سے پہلے ہی قائم ہو چکے تھے۔ اور اس میں کچھ امام ہی کی خصوصیت نہ تھی بلکہ ہر وہ شخص جس کی موافقت اور ہم آہنگی سے عوام متاثر ہو سکتے تھے ان کو مختلف طریقوں سے حکومت اپنے قابو میں لانے کی کوشش شروع ہی سے کر رہی تھی۔ میں نے السفاح کی اس تقریر کا ذکر اسی کتاب میں کسی مقام پر کیا ہے جس میں کوفہ کے سربرآوردہ علماء کو بلا کر اس نے تقریر کی اور اپنی نوازشوں اور عنایتوں کا سب کو اس نے امیدوار بنایا تھا۔ السفاح کے بعد جب منصور خلیفہ ہوا تو اس سلسلہ میں اس نے اپنی سرگرمیوں کو نسبتاً زیادہ بڑھا دیا تھا۔ جس کی ایک وجہ ممکن ہے کہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ایک حد تک اس زمانے کے مروجہ علوم میں وہ خود بھی دست گاہ رکھتا تھا ہو سکتا ہے اس کے علمی مذاق نے بھی اہل علم کی قدر افزائیوں کی طرف اس کو کچھ متوجہ کیا ہو۔

اور امام کے ساتھ تو دوسرا معاملہ بھی تھا یعنی عباسیوں کی پیش رو حکومت کے ساتھ

امام کا جوطرز عمل رہا تھا وہ کوئی پوشیدہ راز نہ تھا۔ زید بن علی کے ساتھ ان کی ہمدردیوں کے قصے کوئی وجہ نہیں کہ موجودہ حکومت کے کانوں تک نہ پہنچے ہوں گے۔ ماسوا اس کے ابراہیم صائغ کا واقعہ تو خود اسی حکومت سے تعلق رکھتا تھا جیسا کہ میں نے پہلے بھی لکھا ہے۔ ابراہیم اور امام ابوحنیفہ کے تعلقات ایسے نہ تھے کہ حکومت کے خفیہ گوئندوں سے پوشیدہ رہ سکتے تھے امام کے ساتھ دار و گیر اگر نہ ہوئی تو عرض کر چکا ہوں کہ اس کی بنیاد بھی ایک سیاسی مصلحت ہی پر مبنی تھی۔

امام جن سے ایسے خطرناک آثار کا ظہور مختلف شکلوں میں ہو چکا تھا یقیناً یوں بھی اس کے مستحق تھے کہ حکومت ان کو اپنے قابو میں رکھنے کی کوشش کرے۔

جیسا کہ چاہیے گرمی سے پہلے عموماً اس قسم کے مواقع میں پہلے حکومتیں نرمی کی راہیں اختیار کرتی ہیں اور گویا امام ابوحنیفہ اور خلیفہ منصور عباسی کے تعلقات کے قصوں کو بیان کرنے والوں نے بغیر کسی ترتیب کے پراگندہ طور پر بیان کیا ہے۔ ان میں بعض واقعات کا تعلق اس زمانے سے ہی جب نرمی کی راہ سے منصور امام کو اپنے قابو میں لانا چاہتا تھا۔ اور گرمی کے واقعات کا تعلق ان دنوں سے ہے جن میں حکومت بالآخر امام سے مایوس ہوگئی پھر مایوس ہو جانے کے بعد حکومتیں جو کچھ کر سکتی ہیں امام کو بھی اس کا تجربہ کرنا پڑا۔

حکومت عباسیہ سے امام کے تعلقات کی ابتداء

جیسا کہ عرض کر چکا ہوں عباسیوں کے پہلے حکمران ابوالعباس السفاح کے پنج سالہ دور حکومت میں بجز اس ایک واقعہ کے جس کا ذکر گذر چکا ہے۔ یعنی علماء کی مجلس میں امام نے خلیفہ کو جو جواب دیا تھا اور کوئی ایسا واقعہ نہیں ملتا جس سے معلوم ہو کہ حکومت نے امام کی طرف توجہ کی ہو یا امام نے حکومت سے براہ راست تعلق قائم کرنے کا ارادہ کیا اور السفاح کے بعد جب ابوجعفر منصور گدی پر آیا تو اس کی حکومت کی بھی ابتدائی چند سالوں میں سکوت اور خاموشی کا وہی عالم قائم رہا۔ میں نے لکھا تھا کہ تقریباً

بارہ تیرہ سال کے اس طویل وقفہ میں امام کو ان کارروائیوں کا موقعہ ملا جن کی داستان سنائی جا چکی۔

ابوجعفر منصور:

باقی یہ سوال کہ خلیفہ ابوجعفر منصور اور امام کے تعلقات کی ابتداء کب سے ہوئی اور کیسے ہوئی میں کہہ چکا ہوں کہ امام کے سوانح نگاروں نے دونوں کے باہمی تعلقات کے قصے منتشر طور پر بیان کر دیئے ہیں کسی قسم کی ترتیب ان میں نہیں پائی جاتی تاہم جہاں تک قرائن وقیاسات کا اقتضاء ہے۔ میرے نزدیک سب سے پہلی دفعہ ابوجعفر منصور نے امام کو اس وقت بلایا ہے۔ جب اپنے مدینۃ السلام (بغداد) کی تعمیر کے سلسلے میں پہلی دفعہ اپنی حکومت کے ارباب علم و دانش کو اس نے جمع کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ اس واقعہ کا طبری نے اپنی تاریخ میں ذکر کیا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ گو مدینۃ السلام کی حقیقی تعمیر کی ابتداء۔ اس واقعہ کے بعد شروع ہوئی جسے النفس الذکیہ محمد بن عبداللہ اور ابراہیم بن عبداللہ کے خروج سے تعبیر کرتے ہیں جس کی پوری تفصیل آگے آ رہی ہے لیکن طبری ہی کے بیان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ منصور نے بغداد کی تعمیر کا انتظام اس واقعہ کے ظہور سے پہلے کرنا شروع کر دیا تھا لیکن کام کی ابتداء ہی ہوئی تھی کہ اچانک ان دونوں بھائیوں کے خروج کا واقعہ پیش آیا۔ اسی وجہ سے تعمیر کے کام کو روک دینا پڑا۔

بغداد کی تعمیر کے سلسلے میں حضرت امام کی طلبی

بہر حال میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میرے نزدیک ابوجعفر نے سب سے پہلے امام کو اپنے دربار میں باضابطہ طور پر اس وقت بلایا جب پہلی دفعہ مدینۃ السلام کی تعمیر کا کام زمین کے انتخاب کے بعد شروع ہوا تھا' طبری نے سلیمان بن مجاہد کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ جب مدینۃ السلام کی تعمیر کا ارادہ قطعی طور پر طے ہو گیا تو۔

> ''منصور نے شام موصل جبل کوفہ واسط بصرہ وغیرہ شہروں میں اپنا حکم بھیجا کہ ہر قسم کے کاریگر اور کام کرنے والے مزدور اکھٹے کئے جائیں اسی کے

ساتھ اس نے یہ حکم بھی صادر کیا کہ ارباب فہم و دانش جن میں امانت اور دیانت کے صفات پائے جاتے ہوں نیز فن ہندسہ (تعمیری ہندسہ) سے جو واقف ہوں ان کا انتخاب بھی ہر شہر سے کیا جائے۔"

سلیمان کا بیان ہے کہ منصور کی اسی حکم کی تعمیل میں جو لوگ طلب کئے گئے ان میں خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر۔

الحجاج بن ارطاة وابو حنيفه النعمان بن ثابت(ص ۲۴۱ ج ۹) حجاج بن ارطاۃ اور نعمان بن ثابت بھی تھے۔

اور یہی میرا خیال ہے کہ خلیفہ ہونے کے بعد سب سے پہلے منصور نے امام ابو حنیفہ کو اسی تقریب سے اپنے پاس بلایا میں سمجھتا ہوں امام کے متعلق یہ قصہ کہ بنی امیہ کی حکومت کے زمانے میں قضاء وغیرہ کے عہدوں کے قبول کرنے سے ابن ہبیرہ کے شدید اصرار کے باوجود انکار کر دیا تھا کوئی وجہ نہیں کہ منصور تک نہ پہنچا ہوگا اور گو مقصود تو اس کا وہی ہوگا جس کا اظہار جیسا کہ گذر چکا خود امام نے اس کے منہ پر کر دیا تھا کہ اس قسم کے لوگوں کے بلانے سے رائے عامہ کے اعتماد کو تم حاصل کرنا چاہتے ہو خصوصاً امام نے تو اپنی علمی اور عملی تدبیروں سے ماحول ہی ایسا پیدا کر دیا تھا کہ حکومت میں امام کے اشتراک کا مطالبہ اس زمانے کا ایک عام مطالبہ بن چکا تھا لیکن بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ شروع میں کسی ایسی چیز کی امام پر پیش کرنے میں منصور نے احتیاط کی جس کے متعلق وہ جانتا تھا کہ انکار کر دیں گے۔

حضرت امام بحیثیت ناظم تعمیرات

اگرچہ مورخین نے واقعات کو ایک دوسرے سے خلط ملط کر کے بیان کیا ہے کہ لیکن ان ہی سلیمان بن مجاہد کے حوالہ سے طبری ہی نے چند اور روایتیں جو نقل کی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ تعمیری مشورے کی حد تک امام نے منصور کے حکم سے سرتابی مناسب نہیں خیال کی اور گو سلیمان کی اس روایت سے پتہ چلتا ہے کہ آخر وقت تک امام اس کام

میں مشغول رہے لیکن میرے نزدیک یہ صحیح نہیں ہے بلکہ جہاں تک قیاس کا اقتضا ہے خروج کے واقعہ سے پہلے بغداد کی تعمیر کے جتنے ابتدائی مراحل طے ہوئے تھے امام کی شرکت ان ہی کی حد تک محدود تھی اور سلیمان کے الفاظ۔

فولاہ القیام بناء المدینۃ — شہر کی تعمیر کا نظم اور اینٹ کی ڈھلائی ان کا گننا
وضرب اللبن وحل لا واخذ — کام کرنے والوں کے کام کی نگرانی یہ سارے
الرجال بالعمل (ص ۲۴۱) — کام ابوحنیفہ کے سپرد ہوئے۔

اگر صحیح ہیں تو اس کا مطلب میرے نزدیک یہی ہے کہ قبل خروج نفس ذکیہ جس حد تک مدینۃ السلام کی تعمیر کا کام ہو چکا تھا اس میں ممکن ہے کہ امام نے کچھ دن کے لئے ان ذمہ داریوں کو قبول کر لیا ہو۔[1]

ایک دلچسپ لطیفہ اس سلسلہ کا یہ ہے جسے امام کے حنفی سوانح نگاروں نے اگرچہ

---

[1] یہاں یہ یاد رکھنے کی بات ہے کہ نفس ذکیہ کے خروج سے پہلے مدینۃ السلام کی تعمیر کا سلسلہ اس حد تک پہنچ چکا تھا جیسا کہ کامل بن اثیر نے لکھا ہے کہ قد آدم کے برابر فصیل کی دیوار زمین سے اوپر آ چکی تھی کہ اتنے میں محمد بن عبداللہ کے خروج کی خبر پھیلی اسی لئے تعمیر کا کام روک دیا گیا ص ۲۰۸ کامل جلد ۵ اس میں لکھا ہے کہ کام کے التوا سے پہلے منصور ان تمام چیزوں کو مہیا کر چکا تھا جن کی ضرورت اس شہر کی تعمیر میں ہو سکتی تھی یعنی لکڑیاں اور سوگوان کے تختے وغیرہ یہ ساری چیزیں اس سر زمین تک آ چکی تھیں جہاں بغداد تعمیر ہو رہا تھا بلکہ اسی سلسلہ میں ایک لطیفہ بھی لکھا ہے کہ اس سارے ساز و سامان کو چھوڑ کر خود تو منصور مقابلہ کے لئے کوفہ کی طرف بھاگا اور ان تعمیری چیزوں کی نگرانی کے لئے اپنے غلام اسلم نامی کو اس نے وہیں چھوڑ دیا کہتے ہیں کہ جب یہ خبر اسلم تک پہنچی کہ منصور کی فوج کو ابراہیم بن عبداللہ کے مقابلہ میں شکست فاش ہوئی تو اس ساری چیزوں میں جو اس کی نگرانی میں دی گئی تھیں اس نے آگ لگا دی سب کچھ جل کر بھسم ہو گیا منصور کو جب اس کی خبر ملی تو اپنی فطرت خصوصیت کی بنیاد پر اس کو سخت تکلیف پہنچی۔ اسلم کو اس نے لکھا کہ تو نے یہ کیا کیا بے چارے نے جواب دیا کہ دشمن اس پر قبضہ کر لیں گے اس خوف سے میں نے یہی مناسب خیال کیا منصور دم سادھ کر رہ گیا ص ۲۰۸ منصور کی فطری خصوصیت سے میری مراد اس کا مشہور عالم بخل ہے وہ اپنے اس عیب کو چھپاتا بھی نہیں تھا بغداد ہی کی تعمیر کے قصوں میں لوگوں نے بیان کیا ہے کہ جب اس سر زمین کو دیکھ کر جس پر بغداد تعمیر کیا گیا منصور نے کہا خوب ہی موقعہ ہے گویا دجلہ کے پانی سے چین تک ایک کھلا راستہ میرے سامنے رہے گا۔[2]

بیان نہیں کیا ہے لیکن طبری وغیرہ میں اس کا تذکرہ کیا گیا ہے یعنی اینٹوں کے گننے کا کام امام نے اپنے ذمہ جو لیا تھا تو ظاہر ہے کہ یہ مدینۃ السلام کی اینٹوں کا قصہ تھا جب معمولی معمولی شخصی مکانوں میں دس بیس لاکھ اینٹیں خرچ ہو جاتی ہیں تو اسی سے اندازہ کرنا چاہیے کہ مدینۃ السلام کے لئے کتنی اینٹوں کی ضرورت ہوتی ہوگی یقیناً کروڑ ہا کروڑ سے بھی ان کی تعداد اگر تجاوز ہو تو تعجب نہیں ہے اتنی اینٹوں کا شمار کرنا آسان نہ تھا آخر وہی عقل حنفی جو مسائل شرعیہ کی گتھیوں کے سلجھانے میں نت نئے نکتے نکالا کرتی تھی اس وقت بھی کام آئی لکھا ہے کہ:

> امام نے ایک بانس منگوایا اور جس نے جتنی اینٹیں ڈھالی تھیں ان کو اسی بانس سے ناپ دیتے تھے۔

تعمیر دنیا پر حضرت امام کا احسان

گویا پیائش کے اس عمل سے اینٹوں کی تعداد معلوم ہو جاتی تھی اگرچہ بعد کو یہ طریقہ خشت شماری کے سلسلہ میں عام ہو گیا لیکن ان ہی مورخین کا بیان ہے کہ:

لہ اور اسی راہ سے ہندوستان مصر الغرض ہر مقام کی چیزیں میرے دار الخلافہ تک بآسانی پہنچتی رہیں گی پھر چند راہبوں کی خانقاہیں اسی میدان میں جو تھیں ان میں داخل ہوا ایک راہب سے اس نے پوچھا کہ یہاں کوئی شہر تعمیر ہو تو کیا اچھی بات ہو اس نے کہا ہماری کتابوں میں لکھا ہے کہ یہاں پر ایک شخص جس کا نام ابوالدوانیق ہوگا شہر بسائے گا یہ سن کر منصور زور سے ہنسا اور بولا کہ یہ تو میرا ہی نام ہے۔ مطلب یہ تھا کہ دوانیق جو دانق کی جمع ہے جس کے سکے پیسے کے ہیں عربی میں اسی کی نسبت سے بخیل آدمی کو ابوالدوانیق (یعنی پیسوں کا باپ کہتے ہیں۔

منصور سمجھ گیا کہ وہ بخیل آدمی تو میں ہی ہوں بعد کو یوں بھی لوگوں نے اس کو اسی بخل کی وجہ سے دوانقی کہنا شروع کیا تھا یعنی ایک ایک پیسہ کا حساب لیا کرتا تھا بغداد کی تعمیر سے جب فارغ ہوا۔ تو اپنے ایک بہت بڑے افسر کو صرف اس جرم میں اس نے قید کر دیا تھا کہ چند آنے اس غریب پر حساب کے رو سے باقی رہ گئے تھے۔ ۱۲

وکان ابو حنیفہ اول من عداللبن بالقصب (طبری ص ۲۴۱ ج ۹)	اینٹوں کو بانس کے ذریعہ گننے کا طریقہ سب سے پہلے امام ابوحنیفہ نے اختیار کیا۔

اگر یہ صحیح ہے تو اس کے یہ معنی ہوئے کہ تعمیری دنیا پر امام کا یہ احسان قیامت تک کے لئے رہ گیا بلکہ میں تو سمجھتا ہوں کہ بعد کو اسی قسم کی چھوٹی چھوٹی عددی چیزوں کی مقدار کا پیائش کے ذریعہ سے پتہ چلانے کا دنیا میں جو عام رواج پایا جاتا ہے۔ علمی اصطلاح میں جس کی تعبیر ہم یہ کر سکتے ہیں کہ کم منفصل کو کم متصل کے قابل میں لا کر اس کی نوعیت سے واقفیت حاصل کرنے کا یہ عجیب رواج امام ابوحنیفہ ہی نے گویا دنیا میں قائم کیا۔

البتہ یہاں یہ سوال جو پیدا ہوتا ہے کہ بنی امیہ کی حکومت سے امام نے جن وجوہ اسباب کی بنیاد پر ترک موالات کا طریقہ اختیار کیا تھا۔ جب عباسی حکومت نے ان چیزوں کے اعادے میں کمی نہیں کی تھی ابراہیم صائغ کے قصہ میں گذر بھی چکا کہ اس نئی قائم ہونے والی حکومت کے مقابلہ میں کھڑے ہونے کو امام فرض قرار بھی دے چکے تھے ابراہیم سے آپ کا اختلاف صرف اس میں تھا کہ مقابلہ کی صورت کیا اختیار کی جائے۔

بہر حال یقیناً یہ سوال پیدا ہوتا ہے طبری نے بعض روایتیں اس موقعہ پر جو درج کی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس عباسی خلیفہ منصور نے بھی دراصل آپ سے بھی چاہا تھا کہ اس کی حکومت میں قضا کی ملازمت قبول کریں امام نے جب انکار کیا تو پھر مذکورہ بالا خدمت (یعنی خشت شماری اور مزدوروں کی نگرانی) وغیرہ ان کے سپرد کی کہتے ہیں کہ امام کے انکار پر منصور قسم کھا بیٹھا تھا کہ ضرور تم کو مقرر کر کے رہوں گا لیکن جب دیکھا کہ قاضی ہونے پر کسی طرح راضی نہیں ہوتے تو اپنی قسم پوری کرنے کے لئے امام کے حوالہ اس کام کو کیا طبری کی اسی روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ:

انما فعل المنصور ذلک لیخرج عن یمینه (ص ۲۴۱ ج ۹ موفق)

یہ کام منصور نے اس لئے کیا کہ اپنی قسم سے وہ باہر ہونا چاہتا تھا یعنی جو قسم کھائی تھی اسے اس تدبیر سے پوری کرنا چاہتا تھا۔

حضرت امام نے یہ خدمت کیوں قبول کی

لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ قسم اگر منصور نے کھائی تھی تو قضا کی خدمت کے قبول کرنے پر پھر یہ خشت شماری وغیرہ کے کام کے قبول کر لینے سے اس کی قسم کیسے پوری ہوگئی علاوہ اس کے جو قضا کے قبول کر لینے پر انکار کرسکتا تھا وہی بآسانی اس دوسری ذمہ داری کے قبول کرنے سے بھی انکار کرسکتا تھا کہ بھلا میں بے چارا ایک ملا آدمی قرآن و حدیث کے مسائل کا بتانے والا اس کام کو کیا جانوں۔

اسی لئے میرا خیال ہے کہ پہلی مرتبہ امام نے منصور نے قضا کا قصہ چھیڑا ہی نہیں گو دل میں ارادہ ہو کہ آئندہ یہی کام ان سے لوں گا لیکن شروع شروع میں مانوس کرنے کے لئے یا تو اس قصے کو اس نے چھیڑا ہی نہیں جس کے متعلق اس کو معلوم ہو چکا ہوگا کہ قبول کرانے میں بنی امیہ کی حکومت ناکام ہو چکی ہے یا کچھ کہا بھی ہو تو بھانپنے کے لئے اشارے کنائے میں کہا ہو۔ لیکن امام کے تیور نے اس کو فوراً دوسرے مسئلہ کی طرف متوجہ کر دیا۔ بہ ظاہر خیال گذرتا ہے کہ اس نے امام کے سامنے یہ پیش کیا ہوگا کہ مسلمانوں کی دارالحکومت کا زمین کے اس کرہ پر پہلا شہر تعمیر ہو رہا ہے میں نے ہر قسم کے ہنرمندوں اور ارباب دانش و فہم کو اپنی امداد کے لئے بلایا ہے اس معاملہ میں آپ بھی میری مدد کیجئے عباسیوں کے متعلق امام کے جو احساسات تھے ان کا اقتضا تو یہی تھا کہ اس خدمت سے بھی انکار کر دیتے لیکن کسی روایت سے یہ ثابت نہیں ہے کہ پیش ہونے کے بعد امام ابوحنیفہ نے منصور کی تعمیری امداد سے انکار کیا۔ اس سلسلے میں امام کے سوانح نگاروں نے یا دوسروں نے مختلف الفاظ اور مختلف پیرایوں میں جو کچھ بھی نقل کیا ہے۔ وہ صرف یہی ہے کہ جب کبھی قضا کی خدمت آپ پر پیش کی گئی اس سے

انکار کرتے رہے۔

واللہ اعلم بالصواب اس کے قبول کرنے میں امام کے سامنے کیا مصلحتیں تھیں خوش اعتقادی سے اگر کام لیا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ بغداد کے مستقبل کی تاریخ ان کے سامنے تھی جس سے لاکھوں اولیا' اقطاب' علماء فقہاء' محدثین' مفسرین اسلامی دنیا کو ملے گویا بغداد کی تعمیر ان سارے فضائل و کمالات کی تعمیر تھی جن کا بالآخر وہ سرچشمہ بنا پھر ایسے نیک کام کی شرکت سے محرومی اپنے لئے انہوں نے پسند نہیں کی۔ کیونکہ بظاہر تعمیر کی ابتداء ابوجعفر منصور کے ہاتھوں سے ہو رہی تھی' لیکن بغداد منصور یا منصور کے بال بچوں ہی کا بغداد نہ تھا بلکہ وہ معروف وسری سقطی' جنید وشبلی سیدنا غوث الاعظم شیخ عبدالقادر الجیلی' شہاب الدین السہروردی جیسے اقطاب اسلام کا بھی بغداد تھا' وہ امام احمد بن حنبل اور خود امام ابوحنیفہ جیسے ائمہ کی خواب گاہ ہونے کا شرف حاصل کرنے :الا تھا بلاشبہ ایسا شہر اس بات کا مستحق تھا کہ اس کی ابتدائی تعمیر کے نگران کاروں میں ابو حنیفہ ہی جیسے لوگ ہوں۔

لیکن ظاہر ہے کہ ہر شخص کے لئے یہ توجیہ قابل قبول نہیں ہو سکتی البتہ حکومت کے مقرر کردہ قاضیوں کے ساتھ امام نے اپنی فطرت اور طبعی افتاد کے خلاف جس طرز عمل کو اختیار فرمایا تھا اگر اس کو سامنے رکھ کر غور کیا جائے تو یہ ہو سکتا ہے کہ کچھ وہی غرض اس خدمت کے قبول کرنے میں ان کے پیش نظر رہی ہو۔

میرا مطلب یہ ہے کہ جیسے مسلمانوں کے لئے صحیح اسلامی قانون سے استفادہ کے مواقع اپنے اس طریقہ عمل سے مہیا کرنا چاہتے تھے سرکاری قاضیوں کے فیصلوں پر نکتہ چینیوں کا سلسلہ جو امام نے قائم کیا تھا تفصیلاً عرض کر چکا ہوں کہ مقصود اس سے خودنمائی یا خودستائی کے جذبات کی تسکین نہیں تھی بلکہ حکومت کو اپنی مجلس وضع خواتین کے کارناموں کی طرف متوجہ کرنا تھا۔

پس کیوں نہ سمجھا جائے کہ بغداد کی تعمیری خدمات کے قبول کرنے میں کچھ اسی قسم کے مصالح امام کے پیش نظر تھے؟

ابو جعفر اور حضرت امام کی پہلی ملاقات کی تفصیل

میرا تو خیال ہے کہ امام خوارزمی نے جامع المسانید کے دیباچہ میں اتنے تین تین استادوں سے جن میں ایک ابن جوزی بھی ہیں۔ بسند متصل یہ روایت جو درج کی ہے یعنی خلیفہ ابو جعفر منصور کے حکم سے کوفہ کے والی (گورنر) عیسیٰ بن موسیٰ نے جب امام ابو حنیفہ کے دربار میں حاضر کیا تو امام کو پیش کرتے ہوئے عیسیٰ نے کہا کہ:

یا امیر المومنین ھذا عالم الدنیا الیوم۔ امیر المومنین! آج دنیا کے یہ سب سے بڑے عالم ہیں۔

قرائن کا اقتضاء ہے کہ یہ اسی وقت کا واقعہ ہے جب منصور نے اپنے ممالک محروسہ کے ممتاز علماء اور دانش مندوں کو دریائے دجلہ کے کنارے بغداد کی تعمیر میں مشورہ اور مدد دینے کے لئے بلایا تھا۔

گذر چکا امام ابو حنیفہ بھی دوسروں کے ساتھ اس موقعہ پر حاضر کئے گئے تھے جیسا کہ میں لکھ چکا ہوں امام کی منصور سے یہ پہلی ملاقات ہے یا کم از کم ذاتی طور پر امام اور منصور کے باہمی تعارف کا پہلا موقعہ یہی ہے۔[1] اسی لیے عیسیٰ بن موسیٰ نے جو کوفہ کے

---

[1] اس میں کوئی شبہ نہیں کہ امام کے سوانح نگاروں نے بعض واقعات ایسے بھی درج کئے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ امام ابو حنیفہ کا تعارف ابو جعفر منصور سے اس واقعہ سے پہلے ہو چکا تھا مثلاً سمعانی کے حوالہ سے کردری نے یہ قصہ نقل کیا ہے کہ یحییٰ بن نصر القرشی کا بیان ہے کہ ابو جعفر منصور کو ضرورت ہوئی کہ ایک "بیع نامہ" لکھوائے اور غالباً وقف نامہ کا بھی ایک وثیقہ لکھوانا چاہتا تھا اس کام کے لئے ابن ابی لیلیٰ اور قاضی ابن شبرمہ کو بھی اس نے دربار میں طلب کیا جس جس نے مسودہ پیش کیا منصور کو پسند نہ آیا تب لوگوں نے کہا کہ جنہیں ہم جانتے ہیں وہ سب تو یہی تھے البتہ کوفہ میں ایک اور فقیہ ہیں جن کا نام نعمان ہے اس قسم کے کام وہ خوب انجام دیتے ہیں تب ڈاک کی چوکی پر امام ابو حنیفہ حاضر کئے گئے اور منصور نے ملاقات کر کے دو مہینہ کا وقفہ کیا کہ تم کیا اتنے دن میں یہ دو وثیقے تیار کر دو گے امام نے جواب میں کہا کہ دو مہینے کی ضرورت نہیں اور دو دن میں تیار کر کے مسودے پیش کر دیئے سبھوں نے خوب غور سے پڑھا انگلی رکھنے کی کوئی جگہ نظر نہ آئی اس پر منصور نے دس ہزار انعام منظور کیا لیکن

گورنر ہونے کی وجہ سے امام صاحب کے علمی مرتبہ سے بخوبی واقف ہو چکا تھا خلیفہ کے سامنے تعارف کے بالا الفاظ کے ساتھ پیش کیا آگے خوارزمی کی اس روایت کا دوسرا جزیہ ہے کہ عیسیٰ بن موسیٰ کے ان لفاظ کے بعد منصور امام کی طرف متوجہ ہوا اور اس نے دریافت کیا کہ نعمان! تم نے علم کس سے حاصل کیا حالانکہ سوال کا سادہ جواب یہ ہوسکتا تھا کہ حماد بن ابی سلیمان سے یعنی ابوحنیفہ اپنے استاد کا نام لے دیتے لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ بجائے اجمال کے خلاف دستور امام نے اپنی مجلس کے مدونہ قوانین کی بنیادوں پر خلیفہ کے سامنے تفصیلی گفتگو شروع کی انہوں نے کہا' جس کا حاصل یہ تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چار ممتاز صحابیوں یعنی عمر بن الخطاب علی بن ابی طالب' عبداللہ بن مسعودؓ عبداللہ بن عباس کے اصحاب اور شاگردوں سے میرا علم ماخوذ ہے۔

جاننے والے جانتے ہیں اور میں نے اپنی کتاب "تدوین فقہ" میں پوری تفصیل کے ساتھ اس مسئلہ کو بیان کیا ہے کہ "اسلامی فقہ" کی بنیاد درحقیقت رسول اللہ ﷺ کے ان ہی چار صحابیوں پر ختم ہو جاتی ہے۔

لہ لیکن امام نے قبول کرنے سے معذرت ظاہر کی اجازت لے کر کوفہ چلے گئے کردری ص ۱۵ ج ۲ قریب قریب اسی روایت کو خابن صبیح کے حوالہ سے بھی کردری نے نقل کیا ہے اضافہ صرف اتنا ہے کہ جب طلب کئے ہوئے فقہاء کے مسودے منصور کو پسند نہ آئے تو اس کو بڑا دکھ ہوا اور بولا علم والے فنا ہو گئے تب ایک شخص نے کہا کہ کوفہ میں ایک جوان عالم ہے وہ ان کے مطلب کے مطابق کام کر دے گا امام بلائے گئے اور فوراً اسی مجلس میں وثیقہ لکھ کر دے دیا جو پسند کیا گیا لیکن مختلف قرائن ایسے ہیں جن سے مجھے اس روایت میں شبہ ہے منصور جس زمانہ میں تخت نشین ہوا ہے اس وقت امام کی شہرت کا آفتاب سمت الراس پر چمک رہا تھا خصوصاً منصور جو کوفہ یا اطراف کوفہ ہی میں رہتا تھا اس کا امام سے ناواقف رہنا جیسا کہ ان رواتیوں میں بیان کیا گیا ہے محل تعجب ہے یہ ہو سکتا ہے کہ اجتماعی طور پر حکومت کی طرف سے علماء کے سپرد یہ کام کیا گیا ہو اور ابوحنیفہ کا مسودہ پسند کیا گیا ہو منصور کے متعلق جو بعض رواتیوں میں ہے کہ امام ابوحنیفہ سے کہا آپ ہمارے پاس کیوں نہیں آتے؟ ممکن ہے اسی زمانہ کی بات ہو۔۱۲

بہر حال یہ دوسرا مسئلہ ہے مجھے اس وقت یہ کہنا ہے کہ بجائے اجمالی جواب کے امام نے اپنے مدونہ قوانین کی بنیادوں کو ابوجعفر منصور کے سامنے جو واضح کیا تو ظاہر ہے کہ اپنی مجلس کے قانونی جذبات کی اہمیت خلیفہ وقت کے ذہن نشین کرنا چاہتے تھے اس کے سوا اور کوئی دوسری غرض ان کی اور کیا ہو سکتی تھی' ابوجعفر چونکہ خود طالب العلم رہ چکا تھا اور شریعت اسلامی کی بنیادوں سے واقف تھا۔ سننے کے ساتھ ہی اس نے کہا کہ تم نے بڑی مستحکم راہ اپنے لئے اختیار کی ص ۳۱ جامع المسانید بعض روایتوں میں ہے کہ منصور نے یہ بھی کہا کہ بلاشبہ علم وہیں ہے علم وہیں ہے کردری ص ۱۴۴ ج ۲۔

خلاصہ یہ ہے کہ اسلامی قوانین کی صحیح ترین شکل امام کے نزدیک جو تھی ان کی تدوین کے بعد ان کی آخری کوشش یہی تھی کہ مسلمانوں کی آئینی زندگی کے لئے حکومت قوانین کے اس مجموعہ کو کسی طرح قبول کرے اسی لئے سرکاری قاضیوں کے فیصلوں پر اعتراض کا سلسلہ انہوں نے شروع کیا تھا اور آج حکومت کی سب سے بڑی اقتداری طاقت کے سامنے ان قوانین کی بنیادوں کو جو واضح کر رہے تھے اس کا مقصد بھی بہ ظاہر یہی تھا اور اسی بنیاد پر میں سمجھتا ہوں کہ انہوں نے بغداد کی تعمیری خدمات کے جس حصہ کو قبول کیا تھا اس سے بھی بالکل ممکن ہے کہ خلیفہ پر یہ اثر قائم کرنا مقصود ہو کہ ان قوانین کی تدوین میں صرف دینی معلومات ہی سے مدد نہیں لی گئی ہے بلکہ جو کاروباری مہارت امام کو حاصل تھی اس کی راہ نمائی بھی اس خدمت میں شریک و دخیل تھی گویا یوں سمجھنا چاہیئے کہ علماء دین کے متعلق عام طور پر جو یہ سمجھا جاتا ہے کہ دنیاوی معاملات اور ان کی نزاکتوں یا پیچیدگیوں سے وہ عموماً ناواقف ہوتے ہیں بسا اوقات ان کے دنیوی مشوروں کو لوگ اسی بنیاد پر مسترد کر دیتے ہیں کہ دنیا کو نہیں سمجھتے ہیں ہو سکتا ہے کہ اسی غلط فہمی کا ازالہ اپنی عملی شہادتوں سے امام صاحب کرنا چاہتے ہوں نہ صرف بڑے بڑے کام بلکہ امام نے منصور کو دکھا دیا کہ معمولی معمولی ادنیٰ کام حتیٰ کہ خشت شماری تک میں بھی اپنی اجتہادی خصوصیتوں کو ظاہر کر سکتے ہیں۔

نظامت تعمیرات کے کام

منصور نے اس موقعہ پر جو کام امام کے سپرد کئے تھے گو طبری نے چند الفاظ میں اس کو ادا کیا ہے یعنی (۱) شہر کی تعمیر کی عام نگرانی (۲) اینٹوں کی ڈھلائی کی نگرانی (۳) پھر اینٹوں کا شمار (۴) کام کرنے والوں کے کام کی دارو گیر۔

طبری کے عربی الفاظ کا یہی ترجمہ ہو سکتا ہے ان کاموں کی نگرانی میں کامیاب ہونے والے کے لئے کتنی بیدار مغزی انتظامی قوت صبر و ثبات کی ضرورت ہے۔ اسی زمانے میں نہیں بلکہ میں تو کہتا ہوں کہ اس وقت بھی امام کا میدان عمل کے اس امتحان میں شریک ہو جانا حنفی فقہ کی عملیت کی دلیل بن سکتا ہے یقیناً ان لوگوں کو جو علم دین کو پیشہ بنا لینے کے بعد یہ اعلان کرتے پھرتے ہیں کہ عمل اور دنیا سے ہمارا کوئی تعلق باقی نہ رہا امام کا یہ طرز عمل بصیرت و عبرت کا سبق ان کو دے رہا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ اور کسی دینی علم میں ضرورت ہو یا نہ ہو لیکن ''فقہ'' ایک ایسا دینی علم ہے جس میں حذاقت اور مہارت اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتی جب تک کہ دین کے ساتھ دنیا اور معاد کے ساتھ معاش کے سمجھنے اور برتنے کا بھی سلیقہ آدمی میں نہ ہو۔

حضرت امام ابو جعفر کے ساتھ شاہی کیمپ میں

بہر حال میرے لئے ان سارے قرائن اور وجوہ کا پیش کرنا تو مشکل ہے کیونکہ بات بہت طویل ہو جائے گی' لیکن پہنچا ہوں میں اسی نتیجے تک کہ بغداد کی ابتدائی تعمیر کے زمانے میں خلیفہ ابو جعفر منصور نے دجلہ کے ساحل پر اپنے خدم و حشم خیمہ و خرگاہ کے ساتھ جو شاہی کیمپ قائم کیا تھا' اسی کیمپ میں محمد النفس الذکیہ کے خروج تک زیادہ وقت خود بھی گذرتا تھا اور اپنے ساتھ ان لوگوں کو بھی رکھے ہوئے تھا' جنہیں اپنے اس محبوب شہر کے بسانے اور آباد کرنے میں مشورہ اور مداد کے لئے ملک کے مختلف گوشوں سے چن چن کر اس نے طلب کیا تھا ان ہی میں ایک امام ابو حنیفہ بھی تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے منصور کے

اس شاہی کیمپ میں امام کے قیام کی مدت کافی طویل تھی یعنی ہفتہ دو ہفتے نہیں بلکہ چند مہینے امام نے منصور کے ساتھ اسی کیمپ میں گذارے ہیں۔[1] ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہ وقت

---

[1] مطلب یہ ہے کہ جس سرزمین پر اس وقت بغداد کا شہر آباد ہے جب منصور نے شہر کی تعمیر کا ارادہ اسی قطعہ اراضی پر کرلیا اور تعمیر ساز و سامان کام کرنے والے مشورہ دینے والے نگرانی کرنے والے لوگ اطراف ملک سے جمع کر لئے گئے تو خود ایک اچھے خاصے شہر کی حیثیت اس نے اختیار کرلی جیسا کہ کتابوں میں لکھا ہے بغداد کی تعمیر میں دس ہزار مزدور کام کرتے تھے ظاہر ہے کہ یہ تو بعد کا قصہ ہے لیکن جس کی انتہا دس ہزار پر ہوئی ابتداء اس کی کم از کم ہزار بارہ سو مزدوروں سے کیا کم ہوگی پھر خود منصور کے خدم حشم اور محافظ فوج وغیرہ سے یقیناً اس مقام نے اچھی آبادی کی شکل اختیار کرلی ہوگی اگرچہ منصور نے بڑے بڑے لوگوں کو اپنی امداد اور مشورے کے لئے جمع کرلیا تھا لیکن واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس شہر کی تعمیر سے ذاتی دل چسپی اس کو ایسی تھی کہ خود بھی اس نے اسی مقام پر قیام کرلیا تھا اور مختلف راتوں میں خود اور اپنے حاشیہ نشینوں کو مختلف مقامات میں سلایا کرتا تا کہ اندازہ ہو سکے کہ مچھروں اور پسوؤں وغیرہ کی حالت اس علاقہ میں کیا ہے دلچسپی کا اس کے یہ حال تھا کہ تعمیر سے پہلے اس نقشے کو جو شہر کا بنایا گیا تھا۔ مختلف طریقوں سے اس کے حسن وقبح کو خود جانچتا تھا کبھی راکھ چھڑک کر پورے شہر کی عمارتوں، محلوں، قصور اور محلات کا اندازہ کرتا یہ تماشے تو دن کو ہوتے اور رات کو اس نے حکم دیا کہ بنولے کے دانے جمع کئے جائیں ان ہی نشانوں پر جن پر دن کو راکھ چھڑکی گئی تھی۔ بنولے کے روغنی دانوں کو چھڑکوا کر آگ لگا دینے کا حکم دیتا اس تدبیر سے پورا شہر آتشین نشانوں کے ساتھ سامنے کھڑا ہو جاتا یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ایک دفعہ بانس کے ٹھٹھروں سے بھی اس نے پورے شہر کو کھڑا کر کے دیکھا الغرض شب و روز کا یہی مشغلہ تھا بہتر سے بہتر تعمیری چیزیں کہاں مل سکتی ہیں منگوائی جاتی تھیں اسی سلسلہ میں اس نے قصر مدائن کو بھی توڑنا چاہا تھا لیکن حساب سے نقصان کا پتہ چلا چھوڑ دیا پھر بھی واسط سے چار آہنی دروازے اور شام سے فراعنہ کے زمانے کا ایک فولادی پھاٹک اپنے شہر میں لگانے کے لئے اس نے منگوایا دجلہ کے ساحل پر تھوڑے تھوڑے فاصلے سے عیسائی راہبوں کی جو مختلف خانقاہیں تھیں، کبھی منصور ان میں بھی جا کر دن یا رات کو آرام کرتا تقریباً ایک سال کے قریب قریب یہ مدت جس میں روز روز عید اور شب شب برات تھی منصور گذار رہا تھا کہ ٹھیک اس وقت جس وقت وہ شدید گرمی کی تپش سے بچنے کے لئے ایک راہب کی خانقاہ میں قیلولہ کر رہا تھا اچانک محمد نفس زکیہ کے خروج کی خبر اس کو ملی اور اسی وقت دھوپ ہی میں بھاگا بھاگا ہوا کوفہ پہنچا اور جب تک اس فتنے کا قلع قمع نہ ہو گیا قصر ابن ہبیرہ میں مقیم رہا ۱۲

کے اس قرب سے بھی اپنے نصب العین میں امام نے فائدہ اٹھانا چاہا جیسا کہ میں نے عرض کیا تعمیر کی نگرانی خشت شماری وغیرہ کے کام کو بھی اسی سلسلہ میں انہوں نے قبول کیا تھا[1] اور اپنی طبیعت کے خلاف خلیفہ کے سامنے اپنی علمی خصوصیتوں کا مختلف طریقہ سے اظہار فرماتے تھے جس کی ایک نظیر خوارزمی کے حوالہ سے گذر چکی ایک واقعہ کا ذکر قاضی ابو یوسف کیا کرتے تھے جس کا حاصل یہ ہے کہ جن دنوں قاضی القضاۃ کے عہدے پر دہ سرفراز تھے' کہتے ہیں کہ ان ہی دنوں میں ایک دفعہ جب خلیفہ کی ڈیوڑھی میں تھا کہ سامنے سے ایک آدمی گذرا اس کو دیکھ کر لوگ آپس میں ایک دوسرے سے کہنے لگے کہ یہ بہت بڑا حسابی آدمی ہے میں نے دیکھا کہ غیر معمولی طور پر لوگ اس کے اس کمال کی وجہ سے اس کا احترام کر رہے ہیں قاضی ابو یوسف کہتے ہیں کہ ایک حسابی مسئلہ میں مجھے دشواری محسوس ہو رہی تھی یہ سن کر کہ حساب میں اس شخص کو غیر معمولی کمال حاصل ہے میں

---

[1] طبری نے لکھا ہے غالباً ان کے زمانہ کی بات ہے یعنی منصور سے کئی سو سال بعد بغداد کی فصیل کا ایک حصہ کسی وجہ سے منہدم ہوا اینٹیں دیوار کے اندر سے جو نکلیں تو لوگوں نے دیکھا کہ ہر اینٹ پر گوند سے اس اینٹ کا وزن (۱۱۷) رطل لکھا ہوا تھا' جب اینٹ تولی گئی تو ٹھیک اس وقت بھی یہی وزن اس کا ثابت ہوا میرا خیال ہے کہ ہر اینٹ پر گوند سے وزن کا لکھوانا ممکن ہے کہ امام ابوحنیفہ ہی کی جدت ہو لکھا ہے ہر اینٹ ایک ہاتھ چوڑی اور ایک ہاتھ لمبی ہوتی تھی اب اسے منصور کی جزرسی کا نتیجہ خیال کیجئے یا امام ابوحنیفہ کی فطری بیدار مغزی کا ثمرہ قرار دیجئے کہ اتنے بڑے عظیم شہر کی تعمیر میں جو کچھ خرچ ہوا تھا ایک ایک پیسہ کا حساب لکھا ہوا بعد کو شاہی خزانے سے برآمد ہوا مورخین نے اس سیاہے کو اپنی کتابوں میں نقل بھی کیا ہے اب اسے میری خوش اعتقادی قرار دیجئے یا اور کچھ لیکن غالب خیال میرا یہی ہے کہ حساب وکتاب کے اتنے واضح طریقہ کی بنیاد بھی کچھ تعجب نہیں کہ امام ابوحنیفہ نے رکھی ہو اور بعد کو اسی اصول پر سیاہیہ درج ہوتا رہا لکھا ہے کہ مستریوں (یعنی استاذ من البیائن) کو روز کی مزدوری چاندی کی ایک قیراط ملتی تھی اور عام مزدور جنہیں اس زمانے میں ''الروزگاری'' کہتے تھے۔ دوحبہ سے تین حبہ تک ملتے تھے' عجیب بات ہے کہ ہندوستان کے بعض علاقوں مثلاً بہار وغیرہ میں تعمیری مزدورں کو اس وقت تک ''ریزہ'' کہتے ہیں بہ ظاہر معلوم ہوتا ہے کہ یہ اسی ''روزگاری'' کی مخفف یا مرخم شکل ہے۔ ۱۲

اس سے ملا اور جو مسئلہ تھا اس پر پیش کیا اس نے مجھے مشورہ دیا کہ فلاں فلاں طریقے سے اس کو حل کرو میں نے حل کیا لیکن جواب صحیح نہ نکلا۔ تب اس نے کہا کہ بس ایک ہی طریقہ رہ گیا ہے جو مجھے امام ابوحنیفہ نے بتایا تھا پھر اس نے امام کے بتائے ہوئے حسابی طریقہ کا مجھ سے ذکر کیا عمل کر کے میں نے دیکھا تو اب کے جواب بالکل صحیح تھا جو دشواری تھی حل ہو گئی۔[1]

میرا خیال ہے کہ اس درباری محاسب کو امام نے حساب کے اس نکتے سے غالباً ان ہی دنوں میں مطلع کیا ہو گا جب منصور کے ساتھ اس شاہی کیمپ میں وہ مقیم تھے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ خلیفہ اور خلیفہ کے ماحول میں رہنے والوں پر امام صاحب یہ اثر قائم کرنا چاہتے تھے کہ صرف دینی ہی نہیں بلکہ کسی قانون کی تدوین میں جن عقلی اور ذہنی علوم کے مسائل کی ضرورت ہوتی ہے ان کو بھی وہ اچھی طرح جانتے ہیں اور مطلب وہی تھا کہ کسی طرح حکومت کا اعتماد ان کے مدونہ قوانین پر قائم ہو جائے اور ایسا اعتماد قائم ہو جائے کہ مسلمانوں کے انصاف اور فصل خصومات کا مسئلہ ہر مدعی علم کے جو سپرد کر دیا جاتا ہے اس بری رسم کا انسداد ہو جائے۔ کیمپ کی محدود آبادی میں خلیفہ کے ساتھ میل جول اور حاضر باشی کے مواقع بکثرت پیش آتے تھے اور ان ملاقاتوں میں امام کو اپنی خداداد ذہانت' اپنے کردار' اپنی گفتار' اپنی وسعت علمی سے متاثر کرنے کا کھلا میدان مل گیا تھا' ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جب منصور خالی ہوتا تو امام کو دوسروں کے ساتھ اپنی مجلس میں بلا لیا کرتا تھا امام خوب کھل کھل کر باتیں کیا کرتے تھے بعض دفعہ ظرافت کی باتیں بھی کرتے جن سے ان کے انتقال ذہنی کی سرعت کا پتہ چلتا ہے۔

ایک لطیفہ

اسی سلسلہ میں ایک لطیفہ کا ذکر مورخین کرتے ہیں حاصل جس کا یہ ہے کہ منصور کے دربار میں اتفاقاً قاضی ابن ابی لیلیٰ بھی کسی ضرورت سے یا منصور کی طلبی پر حاضر

---

[1] کردری ص ۱۹۹ ج ۱۔

ہوئے تھے امام بھی بلائے گئے یہ نہیں معلوم کہ مسئلہ کس نے چھیڑا لیکن ایک سوال یہ اٹھایا گیا کہ سوداگر اپنے مال کے متعلق گاہک سے اگر یہ کہہ دے کہ جس سودے کو آپ لے رہے ہیں میں اس کے عیوب اور نقائص سے بری ہوں اس کے بعد بھی آپ اگر لینا چاہتے ہوں تو لے سکتے ہیں سوال یہ تھا کہ اس کے بعد سودے میں اگر کسی قسم کا عیب یا نقص نکل آئے تو خریدار کو واپسی کا حق باقی رہتا ہے یا نہیں' امام ابوحنیفہ یہ کہتے تھے کہ سوداگر اس اعلان کے ساتھ بری الذمہ ہو جاتا ہے اور ابن ابی لیلیٰ نے کہا کہ سودے میں جو عیب ہو جب تک ہاتھ رکھ کر سوداگر اس کو متعین نہیں کرے گا اس وقت تک صرف لفظی برأت کافی نہیں ہے ہے دونوں میں مسئلہ پر بحث ہونے لگی منصور دونوں کی گفتگو دلچسپی سے سن رہا تھا آخر میں امام نے ابن ابی لیلیٰ سے پوچھا کہ فرض کیجئے کسی شریف عورت کا ایک غلام ہے وہ اس کو بیچنا چاہتی ہے لیکن غلام میں یہ عیب ہے کہ اس کے عضو مخصوص پر برص کا داغ ہے' فرمایئے کیا آپ اس شریف عورت کو یہ حکم دیں گے کہ عیب پر ہاتھ رکھ کر خریدار کو مطلع کرے قاضی ابن ابی لیلیٰ نے اپنی بات کی پچ میں کہا کہ ہاں! ہاتھ اسی مقام پر اس کو رکھنا ہوگا۔ ظاہر ہے کہ ان کے اس فتویٰ کا اثر حاضرین مجلس پر کیا پڑا ہوگا۔ لوگوں نے لکھا ہے کہ ابوجعفر قاضی ابن ابی لیلیٰ پر بہت برہم ہوا۔ (ص ۱۶۷ ج ا موفق)

حضرت امام جعفر صادق کی خدمت میں حضرت امام ابوحنیفہ کے سوالات

بہ ظاہر اسی قول کی باتوں نے بتدریج منصور کے سامنے امام کو جری بنا دیا تھا' اس سلسلہ میں امام نے بعض ایسی باتیں بھی منصور کے کہنے سے کیں کہ شاید اپنی غرض ان کے سامنے نہ ہوتی تو ہرگز نہ کرتے مثلاً کہتے ہیں کہ منصور سے ملنے کے لئے حضرت امام جعفر صادق تشریف لانے والے تھے حسن بن زیاد کا بیان ہے کہ اس نے امام ابوحنیفہ کو بلا کر یہ آرزو ظاہر کی کہ لوگ جعفر صادق کے علم سے بہت مرعوب ہو رہے ہیں' کیا کچھ ایسے

علمی سوالات تیار کر سکتے ہیں جن کے جواب میں ان کو بھی دشواری پیش آئے امام ابو حنیفہ جیسا کہ ان کی زندگی کے دوسرے حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل بیت کے ان بزرگوں سے گہری عقیدت رکھتے تھے خصوصاً ان ہی امام جعفر صادق کے متعلق تو امام سے یہ روایت بھی نقل کی جاتی ہے کہ ان سے جب یہ دریافت کیا گیا کہ آپ نے جن جن علماء کو دیکھا ہے ان میں سب سے بڑا فقیہ کس کو پایا تو کہتے ہیں کہ امام نے جواب میں فرمایا کہ:

مارئت الفقه من جعفر بن محمد الصادق (ص ۵۳ ج ۱ موفق) — میں نے جعفر صادق سے زیادہ سمجھ والا فقیہ آدمی نہیں دیکھا۔

امام کے اساتذہ کی فہرست میں لوگوں نے امام جعفر صادق کا نام بھی درج کیا ہے[1] یہ بھی لکھتے ہیں کہ جب پہلی دفعہ امام جعفر صادق کسی ضرورت سے کوفہ تشریف لائے تو امام ابوحنیفہ اپنے شاگردوں کے ساتھ ان سے ملنے گئے دیکھنے والوں کا بیان ہے کہ:

---

[1] خطیب نے اپنی تاریخ میں امام ابوحنیفہ کے پوتے قاضی اسماعیل بن حماد کے حوالہ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ امام ابوحنیفہ کے دادا امام کے والد کو جن کا نام ثابت تھا بچپن میں حضرت علی کرم اللہ وجہ کی خدمت میں لے گئے تھے مرتضیٰ علیہ السلام نے ثابت کے لئے برکت کی دعا فرمائی اور فرمایا کہ خدا ان کی آئندہ نسل کو برکت عطا کرے اسماعیل اس روایت کو بیان کر کے کہا کرتے تھے کہ خدا سے یہی امید ہے کہ حضرت علی کی یہ دعا رائیگاں نہ ہوگی یہ بھی خطیب ہی نے نقل کیا ہے کہ امام صاحب کے جد امجد نے حضرت علی کی خدمت میں نیروز کے دن فالودہ بطور ہدیہ کے پیش کیا تھا اسی وقت آپ نے فرمایا تھا کہ نوروزنا کل یوم (ہمارا نیروز تو ہر دن ہے) تاریخ بغداد ص ۳۲۶ ج ۱۳ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل بیت سے امام ابوحنیفہ کے موروثی تعلقات تھے ایک دوسری روایت امام جعفر صادق اور امام ابوحنیفہ کے باہمی مکالمے کے متعلق لوگوں نے جو روایت کی ہے اس میں بار بار یہ دیکھا جاتا ہے کہ جب جعفر صادق کو امام خطاب کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ جعلت فداک (میں حضور پر قربان کیا جاؤں) واللہ اعلم ائمہ اہل بیت سے اس زمانہ میں یہ گفتگو کا عام طریقہ تھا یا امام صاحب کی خصوصیت تھی۔ دیکھو موفق ص ۱۴۴۔ ۱۲

قعد ابو حنیفه کالمستوفز معظماله (ص ۱۴۴ موفق)

یعنی بیٹھے امام جعفر صادق کے سامنے امام ابو حنیفہ ایک بے چین مرعوب آدمی کی طرح ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان کی عظمت سے ان کا دل معمور ہے۔

بہر حال کچھ بھی ہو باوجود ان تمام عقیدت مندیوں کے بہ ظاہر یہی خیال گذرتا ہے کہ منصور پر اپنی ساکھ قائم کرنے کے لئے امام نے چند ایسے مشکل سوالات مرتب کئے کہ منصور بھی بھڑک اٹھا۔

کہتے ہیں یہ چالیس ''مسائل شداد'' تھے میں سمجھتا ہوں کہ منصور کی علمی پرواز کے لحاظ سے ان سوالوں کی نوعیت خواہ کچھ ہی ہوئی' لیکن امام ابوحنیفہ چونکہ جعفر صادق کی علمی گہرائیوں اور وسعت معلومات سے واقف تھے اس لئے انہوں نے اس میں کوئی مضائقہ محسوس نہیں کیا کہ حضرت کے سامنے ان سوالوں کو پیش کیا جائے بلکہ اندرونی طور پر ممکن ہے کہ اس کو بھی امام جعفر صادق کی رفعت قدر کا ذریعہ بنانا چاہتے ہوں جیسا کہ بعد کو ہوا بھی۔

امام جعفر صادق ابھی منصور کے پاس نہیں پہنچے تھے حیرہ ہی میں تھے کہ اس نے امام ابوحنیفہ کو ان کے پاس روانہ کیا امام کا بیان ہے کہ میں نے ان مسائل کو جوں ہی ان کی خدمت میں پیش کیا جیسی کہ توقع تھی ہر سوال کا جواب انتہائی بسط و تفصیل کے ساتھ سننے کے ساتھ دیتے چلے جاتے تھے یہی نہیں کہ اپنی رائے صرف ظاہر کرتے بلکہ یہ بھی کہ اس مسئلہ میں عراق والوں کا فتوٰی یہ ہے۔ مدینہ والے یہ کہتے ہیں خود ہمارا خیال یہ ہے امام ابوحنیفہ کہتے ہیں کہ:۔

حتی اتیت علی الاربعین مسئلة ما اخل منها بمسئلة (ص ۱۷۳ ج ۱ موفق)

چالیسوں مسئلے انہوں نے اس طور پر بیان کر دیئے یا کہ کسی مسئلے کے بیان میں کسی قسم کا خلل پیدا نہ ہوا۔

منصور کی جو غرض تھی وہ تو پوری نہیں ہوئی لیکن امام ابوحنیفہ کا مطلب پورا ہو گیا'

یعنی ان مشکل سوالوں کو سن کر امام کی علمی عقیدت اس کے دل میں اور بڑھ گئی۔

ابوجعفر کے یہاں حضرت امام کا رسوخ

الغرض یہ اور اسی قسم کے مسلسل تجربات تھے جو امام ابوحنیفہ خلیفہ ابوجعفر منصور کو اپنے متعلق صبح سے شام تک دیتے رہتے تھے ایسی صورت میں بیان کرنے والوں نے اگر یہ بیان کیا ہے جیسا کہ موفق نے معمر بن الحسن الہروی کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ آخر میں منصور کا یہ حال امام کے ساتھ ہو گیا تھا کہ:

یری من المنصور من تفضیله وتقدیمه واستشارته فیما ینوبه وینوب رعیته وقضاته وحکامه. (ص ۱۴۳ ج ۱ موفق)	یعنی دیکھا جا رہا تھا کہ منصور امام کو دوسروں پر ترجیح دے رہا ہے ہر معاملہ میں ان ہی کو پیش پیش رکھتا ہے، ان ہی سے مشورہ لیتا ہے ان معاملات میں جو ذاتی طور پر اسی سے تعلق رکھتے تھے یا اس کی رعایا براہ راست یا اس کے قاضیوں اور حاکموں سے تعلق ہوتا۔

تو اس پر متعجب نہ ہونا چاہیے ان تجربات کے یہ لازمی نتائج تھے واقعات سے تو معلوم ہوتا ہے امام کو اس معاملہ میں ابوجعفر کے ہاں اتنا رسوخ ہو چکا تھا کہ اس کی ملکہ خاص بادشاہ بیگم اور خود منصور کے درمیان خانگی جھگڑوں میں بھی منصور امام پر اعتماد کرتا اور منصور کی ملکہ بھی امام کو ثالث مقرر کرتی تھی۔

بادشاہ بیگم اور ابوجعفر کے درمیان ایک جھگڑے پر حضرت امام کا فیصلہ

ایک قصہ بھی اسی سلسلہ میں بیان کیا جاتا ہے، حسن بن ابی مالک اپنے والد ابو مالک کی زبانی اس قصے کو بیان کیا کرتے تھے خلاصہ جس کا یہ ہے منصور اور اس کی زوجہ

الحرہ (آزاد بیگم) میں کچھ سومزاجی پیدا ہو گئی۔ بیگم کو منصور سے شکایت تھی کہ جس قدر و منزلت کی وہ حق دار ہے خلیفہ اس میں کوتاہی کرتا ہے لیکن منصور کو اس سے انکار تھا آخر طے ہوا کہ کسی تیسرے کے سامنے مقدمہ پیش ہو جو وہ فیصلہ کر دے وہی مانا جائے منصور نے بیگم سے پوچھا کہ تم کس کے فیصلے پر اعتماد کرو گی؟ کہتے ہیں کہ معاً اس نے امام ابو حنیفہ کا نام لیا جو کیمپ میں وہاں موجود ہی تھے۔ منصور نے امام کا نام سن کر کہا کہ ہاں! ان کے فیصلے پر میں بھی راضی ہوں امام صاحب بلائے گئے درمیان ستر یعنی پردہ چھوڑ دیا گیا چلمن کے پیچھے بیگم تھی اور باہر امام صاحب اور خلیفہ تھے۔ خلیفہ نے امام کو خطاب کر کے کہا' کہ میری یہ بیوی جو پس پردہ بیٹھی ہوئی ہیں' ان کو مجھ سے بے انصافی کی شکایت ہے میں آپ ہی کے سپرد اپنا انصاف کرتا ہوں' پوچھتا ہوں کہ شرعاً مرد کو کتنی بیویوں سے نکاح کرنے کا حق ہے امام نے فرمایا چار اور شرعی اماء (لونڈیوں) کی بھی شرعاً اجازت ہے یا نہیں؟ امام نے فرمایا ہاں اجازت ہے منصور نے کہا تو ایسی صورت میں کیا کسی کو اس کا حق ہے کہ ایک بیوی سے زیادہ عورتوں کے رکھنے پر معترض ہو امام نے فرمایا نہیں امام سے سوال و جواب کے بعد منصور نے بیگم کو خطاب کر کے کہا کہ

اسمعی یا ھذہ. اجی تم سن رہی ہو (یہ کیا کہہ رہے ہیں)

بیگم نے جواب دیا کہ ہاں! سن رہی ہوں۔ اب امام ابو جعفر کی طرف مخاطب ہو کر فرمانے لگے۔

> امیر المومنین! سنئے ایک بیوی سے زیادہ عورتوں کی اجازت شریعت نے ایک شرط کے ساتھ دی ہے یعنی ان ہی لوگوں کے لئے اجازت ہے جو انصاف اور عدل سے کام لے سکتے ہوں۔

اور اس کے بعد آخر میں فرمایا کہ:

فمن لم یعدل او خاف ان لا یعدل فینبغی ان لا یجاوز الواحدة قال الله تعالیٰ فان خفتم ان لا تعدلوا فواحدة.	لیکن جو انصاف سے کام نہ لے یا جسے اندیشہ ہو کہ انصاف نہ کر نے پائے گا تو اس کو چاہیے کہ ایک عورت سے آگے نہ بڑھے خدا نے قرآن میں فرمایا ہے کہ اگر تم کو اندیشہ ہو کہ انصاف نہ کرو گے تو پھر ایک ہی عورت۔

یہ ارشاد فرمانے کے بعد امام منصور سے کہنے لگے کہ:

"ہمیں چاہیے کہ اللہ کے بتائے ہوئے آداب کو اختیار کریں اور اس کی نصیحتوں پر عمل کریں۔"

ان آخری الفاظ سے امام کا اشارہ تھا کہ عدل کا برتاؤ جب تم نہیں کر رہے ہو تو بلاشبہ تم خدا کے حکم کی خلاف ورزی کر رہے ہو اور شریعت کے قانون سے ناجائز نفع اٹھا رہے ہو۔[1]

---

[1] تعدادِ ازدواج کے مسئلہ میں امام کا جو نقطۂ نظر تھا دوسری جگہ لوگوں نے اس کو بیان کیا ہے خلاصہ یہ ہے کہ ابراہیم (غالباً النخعی) کے متعلق امام صاحب سے کسی نے اس قصہ کا ذکر کیا کہ کسی نے ہدیۂ کوئی کپڑا ان کی خدمت میں پیش کیا لیکن لینے سے انہوں نے انکار کیا اس نے کہا کہ خرید لیجیے بولے کہ میاں چار سو درم میرے پاس اگر ہوتے تو دوسری بیوی نہ کرتا جو تمہارا کپڑا خریدتا۔ اس نے کہا کہ ایک بیوی کیا آپ کے لئے کافی نہیں، بولے کہ ان حافت خصت (جب اس کے ایام کا زمانہ آتا ہے تو میں بھی گویا ایام ہی میں بیٹھ جاتا ہوں) امام صاحب نے اس قصے کو سن کر کہا کہ بھائی مجھے تو رسول اللہ ﷺ کے صحابی جابر بن عبداللہ سے یہ روایت پہنچی ہے کہ ایک بیوی والا سرور میں رہتا ہے دو بیویوں والا شرور کا شکار بنتا ہے یعنی مصیبتوں میں مبتلا ہو جاتا ہے یہ سنا کر امام صاحب نے فرمایا کہ میرے ساتھ جسے اتفاق نہ ہو وہ تجربہ کر کے دیکھ لے یا شاید جابر ہی کا یہ قول نقل کیا اور کہا کہ ابراہیم کو شائد تجربہ کا موقعہ نہ ملا اور اس کے بعد کہنے لگے کہ رسول اللہ ﷺ کا جو برتاؤ عدل و انصاف کا اپنی بیویوں کے ساتھ تھا جو اس برتاؤ کو نہ کر سکے تو وہ ظالموں میں لکھا جائے گا پھر وہ حدیث سنائی جس میں ہے کہ دو بیویوں کے ساتھ نہ انصاف کرنے والا قیامت کے دن اس حال میں آئے گا۔ کہ ایک شق اس کے بدن کا ساقط ہو گا امام نے اس پر اور اضافہ کیا کہ ایک ہی بیوی پر قناعت" اپنے لئے تو میں نے اسی طلح

چونکہ امام کے بیان کے اس آخری حصہ سے بیگم ہی کی تائید ہو رہی تھی کہتے ہیں کہ وہ بہت خوش ہوئی اور بہت کچھ انعام و اکرام کے ساتھ شکریہ ادا کرنے کے لئے اپنا آدمی امام صاحب کے پاس بھیجا جواب میں امام نے بیگم کو سلام کہلا بھیجا اور کہا کہ ان سے کہہ دیجیو کہ ان کے خاطر سے میں نے کوئی بات نہیں کہی تھی اپنا دینی فرض میں نے ادا کیا' خدا ان کو برکت دے اور جو کچھ اس نے بھیجا تھا شکریہ کے ساتھ واپس فرما دیا۔ (ص ۲۱۲ موفق ج ۱)

چونکہ میرے نزدیک یہ سارے واقعات جہاں تک قرائن و قیاسات سے میں سمجھ سکا ہوں تعمیر بغداد کے ابتدائی کیمپ سے تعلق رکھتے ہیں اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ یہ پہلا واقعہ ہے جس میں امام کو منصور کے منشاء کے خلاف ''حق'' کے اظہار پر مجبور ہونا پڑا ممکن ہے کہ منصور نے اس کا زیادہ اثر نہ لیا ہو لیکن جو انجام امام اور منصور کے تعلقات کا آخر میں ہونے والا تھا اس کی بنیاد گویا اس واقعہ سے پڑ گئی۔

ابوجعفر کے دربار میں حضرت امام کے حاسدین

اور شاید اسی کے بعد منصور کے بعض حاسد درباریوں کو اپنے جذبہ حسد کی تسکین کے مواقع مل گئے مثلاً کہتے ہیں کہ سب سے منصور کی غیر معمولی دلچسپیوں اور توجہ کی وجہ

لے مسلک کو اختیار کیا ہے اور فرمایا کہ بھائی! بے فکری اور سلامتی کے برابر کوئی چیز نہیں ہے پھر عورتوں کی ذمہ داریوں کی طرف توجہ دلاتے ہوئے آنحضرت ﷺ کے خطبہ حجۃ الوداع کے ان الفاظ کو دہرایا کہ یہ عورتیں تمہارے ہاتھوں میں بندھی ہوئی ہیں پس ان کے ساتھ نیک برتاؤ کرتے رہنا'' راوی کا بیان ہے کہ دیر تک امام صاحب اس مسئلہ پر گفتگو فرماتے رہے لیکن مجھے بس اس قدر یاد رہ گیا کاش! امام کی پوری تقریر راوی کو یاد رہ جاتی تو تعدد ازدواج کے مسئلہ میں مسلمانوں کے سب سے بڑے امام کا نقطہ نظر دنیا کے سامنے آ جاتا اور پہلی صدی تک کے مسلمانوں کے مذاق کی وہ ایک تاریخی شہادت ہوتی جو سمجھتے ہیں کہ اس قسم کی باتیں یورپ کی نکتہ چینیوں کے بعد مسلمانوں نے بنانی شروع کی ہیں ان کا بہترین جواب امام کا یہ بیان ہو سکتا تھا اور میرے خیال میں تو جو کچھ راوی کو یاد رہ گیا ہے وہ بھی اس مدعا کے اثبات کے لیے کافی ہے۔

سے جو امام ابوحنیفہ سے منصور کی درباریوں میں جلتا تھا وہ اس کا مشہور حاجب ربیع تھا بہ ظاہر معلوم ہوتا ہے کہ کیمپ ہی کی ان ہی مجلسوں میں ایک دن ربیع نے منصور کو خطاب کر کے کہا کہ اب ان کے علم و تحقیق کے اتنے مداح اور معترف ہیں۔ اور میں نے علماء سے سنا ہے کہ آپ کے جد امجد عبداللہ بن عباس صلوات اللہ علیہ کے خلفا یہ فتویٰ دیتے ہیں۔ منصور نے پوچھا کہ کس مسئلہ میں؟ ربیع نے کہا کہ قسم کھا کر آدمی مجلس سے اٹھ جانے کے بعد اگر اس قسم سے کسی چیز کو مستثنیٰ کرے تو آپ کے جد امجد کا فتویٰ تھا کہ استثناء کا یہ عمل صحیح ہے اور اس پر عمل کرنے سے قسم نہیں ٹوٹتی۔ لیکن مجھے معلوم ہوا ہے کہ ابوحنیفہ کہتے ہیں کہ قسم کھانے کے ساتھ ہی استثنا کا عمل موثر ہوتا ہے اختتام مجلس کے بعد استثناء لغو ہے اور جو اس پر عمل کرے گا قسم اس کی ٹوٹ جائے گی۔ منصور نے امام صاحب کی طرف مخاطب ہو کر پوچھا کہ واقعہ کیا ہے؟ امام نے فرمایا کہ امیر المومنین! آپ سمجھے بھی یہ کیا کہہ رہا ہے' کہنا یہ چاہتا ہے کہ آپ کی فوج وغیرہ آپ کے ہاتھ پر وفاداری کی قسم کھا کر جو بیعت کرتی ہے تو یہ لوگ چاہتے ہیں کہ اس بیعت کو غیر موثر بنادیں یعنی بیعت کرنے کے بعد بیعت کرنے والوں کو گویا اختیار دیا جاتا کہ گھر جا کر استثناء کرلیں یعنی فلاں فلاں حال میں وفاداری کو اپنے لئے غیر ضروری قرار دیں تو شرعاً بیعت کی پابندی ان کے لیے غیر ضروری ہے۔[1] آپ خیال کررہے ہیں کہ یہ کتنے بڑے فتنے کی بات ہے۔

کہتے ہیں کہ امام کی اس تقریر سے تو ربیع کا خون خشک ہوگیا گویا فوج کے اغواء کا الزام ایک طرح اس پر قائم ہوگیا لیکن خیر گذری منصور سمجھ گیا کہ درباریوں کی باہمی نوک

---

[1] مطلب یہ ہے کہ پہلے بھی کہیں ذکر آ چکا ہے کہ عباسیوں کے زمانے میں بیعت لینے کا یہ دستور ہوگیا تھا کہ بیعت کرنے والا قسم کھاتا تھا کہ اگر میں عہد کی پابندی نہ کروں گا تو میری بیویوں کو طلاق ہوجائے میرے غلام لونڈی آزاد ہوجائیں اور حج کعبہ پیدل اپنے گھر سے مجھے کرنا پڑے' اب اگر ان سب باتوں کی قسم کھا کر آدمی گھر آئے اور صرف اتنا بڑھادے کہ مگر اس وقت تک پابندی ضروری ہے کہ جب تک میرا جی چاہے' لیجئے سارا کیا دھرا ختم ہوگیا استثناء کا یہ مسئلہ اصول فقہ کا ایک معرکۃ الآرا مسئلہ ہے امام اس کو تو کیا سمجھاتے ایک علمی دشواری دکھا کر خلیفہ کو سمجھادی کہ کتنا خطرناک مسئلہ ہے۔۱۲

جھونک سے اس کا تعلق ہے امام کا جواب سن کر صرف ہنسا اور ربیع سے کہا۔

لا تعرض لابی حنیفۃ ابوحنیفہ کو مت چھیڑا کر (ورنہ تیری جان پر بن جائے گی)۔ (ص ۱۱۱ ج ۱ موفق)

دربار سے نکلنے کے بعد ربیع نے امام صاحب سے کہا کہ آج تم نے میرے خون سے کھیلنے ہی کا ارادہ کرلیا تھا امام نے فرمایا کہ بھائی تم نے بھی تو یہی چاہا تھا' بعضوں نے اس قصے کو محمدؒ بن اسحاق مشہور امام السیر والمغازی کی طرف منسوب کیا ہے' یعنی بجائے ربیع کے محمد بن اسحاق نے امام پر الزام لگایا تھا' لیکن میرے خیال میں ربیع والی بات زیادہ صحیح ہے۔

اسی طرح منصور کے درباریوں میں ایک اور صاحب ابوالعباس طوسی تھے امام کی روزافزوں مقبولیت ان کو بھی نہیں بھاتی تھی ایک دن برسر دربار آپ نے بھی امام سے یہ مسئلہ دریافت کیا کہ:

"ابوحنیفہ بتایئے اگر امیرالمومنین ہم میں سے کسی کو یہ حکم دیں کہ فلاں آدمی کی گردن ماردو اور یہ معلوم نہ ہو کہ اس شخص کا قصور کیا ہے' تو ہمارے لئے اس کی گردن مارنی کیا جائز ہوگی۔

برجستہ امام نے فرمایا کہ ابوالعباس! میں تم سے پوچھتا ہوں کہ امیرالمومنین صحیح حکم دیتے ہیں یا غلط طوسی نے کہا کہ امیرالمومنین غلط حکم کیوں دینے لگے' امام نے فرمایا تو صحیح حکم کے نافذ کرنے میں تردد کی گنجائش کیا ہے! طوسی امام سے یہ جواب پا کر کھسیانا سا ہو کر رہ گیا۔

ایک اور دلچسپ واقعہ اسی سلسلے میں لوگ جو نقل کرتے ہیں وہ اس لئے زیادہ دلچسپ ہے کہ امام ابوحنیفہ کی قدرومنزلت منصور کے دربار میں کس حد تک بلند ہو چکی تھی اس کا بھی اس سے اندازہ ہوتا ہے مطلب یہ ہے کہ عام درباریوں کا ایسی صورت میں امام سے رشک و حسد چنداں محل تعجب نہیں۔ لیکن معمولی نوکر چاکر خدام اور شاگرد پیشہ والے کسی سے جلنے لگیں تو اس کے یہ معنے ہیں کہ بادشاہ محض مجالس عامہ ہی میں نہیں بلکہ

اپنی خانگی زندگی میں بھی اس شخص کے فضل و کمال کا ذکر کرتا رہتا ہے۔

بہر حال قصہ یہ ہے کہ کہتے ہیں کہ راوی اس کے قاضی ابو یوسف ہیں کہ منصور کا ایک بڑا منہ چڑھا غلام تھا منصور اس کو بہت مانتا تھا اس شخص کے دل میں بھی امام صاحب کی طرف سے حسد پیدا ہوا جب منصور امام صاحب کی تعریف کرتا تو وہ منہ چڑھا لیتا اور جھوٹ سچ باتیں ادھر ادھر کی ان کی طرف منسوب کرتا اپنے اس جاہل غلام کو منصور منع بھی کیا کرتا تھا کہ تجھے ان سے کیا تعلق؟ مگر خلیفہ سے وہ اتنا شوخ تھا کہ باوجود بار بار ممانعت کے امام کے بدگوئیوں سے باز نہیں آتا۔ منصور نے ایک دن جب ذرا اصرار کے ساتھ ڈانٹ کر منع کیا تو اس نے کہا کہ آپ ان کی بڑی تعریف کرتے ہیں میں جاہل آدمی ہوں' بھلا میرے سوالوں کا جواب دے دیں تو میں جانوں' منصور نے کہا کہ اچھا بھائی تو بھی حوصلہ نکال لے دھمکایا بھی اگر ابو حنیفہ نے تیری باتوں کا جواب دے دیا تو پھر تیری خیر نہیں' مگر اس جاہل کو اپنے سوالوں پر ناز تھا۔ خلیفہ سے اجازت مل ہی چکی تھی' امام صاحب کسی وجہ سے منصور کے پاس بیٹھے ہوئے تھے غلام نے خطاب کر کے کہا آپ ہر بات کا جواب دیتے ہیں میرے سوالوں کا حل کیجئے تو میں جانوں۔ امام صاحب کیا بولتے یہی کہا ہوگا کہ پوچھ بھائی کیا پوچھتا ہے اس نے گہر افشانی شروع کی کہ جناب بتائیے! دنیا کے ٹھیک بیچ میں کون سی جگہ ہے؟ اس جہالت کا جواب کیا ہو سکتا تھا۔ امام نے فرمایا کہ وہی جگہ جہاں تو بیٹھا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کی تردید وہ کیا کر سکتا تھا چپ ہو گیا۔ اور دوسرا سوال پیش کیا کہ خدا کی خلقت میں زیادہ تعداد سر والوں کی ہے یا پاؤں والوں کی امام نے اسی انداز میں فرمایا کہ پاؤں والوں کی اس نے کہا کہ دنیا میں نروں کی تعداد زیادہ ہے یا مادوں کی امام نے فرمایا کہ نر بھی بہت سے ہیں اور مادہ کی کمی نہیں' اچھا تو بتا کس میں ہے چونکہ وہ خصی غلام تھا جھیپ گیا۔

ظاہر ہے کہ یہ شاہی دربار کے چھچھلے ہیں امام صاحب کو ناگوار تو گذرا ہوگا لیکن جس مقصد سے وہ سب کچھ انگیز کر رہے تھے اس جہالت کو آپ نے برداشت فرما لیا کہتے ہیں کہ امام کی خاطر سے منصور نے غلام کو پٹوایا اور کہا کہ آئندہ تم ان کے متعلق اپنے اس

برے رویہ سے باز آ جاؤ (ص ۱۶۱ ج ۱ موفق)

اگر چہ یہ ایک مہمل سا بے معنی قصہ[1] ہے لیکن اگر صحیح ہے تو اس سے جیسا کہ میں نے عرض کیا اس اثر اور نفوذ عام کا پتہ چلتا ہے جو امام کو اندرو باہر الغرض منصور کی درباری خانگی زندگی میں ان کو حاصل ہو گیا تھا اسی کے ردعمل کی یہ مختلف شکلیں ہیں۔ جنہیں مورخین نے بیان کیا ہے۔

اور یہ تو ردعمل کی ہلکی شکلیں تھیں اصل واقعات تو بعد کو پیش آئے۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ منصور کے شاہی کیمپ میں پہنچ کر امام اگر اس فکر میں تھے کہ جس طرح ممکن ہو منصور کو قابو میں لانے کی جو ممکنہ صورت ہو اس کا کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھا جائے اور آپ دیکھ رہے ہیں کہ مختلف راہوں سے منصور کو اپنی گرفت میں لانے کی کوششوں میں وہ مصروف ہیں اس پر اپنا اور اپنے قانونی خدمات کا ایسا غیر معمولی اثر قائم کرنا چاہتے ہیں کہ آئندہ اپنی حکومت کا آئین ان ہی کے مدونہ قوانین کو بنا لینے پر وہ مجبور ہو جائے جن کے متعلق ان کو اطمینان تھا کہ کتاب وسنت سے قریب ترین شکل یہی ہو سکتی ہے مسلمانوں کی آئینی زندگی حتی الوسع اللہ اور رسول کی مرضی کے تحت گذرے گی اگر ان کے خصومات اور باہمی جھگڑوں کا فیصلہ ان ہی کی روشنی میں کرنے پر حکومت آمادہ ہو جائے۔ وہ جو کچھ

---

[1] لیکن مجھے اس قصے میں ایک کلیہ مل گیا یعنی اس قسم کے مہمل سوالوں کا بہترین جواب یہی ہو سکتا ہے کہ کچھ ایسی باتیں جواب میں کہہ دی جائیں جن سے سوال کرنے والا خود مشکلات میں مبتلا ہو جائے آخر خود سوچے کہ امام کے اس جواب پر کہ جس جگہ تو بیٹھا ہے وہی وسط دنیا ہے ایک ایسا دعویٰ ہے جس کی تردید کے لئے ضروری ہو جاتا ہے کہ پہلے ساری دنیا کی پیائش کی جائے بغیر اس کے امام کے اس دعویٰ کی تردید کی کیا شکل ہو سکتی ہے طوسی نے جو سوال امام سے کیا تھا اس کا جو جواب دیا گیا بعض روایتوں کی جائے بغیر اس کے امام کے اس دعویٰ کی تردید کی کیا شکل ہو سکتی ہے طوسی نے جو سوال امام سے کیا تھا اس کا جو جواب دیا گیا بعض روایتوں میں ہے کہ امام اپنے جواب کا تذکرہ کرنے کے بعد کہتے ہیں کہ مجھے اپنے استاد حماد بن ابی سلیمان سے یہ گر ہاتھ آیا ہے کہ ایسے موقعوں پر سوال کے جواب میں ایسی بات کہنی چاہیے کہ خود سائل پر جواب کی ذمہ داری عائد ہو جائے۔ ہٹ دھرم جہال سے جان بچانے کا یہ اچھا اور کارگر گر ہے۔۱۲

کر رہے تھے اسی کے لئے کر رہے تھے لیکن جہاں وہ اپنی اس فکر میں تھے ظاہر ہے کہ دوسری طرف ابو جعفر منصور بھی اپنی فکر میں لگا ہوا تھا امام اس کو اپنے قابو میں لانے کی جدو جہد میں مصروف تھے تو وہ بھی امام کو اپنے دام میں لانے کی تدبیروں میں ڈوبا ہوا تھا گویا حال وہی ہو رہا تھا جسے اکبر مرحوم نے اپنے اس شعر میں ادا کیا ہے کہ ؎

وہ خوش کہ کریں گے ذبح اسے یا قید قفس میں رکھیں گے
ہم خوش کہ وہ طالب ہے تو میرا صیاد سہی جلاد سہی

ابو جعفر کا حضرت امام کی خدمت میں پہلا عطیہ

نہیں کہا جا سکتا کہ ساحل دجلہ کے اس کیمپ میں منصور نے اپنے کام کو کب سے شروع کیا' تاہم اتنا معلوم ہوتا ہے کہ امام کے فضل و کمال ذہن و ذکاوت کی خوبیوں کے مسلسل اعتراف کے بعد پہلی پیش قدمی اس کی طرف سے غالباً وہی ہوگی جس کا ذکر امام کے سوانح نگاروں نے ان الفاظ میں کیا ہے یعنی لکھتے ہیں کہ امام کی خدمات سے خوش ہونے یا خوشی کو ظاہر کرنے کے بعد اپنا ممنون کرم بنانے کے لئے ابو جعفر نے بڑی ہمت سے کام لیتے ہوئے دس ہزار درم کا ایک عطیہ کہیے یا انعام امام کے نام منظور کیا' مغیث بن بدیل جو اس واقعہ کے راوی ہیں ان کا بیان ہے کہ توڑے منظورہ رقم کے منصور نے منگوا کر امام کو بلایا اور رقم کو پیش کرتے ہوئے اس نے کہا کہ میری یہ خواہش ہے کہ اس رقم کو آپ قبول کریں' بہ ظاہر یہ پہلا دانہ تھا جسے صیاد اپنے شکار کے منہ میں اتارنا چاہتا تھا اور اس راہ میں امام کے لئے بھی شاید یہ پہلی آزمائش تھی اگرچہ حکومتوں کے اس دانہ دوام سے بچنے کے لئے جیسا کہ بہ تفصیل بتایا جا چکا ہے امام کافی انتظام کر چکے تھے خدا نے ان کو تجارت کی راہ سے اتنا کچھ دے رکھا تھا کہ دس ہزار کی اس رقم کی ان کی نگاہوں میں کیا وقعت ہو سکتی تھی لیکن معاملہ یہاں دوسرا تھا اپنے عہد کا سب سے بڑا مطلق العنان فرماں روا یہ رقم دے رہا تھا اور دے کیا رہا تھا لینے پر گویا مجبور کر رہا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس کا نہ قبول کرنا گویا ایک طرح سے اس کے حکم سے سرتابی تھی اور ابھی امام اس سے بے تعلق

بھی ہونا نہیں چاہتے تھے سخت مخمصہ میں مبتلا ہوئے راویوں نے تو نہیں لکھا ہے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ معمولی عذر و معذرت کے بعد امام نے کس حیلہ سے کچھ وقفہ چاہا یعنی آج تو اس کو ملتوی کیا جائے' کل اس کا جواب دوں گا دربار سے واپس ہونے کے بعد اپنے ایک دوست جن کا نام خارجہ بن مسیب تھا ان کو بلایا اور ان کے سامنے اپنی اس نئی مصیبت کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ میں بڑی مشکل میں پھنس گیا ہوں۔

> اگر اس رقم کو واپس کرتا ہوں تو یہ آدمی (یعنی خلیفہ) بگڑ جائے گا اور لینا منظور کر لیتا ہوں تو اپنے دین میں ایسی چیز کو میں داخل کروں گا جو مجھے کسی طرح گوارا نہیں۔ (ص ۲۱۱ ج ا موفق)

خارجہ آدمی تھے بڑے زیرک اور منصور کی نفسیات کے ماہر انہوں نے امام کو مشورہ دیا کہ آپ منصور کو کسی طرح یہ باور کرا دیجئے کہ میرے دل میں قطعاً روپیہ پیسہ کا خیال نہ تھا خارجہ نے ان کو گویا یہ سمجھایا کہ عموماً خلیفہ کے دربار میں جو لوگ آتے ہیں وہ اسی قسم کی امیدیں لے کر آیا کرتے ہیں' اس نے آپ کے متعلق بھی یہی رائے قائم ہوگی اس لئے وہ دے رہا ہے ورنہ جس قسم کی طبیعت اس شخص کی ہے۔ اس کے لحاظ سے تو ان لوگوں میں وہ ہے جن کی زندگی کا دستور العمل۔

"ہر کہ نہ خورد جان من"

ہوا کرتا ہے۔ امام صاحب کی سمجھ میں خارجہ کی بات آ گئی دوسرے دن دربار میں حاضر ہو کر کچھ اسی قسم کے خیالات کا اظہار کیا لکھا ہے کہ واقعی خارجہ کی یہ تدبیر کارگر ہوئی یہ سنتے ہی منصور نے حکم دیا کہ اچھا رقم خزانے میں واپس کر دی جائے۔ (ص ۲۱۱)

ابو جعفر کی دوسری پیش کش

واللہ اعلم یہ اسی زمانے کی بات ہے' یا بعد کو پھر منصور نے خیال کیا کہ ممنون کرم کرنے کی شکل اس کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے کہ امام کو کچھ نہ کچھ لینے پر مجبور کیا جائے' بہر حال دوسری روایت یحییٰ بن النضر کے حوالہ سے یہ بیان کی جاتی ہے کہ منصور نے

ان کی رقم کے ساتھ ایک خوبصورت حسین و جمیل چھوکری (امت) بھی امام کو عطا کرنے کی منظوری دی' ظاہر ہے کہ اگر یہ دوسرا واقعہ ہے تو امام صاحب کو خارجہ نے نجات کی جو تدبیر بتائی تھی وہ کارگر نہیں ہو سکتی تھی' کیونکہ اب کے تو منصور نے قطعی طور پر امام کو ممنون کرم بنا لینے کا ارادہ ہی کر لیا تھا اسی لئے رقم کے ساتھ ایک ایسی چیز بھی اس نے جائزے میں قصداً شریک کی تھی کہ مالی جال میں اگر امام نہ پھنس سکے تو دوسرا دام کم از کم منصور کے تجربے کے لحاظ سے ایسا تھا جس سے آدم کی اولاد مشکل ہی سے بچ کر نکل سکتی ہے۔

حضرت امام کا جواب

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ امام نے بھی اب کچھ طے کر لیا خلیفہ بگڑ جائے تو بگڑنے دو لیکن جو واقعہ ہے اب کھل کر کہہ دینا چاہیے' میرا خیال ہے کہ منصور کے سامنے امام کی جو تقریر نقل کی جاتی ہے جس کا ذکر پہلے بھی کسی سلسلہ میں آ چکا ہے یعنی روپے کو واپس کرتے ہوئے امام نے فرمایا کہ:

''امیر المومنین اگر ذاتی مال سے مجھے کچھ دیئے ہوتے تو شاید اس وقت میں اس کو قبول بھی کر لیتا' لیکن یہ جو کچھ آپ مجھے دے رہے ہیں' یہ تو مسلمانوں کے بیت المال کا روپیہ ہے جس کا میں اپنے آپ کو کسی حیثیت سے بھی مستحق نہیں پاتا' میں نہ ننگا' بھوکا محتاج فقیر ہوں اگر صورت ہوتی تو فقیروں کی مد سے شاید کچھ لے لینا میرے لئے جائز ہوتا' اور نہ میں ان لوگوں میں ہوں جو مسلمانوں کی حفاظت کرتے ہوئے ان کے دشمنوں سے لڑتے ہیں اگر میرا تعلق فوجیوں سے ہوتا تو اس وقت میں بھی اس مد سے لے سکتا تھا جس مد سے سپاہیوں کو امداد ملتی ہے میرا تعلق جب نہ اس گروہ سے ہے اور نہ اس طبقے سے تو آپ ہی انصاف کیجئے کہ اس رقم کو میں کس بنیاد پر لوں۔''

ظاہر ہے کہ امام کی اس تقریر کا منصور کیا جواب دے سکتا تھا بعض روایتوں میں جو

یہ آیا ہے کہ امام نے جب جائزہ لینے سے انکار کر دیا تب منصور نے ان سے کہا کہ:

لا تقل للناس انک لم تقبلها. (ص ۲۱۳ ج ۱ موفق) اچھا تو لوگوں میں اس کا چرچا مت کیجیو کہ میں نے خلیفہ کے جائزے کو قبول نہیں کیا!

جہاں تک میرا خیال ہے اسی تقریر کے بعد منصور نے امام کو یہ ہدایت کی ہوگی اور یہ معاملہ تو روپے کے ساتھ گذرا باقی چھوکری اس کے متعلق غالباً خود منصور سے امام صاحب حیاءً کچھ نہ کہہ سکے لیکن منصور کا ایک درباری حمید بن عبدالملک جو غالباً کسی زمانہ میں منصور کا وزیر بھی تھا اور امام صاحب سے حسن ظن رکھتا تھا اس نے فرمایا کہ:

''بھائی کہ میں بوڑھا ہو گیا ہوں' اور عورتوں کے معاملہ میں ہو چکا ہوں آپ ہی بتایئے کہ ایسی صورت میں اس بے چاری کو لے لینا اس پر کتنا بڑا ظلم ہو جائے گا' باقی یہ احتمال کہ فروخت کر کے دام کھڑے کر لو' سو امیر المومنین سے کہہ دیجئے گا کہ میری کیا مجال ہے کہ امیر المومنین کی ملک سے جو عورت نکل کر میرے قبضے میں آئے اسے میں بیچ دوں۔ (ص ۲۱۶ جلد ا موفق)

الغرض ان ہی طریقوں سے وہ منصور کے داؤ پیچ کے مقابلہ میں امام بھی پیترے کرتے رہے۔

ایک یہ روایت بھی اس مالی انکار کے سلسلے میں نقل کی جاتی ہے کہ بعد کو منصور کہا کرتا تھا۔

خدعنا ابو حنیفہ (ص ۱۹۴ ج ۱ موفق) ابو حنیفہ مجھے دھوکہ دیتے رہے (یعنی کسی نہ کسی تدبیر سے وہ روپیہ واپس کرتے رہے۔

کیا تماشے کی بات ہے دوسرے سے کچھ جھٹک لینے میں البتہ لوگ باہم ایک دوسرے کو دھوکے دیا کرتے ہیں لیکن روپے واپس کرنے میں دھوکہ دینا بلاشبہ عجیب بات ہے مگر کیا کیجئے کہ عباسیوں کے ایک خلیفہ کی یہی شہادت مسلمانوں کے ایک امام اور پیشوا کے متعلق ہے۔

خیر مالی لین دین کے متعلق امام کو جن آزمائشوں سے گذرنا پڑا گو بجائے خود وہ کتنی بھی اہم ہوں لیکن معاملہ ان ہی امور تک ختم کہاں ہو گیا جن اغراض کی تکمیل کا ذریعہ منصور اپنی مالی ممنونیت کو بنانا چاہتا تھا۔ بہرحال وہ کانٹے کی طرح اس کے دل میں کھٹکتے رہتے تھے وہ امام کو اپنے کام کا بنانا چاہتا تھا اور امام اس کے ذریعہ سے اپنا کام نکالنا چاہتے تھے اسی لئے گو حتیٰ الوسع وہ مدارات ہی سے کام لیتے رہے لیکن امام کی افتاء طبع سے منصور واقف تھا بنی امیہ کے زمانے کے قصے اس کے کانوں تک یقیناً پہنچے ہوئے ہوں گے جیسا کہ میرا خیال ہے ابراہیم الصائغ اور امام کے تعلقات سے بھی غالباً وہ ناواقف نہ تھا اور اب گذشتہ مالی تجربات سے امام کی فطرت کے بھانپنے کا موقعہ ذاتی طور پر بھی اس کو مل رہا تھا غالباً کیمپ ہی کے دنوں کے یہ چند واقعات ہیں جن کا ذکر امام کی سوانح عمریوں میں کیا گیا ہے۔

ابوجعفر کے دربار میں حضرت امام کی حق گوئی

مثلاً ربیع بن یونس کے حوالہ سے الکردری نے اپنے مناقب میں یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ موصل کے باشندوں نے اچانک منصور کے خلاف بغاوت کا اعلان کر دیا ان کے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے دربار لگا ہوا تھا جس میں ابوحنیفہ بھی بیٹھے تھے منصور نے مجلس کی طرف خطاب کر کے کہنا شروع کیا کہ موصل والوں نے یہ معاہدہ مجھ سے کیا تھا کہ میرے اور میری حکومت کے وفادار رہیں گے اور کبھی سرکشی پر آمادہ نہ ہوں گے معاہدے میں موصل والوں نے یہ بھی تسلیم کیا تھا کہ اگر حکومت عباسیہ کے خلاف وہ کبھی بغاوت پر آمادہ ہوں تو خلیفہ کو حق ہوگا کہ ہم میں ہر ایک کو وہ قتل کر دے منصور نے پوچھا کہ:

> ''دیکھو! میرے گورنر (عامل) کے خلاف وہ اٹھ کھڑے ہوئے ہیں' کیا ان کی خوں ریزی خود ان کے معاہدے کے رو سے میرے لئے شرعاً جائز نہیں ہو چکی ہے؟''

یقیناً آپ کا ہاتھ ان کے مقابلہ میں کھولا جا چکا ہے اور جو بھی ان کے متعلق

آپ فیصلہ کریں اس کا آپ کو قطعاً اختیار حاصل ہے اگر ان سے درگذر کیجئے تو عفو اور درگذر آپ کا شیوہ ہے' اور اگر سزا ہی ان کے لئے تجویز کی جائے تو وہ خود اپنے معاملہ کے رو سے سزا کے مستحق ہو چکے ہیں۔''

لیکن منصور کا اشارہ سوال میں جس کی طرف تھا وہ یہ آدمی نہیں تھا درحقیقت وہ امام ابوحنیفہ کے فتوٰی اور ہم نوائی کا امیدوار تھا جب اس نے دیکھا کہ امام صاحب کچھ نہیں بولتے تو براہ راست ان کی طرف رخ کر کے منصور نے پوچھا:

اے شیخ! تمہاری اس معاملہ میں کیا رائے ہے؟

آزمائش کی گھڑی پھر امام کے سر پر آ کر کھڑی ہو گئی منصور امام کے گذشتہ ماراتی طریقوں کو دیکھ کر شاید اپنے دل میں کسی انقلاب کے توقعات قائم کر چکا تھا اس لئے اس نے امام کو شخصی مخاطب بنا کر سوال کیا تھا امام کھڑے ہوئے اور اپنی رائے کو پیش کرنے سے پہلے تمہیداً منصور کو خطاب کر کے آپ نے دریافت کیا کہ:

''کیا میں اس وقت نبوت کی جانشینی کے جو مدعی ہیں ان کے سامنے کھڑا ہوا نہیں مجھے توقع ہے کہ جس گھر میں اس وقت ہوں یہ مسلمان کی پناہ گاہ ہے؟''

منصور نے کہا بے شک یہی واقعہ ہے تب اپنی رائے ان الفاظ میں پیش کرنے لگے۔

''امیر المومنین! موصل والوں نے اگر اس قسم کا کوئی معاہدہ آپ سے کیا تھا (یعنی بغاوت کی صورت میں ان کا خون خلیفہ کے لئے حلال ہو جائے گا) تو آپ کو معلوم ہونا چاہیے انہوں نے ایک ایسی چیز کا اختیار آپ کے سپرد کیا تھا جس کے سپرد کرنے کا شرعاً انہیں قطعاً اختیار نہیں تھا۔

مطلب یہ تھا کہ اپنی جان اور اپنے خون پر مسلمانوں کو اختیار ہی نہیں دیا گیا ہے اسی لئے خودکشی اسلام میں حرام ہے پھر دوسروں کو یہ اختیار وہ کیسے منتقل کر سکتے ہیں[1]

---

[1] دراصل یہ فقہ کا مسئلہ ہے اسی بنیاد پر یہ قانون ہے کہ کسی کو کوئی اگر کہے کہ مجھے مار ڈال یا قتل [illegible]

آخر میں امام نے فرمایا کہ:

اس کے بعد بھی اگر آپ ان کی خوں ریزی پر آمادہ ہوں گے' تو ایک ایسی چیز میں آپ ہاتھ ڈالیں گے جو آپ کے لئے کسی طرح جائز نہیں ہے۔

امیر المومنین! خدا کا عہد زیادہ مستحق ہے کہ اس کا ایفاء کیا جائے'' (ص ۱۷ ج ۲ کر)

منصور خدا جانے اپنے دل میں کیا کچھ سوچے ہوئے تھا' لیکن امام کی کھری کھری اس بے لاگ تقریر کو سن کر کچھ بدحواس سا ہو گیا اسی وقت اس نے جلسہ کے برخاست ہونے کا حکم دیا جب لوگ چلے گئے اور غالباً امام کو اس نے روک لیا تھا تو ان سے بڑی نرمی سے کہنے لگا۔

''اے شیخ! بات وہی ہے جو تم نے کہی''۔

وطن کو واپسی

اور شاہی کیمپ سے نجات کا ذریعہ بھی امام کی یہی جسارت بن گئی کہتے ہیں کہ اسی کے بعد اس نے امام صاحب کو کہا کہ:

انصرف الی بلادک. آپ اپنے وطن تشریف لے جایئے۔

کر دے اور اس کے کہنے والے کو قتل کر دیا جائے تو قاتل یہ عذر پیش کر کے کہ میں نے تو مقتول کے حکم سے اس کو قتل کیا ہے بری الذمہ نہیں ہو سکتا' البتہ قتل عمد میں ایک طرح سے شبہ کی گنجائش چونکہ پیدا ہو جاتی ہے اس لئے بجائے قصاص کے عام فتویٰ یہی ہے کہ دیت قاتل سے مقتول کے وارثوں کو دلوائی جائے گی' اگرچہ امام زفر کا فتویٰ قصاص ہی کا ہے بہرحال یہ وہی مسئلہ ہے' جس کی تعبیر فقہ کی کتابوں میں بذل بالانفس والاموال'' سے کی گئی ہے یعنی مالیات میں تو بذل چل سکتا ہے مگر جان میں بذل کی گنجائش نہیں ہے اسی طرح اطراف بدن یعنی آنکھ ناک کان وغیرہ میں بھی بذل جاری ہوتا ہے یا نہیں اس کے تفصیلات فقہ کی کتابوں میں دیکھیے حال حال تک یورپ میں ڈویل کا جو طریقہ جاری تھا وہ اسی بنیاد کی نافہمی پر مبنی تھا یعنی انفس میں بھی بذل کو جائز سمجھا جاتا تھا لیکن شاید اب اس کی ممانعت ہو گئی ہے۔ واللہ اعلم۔

رخصت کرتے وقت ابوجعفر کی ایک خواہش

آخر میں بڑی لجاجت سے بطور وصیت اور دوامی ہدایت کے اس نے کہا:

مگر اس کا ذرا خیال رکھا کیجئے گا کہ ایسا فتویٰ لوگوں کو نہ دیا جائے جس سے آپ کے امام (یعنی امیر) کی ذات پر کوئی حرف آئے' آپ جانتے ہیں کہ اس قسم کے فتوؤں سے خوارج (یعنی حکومت کے باغیوں) کو حکومت کے خلاف دست اندازی کا موقعہ مل جاتا ہے۔ (ص ۱۷ ج ۲ کر)

جہاں تک میرا خیال ہے ساحل دجلہ کے شاہی کیمپ سے رست گاری امام کو اسی واقعہ کے بعد میسر آئی معلوم ہوتا ہے کہ امام کے وجود کو منصور نے خطرہ قرار دیا' اور یوں سمجھا بجھا کر گھر جانے کی اجازت دے دی' شاید اسی وقت کا یہ واقعہ بھی ہے' یعنی امام صاحب جب منصور کی خرگاہ سے کوفہ روانہ ہونے لگے تو غالباً منصور نے ان سے یہ خواہش کی کہ کبھی کبھی آپ ہمارے پاس آیا جایا کیجئے۔

حضرت امام کا جواب

کہتے ہیں کہ امام نے جواب میں فرمایا جس کا حاصل یہ تھا کہ:

"یہ ذرا مشکل ہے کیونکہ آپ سے قربت اور نزدیکی کا نتیجہ دیکھ چکا ہوں کہ آزمائش میں مبتلا ہو جاتا ہوں' علاوہ اس کے اگر دل میں اس آرزو کو پالتا ہوں تو یقین مانئے کہ کسی وجہ سے اگر اپنے دربار میں میرے آنے کو آپ روک دیں گے تو خواہ مخواہ کے غم میں مبتلا ہونا پڑے گا اور امیر المومنین سچ تو یہ ہے کہ آپ کے پاس میں دیکھ چکا ایسی کوئی چیز نہیں ہے جس کی مجھے آرزو ہو۔ باقی آپ کے پاس اس لیے آمد و رفت رکھنا کہ وارد گیر سے آپ کے محفوظ رہوں' سو اس معاملہ میں میرا خیال یہ ہے کہ بحمد اللہ میں کسی ایسے جرم میں مبتلا نہیں ہوں جس کی وجہ سے حکومت کی دھڑ پکڑ کا مجھے خوف ہو:

امیر المومنین! یہ واقعہ ہے کہ آپ کے پاس وہی لوگ زیادہ آمد و رفت رکھتے ہیں جو ہر چیز سے بے نیاز ہو کر صرف آپ ہی کو اپنا سب کچھ سمجھ لیتے ہیں اور خدا کا شکر ہے کہ جس نے آپ کو دوسروں سے بے نیاز کر دیا ہے اسی ذات نے مجھے بھی اپنے سوا ہر چیز سے بے پروا اور بے نیاز بنا رکھا ہے' پس مجھے معاف فرمایا جائے کہ ان لوگوں کی طرح درباداری مجھ سے ممکن نہیں جن سے آپ کی بارگاہ بھری رہتی ہے۔ (ص ۲۹ ج ۱)

امام محمدؒ بن حسن الشیبانی امام کے متعلق یہ روایت کیا کرتے تھے' کہ والی کوفہ عیسیٰ بن موسیٰ کے دربار میں ایک دفعہ امام نے عربی کے چند شعر پڑھے جن کا ترجمہ یہ ہوسکتا ہے۔

کوزۂ[1] آب پارۂ نالے جامہ چند باتن و جانے
ہست بہتر ہزار بار زعیتیں کآ ورد عاقبت پشیمانے
(ضیا گیلانی)

بعضوں کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ منصور کے سامنے بھی دہرائے گئے تھے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

بہر حال منصور نے اس وقت تو امام کو اپنے کیمپ سے رخصت کر دیا۔ لیکن امام نے اپنے متعلق اس کے دل و دماغ پر جن لازوال نقوش کو مختلف حیثیتوں سے قائم کر دیا تھا ظاہر ہے کہ وہ کیا مٹ سکتے تھے ان کی غیر معمولی شخصیت جس کے براہ راست تجربہ کرنے کا موقعہ اس کو مہینوں شب و روز ملتا رہا' کوئی وجہ نہیں کہ طرح طرح کے خیالات اس کے دماغ میں نہ آتے ہوں زید شہید کے ساتھ امام کی ہمدردیوں کا قصہ مشہور تھا' ان کی آزادی رائے' صاف گوئی اور سب سے زیادہ ان کی فرزانگی و دانائی کے تصورات اگر

---

[1] اصل عربی اشعار یہ ہیں۔

كسرة خبز وقعب ماء وفرد ثوب مع السلامه
خير من العيش في نعيم يكون بعد ه باالملامه

مختلف وسوسوں میں اس کو مبتلا رکھتے ہوں' تو اس میں کوئی تعجب نہیں ہے ہم نہیں کہہ سکتے کہ اس سلسلہ میں اس نے اور کیا کیا۔

ابوجعفر کے دربار میں حضرت امام کی دوبارہ طلبی اور ایک سوال

لیکن تاریخ والے ایک واقعہ کا ذکر کرتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ منصور امام کی طرف سے کس قدر غیر مطمئن رہتا تھا' خلاصہ یہ ہے کہ براہ راست بلا کر پوچھنے میں تو اس نے شاید مصلحت نہ سمجھی بلکہ امام کے رخصت ہونے کے چند ہی دنوں کے بعد مدینہ منورہ[1] سے اس نے امام مالک اور اس زمانہ میں مدینہ کے ایک دوسرے با اثر عالم ابن ابی ذئب نامی تھے ان دونوں کی طلبی کا فرمان جاری کیا اور کوفہ کے گورنر کو لکھا کہ امام ابوحنیفہ کو بھی روانہ کرو غرض تینوں حضرات منصور کے پاس جمع ہوئے غالباً یہ بھی کیمپ ہی کا واقعہ ہے اور خلوت کی صحبت میں تینوں کو بلا کر اس نے دریافت کیا کہ:

سچ سچ بتائیے کہ اس امت (یعنی مسلمانوں) کی حکومت کی باگ قدرت نے جو ہمارے سپرد کی ہے کیا واقعی ہم اس کے اہل ہیں یا نہیں۔

حضرت امام کی جوابی تقریر

میں نے شاید کسی دوسری جگہ بھی امام ابوحنیفہ کے اس جواب کا تذکرہ کیا ہے جو اس موقعہ پر آپ نے منصور کو دیا اس وقت چند اجمالی فقرے ان کی تقریر کے پیش کئے گئے تھے پوری تقریر امام کی یہ تھی جسے اب درج کرتا ہوں پہلے بطور تمہید کے آپ نے خلیفہ کو نصیحت کی کہ:

---

[1] جیسا کہ تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے کہ عباسیوں کے خلاف نفس زکیہ کی تحریک اندر ہی اندر جاری تھی کچھ حالات اس کے آئندہ آرہے ہیں جہاں تک میرا خیال ہے امام مالک اور ابن ابی ذیب کو اس وقت طلب کیا گیا ہے جب معاملہ خروج کا قریب قریب ظہور کے آچکا تھا منصور کے خفیہ نمائندے منٹ منٹ کی خبریں اس تک پہنچا رہے تھے ۔۱۲

"اپنے دین کے بہی خواہ کو چاہیے کہ غصے سے اپنے آپ کو پاک صاف رکھے۔"

اور اس کے بعد جو امام کا خیال تھا اس کا اظہار ان الفاظ میں فرمانے لگے۔

"اپنے آپ کو ہر قسم کے فضول خیالات سے خالص اور پاک کر کے اگر تم سوچو گے تو میں سمجھتا ہوں کہ تم پر یہ بات مخفی نہ ہوگی کہ ہم لوگوں کے جمع کرنے میں قطعاً خدا تمہارے سامنے نہیں ہیں (یعنی خدا کی مرضی کے مطابق اپنے آپ کو بنا لینے کے لئے تم ہم سے مشورہ نہیں کر رہے ہو) بلکہ صرف تم عوام پر یہ اثر قائم کرنا چاہتے ہو کہ ہم لوگ بھی تمہارے متعلق وہی خیال رکھتے ہیں، جو خیال خود تم نے اپنے جی سے اپنے متعلق قائم کر لیا ہے یعنی تمہارے خوف سے ہم بھی تمہاری جیسی بات کہہ دیں؟

اس کے بعد ہر قسم کے خطرات سے بے پرواہ ہو کر ابوجعفر کو امام نے سمجھانا شروع کیا۔

"دیکھو تم نے خلافت کی باگ اپنے ہاتھ میں اس وقت سنبھالی ہے جب کہ مسلمانوں میں فتویٰ دینے کی اہلیت جن لوگوں میں ہے ان میں سے دو آدمی بھی تمہاری خلافت پر متفق نہیں ہوئے تھے اور تم جانتے ہو کہ خلافت ایک ایسا مسئلہ ہے جسے مسلمانوں کا اجماع ہی طے کر سکتا ہے ان ہی کے مشورے سے خلیفہ منتخب ہو سکتا ہے، ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی مثال تمہارے سامنے ہے چھ مہینے تک حکومت کرنے سے انہوں نے اپنے آپ کو روکے رکھا جب تک کہ یمن کے مسلمانوں کی بیعت کی خبر ان تک نہ پہنچی[1] (ص ۱۶ ج ۲ کر)

---

[1] اس تقریر میں اسلامی سیاست کی بنیاد کو واضح کرتے ہوئے امام ابوحنیفہ نے حضرت ابو بکر کی خلافت کے متعلق ایک ایسے تاریخی واقعہ کا اعلان کیا ہے جس کا لوگوں کو بہت کم علم ہے لیکن یہ ایک امر کا بیان ہے، افسوس ہے کہ اس رسالہ میں اس پر تفصیلی گفتگو کی گنجائش نہیں حضرت علی کرم اللہ وجہ ←

صاحب فتاویٰ بزازیہ امام حافظ الدین المعروف بالبزاز الکردری نے مذکورہ بالا تقریر دو جلیل القدر مورخوں یعنی امام احمد المدینی اور الحلبی کے حوالہ سے نقل کی ہے صحت کی ذمہ دار یہی حضرات ہیں اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ایک مطلق العنان جبار کے سامنے ایک بڑی جرأت تھی کیونکہ یہ کوئی جزئی مسئلہ نہیں تھا بلکہ منصور کی خلافت کی بنیاد پر یہ کاری ضرب تھی گویا آج امام نے صاف لفظوں میں اس کا اعلان خود منصور کے منہ پر کر دیا کہ کسی حیثیت سے بھی تمہاری حکومت شرعی اور آئینی حکومت نہیں ہے' اگرچہ امام نے اپنے جس مسلک کو ابراہیم الصائغ کے سامنے ظاہر کیا تھا اس سے ان کا موجودہ طریقہ عمل کچھ مختلف نظر آتا ہے لیکن اگر یہ سوچا جائے کہ پوچھنے کے بعد کتمان کا حق اور جو صحیح بات تھی اس کے چھپانے کو امام کی ایمانی غیرت نے قبول نہیں کیا اور ابراہیم سے امام جو کچھ کہہ رہے تھے اس کا حاصل یہ تھا کہ طاقت کے بغیر خود اپنی طرف سے ایسے موقعہ پر حق کا اظہار لا حاصل ہے تو دونوں میں فرق نظر آئے گا اور میرا خیال تو کچھ اُدھر بھی جاتا ہے کہ کوفہ پہنچنے کے بعد ایسا معلوم ہوتا ہے حکومت عباسیہ کو تہ و بالا کرنے کے لئے اندر ہی اندر جو آتش فشاں مادہ پک رہا تھا اس سے باخبر ہی نہیں بلکہ کچھ تعجب نہیں کہ امام کسی نہ کسی حیثیت سے اس میں شریک ہو گئے ہوں۔[1] گویا ان کو مسلمانوں کی جس تنظیمی قوت کا انتظار تھا وہ ان کے سامنے بے نقاب ہو چکی تھی ہو سکتا ہے کہ اس جسارت و دلیری میں کچھ اس کو بھی دخل ہو!

لہ کے متعلق یہ جو کہا جاتا ہے کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر چھ مہینے بعد بیعت کی اس واقعہ کا امام ابوحنیفہ کے اس اکتشاف سے بڑا گہرا تعلق ہے انشاء اللہ اسلامی سیاسیات پر جس کتاب کے لکھنے کا ارادہ ہے اس میں اس مسئلہ پر سیر حاصل بحث کی جائے گی۔ واللہ ولی الامر والتوفیق ۱۲

[1] جیسا کہ آئندہ ابھی معلوم ہوگا کہ نفس زکیہ کے خروج کا واقعہ مقامی نہ تھا بلکہ برسوں سے تمام اسلامی صوبوں میں اہل بیت کے نمائندے مسلمانوں کو اپنی امداد و اعانت پر آمادہ کرنے کی کوشش کر رہے تھے نفس زکیہ کے بھائی جن کا امام ابوحنیفہ سے گہرا تعلق ہے ان کے متعلق تو کتابوں میں لکھا ہے کہ منصور کے اس شاہی کیمپ میں بھی خفیۃً قیام کیا تھا' منصور ان کی تلاش میں تھا لیکن بعض مواقع ایسے بھی پیش ہوئے ہیں کہ منصور کے دستر خوان پر دوسروں کے ساتھ انہوں نے کھانا کھایا اور منصور کو پتہ نہ چلا۔ ۱۲

چاہیے تو یہی تھا کہ ابوجعفر اس تقریر کے سننے کے بعد شائد امام کے متعلق اپنا آخری فیصلہ ابھی صادر کر دیتا جس حال میں اس وقت تھا اس کا اندازہ اسی سے کیجئے کہ ابن ابی ذئب جب منصور کو جواب دے رہے تھے تو امام کا خود بیان ہے کہ میں نے اور مالک بن انس (امام مالک) نے اپنے کپڑے سمیٹ لئے ہم لوگوں کو یقین تھا کہ اس کے بعد گردن اڑا دی جائے گی۔

لیکن ابوجعفر لاکھ غضب ناک آدمی تھا' تاہم سیاسی مصالح پر اپنے جذبات کو غالب ہونے نہیں دیتا تھا اور اسی میں اس کی کامیابی کا راز پوشیدہ تھا' آپ دیکھ چکے ہیں کہ اس کے عطیہ کو امام نے جب رد کر دیا تو بجائے بگڑنے کے اس نے کہا تو یہ کہا "اپنے اس نہ لینے کا چرچا دوسروں سے نہ کیجیو" یا موصل کے مسلمانوں کے قصے میں امام صاحب نے اس کی مرضی کے خلاف رائے دی تو بجائے برہم ہونے کے اس وقت بھی اس نے امام سے یہی کہا کہ "ذرا اس قسم کے فتوؤں میں اس کا خیال رکھا کرو کہ تمہارے امام پر کوئی حرف نہ آئے" ظاہر ہے کہ یہ جو کچھ وہ کر رہا تھا' محض سیاسی مصلحت اندیشیوں ہی کی نبیاد پر کر رہا تھا۔ اس وقت بھی وہ جان رہا تھا کہ ان لوگوں کے ساتھ کسی قسم کی بے جا حرکت اگر کی گئی تو جو واقعہ کل پیش آنے والا ہے' آج ہی پیش آ جائے گا اس زمانہ کے اس سیاسی نظریہ کو اسی منصور کے بیٹے مہدی کی زبان نقل کر چکا ہوں کہ امام جیسی ہستیوں پر دست اندازی سے حتیٰ الوسع بچنے کی کوشش اس لئے کیا کرتے تھے کہ اپنی یزیدیت کی موت کی تصویر حسین کے قتل کے آئینے میں ان لوگوں کو نظر آتی تھی۔

کچھ بھی ہو' بلا سخت تھی' دلے بخیر گذشت[1] تینوں حضرات کو اپنے اپنے وطن جانے

---

[1] بعضوں کا بیان ہے کہ منصور نے چند توڑے اپنے آدمی کے حوالے کئے اور حکم دیا کہ ابن ابی ذئب اور ابوحنیفہ کو جا کر دو' اگر لے لیں تو اسی وقت دونوں کے سر اتار کر لیتے آنا' ہاں اگر لینے سے انکار کریں تو چھوڑ دینا۔ کہتے ہیں کہ ابن ابی ذیب نے تو یہ کہا کہ جس مال کو اس شخص کے لئے میں حلال نہیں سمجھتا بھلا اپنے لئے اسی مال کو کیسے حلال قرار دوں اور امام ابوحنیفہ نے کہا کہ میری گردن بھی چاہئے اڑا دی جائے لیکن ایک درم چھونے کو بھی میں اپنے لئے جائز نہیں سمجھتا مگر میرا خیال ہے کہ منصور اس سے واقف ہی تھا جانی ہی چیز کو دوبارہ جاننے کی ضرورت کیا تھی۔ ۱۲

کی اجازت مل گئی۔

مجھے پھر بھی کہنا پڑتا ہے کہ واقعات کے بیان کرنے میں ترتیب کو لوگوں نے قائم نہیں رکھا جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں اب امام کی زندگی کے دو ہی واقعے سیاسی حیثیت سے اہمیت رکھتے ہیں' ایک تو نفس زکیہ اور ان کے بھائی ابراہیم بن عبداللہ کے خروج کے وقت امام کی علانیہ اس بغاوت میں شرکت اور دوسرا واقعہ ان کے قضا کا ہے یعنی منصور نے بلا بلا کر متفرق اوقات میں ان کو اس پر مجبور کیا کہ اس کی حکومت میں قضا کا عہدہ قبول کر لیں پہلے تو صرف اسی علاقے کی قضا اس نے پیش کی جس میں وہ اپنے جدید شہر مدینۃ السلام کو بنوا رہا تھا جب امام نے انکار کیا تو پھر اس نے بغداد کے ساتھ کوفہ اور بصرہ کو بھی ان کی عدالت کے حدود میں شریک کر دیا جیسا کہ الکردری نے لکھا ہے۔

عهل للامام الى البصرة والكوفة وبغداد وما يليها (ص ۲۱ ج ۲ کر)	بصرہ کوفہ بغداد کے متصلہ علاقوں کی قضاءت امام کے نام مقرر کی۔

اور آخر میں سب کا اس پر اتفاق ہے کہ امام کے سامنے منصور نے یہ عہد پیش کیا کہ:

ان يتولى القضاء يخرج القضاة من تحت يده الى جميع كرد الاسلام (ج ۲ ص ۱۸۲ موفق)	قضا کا عہدہ ان کے سپرد کیا گیا اور یہ بھی کہ سارے اسلامی قلمرو میں جو بھی قاضی مقرر ہو امام ہی کے ہاتھ سے اس کا تقرر ہو گا

لیکن انکار ہی پر امام کا اصرار قائم رہا پھر اجبار و انکار کے ان قصوں میں منصور نے امام کے ساتھ جو ظالمانہ سلوک مختلف طریقوں سے کئے افسوس ہے کہ لوگوں نے نہ اوقات اور تاریخوں کی تعین کی طرف توجہ کی اور نہ کسی نے اس کی تصریح کی ہے کہ یہ مختلف عہدے جو امام صاحب پر پیش کئے گئے' ان میں مقدم کون ہے اور موخر کون ہے بس لکھنے والوں نے صرف اتنا لکھ دیا ہے کہ اس قسم کے واقعات پیش آئے۔

سب سے زیادہ مشکل یہ ہے کہ نفس زکیہ کے خروج اور قضا کے ان قصوں کے متعلق یہ معلوم نہیں ہوتا کہ خروج سے پہلے کہ یہ واقعات ہیں' یا بعد کے' یا بعض واقعات

قۃً ناخروج سے پہلے اور بعض واقعات خروج کے اختتام کے بعد پیش آئے۔
مدتوں کے غور وخوض کے بعد میں جس نتیجہ تک پہنچا ہوں ان کو درج کر دیتا ہوں۔ بڑی طوالت ہو جائے گی اگر اس ترتیب کے وجوہ پر بھی بحث کی جائے۔

بہر حال میرا خیال یہی ہے کہ نفس زکیہ کے خروج کے زمانہ تک آخری مکالمہ امام میں اور منصور میں وہی ہوا ہے، جس میں امام مالک اور ابن ابی ذیب مدینہ سے بلائے گئے اور کوفہ سے امام صاحب طلب کئے گئے جس کی تفصیل گذر چکی ہے جہاں تک میں سمجھتا ہوں اس دفعہ امام صاحب کی صاف گوئی نے منصور کے تمام شکوک و شبہات کو جو امام کے متعلق وہ رکھتا تھا یقین سے بدل دیا ہوگا۔ لیکن اب کرنا کیا چاہیے کیا ''اخر الحیل السیف'' یعنی تلوار سے آخری فیصلہ امام کا کر دیا جائے یا بجائے زہر کے ابھی گڑ کھلانے کے تجربے کو کچھ دن اور جاری رکھا جائے شاید وہ ان ہی خیالات میں غلطاں پیچاں ہی تھا اور جیسا کہ عرض کر چکا ہوں ان دنوں اس کا زیادہ تر قیام اسی نوتعمیر شہر کے اس کیمپ میں رہتا تھا جہاں مقیم رہ کر خود بھی تعمیری دلچسپیوں میں وہ حصہ لے رہا تھا کہ جس خطرے کی خبریں مختلف ذرائع سے اس کو مل رہی تھیں ٹھیک دوپہر کے وقت دجلہ کے کنارے جب کسی راہب کے دیر میں وہ قیلولہ کر رہا تھا کہ ہانپتا کانپتا مدینہ سے بغداد کے درمیانی فاصلے کو کل (۹) دن میں طے کر کے ایک شخص جس کا نام حسین بن صخر تھا پہنچتا ہے اور ربیع منصور کے حاجب سے کہتا ہے کہ خلیفہ سے تنہائی میں مجھے کچھ کہنا ہے رد وکد کے بعد ربیع اس کو اندر لے جاتا ہے اور جس خطرے کے خیال سے منصور اندر ہی اندر گھلا چلا جا رہا تھا اسی خبر کو:

خرج محمد بن عبدالله بالمدينة (ص ۱۹۸ کامل وغیرہ)	محمد بن عبداللہ نے مدینہ میں خروج کیا (یعنی حکومت کے خلاف مقابلہ پر آمادہ ہو گئے)

کے الفاظ میں اس نے ادا کیا گویا ایک بجلی تھی جو منصور کی آنکھوں کے سامنے کوندگئی کہا تو نے خود دیکھا، اپنی آنکھوں سے دیکھا مخبر سے بار بار پوچھتا ہے اور جواب میں وہ کہتا جاتا ہے۔

''جی ہاں! میں نے خود دیکھا ہے بلکہ رسول اللہ ﷺ کے منبر پر جب وہ

بیٹھے ہوئے تھے تو ان سے میں نے بات بھی کی ہے۔"

منصور کی حیرانی و پریشانی کا اسی سے اندازہ کیجئے کہ مدینۃ السلام اور اس کی تعمیر کا خیال اس کے دماغ سے نکل گیا اسی وقت کوچ کا اس نے حکم دیا اور کوفہ ہی میں آ کر دم لیا کہتے ہیں کہ پچاس دن تک اپنے مصلی ہی پر جسے زمین پر اس نے بچھا دیا تھا سوتا بیٹھتا تھا ایک رنگین جبہ اس وقت پہنے ہوئے تھا جب مصلی پر بیٹھا تھا اس عرصے میں حد سے زیادہ میلا ہو گیا لیکن جب تک بغاوت کا بالکلیہ قلع قمع نہیں ہو گیا کپڑے نہیں بدلے۔[1]

اسلامی تاریخ کے مطالعہ جن لوگوں نے نہیں کیا ہے شاید اس واقعہ کی اہمیت کا اندازہ نہیں کر سکتے اور میرے لئے بھی تفصیل کا موقعہ نہیں ہے تاہم چند سطروں میں ضرورت ہے کہ اجمالی ذکر اس کا کر دیا جائے۔

نفس زکیہ کے خروج کی اہمیت

اس واقعہ کا ظہور ۱۴۴ء اور ۱۴۵ء کے درمیان ہوا ہے یعنی ہجرت کے قریب قریب ڈیڑھ سو سال بعد اس عرصے میں اہل بیت نبوت کے دونوں صاحبزادے یعنی حضرت حسن اور حسین علیہما السلام کی اولاد کی کئی پشتیں گذر چکی تھیں۔ دونوں خاندانوں کے افراد کی کافی تعداد پھیل چکی تھی حالانکہ ابتداء میں دونوں حقیقی بھائی تھے لیکن جیسا کہ دنیا کا دستور ہے کچھ دن کے بعد اہل بیت کے دو مستقل سلسلے قائم ہو گئے یعنی حسنی گھرانے کے سادات اور حسینی خاندان کے سادات زیادہ تر دونوں خاندانوں کے افراد کا قیام مدینہ ہی میں تھا۔

---

[1] کہتے ہیں کہ ان ہی دنوں میں دو امیروں نے منصور کے پاس اپنی لڑکیاں بطور ہدیہ کے پیش کیں لیکن منصور نے ان کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا لوگوں نے اس سے پوچھا بھی جواب میں کہا کہ یہ وقت عورتوں کی طرف توجہ کرنے کا نہیں ہے جب تک اس کا فیصلہ نہ ہولے کہ دشمن کا سر میرے سامنے آتا ہے یا میرا سر اس کے پاس جاتا ہے اس قسم کی باتوں کا میرے سامنے ذکر نہ کرو۔

حسنی سادات

اسلام کی سیاسی تاریخ میں ایک کش مکش تو وہ تھی جس کی ابتداء کربلا کے میدان سے ہوئی اور زید بن علی الشہید کی جدوجہد پر گویا یوں سمجھنا چاہیے کہ اس کش مکش کا خاتمہ ہو گیا یہ حسینی سادات کی کش مکش کا سلسلہ تھا لیکن حسنی سادات کی طرف سے اس وقت تک کسی سیاسی جدوجہد کا اظہار بہ ظاہر نہیں ہوا تھا حسینی سادات کے حوصلے اس راہ میں گویا پست ہو چکے تھے امام باقر اور امام جعفر صادق وغیرہ بزرگ جو حسینی سادات کی نمائندگی کرتے تھے اپنی زندگی کا رخ بدل چکے تھے مگر حسنی سادات کی امنگیں ابھی زندہ تھیں جس زمانہ کا ہم ذکر کر رہے ہیں حسنی سادات میں سب سے سربرآوردہ ہستی حضرت عبداللہ بن الحسن بن الحسن بن علی بن ابی طالب علیہم السلام کی تھی۔

حضرت محمد بن عبداللہ نفس ذکیہ

آپ ہی کے ایک صاحبزادے کا نام محمد بن عبداللہ تھا بچپن ہی سے بعض غیر معمولی آثار رشد و صلاح کے ان میں پائے جاتے تھے' ان کی ان ہی خصوصیتوں کو دیکھ کر لوگوں میں ''نفس زکیہ'' کے نام سے مشہور ہوئے تھے بلکہ نام ان کا چونکہ محمد اور والد کا نام عبداللہ تھا اور غالباً والدہ کا نام بھی آمنہ تھا اس بنیاد پر بعض لوگوں نے ان حدیثوں کا مصداق ان کو قرار دینا شروع کیا' جن میں امام مہدی کے ظہور و خروج کی پیش گوئی کی گئی ہے جیسے عباسیوں میں مشہور تھا کہ بنی امیہ سے منتقل ہو کر حکومت ان ہی کے ہاتھ میں آئے گی اسی طرح یہ حسن ظن حسنی سادات میں پھیل گیا تھا کہ پیدا ہونے والا مہدی ان کے خاندان میں پیدا ہو چکا ہے اور بنی عباس سے حکومت کا جائزہ وہی لیں گے۔[1]

---

[1] عباسیوں کا خیال تھا کہ ان کے ہاتھ میں آنے کے بعد حکومت مسلسل ان ہی کے خاندان میں اس وقت تک باقی رہے گی جب تک مسیح علیہ السلام ظاہر ہو کر ان سے حکومت کا جائزہ نہ لیں اور مسیح علیہ السلام پھر اس کو مہدی کے حوالہ کریں گے۔۱۲

حسنی سادات کی جہاد کے لیے عملی اسکیم

آخر خیالات نے بتدریج واقعات کا قالب اختیار کرنا شروع کیا جس وقت منصور عباسی خلافت کا وارث ہوا اس کے زمانے میں حسنی سادات کی سیاسی تدبیریں قریب قریب تکمیل کے درجہ تک پہنچ چکی تھیں محمد نفس زکیہ جن کے والد عبداللہ بن الحسن بن الحسن ابھی زندہ تھے علاوہ اپنے چند بھائیوں کے عبداللہ جوان جوان لڑکوں کے بھی باپ تھے انتظام یہ کیا گیا تھا کہ مرکز تو خروج کا مدینہ منورہ ہی کو بنایا جائے لیکن ہر ہر صوبہ میں خاندان کا ایک آدمی بھیجا جائے اور وہاں کے مسلمانوں کو وہی موجودہ حکومت کے خلاف خروج پر آمادہ کرے المسعودی نے یہ لکھ کر محمد النفس الزکیہ کے بیعت میں سارے امصار کے لوگ شریک ہوئے۔ ہر ہر صوبے میں جو لوگ بھیجے گئے تھے ان کے نام کی فہرست یہ درج کی ہے۔

محمد نفس زکیہ کے صاحبزادے جن کا نام علی بن محمد تھا یہ مصر بھیجے گئے تھے اور عبداللہ جو دوسرے صاحبزادے تھے یہ خراسان روانہ کئے گئے حسن ان کے جن صاحبزادے کا نام تھا وہ یمن پہنچے اور نفس زکیہ کے بھائی موسیٰ بن عبداللہ جزیرہ (موصل وغیرہ میں نمائندگی کرتے تھے اسی طرح دوسرے بھائی جن کا نام یحیٰی تھا وہ رے اور طبرستان میں کام کر رہے تھے اور ان ہی کے بھائی ادریس بن عبداللہ کے سپرد سارے مغربی علاقے (افریقہ مراکش وغیرہ) اور نفس زکیہ کے بھائی ابراہیم کو بصرہ بھیجا گیا[1] المسعودی بر کامل

---

[1] لیکن خدا کی یہ عجیب شان ہے کہ گو لوگوں کو ہم نوا بنانے میں ان میں سے ہر ایک کو ہر ہر علاقے میں بڑی چھپی کامیابیاں میسر آئیں اور ان ہی کے اعتماد پر نفس زکیہ نے مدینہ میں باضابطہ اپنی حکومت کا اعلان کر دیا مگر قسمت نے عباسیوں ہی کی یاوری کی خود نفس زکیہ بھی شہید ہوئے اور ان کے لڑکے کے بھائی جہاں جہاں پہنچے تھے وہیں قتل ہوئے بعضوں نے قید خانوں میں جان دی البتہ مغرب اقصیٰ کی طرف ادریس بن عبداللہ نفس زکیہ کے بھائی جو بھیجے گئے تھے وہ اس علاقے میں ایک

عباسی حکومت کا تختہ الٹ دینے کا منصوبہ

اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ حسنی سادات کی یہ کش مکش معمولی مقامی کش مکش کی نوعیت نہیں رکھتی تھی بلکہ سارے اسلامی ممالک میں ارادہ کیا گیا تھا کہ زمین کو تیار کر کے

لـــه آزاد مقامی حکومت کے قائم کر لینے میں کامیاب ہوئے اور زمانہ تک مغرب میں حسنی سادات کا یہ خانوادہ حکومت کرتا رہا وہ اپنی ایک مستقل تاریخ رکھتے ہیں اور شاید حسنی سادات بھی اس عام ناکامی کے بعد اپنے حسینی بھائیوں کے ہم مسلک ہو گئے یعنی ان بزرگوں نے بھی زندگی کی راہ بدل دی تھی، گو سیاست سے ہٹ کر دونوں خانوادے کے بزرگوں نے اپنے نانا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ والہ وسلم کے دین کے مخلصانہ خدمات انجام دیئے ہیں لیکن یہ عجیب بات ہے کہ سیاست کی راہ سے جب کبھی ان دونوں خاندانوں میں کسی نے حکومت پر قبضہ کرنے کا ارادہ کیا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مرضی ربی اس باب میں ان کا ساتھ نہیں دیتی رہی ہے اللہ کی مصلحتوں کو اللہ ہی جان سکتا ہے لیکن اتنی بات تو تجربے اور مشاہدے کی ہے کہ کسی قوم وامت کی زندگی کے لئے سیاسی اقتدار خواہ جس حد تک اس دنیا میں ضروری ہو لیکن دیکھا یہ جاتا ہے کہ سیاسی اقتدار کی باگ قوم کے جن افراد کے ہاتھوں میں چلی جاتی ہے' ابتداء میں تو کم لیکن جوں جوں اپنی مطلق العنانیوں کا احساس ان میں بڑھ جاتا ہے۔ فرعون بے ساماں بننے میں وہ آگے کی طرف بڑھتے چلے گئے ہیں ہر ایک کو وہ دبا سکتے ہیں لیکن ان کو کوئی زبان سے بھی کچھ نہیں کہہ سکتا بلکہ ان کی ہر برائی کو خوش نما تعبیروں میں پیش کرنے والے ہر زمانے میں پیدا ہو جاتے ہیں اور جن کی زندگی اندر سے باہر تک عفونت میں سنڈاس سے بھی بدتر ہوتی ہے۔ لیکن نظم ونثر میں مداحوں کا ایک طبقہ ان کی ساری برائیوں کی پردہ پوشی کرتا رہتا ہے اور یہ صورت حال اتنی خطرناک ہے کہ میں نہیں سمجھتا کہ جن لوگوں کی رگوں میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ والہ وسلم کا مقدس خون کسی نہ کسی حد تک پہنچ گیا ہے ان کو خدا اس بری حالت میں مبتلا ہونے کے لئے چھوڑ دیتا بہ ظاہر بادشاہی اور حکومت کے الفاظ میں بڑی جاذبیت ہے اور بیرونی طمطراق کو اس کے دیکھ کر ہر شخص کی خواہش ہوتی ہے کہ کاش! ایسا اقتدار اسے بھی حاصل ہوتا لیکن انجام اس طاقت کے حصول کا جو کچھ ہوا کرتا ہے میں تو نہیں سمجھتا کہ اس کو دیکھ کر اپنی نسل اور اپنے خاندان کے متعلق کوئی اس انجام پر بخوشی راضی ہوسکتا ہے۔

یقیناً بعض خاص لذتوں سے مزہ لوٹنے کا موقعہ ان لوگوں کو مل جاتا ہے لیکن بڑی بھاری قیمت اس کی ان کو ادا کرنی پڑتی ہے شاید یہی کچھ مصلحت اس بات کی نظر آتی ہے جو اہل بیت فاطمہ لـــه

ایک دن میں عباسی حکومت کا تختہ الٹ دیا جائے۔ اندر ہی اندر۔ یہ سارے انتظامات مکمل ہو چکے تھے اور ٹھیک ایک مقررہ تاریخ میں بغاوت کا اعلان کر دیا گیا۔ حالت اتنی نازک ہو گئی تھی کہ مبصرین کی رائے الیافعی نے نقل کی ہے کہ:

قالو او لولا لسعادة لسل عرشه.(ص ۲۹۹ ج ۱) اگر منصور کا اقبال نہ ہوتا تو اس کا تخت الٹ چکا تھا۔

حسنی سادات کی اس جدوجہد کے تفصیلات تو تاریخ میں پڑھیے مجھے یہاں صرف اتنی بات عرض کرنی ہے کہ نفس زکیہ کے بھائی ابراہیم جن کی جدوجہد کا مرکز بصرہ قرار دیا گیا تھا علاوہ بصرہ کے ان کے نمائندے کوفے میں بھی مخفی طور پر بیعت لوگوں سے لے رہے تھے اور یہاں کافی کامیابیاں حاصل ہو رہی تھیں یہ فقرہ تقریباً اکثر تاریخوں میں پایا جاتا ہے کہ حکومت عباسیہ کو الٹ دینے کے لیے۔

مائة الف سيف كامنة له بالكوفه.(ص ۲۹۹ ايافعى ج ۱ وغيره) ایک لاکھ تلواریں کوفہ میں ان کے لئے چھپی ہوئی تھیں۔

ابو جعفر کو اطلاع

ابو جعفر اپنے کیمپ سے سیدھا بھاگا ہوا ''جو کوفہ'' ہی پہنچا اور سلطنت کے دوسرے مقامات پر نہیں گیا اس کی وجہ بھی غالباً معلوم ہوتی ہے کہ منصور کو اس کی اطلاع پہنچائی گئی ہو گی کہ سب سے بڑا مستحکم محاذ مدینہ کے بعد حکومت کے خلاف کوفہ میں قائم کیا گیا ہے کہتے ہیں کہ عیسیٰ بن موسیٰ جو منصور کے بعد عباسی حکومت کا خلیفہ ہونے والا تھا منصور نے

لله بنت رسول اللہ ﷺ کے ہاتھوں میں سیاسی اقتدار مسلمانوں کا بھی منتقل ہو سکا حالانکہ بہ ظاہر حالات ایسے تھے کہ سب سے پہلے اس اقتدار کے مالک وہی ہو سکتے تھے عباسیوں نے محض ان کے نام کے ناجائز استعمال سے حکومت حاصل کی تھی البتہ جب حکومت مل گئی تو بجائے اہل بیت رسول اللہ کے سادات کی تعبیر عباسی طالبین سے کرنے لگے گویا ابو طالب اور عباس دو بھائیوں کی اولاد کے درمیان یہ جھگڑا تھا بہر حال اسی کے ساتھ اس کا بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ حکومت کے سوا دوسری جتنی خدمت دین کی سادات سے بن آئی ہے دوسرے خانوادوں میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔ ۱۲

اس کو بلا کر کہا تھا۔

''بھائی! یہ جو کچھ ہو رہا ہے اس نے غرض صرف میرا اور تمہارا خاتمہ کرنا ہے اب دو ہی حال ہے مدینہ تم جاؤ اور میں کوفہ میں رہوں یا میں مدینہ فوج لے کر جاتا ہوں اور کوفہ کی نگرانی تم کرو۔'' (ص ۲۰۲ کامل وغیرہ)

چونکہ عیسیٰ ہی مدینہ پر چڑھائی کرنے کے لئے آمادہ ہو گیا۔[1] اس لئے منصور جیسا کہ گذر چکا مصلیٰ بچھا کر پچاس دن تک اسی پر پڑا رہا اور انتظار کرتا رہا کہ ہمارا سر ابراہیم کے سامنے جاتا ہے یا ابراہیم کا سر ہمارے سامنے آتا ہے۔

عباسیوں کے خلاف اس سب سے بڑی انقلابی تحریک میں

امام ابو حنیفہ کا حصہ

جیسا کہ میں نے عرض کیا اس ''انقلابی تحریک'' کے تفصیلی واقعات کے ذکر کی گنجائش اپنی اس کتاب میں نہیں پاتا عام طور پر کتابوں میں وہ لکھے ہوئے ہیں' لیکن اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ عباسی حکومت کو اپنے قیام کے ابتدائی دنوں میں ایک ایسے خطرے کا سامنا کرنا پڑا جس کی نظیر غالباً عباسیوں کی سینکڑوں سال کی تاریخ میں مشکل ہی سے مل سکتی ہے مدینہ منورہ میں امام مالک فتویٰ دے چکے تھے کہ عباسیوں نے مسلمانوں پر جبر کر کے بیعت لی ہے۔ اور جبری قسم یا قسمیں نہ واقعی قسم ہے اور نہ قسمیں نتیجہ یہ ہوا جیسا کہ تمام مورخین نے لکھا ہے بجز معدودے چند آدمیوں کے۔

---

[1] گذر چکا بیعت لیتے ہوئے عباسیوں کا دستور تھا کہ طلاق وغیرہ کو بھی شریک کر دیتے یعنی معاہدے کی خلاف ورزی کی صورت میں بیعت کرنے والے کی بیوی کو طلاق پڑ جائے گی جب مدینہ میں خروج کا مسئلہ چھڑا تو لوگوں نے اپنے اپنے اس معاہدے کا ذکر کیا امام مالک نے فتویٰ دیا کہ یہ جبری طلاق ہے جو نہیں پڑتی ہے ان کی طرف یہ مسئلہ جو منسوب ہے کہ ''طلاق المکرہ لیس شئ'' جبراً جس سے طلاق دلوائی جائے اس کی طلاق نہیں پڑتی' اس کی بنیاد یہی ہے۔۱۲

لم تخلف عن محمد من وجوہ الناس.(ص۱۹۷ کامل ج ۵) مدینہ میں ایسا کوئی قابل ذکر آدمی نہ تھا جس نے ان کی رفاقت نہ کی ہو۔

عہد نبوت کی کھودی ہوئی خندق جو پٹ چکی تھی نئے سرے سے کھودی گئی گویا مدینہ میں ڈیڑھ سو سال بعد ایک ایسا نقشہ قائم کر دیا گیا تھا کہ لوگوں کے سامنے معلوم ہو رہا تھا کہ نبوت کا مقدس عہد پھر ان کے سامنے ہے جن جن صوبوں میں نفس زکیہ کے نمائندے بھیجے گئے تھے کم وبیش ہر جگہ ان کو غیر معمولی کامیابی حاصل ہو چکی تھی لکھا ہے کہ دجلہ کے کیمپ سے بھاگ کر جب منصور کوفہ میں اپنے مصلے پر آ کر جما تھا تو جیسا کہ الیافعی وغیرہ نے لکھا ہے۔

كان كل يوم ياتيه فتق من ناحية.(اليافعي ص۲۹۸ ج۱) روزانہ مختلف صوبوں سے بغاوت کی خبریں اس کے پاس آ رہی تھیں۔

خیر وہ تو جو کچھ ہو رہا تھا ہو ہی رہا تھا مجھے تو یہ بیان کرنا ہے کہ امام ابوحنیفہ کا اس انقلابی تحریک میں کیا حصہ تھا ابراہیم صائغ کے قصے میں امام کے مسلک کی تفصیل گذر چکی اس تحریک سے پہلے امام "انتظار کرو اور دیکھو!" کے رویہ پر قائم تھے' بتا چکا ہوں کہ کسی باضابطہ اجتماعی تنظیم کے بغیر انفرادی طور پر کسی ایسے خطرے میں اپنے آپ کو جھونک دینا جس کا نتیجہ قتل ہو جانے کے سوا اور کچھ نہ ہو اس کے وہ مخالف تھے ایسے زمانہ میں حق کے بڑھانے کے امکانات سے ممکنہ حد تک فائدہ اٹھانے کی کوشش میں مشغول رہنا یہی ان کا مسلک تھا' اس باب میں جو نمونے امام نے چھوڑے ہیں ان کی تفصیل آپ پڑھ چکے ہیں۔

انقلابی تحریک کے متعلق حضرت امام کا اظہار خیال

لیکن اب وقت بدل گیا تھا وہ سارے شرائط اپنی انتہائی مشکلوں میں پورے ہو چکے تھے جن کے بعد حق کی حمایت میں اپنے فرض سے سبک دوش ہونے کے لئے کوئی عذر باقی نہ رہا تھا۔ بڑی سے بڑی اجتماعی تنظیم جو ممکن تھی اس کا جال سارے اسلامی

ممالک میں پھیلایا جا چکا تھا اور امام کی شرط کے وہ الفاظ کہ:

رجل یروس علیھم ماھو نا علی دین اللہ. اس اجتماعی تحریک کی باگ کسی ایسے آدمی کے ہاتھ میں ہو جو اللہ کے دین کے معاملہ میں محفوظ ہو۔

یعنی دینی اور ایمانی حیثیت سے اس پر کامل بھروسہ کیا جا سکتا ہو "محمد نفس زکیہ" اور ان کے بھائی ابراہیم جن سے براہ راست امام کا سابقہ تھا دونوں کے دونوں ہر لحاظ سے اس معیار پر پورے اتر رہے تھے بلکہ بعض کتابوں میں تو لکھا ہے کہ جیسے محمد بن عبداللہ کو ان کی عبادت ریاضت زہد و تقویٰ کی وجہ سے لوگ "نفس زکیہ" کہتے تھے اسی طرح ابراہیم ان کے بھائی "نفس رضیہ" کے خطاب سے مشہور تھے اور یہ واقعہ ہے کہ علاوہ شجاعت و بہادری، بے جگری و جفاکشی[1] کے جو اولادِ علی کے فطری خواص میں دینی زندگی دونوں بھائیوں کی قابل رشک بنی ہوئی تھی ان کے ان ہی فطری صفات نے لوگوں کو ان پر جمع کر دیا تھا۔

---

[1] دونوں بھائیوں کی جفاکشی اور اللہ کی راہ میں شدائد و مشکلات کے برداشت کرنے کی جو غیر معمولی صلاحیتیں تھی ان کا اندازہ ان بزرگوں کی سوانح عمریوں کے پڑھنے ہی سے کچھ ہو سکتا ہے طبری نے لکھا ہے کہ ابو جعفر منصور کو جب ان دونوں بھائیوں کی اندرونی تحریکوں کا پتہ چلا تو ان دونوں کی گرفتاری کا اس نے عام حکم اپنے ممالک محروسہ میں جاری کر دیا تھا دونوں بھائی روپوش ہو گئے ابتداء میں ان کا یہ حال تھا کہ جس شہر میں پہنچتے خلافت کے لوگوں کو خبر ہو جاتی اور گرفتاری کا ارادہ کرتے اسی طرح مختلف شہروں میں چھپتے چھپاتے آخر میں دونوں نے یہ طے کیا کہ کسی دور دراز علاقے میں پناہ لینا چاہیے اسی نیت سے عدن پہنچے اور جہاز میں سوار ہو کر سندھ کے کسی مقام میں بھی کچھ دن مقیم رہے لیکن حکومت نے سندھ میں بھی چین لینے نہ دیا وہاں کے گورنر کو خبر ہو گئی تنگ آ کر پھر عرب لوٹے اور جب ہر طرف سے خبریں آنے لگیں کہ لوگ تیار ہو چکے ہیں تب خروج کا اعلان کر دیا، طبری نے لکھا ہے کہ ایک جاریہ جو اس سفر میں ان کے ساتھ تھی کہتی تھی کہ پانچ سال سے ہمارا یہ حال ہے کہ کسی ایک جگہ کچھ دن بھی نہ رہ سکے آج فارس میں کل کرمان میں پرسوں حجاز میں کچھ دن دیلیم میں رہے پھر یمن میں کچھ وقت گذرا یمن ہی سے ہم لوگ سندھ پہنچے تھے (طبری واقعات ۱۴۵ھ) مواصلات کے مشکلات حکومت کی مخالفت اور اس حال میں ان بزرگوں کی ان اولوالعزمیوں کا اندازہ کیجئے آج ان ہی مسلمانوں کی اولاد دنیا میں ہے شاید ان کے لئے ان جفاکشیوں کا تصور بھی ناممکن ہے۔ ۱۲

انقلابی تحریک کی علی الاعلان حمایت

بہرحال عہد انتظار کے کام سے امام فارغ بھی ہو چکے تھے' یہ ان کی خوش قسمتی تھی کہ جب وہ کام پورا ہو گیا تو خدا نے ان کے سامنے ان کی سب سے بڑی آرزو کی تکمیل کا موقعہ بھی بڑی فیاضی کے ساتھ فراہم کر دیا۔ الیافعی نے لکھا ہے کہ کوفہ میں ابراہیم کی حمایت پر لوگوں کو تیار کرنے کا کام جو لوگ کر رہے تھے ان میں سب سے زیادہ امتیاز امام ابوحنیفہ اور ان کے ساتھ شہر کوفہ کے چند دوسرے خواص مثلاً ابراہیم ہشیم ابو خالد الاعمر عیسیٰ بن یونس' عباد بن العوام' یزید بن ہارون وغیرہ تھے ان میں ہر ایک شخص بڑی بڑی کثرتوں کا قبلہ بنا ہوا تھا' اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زید شہید کی رفاقت اور حمایت کے قصہ میں جیسا کہ عرض کر چکا ہوں حتی الوسع امام اپنے آپ کو ظاہر کرنا نہیں چاہتے تھے لیکن اس دفعہ امام کا رنگ بدلا ہوا تھا وہ اپنے کام سے فارغ ہو چکے تھے اور اب صرف۔

ایک مرگ ناگہانی اور ہے

کا واحد مرحلہ ان کے سامنے تھا' عمر بھی کافی ہو چکی تھی یعنی (۶۶) سال کے لگ بھگ ان کا سن پہنچ چکا تھا بالاتفاق مورخین نے لکھا ہے کہ ابراہیم کی اعانت وحمایت میں

كان ابو حنيفة يجاهر فى امره ويامر بالخروج معه. (اليافى الشافعى ص ۳۰۰ ج۱)	ابراہیم کی رفاقت پر امام ابوحنیفہ لوگوں کو علانیہ ابھارتے اور لوگوں کو حکم دیتے تھے کہ ان کے ساتھ ہو کر حکومت کا مقابلہ کرو۔

جس کا مطلب یہی ہوا کہ حکومت کے انتقام اور دار و گیر سے قطعاً بے پروا ہو کر علانیہ ابراہیم کی حمایت کا دم بھرنے لگے اور نہ صرف خود بلکہ جو بھی ان کے زیر اثر تھا اس کو ابراہیم کی حمایت پر آمادہ کرتے تھے بلکہ ''امر'' کے اصطلاحی معنی اگر لئے جائیں تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ ان کا ساتھ دے کر حکومت ظالمہ کے مقابلہ کو فرض قرار دیتے تھے اور کیسا فرض شاید میں نے کسی موقعہ پر ذکر بھی کیا ہے یعنی کوفہ کے مشہور محدث ابراہیم بن سوید کا بیان ہے کہ میں نے امام ابوحنیفہ سے ابراہیم بن عبداللہ بن حسن کے خروج کے

زمانہ میں دریافت کیا کہ حج جو فرض ہے اس کے ادا کرنے کے بعد آپ کا کیا خیال ہے حج کرنا زیادہ بہتر ہے یا اس شخص یعنی ابراہیم کی رفاقت میں حکومت سے مقابلہ کرنا زیادہ ثواب کا کام ہے ابراہیم بن سوید کہتے ہیں کہ سننے کے ساتھ میں نے دیکھا کہ ابوحنیفہ کہہ رہے ہیں۔

کہ اس جنگ میں شرکت ایسے پچاس حج سے زیادہ افضل ہے۔(ص ۸۳ ج ا موفق)

اسی طرح حسین بن سلمہ الرجی یہ روایت کیا کرتے تھے کہ میں نے ایک عورت کو دیکھا امام ابوحنیفہ سے ابراہیم بن عبداللہ کے زمانہ میں پوچھ رہی ہے کہ میرا لڑکا ابراہیم کی تائید کر رہا ہے اور میں اس کو منع کرتی ہوں مگر نہیں مانتا امام نے عورت سے کہا'' کہ دیکھ! ایسے نیک کام سے اپنے لڑکے کو نہ روک۔'' حماد بن اعین بھی کہتے ہیں کہ اس زمانہ میں ہم دیکھتے تھے کہ لوگوں کو امام ابوحنیفہ ابراہیم کی امداد و نصرت پر آمادہ کر رہے ہیں اور ہر ایک کو ان کی پیروی اور رفاقت کا حکم دے رہے ہیں ص ۸۸ امام کا اس معاملہ میں کیا حال تھا؟ لوگوں کو حکومت سے ٹکرا جانے کا مشورہ کتنے اصرار اور کتنی بے خوفی سے دے رہے تھے اسی سے اندازہ کیجئے کہ ان کے براہ راست شاگرد امام زفر بن ہذیل کی یہ شہادت ہے کہ:

كان ابو حنيفة بحر بالكلام ايام ابراهيم جهاراً شديدا (ص ۱۷۱)	ابراہیم کے زمانے میں امام ابوحنیفہ علانیہ بلند آواز سے گفتگو کرنے لگے اور بہت زیادہ بلند آواز سے۔

ابوجعفر کوفہ میں

''جہاراً شدیدا'' کے الفاظ پر غور کیجئے اور سوچئے کہ اسی کوفہ میں ابوجعفر منصور اپنے مصلی پر بیٹھا ہوا ہے ہر ناکے اور ہر موڑ پر بلکہ ہر گلی اور ہر کوچہ میں اس کے جاسوس پھیلے ہوئے ہیں جو دم دم کی خبریں اسے پہنچا رہے ہیں جیسا کہ الیافعی نے لکھا ہے کہ منصور:

نزل الکوفة حتیٰ یا من غائلة اھلھاء(ص ۲۹۸)	کوفہ میں آ کے ٹھہرا ہی اس لئے تھا تا کہ اس کے فتنوں پر قابو رکھے۔

اسی لئے اس نے سارے شہر میں منادی کرادی تھی کہ جس کے بدن پر سیاہ لباس نہیں دیکھا جائے گا قتل کر دیا جائے گا[1] الیافعی ہی نے یہ بھی لکھا ہے۔

وجعل یقتل کل من اتھمه او یحبسه.(ص ۲۹۸)	جس پر ابراہیم کی اعانت یا ہمدردی کا شبہ ہوتا اس کو قتل کرنے لگا یا قید کرنے لگا۔

ایسی صورت میں امام کا ''جہاراً شدیدا'' کے ساتھ ابراہیم کی حمایت میں لوگوں کو آمادہ کرنا یقیناً اس فیصلے کی خبر دیتا ہے۔ جو امام اپنے متعلق کر چکے تھے اس سلسلہ میں ان کو کس حد تک کامیابی حاصل ہو رہی تھی اس کا اندازہ مورخین کے اس بیان سے ہوتا ہے کہ ایک لاکھ تلوار کوفہ میں میانوں سے حکومت کے خلاف چلنے کے لئے نکلی ہوئی تھی' نہ صرف کوفہ ہی ان کی تبلیغی جدوجہد سے متاثر تھا بلکہ کامل وغیرہ میں جو یہ ہے کہ:

''پیہم عراق کے شہروں مثلاً بصرہ اہواز واسط مدائن سواد (دیہی علاقہ) سے خبریں منصور کے پاس یہ آ رہی تھیں کہ وہاں کے لوگ بدل گئے۔''

اور دوسری طرف یہ حال تھا کہ:

ایک لاکھ سپاہی کوفہ میں تلواریں سونتے صرف ایک آواز کے منتظر تھے۔'' (ص ۲۱۰ ج ۵ کامل)

لکھا ہے کہ ان حالات سے پریشان ہو ہو کر منصور کی زبان پر عربی کا وہ شعر جاری ہو جاتا جس کا ترجمہ ہے کہ:

میں نے تو اپنی جان نیزے کی انی پر چڑھا دی ہے۔ ہر رئیس اور سردار کو یہی

---

[1] عباسیوں کا شاہی رنگ سیاہ تھا جس کی ابتداء ابومسلم نے کی تھی لیکن جن لوگوں کو اہل بیت سے یا عباسیوں کی اصطلاح میں طالبیوں سے ہمدردی تھی وہ سفید لباس پہنا کرتے تھے اسی لئے ان کو ''مبیضہ'' کہتے تھے جیسے عباسیوں کے حامیوں کو ''المسودہ'' کہتے تھے منصور نے مذکورہ حکم اسی بنیاد پر دیا تھا کہ دوست اور دشمن میں تمیز ہو جائے۔۱۲

کرنا چاہیے۔

کون کہہ سکتا ہے کہ ان حالات کے پیدا کرنے میں امام کے "جہاداً شدیداً" والی تقریروں اور بیانوں کو دخل نہ تھا اسی سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ جب کوفہ پر چڑھائی کرنے کے لئے ابراہیم بصرے سے روانہ ہوئے ہیں تو ابوالفداء نے یہ لکھنے کے بعد۔

اجابه جماعة كثيرة من الفقهاء واهل العلم.	اہل علم اور فقہا کے ایک بڑے گروہ نے ان کی حمایت کی حامی بھری۔

لکھا ہے کہ:

ابراہیم کی فوج کا جائزہ لیا گیا تو ایک لاکھ سپاہیوں کے نام معلوم ہوا کہ درج رجسٹر ہو چکے ہیں۔ (ص ۴ ابوالفداء ج ۲)

عباسیوں سے جہاد کے متعلق حضرت امام کا فتویٰ

امام کے جوش و خروش کا اندازہ اسی سے ہو سکتا ہے کہ نہ صرف یہی کہ فرض حج کے بعد پچاس حج کے ثواب پر ابراہیم کی رفاقت کو علانیہ ترجیح دے رہے تھے بلکہ اس سلسلہ میں کھلم کھلا یہ فتویٰ بھی امام نے دینا شروع کیا کہ اس وقت جو حالات ہیں ان کے لحاظ سے ابراہیم کی اعانت اور رفاقت اس سے کہیں بہتر ہے کہ آدمی غیر مسلم اقوام کے مقابلہ میں جا کر جہاد کرے محدثین کی ایک بڑی وجہ امام سے برہمی کی ان کا یہی فتویٰ تھا جس کی عام اشاعت ان کی طرف سے مسلمانوں میں ہو رہی تھی:

مشہور محدث ابراہیم بن محمد الفزاری جن کا زیادہ تر قیام شامی سرحد کی چھاؤنی "مصیصہ" میں رہتا تھا اور یہاں کے سپاہیوں کی ذہنی تربیت میں ان کو بہت کچھ دخل تھا اگر چہ ابن سعد کے حوالہ سے ابن عساکر نے یہ بھی نقل کیا ہے کہ کان کثیر الخطا فی الحدیث (حدیثوں کے بیان کرنے میں بہت زیادہ غلطیاں ان سے سرزد ہوئی ہیں بہ ظاہر حافظہ کی کمزوری کا نتیجہ تھا ورنہ عدل یعنی کردار کے لحاظ سے لوگ ان کے بڑے مداح ہیں' بہرحال ان ہی ابراہیم الفزاری کا مشہور قصہ ہے' خطیب نے اپنی تاریخ بغداد

میں ان ہی کے حوالہ سے اس قصے کو بیان کیا ہے حاصل یہ ہے خود کہتے تھے کہ میں مصیصہ میں تھا کہ وہیں مجھے یہ خبر ملی کہ میرے بھائی حسن نے ابراہیم طالبی[1] کا ساتھ دیا تھا اسی جنگ میں وہ کام آیا میں اس خبر کو سن کر سیدھے کوفہ پہنچا۔ یہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ میرے بھائی کو ابو حنیفہ نے فتویٰ دے کر قتل کرایا ہے' میں ان کے پاس آیا اور پوچھا کہ تم ہی نے میرے بھائی کو فتویٰ دے کر اس طالبی کی رفاقت پر آمادہ کیا' ظاہر ہے کہ یہ سوال امام سے اس وقت کیا گیا تھا جب ابراہیم کی مہم قطعی طور پر ناکام ہو چکی تھی۔ لیکن امام جس حال میں تھے جانتے ہوئے کہ یہ عباسیوں کی پارٹی کا آدمی ہے جو واقعہ تھا اس کا اظہار ان الفاظ میں فرمایا کہ ہاں! میں ہی نے اس کو خروج (یعنی حکومت کے خلاف اٹھ کھڑا ہونے کا) فتویٰ دیا تھا ابراہیم نے کہا کہ یہ سن کر میں نے کہا کہ لا جزاک اللہ خیرا (خدا سے اس کا اچھا بدلہ تجھے نہ ملے) امام نے فرمایا کہ میری یہی رائے ہے اور اس کے بعد ابراہیم کو مخاطب کر کے فرمانے لگے کہ:

> کہ تم بھی اگر اپنے بھائی کے ساتھ شہید ہو جاتے تو جہاں سے تم آئے ہو (یعنی کفار کے مقابلے میں مصیصہ کی چھاؤنی) سے جو تم آئے ہو وہاں کے قیام سے یہ بات تمہارے لئے بھی بہتر ہوئی (ص ۳۴۶ ج ۱۳ تاریخ بغداد)۔

بعض دوسری روایتوں میں ہے کہ امام نے فرمایا کہ اگر تم بھی وہیں پے جاتے جہاں تمہارا بھائی گیا تو تمہارے لئے بھی یہ بہت اچھا ہوتا۔ ابراہیم نے ہارون الرشید کے دربار میں اسی قصے کو بیان کرتے ہوئے امام کی طرف یہ الفاظ بھی منسوب کئے تھے جیسا کہ ابن عساکر میں ہے یعنی ہارون سے وہ کہہ رہے تھے۔

---

[1] الطالبی سے اشارہ اسی مسئلہ کی طرف ہے کہ بجائے اہل بیت کی طرف منسوب کرنے کے عباسیوں کے شیعہ (پارٹی) نے آل فاطمہ کو عباسیوں کے مقابلہ میں طالبی کہنا شروع کیا تھا ابراہیم کے اس لفظ سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ عباسی شیعوں میں شریک تھے ان کے حالات سے بھی اسی کی تائید ہوتی ہے۔ عباسی دربار میں ان کا بڑا اعزاز تھا' ہارون کے زمانے میں وفات ہوئی۔ ہارون ان کی بڑی تعریفیں کیا کرتا تھا۔ ۱۲

امیر المومنین! آپ کے جد امجد منصور کے مقابلہ میں جب ابراہیم نے سر نکالا تو میرا بھائی بھی ان کے ساتھ ہو گیا لیکن میں نے بجائے اس کے کافروں کے مقابلہ میں جہاد کو زیادہ بہتر خیال کیا اور طے کر لیا کہ کفار ہی کے مقابلہ میں جا کر جہاد کروں گا اسی سلسلہ میں ابوحنیفہ کے پاس بھی آیا اور قصے کا ان سے ذکر کیا انہوں نے یہ سن کر مجھ سے کہا کہ:

(مخرج اخیک احب الی مما عزمت علیہ من الغزو) (تمہارے بھائی نے جو کام کیا ہے وہ تمہارے جہاد کے ارادہ سے زیادہ پسندیدہ ہے۔ (ص ۲۵۵ ابن عساکر ج ۲)

جس کا مطلب یہی ہوا کہ الفزاری نے امام صاحب کے مشورے کو نہ مانا اور مصیصہ کی چھاؤنی جو رومیوں کے مقابلہ میں شام کی سرحدی چوکی تھی وہیں چلے گئے واللہ اعلم وہاں جہاد کا موقعہ کافروں کے ساتھ ان کو ملا بھی یا نہیں اتنے میں بھائی کے شہید ہو جانے کی خبر پا کر پھر وہ کوفہ لوٹے اور دوسری گفتگو امام کی ان سے مصیصہ سے واپسی کے بعد ہوئی کچھ بھی ہو درحقیقت یہ وہی مسئلہ ہے جس کا ذکر پہلے بھی آ چکا ہے' ابوبکر جصاص اور حافظ ابن حزم کے حوالہ سے یہ بیان کر چکا ہوں کہ اسلام کی ان ابتدائی صدیوں میں یعنی بنی امیہ اور بنی امیہ کے بعد عباسیوں کے ہاتھ میں اسلامی سیاست کی باگ جب آ گئی تو محدثین کے ایک طبقہ نے اپنا یہ مسلک مقرر کر لیا تھا کہ حکومت کا اقتدار جن لوگوں کے ہاتھ میں چلا جائے خواہ کسی ذریعہ یہ اقتدار ان کے ہاتھوں میں پہنچا ہو لیکن جب اقتدار کے وہ مالک ہو گئے تو ان کے مقابلے میں کچھ کہنا شرعاً ناجائز ہے خواہ ان کا طرز عمل کچھ ہی ہو مسلمانوں کے مذہب نے ان کو اس کا پابند بنایا ہے کہ خاموشی کے ساتھ ان کے آگے سر جھکا دیں اور صبر کریں ابوبکر الجصاص نے ان کے اس مسلک کی تعبیر ان الفاظ میں کی ہے۔

زعموا مع ذلک ان السلطان	ان کا خیال ہے کہ حکومت کے ظلم و جور پر
لا ینکو علیہ الظلم والجور	اعتراض نہ کرنا چاہیے حتیٰ کہ جن کے خون کو خدا

وقتل النفس التی حرم الله.(ج ۲ ص ۳۴)

نے حرام کیا ہے ان کو بھی اگر حکومت قتل کرے تو اس کو نہ ٹوکا جائے۔

جصاص ہی نے لکھا ہے کہ ان کے نزدیک امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا حکم صرف ان لوگوں تک محدود ہے جو حاکمانہ اقتدار کے مالک نہ ہوں' اور ان لوگوں کو بھی صرف زبان سے ٹوکنا چاہیے یا ہاتھ سے روکنے کی گنجائش ہو تو عوام کی حد تک اس کی بھی اجازت ہے مگر تلوار کسی حال میں بھی اٹھانا نہ چاہیے جصاص کے الفاظ یہ ہیں۔

انما ینکر علی غیر السلطان بالقول او بالید بغیر سلاح (ص ۳۴ ج ۲)

حکومت والوں کے سوا عوام کو زبان سے ٹوکا جائے یا ہاتھ سے روکا جائے لیکن ہتھیار نہ اٹھانا چاہیے۔

جصاص ہی نے لکھا ہے کہ محدثین کا یہ گروہ جسے جصاص نے الحشویہ کے نام سے موسوم کیا ہے ان کا خیال تھا کہ حکومت کے مقابلہ میں امر بالمعروف یا نہی المنکر کی جرأت ثواب نہیں بلکہ فتنہ اور فساد ہے۔

جیسا کہ میں نے پہلے بھی لکھا ہے ''اسلامی سیاسیات'' کے چند بنیادی مسائل میں سے ایک بڑا اہم مسئلہ یہ بھی ہے اس کے تمام پہلوؤں پر بحث اس کتاب میں ہو سکتی ہے جو خصوصیت کے ساتھ اسلامی سیاسیات پر لکھی جائے تاہم چند ضروری امور کا ذکر بقدر گنجائش میں پہلے کر چکا ہوں۔

لیکن ''الفزاری'' نے علاوہ اس مسئلہ کے اس مقام پر دوسری چیز کی طرف بھی اشارہ کیا ہے اور اس وقت اسی کو میں بیان کرنا چاہتا ہوں۔

مطلب یہ ہے کہ زبردستی مسلمانوں کے سیاسی اقتدار پر قبضہ کر کے جور و ستم کی جہنم خود مسلمانوں پر جن لوگوں نے بھڑکا رکھی ہو اپنے سیاسی اغراض کے مقابلہ میں اسلام کے نشان زدہ حدود پر قائم رہنا عملاً دیکھا جا رہا ہو کہ غیر ضروری قرار دیئے ہوئے ہیں اگر ان کے جور و ستم کے انسداد کے اسباب فراہم ہو جائیں' تو اس وقت کیا کرنا چاہیے آیا ظلم و ستم کے ازالہ میں ان لوگوں کا ہاتھ بٹانا چاہیے جو اس حکومت جائز کے مقابلہ میں کھڑے

ہو گئے ہوں یا یہ سوچ کر کہ کچھ بھی ہو ظالم ہو جابر ہو کچھ بھی ہو مگر ہے تو حکومت مسلمانوں ہی کے ہاتھ میں پس ان کے مقابلہ سے منہ پھیر کر کسی ایسی جگہ چلا جانا چاہیے جہاں غیر مسلموں سے جہاد کرنے کے مواقع میسر آ سکتے ہوں۔ ''الفزازی'' نے اس وقت اسی مسئلہ کو چھیڑ دیا تھا ان کا اور ان کے ہم مشرب دوسرے محدثین کا خیال بھی تھا کہ کچھ بھی ہو مسلمانوں کے مقابلہ میں تلوار کسی حالت میں اٹھانا صحیح نہیں ہے اور وہ جو کچھ بھی کر رہے ہوان کے حال پر ان کو چھوڑ کر جہاد کے فریضہ کو کافروں کے مقابلہ میں ادا کرنا چاہیے۔

سچ پوچھیے تو یہ وہی سوال ہے جو اس زمانے میں بھی مسلمانوں کے مختلف طبقوں میں زیر بحث ہے یعنی ایک طبقہ پیدا ہو گیا ہے جو بنی امیہ کے سلاطین عجمین کے مقابلہ میں بے چارے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو محل طعن و ملامت بناتے رہتے ہیں مرتضیٰ علیہ السلام سے ان لوگوں کو اس کی شکایت کہے کہ مسلمان کفار کے مقابلہ میں مسلمان صف آرا تھے اور فتوحات پر فتوحات حاصل کئے چلے جا رہے تھے کہ حکومت کی باگ جوں ہی حضرت علی کے ہاتھ میں آئی انہوں نے کفار کے محاذ سے مسلمانوں کے رخ کو پھیر کر ان لوگوں کے مقابلہ میں ان کو کھڑا کر دیا جو خود بھی اپنے آپ کو مسلمان ہی کہتے تھے اور بجائے حضرت علی کے سمجھتے تھے کہ اقتدار حکومت کے صحیح اور جائز حق دار وہی ہیں۔

کہتے ہیں کہ جو مقابلہ غیروں سے ہو رہا تھا علی نے غیروں سے ہٹا کر اس مقابلہ اور مقاتلہ کو خود باہم مسلمانوں کے اندر قائم کر دیا سمجھا جاتا ہے کہ مسلمانوں کے مقابلہ میں مسلمانوں کی تلوار نکالنے کی سنت سب سے پہلے حضرت ہی نے قائم کی اس سلسلے میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے ساتھ جن احسان فراموشیوں کا ارتکاب کرنے والے کر رہے ہیں، اور جن الفاظ میں اللہ کے اس برگزیدہ بندے کو یاد کرنے والے یاد کر رہے ہیں الی اللہ المشتکی کے سوا اس کے جواب میں اور کیا کیا کہا جاتا ہے ان کے دور حکومت کے نقشے کو دکھلا دکھلا کر پوچھا جاتا ہے کہ اسلامی دائرہ اقتدار میں بتایا جائے کہ زمین کا کتنا حصہ انہوں نے داخل کیا اور اسی کو دکھا کر اعلان کر دیا جاتا ہے کہ مسلمانوں کے حکمرانوں میں علی سے زیادہ ناکام حکمران اسلامی تاریخ میں کوئی نہیں گذرا ناکامی کی دلیل یہ ہے کہ

چار سال نو ماہ کی اپنی مدت حکومت میں ایک انچ کا اضافہ بھی مسلمانوں کے فتوحاتی اطلس میں ان کے زمانہ میں نہیں ہوا[1] بلکہ باہمی خانہ جنگی کی وجہ سے مسلمانوں کی سیاسی قوت کو شدید صدمہ پہنچا۔

ظاہر ہے کہ میری اس کتاب میں اس مسئلہ پر تفصیلی گفتگو کی بھلا کیا گنجائش پیدا ہو سکتی ہے لیکن ''الفزاری'' کے طرف سے ہارون الرشید کے دربار میں امام ابوحنیفہ پر جو الزام قائم کیا جارہا تھا چونکہ قریب قریب یہ وہی الزام ہے جو حضرت علی پر اس زمانے میں عائد کیا جارہا ہے اس لئے ضمناً اس کا ذکر کرنا پڑا!۔

حضرت علیؓ اور غلطیہائے مضامین

باوجود دیکھنے کے جو نہیں دیکھنا چاہتے ہیں ان کو کیسے دکھایا جاسکتا ہے۔ حضرت علی پر تنقید کرنے والوں کی طرف سے اس قسم کی باتیں جب میرے کانوں میں پہنچتی ہیں تو ہمیشہ دل میں یہ خیال آیا کہ علی کی پچھلی زندگی پر تنقید کرنے والے ان کی زندگی کے ابتدائی خدمات سے اپنے آپ کو کیوں اندھا بنا لیتے ہیں وہ اسلامی اطلس میں ایران و مصر شام و عراق کو دیکھ کر خوش ہوتے ہیں لیکن میں پوچھتا ہوں کہ قادسیہ میں جو کامیابی مسلمانوں کو نصیب ہوئی کیا بدر کی فیصلہ کن کامیابی کے بغیر نصیب ہوسکتی تھی وہ خوش ہوتے ہیں کہ یرموک ندی کے ساحل پر معجزانہ شکست ان کے دشمنوں کو اٹھانی پڑی لیکن یرموک کی فتح پر خوشی کے شادیانے بجانے والوں سے کون پوچھے کہ ارے محسن کشو! یرموک تک تم پہنچ بھی سکتے تھے اگر کھولنے والا تم پر خیبر کے پہاڑی قلعوں کے دروازوں کو نہ کھول دیتا' سچ کہتے تھے ابوہریرہ جب کسی ملک کی فتح کی خبر مدینے پہنچتی تھی کہ خبر گو آج آئی ہے لیکن فتح کا یہ واقعہ تو اسی دن پیش آچکا تھا۔ جب مدینہ کے اطراف میں

---

[1] مگر بلاذری نے لکھا ہے کہ ۳۹ھ یعنی جس کے ایک سال بعد حضرت علی شہید ہوئے حارث بن حرہ العبدی نے حضرت علی کی اجازت سے سندھ کے بعض علاقوں پر چڑھائی کر کے فتوحات حاصل کئے تھے۔ (۴۲۸ فتوح البلدان)

اللہ کا رسول اور رسول کے ساتھی خندق کھودنے میں مصروف تھے تم نے تو دجلہ کے کنارے دیکھا کہ سعد بن وقاص اپنی فوج کو تراتے ہوئے مدائن کی طرف لے جا رہے ہیں، لیکن دیکھنے والوں نے اسی واقعہ کو اسی وقت دیکھ لیا تھا جب مدینہ کے خندق کو پھاند کر عمرو بن عبدود عرب کا سورما اس شخص سے مبارزت طلب کر رہا تھا جس نے ایک ہی وار میں سو کے برابر سمجھے جانے والے اس پہلوان کو دو ٹکڑے کر کے رکھ دیا تھا، یقیناً حافظے کمزور بھی ہوتے ہیں لیکن کیا اتنے کمزور کہ ہر دوسرے قدم کو اٹھانے کے بعد دماغ سے یہ بات نکل جائے کہ دوسرا قدم اٹھ ہی نہیں سکتا اگر پہلا قدم نہ اٹھتا یہ فطرت کی انتہائی دنادت اور گندگی ہے کہ جس نے سارے جسم سے کانٹوں کو نکالا اس کے احسانوں کا صرف اس لئے انکار کر دیا جائے کہ آنکھ جب کھلی تھی تو اس وقت ہمارے سامنے صرف وہی تھا جس نے آخر میں آنکھ کے کانٹوں کو کھینچ لیا تھا۔

میں نے اس کتاب پر کسی موقعہ پر حضرت عمر بن عبدالعزیز کا وہ پر مغز اور حکیمانہ فقرہ نقل بھی کیا ہے کہ محمد رسول اللہ ﷺ کو اللہ نے دین کا داعی بنا کر بھیجا تھا نہ کہ جابی (یعنی ٹیکسوں کے وصول کرنے کے لئے) خدا نے ان کو رسول نہ بنایا تھا جو سب سے زیادہ آدمیوں سے ٹیکس وصول کرنے میں کامیاب ہو، اگر لوگوں کے سامنے اسلامی نقطہ نظر سے بھی وہی سب سے بڑا کامیاب ہے اور محصول ادا کرنے والوں کی تعداد میں جو اضافہ نہ کر سکا وہی اسلام کا سب سے ناکام آدمی ہے، تو اب ایسوں سے آپ ہی بتائیے کہ کیا بات کی جائے ٹیکس ادا کرنے والوں کی تعداد میں اضافہ کرنے والوں کی دنیا میں کب کمی رہی ہے آج بھی اس زمین کے کرۂ پر ایسی ایسی محصول وصول کرنے والی قومیں پائی جاتی ہیں کہ ان کے محصول ادا کرنے والوں کے سامنے سے کہتے ہیں کہ آفتاب کبھی غائب نہیں ہوتا، تاریخ کی مختلف منزلوں پر ایسی قومیں اور ایسے اشخاص نظر آتے ہیں اگر فضائل و کمالات کا لے دے کر سارا معیار محصول ادا کنندوں کی تعداد کا اضافہ ہی ہے۔ اور صرف اسی معیار کو پیش کر کر کے علی کے مقابلہ میں بنی امیہ کی حکومت سراہی جا رہی ہے تو سراہنے والوں کا یہ گروہ اس وقت کیا کرے گا جب ان ہی کے

سامنے ان کو لا لا کر کھڑا کر دیا جائے جن کے محصول ادا کنندوں کی تعداد کے مقابلہ میں بنی امیہ کے محصول ادا کرنے والے شاید وہ نسبت بھی تو نہیں رکھتے جو کسی سیاہ رنگ کی گائے کے سیاہ بالوں میں ان چند سفید بالوں کی ہوتی ہے جو کہیں کہیں پیدا ہو جاتے ہیں ان سے پہلے بھی ایسوں کی کمی نہ تھی اور ان کے بعد بھی کمی نہیں رہی بلکہ شاید ان کے زمانہ میں بھی ایک سے زیادہ ایسی قومیں پائی جاتی تھیں' والقصہ بطولہا۔

یہ تو صحیح ہے کہ رسول کے جو چوتھے جانشین تھے ان کو پہلا جانشین یا خلیفہ اول کیسے کہا جا سکتا ہے' کیا واقعہ کا انکار کیا جائے لیکن کہنے والوں نے جیسے یہ کہا ہے کہ خلافت کی یہ ترتیب ہر خلیفہ کی وفات کی ترتیب تھی ان میں سے کوئی ایک بھی اپنی جگہ سے ہٹ جاتا تو قدرت جنہیں رسول کی جانشینی کے شرف سے مشرف کر چکی تھی وہ اس شرف سے محروم ہو جاتے اسی طرح کم از کم میرا تو ذاتی خیال یہی ہے کہ ردہ کے داخلی فتنے سے پیغمبر کے باندھے ہوئے شیرازے کو بکھرنے سے بچانے کے لئے صدیق اکبر کے آہنی ارادے کی ضرورت تھی وہ نہ ہوتے تو جو کچھ بعد کو ہوا کچھ بھی نہ ہوتا اور اندرونی فتنے کو فرو ہو جانے کے بعد اسلام کی اس جدید اجتماعی طاقت کو منتشر کرنے کے لئے ایک طرف سے رومیوں اور دوسری طرف ایرانیوں کی خارجی قوتوں نے جب سر نکالا تو ان دونوں طاقتوں کو واپس کر کے خود ان پر چھا جانے کے لئے فاروقی عزم و ارادہ مسلمانوں کو عطا کیا گیا اور ثروت و دولت کا جو طوفان اس کے بعد مسلمانوں کے گھر گھر میں ابلنے لگا یقیناً اس بے ہوش و بدحواس کرنے والی دنیا کے ساتھ دینی زندگی کے مطالبات کی تکمیل شاید مشکل ہی ہو جاتی اگر خدا کے اس راست باز بندے کا نمونہ مسلمانوں کے سامنے نہ ہوتا جو غنا اور تونگری کی بلند ترین منزلوں پر پہنچنے کے بعد بھی دین کے ہر ہر جزئی مطالبے کو زندگی کے آخری لمحوں تک پوری کرتا رہا اگر ان سارے واقعات کا ظہور اسلام کی تاریخ میں ٹھیک اپنے اپنے وقت پر ہوتا رہا تو مسلمان قدرت کی اس غیبی امداد کے شکریہ سے کیا سبک دوش ہو سکتے ہیں کہ جب دین کو چاہا جا رہا تھا کہ دنیاوی جاہ و جلال شوکت و اقتدار کا صرف ایک حیلہ اور بہانے کی حیثیت عطا کر کے اس کے سارے زور اور واقعیت کو ختم کر

دیا جائے دنیا کو بھی دینی کامیابیوں کا ذریعہ بنا کر دنیا کو بھی دین بنالیا جائے جو اسلام اس کی تعلیم دینے کے لئے آیا تھا خطرہ پیدا ہو گیا تھا کہیں اس کو بھی دنیا کی اس چلتی پھرتی چھاؤں کی تاریکیوں میں گم نہ کر دیا جائے تو کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ اس وقت سب سے بڑی فیصلہ کرنے والی قوت عین وقت پر ہر چیز سے بے پروا ہو کر وہ سب کچھ کرنے کے لئے اگر تیار نہ ہو جاتی جس کے تصور سے بھی آج مسلمانوں کے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں تو کیا اسلام جو صرف دین ہے دین کے سوا اور کچھ نہیں ہے اپنے دین ہونے کی اس حیثیت کو برقرار رہ سکتا تھا؟ سمجھنے والوں کو کون روک سکتا تھا؟

اسلام کے متعلق بھی اگر وہ یہی سمجھنے لگتے کہ جیسے بیسیوں حیلے مختلف ناموں سے سیاسی اقتدار کے حاصل کرنے کے لئے دنیا میں آئے دن تراشے جاتے ہیں پہلے بھی تراشنے والے تراشتے رہے اور اب بھی تراش وخراش کا سلسلہ جاری ہے ان ہی تراشے ہوئے حیلوں میں ایک خود تراشیدہ حیلہ اسلام بھی ہے تو الزام لگانے والوں کے اس الزام کی تردید کی آخر شکل ہی کیا ہوتی؟ ہر قسم کے اصول سے بے پروا ہو کر حصول مقصد کے لئے وقت کا جو اقتضا ہو اسے پورا کرنا چاہیے کرنے والوں نے جب یہ کرنے کا ارادہ کر لیا تھا بلکہ یہی کرنے بھی لگے تھے اور شاید انہوں نے یہی کیا بھی ہو؟ تو خود ہی سوچنا چاہیے کہ جو کچھ کیا جا رہا ہے شائستگی اور تہذیب کے پھیلانے کے لئے کیا جا رہا ہے جیسے یورپ کی استعماری اور استبقاری قوتوں کے اس اعلان یا اسی قسم کے خوش نما دعووں کو سن سن کر لوگ مسکرا مسکرا کر رہ جاتے ہیں کیا اسلام کو بھی تحقیری خندوں کے ان تھپیڑوں سے کوئی بچا سکتا تھا' مسلمان مر رہے ہیں مارے جا رہے ہیں کٹ رہے ہیں اور کاٹے جا رہے ہیں لیکن اسلام بچ رہا ہے اور بچایا جا رہا ہے اس بلند حوصلہ اور فولادی عزم کے ساتھ خدا کے دین کی آخری مشکل کو بچانے کے لئے کھڑا ہونے والا اگر جمل اور صفین کے میدان میں سینہ تان کر اگر کھڑا نہ ہو جاتا تو کیا اسلام کو وہ بچا لینے میں کامیاب ہو سکتا تھا؟ جو صرف مسلمانوں کو یا اپنے آپ کو مسلمان کہنے والوں کو بڑھانا چاہتے تھے بلکہ زیادہ صحیح یہ ہے کہ ان مسلمانوں کے ٹیکس دہندوں کو بڑھانا چاہتے تھے اور یہ طے کر کے

بڑھانا چاہتے تھے کہ اسلام اس کی وجہ سے گھٹ رہا ہو تو گھٹنے دو۔[۱]

بہر حال لوگوں کا خواہ کچھ ہی خیال ہو لیکن اسلامی تاریخ کے طویل مطالعہ نے مجھے اسی نتیجہ تک پہنچایا ہے کہ خلفاء اربعہ میں سے ہر خلیفہ کا وجود اس خاص وقت کی ضرورت کی پکار کا قدرتی جواب تھا الحیٰوۃ الدنیا جس میں آدمی قرآن کے رو سے کبھی خیر سے آزمایا جاتا ہے اور کبھی شر سے اسی الحیٰوۃ الدنیا کا وہ دور جو حضرت مرتضٰی علیہ السلام کے سامنے آ گیا تھا۔ یعنی ایک طرف اسلام تھا اور دوسری طرف مسلمان تھے ان دونوں چیزوں میں پیدا کرنے والوں نے ایک ایسا تعلق پیدا کر دیا تھا ایک کو اگر پکڑا جاتا ہے تو دوسری چیز بگڑتی ہے پھر کیا کیا جائے ایک ایسا مشکل مسئلہ تھا کہ قضا ہم کی قوت فیصلہ اگر

---

[۱] یہ جو کچھ لکھا گیا ہے جن کے سامنے اسلام کی تاریخ ہے وہی سمجھ سکتے ہیں کہ کس حد تک واقعات سے ان دعووں کا تعلق ہے اس کتاب میں سارے واقعات کی تفصیلی ذکر کا موقعہ نہیں ہے اتنا تو سب ہی جانتے ہیں کہ بنی امیہ کے زمانے میں ایک دفعہ نہیں متعدد مواقع ایسے پیش آئے ہیں کہ جزیہ کی آمدنی لوگوں کے مسلمان ہونے کی وجہ سے گھٹنے لگی تو انہوں نے اسلام پر داخل ہونے سے روکنے کی کوشش کی خود اسی کتاب کے ابتدائی اوراق میں عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے کے ایک واقعہ کا تذکرہ کیا گیا ہے بہر حال مسلمانوں کے بڑھانے اور اسلام کے گھٹانے کی یہ ایک جزئی مثال ہے اسی کے مقابلہ میں سنن بیہقی نے اپنے سنن میں نقل کیا ہے کہ ''بزرگ سابور'' جسے غرب ''بزرح سابور'' کہتے تھے ایک ضلع تھا حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے ایک صاحب کو وہاں کی مال گذاری کے وصول کرنے پر مقرر فرمایا رخصت کرتے ہوئے ان صاحب سے حضرت علی نے فرمایا کہ دیکھنا! ایک درم کے وصول کرنے پر بھی کسی کو کوڑے سے نہ مارنا اور ہرگز ہرگز ذی رعایا کی ان چیزوں کو بقایا میں نیلام نہ کرانا یعنی روز کی روزی کا ان کے جو ذریعہ ہو گرما اور سرما کے لباس اور ان کے مویشی جن سے کاشت اور بار برداری وغیرہ کا کام لیتے ہوں ان کو ہاتھ نہ لگانا اس شخص نے حضرت علی سے کہا کہ امیر المومنین! پھر تو میں اسی طرح واپس ہو جاؤں گا جیسے جا رہا ہوں یعنی کچھ وصول نہ ہو گا مرتضٰی علیہ السلام نے یہ سن کر فرمایا خواہ تم اسی طرح واپس ہی کیوں نہ ہو جاؤ'' پھر فرمایا تجھ پر افسوس! مجھے تو یہی حکم دیا گیا ہے لوگوں نے العضوم لوں یعنی زندگی کی اصلی ضرورتوں سے جو بچ جائے اس سے لوں۔۱۲ (دیکھو سنن بیہقی ص ۲۰۵ ج ۹)

اگر مسلمانوں کو اس وقت نہ مل جاتی تو ممکن تھا کہ مسلمان نام رکھنے والی کوئی قوم دنیا میں رہ جاتی لیکن اسلام بھی باقی رہتا یا نہیں اس کی پیش گوئی مشکل تھی اور سچ تو یہ ہے کہ اسلام کے غائب ہو جانے کے بعد یہ کہنا کہ مسلمان قوم تو باقی رہ گئی کچھ بے معنی سی بات ہے۔

یہ پہلا موقعہ ہے کہ مسلمانوں کے مقابلہ میں مسلمانوں کو صف آراء کرنے میں لوگ کامیاب ہو چکے ہیں مسلمانوں کے امام اور خلیفہ کے سامنے ایک عجیب صورت حال پیش ہوتی ہے کیا کیا جائے ان کے مقابلہ میں تلوار اٹھائی بھی جائے یا نہ اٹھائی جائے پھر تو جنگ میں ان کے ساتھ بھی وہی طریقہ اختیار کیا جائے جو غیر مسلموں کے ساتھ اختیار کیا جاتا ہے ان کے زخمیوں کے ساتھ کیا برتاؤ کیا جائے شکست کھانے والے جس مال و متاع کو چھوڑ کر بھاگیں گے اس کا انجام کیا ہوگا؟ الغرض یہ اور ایسے بیسیوں پریشان کن سوالات تھے جنہیں وہی حل کر سکتا تھا جسے پیغمبر کی زبان نے مسلمانوں کا سب سے بڑا قاضی قرار دیا تھا قدرت کی ان مصلحتوں کو کون جانتا تھا کہ اسلام جب ان الجھنوں سے دوچار ہوگا تو الجھنوں کی سب سے بڑی سلجھانے والی طاقت کے ہاتھ میں اسلام کی سیاسی باگ اسی زمانے میں آ جائے گی امام ابوحنیفہ کا اسی سلسلہ میں ان کے مشہور شاگرد نوح بن دراج جو یہ قول نقل کیا کرتے تھے یعنی جب حضرت علی کے زمانے کے واقعات (جمل وصفین) کے متعلق امام سے پوچھا جاتا تو نوح کہتے ہیں کہ امام اس کے جواب میں فرماتے کہ:

سار علی فیه بالعدل وھو علم المسلمین السنة فی قتال اھل البغی.(ص ۸۴ ج ۲ موفق)	علی نے ان مواقع میں عدل کی روش اختیار کی اور مسلمان باغیوں کے ساتھ اسلامی حکومت کو کیا برتاؤ کرنا چاہیے اس کے قوانین حضرت علی ہی نے سکھایا اور بتایا۔

امام کے ان مختصر الفاظ کی وہی تشریح ہے جو میں نے اس سے پہلے درج کی ''عدل کی روش'' سے مرتضٰی علیہ السلام کے اس متوازن فیصلہ کی طرف اشارہ ہے جسے انہوں نے اس موقعہ پر صادر کیا۔

رہے اہل بغی کے ساتھ جنگ کے قوانین سو اس میں کوئی شبہ نہیں کہ گو واقعہ بعد کو پیش آیا لیکن وقوع سے برسوں پہلے قرآن میں آیت نازل ہو چکی تھی یعنی [1]

وان طائفتان من المومنین اقتتلوا فقاتلوا التی تبغی حتی یفئ الی امر الله.	ایمان والوں کے دو گروہ آپس میں اگر لڑ پڑیں تو ان میں جس نے سرکشی اختیار کی ہو اسی گروہ سے مسلمانو! جنگ کرو تا ایں کہ خدا کے فیصلہ پر معاملہ جائے (یعنی جو حق پر ہو وہ غالب ہو جائے)

لیکن ظاہر ہے کہ جیسا کہ قرآن کا قاعدہ ہے جس قانون کو بھی اس نے دیا ہے اسی قسم کے اجمال کے رنگ میں دیا ہے' اس وقت اندازہ کرنا مشکل ہے لیکن پہلی دفعہ جب یہ صورت حاصل پیش آئی ہوگی قرآن کے اس اجمالی قانون کے تمام تفصیلات کا سوچنا اور ہر ایک کے متعلق فیصلہ صادر کرنا کتنا دشوار ہوگا لیکن جنگ جمل و صفین کے حالات

---

[1] خود مرتضیٰ علیہ السلام اور آپ کے ساتھ بعض دوسرے جلیل القدر صحابیوں کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے لوگوں کو ان آئندہ پیش آنے والے واقعات بلکہ ان کے جزئیات تک سے رسول اللہ ﷺ نے مطلع فرما دیا تھا مرتضیٰ علیہ السلام بسا اوقات اس کا اظہار بھی فرما دیتے تھے بلکہ اس سلسلہ میں ان کے سارے اقوال اگر جمع کر دیئے جائیں تو کہا جا سکتا ہے کہ جو کچھ بعد کو ہوا۔ سب پہلے سے معلوم تھا آنحضرت ﷺ کے ایک خاص صحابی جن کا نام حذیفہ بن یمان تھا ان کی خصوصیت ہی یہ بیان کی جاتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے "اسرار" سے وہ واقف تھے صاحب سر النبی ﷺ کے خطاب سے لوگ ان کو مخاطب کیا کرتے تھے۔ لکھا ہے کہ جس زمانے میں حضرت عثمانؓ شہید ہوئے وہ کوفہ میں تھے شہادت کے بعد کوفہ خبر پہنچی لوگوں نے حضرت علی کا خلافت کے لئے انتخاب کیا ہے باوجودیکہ حضرت حذیفہ بیمار تھے لیکن مسجد جامع تشریف لائے لوگوں کو جمع کر کے اعلان کیا کہ خدا کا شکر ہے کہ اس دن تک میں زندہ رکھا گیا اور فرمایا کہ لوگو! اس کے بعد بہت سی لڑائیاں پیش آنے والی ہیں تو تم لوگ گواہ رہو اس کے بعد اپنے ایک ہاتھ کو دوسرے ہاتھ پر مارتے ہوئے فرمایا اللھم اشھد انی بایعت علیا (اے خدا تو گواہ رہ میں نے علی کے ہاتھ پر بیعت کی) پھر اپنے دونوں بیٹوں جن کا نام صفوان اور سعد تھا حکم دیا کہ علی کی صف میں جا کر شریک ہو جاؤ حضرت حذیفہ کا سات دن بعد انتقال ہو گیا اور دونوں صاحبزادے بھی حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی رفاقت میں شہید ہو گئے۔ (المسعودی ص ۲۱۵ ج ۲)

پڑھیے اور دیکھئے اس بوکھلا دینے والے ماحول میں بھی مرتضٰی علیہ السلام نے کتنے ٹھنڈے دماغ سے ہر موقعہ پر اس کے مناسب حاصل رائیں قائم کی ہیں ان پر خود عمل کیا ہے اور جہاں تک آپ کے امکان میں تھا دوسروں سے عمل کرایا ہے۔

خدا جانے لوگ کس طرح سوچتے ہیں میرا حال تو یہ ہے کہ حضرت امام نے جیسے یہ فرمایا کہ اہل بغاوت سے جنگ کے قوانین کی تعلیم حضرت علی ہی نے دی' اسی کے ساتھ میں یہ کہتا ہوں کہ حکومت کے جس نظام کو اسلام نے پیش کیا ہے اس میں شک نہیں کہ خلفاء راشدین میں سے ہر ایک نے اپنے عملی نمونوں سے اس نظام پر عمل کر کے دکھایا ہے لیکن یہ بات کہ اپنے اس نظام کے قائم کرنے پر اسلام کو اتنا اصرار ہے کہ خواہ کچھ بھی ہو جائے مسلمانوں کا خون پانی سے زیادہ ارزاں نظر آنے لگے لیکن ہر قیمت پر اس نظام کے قائم کرنے کی کوشش میں مسلمانوں کو آخر وقت تک منہمک رہنا چاہیے ''اسلامی نظام سیاست'' میں اتنی اہمیت صرف حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے عملی نمونے پیدا کر دی ہے اس راہ میں ادنیٰ سی ادنیٰ چشم پوشی یا مساحت سے اگر وہ کام لیتے تو شاید نتیجہ نکالنے والے بعد کو نتیجہ نکال لینے کا اس کو بہانہ بنا لیتے کہ حکومت کے جس معیار کو خلفاء راشدین نے دنیا میں قائم کر کے دکھایا تھا' تھی تو وہ ایک معیاری حکومت لیکن اس میں ان بزرگوں کی ذاتی نیک نفسیوں کو دخل تھا خواہ مخواہ حکومت کے اسی قالب پر اصرار کرنے کی ضرورت مسلمانوں کو نہیں ہے جیسا کہ ایک بڑا گروہ خواہ زبان سے اس کا اظہار کرتا ہو یا نہ کرتا ہو لیکن دل میں شاید یہی سمجھتا رہا یا ممکن ہے اب بھی سمجھتا ہو لیکن صرف حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا طفیل ہے کہ عمل کر کے انہوں نے جو کچھ دکھایا یا زبان سے جو کچھ فرمایا[1] وہ تو خیر اپنی

---

[1] مطلب یہ ہے کہ اس قسم کی باتیں جو حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی عام زندگی تھی کہ خلیفہ ہونے کے بعد مسلمانوں کے بیت المال میں آپ نے ہمیشہ اپنے لئے اور اپنے اہل وعیال کے لئے اسی قدر لیا جتنا کہ کسی دوسرے مسلمان کو ملتا تھا ایک نصرانی ذمی رعایا کے مقابلہ میں قاضی شریح کے اجلاس میں مقدمہ پیش ہوتا ہے یعنی حضرت علی کی ایک زرہ گم ہو جاتی ہے ایک عیسائی کے پاس ملتی ہے اور آپ دعویٰ دائر کرتے ہیں قاضی حضرت علی سے شہادت کا مطالبہ کرتا ہے آپ فرماتے ہیں کہ گواہ کوئی نہیں ہے لہٰ

جگہ پر ہے اور اس میں ان کی ذات تنہا نہیں ہے لیکن حکومت کے اس نظام کو جو بدلنا چاہتے تھے ان کے مقابلہ میں ہر قسم کی مصلحت اندیشیوں سے بے پروا ہو کر آستینیں

بقیہ قاضی شریح زرہ عیسائی کو دلا دیتے ہیں اور خلیفہ وقت مقدمہ ہار جاتا ہے اگرچہ بعد کو خود عیسائی اس انصاف کو دیکھ کر مسلمان ہو جاتا ہے اور عرض کرتا ہے کہ واقعی یہ زرہ آپ ہی کی ہے فلاں دن بھیڑ میں گر پڑی تھی اور میں نے اٹھالی تھی حضرت اس کے مسلمان ہونے کی خوشی میں زرہ بھی بخش دیتے ہیں اور انعام میں ایک گھوڑا بھی دیتے ہیں ایک دن بازار سے ایک درم کے کھجور خرید کر چادر میں باندھے لئے چلے جاتے ہیں امیر المومنین! مجھے دیجئے لوگ عرض کرتے ہیں لیکن فرماتے ہیں کہ ہر شخص کو اپنے اہل وعیال کا بار خود اٹھانا چاہیے دنیا سے جاتے ہیں تو اس طور پر جاتے ہیں کہ اینٹ پر آپ نے کبھی اینٹ نہیں رکھی، مکان ہی نہیں بنایا صرف ڈھائی سو درم ترکہ میں چھوڑ کر جاتے ہیں اور وہ بھی اس لئے رکھ چھوڑتے تھے کہ اس ایران وعراق وخراسان، ترکستان کے بادشاہ کی بیوی صاحبہ کے لئے ایک خادمہ کے خریدنے کی ضرورت تھی متروکہ سامان میں علاوہ اس ڈھائی سو درم کے ایک قرآن مجید اور ایک تلوار نکلی تھی لوگوں نے جانشین نامزد کرنے پر اصرار کیا قطعاً انکار فرما دیا گیا اور مسلمانوں کی رائے عامہ کے حوالہ فرما دیا ارشاد ہوا کہ رسول اللہ ﷺ نے جیسے اس معاملہ کو مسلمانوں کے سپرد کر دیا میں بھی سپرد کرتا ہوں، ہر جمعہ کو قاعدہ تھا کہ خزانے کو خالی فرما کر دو رکعت نماز اس میں پڑھتے زمین کو گواہ بناتے کہ میں نے لوگوں کے حقوق ان تک پہنچا دیئے اس قسم کی باتوں سے حضرت کی سوانح عمریاں معمور ہیں لیکن خاص بات جس پر آپ کا اصرار اس حد کو پہنچ گیا وہ یہی تھی جسے بار بار اپنے خطبوں میں لوگوں کو جنگ پر آمادہ کرتے ہوئے دہراتے کہ چلو! ان لوگوں سے لڑنے کے لئے جو محض اس بنیاد پر لڑ رہے ہیں تاکہ وہ جبار (ڈکٹیٹر) بن کر لوگوں کے رب بن جائیں، اور اللہ کے بندوں کو اپنا نوکر چاکر بنالیں اور مسلمانوں کے مال کو ایسا موروثی مال بنا دیں جو ان ہی کے خاندان میں گھومتا رہے یہ ترجمہ ہے حضرت والا کے ان عربی الفاظ کا (یکونوا جبارین یتخذ هم الناس اربابا ویتخذون عباد الله خولا وما لهم دولا) لوگ خلیفہ میں اور مسلمانوں میں امتیاز پیدا کرنا چاہتے تھے لیکن آپ اس غیر اسلامی امتیاز کے مخالف تھے حضرت عمر کے صاحبزادے عبید اللہ نے غریب نومسلم ایرانی امیر ہرمزآن کو بلا وجہ مار ڈالا تھا آپ کو قصاص میں ان کے قتل پر اصرار تھا محض اس لئے کہ فاروق اعظم کے صاحبزادے ہیں اسلام کے قانون سے حضرت کا خیال تھا کہ وہ بچ نہیں سکتے اسی طرح حضرت عثمان کے قاتلوں کو محض اس لئے کہ انہوں نے خلیفہ وقت کو قتل کیا وہ بغیر کسی تحقیق کے مطالبہ کرتے تھے کہ جس جس پر وہ شک کریں وہ حوالہ کر دیا جائے آپ نے اس سے انکار کیا آپ کو اس قسم کی جمہوری بقیہ

چڑھائے سر بکف میدان میں کود جاتا اور اس طور پر کود جاتا کہ بولنے والے تو صرف زبان سے بولتے ہیں کہ ہم اپنے نصب العین کے لئے اپنے خون کا آخری قطرہ بھی بہانے

لے غیر اسلامی سیاست سے سخت نفرت تھی جس میں سازش جوڑ توڑ جھوٹ سچ سے کام لیا جاتا تھا مصر کا ملک کسی کو عین حیات جاگیر میں محض اس لئے دینے پر راضی نہیں ہو سکتے تھے کہ وہ میرا ساتھ دے گا حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو مختلف مغالطوں میں مبتلا کر کے لوگوں نے اپنی رفاقت پر آمادہ کیا اور ان کے محترم وجود سے نفع اٹھانے کے لئے بقول حضرت عمار بن یاسر ان لوگوں نے اپنے نبی ﷺ کے ساتھ انصاف نہیں کیا کہ اپنی اپنی بیویوں کو تو اپنے گھروں میں چھپا رکھا اور پیغمبر ﷺ کی زوجہ مطہرہ کو تلواروں کے بیچ میں لا کر کھڑا کر دیا لیکن اپنے اغراض کی تکمیل کے لئے لوگوں نے اسے بہت بڑی سیاسی چال قرار دی گویا اس ذریعہ سے انہوں نے خیال کیا کہ حضرت علی کے خلاف ایسا وزن ڈال دیا گیا ہے کہ اس بوجھ کو وہ برداشت نہیں کر سکتے۔ لیکن بجنسہ یہی موقع حضرت علی کو جب ملتا ہے یعنی عائشہ صدیقہ پر اپنی رائے کی غلطی جب واضح ہو گئی تو صدیقہ نے حضرت علی پر اصرار شروع کیا کہ شام والوں کے مقابلہ میں اپنے ساتھ مجھے تم لے چلو۔ لیکن اس قسم کی سیاست کو آپ ہمیشہ ناپسند کرتے تھے ام المومنین سے باصرار بلیغ آپ نے عرض کیا کہ رسول اللہ جس گھر میں آپ کو چھوڑ کر گئے ہیں پس آپ اسی گھر میں جا کر آرام کیجئے اور ایک بڑی کارگر طاقت سے ناجائز سیاسی نفع حاصل کرنے پر آمادہ نہ ہونے خود اپنی نگرانی میں آپ نے صدیقہ کو بصرہ سے حجاز روانہ فرمایا اس موقعہ پر ایک لطیفہ قابل ذکر یہ ہے کہ عائشہ صدیقہ کو جب آپ روانہ کرنے لگے تو ان کے ساتھ آپ نے ان کے حقیقی بھائی عبدالرحمٰن بن ابی بکر کو کیا تمیں سپاہی مرد اور بیس عورتیں بھی حفاظت و خدمت کے لئے ساتھ روانہ کی گئیں لطیفہ یہ ہے کہ ان عورتوں کو حضرت علی نے یہ حکم دیا کہ عمامے باندھ لیں اور تلوار حمائل کر لیں بظاہر ان کی شکل مردوں کی نظر آتی تھی عورتوں پر قدغن تھا کہ حضرت عائشہ پر یہ کھلنے نہ پائے کہ یہ عورتیں ہیں حسب ہدایت سارے راستہ یہ مردنما عورتیں آپ کی خدمت میں رہیں۔ جب حضرت عائشہ مدینہ پہنچ گئیں لوگ ملنے آئے حالات دریافت کرنے لگے تو حضرت علی کے حسن سلوک کی بہت تعریف کی صرف یہ شکایت کی کہ انہوں نے رفاقت میں چند عورتوں کو میرے ساتھ نہیں کیا اس پر عورتوں نے اپنے آپ کو ظاہر کر دیا۔ لکھا ہے کہ اسی وقت عائشہ صدیقہ سجدے میں چلی گئیں اور سر اٹھا کر فرمانے لگیں کہ اے ابن ابی طالب شرافت کی تم نے حد کر دی (مسعودی) اس قسم کی گندی جمہوری سیاست کے مشورے جب آپ کو دیئے جاتے تو فرماتے ہیں دین کے معاملہ میں مداہنت اور چشم پوشی سے کام نہیں لوں گا۔ میں ریاکاری کی چالیس ہرگز اختیار نہیں کروں گا (مروج) آپ کی اس معصوم اور مقدس خالص دینی سیاست جس کی بنیاد لے

کے لئے تیار ہیں، لیکن جمل صفین میں یہ کر کے دکھا دیا گیا کہ دس پانچ نہیں ہزار ہا ہزار بقول بعض لاکھوں تک نوبت قتل و شہید ہونے والے مسلمانوں کی پہنچی چلی جاتی تھی

لہ صرف صداقت اور ریاست بازی عدل و انصاف پر قائم تھی اس نے لوگوں کو غلط امیدوں کے قائم کرنے سے مایوس کر دیا ایک طرف بات بات پر جاگیریں مل رہی تھیں مسلمانوں کے بیت المال کا منہ کھول دیا گیا تھا اور دوسری طرف یہ حال تھا کہ حضرت کے سگے بھائی عقیل بن ابی طالب حق سے کچھ زیادہ کا مطالبہ کرتے ہیں آپ صاف انکار کر دیتے ہیں وہ اسی بنیاد پر شام والوں کی فوج میں شریک ہو جاتے ہیں آج بھی شاید کہنے والے کہتے ہیں لیکن یہ پرانی بات ہے کہ علی کو سیاست نہیں آتی ہے خود ہی فرمایا کرتے تھے کہ قریش کہتے ہیں کہ ابو طالب کا بیٹا بہادر تو بہت بڑا لیکن جنگ اور مقابلہ میں جن چالوں کی ضرورت ہے ان سے ناواقف ہے، اس کے بعد ارشاد ہوتا کہ جنگ اور اس کے طور طریقے سے میں ناواقف ہوں کیا بتایا جائے میں تیس سال کا بھی نہیں ہوا تھا جب جنگی مہارت میں سر بلند ہو چکا تھا اور اب تو ساٹھ سے متجاوز ہوں، اس وقت کہا جاتا ہے کہ میں ان باتوں کو نہیں سمجھتا جو پتے کی بات تھی آخر میں وہ بھی کہہ دیتے کہ اصل بات یہ ہے لا رای لا یطاع یعلی جس کی بات نہ مانی جائے کہ وہ یوں ہی بے رائے والا بنا کر چھوڑ دیا جاتا ہے، ناجائز توقعات سے مایوسی نے اس حال کو پیدا کر دیا تھا کہ جہاں ان کے پورے ہونے کی امید تھی لوگ ادھر کھنچے چلے جاتے تھے اور جہاں سمجھا جاتا کہ سگے بھائی کی بھی پروا نہیں کی جاتی وہاں لوگ کب تک ٹھہر سکتے تھے لیکن علی کیا علی باقی رہتے اگر اپنے غلط مشیروں کے مشورہ کو مان لیتے کامیابی اور ناکامی کا مطلب جو عوام کے نزدیک ہے خواص خواص ہی کب باقی رہتے اگر ان کے نزدیک بھی کامیابی و ناکامی کا وہی عامیانہ معیار ہوتا بنی امیہ کی اسی تر اسی سال کی کامیابی کیا کوئی کامیابی ہے اور بیچارے حضرت امیر معاویہؓ کی ایک پشت بھی صحیح معنوں میں اس کامیابی سے مستفید نہ ہو سکی جس کا لوگوں نے کامیابی نام رکھ چھوڑا ہے اگرچہ اس کتاب کے موضوع سے شاید یہ چند باتیں جو ہم نے بطور نوٹ کے بڑھا دی ہیں زائد نظر آئیں لیکن دراصل امام ابو حنیفہ کے اس سیاسی مسلک کی تشریح کے لئے مفید ہوں گی جو ابراہیم بن عبداللہ بن حسن الفاطمی الامام کی رفاقت و نصرت کے سلسلے میں انہوں نے اختیار فرمایا تھا اور آج تک محدثین کا وہی ''طبقہ حشویہ'' یہ الزام لگا رہا ہے کہ مسلمانوں کے درمیان تلوار نکالنے کے وہ فتویٰ دیا کرتے تھے نیز اس زمانہ میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے خلاف ان لوگوں میں کچھ بدگمانیاں پھیلی ہوتی ہیں جن کا کمزور دماغ اسلام اور مسلمانوں کے درمیان امتیاز پیدا کرنے سے عاجز ہے ان کے نزدیک مسلمانوں کے ٹیکس دہندوں کی تعداد کا اضافہ بھی اسلام کی ترقی ہے شاید ان کی سمجھ میں کوئی بات آ جائے۔۱۲

کشتوں کے واقعی پشتے لگتے چلے جاتے تھے مسلمانوں کی لاشوں کا پہاڑ جمع ہوتا چلا جارہا تھا لیکن یہ حد تھی کسی نصب العین پر اصرار کی کہ کسی قسم کا کوئی حادثہ یا کوئی مصلحت ان کو بال برابر بھی اس سے نہ ہٹا سکی، میں نہیں جانتا کہ کسی نصب العین کے حصول کی کوشش میں ان کی نظیر انسانیت کی تاریخ پیش کرسکتی ہے؟ سب کچھ اسی راہ میں لٹا دیا گیا بلکہ کربلاء کے میدان میں تو اسی نصب العین کے پیچھے علی کے گھرانے کا ایک ایک بچہ قربان ہوگیا اور اب سمجھ آتی ہے اہمیت اس سیاسی نظام کی جسے "اسلام" نے دنیا میں پیش کیا ہے لوگوں نے اس پر بعد کو عمل کیا یا نہیں، یہ الگ سوال ہے، لیکن جمل وصفین وکربلا کے خون سے جریدہ روزگار پر جس نہ ختم ہونے والے اسرار کا نقش دوام قائم ہوگیا ہے کیا اس کو کوئی مٹا سکتا ہے اور جب تک یہ نقش قائم ہے اسلامی نظام سیاست کی اہمیت بہرحال دنیا میں قائم رہے گی۔

اسلامی نظام حکومت قائم کرنے کے لیے حضرت امام کا جوش وخروش

شاید اپنے موضوع بحث سے تھوڑی دیر کے لئے مجھے الگ ہونا پڑا بحث ۱۴۵ء ہجری کے واقعات پر ہو رہی تھی جب مدینہ منورہ کو مرکز بنا کر ساری اسلامی دنیا میں عباسی حکومت کے تخت اقتدار کو الٹ دینے کی اسکیم "محمد نفس زکیہ" کی قیادت میں مکمل ہو چکی تھی اور اسی لائحہ عمل کے بالکل مطابق ہر صوبہ میں تلواریں سونت سونت کر لوگ نکل پڑے تھے عرض کر رہا تھا کہ اسی سلسلہ میں نفس زکیہ کے بھائی ابراہیم بن عبداللہ بن حسن بصرہ سے فوج لے کر کوفہ کی طرف چل پڑے تھے جہاں عباسیوں کا خلیفہ ابوجعفر منصور میلے کچیلے کپڑوں میں اس عزم کے ساتھ اپنے مصلے پر بیٹھ گیا تھا کہ یا ابراہیم کا سر میرے قدموں پر لا کر ڈالا جائے یا میرا سر ابراہیم کے پاس تحفے میں پیش کیا جائے، امام ابوحنیفہ ابراہیم کی طرف سے علانیہ کوفہ میں کام کر رہے تھے۔ بات یہاں تک پہنچی تھی کہ الفزاری محدث کے بھائی کو عباسیوں سے توڑ کر ابراہیم کی فوج میں شریک ہو جانے پر امام ابو حنیفہ نے راضی کرلیا تھا اور اسی وجہ سے ان کو شہید ہونا پڑا درمیان میں ایک ایسا مسئلہ چھڑ گیا کہ ۱۴۵ھ سے سو سال پیچھے ہٹ کر اسی بصرہ اور کوفہ کے اردگرد جمل وصفین کے جو

ہولناک خونین مناظر دیکھے گئے تھے ان کے مباحث میں الجھنا پڑا کیونکہ گو بظاہر دونوں واقعے میں ایک صدی کا فاصلہ ہے مگر سچ پوچھئے تو مسئلہ آج بھی وہی ہے جو کل تھا ایک طرف مسلمانوں کا ایک گروہ تھا جس کے سامنے صرف ٹیکس دہندوں کی تعداد کا اضافہ بھی اسلام کی بھی اور مسلمانوں کی بھی سب سے بڑی خدمت تھی۔ لیکن دوسری طرف علی اور علی کے مسلک پر اصرار کرنے والوں کی جماعت تھی جو محمد رسول اللہ ﷺ کے قائم کئے ہوئے نظام کو بہر حال قائم کرنے پر آمادہ ہوتی ہے خواہ اس کی جو قیمت بھی ادا کرنی پڑے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اپنی زندگی کا آخری مغتنم موقعہ قرار دے کر امام ابوحنیفہ نے سردھڑ کی بازی لگا دی ہے اسی کوفہ میں عباسیوں کا دم بکنے الاثیر جسے لوگ صقر اخوذی (عقاب چالاک) کہتے تھے۔ ہر اس شخص کو اچک لینے کے لئے منڈلا رہا ہے جس کے متعلق ہلکا سا بھی شبہ مخالفت کا محسوس کرتا ہے' لیکن آپ دیکھ رہے ہیں کہ "جبارا شدیداً" کی شکل میں امام ابوحنیفہ ہر اس شخص کو ابرہیم کی رفاقت پر آمادہ کر رہے ہیں جس پر ان کا بس چل رہا ہے نہ صرف پچاس پچاس حج (نفلی) کے ثواب ہی پر بلکہ جہاد جو کافروں سے کیا جاتا ہے اس پر بھی ان لوگوں کی جانی و مالی امداد کو ترجیح دینے کا فتویٰ دے رہے ہیں جو مسلمانوں میں پھر حکومت کے اسی نظام کو قائم کرنے کے لئے کھڑے ہوئے ہیں' جس پر اللہ کی کتاب اور رسول کے راشد جانشینوں نے قائم کر کے دکھایا تھا۔

امام کے شاگردوں کو پھانسی کا یقین

اس راہ میں امام کا جوش و خروش شدت کے جس انتہائی نقطہ تک پہنچ گیا تھا اس کا اندازہ اسی سے کیجئے کہ نہ صرف امام اور امام کے اہل و عیال کے لئے ہر لمحہ اس کا خطرہ تھا کہ حکومت کے عتاب کی آگ میں جھونک دیئے جائیں گے' بلکہ امام کے مشہور شاگرد رشید زفر بن ہذیل کے بیان سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ امام کی مجلس وضع قوانین کے ارکان کہیے یا حلقہ درس کے تلامذہ ان کو سمجھئے بہر حال ہر وہ شخص جو امام کے ساتھ تعلیمی تعلق رکھتا تھا' اس کی زندگی خطرے میں آ گئی تھی اور کیسا خطرہ؟ امام زفر کا بیان ہے کہ ان حالات کو

دیکھ کر امام کے سامنے عرض کیا گیا کہ:

جب تک ہم لوگوں کی گردنوں میں پھانسی کی رسیاں نہ ڈالی جائیں گی آپ باز نہ آئیں گے۔	ما انت بمنته حتی توضع الجبال فی اعناقنا(ص ۱۷۱)

جس کے معنی یہی ہوئے کہ امام کا ہر شاگرد یا ان کی مجلس مقننہ کا ہر رکن یہ محسوس کر رہا تھا کہ آج نہیں تو کل ہمارے گلوں میں پھانسی کی رسی ڈالی جائے گی جہاں تک معلوم ہوتا ہے ہر قسم کے عواقب اور نتائج سے امام قطعاً بے پروا ہو کر آگ کی اس وادی میں پھاند چکے تھے طے کر چکے تھے کہ ؎

موج خاں سر سے گذر ہی کیوں نہ جائے
آستان یار سے اٹھ جائیں کیا

اس قسم کی کوئی چیز ان کو اپنے ارادے سے روک نہ سکی ہر آنے والے دن میں آپ کی سرگرمیاں گذرنے والے دن کی کوششوں سے تیز سے تیز تر ہوتی چلی جاتی تھیں اسی کا نتیجہ تھا کہ ان تلواروں کے سوا جو کوفہ میں وقت کا انتظار نیاموں سے نکلنے کے لئے کر رہی تھیں سب سے بڑا انقلابی کارنامہ اس راہ میں امام کا وہ ہے جس کا ذکر گو ان کے سوانح نگاروں میں سے اکثر نے کیا ہے۔ لیکن اس کی اہمیت کا اندازہ اس کے اجمالی بیان سے پڑھنے والوں کو نہیں ہو سکتا!

امام کی کامیابی

بنی امیہ اور بنی عباس کی باہمی آویزشوں کے قصے میں اگرچہ بہ ظاہر ابو مسلم اصفہانی کا نام سب سے زیادہ نمایاں ہے میں نے بھی اس سلسلے میں جو کچھ لکھا ہے اس میں بھی اس وقت تک ابو مسلم ہی کی اہمیت ظاہر کی گئی تھی۔ لیکن عباسیوں کی کامیابی میں سچ پوچھئے تو ابو مسلم کی حیثیت صرف دماغ کی تھی' وقت پر سوجھ جانے والی چالوں کر و دہاء کی حد تک یقیناً ابو مسلم نے بڑے بڑے کام انجام دیئے تھے۔ لیکن عباسی تحریک کو آگے بڑھانے میں جس فولادی ہاتھ نے کام کیا تھا عوام اس سے بہت کم واقف ہیں۔

عباسیوں کا پہلا جنرل قحطبہ

قبیلہ بنی طے حاتم طائی مشہور جواد جس سے تعلق رکھتا ہے سارے عرب میں اپنی شجاعت اور بہادری بے جگری میں مشہور تھا عرب کے مشہور ڈاکوؤں کا زیادہ تر تعلق اس قبیلے سے تھا۔ سارا عرب ان کے نام سے کانپتا تھا اجاء اور سلمی کے سرسبز پہاڑوں کی فلک پیما چوٹیاں ان ڈاکوؤں کی پناہ گاہیں تھیں ایام جاہلیت کی تاریخ ان کے خونیں کارناموں کے ذکر سے لبریز ہے عباسیوں کی یہ خوش قسمتی تھی کہ ٹھیک اس وقت جب ان کی تحریک اس منزل پر پہنچ گئی۔ جہاں سے فوجی تنظیم کے مواقع ان کے لئے فراہم ہوئے تو اسی طے کے قبیلہ کا ایک بوڑھا تجربہ کار سرد وگرم چشیدہ سپہ سالار جس کا نام قحطبہ تھا وہ عباسیوں کی بیعت میں داخل ہو گیا اور پہلی دفعہ جب ابومسلم باضابطہ عسکری تنظیم کے ساتھ بنی امیہ کے مقابلہ میں صف آرائی کے لئے چلا ہے تو وہ اسی دن عباسیوں کے امام ابراہیم[1] کے حکم سے اسی کو عباسی فوج کا کمانڈر مقرر کیا گیا عباسی امام نے خاص اپنے ہاتھ سے عباسی لوا کر باندھ کر قحطبہ کے حوالہ کیا تھا بالاتفاق تمام مورخین نے لکھا ہے کہ ابومسلم نے قحطبہ ہی کو سپہ سالار اعظم مقرر کیا اور

ضم الیه الجیوش وجعل الیه العزل والاستعمال وکتب الی الجنود بالسمع والطاعة (ص ۱۴۴ کامل ج ۵)	سارے عباسی عساکر کو اسی کا ماتحت بنا دیا۔ اسی کے ہاتھ میں سپاہیوں کے تقرر و برطرفی کو سپرد کر دیا اور جہاں جہاں فوجیں تھیں ان کے نام یہ لکھ بھیجا کہ قحطبہ کے حکم کی بسرو چشم تعمیل کریں۔

---

[1] یہی ابراہیم ہیں جن کے ہاتھ پر ابومسلم نے بیعت کی اور ان ہی کے اشارے سے خراسان کی زمین عباسیوں کے لئے تیار کی لیکن افسوس ہے کہ خود ابراہیم عباسیوں کی کامیابیوں سے پہلے گرفتار کر لئے گئے اور بنی امیہ کے آخری خلیفہ مروان ہی کے قید میں وفات ہوئی بعض لوگ کہتے ہیں کہ زہر دیا گیا اور بعض کہتے ہیں کہ مکان کو ان پر گرا دیا گیا۔ لکھا ہے کہ بڑے متقی پارسا اور جواد وکریم تھے اہل بیت کے ساتھ بہت سلوک کرتے تھے زید شہید کے کم سن صاحبزادے جن کا نام حسینؒ تھا ان کے پاس لائے گئے تو گود میں اٹھا کر دیر تک روتے رہے اور دے کر ان کی والدہ کے پاس واپس کیا۔

اس کے بعد عباسیوں اور بنی امیہ میں جتنے بھی معرکے ہوئے ہیں تاریخ اٹھا کر پڑھیے ہر جگہ قحطبہ ہی آپ کو پیش پیش نظر آئے گا واقعہ تو یہ ہے کہ ابو مسلم کا دماغ اور قحطبہ کے دست و بازو ان ہی دو چیزوں پر عالم اسباب کے لحاظ سے عباسی حکومت کی بنیاد قائم ہے' مرد نیشا پور جرجان رے اصفہان' نہاوند' شہرزور الغرض جہاں جہاں عباسیوں اور امویوں کے گھمسان کے رن سرزمین خراسان میں پڑے سب کا فاتح یہی قحطبہ تھا آخر میں ابن ہبیرہ کے مقابلہ کے لئے جب عراق آیا تو اس بوڑھے سپہ سالار کی عباسیوں کے ساتھ آخری وفاداری اس شکل میں ظاہر ہوئی کہ یہ مقام واسط فرات کے ایک مسناۃ (بند) پر رات کی تاریکی میں جب ایک کاری زخم کھا کر وہ دریا میں گر پڑا اور لوگوں نے اس کو پانی سے نکالا تو اس نے لوگوں سے کہا کہ میرے زخمی ہونے کی خبر نہ پھیلائی جائے بلکہ میرے دونوں ہاتھوں کو ملا کر باندھ دو دیکھو اگر میں اس زخم سے جان بر نہ ہو سکا تو خاموشی کے ساتھ میری لاش کو اسی دریا میں بہا دینا تا کہ لوگوں کو میری موت کا علم نہ ہو سکے اس کا اندیشہ تھا کہ اس کے قتل ہو جانے کی خبر سن کر فوج میں کہیں بزدلی اور ابتری نہ پھیل جائے مدت اس کی پوری ہو چکی تھی تھوڑی دیر میں صبح ہونے سے پہلے قحطبہ مر گیا خاموشی کے ساتھ اس کی لاش بہا دی گئی صبح کو لوگوں نے جب قحطبہ کو نہ پایا تو دوپہر تک سمجھتے رہے کہ شاید کسی ضرورت سے کہیں گے ہوں گے' بعد کو بے چارے کی بہتی ہوئی لاش کسی نالے میں ملی دنیا کو آج تک پتہ نہ چلا کہ قحطبہ کس وقت قتل ہوا اور کس نے اس کو مارا طرح طرح کے افسانے لوگوں میں مشہور ہوئے جن کا ذکر اس وقت تک تاریخ کی کتابوں میں کیا جاتا ہے[1] ایک بڑے نازک موقعہ پر عباسیوں کی فوج کے اخلاقی شیرازے کو منتشر اور پراگندہ ہونے سے اس نے بچا لیا۔

---

[1] چونکہ اس کی لاش کے ساتھ بنی امیہ کی فوج کے ایک سپاہی حرب بن مسلم کی بھی لاش ملی تھی اس لئے بعضوں نے رائے قائم کی کہ باہم ایک نے دوسرے کو قتل کیا کوئی کچھ کوئی کچھ کہتا تھا ایک صاحب نے جو پہلے بنی امیہ کے ساتھیوں میں تھے بعد میں عباسیوں میں مل گئے تھے ابراہیم بن بسام نام تھا جب مرنے لگے تب یہ لطیفہ بیان کر کے مرے کہ رات کی تاریکی میں فرات سے دیکھا کہ قحطبہ ۔۔۔

عباسیوں کا دوسرا جنرل حسن بن قحطبہ

بہر حال مجھے کہنا یہ ہے کہ عباسیوں کے اسی بوڑھے جنرل کی وفات کے بعد خود اس کی وصیت کے مطابق اور فوج کے اتفاق سے عباسی جیوش کا سپہ سالار اعظم اس کا بیٹا حسن بن قحطبہ مقرر ہوا طبری میں ہے کہ جب لوگوں کو قحطبہ کے غرق ہو جانے کا یقین ہو گیا تب اجمع القواد علی الحسن بن قحطبه فولوه الامر وبايعوه (ص ۱۲۰) یعنی فوج تمام افسروں نے بالاتفاق قحطبہ کے بیٹے حسن کو اپنا سپہ سالار بنالیا اسی کے سپرد فوج کا معاملہ کر دیا اور اس کے ہاتھ پر بیعت کی۔

اور اس کے بعد عباسیوں کی ساری فوجی مہموں میں بجائے قحطبہ کے اس کے بیٹے حسن بن قحطبہ ہی کا نام نمایاں نظر آتا ہے اپنے باپ کے بعد عباسی فوج کی کمان حسن ہی کے ہاتھ میں تھی اور وہی ان کا سب سے بڑا جنرل تھا' نہیں کہا جا سکتا کہ امام ابوحنیفہ کی نظر حسن بن قحطبہ پر کب سے تھی جہاں تک واقعات سے معلوم ہوتا ہے امام اور حسن بن قحطبہ میں تعلقات کی ابتداء اس وقت سے ہوئی جب ابوجعفر منصور امام کے ساتھ "دہن دوزی" کی کوششوں میں مصروف تھا اس قصہ کے سلسلہ میں امام کے سوانح نگاروں نے یہ بیان کیا ہے کہ دس ہزار کی رقم ایک دفعہ امام کی خدمت میں ابوجعفر منصور نے اسی حسن بن قحطبہ کی معرفت بھیجی کہتے ہیں کہ خود حسن اپنے ساتھ روپے کے توڑوں کو لئے ہوئے پہنچا امام یہ دیکھ کر کچھ اتنا پریشان ہوئے کہ کوئی بات منہ سے نہیں نکل رہی تھی دوسروں کے ساتھ حسن کے جو تجربات تھے ان کی بنیاد پر اسے یہ عجیب بات نظر آئی کہ بجائے مسرور اور خوش ہونے کے یہ پریشان کیوں ہو رہے ہیں' غالباً امام ابوحنیفہ کی فطرت ان کی سیرت و کردار کی بلندی سے براہ راست متاثر ہونے کا حسن بن قحطبہ کے لئے پہلا

بقیہ گھوڑے کو مجبور کراتے ہوئے باہر نکل رہا ہے میں وہیں چھپا ہوا تھا پرانی عداوت میرے دل میں جو اس کی تھی اسی نے انتقام پر ابھارا اور میں نے اچانک اس کا خاتمہ کر دیا اور بھی بہت سے قصے بیان کئے گئے ہیں جس سے اس شخص کی اہمیت معلوم ہوتی ہے۔

موقعہ یہی تھا[1] بہ ظاہر حسن کی آمد و رفت امام کے پاس اسی کے بعد شروع ہوگئی تھی کیونکہ بعد کو جب ابوجعفر منصور نے حسن کے حالات کی تحقیق کے لئے ان الفاظ کے ساتھ لوگوں کو حکم دیا۔

من هذ الذی یفسد علینا هذالرجل.(ص ۱۸۴ ج۲ موفق) کون ہے جو اس آدمی (حسن) کو ہم سے بگاڑ رہا ہے۔

تو کہا جاتا ہے کہ رپورٹ کرنے والوں نے ابوجعفر کے پاس یہ رپورٹ کی کہ:

انه یدخل علی ابی حنیفة.(ص ۱۸۴ ج۲ موفق) اس کی آمد و رفت امام ابوحنیفہ کے پاس ہے۔

نہیں کہا جا سکتا کہ امام اور حسن بن قحطبہ کے درمیان آمد و رفت کا سلسلہ کتنے دن سے جاری تھا لیکن قحطبہ کے دوسرے بیٹے حمید نے منصور کو حسن کے متعلق یہ خبر دیتے ہوئے کہ اس میں کب سے تغیر اور انقلاب کو محسوس کر رہا ہے' کہا تھا کہ:

''امیر المومنین! تقریباً ایک سال سے ہم لوگ اس شخص کی چال وچلن میں تغیر کو پا رہے ہیں اور اسی زمانے سے یہ اندیشہ پیدا ہو چلا تھا کہ غیروں سے پینگ بڑھا رہا ہے۔(ص۱۸۴موفق)

حسن بن قحطبہ حضرت امام کی خدمت میں

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ابراہیم بن عبداللہ کی تحریک جب بصرہ اور کوفہ میں اندر ہی اندر کام کر رہی تھی اسی زمانے سے امام ابوحنیفہ عباسیوں کی فوج کے اس

---

[1] امام ابوحنیفہ کے صاحبزادے قاضی حماد بن ابی حنیفہ کے حوالہ سے کتابوں میں یہ روایت نقل کی گئی ہے کہ امام ابوحنیفہ کی وفات کے بعد حسن بن قحطبہ نے ان سے کہا کہ رحم اللہ اباک لقد شح علی دینه وجل بدالنفس اقوام ص ۲۲۱ ج ا موفق بڑا بلیغ فقرہ ہے جس کا ترجمہ یہ ہے کہ تمہارے والد نے خدا ان پر رحم کرے اپنے دین کے معاملہ سخت تنگ دلی اور نجالت سے کام لیا جب کہ دوسرے بڑی دریا دلی اور سخاوت اسی دین کے ساتھ اختیار کئے ہوئے تھے۔

روح رواں کو توڑ لینے کی کوشش میں مصروف تھے بات کوئی معمولی نہ تھی عباسیوں کے سب سے بڑے جنرل کا معاملہ تھا عباسی فوج سے حسن کی علیحدگی صرف حسن کی علیحدگی نہ تھی بلکہ ان سب کی علیحدگی پر منتج ہونے والی تھی جو حسن کے زیر اثر تھے۔ یوں سمجھنا چاہیے کہ عباسیوں کی عسکری قوت کی کمر پر امام کی طرف سے کاری ضرب لگانے کا یہ اقدام تھا جس کے باپ کے دست و بازو نے عباسی حکومت قائم تھی اسی کے خلیفہ اور جانشین سپہ سالار کو ملا لینا آسان بھی نہ تھا ساری عزت و جاہ دولت و ثروت قحطبہ کے خاندان کی اسی ملازمت پر مبنی تھی سب کو لات مار کر حکومت سے حسن کا علیحدہ ہو جانا بڑی قربانیوں کا مطالبہ کر رہا تھا' نہیں کہا جا سکتا تھا کہ سال بھر کی مسلسل جدو جہد کے اس سلسلے میں حسن کو امام نے کیا کیا سمجھایا اور کن کن ترکیبوں سے اس کو متاثر کرتے رہے' یہی نہیں کہ صرف منافع سے محرومی کے خطرات حسن کے سامنے تھے بلکہ معاملہ ابوجعفر منصور کے ساتھ تھا اسی ابوجعفر کے ساتھ جس نے ابھی ابھی کچھ دن پہلے اپنی حکومت کے سب سے بڑے محسن ابومسلم کے ختم کر دینے میں کسی قسم کی رو رعایت کو روا نہ رکھا تھا یقیناً جس نازک عہدے سے حسن کا تعلق تھا عین وقت پر اس عہدے کی ذمہ داریوں سے اچانک دست برداری کا اعلان جن عواقب کو اس کے سامنے لا سکتا تھا وہ حسن سے مخفی نہ تھے لیکن میں تو اس کی امام کی کرامت سمجھتا ہوں اور اگر کرامت نہ سمجھی جائے تو ایک بے نظیر سیاسی کامیابی ان کی یہ قرار پا سکتی ہے کہ عباسیوں کا یہی سب سے بڑا سپہ سالار امام کے پاس آتا ہے اور جیسا کہ حنفی مکتب خیال کے سب سے بڑے بخاری امام ابوحفص کبیر سے یہ روایت نقل کی جاتی ہے کہ آنے کے بعد حسن امام ابوحنیفہ سے عرض کرتا ہے میرے حالات جیسے کچھ بھی ہیں مگر آپ سے میں صرف یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ واقعی اگر اب بھی میں توبہ کر لوں تو میری توبہ قبول ہو سکتی ہے؟

حسن بن قحطبہ کے سامنے حضرت امام کی تقریر

امام نے اثبات میں جواب دیتے ہوئے حسن سے یہ تقریر کی کہ:

''اگر تم واقعی خدا کے سامنے اپنی نیت کو درست کرلو اور ارادے میں اپنے صادق اور راست باز بن کر گذشتہ کرتوتوں پر اپنے اندر ندامت کے جذبات کو اس حد تک ابھارو کہ تم پر یہ حال طاری ہو جائے کہ ان دو باتوں میں سے کسی ایک بات کا اگر تمہیں اختیار دیا جائے یعنی کہا جائے کہ یا تو کسی مسلمان (جسے حکومت حکم دے) قتل کرو یا خود قتل ہونے کے لئے تیار ہو جاؤ تو اپنے آپ کو قتل کرانے پر تم آمادہ ہو جاؤ گے اور خدا کے سامنے تم عہد کرو کہ اب تک تم جو کچھ بھی کرتے رہو اس کا پھر اعادہ زندگی کے آخری لمحات تک نہیں کرو گے۔''

امام نے فرمایا کہ:

''تمہارا یہی عزم اور یہی ارادہ تمہاری توبہ ہے۔''

حسن بن قحطبہ کا امام کے سامنے عہد

کہتے ہیں کہ امام کے الفاظ کو حسن غور سے سنتا رہا اور جواب میں بغیر کسی تردد اور کش مکش کے قد فعلت (میں نے یہ کرلیا) کا سپاہیانہ جواب دے کر آخر میں اس نے امام سے کہا کہ:

''میں نے خدا سے عہد کرلیا کہ مسلمانوں کے قتل کا جو کام میں اب تک (حکومت کے اشارے سے) کرتا رہا ہوں اب اس کی طرف کبھی نہ پلٹوں گا۔ (ص ۱۸۳ ج ۲ موفق)

حالانکہ حسن امام کے سامنے اس توبہ کے اعلان کے بعد تقریباً پینتیس چھتیس سال تک زندہ رہا' ہارون الرشید کے عہد حکومت میں جیسا کہ خطیبؒ نے لکھا ہے

چوراسی سال کی عمر میں وفات ہوئی مگر جو کچھ اس نے کہا تھا اس کو پورا کیا آزمائش کی گھڑی بہت جلد اس کے سامنے آ گئی' یعنی وہی تحریک جو اب تک مخفی طور پر ملک کے گوشوں میں چلائی جا رہی تھی سطح پر نمایاں ہو گئی مدینہ منورہ سے محمد نفس زکیہ کے خروج کی خبر منصور تک پہنچی اور اسی کے کچھ دن بعد خود اس کے سامنے بصرہ سے ابراہیم نے سر نکالا جیسا کہ چاہیے تھا حسن منصور کے دربار میں بلایا جاتا ہے ابو حفص کبیر کا بیان ہے حسن قبل دربار کی حاضری کے امام کی خدمت میں حاضر ہوا اور جو واقعہ تھا اس سے مطلع کیا' امام نے فرمایا کہ:

''حسن! تمہاری توبہ کے امتحان کا وقت آ گیا' تم نے خدا سے جو عہد کیا ہے اگر اس عہد کو تم پورا کرتے ہو تو مجھے امید ہے کہ خدا تمہاری توبہ قبول فرمائے گا اور اگر اپنی بات سے تم پھرتے ہو تو جو کچھ تم نے اب تک کیا ہے اس کی سزا بھی بھگتو گے اور آئندہ جو کچھ کرو گے اس کی بھی۔''

امام سے یہ سن کر حسن نے کہا کہ:

''میں خدا کو گواہ کرتا ہوں کہ آپ سے جو عہد میں نے کیا ہے اسے پورا کروں گا۔''

اور یہ طے کر کے خلیفہ کے دربار سے زندہ واپس نہ ہو گا امام صاحب کو بعض باتوں کی وصیت کر کے منصور کے سامنے حاضر ہوا اور جو خدمت اس کے سپرد کی گئی تھی اس سے معافی چاہتے ہوئے شاید بیماری اور خرابی صحت کا اس نے عذر پیش کیا' لیکن منصور نے اس پر اصرار شروع کیا کہ مقابلہ پر تجھے جانا پڑے گا' معلوم نہیں اور کیا کیا باتیں ہوئیں آخری الفاظ اس کے یہ نقل کئے جاتے ہیں کہ وہ منصور سے کہہ رہا تھا۔

''امیر المومنین! جس مہم پر آپ مجھے روانہ کرنا چاہتے ہیں میں آخری طور پر عرض کرتا ہوں کہ بندہ قطعاً اس کی شرکت سے معذور ہے اب تک جن لوگوں کو آپ کی حکومت کے تحت میں قتل کر چکا ہوں' آپ کی یہ اطاعت خدا

کے لئے میں نے کی ہے تو اس راہ میں بہت کچھ کہا چکا اور لوگوں کو قتل کر کے میں نے خدا کی اگر نافرمانی کی ہے تو گناہ اور نافرمانی کا بھی یہ ذخیرہ میرے لئے کافی ہے۔ (ص ۱۸۴)

ابو جعفر حسن کی باتیں سن رہا تھا اور آگ بگولا ہو رہا تھا کس نے میرے اتنے بڑے موروثی وفادار جنرل کو بہکا دیا اندر ہی اندر پیچ تاب کھاتے ہوئے اس کو سوچ رہا تھا دربار میں حسن کا بھائی حمید بھی بیٹھا تھا اس حال کو دیکھ کر وہ کھڑا ہو گیا اور وہی بات جس کا پہلے بھی ذکر کر چکا ہوں خلیفہ سے کہنے لگا یعنی سال بھر سے اس شخص کے اندر ہم لوگ تغیر کو محسوس کر رہے ہیں اور اسی وقت سے ہمیں اندیشہ پیدا ہو چلا تھا کہ غیروں سے یہ میل ملاپ رکھتا ہے اور اپنی پینگیں بڑھا رہا ہے۔

حضرت محمد نفس زکیہ اور ان کے بھائی ابراہیم کی شہادت

افسوس ہے کہ ہماری سیاسی تاریخیں اتنے بڑے اہم واقعہ کے ذکر سے خاموش ہیں سچ پوچھئے کہ تاریخ کی ان عام کتابوں مثلاً طبری کامل ابن اثیر وغیرہ کا اس واقعہ کے ذکر سے خالی ہونا بجائے خود واقعہ کو ایک حد تک مشتبہ بنا دیتا ہے لیکن جب یہ دیکھا جاتا ہے کہ محمد نفس زکیہ اور ابراہیم کے خروج سے پہلے قحطبہ کی موت کے بعد تقریباً عباسیوں کی ہر فوجی مہم میں حسن بن قحطبہ پیش پیش ہے لیکن ٹھیک خروج کے اس واقعہ سے اچانک حسن کا نام تاریخوں میں غائب ہو جاتا ہے اور بجائے اس کے اب ہم قحطبہ کے اسی دوسرے بیٹے حمید کے ہاتھ میں عموماً عباسی عساکر کی کمان پاتے ہیں۔ محمد نفس زکیہ کے مقابلہ میں جو فوج ابو جعفر نے اپنے بھتیجے عیسیٰ بن موسیٰ کی سرکردگی میں مدینہ منورہ پر چڑھائی کرنے کے لئے بھیجی اس میں بھی فوج کی کمان حمید ہی کے ہاتھ میں دیکھی جاتی ہے اسی بدبخت نے محمد کے سینے میں نیزہ بھونک دیا' اور جب وہ گر گئے تو گھوڑے سے اتر کر اسی نے ان کے مبارک سر کو تن سے جدا کر

کے عیسیٰ کی خدمت میں بطور تحفہ کے پیش کیا[1] اور عیسیٰ نے کوفہ منصور کو ہدیہ کے طور پر بھیج دیا نیزے پر رکھ کر کوفہ کے بازاروں میں اس کی نمائش کی گئی، اور مدینہ کی مہم سے فارغ ہونے کے بعد منصور کی طلبی پر عیسیٰ بن موسیٰ حمید اور جو فوج اس کے زیر کمان تھی سب کو لے دے کر پھر کوفہ واپس لوٹا ابراہیم بن عبداللہ بن حسن بصرہ سے چل کر جب کوفہ پر حملے کرنے کے لئے روانہ ہوئے تو ان کے مقابلہ میں بھی یہی حمید بن قحطبہ عیسیٰ بن موسیٰ کی ماتحتی میں بھیجا گیا باخمرا کے میدان میں جو کوفہ سے کل (۴۸ میل) کے فاصلہ پر تھا۔ حمید اور حضرت ابراہیم کی فوج میں مڈبھیڑ ہوئی ابتداء میں حمید کو شکست فاش ہوئی کہتے ہیں کہ حمید اور اس کی فوج کے پاؤں جب اکھڑ گئے تو عیسیٰ بن موسیٰ چلاتا رہا ''اللہ اللہ امیر کی اطاعت'' لیکن حمید بھاگا جاتا تھا اور کہتا جاتا تھا کہ بھگدڑ میں کہاں کی اطاعت لیکن تقدیری حالات جیسا کہ ہمیشہ ان مہموں میں پیش آئے ہیں یہاں یہاں بھی پیش آئے ابراہیم شہید ہو گئے جس کی تفصیل تاریخ کی

---

[1] دراصل محمد نفس زکیہ کو بھی بجز چند سو آدمیوں کے لوگوں نے تنہا چھوڑ دیا اور عیسیٰ پندرہ ہزار سواروں کے ساتھ حملہ آور ہوا تھا خندق جو کھودی گئی تھی عیسیٰ نے بڑے بڑے تختے منگوا کر اس کو پاٹ دیا گھوڑے آسانی سے مدینہ میں داخل ہو گئے لکھا ہے کہ محمد بار بار حمید بن قحطبہ کو پکار پکار کر بلاتے رہے کہ میرے مقابلہ میں تو آ، لیکن وہ کتراتا رہا اس پر عیسیٰ نے کچھ اس پر شبہ کیا کہ اندرونی طور پر شاید یہ بھی ان لوگوں کے ساتھ ہمدردی رکھتا ہے اسی کا عملی جواب اس نے اپنی اس قسادت سے دیا کہتے ہیں کہ جس وقت محمد نفس زکیہ پر ایک کاری ضرب کسی نے لگائی تو گھٹنوں کے بل ٹیک کر تلوار گھمانے لگے اس حالت میں بھی قریب آنے کی جرأت کسی کو نہیں ہوتی تھی۔ دور سے تیروں سے زخمی کئے گئے کہتے جاتے تھے ارے اپنے نبی کی خستہ نزار اولاد کے ساتھ یہ سلوک کر رہے ہو بڑے بہادر تھے جب تک زخمی نہ ہوئے تھے کشتوں کے پشتے لگاتے چلے گئے یہ بھی لوگوں کا بیان ہے کہ اس وقت ان کے ہاتھ میں مشہور تاریخی تلوار ذوالفقار تھی، بعد کو عباسیوں کے قبضہ میں آئی، بعض کہتے ہیں کہ ہادی عباسی خلیفہ نے ایک کتے پر چلا کر آزمانا چاہا اس میں ٹوٹ گئی اور بعض کہتے ہیں کہ یہ غلط ہے ہارون الرشید تک اس کا پتہ چلتا ہے وہ خود بھی اس تلوار کو کبھی کبھی لگایا کرتا تھا اس تلوار کو ذوالفقار کہنے کی یہی وجہ تھی کہ (۱۸) دندانے اس میں بڑے ہوئے تھے۔ (کامل ابن اثیر ص ۲۰۴ ج ۲)

کتابوں میں پڑھنی چاہیے۔[1]

مجھے تو اس سلسلہ میں یہ کہنا ہے کہ حسن بن قحطبہ کے ساتھ اگر وہ واقعہ جس کا امام ابوحنیفہ کے حنفی سوانح نگاروں نے ذکر کیا ہے نہ پیش آتا تو محمد اور ابراہیم دونوں بھائیوں کے مقابلہ میں بجائے حسن کے حمید بن قحطبہ ہی کو ہم کیوں پاتے ہیں۔

افسوس ہے کہ لوگوں نے حسن کی علیحدگی کے اس واقعہ کو اہمیت نہیں دی ورنہ ابو جعفر منصور جو علاوہ ایک غیر معمولی سیاسی مدبر کے بجائے خود بڑا بہادر دلیر جیوٹ والا

---

[1] میں نے کہیں لکھا ہے کہ ابراہیم کی فوج کے دفتر میں ایک لاکھ آدمیوں کا نام لکھا گیا تھا لیکن دشمن کے ساتھ صف آرائی کے وقت دیکھا گیا تو ان کے ساتھ کل چند سو آدمی رہ گئے ہیں اس پر بھی ابتدا میں حمید کو ہزیمت ہوتی یہاں قابل ذکر لطیفہ یہ ہے کہ ابراہیم کے مقابلہ میں جب ابوجعفر عیسیٰ بن موسیٰ کو حمید بن قحطبہ کے ساتھ بھیجنے لگا تو رخصت کرتے ہوئے اس نے کہا کہ یہ ناپاک گندے خبیث لوگ یہ کہتے ہیں کہ شروع میں تمہاری فوج کے پاؤں اکھڑ جائیں گے آخر میں کامیاب تم ہی رہو گے اصلی عربی لفظ "الخبثاء" یا مخبثون" کا ہے جس کے معنی گندے ناپاک کے ہیں مراد نجومی تھے حالانکہ منصور نجومیوں سے بہت کام لیا کرتا تھا لیکن پھر بھی بے چارا مسلمان تھا باوجود فائدہ اٹھانے کے ان لوگوں کو خبیث ہی کہتا تھا کہتے ہیں کہ حضرت ابراہیم کو لوگوں نے مختلف مشورے دیئے' مثلاً شب خون مارنے کے یا عورتوں بچوں پر چھاپا مارنے کے لیکن سب کا انہوں نے انکار کیا عیدالفطر کو تین دن باقی تھے کہ مدینہ سے بھائی کی شہادت کی خبر ملی دل اسی وقت ٹوٹ چکا تھا' عید کی نماز کے بعد کوفہ کی طرف روانہ ہوئے باخمرا میں مقابلہ ہوا گرمی زیادہ تھی قباء کی گھنڈیاں کھول دیں اچانک ایک تیر جس کے چلانے والے کا پتہ نہ چلا' آ کر حلق میں ترازو ہو گیا' خون جاری ہوا گھوڑے کی گردن سے لپٹ گئے کہتے جاتے تھے کان امر اللہ قدرا مقدورا ہم نے کچھ چاہا تھا اور خدا نے کچھ چاہا' لوگوں نے گھوڑے سے اتار لیا مجمع جمع ہو گیا' حمید نے اس حال کو دیکھ کر اسی مجمع پر پل پڑنے کا حکم دیا' لوگ چھوڑ کر بھاگ گئے حمید کے آدمیوں نے حضرت ابراہیم کا سر مبارک تن سے جدا کر کے عیسیٰ کے سامنے تحفے میں پیش کیا وہاں سے منصور کے پاس تحفہ گیا سجدے میں گر گیا اور شعر پڑھا جس کا ترجمہ تھا۔ اس نے لاٹھی رکھ دی فراق کا دن ختم ہو گیا' ایسی ہی خوشی ہوئی جیسے گھر پہنچ کر مسافر کو ہوتی ہے حسنی سادات کی یورش کا بھی اسی واقعہ پر گویا خاتمہ ہو گیا صرف طالبیوں کے نام سے ایک جماعت پیدا ہو گئی جس پر عباسی حکومت کی ہمیشہ کڑی نگرانی قائم رہی۔

آدمی تھا لیکن ان دونوں بھائیوں کے خروج کے زمانہ میں اس کو جتنا از خود رفتہ بوکھلایا ہوا پریشان بلکہ ایک حد تک مایوس پایا جاتا ہے اتنا مایوس کہ اگر نوبخت نامی نجومی اس کی آ کر تسلی نہ کرتا تو کوفہ چھوڑ کر رے کی طرف بھاگ کھڑا ہونے کا قطعی ارادہ کر چکا تھا وہ تو اس کی خوش قسمتی تھی کہ کہیں سے نوبخت پہنچ گیا اور بھاگنے کی تیاری میں مصروف پا کر اس نے قطعی فیصلہ کی صورت میں اس کو یقین دلایا کہ فتح آپ ہی کی ہوگی۔ منصور کو پھر بھی اس کے قول پر اطمینان نہ ہوا تو اس نے کہا کہ فتح کی خبر آنے تک مجھے قید کر لیجئے آخر نجومی کی خبر صحیح ثابت ہوئی نہر حویزہ کے نیچے دو ہزار جریب زمین جاگیر منجم کو عطا ہوئی۔

آخر یہی منصور ہے زندگی میں بیسیوں معرکے اس کے ساتھ پیش آئے لیکن یہ حال اس کا کبھی نہیں ہوا تھا جیسا کہ طبری وغیرہ میں ہے کہ کوفہ کے ہر ہر دروازے پر اس نے تیز رو سواریاں مثلاً سانڈنیاں اور گھوڑے وغیرہ اس لئے بندھوا دیئے تھے کہ جس طرف سے بھی بھاگنے کا موقعہ جہاں جانے کے لئے مل جائے گا بھاگ جاؤں گا' اس پر کچھ اتنا خوف طاری تھا کہ آج کل جسے کرفیو آرڈر یا درائے عشائی کا حکم'' جسے کہتے ہیں جب تک ابراہیم کی مہم کا بالکلیہ قلع قمع نہ ہوگیا' کوفہ میں اس نے اسی حکم کو جاری کر رکھا تھا اور کتنا سخت حکم طبری میں ہے۔

> ابوجعفر کی طرف سے کوفہ میں منادی کرنے والے یہ پکارتے پھرتے تھے کہ عشاء کے بعد جو آدمی بھی گھر سے باہر پکڑا جائے گا اس کا خون حلال کر دیا گیا ہے۔ (ص ۲۴۸)

علاوہ اس کے پانچ سو مسلح سپاہی رات بھر کوفہ کی گلیوں اور سڑکوں پر پٹرول کرتے رہتے تھے عجیب عجیب ترکیبیں اس وقت اس نے کیں لکھا ہے کہ:

> روز رات کو فوج کے ایک حصہ کو چپ چاپ کسی غیر معروف راستے سے حکم دیا جاتا تھا کہ شہر کے باہر چلے جایا کریں اور صبح کو باضابطہ نئی فوج کی شکل میں گویا کسی علاقہ سے تازہ دم نئی فوج آ رہی ہے شہر میں داخل ہوں جس سے کوفہ والوں کے قلب میں دہشت پیدا کرنا مقصود تھا لوگ یہ سمجھتے رہے کہ

روزانہ دستوں پر دستے باہر سے چلے آ رہے ہیں۔

اسی موقعہ ابوجعفر نے یہ حرکت بھی کی کہ فوجی علاقے میں دور دور تک حکم دے رکھا تھا کہ رات کو بغیر کسی ضرورت کے میلوں آگ جلائی جائے۔ تا کہ لوگوں کو معلوم ہو کہ بہت بڑی فوج پڑی ہوئی ہے اسی سلسلے میں لوگ یہ بھی لکھتے ہیں کہ محض دل کی ڈھارس کے لئے ابوجعفر نے عام فرمان کوفہ والوں کے لئے سیاہ پوشی'' کے لزوم کا بھی شائع کیا ظاہر ہے کہ اس نے دوست و دشمن کی تمیز میں کیا مدد مل سکتی تھی' جو حکومت کے مخالف تھے وہ اپنی مخالفت کو سیاہ کپڑوں کی سیاہی میں بہ آسانی چھپا سکتے تھے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سیاہ رنگ کے سوا جس رنگ کا لباس پہنے آدمی گذرتا ہوا اسے نظر آتا تھا دیکھ کر اس کا کلیجہ دھڑ کنے لگتا نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ بقول طبری۔

> حد یہ ہو گئی کہ بے چارے بنئے بقال کنجڑے کباڑی تک کسی نہ کسی طرح کپڑوں کو سیاہ رنگ میں رنگ کر پہنے پر مجبور ہوئے رنگ جب نہیں ملتا تو (داواتوں) کی روشنائی سے رنگ رنگ کر لوگ کپڑے پہننے لگے۔ (ص ۲۴۹)

یہ اور اس قسم کے بیسیوں واقعات کا ذکر اس موقعہ پر مورخین نے کیا ہے یہ ہوسکتا ہے کہ اس کے کچھ اور اسباب بھی ہوں مثلاً یہی کہ ہر طرف سے مطمئن ہو جانے کے بعد اپنی فوج کے اکثر دستوں کو اس نے مختلف صوبوں میں بھیج دیا تھا اور بے چارا اطمینان سے بغداد کی تعمیر میں مصروف تھا کہ اچانک ایک آسمانی بجلی کی طرح دونوں بھائیوں کے خروج کی خبر ابوجعفر کو ملی کہتے ہیں کہ گھبرا گھبرا کر کہتا تھا کہ ما اوری اصنع (کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ اب کروں تو کیا کروں) میں نے فوجوں کو صوبوں پر روانہ کر دیا (پھر قسم کھاتا کہ آئندہ ایسی غلطی کبھی نہ ہوگی کم از کم تیس ہزار فوج ہمیشہ اپنے رکاب میں رکھا کروں گا۔ لیکن ظاہر ہے کہ منصور جیسے آدمی کے لئے فوج کا معاملہ اتنا اہم نہ تھا جیسا کہ ہوا بھی کہ دم کے دم میں ہر ہر صوبے سے قاہرہ دستے سوار و پیدل کے یکے بعد دیگرے محض اس کے ادنیٰ اشارے پر آدھمکے جہاں تک میں سمجھتا ہوں کہ تھوڑا بہت دخل ممکن ہے کہ فوج کی

قلت کا بھی ہو لیکن اصلی معاملہ یقیناً اور تھا طبری میں ہے کہ اسی فوج کے معاملہ میں ایک بوڑھے تجربہ کار آدمی سے ابو جعفر بلا کر مشورہ لے رہا تھا' بوڑھے نے کہا کہ کیا بڑی بات ہے آپ ابھی شام سے چار ہزار سواروں کا دستہ منگوا سکتے ہیں لیکن منصور نے بوڑھے کے اس مشورے پر جو بات کہی اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کا دماغی توازن کسی اور وجہ سے بگڑا ہوا تھا یعنی منصور نے کہا کہ بھائی! شام کی فوج کو میرے لئے کون بھیج سکتا ہے اس پر جھنجھلا کر بڈھے نے کہا کہ کون بھیج سکتا ہے؟ صاحب! آپ وہاں کے عامل (گورنر) کو لکھئے ڈاک پر وہ ایک دن میں دس دس کے حساب سے بھیج سکتا ہے۔(ص ۲۴۸) ظاہر ہے کہ یہ ایک کھلی بات تھی شام سے بصرہ اور کوفہ تک فوج کے پہنچنے میں اور وہ بھی منصور جیسے آدمی کے لئے کیا دشواری ہو سکتی تھی لیکن بے چارے کا دماغ بھی تو قابو میں ہو' کتنی بے کسی سے بڈھے سے اس نے کہا "من لی بھم" (میرے لئے کون اس فوج کو بھیجے گا)

میرا خیال ہے کہ اضطراب اور گھبراہٹ کے دوسرے اسباب کے ساتھ کوئی وجہ نہیں ہو سکتی کہ ابو جعفر پر اتنے زبردست موروثی نمک خوار اور وفادار جرنل حسن بن قحطبہ کے بدل جانے کا اس پر اثر نہ پڑتا اس کا بدلہ صرف اسی کا بدلنا ہوتا تو غنیمت تھا یقیناً طرح طرح کے وسوسے ابو جعفر کو پریشان کر رہے ہوں گے حسن کی وجہ سے کون کون بدلے ہیں' بلاشبہ اس کو آخر وقت تک اس کا کھٹکا لگا ہوا ہوگا اس عظیم عسکری انقلاب کا نتیجہ نہ معلوم کس وقت کسی رنگ میں سامنے آتا ہے آپ دیکھ رہے ہیں کہ وہ کتنا گھبرایا ہوا ہے اور نوبخت بخومی اگر اس کو نہ روک لیتا' تو یقیناً وہ رے بھاگ چکا تھا' عباسیوں کی اندرونی جذبات کا اندازہ اس واقعہ سے بھی ہوتا ہے جس کا ذکر میں نے کہیں کیا ہے کہ محمد نفس زکیہ کے صدر مبارک کو حالانکہ حمید بن قحطبہ ہی نے نیزے سے چھیدا اسی کو رنجت نے سر مبارک کو تن سے جدا کیا الغرض عباسیوں کی وفاداری میں اول سے آخر تک وہ ثابت قدم رہا لیکن ان ہی محمد نفس زکیہ کے مقابلہ میں ابو جعفر منصور کے بھتیجے عیسیٰ بن موسیٰ نے بلاوجہ اس پر یہ بدگمانی کی جیسا کہ طبری وغیرہ میں ہے کہ:

اراک ابطاء ت فی امر هذ الرجل. — میں دیکھ رہا ہوں کہ اس شخص (محمد نفس زکیہ) کے معاملہ میں تو کچھ تاخیر سے کام لے رہا ہے۔

بعض روایتوں میں ہے کہ اس نے یہ بھی کہا کہ:

یا حمید ما اراک تبالغ. — حمید میں دیکھ رہا ہوں کہ تم پوری کوشش سے کام نہیں لے رہے ہو!

جس پر بدقسمت حمید نے کہا کہ:

اتهمنی ۔ فوالله لاضربن محمد احین اراه بالسیف اواقتل دونه. (ص ۲۲۸) — تم مجھ پر (اہل بیت کی طرف داری) کی تہمت لگاتے ہو تو خدا کی قسم جوں ہی محمد پر نظر پڑے گی میں ان کو تلوار سے ختم کر دوں گا یا ان کے آگے قتل ہو جاؤں گا۔

ان فقروں کو میں نے قصداً اس لئے نقل کیا ہے تا کہ اندازہ ہو کہ حسن کے بدل جانے سے عباسیوں میں کس کس قسم کے شبے اور شکوک پیدا ہو گئے تھے شک و شبہ کی یہ انتہا ہے کہ حمید جیسے آدمی پھر بھی عین اس وقت جب جان اپنی ہتھیلیوں پر لئے ہوئے عباسیوں کی طرف سے وہ سب کچھ کر رہا ہے جو حد سے زیادہ وفادار سپاہی کر سکتا ہے لیکن یہ شبہ بقول حمید تہمت جو عیسیٰ کی طرف سے اس پر لگائی گئی اس کی وجہ "ایں ہم بچہ شتر ست" کے سوا آپ ہی بتائیے اور کیا ہو سکتی ہے کچھ بھی ہو آخر حمید حسن کا بھائی ہی تو ہے میں سمجھتا ہوں اسی چیز نے عیسیٰ کے اندر اس وسوسے کو پیدا کیا اور اس میں اتنی شدت پیدا ہو گئی کہ دل سے ابل کر آخر عیسیٰ کی زبان پر بھی آ گیا حمید کے منہ پر اپنے اس شبہ کا اظہار کرنا پڑا۔

بہر حال امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی یقیناً یہ بڑی اہم سیاسی کامیابی تھی کہ عباسیوں کی فوج سے گویا اس کی روح رواں کو توڑ لینے میں وہ کامیاب ہو گئے تقدیری واقعات کا تو کوئی علاج نہ تھا[1] بقول حضرت ابراہیم کے ہم نے کچھ چاہا تھا' اور خدا نے کچھ چاہا' یہ

---

[1] اب اس سے زیادہ اور کیا ہوگا کہ صرف یہی دونوں بھائی محمد اور ابراہیم ہی نہیں بلکہ بقیہ

دوسری بات ہے۔ لیکن تدبیری حد تک کسی حکومت قائمہ کو بٹھا دینے کی آخری تدبیر یہ ہو سکتی ہے کہ فوج میں انقلاب پیدا کر دیا جائے اور آپ دیکھ رہے ہیں' اس حد تک امام یقیناً کامیاب ہو چکے تھے فوجی بساط کا سب سے بڑا اہم مہرہ پٹ گیا تھا لیکن قسمت نے ساتھ نہیں دیا شاید اسی لئے عام مورخین نے اس واقعہ کا اپنی کتابوں میں ذکر بھی نہیں کیا

لے سارے نمائندے جو خفی کارروائیوں کے لئے مختلف صوبوں میں بھیجے گئے تھے باوجود کامیاب ہو جانے کے آخر میں ایسے حالات سے دوچار ہوئے کہ سب کے سب گرفتار ہو کر یا قتل کر دیئے گئے یا قید میں ان کو مرنا پڑا صرف یحییٰ بن عبداللہ جو نفس زکیہ کے بھائیوں ہی میں تھے' دیلم کے علاقے میں ان کو کچھ دن کے لئے پناہ مل گئی ہزار ہا ہزار آدمی ان کے ہاتھ پر مسلمان ہوئے اور ہارون الرشید کے زمانے تک اس علاقے کے حکمراں رہے لیکن ہارون سے ان کا مقابلہ ہوا آخر صلح پر معاملہ طے ہوا' بغداد لائے گئے۔ ابتدا میں بڑی خاطر مدارت ہوئی اور آخر میں ان کو بھی جیل ہی سے وفات پا کر نکلنا پڑا اسی طرح مغرب اقصیٰ کی طرف نفس زکیہ کے بھائی ادریس بن عبداللہ جو بھیجے گئے تھے گو منصور نے ان کے قتل کرانے کی کوشش میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا لیکن اس کی پیش نہ گئی اور ایسی سادات کی ایک اچھی مستحکم حکومت اس علاقے میں ان ہی ادریس بن عبداللہ کے ہاتھوں سے قائم ہو گئی جس کی تفصیل کتابوں میں پڑھیے بس ان دونوں کے سوا ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر اس خاندان کے نمائندوں کو عباسیوں نے ختم کیا ایک صاحب اسی خاندان کے جن کا نام عبداللہ تھا اور خراسان میں کام کرنے کے لئے ان کو بھیجا گیا تھا بے چارے سندھ میں آ کر انہوں نے پناہ لی لیکن وہاں بھی ان کو پناہ نہ ملی' آخر قتل کر دیئے گئے۔ اب اس کی توجیہ کوئی کیا کر سکتا ہے کہ نفس زکیہ کے فوجی دفتر میں لوگوں نے شروع میں جو نام لکھوائے تھے ایک لاکھ سے اوپر ان کی تعداد تھی لیکن آخر میں جب چاروں طرف سے عباسی عساکر نے ان کو گھیر لیا تو بیان کیا جاتا ہے کہ کل تین سو آدمی کے قریب قریب رہ گئے تھے نفس زکیہ کو جب اس کی خبر ملی تو بولے کہ اچھا ہوا بدر میں بھی تو مسلمانوں کی تعداد یہی تھی ابن خضیر جوان کا سب سے بڑا وفا دار سپاہی تھا اسی حال میں اس نے خبر دی کہ اس رجسٹر کو میں نے جلا دیا جس میں لوگوں نے نام لکھوائے تھے سن کر دعا دینے لگے کہ اچھا کیا ورنہ اسی رجسٹر کو دیکھ کر لوگوں کو قتل کیا جاتا جس بے جگری کے ساتھ نفس زکیہ اور ان کے رفقاء لڑ رہے تھے ایک صاحب نے کہا قطعی فتح ان کی تھی اگر ان کے ساتھ کچھ بھی لوگ رہ جاتے ابن خضیر لڑتے لڑتے جب چور ہو کر گر گیا اور سر کاٹا گیا تو کاٹنے والے کا بیان ہے کہ ایسے بینگن کی شکل ان کے چہرے کی تھی جیسے کچو کے دے دے کر ہر طرف سے داغ دار کر دیا گیا جو بھی حال ابراہیم کا ہوا خمرا کے میدان کی طرف جب جا رہے تھے تو راستے میں ایک بندندی کا ملا لے

ورنہ ابراہیم کی مہم اگر کہیں کامیاب ہو جاتی تو شاید دنیا کی چند عظیم جنگی چالوں میں امام ابو حنیفہ کی یہ کامیاب چال شمار ہوتی۔

حضرت محمد نفس زکیہ کی مہم میں حضرت امام کیوں شریک نہ ہو سکے

یہ قصہ تو حضرت ابراہیم کی شہادت پر ختم ہو گیا۔ لیکن دو باتیں اس سلسلہ میں ایسی ہیں جن پر بحث کی تکمیل کے لئے مجھے کچھ کہنا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ حضرت ابراہیم کی مہم میں امام ابوحنیفہ نے واقعی اتنا ہی حصہ لیا تھا جو ان کے حنفی سوانح نگاروں نے لکھا ہے تو پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے اور اب کیا پیدا ہوتا ہے خطیب بغدادی کی روایت سے تو معلوم ہو رہا ہے کہ محدث الفزاری نے اپنے بھائی کے قصے کے سلسلے میں خود امام ہی سے اس سوال کو پوچھا بھی تھا جس کا حاصل یہی تھا کہ ابراہیم کی رفاقت کا مشورہ دے کر تم نے میرے بھائی کو تو قتل کرا دیا۔ لیکن خود تم ابراہیم کی فوج میں جا کر کیوں شریک نہیں ہوئے۔ بھائی کو تو میرے بصرہ روانہ کر دیا اور خود کوفہ میں بیٹھے بیٹھے صرف لوگوں کو فتویٰ دیتے رہے۔ یقیناً یہ سوال اس وقت بھی کرنے

لے فوج اس سے عبور کر کے آگے بڑھی تو حکم دیا گیا کہ بند توڑ دیا جائے تاکہ بھاگنے سے مایوس ہو کر لوگ لڑیں لیکن یہی تدبیر الٹی پڑی' غالب آنے کے بعد جب ان کی فوج کو ہزیمت ہوئی تو یہی نالہ روک بن گیا اور کتنے آدمی محض اسی کی وجہ سے مارے گئے عباسیوں کے ساتھ اس کے برعکس یہ صورت پیش آئی کہ پہلی دفعہ حمید بن قحطبہ کے ساتھ ان کی فوج بھاگی تو تو سامنے بھی ایک ندی آئی۔ بہت تلاش کیا گیا لیکن کوئی مخاضہ (گذر) نہ ملا' مجبوراً پلٹنا پڑا اور یہی پلٹنا ان کے لئے مفید ہوا لوگ عموماً طارق فاتح اندلس کے اس واقعہ کو کہ کشتی اس نے جلا دی تھی بڑی جنگی چال کی مثال میں پیش کرتے ہیں۔ لیکن آپ دیکھ رہے ہیں بجنسہ یہی تدبیر تقدیر کے سامنے الٹی تدبیر بن گئی۔ سچ ہے کہ چلتی کا نام ناؤ طارق کامیاب ہو گیا تو ساری کامیابی اس کی تدبیر کی طرف منسوب ہونے لگی۔ ۱۲

کا ہی تھا اور اب بھی ضرورت ہے کہ اس کا جواب امام کے حالات میں تلاش کیا جائے۔

الخطیب نے اس موقعہ پر امام کی طرف جس جواب کو منسوب کیا ہے یعنی الفزاری سے امام نے کہا کہ:

لو لا ودائع کانت عندی واشیاء الناس. ما استثنیت. (ص ۳۸۵ ج ۱۳) — لوگوں کی امانتیں اور دوسری چیزیں اگر میرے پاس نہ ہوتیں تو میں بھی اپنے آپ کو مستثنیٰ نہ کرتا۔

شاید یاد ہوگا کہ حضرت زید شہید کی مہم میں عدم شرکت کے وجوہ کے سلسلے میں بھی امام کی طرف اس عذر کو منسوب کیا گیا ہے قرائن و قیاسات کے پیش کرنے میں چونکہ بہت طوالت پیدا ہو جائے گی ورنہ جہاں تک میرا خیال ہے راوی کو اگر خلط مبحث ہوا تو تعجب نہیں ہے یعنی زید شہید کے واقعہ کے عذر کو اس نے اس موقعہ پر بھی امام کی طرف منسوب کر دیا ہے۔

بہر حال اس میں کچھ حرج نہیں ہے کہ ایک عذر کوفہ کے نہ چھوڑنے کا یہ بھی ہو خیال امام کو یہ گذر سکتا تھا کہ فوج میں شریک ہو جانے کے بعد اقتل او اقتل (ماروں یا مارا جاؤں) دونوں کا احتمال ہے۔ گذر چکا کہ امام کی تجارتی کوٹھی میں امانت کا کھاتہ معمولی رقوم پر مشتمل نہ تھا بلکہ کروڑ ہا کروڑ تک اس کی تعداد پہنچی ہوئی تھی اچانک قتل ہو جانے کی صورت میں بلاشبہ اندیشہ تھا کہ لوگوں کے رقوم کا حساب غت ربود نہ ہو جائے لیکن میرے نزدیک ایک یہی وجہ کوفہ میں ٹھہرے رہنے کی نہیں ہو سکتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ جیسا کہ طبری وغیرہ نے لکھا ہے کہ خروج تو حضرت ابراہیم نے بصرہ ہی سے کیا تھا جس کی بڑی وجہ وہی تھی کہ عباسیوں کی طرف سے بصرے کا اس زمانے میں سفیان بن معاویہ نامی جو گورنر تھا گو بہ ظاہر اس نے بغاوت کا اعلان اپنی حکومت کی طرف سے نہیں کیا تھا لیکن اندرونی طور پر وہ ابراہیم سے ملا ہوا تھا جب دارالامارہ کا محاصرہ حضرت ابراہیم نے کیا تو تھوڑی دیر کے لئے وہ محصور ہو گیا اور آخر امان طلب کر کے دارالامارہ کو اور بصرے کے خزانے کو حضرت ابراہیم کے

حوالہ کر دیا' خیر یہ تو طویل قصہ[1] ہے کہنا یہ ہے کہ خروج کے لئے گو بصرہ ہی کا انتخاب مختلف اسباب و وجوہ کی بنیاد پر کیا گیا تھا لیکن جہاں تک واقعات سے معلوم ہوتا ہے کوفہ میں حضرت ابراہیم کے ہمدردوں کا جو گروہ تھا اس کی رائے یہی تھی کہ مقابلہ بصرہ میں بیٹھ کر نہ کیا جائے بلکہ جتنے آدمی بصرے میں مل سکتے ہوں ان کے ساتھ لے کر ابراہیم کوفہ پر باہر سے حملہ کریں اور ہم لوگ شہر کے اندر برہمی پھیلا دیں کوفہ کا جو وفد بصرہ ابراہیم کے پاس پہنچا تھا اس نے ان سے یہی کہا تھا کہ

اذا سمع المنصور الهيعه بار جاء الكوفه لم يرد وجهه دون حلوان. (ص ۲۱۰ کامل) کوفہ کے اطراف وجوانب سے غل اور شور کی صدا منصور کے کان میں پہنچ گئی تو حلوان سے پیچھے رخ نہ پلٹے گا۔

پس پہلی وجہ تو یہی ہو سکتی ہے کہ جب اسی مشورے کے تحت ابراہیم کوفہ خود آ رہے تھے تو امام کو بصرہ جانے کی ضرورت ہی کیا تھی علاوہ اس کے خود اسی کوفی وفد نے کوفہ چلنے کی استدعا کرتے ہوئے حضرت ابراہیم سے جو یہ کہا تھا کہ:

> "کوفہ میں لوگ تیار بیٹھے ہیں مگر ان کا حال یہ ہے کہ آپ کو جس وقت دیکھ لیں گے ایک ایک کر کے آپ پر اپنی جان قربان کر دے گا لیکن اگر آپ ان کے سامنے نہ گئے تو قعد تهم اسباب شتى (یعنی مختلف اسباب ایسے ہیں جو ان کو بٹھا دیں) (ص ۲۱۰ کامل)

اس سے کوفہ والوں کی ذہنیت اور عام حالت کا اندازہ ہوتا ہے ظاہر ہے کہ اس قسم

---

[1] طبری میں ہے کہ ابراہیم کی شہادت کے بعد سفیان بن معاویہ کو اپنی فکر بھی ہوئی' منصور پر اس کے حالات پوشیدہ نہ تھے جوں ہی حضرت ابراہیم کے قتل کی خبر اس کو ملی بصرہ سے ایک کشتی پر سوار ہو کر اس نے راہ فرار اختیار کی کشتی اس کی فرات میں جا رہی تھی اور منصور اس وقت اس قصر میں ٹھہرا ہوا تھا جو فرات کے ساحل پر تھا۔ اتفاقاً دریا کی طرف دیکھ رہا تھا کہ سامنے سے سفیان کی کشتی گذرتی ہوئی معلوم ہوئی اس نے فوراً پہچان لیا اور مصاحبوں سے کہنے لگا کہ دیکھو! کیا یہ سفیان ہے لوگوں نے کہا کہ جی ہاں! وہی ہے تب غصہ میں گالیاں دیتے ہوئے اس نے کہا کہ دیکھتے ہو اس میں ابن الفاعلہ کو کس طرح مجھ سے نکل بھاگنا چاہتا ہے۔ ۱۲

کی جماعت کو قابو میں رکھنے کے لئے کس قدر ضرورت تھی کہ ذمہ دار لوگ ان کے ساتھ ساتھ وہیں اور میں تو سمجھتا ہوں کہ دوسری وجہ کوفہ نہ چھوڑنے کی یہ بھی ہو سکتی ہے۔ ماسوا اس کے ان ہی مورخین نے یہ بھی تو لکھا ہے کہ منصور نے بوکھلاہٹ اور اضطراب کی حالت میں جہاں اور اور تدبیریں اختیار کی تھیں۔ ان میں ایک تدبیر یہ بھی تھی کہ کوفہ سے جانے کے لئے بصرے تک جتنے راستے تھے ہر راستہ پر اس نے تھوڑی تھوڑی دور پر پہرہ مقرر کر دیا تھا کہ کوفہ سے بصرہ جاتے ہوئے جن لوگوں کو دیکھا جائے قتل کر دیا جائے اس سلسلہ میں کتنے آدمی قتل بھی ہوئے جن کی تفصیل طبری وغیرہ میں موجود ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ امام بصرہ جا کر حضرت ابراہیم کے ساتھ جو شریک نہیں ہوئے تو علاوہ اس وجہ کے جس کا ذکر الخطیب کی روایت میں ہے اور وجوہ بھی ہو سکتے ہیں خصوصاً زیادہ تر وجہ وہی معلوم ہوتی ہے اور کوفہ کے باشندوں کے متعلق جو تجربات ہوتے رہے ہیں ان سے اس کی تائید بھی ہوتی ہے ضرورت تھی ان پر کڑی نگرانی رکھنے کی اور میں نے پہلے بھی کہیں جو یہ نقل کیا ہے کہ کوفہ کے اندر ایک لاکھ تلواریں میانوں سے نکلنے کے لئے تیار تھیں۔ یہی لوگ تھے جن کو چھوڑ کر امام کو چاہیے تھا کہ باہر نہ جائیں' کوئی شبہ نہیں کہ خارجی اور اندرونی حملے کی جو اسکیم بنائی گئی تھی۔ اگر تقدیر اس کی راہ میں حائل نہ ہو جاتی تو حلوان کیا۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ ابو جعفر منصور عالم برزخ سے پہلے شاید دوسری طرف رخ پھیرنے کی بھی گنجائش نہ پاتا۔ لیکن کل (۴۸) میل کوفہ پہنچنے کے لئے باقی رہ گئے تھے۔ کہ باخمرا کے میدان میں قدرت نے عباسیوں کے حق میں فیصلہ کر دیا[1]

---

[1] لکھا ہے کہ عیدالفطر کو تین دن باقی تھے نفس زکیہ کی شہادت کی خبر بصرہ پہنچی اسی وقت سے ابراہیم بدحال نظر آتے تھے نماز عید کی حضرت نے خود پڑھائی تھی' منبر پر خطبہ کے لئے جب چڑھے تو اس ناگہانی مصیبت کا حال بیان کرتے ہوئے چند اشعار بھی پڑھے بھائی کو مخاطب کر کے گویا کہہ رہے تھے کہ اگر معلوم ہوتا کہ یہ انجام ہونے والا ہے تو ہم بھائی تم سے جدا نہ ہوتے اور قتل ہونے کے لئے دشمنوں کے سپرد نہ کر دیتے پھر جیتے تو دونوں بھائی ساتھ جیتے' اور مرتے تو دونوں بھائی ساتھ مرتے' سننے والوں نے اسی وقت فیصلہ کر لیا تھا کہ آپ زندگی سے بیزار ہو چکے ہیں اور مر جانے کا صرف حیلہ تلاش کر رہے ہیں۔۱۲

سچ پوچھئے تو دوسرا سوال جو قدرتی طور پر یہاں پیدا ہوتا ہے اس کے جواب کو بھی ہم ان ہی واقعات کی روشنی میں پاسکتے ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ حضرت ابراہیم بن عبداللہ کے خروج کی مہم میں امام ابوحنیفہ کی سرگرمیوں کا ان کے حمائت میں اگر واقعی وہی حال تھا جو بیان کیا گیا تو پھر اس کی کیا وجہ تھی کہ ابوجعفر منصور کی طرف سے مخالفین حکومت کی دارو گیر میں جب اتنی کھلبلی مچی ہوئی تھی تو پھر اسی کوفہ میں بیٹھے ہوئے امام جب سب کچھ کر رہے تھے' تو حکومت کی گرفت اور زد سے وہ کیسے بچے ہوئے تھے حالت تو یہ تھی کہ عتمہ (یعنی عشاء کے بعد) کوفے کی گلیوں اور بازاروں میں جو کوئی چلتا پھرتا آدمی حکومت کے پہرہ داروں کو مل جاتا خواہ وہ کوئی بھی ہوتا طبری میں ہے کہ:

اس کو فوراً پکڑ لیتے اور کمبل میں لپیٹ کر اس جگہ پہنچا دیئے جاتے جہاں رات بھر ان کو رہنا پڑتا' جب صبح ہوتی تو پوچھ گچھ کے بعد یا چھوڑ دیا جاتا یا جیل بھیج دیا جاتا تھا۔ (ص ۲۴۸ ج ۹ طبری)

اس میں یہ بھی لکھا ہے کہ شہر میں ابوجعفر منصور کے جاسوس چھوڑے ہوئے تھے اور تھوڑی تھوڑی دیر بعد منصور کو شہر کے مختلف لوگوں کے متعلق خبریں پہنچاتے رہتے خلیفہ کے ایک معتبر آدمی کے حوالہ سے طبری میں یہ واقعہ نقل کیا گیا ہے کہ:

جس شخص کے متعلق ابوجعفر کو یہ خبر ملتی کہ ابراہیم بن عبداللہ کی طرف کسی قسم کا رجحان اس میں پایا جاتا ہے' تو قحطبہ کا ایک غلام جس کا نام سلم تھا اس کو بلا کر ابوجعفر حکم دیتا کہ اس کی خبر لی جائے۔

اس خبر لینے کا مطلب کیا ہوتا تھا اس سلم کے بیٹے عباس کی زبانی اس کی تفصیل طبری نے درج کی ہے کہ:

''میرے والد سلم خلیفہ سے حکم پانے کے بعد دن کے گذرنے کا انتظار کرتے جب آفتاب غروب ہو جاتا اور رات کا کافی حصہ گذر جاتا ہر طرف سناٹا چھا جاتا' تب سیڑھی لے کر میرے والد اس مشتبہ آدمی کے گھر پر

پہنچتے اور اسی سیڑھی پر چڑھ کر اس کے گھر میں اترتے اور گھر سے باہر نکال کر اس کو قتل کر دیتے اور (خلیفہ کو دکھانے کے لئے) مقتول کی انگوٹھی اتار لیتے۔[1]

یقیناً یہ سوال ہوتا ہے کہ جب کوفہ میں یہ سب کچھ ہو رہا تھا تو امام جن کی طرف سے ''جہار شدید'' کی شکل میں ابراہیم کی تائید و حمایت کا سلسلہ جاری تھا تو ان کو اسی زمانے میں حکومت نے کیوں گرفتار نہیں کر لیا؟

جہاں تک میں سمجھتا ہوں اس کی وجہ وہی تھی کہ امام ابو حنیفہ کی حیثیت شہر کے عام باشندوں کی نہ تھی علم و فضل تقویٰ و طہارت اور دوسری خصوصیتوں نے جیسا کہ گذر چکا نہ صرف کوفے کا بلکہ سارے عراق' بلکہ سارے مشرق کا ان کو امام اور پیشوا بنا دیا تھا' سفیان بن عینہ کے حوالہ سے جو یہ فقرہ نقل کیا جاتا ہے۔ یعنی وہ کہا کرتے تھے۔

''دو چیزیں ایسی تھیں جن کے متعلق میرا خیال تھا کہ کوفہ کے پل کے پار بھی نہ ہو سکیں گی۔ لیکن اپنی آنکھوں سے دیکھنا پڑا کہ دنیا پر وہ چھا گئیں۔''

کہتے کہ:

''ابو حنیفہ کے اجتہادی آراء اور حمزہ کی قرأت کی طرف میرا اشارہ ہے۔''

سفیان کا یہ بیان شاعری نہیں بلکہ واقعہ تھا' میں نے شاید پہلے بھی کہیں ذکر کیا ہے آئندہ بھی تفصیلاً اس کا تذکرہ آئے گا کہ آخر میں امام ابو حنیفہ کے ساتھ ابو جعفر منصور نے جو کچھ کیا تو منصور کے چچا جن کا نام عبدالصمد بن علی بن عبداللہ بن عباس تھا وہ گھبرائے ہوئے پہنچے اور منصور سے کہہ رہے تھے۔

تم نے آج یہ کیا کیا' اپنے اوپر تم نے ایک لاکھ تلواریں خود اپنے ہاتھوں کھچوا لیں یہ (امام ابو حنیفہ) اہل عراق کا فقیہ اہل مشرق کا فقیہ تھا۔ (ص ۱۸۲)

---

[1] اسی سلسلہ میں لطیفہ یہ نقل کیا ہے کہ بعد کو لوگ سلم کے اسی بیٹے عباس کو کہتے کہ تیرا باپ اگر اس زمانے کے مقتولوں کی انگوٹھیوں کے علاوہ ترکہ میں اور کچھ نہ بھی چھوڑتا جب بھی تو ایک فارغ البال وارث اپنے باپ کا بن سکتا تھا۔ ۱۲

واقعہ یہ ہے کہ ابوجعفر منصور اضطراب و سراسیمگی کے جس حال میں اس وقت مبتلا تھا بھڑ کے چھتے میں ہاتھ دے دیتا اگر ایک ایسے نازک وقت میں امام ابوحنیفہ پر ہاتھ ڈالتا اس وقت تک تو صرف ابراہیم ہی کی بلا سامنے تھی اور کہیں یہ حماقت اس سے سرزد ہو جاتی تو بجائے ''یک نہ شد دو شد'' کی مصیبت میں گھر جاتا' جس کا اندازہ خود ابوجعفر سے زیادہ کوئی دوسرا نہیں کر سکتا تھا حالت تو یہ تھی کہ ہر لحہ اس کو خطرہ تھا کہ کوفے والے اس پر ٹوٹ پڑیں گے طبری میں ہے کہ سلیمان بن مجاہد جو ابوجعفر منصور کے خاص امراء میں تھے ان کا بیان تھا کہ ان ہی دنوں میں جب ابراہیم کے خروج کی وجہ سے ہم لوگ پریشان تھے اچانک میرا ایک کوئی دوست آیا اور اس نے اضطراب کے لہجہ میں مجھ سے کہنا شروع کیا کہ:

> ''سلیمان! ہو سکے تو تم اپنے لئے اور اپنے اہل و عیال کے لئے کسی محفوظ ٹھکانے کا نظم کر لو کیونکہ کوفہ والے تمہارے صاحب (ابوجعفر) پر یک بارگی ٹوٹ پڑنے کے لئے تیار ہو چکے ہیں۔ (ص ۲۴۹)

سلیمان کہتے ہیں کہ اس خبر کے سننے کے ساتھ ہی میں بھاگا ہوا خلیفہ کے پاس پہنچا اور جو خبر ملی تھی اس سے مطلع کیا لکھا ہے کہ ابوجعفر نے سننے کے ساتھ فوراً اپنا آدمی ابن مقرن کے پاس دوڑایا (یہ ابن مقرن کوفہ کا مشہور صراف تھا' اور پبلک سے بہ ظاہر ملا ہوا تھا' لیکن اندرونی طور پر ابوجعفر کی جاسوسی کا کام کرتا تھا) ابن مقرن بلایا گیا سخت پریشانی کے لہجہ میں ابوجعفر نے اس سے کہنا شروع کیا۔

ویحک قد تحرک اهل الکوفه.	خرابی ہو تیرے لئے کوفہ والے تو چل پڑے۔

سلیمان کہتے ہیں کہ اس پر ابن مقرن نے منصور کو اطمینان دلایا کہ آپ اس معاملہ کو مجھ پر چھوڑ دیئے کوئی صورت حال اگر پیش آئے گی تو میں اس کی پوری نگرانی کر رہا ہوں' ابن مقرن کے بیان سے منصور نے اطمینان کی سانس لی۔

الغرض یہ اور اس قسم کے بیسیوں واقعات سے بآسانی سمجھا جا سکتا ہے کہ اچانک

ایک ایسی شورش اور ہنگامے کی حالت میں امام ابوحنیفہ پر ابوجعفر نے اگر ہاتھ نہیں ڈالا تو وقتی مصلحت کا یہی اقتضا تھا لیکن یہ صرف وقتی بات تھی جیسا کہ معلوم ہوگا امام کے ساتھ منصور نے آئندہ جو کچھ کیا اس میں بہت بڑا دخل ان کے اسی طرز عمل کو تھا جو حضرت ابراہیم کے خروج کے زمانے میں انہوں نے اختیار کیا تھا اس وقت منصور صرف وقت ٹالنے کے لئے دم سادھے رہا بلکہ شمس الائمہ زرنجری (زرنگری) کے حوالے سے کردری نے ایک روایت جو نقل کی ہے اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ آئندہ منصور نے جو کچھ کیا اس کی تیاریوں میں وہ اسی زمانے سے مشغول تھا میرا اشارہ کردری کی اس روایت کی طرف ہے جس میں ہے کہ:

"جب ابراہیم بن عبداللہ نے بصرے میں خروج کیا اور منصور تک لوگوں نے یہ خبر پہنچائی کہ اعمش[1] اور ابوحنیفہ کوفہ کے ان دونوں عالموں نے ابراہیم

---

[1] یہ اعمش امام ابوحنیفہ کے معاصرین میں تھے اصلی نام سلیمان بن مہران تھا آنکھ میں حرج تھا اس لئے اعمش کے نام سے (چوندھے) مشہور ہوئے قراۃ اور حدیث کے امام ہیں امام ابوحنیفہ اور ان میں جو تعلقات تھے لوگوں نے ان کو بڑی دلچسپیوں سے ذکر کیا ہے مزاج میں معلوم ہوتا ہے کہ کچھ ظرافت تھی طالب العلموں کو ایک دن کھانا لا کر کھانے لگے طلباء میں بعض شوخ مزاج تھے انہوں نے کہا کہ جتنا لائے جائیں کھاتے چلا جانا چاہیے دیکھیں کب تک کھلاتے ہیں آخر جو کچھ گھر میں تھا سب لا کر رکھ دیا اور آخر میں بولے ارے شریرو! تم نے میرا اور میری بیوی تک کا کھانا سب کھا لیا طلبہ بھاگے اور چند ہفتے ڈر کے مارے سامنے نہ گئے۔ ان ہی بیوی صاحبہ کے ساتھ ان کا قصہ یہ پیش آیا' رات کو اعمش اور ان کی بیوی میں جھگڑا ہوا یہ کچھ پوچھتے تھے غصہ میں ان کی بیوی نے خاموشی اختیار کر لی۔ لاکھ جھنجھوڑا مگر وہ گم چپ رہیں۔ تب ان کو بھی غصہ آ گیا اور بول اٹھے کہ اگر صبح ہونے سے پہلے تم نہ بولیں تو تم کو طلاق ہے۔ کہتے ہیں کہ ان کی بیوی پر اتنا غصہ چڑھا ہوا تھا کہ طلاق لینے پر آمادہ ہو گئیں۔ اب تو اعمش کو بہت پریشانی ہوئی سیدھے امام ابوحنیفہ کے دروازے پر پہنچ کر کنڈی کھٹکھٹائی' حماد امام کے صاحبزادے باہر نکل کر آئے دیکھا اعمش ہیں۔ بلا کر لے گئے۔ بھائی اس اندھیری رات میں کہاں آئے امام ابوحنیفہ نے کہا: بولے کہ بیوی میرے ہاتھ سے گئی بال بچوں کی فکر ہے کون پالے گا امام صاحب نے کہا ٹھہرو ان کے ساتھ اس مسجد میں پہنچے جو اعمش کے محلہ میں تھی' موذن کو اٹھایا اور کہا

کے نام خطوط لکھے ہیں تب منصور نے یہ سن کر ابراہیم کی طرف سے ایک جعلی خط اعمش کے نام اور ایک خط امام ابوحنیفہ کے نام لکھوا کر بھیجے دونوں خطوط قبول کر لئے گئے اسی کو منصور نے امام ابوحنیفہ پر الزام لگانے کا ذریعہ بنا لیا۔ (ص ۲۱ ج ۲ کردری)

میرا خیال ہے کہ آئندہ جو کارروائی منصور امام ابوحنیفہ کے معاملہ میں کرنا چاہتا تھا اسی کی یہ تمہید تھی گویا اس ذریعہ سے اس نے مقدمہ قائم کرنے کی ایک شہادت بہم پہنچائی یعنی اگر امام ابراہیم کی تائید و حمایت کا انکار کریں گے تو اس وقت دکھانے کے لئے یہ ثبوت پیش کیا جائے گا۔

بہرحال اگر یہ واقعہ صحیح ہے کہ منصور نے کوئی ایسی جعلی کارروائی امام کے ساتھ کی تھی تو اس کا مطلب یہی ہوگا کہ ابھی سے ان باتوں کے لئے وہ زمین تیار کر رہا تھا جن کا ظہور بعد کو ہوا بلکہ نفس زکیہ اور ابراہیم بن عبداللہ کے خروج کے موقعہ پر حسن بن قحطبہ نے جس طرز عمل کو اختیار کیا تھا تو اسی موقعہ پر بھی جیسا کہ گذر چکا اپنے خفیہ نمائندوں کو منصور نے تحقیقات کا حکم دیا تھا کہ اس شخص کو کون بگاڑ رہا ہے اس کا پتہ چلایا جائے بعض روایتوں میں ہے کہ منصور نے خفیہ کے ان آدمیوں کو یہ بھی کہا تھا کہ:

اس کی نگرانی کرتے رہو کہ ان قراء (یعنی علماء) میں سے کس کی آمد و رفت حسن

ﷺ کہ بھائی ایک ضرورت ہے آج تو ذرا طلوع صبح سے پہلے ایک اذان دے دے بے چارہ تیار ہو گیا اعمش سے امام نے کہا کہ اب گھر جاؤ گھر ادھر وہ پہنچے موذن نے رات رہتے اذان پکار دی اعمش کی بیوی نے سمجھا کہ صبح ہو گئی۔ بولیں لو! اب میں جاتی ہوں طلاق پڑ گئی اعمش نے کہا کہ رات تو ابھی باقی ہے۔ طلاق کیسے پڑی دیکھا گیا تو یہی واقعہ تھا۔ قصہ رفع دفع ہو گیا۔ زید شہید کے واقعہ میں ان کا ذکر گذر چکا ہے کہتے ہیں کہ تشیع کی طرف ان کا میلان تھا۔ بعض مسائل امام ابوحنیفہ نے ان کے سامنے بیان کئے تو بولے کہ کہاں سے تم ایسا کہتے ہو امام نے فرمایا تم ہی سے تو فلاں فلاں حدیثیں میں نے سنی ہیں ان ہی سے تو معلوم ہوتا ہے۔ اعمش نے کہا کہ میرا ذہن بھی ان حدیثوں سے ان مسائل کی طرف نہیں گیا تھا۔ اسی زمانے میں غالباً ان کی زبان سے یہ جملہ نکلا کہ ہم محدثین دراصل صیادلہ (دوا فروش) ہیں اور طبیب تم لوگ ہو۔ ۱۲

کے پاس زیادہ ہے یا حسن ان میں سے کس کے پاس زیادہ آمد و رفت رکھتا ہے۔''
میں نے لکھا تھا کہ اس وقت بھی خفیہ والوں کی رپورٹ خلیفہ کے پاس بھی پہنچی تھی کہ:

انہ یدخل علی ابی حنیفة. (ص ۱۸۴) ابو ابوحنیفہ کے پاس آتا جاتا رہتا ہے۔

میرے خیال میں یہ ساری کارروائیاں منصور اپنے اس ارادے کی تکمیل کے لئے کر رہا تھا جسے امام کے متعلق ابراہیم کے خروج کے زمانہ میں طے کر چکا تھا معاملہ کسی عام آدمی کا نہ تھا امام اہل العراق امام اہل المشرق کا معاملہ تھا اور اسی لئے کافی شہادتیں بھی وہ مہیا کر رہا تھا تا کہ آئندہ پبلک کو مطمئن کرنے کے لئے امام کے ان ہی باغیانہ چال چلن کو پیش کر کے ثابت کرے کہ میں جو کچھ کر رہا ہوں ضابطہ اور قانون کا بھی اقتضاء ہے۔

حضرت ابراہیم کا سر ابوجعفر کے دربار میں

بہرحال دونوں بھائیوں کے خروج کا یہ قصہ ختم ہو گیا کہتے ہیں کہ حضرت ابراہیم کا سر مبارک جب منصور کے سامنے لایا گیا تو دیکھنے کے ساتھ ہی منصور بلبلا کر رو پڑا دیکھنے والے کہتے ہیں کہ منصور کے آنسو حضرت ابراہیم کے رخسارے پر گر رہے تھے۔ منصور روتا جاتا تھا اور کہتا جاتا تھا کہ:

> ''قسم ہے خدا کی جو شکل پیش آئی میرے لئے سخت ناگوار ہے مگر کیا کیا جائے ابراہیم! تم ہمارے ساتھ مبتلا کئے گئے اور میں تمہارے ساتھ مبتلا ہوا۔ (ص ۲۱۲ کامل ج ۵)

پھر دربارِ عام ہوا خلیفہ کے حاشیہ نشین یکے بعد دیگرے داخل ہوتے جاتے تھے اور ابراہیم کے حق میں سخت سست کہتے تھے لیکن منصور کو دیکھا جا رہا تھا کہ خاموش منہ پھیلائے بیٹھا ہے جب ایک اور صاحب جن کا نام جعفر حنظلہ تھا' آئے اور آ کر انہوں

نے خلیفہ کو خطاب کر کے کہنا شروع کیا۔

اپنے چچا زاد بھائی کے ساتھ جو سلوک آپ نے کیا خدا اس کا آپ کو اجر دے اور ان سے آپ کے حق میں جو زیادتی ہوئی اسے معاف فرمایئے۔(ص۲۱۲)

اس پر منصور کچھ منشرح ہوا یہ بھی کہتے ہیں کہ کسی بدبخت نے حضرت ابراہیم کے چہرے پر تھوک پھینکا اس نے خیال کیا تھا کہ منصور اس کام سے خوش ہوگا لیکن دیکھا گیا کہ چوب دار نے منصور کے حکم سے اس کی ناک پر کے مار رہے ہیں اور غصہ میں منصور کہہ رہا ہے کہ پھینک دو باہر لے جا کر مردود کو اس کی ٹانگ گھسیٹتے ہوئے آخر یہی ہوا!

میں نے آخری واقعات کو قصداً اس لئے نقل کیا ہے تاکہ اس زمانے کے ان خلفاء کی روش اور سیاسی حکمت عملی کا اندازہ ہو یہ بھی ممکن ہو کہ واقعی منصور کی آنکھوں میں یہ آنسو مگر مچھ کے آنسو نہ ہوں اور اسی کا یہ فعل بقول عارف شیراز۔

آفریں بردل نرم تو کہ از بہر ثواب
کشتۂ غمزۂ خود را بہ نماز آمدۂ

واقع میں بھی مستحق آفرین و تحسین ہو لیکن شخصی طور پر میرے نزدیک صرف ''رائے عامہ'' کی خوشامد اور چاپلوسی کے یہ مظاہرے ہوتے ہیں افراد بادشاہوں اور ان کے حکام کی خوشامد کرتے ہیں لیکن یقین کیجئے کہ خود حکومتوں اور حکمرانوں کا بھی عوام کی خوشامد اور چاپلوسی کے بغیر کام چل نہیں سکتا۔

میرا مطلب یہ ہے کہ فتنہ فرو ہونے کے ساتھ ہی امام ابوحنیفہ کی دھر پکڑ کی طرف اگر منصور متوجہ نہیں ہوا اس میں بھی جہاں تک میرا خیال ہے محض رائے عامہ کے دباؤ ہی کو دخل تھا صرف ایک وقتی مہلت تھی جو اپنے خاص حالات کی وجہ سے امام کو مل گئی تھی اور امام بھی اپنے اس انجام سے جو پیش آنے والا تھا ناواقف نہ تھے بلکہ سچ یہ ہے کہ ''جہار شدید'' کے تاریخی طرز عمل کو ایام ابراہیم میں انہوں نے جس وقت اختیار کیا تھا تو یہ طے ہی کر کے اختیار کیا تھا کہ:

ان تتربص منکم الا احدی الحسنین. یعنی دو اچھی باتوں میں سے کسی ایک بات کی تم سے توقع کر رہا ہوں۔"

گویا وہی مشہور بات کہ مارا تو نمازی ورنہ شہید ہونے کا ایک مغتنم موقعہ جو سامنے آ گیا ہے وہ ہاتھ سے کہا جاتا ہے ابراہیم صائغ اور ابوحنیفہ کے مسلک میں اختلاف نتیجے میں نہیں تھا بلکہ نتیجے تک پہنچنے کے راستے میں تھا امام رحمۃ اللہ علیہ مسلمانوں کی کسی باضابطہ تنظیمی صاحب قوت اجتماع میں شریک ہو کر چاہتے تھے کہ اس فرض کو ادا کیا جائے اور ابراہیم بے چارے کی قلندری مشرب میں یہ دور دراز کی راہ تھی۔ انہوں نے اپنے قصے کو مرو کے ایوان حکومت میں مختصر کر دیا اور امام ابوحنیفہ انتظار میں رہے۔

خدا شکر خورے کو شکر پہنچا کر رہتا ہے مرنے سے......... چند سال پہلے جب ان کی عمر ساٹھ سے متجاوز ہو چکی تھی یعنی ایک حساب سے تو (۶۵) سال کے تھے اور اگر مورخ السعودی کے بیان کو صحیح تسلیم کیا جائے تو خروج ابراہیم کے زمانے میں ماننا پڑے گا کہ (۸۶) سال کی عمر امام صاحب کی تھی[۱]

کچھ بھی ہو کتنے ہی دن انتظار میں ان کو کاٹنے پڑے ہوں لیکن خدا نے اس سعادت میں شرکت کا موقعہ ان کے لئے بہم پہنچا دیا جس میں اگر مرنے سے پہلے شریک نہ ہو جاتے تو شاید ابراہیم صائغ کے سامنے جو گفتگو امام نے کی تھی اس کو پیش کر کے ممکن تھا لوگ ان پر جبن اور بزدلی کا الزام قائم کرتے کوئی شبہ نہیں کہ اس دفعہ "نفس زکیہ" کے خروج کے وقت جو تیاریاں عمل میں آئی تھیں اور سارے ممالک محروسہ اسلامیہ میں اس تحریک کا جو جال بچھا دیا گیا تھا اور یہی دوسرے اسباب ایسے تھے کہ غالب قرینہ کامیابی ہی کا تھا گذر چکا کہ خود ابوجعفر منصور کو جتنا مایوس اس زمانہ میں پایا گیا اور کسی موقعہ پر یہ

---

[۱] امام ابوحنیفہ کے سن ولادت کے متعلق عام طور پر اگرچہ یہی مشہور ہے کہ ۸۰ ہجری میں پیدا ہوئے۔ لیکن المسعودی نے اپنی کتاب مروج الذہب میں وفات کے وقت ان کی عمر (۹۰) بتائی ہے دیکھو ص ۹۱ بر حاشیہ کامل ابن اثیر تعجب یہ ہے کہ اس جلیل القدر مورخ نے اختلاف کا بھی ذکر نہیں کیا ہے اس مسئلہ کی تحقیق انشاء اللہ اپنی کتاب "تدوین فقہ" میں کروں گا۔۱۲

حال اس پر کبھی طاری نہیں ہوا۔ لیکن پھر بھی ”جنگ“ کی آگ میں کودنے والوں کے سامنے اس کی دونوں شاخیں ہوتی ہیں اور جنگ کی اس دوسری خصوصیت پر امام کی نظر نہ ہوتی تو کس کی ہوتی یقیناً ”جہاد شدید“ کے مسلک پر وہ کامیابی اور ناکامی دونوں پہلوؤں اور ان کے سارے عواقب و نتائج کو سوچ کر شریک ہوئے تھے اسی لئے آئندہ جو واقعات پیش آئے اطمینان سے انہوں نے ان کو برداشت کیا اس مسئلہ میں امام کی زندگی کا یہ آخری باب ہے اور اب ہم اسی کو بیان کرنا چاہتے ہیں۔

جیسا کہ میں لکھ چکا ہوں حضرت ابراہیم کی شہادت کی خبر جوں ہی منصور کے کان میں پہنچی بے ساختہ اس کی زبان پر یہ شعر جاری ہوگیا۔

فالقت عصاها واستقربه النوى
كما قر عليها بالاياب المسافر

بغداد کی تعمیر کے بقیہ کام کی تکمیل

گویا ع: ”شکر کہ جنازہ بمنزل رسید“ کے فارسی مصرعہ کا منصور نے عربی میں ترجمہ کیا یا اس عربی شعر کا فارسی میں کسی نے یہ ترجمہ کر دیا ہے جس سے اس سکینت قلب اور طمانیت خاطر کا اندازہ ہوتا ہے۔ جس سے منصور کا دل معمور دلبریز تھا اب فضا صاف تھی حسینی سادات کی جدوجہد کا خاتمہ زید بن علی کی کوششوں پر ہوا تھا حسنی سادات باقی تھے آخری خطرہ ان ہی کا تھا خروج کے واقعہ سے پہلے چن چن کر ان میں سے اکثر کو قتل کر چکا تھا جو زندہ تھے عموماً حبس دوام کی سزا میں مبتلا تھے۔[1] باقی یہی دو بھائی رہ گئے تھے ان کو

---

[1] بتا چکا ہوں کہ نفس زکیہ اور ابراہیم کے خروج سے پہلے ہی ابو جعفر منصور کو حسنی سادات کی ان تیاریوں کی خبر مل چکی تھی۔ تاریخوں میں ان واقعات کی تفصیل پڑھیے' کن بے دردیوں کے ساتھ حسنی سادات مدینہ منورہ سے پابہ زنجیر کھلی پیٹھ والے اونٹوں پر باندھ کر ربذہ لائے گئے اور ان بے چاروں کو گالیاں دے دے کر منصور جس طرح کوڑوں سے پٹواتا تھا کہ بعضوں کی اسی میں آنکھ بیٹھ گئی۔ لیکن اسے رحم نہ آیا' پھر ان سارے حسنی سادات کو جن میں نفس زکیہ کے والد عبداللہ بن حسن بھی تھے۔ قصر ابن ہبیرہ کے تہ خانہ میں قید کیا گیا اور بے کسی کے ساتھ تھوڑے دنوں کے بعد لوگ مرتے [illegible]

بھی ختم کر کے پورے اطمینان کے ساتھ سانس لینے کا اس کو موقعہ ملا قدرتاً ایسی صورت میں جو خیال سب سے پہلے اس کے سامنے تھا بغداد کی تعمیر کا قصہ تھا۔ ابن خلدون نے لکھا ہے کہ:

جب ابوجعفر محمد نفس زکیہ اور ان کے بھائی ابراہیم کی جنگ سے فارغ ہوا تو قصر ابن ہبیرہ (جس کو دوران جنگ میں اپنی قیام گاہ اس نے بنائی تھی) وہاں سے نکلا اور پھر بغداد پہنچا اور اس کی تعمیر کے سلسلے کو اس نے پھر جاری کر دیا۔ (ص ۱۹۷ ج ۳ ابن خلدون)

نظامت تعمیرات پر امام کی بجائے حجاج بن ارطاۃ کا تقرر

بھاگے ہوئے راج مزدور پھر اپنی اپنی جگہوں سے سمیٹے گئے اور دجلہ کے کنارے جیسے پہلے شاہی کیمپ قائم تھا۔ پھر اپنی اسی تزک و احتشام کے ساتھ قائم ہو گیا۔ مشورے کے لئے جو لوگ پہلے کیمپ میں تھے۔ سب بلائے گئے لیکن نئی بات صرف ایک نظر آتی ہے کہ اہل علم و فقہ میں جیسا کہ عرض کر چکا ہوں' امام ابوحنیفہ بھی تھے بلکہ مختلف وجوہ سے امام صاحب کی ذات نمایاں تھی مگر تعمیر بغداد کا یہ نیا سلسلہ جب شروع ہوا تو امام ابوحنیفہ نہیں بلائے گئے اور کوفہ کے ایک دوسرے عالم جن کا نام حجاج بن ارطاۃ تھا گو پہلی دفعہ بھی امام صاحب کے ساتھ وہ بلائے گئے تھے لیکن اس دفعہ بغداد کے شاہی کیمپ میں وہی آگے آگے نظر آتے ہیں ظاہر ہے کہ علانیہ حکومت کے مخالفوں کا ساتھ دیا تھا۔ الخطیب نے حجاج بن ارطاۃ کا ایک قول امام ابوحنیفہ کے متعلق یہ نقل کیا ہے یعنی حجاج کہا کرتے تھے کہ:

کان فی صحابة ابی جعفر. (ص ۲۵۰ ج ۲)	حجاج ابو جعفر دوانیقی کے مصاحبوں میں تھے۔

لہ چلے گئے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ملنے کو یوں تو عباسیوں کو حکومت ضرور ملی لیکن بڑی بھاری قیمت اس کی ان کو ادا کرنی پڑی۔ مگر تف ہے اس دنیا پر اور اس کی دو روزہ لذتوں پر لاحول ولا قوۃ۔

اسی کا نتیجہ تھا کہ بغداد کی جامع مسجد کا نقشہ بھی حجاج ہی سے بنوایا گیا تھا اور سمت قبلہ کی تعیین میں بھی حجاج ہی کی رائے پر اعتماد کیا گیا' الغرض امام کے مقابلہ میں حجاج کا مرتبہ روز بروز ابوجعفر بڑھاتا چلا جاتا تھا۔ پہلے ان کو بصرہ کا قاضی بنایا گیا۔ بصرہ کے بعد کوفہ کی قضاءت ملی اور آخر میں تو اپنے ولی عہد مہدی کے ساتھ منصور نے ان کو خراسان ہی بھیج دیا جہاں سے بڑی دولت کما کر لائے [1]

ابوجعفر کا حضرت ابراہیم کے حمایتوں سے انتقام

ادھر امام صاحب یہ دیکھ رہے تھے کہ کوفہ سے جانے کے بعد ابوجعفر منصور کی طرف سے ان لوگوں سے انتقام لیا جارہا ہے جن کی شرکت خروج کے اس واقعہ میں کسی نہ

---

[1] جیسا کہ حجاج کے حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ کوفہ کے ممتاز علماء ہیں ان کا شمار تھا۔ خطیب نے لکھا ہے کہ کان مفتی الکوفہ یعنی کوفہ کے مفتی تھے مگر ابتداء میں بے چارے بہت تنگ حال تھے خطیب ہی کی رعایت ہے کہ ایک چھوکری (شرعی لونڈی) ان کے پاس تھی' وہی کات کات کر جو سوت ان کو دیتی تھی بیچ کر اس سے گذر اوقات کرتے تھے لیکن امام ابوحنیفہ کے مقابلہ میں ایک زرین موقعہ ان کو حکومت میں رسوخ حاصل کرنے کا مل گیا' افسوس ہے کہ پھر علم و دین کے اقتضاؤں کی انہوں نے پروا نہ کی' کسی حنفی مورخ کا نہیں بلکہ خطیب کا بیان ہے کہ بصرہ میں سب سے پہلے جس قاضی نے رشوت لی وہ آپ ہی کی ذات ستودہ صفات تھی' یہ بھی لکھا ہے کہ اسی کوفہ میں ایک حال تو یہ تھا کہ لونڈی کے سوت پر گذارا تھا' جب خراسان سے کوفہ واپس ہوئے تو ستر بہتر غلام آگے پیچھے تھے دولت کی مستی اتنی سوار ہوئی کہ جماعت اور جمعہ کی شرکت اس لئے آپ نے ترک کردی کہ عوام کے مجمع میں جانا پڑتا ہے۔ دلچسپ لطیفہ یہ پیش آیا کہ بغداد کی جامع مسجد کے قبلہ کی سمت امام ابوحنیفہ کی جگہ آپ نے درست فرمائی تھی لیکن مسجد بن کر جب تیار ہوئی تو طبری نے لکھا ہے۔ **ان قبلتها علی غیر صواب وان المصلی فیه یحتاج الی ان ینصرف الی باب البصرة قلیلا** (بغداد کی جامع مسجد کا قبلہ درست نہیں ہے نمازی کو ضرورت ہوتی ہے کہ باب البصرہ کی طرف جھکے) (ص ۲۶۱) کہتے ہیں کہ آخر میں خود کہا کرتے تھے کہ جب جاہ نے مجھے مارڈالا' اب گویا ان پر کھلا تھا کہ بے وقوف امام ابوحنیفہ تھے یا حجاج مشہور جملہ کہ "صدر ہر جا کہ نشیند صدر است" خطیب نے لکھا ہے کہ شروع شروع میں آپ ہی کی زبان سے یہ فقرہ نکلا۔

کسی حیثیت سے ثابت ہوئی تھی بصرہ کے جتنے سر برآوردہ افراد جنہوں نے ابراہیم کی حمایت کی تھی ان کے متعلق مسلم بن قتیبہ بصرہ کے گورنر کو حکم دیا گیا کہ ہر ایک کا مکان ڈھا دیا جائے اور ان کے نخلستان کاٹ دیئے جائیں [1]

ابو جعفر کی شتر کینگی

حالت یہ تھی کہ ان ہی حسنی سادات کے ایک فرد جو نفس زکیہ کے صاحبزادے تھے عبداللہ الاشتر کے نام سے مشہور تھے یہ بے چارے سندھ میں ایک ہندو[2] راجہ کی پناہ میں

---

[1] اس فرمان کے متعلق ایک لطیفہ بھی پیش آیا سلم بن قتیبہ کے نام جب ابو جعفر منصور کا یہ فرمان آیا تو اس نے خلیفہ سے لکھ کر دریافت کیا کہ ابتدا کس سے کروں مکانوں سے یا نخلستانوں سے ابو جعفر آگ بگولا ہو گیا اس نے خیال کیا کہ سلم نے میرے ساتھ مذاق کیا ہے اور فوراً معزولی کا فرمان بھیجا گیا بے چارا معزول ہو گیا۔ منصور نے لکھا تھا کہ برنی اور عجوہ کھجوروں کے درختوں کے کاٹنے کا حکم بھیجوں تو مجھ سے تو یہ پوچھے گا کہ کسے پہلے کاٹوں۔؟

[2] یہ ایک بڑا طویل قصہ ہے طبری کامل وغیرہ میں تفصیل پڑھیے حاصل یہ ہے کہ حسنی سادات کے مختلف نمائندے جیسے مختلف علاقوں میں کام کرنے کے لئے بھیجے گئے تھے محمد نفس زکیہ نے اپنے ان ہی صاحبزادے عبداللہ الاشتر کو سندھ کے گورنر کے پاس بھیجا تھا جس کا نام عمر بن حفص تھا اور عام طور پر ''ہزار مرد'' کے نام سے مشہور تھا شاید ایک آدمی ہزار آدمیوں کے برابر بہادری میں سمجھا جاتا ہو گھوڑے بیچنے والوں کے بھیس میں عبداللہ الاشتر سندھ پہنچے ہزار مرد سے ملے' سارا قصہ کہہ سنایا کہ میرے والد اور چچا ابراہیم مقابلہ پر عباسیوں کے نکل آئے ہیں۔ گورنر نے ان کا ساتھ دیا لیکن تھوڑے دن بعد بصرے سے ابراہیم کی شکست کی خبر آئی اور یہ کہ مدینہ کی مہم بھی ناکام ہو گئی تب تو عبداللہ الاشتر کو بڑی پریشانی ہوئی لیکن ہزار مرد نے کہا کہ گھبرائیے نہیں ایک ہندو راجہ قریب ہی میں رہتا ہے اگرچہ وہ اپنے مذہب پر قائم ہے۔ لیکن رسول اللہ ﷺ کا بے حد احترام کرتا ہے اسی کے پاس آپ کو بھیج دیتا ہوں۔ انشاء اللہ آپ کو بڑی عزت و توقیر کے ساتھ رکھے گا' یہی کیا گیا واقعی اس ہندو راجہ نے یہ سن کر کہ پیغمبر اسلام کے خاندان کے آدمی میرے گھر آئے ہیں بہت خوش ہوا اور بالکل شاہزادوں کی طرح حضرت عبداللہ کے قیام کا نظم کر دیا لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا۔ اس کی خبر ابو جعفر کو ملی سندھ کے گورنر پر تقاضا کر کر کے آخر اس نے ان کو شہید ہی کرا دیا راجہ کو اس کا علم بعد کو ہوا۔ [12]

زندگی گذار رہے تھے ان تک کا اس نے پیچھا کیا حتیٰ کہ اس بے چارے ہندو راجہ پر فوج کشی تک کا اس نے حکم دے دیا تھا۔ اگر رضامندی سے عبداللہ الاشتر کو حوالہ کرنے پر راجہ تیار نہ ہوا اگرچہ لڑائی کی نوبت نہیں آئی کہ عبداللہ بغیر لڑائی ہی کے منصور کے آدمیوں کے ہاتھوں شہید ہو گئے لیکن اس سے اس شخص کی شتر کینگی کا اندازہ ہوتا ہے آج تو سینکڑوں سال ان واقعات پر گذر چکے ہیں، لیکن اندازہ کیجئے امام ابوحنیفہ کا کیا حال ہوگا جن کے سامنے یہ واقعات گذر رہے تھے۔

حضرت امام مالک سے انتقام

اور یہ تو خیر براہ راست سیاسی لوگوں کے ساتھ اس کا برتاؤ تھا اسی زمانے میں جب کوفہ سے لوٹ کر بغداد کی تعمیر میں نئے سرے سے مشغول ہوا ہے تو ہم دیکھتے ہیں کہ دارالہجرت کے امام حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ انتقامی کاروائی ہو رہی ہے مطلب یہ ہے کہ محمد نفس زکیہ کے خروج کے قصے میں ذکر کیا گیا تھا کہ لوگوں نے طلاق والی بیعت کا عذر جب پیش کیا تھا تو امام مالک نے یہ فتویٰ دے کر کہ یہ بیعت جبراً زبردستی لی گئی ہے اس لئے طلاق نہیں پڑے گی۔ آپ نے فتویٰ دیا تھا کہ جبری طلاق نہیں پڑی۔ اب واللہ اعلم خود ابوجعفر کا براہ راست فرمان مدینہ پہنچا تھا یا جعفر بن سلیمان عباسی جو اس زمانے میں مدینہ کا والی تھا۔ اس کو اندرونی اشارہ تھا یا خود اس نے اپنے جی سے یہ فیصلہ کیا۔ بہرحال ہوا یہی کہ اسی جعفر بن سلیمان عباسی نے امام مالک پر یہ الزام لگا کر کہ عباسی حکومت کی بیعت کے متعلق تم نے کالعدم ہونے کا چونکہ فتویٰ دیا

لہ حضرت عبداللہ دریائے اٹک کے کنارے شکار کے لئے تشریف لے گئے تھے وہیں عباسیوں کی ایک فوج سے مڈبھیڑ ہوئی اور شہید ہو گئے ایک بچہ اس عرصے میں ان کا سندھ سے بغداد لایا گیا جو بعد کو مدینہ منورہ بھیج دیا گیا جس سے نسل چلی الاشتر کا یہ لفظ عربی ہے اکبر کے وزن پر ہے، اشتر باشتیر جس کے معنی اونٹ کے ہیں یہ فارسی لفظ ہے۔ الاشتر عربی میں اس شخص کو کہتے ہیں۔ جس کی آنکھ کا کچھ حصہ لٹکا ہوا ہو اور کج ہو۔۱۲

ہے جو صریح بغاوت ہے کوڑے سے پیٹا بھی اور بیان کیا جاتا ہے کہ مونڈھے سے حضرت والا کے ہاتھ اتروائے گئے جس کی وجہ سے آخر عمر تک نہ ہاتھ پوری طرح اٹھا سکتے تھے اور نہ بدن پر چادر اپنے دست مبارک سے درست کر سکتے تھے کوڑوں کے متعلق بعض کہتے ہیں کہ تیس کوڑے امام کو لگائے گئے۔ بعضوں نے زیادہ تعداد بتائی ہے۔ یہاں تک کہ بعض روایتوں میں ہے کہ سو کوڑے لگائے گئے۔ یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ مار کی شدت جب حضرت کے لئے نا قابل برداشت ہوگئی تو بے ہوش ہو گئے۔ لوگ چاروں طرف سے دوڑ پڑے۔ کہا جاتا ہے کہ امام کو جب ہوش آیا تو سب سے پہلا فقرہ زبان مبارک پر یہ جاری تھا۔

"لوگو! گواہ رہو کہ میں نے اپنے مارنے والے کو معاف کر دیا۔"

درادردی کا بیان ہے کہ امام کے ساتھ جب یہ حادثہ پیش آیا تو میں وہیں موجود تھا میں نے دیکھا کہ امام پر جب تازیانے کی مار پڑتی تو معاً آپ کی زبان پر یہ دعا جاری ہو جاتی۔

اللھم اغفرلھم فانھم لا یعلمون.[1] پروردگار! ان لوگوں کو معاف فرما دیجئے کیونکہ یہ جانتے نہیں ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ امام دار الہجرت جس کردار اور سیرت کی بلندی کا ثبوت اس واقعہ کے سلسلے میں پیش کیا ہے بجائے خود ایک مستقل مسئلہ ہے اور میرا خیال ہے کہ جیسے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی سیاسی زندگی کے مختلف اجزاء کو سمیٹ کر اس کتاب میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ضرورت ہے کہ امام مالک کے سیاسی خدمات کی اہمیت بھی لوگوں پر ظاہر کی جائے ممکن ہے کہ اللہ کا کوئی بندہ اس خدمت کے ساتھ موفق ہو ان تفصیلات کو اسی کے حوالہ کرتا ہوں کوئی شبہ نہیں کہ امت اسلامیہ کے یہی اکابر ہیں جنہیں یہ کشادہ پیشانی بنی اسرائیل اور دوسری امتوں کے انبیاء و رسل کے سامنے مسلمان چاہیں

---

[1] یہ ساری تفصیلات علاوہ عام کتابوں کے ابن فرحون کی مشہور کتاب دیباج المذہب ص ۲۸ میں مل سکتے ہیں۔ ۱۲

تو پیش کر سکتے ہیں ان بزرگوں کو مسلمانوں میں امامت کا مرتبہ آسانی سے محض دنیا میں عطا کیا گیا ہے اور آخرت میں جو کچھ دیا جائے گا اس کا تو آج اندازہ بھی مشکل ہے۔ میرا خود بھی جی چاہتا تھا کہ جب امام مالک کی اس قربانی کا ذکر چھڑ ہی گیا ہے تو تھوڑے بہت حالات حضرت کے بھی اس ذیل میں درج کر دیتا لیکن کتاب بہت طویل ہو جاتی ماسوا اس کے حضرت والا کے شانِ شایاں بھی یہ نہیں ہے کہ آپ کا ذکر کسی دوسرے امام کے تذکرے کے ذیل میں کیا جائے۔ ادباً ان ہی مختصر الفاظ پر قناعت کرتے ہوئے میں امام ابوحنیفہ کے ساتھ آئندہ جو واقعات پیش آئے ہیں ان کی طرف توجہ کرتا ہوں۔

کہنا یہ چاہتا ہوں کہ جن جن لوگوں نے خروج کے اس واقعہ میں کچھ بھی حصہ لیا تھا جب ان کے ساتھ حکومت کی دارو گیر کا قصہ ہر طرف چھڑا ہوا تھا۔ آخر امام مالک کا قصور کیا تھا؟ پوچھنے پر آپ نے مسئلہ کا جو صحیح جواب آپ کی تحقیق کی رو سے تھا۔ اسی کا صرف اعلان ہی تو کیا تھا اس کے علاوہ تو عملی دلچسپی اس واقعہ میں آپ کی اور کچھ ثابت نہیں بلکہ بالاتفاق ان تمام مورخین نے جنہوں نے امام مالک کے اس فتویٰ کا ذکر کیا ہے ان ہی لوگوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ امام مالک کے فتویٰ کے بعد۔

اسرع الناس الی محمد ولزم مالک بیته.(ص۲۰۶ ج۹ طبری)	لوگ محمد نفس زکیہ پر ٹوٹ پڑے (بیعت کرنے کے لئے) اور امام مالک اپنے گھر جا کر بیٹھ گئے۔

مگر اس عملی بے تعلقی کے باوجود جب امام مالک کے ساتھ یہ سلوک کیا گیا تو امام ابوحنیفہ جو "جہار شدید" کی شکل میں ابراہیم کا ساتھ دے رہے تھے اور عساکر عباسیہ کے سب سے بڑے سپہ سالار حسن بن قحطبہ کو عین وقت پر خلیفہ کے حکم سے سرتابی پر آمادہ کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے ان کا جرم یقیناً امام مالک سے سخت اور زیادہ سخت تھا' لیکن یہ عجیب بات ہے کہ امام مالک سے انتقام لینے میں اتنی جلدی کی جاتی ہے یعنی ابن فرحون کا بیان ہے کہ:

کان ضربه سنة ست واربعین ومائة. (ص ۲۸)	حضرت امام مالک کے ساتھ مار کا واقعہ ۱۴۶ھ ہجری میں پیش آیا۔

جس کے معنی یہی ہوئے کہ خروج کی مہم کے اختتام کے چند مہینے مشکل ہی سے گذرے ہوں گے کیونکہ ابراہیم کی شہادت ۱۴۵ھ شوال میں ہوئی اور جعفر بن سلیمان ربیع الاول ۱۴۶ھ میں مدینہ کا والی مقرر ہو کر پہنچا ہے پہنچنے کے ساتھ ہی حضرت امام مالک کے ساتھ اس نے یہ کارروائی کی ہے۔

سوال یہی پیدا ہوتا ہے کہ امام مالک تو اتنی دور مدینہ میں تھے ان سے بدلہ لیا جائے اور امام ابو حنیفہ سامنے کوفہ میں مقیم میں کوئی واقعہ ایسا نہیں ملتا جس سے ثابت ہو کہ امام کی بھی اس عرصے میں حکومت سے کوئی باز پرس ہوئی ہو زیادہ سے زیادہ کوئی واقعہ جس سے حکومت کے بدلے ہوئے رویہ کا پتہ چلتا ہے جیسا کہ عرض کر چکا ہوں وہ بغداد کی تعمیری مشورے میں اس دفعہ امام کے بغیر حجاج بن ارطاۃ کی طلبی کا واقعہ ہو سکتا ہے۔ صحیح ہے کہ امام ابو حنیفہ کی وفات کے سلسلہ میں واقعات کا تذکرہ کرتے ہوئے لوگوں نے منجملہ دوسرے اسباب کے ابراہیم بن عبداللہ کے خروج میں امام کی شرکت کا بھی ذکر اس حیثیت سے کیا ہے کہ حکومت اس کا انتقام لینا چاہتی تھی لیکن ظاہر ہے کہ امام کی وفات ۱۵۰ھ میں ہوئی ہے جس کے معنی یہ ہوئے کہ امام کی گرفت اس واقعہ کے سلسلہ میں اگر ہوئی بھی ہے تو واقعہ خروج کے چار سال بعد ہوئی ہے' دریافت طلب یہی ہے کہ سب کی دھر پکڑ کے ساتھ اتنی طویل مدت تک امام سے حکومت نے تعرض کیوں نہیں کیا اور اتنے دن خلاف توقع باز پرس سے جو بچے رہے تو کیوں بچے رہے۔؟

سوانح نگاروں نے تو اس کا کوئی متعین جواب نہیں دیا ہے لیکن اس موقعہ پر بھی ہم واقعات کو پیش کر دیتے ہیں میرا خیال ہے کہ ان ہی میں اس سوال کے جواب کو شاید ہم پا سکتے ہیں۔

حضرت امام مالک کو کوڑوں کی سزا

مطلب یہ ہے کہ جعفر بن سلیمان جس نے حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کو تازیانہ کی سزا دی تھی اس شخص کا حال تو یہ تھا کہ ابراہیم بن عبداللہ کی مہم میں بعض اہم جنگی کارناموں میں کامیاب ہونے کے صلہ میں پہلی دفعہ مدینہ منورہ کا والی بن کر گیا تھا گویا سمجھنا چاہیے کہ نیا نوکر تھا نئے نوکروں کا پرانا دستور ہے کہ خرگوش پکڑنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن کوفہ کا معاملہ بالکلیہ اس کے برعکس تھا عیسیٰ بن موسیٰ جو السفاح کے زمانے سے کوفہ کا والی تھا۔ تقریباً گیارہ بارہ سال سے مسلسل کوفہ کی حکومت اس کے ہاتھ میں تھی۔ حالانکہ اسی بے چارے کی کوششوں سے نفس زکیہ اور ابراہیم کے یہ سارے قصے ختم ہوئے تھے۔ لیکن بجائے کسی صلہ کے ابوجعفر منصور نے اس کو بدلہ یہ دیا کہ السفاع نے ابوجعفر کے بعد عباسی حکومت کی خلافت کے لئے حالانکہ باضابطہ بیعت اسی عیسیٰ بن موسیٰ کے لئے لی تھی لیکن ابوجعفر کی نیت بدل گئی اور نیت تو اس کی پہلے ہی سے بدلی ہوئی تھی۔ میں نے شاید ذکر بھی کیا تھا کہ مدینہ جس وقت اس کو روانہ کر رہا تھا اس وقت بھی دل میں اس کے یہی خیال تھا کہ نفس زکیہ اگر ختم ہوئے جب بھی میرا فائدہ ہے اور عیسیٰ کام آیا جب بھی میری راہ کا کانٹا نکل جائے گا۔ میں نے کہا تھا کہ خلیفہ ہونے کے بعد ابوجعفر چاہتا تھا کہ اس کے بعد گدی پر اس کا بیٹا مہدی بیٹھے۔ اندر ہی اندر اس خیال میں غلطاں پیچاں رہتا تھا' حسنی سادات کے اس خطرے سے مطمئن ہونے کے بعد فضا کو اپنے مطابق پا کر اب علانیہ اپنے خیال کو ظاہر کرنے لگا' آخر ایک دن بلا کر صاف صاف اپنے ارادے کا اس نے اعلان بھی کر دیا عیسیٰ بن موسیٰ پر اس کا اثر جو کچھ ہو سکتا تھا۔ ظاہر ہے دونوں میں زمانہ تک سوال و جواب کا ایک سلسلہ جاری رہا۔ بیسیوں واقعات اس سلسلہ میں پیش آئے بالآخر عیسیٰ بے چارے کو مجبوراً مہدی کے لئے اپنے حق سے دست بردار ہونا پڑا۔[1]

---

[1] مورخین نے اس سلسلہ میں بہت سے واقعات بیان کئے ہیں عیسیٰ کو ابوجعفر نے زہر بھی پلا دیا تھا جس سے وہ اچھا ہو گیا۔ بعض کہتے ہیں کہ گیارہ ملین درم دے کر عیسیٰ کو ابوجعفر نے راضی کیا یہ ۱۲

مجھے اس پورے قصے سے بحث نہیں بلکہ کہنا یہ ہے کہ کوفہ اور کوفہ کے سارے معاملات جس کے ہاتھ میں برسوں سے تھے اسی سے حکومت جب بگڑ گئی تھی اور زمانہ تک بگاڑ کا یہ قصہ چھڑا رہا" بسا اوقات نازک ترین صورت اختیار کر لیتا تھا ایسی صورت میں اگر امام ابوحنیفہ کی طرف سے اغماض اور چشم پوشی میں حکومت اپنی مصلحت سمجھتی ہو تو غالباً محل وقوع کا اقتضا بھی یہی تھا۔

حجاج بن ارطاۃ کی پہلی نحوست

ایک طرف تو کوفہ کے والی کے متعلق یہ مسئلہ چھڑا ہوا تھا دوسری طرف یہ ہوا کہ امام ابوحنیفہ کو چھوڑ کر کوفہ کے جس عالم کو منصور نے بڑھانا چاہا تھا یعنی حجاج بن ارطاۃ اپنے علم و فضل کے لحاظ سے خواہ ان کا مرتبہ کچھ ہی ہو لیکن مسلسل ان سے ایسے حرکات صادر ہونے لگے کہ امام ابوحنیفہ تو خیر امام ابوحنیفہ ہی تھے کسی معمولی مولوی سے جو توقعات قائم کیے جاتے ہیں وہ بھی ان سے پورے نہیں ہو رہے تھے سب سے پہلی نحوست اس شخص کی یہ تھی کہ دنیا کے شہروں میں جس شہر کو تاریخی امتیاز ہونے والا تھا اس کی پہلی جامع کے قبلہ ہی کو اس نے غلط کر دیا۔ خیال کیا جا سکتا ہے کہ ہر پانچ وقت میں لوگوں کو اس مسجد میں اپنے آپ کو اور اپنی صفوں کو خواہ مخواہ ٹیڑھی رکھنے پر جو مجبور ہونا پڑتا ہوا اس وقت بے

لہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ ابوجعفر نے فوج کو اس پر آمادہ کیا کہ وہ مہدی کے سوا اور کسی کی خلافت پر آئندہ راضی نہیں ہیں اس کا اعلان کریں مہدی اس زمانہ میں نوجوان تھا۔ کہتے ہیں کہ فوج والے عموماً یہ نعرہ لگاتے تھے کہ ع۔ فقدر ضینا بالغلام الامرد یعنی ہم لوگ تو اس امرد لڑکے کی حکومت پر راضی ہیں، خود ابوجعفر بھی عیسیٰ کو بلا بلا کر سمجھا جاتا کہ برادر عزیز! ہم کیا کریں فوج والے اس لونڈے (فتی) کے سوا اور کسی کو خلیفہ بنانے پر راضی نہیں میں یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ عیسیٰ بن موسیٰ کے پیچھے پیچھے بھی فوجی یہ آواز لگاتے ہوئے چلتے کہ یہی وہی (موسیٰ) کی گائے ہے جسے آخر لوگوں نے ذبح کر دیا۔ اگرچہ ذبح کرنا نہیں چاہتے تھے۔ یعنی قرآنی آیت فذبحوھا وما کادوا یفعلون پڑھتے عیسیٰ منصور سے اس کی شکایت کرتا تو جواب میں کہتا کہ میں کروں کیا ان فوجیوں کے قلب میں تو اسی فتی (نوجواں) کی محبت رچ گئی ہے۔ ۱۲

ساختہ زبانوں سے جس قسم کے الفاظ حجاج کے حق میں نکلتے ہوں گے ان کے بعد ان کی وقعت بھلا کیا باقی رہ سکتی ہے شاید کوئی دوسرا خلیفہ یا بادشاہ ہوتا تو مصارف کے مسئلہ سے بے پروا ہو کر اس مسجد کو شہید کرا کے پھر بنوا بھی دیتا لیکن ابوالدوانیق منصور سے اس کی بھی بھلا کیا توقع ہو سکتی تھی غالباً یہ پانچوں وقت کا مشغلہ نماز پڑھنے کے وقت نمازیوں کا ایسا دستور بن گیا ہوگا کہ حجاج کو شاہی کیمپ میں زیادہ دن تک ابوجعفر رکھ بھی نہ سکا۔ اور پہلے بصرہ پھر کوفہ کے قاضی بنائے گئے۔ لیکن بصرہ پہنچ کر جیسا کہ مورخین نے لکھا ہے۔ ان پر رشوت ستانی کا الزام قائم ہوا البصرہ سے منتقلی کے بعد کوفہ پہنچے تو جہاں غربت کی زندگی بسر کر چکے تھے اسی کوفہ میں عوام کے مجمع میں شریک ہونے سے قاضی ہونے کے بعد ان کو شرم آنے لگی۔ اسی جذبہ کے تحت حمایت بلکہ جمعہ تک کی شرکت بندہ خدا نے ترک کر دی۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ طبقات ابن سعد وغیرہ میں جو یہ لکھا ہے کہ پہلے یہ ابو جعفر منصور کی مصاجہت میں تھے بعد کو منصور نے ان کو اپنے بیٹے مہدی کے ساتھ خراسان روانہ کر دیا۔ اس کی وجہ یہ بھی یہی معلوم ہوتی ہے اپنے آپ کو عراق میں حجاج بن ارطاۃ نے اتنا رسوا اور بدنام کر لیا تھا کہ کوئی چارہ کار اس کے سوا نہ تھا کہ انہیں عراق سے دور خراسان وغیرہ علاقے میں کھدیڑ دیا جائے۔ منصور کو کچھ تو اپنی بات کی بھی پچ تھی۔ امام ابوحنیفہ کے مقابلہ میں ان کو اس نے بلایا تھا' اب خود ہی نہیں چاہتا تھا کہ ان کو گرایا جائے دوسرے انہوں نے اس زمانہ کے علماء کی روش سے الگ ہو کر عباسیوں کے شعار خاص (لباس سیاہ) کو بھی ابوجعفر کی خوشامد میں اختیار کر لیا تھا الغرض کچھ ان ہی باتوں کی مروت تھی جو نکالے تو نہیں گئے۔ لیکن عراق کے عوام کی نگاہوں سے دور کر دیئے گئے۔

ابوجعفر کی امام مالک سے سیاسی معافی

ہم دیکھتے ہیں کہ اسی زمانے میں ابوجعفر اچانک حج کا ارادہ کرتا ہے اور حج کے سلسلہ میں وہ مدینہ منورہ پہنچتا ہے اور وہی امام مالک جن کے ساتھ اس کے عامل سلیمان بن جعفر نے ابھی ابھی وہ سب کچھ کیا تھا جس کا ذکر گذرا ان ہی امام مالک کو خصوصیت

کے ساتھ اپنے پاس بلاتا ہے اور سلیمان نے جن حرکات کا ارتکاب کیا تھا اس کو سلیمان کا ذاتی فعل قرار دیتے ہوئے ان کی معافی چاہتا ہے صرف معافی ہی نہیں چاہتا ہے بلکہ لکھا ہے کہ امام مالک جب واپس تشریف لے گئے تو مدینے کے اسی والی جعفر بن سلیمان کو پکڑ وا کر امام مالک کے پاس اس نے روانہ کیا اور کہلا بھیجا کہ:

حضرت کے ساتھ جو بدسلوکی اس نے کی ہے اس کو بھیج رہا ہوں آپ جس طرح چاہیں اس سے بدلہ لے سکتے ہیں۔ (ص ۲۸ الدیباج المہذب)

جیسا کہ حضرت امام کی فطرت عالی کا اقتضاء تھا آپ نے جواب میں فرمایا کہ:

خدا کی پناہ! قسم ہے اللہ کی ہر کوڑا جو میرے بدن پر اٹھایا گیا' رسول اللہ ﷺ کی قرابت کا خیال کر کے اسی وقت معاف کرتا چلا جاتا تھا۔''

ابوجعفر کی حضرت امام مالک سے تعلقات وسیع کرنے کی کوشش

ابوجعفر نے اس پر قناعت نہیں کی بلکہ جب تک مدنیہ میں رہا معلوم ہوتا ہے کہ امام مالک سے اپنے تعلقات کو روز بروز زیادہ بڑھاتا چلا جاتا تھا اور بھی مختلف طریقوں سے حضرت امام کی دل جوئیوں میں ہم اس کو مشغول پاتے ہیں' خود امام مالک اس قصے کے راوی ہیں کہ ان ہی دنوں میں جب ابوجعفر منصور مدینہ منورہ میں تھا میں اس کے پاس پہنچا ابوجعفر اس وقت گدے پر بیٹھا ہوا تھا' میں بھی پاس ہی بیٹھ گیا۔ اتنے میں میں نے دیکھا کہ ایک بچہ ہے جو کبھی باہر آتا ہے اور پھر اندر چلا جاتا ہے ابوجعفر نے مجھ سے پوچھا کہ آپ جانتے ہیں یہ بچہ کون ہے میں نے کہا نہیں ابوجعفر نے کہا کہ یہ میرا لڑکا ہے آپ کی ہیبت اور رعب سے اس کی یہ حالت ہو رہی ہے جو گھبرا گھبرا کر کبھی اندر جاتا ہے اور کبھی باہر آتا ہے۔''

امام مالک فرماتے ہیں کہ اس کے بعد ابوجعفر مجھ سے بعض علمی مسائل دریافت کرنے لگا' جن میں بعض کے متعلق حلال ہونے کا اور بعض کے متعلق حرام ہونے کا میں نے فتویٰ دیا' آخر میں میں نے دیکھا کہ مجھ سے کہہ رہا ہے۔

انت والله اعقل الناس واعلم الناس. تم خدا کی قسم (اس وقت) لوگوں میں سب سے زیادہ دانشمند اور سب سے زیادہ علم والے ہو۔

امام مالک فرماتے ہیں کہ یہ سن کر میں نے کہنا شروع کیا کہ۔

لا والله یا امیر المومنین. نہیں امیر المومنین خدا کی قسم واقعہ یہ نہیں ہے۔

لیکن اس پر بھی ابوجعفر یہ کہتا جاتا تھا کہ:

''نہیں تم ضرور سب سے بڑے دانشمند اور سب سے بڑے عالم ہو مگر اپنے آپ کو تم چھپاتے ہو۔''

لیکن یاد ہوگا کہ:

یا امیر المومنین هذا عالم الدنیا الیوم. امیر المومنین! آج دنیا میں سب سے بڑا عالم یہی ہے۔

کے الفاظ سے ابھی کچھ دن پہلے دجلہ کے شاہی کیمپ میں ابوجعفر سے امام ابوحنیفہ کوفہ کے کوتاہ بخت والی عیسیٰ بن موسیٰ نے روشناس کرایا تھا جسے ولی عہدی کے عہدے سے معزول کر کے ابوجعفر حج میں آیا ہوا ہے۔

ابوجعفر کا تدوین فقہ مالکی کے متعلق اظہار خیال

کون کہہ سکتا ہے کہ ابوجعفر امام مالک پر اسی ''عالم الدنیا الیوم'' کا عہدہ اس وقت بلیغ اصرار کے ساتھ جو پیش کر رہا تھا تو اس کے دماغ میں حکومت کے باغی ابوحنیفہ اور معزولی ولی عہد کی یہ بات نہ تھی؟

اگر میں زندہ رہا تو تمہارے قول (یعنی اجتہادی مسائل) کو قطعاً لکھوا کر رہوں گا اور اپنے تمام صوبوں میں بھیج کر حکم کروں گا کہ لوگ اسی کے مطابق عمل کریں۔ (ص ۲۲۶)

جیسا کہ ابوجعفر کے اس بیان سے بھی معلوم ہوتا ہے اور یہی واقعہ بھی ہے کہ آج جس مذہب کو امام مالک کی طرف منسوب کیا جاتا ہے اسی وقت نہیں جب ابوجعفر یہ کہہ رہا

تھا بلکہ اس کے بعد بھی امام مالک کی زندگی میں مدون اور مرتب نہیں ہوا تھا[1] بلکہ سچ یہ ہے کہ خود امام مالک کی یہ کوشش بھی نہیں تھی کہ مسلمانوں کی زندگی کے تمام شعبوں کو پیش نظر رکھ کر کتاب و سنت سے ان کے متعلق قوانین پیدا کئے جائیں بلکہ جہاں تک حضرت والا کے حالات سے معلوم ہوتا ہے طریقہ آپ کا یہ تھا کہ پوچھنے والے نے اگر پوچھا تو اپنے معلومات کی بنا پر جو جواب آپ کے نزدیک ہوسکتا تھا وہ دے دیتے تھے بلکہ بسا اوقات

---

[1] دراصل تدوین فقہ اسلامی کی تاریخ کا یہ بڑا اہم اساسی مسئلہ ہے تفصیل اس کی انشاء اللہ وہیں کی جائے گی ابواسحاق شیرازی کی طبقات الفقہاء اور ابن خلکان کی تاریخ ان لوگوں کو پڑھنا چاہیے جو اس مسئلہ کی تحقیق کرنا چاہتے ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ امام مالک کی زندگی کے آخری دنوں میں قیروان (مغربی افریقہ) سے ایک صاحب اسد بن فرات پڑھنے کے لئے مدینہ امام مالک کے پاس آئے یہ بڑے ذہین آدمی تھے اور تھے نوجوان دماغ ان کا فطرتاً قانونی تھا امام مالک سے طرح طرح کے سوالات کرتے جن کے امام عادی نہ تھے آخر ایک دن آپ نے فرمایا کہ سلسلة بنت سلسلة اذا کان کذ کذاً (یعنی بھائی یہ تو ایک زنجیر کے بعد دوسری زنجیر اس کی بیٹی پیدا ہوتی ہی چلی جائے گی۔ ایسا ہوتو کیا ہوگا۔ یوں ہوتو کیا ہوگا) اور اسد سے آپ نے فرمایا کہ اپنے ذوق کی تشفی اگر چاہتے ہوتو عراق چلے جاؤ یعنی ابوحنیفہ کے شاگردوں کے پاس چلے جاؤ۔ اسد حسب ارشاد عراق پہنچے امام ابو حنیفہ کے مختلف شاگردوں سے استفادہ کرتے ہوئے آخر میں انہوں نے امام محمد کو پکڑ لیا۔ امام محمد نے بھی پوری توجہ سے ان کو پڑھانا شروع کیا۔ لکھا ہے کہ چونچ ڈال کر چڑیا جیسے اپنے بچوں کو دانہ کھلاتی ہے اسی طرح امام محمد نے اسد کو فقہ گھول کر پلا دی۔ اسد نے اس عرصے میں امام ابوحنیفہ کی مجلس وضع قوانین کی مدونہ کتابوں کی نقلیں بھی حاصل کیں۔ ان کو لے کر وہ مصر پہنچے اور امام مالک کے شاگردوں خصوصاً ابن القاسم سے انہوں نے ان ہی حنفی مذہب کی کتابوں کی روشنی میں امام مالک کے فتووں کو جمع کیا۔ کرتے یہ تھے کہ سوال تو امام ابوحنیفہ کی کتابوں سے چنتے اور جواب اس کا ابن القاسم امام مالک کے مذاق کو پیش نظر رکھ کر جو دیتے اسے درج کر لیتے یوں انہوں نے امام مالک کے اجتہادات کو ایک کتاب کی شکل میں مدون فرما دیا تھا۔ ابتداء میں اس کتاب کا نام الاسدیہ تھا بعد کو سحنون ایک مالکی امام نے اس میں کچھ ردو بدل کیا "مدونہ" "امام مالک" کے نام سے اب یہی سحنون والا نسخہ مشہور و متداول ہے چھپ بھی گیا ہے جس کا مطلب یہی ہوا کہ امام مالک کا مذہب امام ابوحنیفہ ہی کی مجلس کے سوالات کی روشنی میں مدون ہوا ہے تفصیلی بحث کے لئے تدوین فقہ کا انتظار کیجئے۔ ۱۲

آپ یہ بھی فرما دیتے کہ مجھے معلوم نہیں کہ اس کا کیا جواب دیا جائے بیسیوں سوالات کے متعلق علما نے لکھا ہے امام مالک نے لا ادری یعنی ہم نہیں جانتے فرمایا۔

لیکن ابوجعفر کے ان الفاظ سے معلوم ہو رہا ہے کہ وہ امام مالک کے اجتہادی نتائج کو کسی باضابطہ قانون کی شکل میں مرتب کرانے کا مسودہ طے کر چکا تھا اور یہ بھی کہ اسی کو حکومت کا **قانون** قرار دیا جائے یہ رائے بھی اس کے سامنے آ چکی تھی۔

تدوین فقہ مالکی سے ابوجعفر کا پوشیدہ سیاسی مقصد

سوال یہی ہوتا ہے کہ اس سے پہلے یہ خیال اس کے دماغ میں کیوں نہیں آیا امام مالک اور ان کے علم کی شہرت تو ایک زمانے سے پھیلی ہوئی تھی کئی دفعہ منصور مدینہ آیا اور آ کر چلا گیا لیکن اس قسم کے خیالات اس سے پیشتر کبھی کسی کے سامنے ظاہر نہیں کیے۔

ایسی صورت میں کیا یہ صرف بے بنیادی نری بدگمانی ہی ہوگی اگر سمجھا جائے کہ امام ابوحنیفہ کے مقابلہ میں وہ ایک نئی زمین حجاج بن ارطاۃ سے مایوس ہونے کے بعد تیار کرنی چاہتا تھا یہ دعویٰ تو شاید حد سے زیادہ متجاوز ہوگا۔ اگر ابوجعفر کے اس سفر حج کی اصلی غرض یا اس سفر کا مشن اسی مقصد کو قرار دیا جائے لیکن منجملہ دوسرے اغراض کے اگر ایک غرض اس کی یہ بھی ہو تو اس کے انکار کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی۔

اس وقت تو جس کا جی چاہے جتنا بڑا دعویٰ چاہے کر بیٹھے۔ لیکن میں جب سوچتا ہوں کہ اس وقت کی دنیا کی سب سے بڑی حکمراں طاقت اعقل الناس' اعلم الناس کا خطاب دیتے ہوئے اپنی حکومت کے سارے وسائل امام مالک کے قدموں کے نیچے اس لئے ڈال دیتا ہے کہ اپنے اجتہادات وخیالات کو جس طرح چاہیں مدون ومرتب کر کے حکومت کے قانون کی حیثیت سے ان کو نافذ کر دیں اپنے اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر انصاف کرنا چاہئے کہ کرنے والے کیا کچھ نہ کر گذرتے بہ ظاہر اس میں شرعی خرابی بھی کوئی نہ تھی بلکہ میں عرض کر چکا ہوں کہ امام ابوحنیفہ تو یہی چاہتے بھی تھے اسی لئے انہوں نے شریعت اسلامی کو ایک باضابطہ دستور اور آئین کے قالب میں ڈھال بھی دیا تھا لیکن امام مالک کو
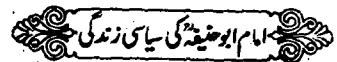
جس چیز نے امام مالک بنادیا وہ ان کی یہی بے نفسی اور ظرف کی وسعت فطرت کی بلندی تھی۔

امام مالک کا جواب

انہوں نے ابو جعفر کے اس ارادے سے واقف ہونے کے بعد جو بات جواب میں فرمائی کہ آج تک تاریخ میں گونج رہی ہے مختلف مواقع پر نقل کرنے والے اسے نقل کرتے ہیں آپ نے خلیفہ کو خطاب کر کے فرمایا۔

"امیر المومنین! آپ ہرگز ہرگز ایسا نہ کیجئے دیکھئے! مسلمانوں کے پاس (مختلف علماء) کے اقوال پہلے سے پہنچ چکے ہیں، وہ حدیثیں سن چکے ہیں اور روایتیں روایت کر چکے ہیں، لوگوں کے پاس جو بات پہلے پہنچ چکی ہے اسی پر وہ عمل پیرا ہو چکے ہیں اور اسی کو اپنا دین بنا چکے ہیں پس جس علاقے کے باشندوں نے جو باتیں اختیار کر لی ہیں ان کو ان کے حال پر چھوڑ دیجئے (میزان الکبریٰ شعرانی وغیرہ)

امام مالک کے اس مشہور قول سے مسلمانوں کے فروعی اختلافات کے متعلق ان کے جس نقطہ نظر کا پتہ چلتا ہے۔ "تدوین فقہ" والے مقالے میں جس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے وہ تو خیر ایک الگ مستقل مسئلہ ہے یہاں میں دوسری بات کہنا چاہتا ہوں یعنی اگر یہ سمجھا جائے کہ علماء عراق کہئے یا ابو حنیفہ اور ان کے تلامذہ کہیے ان کے مقابلہ میں ابو جعفر جس مخالفانہ محاذ کے قائم کرنے کی تدبیریں کر رہا تھا اور حضرت امام مالک سے اس معاملہ نفع اٹھانا چاہتا تھا اور امام مالک نے اس کے اس تیر کو اپنی ترکیب سے اسی کی طرف مسترد کرنا چاہا ہو تو اس پر تعجب نہ کرنا چاہیے ظاہر ہے کہ امام مالک حجاج بن ارطاۃ جیسے ہلکے پھلکے عالم تو تھے نہیں کہ حکومت کے میلان کو پاتے ہی امام ابو حنیفہ کو بے وقوف قرار دیتے ہوئے اپنا سب کچھ اسی کے قدموں میں نثار کرنے کے لئے آمادہ ہو جاتے خدانخواستہ اگر وہ بھی ذہنی ہوتے تو آج جیسے حجاج اور ان جیسے دوسرے اہل علم اپنے آپ

کو گم کر بیٹھے شاید امام مالک بھی ان ہی گم شدہ لوگوں میں شریک ہو جاتے لیکن وہ جان رہے تھے کہ بذات خود بات غلط ہو یا صحیح لیکن جس مقصد کے لئے پیش کرنے والا پیش کر رہا ہے وہ مقصد قطعاً غلط ہے۔

میرا تو خیال ہے کہ مسلمانوں ہی کی تاریخ میں نہیں بلکہ دنیا کی تاریخوں میں بھی نیک نفسی، بلند نظری، انجام بینی کا ایک ایسا نمونہ امام مالک نے چھوڑا ہے جس کی نظیر مشکل ہی سے مل سکتی ہے بہ ظاہر ایک بڑے بھر پورے موقعہ کو گویا انہوں نے کھو دیا لیکن میں خدا کے لئے انہوں نے کھویا تھا واقعات نے ثابت کیا کہ اس نے نہ امام کو گم ہونے دیا اور نہ ان کے خدمات کو[1]

خلاصہ یہ ہے کہ امام ابوحنیفہ اور ان کے علمی خدمات کا جو اثر حکومت عباسیہ کے مرکز عراق اور دوسرے مشرق ممالک پر قائم ہو گیا تھا۔ اس اثر اور اقتدار کے ختم کرنے کی یہی ایک واحد تدبیر تھی کہ امام مالک کو ابوحنیفہ کے مقابلہ میں لا کھڑا کر دیا جائے مجموعی

---

[1] میرا مطلب یہ ہے کہ جیسا کہ میں نے عرض بھی کیا ہے کہ حضرت امام مالک نے اپنی زندگی اپنے اجتہادات کو باضابطہ کسی کتاب کی شکل میں مدون بھی نہیں فرمایا بلکہ ان کے مشہور تلمیذ اشہب کے حوالہ سے لوگوں نے نقل کیا ہے کہ کسی سوال کا جواب امام نے دیا اشہب موجود تھے انہوں نے چاہا کہ اس جواب کو قلم بند کر لیں۔ مگر دیکھا کہ امام منع فرما رہا ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ لکھو مت میں نہیں جانتا ہوں کہ اس جواب پر آئندہ میں قائم بھی رہوں گا یا نہیں۔ (ص ۱۲۴ ابن فرحون) لیکن خدا نے ان کے بعد ایسے لوگوں کو کھڑا کر دیا جنہوں نے امام کے مذہب کو باضابطہ شکل میں مدون کر دیا اور ٹھیک جیسے مشرق میں عباسی حکومت حنفی مذہب کو اپنی حکومت کا قانون بنانے پر مجبور ہوئی اندلس کی اموی حکومت کے سلاطین کو خدا نے توفیق بخشی انہوں نے امام مالک کی فقہ کو اپنی مغربی حکومت کا دستور بنا لیا امام کی خوش نیتی ہی کا نتیجہ یہ ہے کہ مالکی فقہ میں بڑے بڑے کبار علماء پیدا ہوئے کہنے والوں نے سچ کہا ہے کہ حنفی مذہب میں لوگ بڑے بڑے ہیں لیکن کتابیں زیادہ بڑی تصنیف نہیں ہوئیں اور شوافع میں کتابیں بڑی بڑی لکھی گئیں۔ لیکن لوگ اتنے بڑے نہیں پیدا ہوئے لیکن مالکی فقہ کی یہ خصوصیت ہے کہ لوگ بھی بڑے بڑے پیدا ہوئے اور کتابیں بھی اس فقہ میں بڑی معرکۃ الآرا لکھی گئیں جو واقعات سے واقف ہیں وہ اس کی تصدیق کر سکتے ہیں میرا تو خیال ہے کہ امام مالک کو اپنی اسی قسم کی قربانیوں کا قدرت کی طرف سے صلہ ملا فرحمۃ اللہ علیہ وجعلنا من احبائہ ۔۱۲

حیثیت سے اس وقت سارے اسلامی ممالک میں امام مالک ہی کی ہستی ایسی تھی جن سے حکومت امام ابوحنیفہ کے مقابلہ میں فائدہ اٹھا سکتی تھی۔ لیکن امام نے اپنے چند الفاظ نے ابوجعفر کے اس آخری امید کو بھی ختم کر دیا۔

عباسی حکومت کی حضرت امام مالک کو آلہ کار بنانے کی کوشش اور اس کی مایوسی

اگرچہ عباسی حکومت کی طرف سے وقتاً فوقتاً خود ابوجعفر کے زمانے میں بھی اور ابو جعفر کے بعد مہدی اور ہارون الرشید کے عہد میں بھی امام مالک کو مختلف طریقوں سے دوبارہ آمادہ کرنے کی کوششیں ہوتی رہیں۔ لیکن امام کا فیصلہ امام کا فیصلہ تھا جو کچھ انہوں نے پہلی دفعہ ابوجعفر سے کہا تھا وہی آخر وقت تک کہتے رہے ان کے سوانح نگاروں نے ان واقعات کا تفصیل سے اپنی کتابوں میں ذکر کیا ہے اسی سلسلہ کا ایک مشہور لطیفہ مہدی کے زمانہ کا ہے جو ابوجعفر منصور کے بعد عباسی خلیفہ تھا یعنی لکھا ہے کہ مہدی مدینہ منورہ آیا تھا۔ اپنے آنے کی تقریب کے سلسلے میں دو ہزار اشرفیاں امام مالک کی خدمت میں ہدیۃً بھیجیں۔ امام نے اشرفیاں لے لیں اسی دن یا چند دن بعد مہدی کا حاجب (عرض بیگی) ربیع امام کے پاس حاضر ہوا اور مہدی کا یہ پیغام پہنچایا کہ امیر المومنین کی خواہش ہے کہ مدینۃ السلام بغداد ان کے ساتھ آپ بھی چلتے کہتے ہیں کہ امام نے جواب میں ربیع سے کہا کہ ''المال عندی علی حالہ'' (یعنی جو اشرفیاں خلیفہ نے بھیجی ہیں وہ بجنسہ اسی طرح رکھی ہوئی ہیں۔ مطلب یہ تھا کہ ان اشرفیوں کے دباؤ اور معاوضہ میں خلیفہ نے اگر یہ حکم دیا ہے تو میں نے ان کو چھوا بھی نہیں ہے جس حال میں آئی ہیں اسی حال میں واپس ہو سکتی ہیں پھر آپ نے ربیع کو رسول اللہ ﷺ کا قول سنایا جو آپ فرمایا کرتے تھے کہ مدینہ والوں کے بہر حال مدینہ ہی بہتر ہے کاش! لوگ اس کو جانتے۔[1]

---

[1] حدیث کے اصلی الفاظ یہ ہیں المدینۃ خیر لھم لو کانوا یعلمون ص ۲۲۶ معجم المصنفین ج ۲۔

جیسا کہ میں نے شروع ہی میں بیان کر دیا ہے کہ ابوجعفر منصور اور امام ابوحنیفہ کے درمیان قضاء وغیرہ کے قصوں کو لوگوں نے کچھ اسی طرح بیان کیا ہے کہ ان میں کسی قسم کی زمانی ترتیب کا قائم کرنا مشکل ہے۔

حضرت امام کے متعلق ابوجعفر کا آخری فیصلہ

لیکن جہاں تک میرا خیال ہے حجاج بن ارطاۃ کے تجربہ کی ناکامی اور امام مالک کے جواب سے جو مایوسی اس میں پیدا ہوئی اسی کے بعد امام ابوحنیفہ کے متعلق خرج ابراہیم کا واقعہ کے بعد جس طرز عمل کو اب تک وہ اختیار کئے ہوئے تھا یعنی بظاہر امام سے اپنے آپ کو اس نے کچھ بے تعلق سا بنا رکھا تھا۔ لیکن ان مرحلوں کو طے کرنے کے بعد میرا خیال ہے کہ امام ابوحنیفہ کے متعلق آخری فیصلہ کا اس نے قطعی ارادہ کر لیا اور آئندہ جو واقعات امام اور ابوجعفر کے درمیان پیش آئے ہیں میرے نزدیک اسی آخری فیصلے تک پہنچنے کی یہ تدبیریں تھیں۔

بغداد کی تعمیر کی مدت

امام ابوحنیفہ کی وفات ۱۵۰ھ ماہ رجب میں ہوئی اور بغداد کی تعمیر میں دوسری دفعہ ابوجعفر ۱۴۶ھ سے مشغول ہوا جیسا کہ لوگوں کا بیان ہے پوری تعمیر سے چار سال میں فراغت حاصل ہوئی گویا بغداد کی تعمیر کی تکمیل اور امام ابوحنیفہ کی وفات کا زمانہ قریب ہی قریب ہے ان چار سالوں میں سے ۱۴۷ھ تک تو ابوجعفر سفر حج اور امام مالک سے گفتگو کرنے میں مشغول رہا۔ گویا اس بنیاد پر یہ سمجھنا چاہیے کہ ابوجعفر کا امام ابوحنیفہ سے یہ جدید تعلق ۱۴۸ھ سے یا اسی کے کچھ آگے پیچھے زمانے میں پیدا ہوا جہاں تک قیاس کا اقتضاء ہے یہی دو ڈھائی سال کی مدت ہے جس میں امام ابوحنیفہ کو متعدد بار ہم ابوجعفر کے دربار میں پاتے ہیں موفق نے علی بن علی الحمیری کے حوالہ سے یہ الفاظ جو نقل کئے ہیں کہ:

ابوجعفر نے امام کو کوفہ سے بغداد بلا کر اپنے پاس روکا اور قضاء کے عہدے پر (غیر مرۃ) یعنی ایک سے زیادہ مرتبہ مجبور کرتا رہا۔ (ص ۱۷۸ ج ۲)

اس کا یہی مطلب ہے اور غیر مرۃ یعنی ایک سے زیادہ مرتبہ امام کو بلا بلا کر اپنے پاس رکھتا اور قضا کے عہدے کو قبول کرنے پر امام کو مجبور کرتا رہا یہ امام کی زندگی کے ان ہی آخری دو ڈھائی سال کے زمانہ کی باتیں ہیں قرائن و قیاسات کی مدد سے ان واقعات میں جو ترتیب مجھے محسوس ہوتی ہے اسی ترتیب کے مطابق اب ان واقعات کو درج کرتا ہوں۔

کوفہ کا علمی ماحول

واقعہ یہ ہے کہ جس زمانہ کا یہ قصہ ہے اس وقت کوفہ قبۃ الاسلام بنا ہوا تھا نہ صرف مادی دولت و ثروت کی اس شہر میں ریل پیل تھی بلکہ اسی کے ساتھ زہد و تقویٰ علم معرفت کے بیسیوں سرچشمے اپنی اپنی جگہ پر ابل رہے تھے لیکن اس وقت تک مسلمانوں میں علم کی حیثیت سے تین ہی چیزوں کو اہمیت حاصل تھی قرآن اور اس کی قرأت و تجوید' حدیث و سنت' تفقہ و اجتہاد' مرکزیت ان ہی تین علموں کو حاصل تھی ان میں سے ہر علم کے متعدد ائمہ کوفہ میں اس وقت موجود تھے ان میں زیادہ تر تو اسی قسم کے حضرات تھے جو اپنے خاص علم کے سوا دوسرے علم سے کم تعلق رکھتے تھے لیکن بعض ایسے بھی تھے جو اپنے خاص فن کے سوا دوسرے علم سے بھی دلچسپی رکھتے تھے علی الخصوص حدیث و فقہ میں بعض لوگوں کا یہی حال تھا یعنی خصوصی خدمت تو ان کی حدیث و سنت کی روایت تھی مگر پوچھنے والے مسائل بھی ان سے پوچھتے تھے حدیث یا آثار صحابہ فتاویٰ تابعین وغیرہ کی بھی چونکہ یہ حافظ ہوتے تھے اس لئے ان ہی محفوظات و معلومات کی مدد سے لوگوں کو جواب بھی دے دیا کرتے تھے ان میں بعض کبھی کبھی قیاس اور رائے سے بھی کام لیا کرتے تھے اسی لئے ان لوگوں کا شمار ایک طرف اگر محدثین کے طبقہ میں کیا جاتا ہے تو دوسری طرف فقہاء اور مجتہدین کے سلسلہ میں بھی ان کا نام لیا جاتا ہے امام

ابوحنیفہ کے زمانے میں اس قسم کے ممتاز ترین محدث سفیان ثوری تھے ان کا اصلی کام تو یہی تھا کہ حلقہ بنا کر اپنے مرویات لوگوں کو سنایا کرتے تھے جن میں رسول اللہ ﷺ کی حدیثیں بھی ہوتی تھیں اور صحابہ کے فتاویٰ بھی صحابہ کے بعد تابعین نے جو فتوئی دیئے تھے اور ان کی بھی کافی تعداد جمع ہو چکی تھی۔ یہی ان کا سب سے بڑا علمی سرمایہ تھا۔ لیکن یہ بات کہ انسانی زندگی کے ہر ہر پہلو کے متعلق سوال پیدا کرنا اور پھر ان سوالوں کا جواب نکالنا پھر اپنے تلامذہ کو ان کی تعلیم دینا خود ان شاگردوں میں استنباط اور اجتہاد کے ملکہ کو پیدا کرنے کی کوشش کرنا جہاں تک میں جانتا ہوں کم از کم کوفہ میں یہ کام امام ابوحنیفہ کی مجلس وضع قوانین کے سوا اور کہیں نہیں ہوتا تھا' انفرادی طور پر اس کام کا رجحان اس عہد کے علماء کوفہ میں تھوڑا بہت اگر پایا جاتا تھا تو غالباً ابن ابی لیلیٰ و ابن شبرمہ اور سب سے زیادہ ممتاز حجاج بن ارطاۃ تھے ان تینوں بزرگوں کے متعلق کافی معلومات پہلے گذر چکے ہیں۔

سفیان ثوری' شریک بن عبداللہ' مسعر بن کدام اور امام ابوحنیفہ کی بغداد میں طلبی

میرا خیال ہے کہ مدینہ منورہ سے واپس لوٹنے کے بعد ابوجعفر منصور نے امام ابو حنیفہ کو جو بلانا چاہا تو غالباً تنہا بلانا قرین مصلحت خیال نہیں کیا' واللہ اعلم کیا مصلحت پیش نظر تھی۔ ہوسکتا ہے کہ تنہا طلب کرنے میں اندیشہ ہو کہ پبلک میں امام کی اہمیت بڑھ جائے گی یا امام ہی پر یہ اثر قائم کرنا مقصود ہو کہ تمہارے علم و اثر کوئی خاص امتیازی وزن میرے دل میں نہیں ہے۔ ابوجعفر سے جو گفتگو اس موقعہ پر ہوئی ہے اس سے دوسرے خیال کی زیادہ تائید ہوتی ہے۔

بہرحال کہا یہ جاتا ہے کہ کوفہ ابوجعفر منصور کا فرمان پہنچا جس میں لکھا ہوا تھا کہ کوفہ کے حسب ذیل علماء کو فوراً بارگاہ خلافت میں روانہ کیا جائے یعنی ابوحنیفہ' سفیان

ثوری اور ان دو کے علاوہ شریک[1] بن عبداللہ النخعی اور مسعر بن کدام ان دو بزرگوں کے نام بھی تھے۔

اس میں شک نہیں کہ بجائے خود ان دونوں حضرات کا شمار بھی کوفہ کی ممتاز ہستیوں میں تھا لیکن ابوحنیفہ تو خیر ابوحنیفہ ہی تھے سچی بات یہ ہے کہ سفیان ثوری کی صف میں بھی شریک ہونے کے قابل یہ حضرات نہ تھے اگرچہ نوعیت ان دونوں کے علمی خدمات کی

---

[1] قاضی شریک بن عبداللہ کا ذکر مختلف مقامات میں پہلے بھی گذر چکا ہے یہی صاحب ہیں جن کے متعلق ابن خلکان نے نقل کیا ہے کہ مہدی با ورچی نے انڈے کا حلوا کھلا کر خلیفہ سے کہا تھا کہ اب یہ شخص نکل بھاگنے میں کامیاب نہیں ہوسکتا۔ باقی مسعر بن کدام کوفہ کی جامع مسجد میں حدیث بیان کیا کرتے تھے ابن سعد نے لکھا ہے کہ ان کی بوڑھی والدہ بڑی عابدہ زاہدہ تھیں۔ قاعدہ یہ تھا کہ ایک گدا کندھے پر لادے والدہ کو ساتھ لئے ہوئے یہ مسجد میں لا کر اسی گدے کو بچھا دیتے جس پر ان کی والدہ تو نماز پڑھنے میں مشغول ہو جاتیں اور خود مسعر ان لوگوں کے حلقہ میں بیٹھ کر جو سننا چاہتے تھے حدیثیں روایت کرتے رہتے جب فارغ ہو جاتے تو پھر اسی گدے کو کندھے پر ڈال کر والدہ کو ساتھ لئے ہوئے گھر تشریف لے جاتے لکھا ہے کہ گھر اور مسجد کے سوا کوئی دوسری جگہ ان کے بیٹھنے کی نہیں تھی۔ ص ۲۵۴ باقی سفیان ثوری شاید پہلے بھی کہیں ذکر گذرا ہے اور سچ تو یہ ہے کہ اسلامی علوم سے تھوڑا بہت تعلق جن کا ہے وہ سفیان اور ان کے علمی مقام سے ناواقف نہیں ہیں ابن جوزی نے ان کی مستقل سیرت لکھی ہے کہتے ہیں کہ تیس ہزار حدیثوں کے راوی ہیں خود کہتے ہیں کہ میرے حافظہ نے "مجھ سے کبھی خیانت نہیں کی ابراہیم کے خروج کے واقعہ میں خطیب نے لکھا ہے کہ لوگ ان سے شرکت کے متعلق دریافت کرتے تو کہتے کہ نہ میں لوگوں کو شرکت کا حکم دیتا ہوں اور نہ منع کرتا ہوں ابتداء میں بعض امراء سے انہوں نے امداد کی تھی۔ لیکن بعد کو اس میں خطرات محسوس ہوئے پھر تھوڑا سرمایہ اپنے دوستوں اور معتقدوں کو دے رکھا تھا اسی کے نفع سے زندگی گذارتے تھے کہا کرتے تھے کہ اگر یہ اشرفیاں اپنے پاس نہ رکھوں تو یہ دولت والے مجھے اپنے چہرے کا رومال ہی بنا چھوڑیں ابوجعفر منصور زندگی بھر اس فکر میں رہا کہ کسی طرح ان کو اپنی حکومت میں شریک کرے لیکن کامیاب نہ ہوا۔ لکھا ہے کہ مکہ معظمہ میں تھے کہ ابوجعفر بھی حج کے ارادے سے مکہ چلا سفیان کو بڑی پریشانی ہوئی آخر کعبہ کے ملتزم کے پاس لیٹ گئے اور دعا کرنے لگے کہ خداوند! ابوجعفر سے مجھے نجات دے کہتے ہیں کہ راستہ ہی میں ابوجعفر بیمار ہوا اور قبل مکہ پہنچنے کے انتقال ہو گیا لاش مکہ پہنچی وہیں دفن کیا گیا۔ ۱۲

قریب قریب وہی تھی جو سفیان ثوری کی تھی بعض قرائن سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ دربار میں پہنچنے سے پہلے ان حضرات کو کسی ذریعہ سے اس کی خبر ہوگئی تھی کہ خلیفہ حکومت کا کوئی عہدہ یا قضا کا عہدہ ہم لوگوں پر پیش کرے گا اور جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ گو سب کے سب برابر درجے کے آدمی نہیں تھے لیکن حکومت کی ملازمت سے ان میں ہر ایک ناکارہ تھا، ممکن ہے کہ کراہت و ناگواری کے اسباب مختلف ہوں اتنی بات تو سب کے سامنے کوفہ ہی میں روز دیکھی جاتی تھی کہ قاضی بن ابی لیلیٰ اور قاضی ابن شبرمہ[1] بے چارے کی اسی ملازمت کے تعلق کی وجہ سے یہ درگت بنی ہوئی تھی جیسا کہ ابن سعد نے لکھا ہے کہ:

> ''ابن شبرمہ اور ابن ابی لیلیٰ دونوں کا قاعدہ تھا کہ روزانہ بعد عشاء کے کوفہ کے والی عیسیٰ بن موسیٰ کے دربار میں مسامرہ (شب گپی) کے لئے حاضر ہوا کرتے تھے طریقہ یہ تھا کہ اپنی اپنی سواریوں پر یہ گورنر کی ڈیوڑھی پر حاضر ہو کر اجازت کے انتظار میں کھڑے رہتے تھوڑی دیر بعد عیسیٰ کا حاجب جس کا عیاض نام تھا وہ کبھی اندر بلا لیتا اور کبھی کہہ دیتا کہ آج آپ لوگوں کو گھر جانے کی اجازت ہے ابن شبرمہ جو شاعر بھی تھے، چھٹی کی خبر عیاض سے سن

---

[1] قاضی ابن ابی لیلیٰ کے حالات کا ذکر پہلے آچکا ہے، ابن شبرمہ بھی اپنے وقت کے ممتاز آدمی تھے دین میں بھی اور علم میں بھی دین کا حال تو ان کے طبقات ہی میں یہ لکھا ہے کہ یمن والی بنا کر شروع شروع میں بھیجے گئے تھے کچھ دن رہے اس کے بعد معزول ہو گئے معمر جو یمن کے مشہور محدث ہیں ان کا بیان ہے کہ رخصت کرنے کے لئے میں ان کے ساتھ ذرا دور تک چلا گیا۔ جب سب لوگ چھٹ گئے اور تنہا میں ہی رہ گیا تو فرمایا کہ بھائی خدا کا شکر بجالاتا ہوں کہ اگرچہ میں یہاں کا والی تھا لیکن جس کرتے کو پہن کر آیا تھا وہی پہنے ہوئے واپس جارہا ہوں معمر کہتے ہیں کہ یہ کہہ کر چپ ہو گئے پھر بولے یہ حلال کے متعلق ذکر کر رہا ہوں اور حرام کی تو خیر گنجائش ہی کیا تھی ابن سعد ص ۲۸۷ ج ۲ میں ان کا خاص درجہ تھا بعض اجتہادی مسائل ان کی طرف جو مشہور ہیں وہ عجیب ہیں مثلاً لکھا ہے کہ انہوں نے لڑکوں اور لڑکیوں کی شادی کی عمر متعین کر دی تھی۔ یعنی ۱۸ سال لڑکے کی اور ۱۶ سال لڑکی کی عمر شادی کے وقت ہونا چاہیے مصری گورنمنٹ نے جدید شرعی قوانین علماء مصر سے چند سال پیشتر مدون کرایا تھا تو اس میں ابن شبرمہ کے اس فتویٰ کو قانون کی حیثیت عطا کی گئی تھی دیکھو القضاء فی الاسلام۔ ص ۶۷۔

کر کبھی کبھی اس شعر کو پڑھتے (جس کا ترجمہ یہ ہے) جب عشاء کا وقت ہو چکتا ہے اور نیند کا غلبہ شروع ہو جاتا ہے تو اچانک عیاض دو راحتوں میں سے ایک راحت کی خبر سناتا ہے (یعنی حضوری کی اجازت لاتا ہے یا چھٹی کی اور ہمارے لئے دونوں میں راحت ہے۔ (ص ۲۴۵ ج ۲)

چاروں علماء کے سامنے ابوجعفر کا اظہار مقصد

بہر حال چاروں حضرات ابوجعفر کے سامنے پیش ہوتے ہیں بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ خروج ابراہیم کے بعد پہلی ملاقات خلیفہ سے ان لوگوں کی جو ہوئی تو اس نے تسلی دیتے ہوئے کہا کہ:

لم ادعکم الا الخیر. (ص ۱۸۰ ج ۱ موفق) — میں نے تم لوگوں کو بجز ایک اچھے کام کے اور کسی دوسری غرض سے نہیں بلایا ہے۔

مسعر بن کدام اور سفیان ثوری نے کس طرح رستگاری حاصل کی

اگر یہ واقعہ ہے تو گو خطاب اس میں سب کی طرف تھا مگر جہاں تک میں خیال کرتا ہوں شاید زیادہ رخ اس خطاب کا ابوحنیفہ ہی کی طرف ہوگا کیونکہ وہی زیادہ بدنام تھے خیر کچھ بھی ہو آگے بیان کرنے والوں نے جو قصہ بیان کیا ہے وہ یہ ہے کہ اچانک مسعر بن کدام کو دیکھ گیا کہ وہ صف سے ٹوٹ کر خلیفہ کی طرف بڑھے چلے جاتے ہیں اور بے محابا ابوجعفر کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے کر مصافحہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

''فرمایئے آج کل جناب کا مزاج کیسا رہتا ہے بندہ جب یہاں نہیں تھا تو اس وقت آپ رہے کیسے اور آپ کے مویشیوں کا گھوڑوں کا کیا حال ہے' پڑوس میں آپ کے فلاں فلاں صاحب جو رہتے ہیں ان کی کیفیت کیا ہے

آپ کے نوکر چاکر کیسے ہیں۔

کہتے ہیں کہ مسعر نے اسی کے ساتھ یہ اضافہ بھی کیا کہ:

''اور خبر ہے' کوفہ کے بندکی وہاں کی گلیوں کا حال بہت خراب ہے۔''

سارا دربار مسعر کی اس حرکت کو دیکھ کر متحیر تھا کہ آخر ان کو ہو کیا گیا ہے اور کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ یہ بھی کہتے ہیں کہ آخر میں مسعر نے کہا۔

''آیا آپ مجھے قاضی مقرر کرنا چاہتے ہیں۔''

آخر کسی نے آگے بڑھ کر ان کو ہٹایا اور طے کیا گیا کہ دماغی توازن اس شخص کا خراب ہو گیا ہے بعض لوگوں کا بیان ہے کہ امام ابوحنیفہ ہی نے مسعر کے اندر اس خیال کو پیدا کر دیا تھا کہ تم مجنونوں کی طرح باتیں کرنے لگنا۔

الغرض مسعر کی جان تو یوں بچ گئی۔ رہ گئے سفیان ثوری سوان کے متعلق کہتے ہیں کہ وہ بھاگ گئے۔ اب خدا جانے مسعر کے ان عجیب وغریب حرکات کی وجہ سے جو گڑبڑ مچھی اس میں سفیان کو نکل بھاگنے کا موقعہ ملا یا جیسا کہ بعض روایتوں میں ہے کہ راستہ ہی سے استنجاء وغیرہ کا حیلہ کر کے وہ روپوش ہو گئے۔

امام ابوحنیفہ کے سامنے کوفہ کے عہدۂ قضا کی پیشکش اور امام کا انکار

اب صرف امام ابوحنیفہ اور قاضی شریک خلیفہ کے سامنے تھے ابوجعفر نے امام کو بلا کر کہا کہ میں کوفہ کا قاضی تمہیں بنانا چاہتا ہوں جیسا کہ میں مسلسل کہتا چلا آ رہا ہوں کہ یہ قصہ امام کے ساتھ متعدد بار پیش آیا اور سوانح نگاروں نے امام کی طرف معذرت پیش کرتے ہوئے مختلف جوابوں کو منسوب کیا ہے میرا خیال ہے کہ کوفہ کے قاضی بنانے کا خیال ابوجعفر نے امام کے سامنے جب پیش کیا تو غالباً کوفہ کے خاص حالات[1] کے لحاظ

---

[1] کچھ اسی زمانے میں نہیں بلکہ خدا ہی جانتا ہے کہ اس سرزمین میں یہ کیا خاصیت تھی ۱۲

سے آپ نے ابو جعفر کو سمجھانا شروع کیا جس کا حاصل یہ ہے کہ کوفہ والوں کی ذہنیت سے آپ واقف ہیں اس وقت تک ان میں ایک خوش باش آدمی کی طرح میں زندگی بسر کر رہا ہوں کسی قسم کی افسری اور حکومت کی طاقت مجھے اس شہر میں حاصل نہیں ہے لیکن قضا کے عہدے پر تقرر کر کے مجھے وہاں جب آپ بھیجیں گے تو لوگ میرے خاندانی حال سے واقف ہیں کہتے ہیں کہ امام نے صاف لفظوں میں کہا کہ میرے والد کو لوگ جانتے ہیں کہ وہ نان بائی یعنی خباز تھے۔ خیال کیجئے کہ ایک نان بائی کے لڑکے کی حکومت کیا کوفہ والے برداشت کر سکتے ہیں' بلکہ تعجب نہیں کہ اینٹ پتھر سے اس کی خبر لیں'' ص ۲۶۲ ج ا موفق۔

لوگوں کا بیان ہے کہ ابو جعفر کے سامنے امام ابو حنیفہ نے کچھ اس طرح تقریر کی کہ

لہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خلافت کے عہد میں یہ شہر بسایا گیا' لیکن اسی زمانے میں یہاں کے باشندوں کا حکام سے عجیب تعلق تھا سعد بن ابی وقاص ان کے والی تھے تو ان کی مسلسل شکایتیں حضرت عمر کے پاس پہنچیں آپ نے سعد کو بلا لیا عمار بن یاسر صحابی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو والی بنا کر بھیجا ایک سال نو مہینے بے چارے نے بہ مشکل گذارے ان کے متعلق یہ شکایت کرنے لگے کہ کمزور آدمی ہیں' سیاست سے واقف نہیں ہیں حضرت عمر کا مشہور قول کوفہ کے متعلق ہے کہ ''کوفہ والوں کا میں کیا کروں اگر کسی قوی آدمی کو حاکم بنا کر وہاں بھیجتا ہوں تو اس کی طرف برائیوں کو منسوب کرتے ہیں اور کسی کمزور کو بھیجتا ہوں تو اس کی تحقیر کرتے ہیں۔ (ص ۲۸۸ البلاذری) مشہور ہے کہ حضرت سعد نے کوفہ کے ایک باشندے کو جس نے بلا وجہ ان کی شکایت کی تھی رخصت ہوتے ہوئے یہ بددعا دی تھی کہ خدایا اگر یہ شخص میری طرف غلط باتوں کو منسوب کرتا ہے تو اس کی عمر دراز کر دی جائے اور اس کی نظر کو غیر محتاط بنا دے فتنوں میں اس کو مبتلا کر۔ کہتے ہیں کہ بوڑھا ہو گیا تھا اور جوان چھوکریوں کے پیچھے پیچھے گلیوں میں بھاگا بھاگا پھرتا تھا لوگ پوچھتے کہ بڑے میاں تمہارا یہ کیا حال ہے تو جواب میں کہتا کہ سعد کی بددعا پکڑے ہوئے ہے البلاذری نے یہ بھی لکھا ہے کہ حضرت سعد نے کوفہ کے لئے بددعا بھی کی تھی کہ خداوند یہاں کے باشندے کسی امیر سے راضی رہیں اور نہ امراء ان سے راضی ہوں'' حجاج سے پہلے یہاں کے باشندوں کا دستور تھا کہ جہاں کسی امیر سے بگڑتے بے چارے پر مسجد میں مٹھی بھر بھر کر کنکریاں پھینکتے'' حجاج نے اس بری رسم کا ازالہ تلوار کے زور سے کیا۔ ۱۲

وہ خاموش ہو گیا۔ شاید اس وقت تک بغداد کی تعمیر مکمل نہ ہوئی تھی ورنہ ہو سکتا تھا کہ بجائے کوفہ کے امام کو اسی وقت اپنے شہر جدید کے قاضی ہونے پر آمادہ کرتا جیسا کہ بعد کو اس نے یہی کیا بھی امام رحمہ اللہ علیہ کی بلا اس دفعہ یوں ٹل گئی۔

قاضی شریک کی بادل ناخواستہ عہدۂ قضا کی قبولیت

صرف قاضی شریک دھر لئے گئے کچھ دماغی ضعف وغیرہ کا بہانہ انہوں نے بھی پیش کیا جس کے جواب میں ابوجعفر نے کہا کہ روزانہ روغن بادام میں فالودہ بنوا کر پلانے کا حکم تمہارے لئے دے دوں گا اسی کے بعد قاضی شریک نے قضا کا عہدہ چند خاص شرائط کے ساتھ قبول کر لیا تھا۔[1] چونکہ امام کے سوانح نگاروں نے اپنی کتابوں میں اس واقعہ کا ذکر کیا ہے اس نے مجبوراً مجھے بھی اس کا تذکرہ کرنا پڑا ورنہ امام کی زندگی کے جس پہلو کو میں نمایاں کرنا چاہتا ہوں' اس پر کوئی خاص روشنی اس واقعہ سے نہیں پڑتی' بس اتنا معلوم ہوتا ہے کہ ابوجعفر خلیفہ اور امام ابوحنیفہ میں خروج ابراہیم کے واقعہ کے بعد سے ایک قسم کا حجاب سا جو حائل ہو گیا تھا یہ پردہ دونوں کے درمیان سے اٹھ گیا اور اس کے بعد دونوں میں گویا نئے سرے سے پھر تعلقات قائم ہو گئے ابوجعفر نے جیسا کہ واقعات سے معلوم ہوتا ہے اس کے بعد بار بار امام کو بلانا شروع کیا اور دونوں میں مکالمہ اور مخاطبہ کا ایک طویل سلسلہ ہے جسے بیان کرنے والوں نے بیان کیا ہے بعض روایتوں سے بہ ظاہر یہ ثابت ہوتا ہے کہ جیسے اس دفعہ امام تنہا نہیں بلائے گئے تھے اسی طرح ایک دفعہ

---

[1] اس واقعہ کا ذکر ابتداء کتاب میں گذر چکا ہے کہ قاضی شریک نے شرطاً یہ پیش کی تھی کہ میں آپ کے عزیزوں اور اقرباء درباریوں کا خیال نہ کروں گا اس پر منصور نے وعدہ کر لیا تھا کہ تم کو اس کا اختیار دیا جاتا ہے۔ پھر ڈیوڑھی کی خاص لونڈی کا مقدمہ پیش ہوا۔ جس کی تفصیل گذر چکی قاضی شریک کے متعلق ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک سے زیادہ مرتبہ قضا کے عہدے پر ان کا تقرر ہوا ہے ابوجعفر کے زمانہ میں بھی اور ابوجعفر کے بعد اس کے بیٹے مہدی کے عہد میں بھی آخر وقت تک وہ کوفہ کے قاضی رہے ہیں الخطیب وغیرہ نے بعض دلچسپ واقعات کا تذکرہ ان کے قضا کے متعلق کیا ہے۔۱۲

اس کے بعد بھی بجائے تین کے امام صاحب کو صرف قاضی شریک اور سفیان ثوری کی معیت میں اس نئے شہر بغداد کے کیمپ میں بلایا گیا تھا لیکن میرا خیال ہے کہ یہ ایک ہی واقعہ ہے بعضوں نے مسعر کا ذکر کیا ہے اور بعضوں نے نہیں کیا ہے اس لئے لوگوں نے سمجھ لیا کہ یہ دو الگ الگ واقعات ہیں' کچھ بھی ہو دوسروں کے ساتھ امام ابوحنیفہ ایک دفعہ بلائے گئے ہوں یا چند بار لیکن جتنی روایتیں اس سلسلہ میں بیان کی گئی ہیں ان سے دو باتیں معلوم ہوتی ہے ایک تو یہی کہ شروع شروع میں امام ابوحنیفہ کو ایک دفعہ یا دو دفعہ اکیلے نہیں بلکہ کوفہ کے دوسرے علماء کے ساتھ طلب کیا گیا تھا اور اس کے بعد چند بار تنہا امام ابوحنیفہ ہی کی طلبی دربار خلافت سے ہوئی ہے اور دوسری بات یہ ہے کہ ہر طلبی کے موقعہ پر حکومت کی طرف سے قضا کا عہدہ پیش کیا گیا ہے۔

حضرت امام کو دوبارہ قاضی القضاۃ کے عہدہ کی پیش کش

افسوس ہے کہ لوگوں نے ان ملاقاتوں کے سلسلہ میں اور بہت سی باتوں کا ذکر کیا ہے لیکن ایک چیز جو ان ہی لوگوں کے بیان سے معلوم ہوتی ہے اس کی طرف خصوصی توجہ شاید نہیں کی گئی میں نے شاید پہلے بھی اجمالاً اس کی طرف اشارہ کیا ہے یعنی قضا کا یہ عہدہ امام ابوحنیفہ کے سامنے ایک ہی شکل میں نہیں پیش ہوا ہے بلکہ معلوم ہوتا ہے کہ پہلے تو کسی خاص شہر مثلاً کوفہ یا بغداد کا قاضی چاہا گیا کہ ان کو مقرر کیا جائے اور کردری کی ایک روایت کے جو یہ الفاظ ہیں کہ:

وعهد الأمام الى البصرة والكوفة وبغداد وما يليها. (۲۱ ج ۲)

اور تقرر کا ایک پروانہ امام ابوحنیفہ کے سپرد کیا گیا۔ کہ بصرہ اور کوفہ اور بغداد اور جو علاقے ان صوبوں کے تحت ہیں ان کا قاضی تم کو بنایا گیا۔

ان کا اگر وہی مطلب ہے جو ظاہر الفاظ سے سمجھ میں آتا ہے تو ثابت ہوتا ہے کہ بجائے کسی خاص شہر یا صوبہ کے چند ملحقہ صوبوں (کوفہ بصرہ بغداد) کی قضا امام پر پیش کی گئی اور ان ہی مورخین کے متفقہ بیان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آخر میں۔

يطلب منه ان يكون قاضی القضاة.	امام ابوحنیفہ سے چاہا گیا کہ وہ سارے قاضیوں کے قاضی بننے کا عہدہ قبول کریں یعنی قاضی القضاۃ بن جائیں۔

موفق نے احمد بن بدیل کے حوالہ سے یہ الفاظ نقل کئے ہیں اور لکھا ہے کہ احمد سے محمد بن حسن صاحب الامالی نے یہ روایت کی ہے۔(ص ۱۷۳) پھر خود ہی اس کی شرح میں موفق نے دوسری روایت مجد الائمہ ابوالفضل محمد بن عبداللہ السرخی کے حوالہ سے یہ درج کی ہے کہ:

ان يتولی القضاء ويخرج القضاة من تحت يده الى جميع كو (الاسلام ص ۱۷۳ ج ۲)	قضا کے اختیارات بھی دیئے جاتے ہیں اور یہ کہ سارے اسلامی صوبوں میں قاضی امام ہی کے ہاتھ سے نکلیں۔

جس کا مطلب بہ ظاہر یہی ہے کہ سارے اسلامی ممالک میں قاضیوں کے عزل و نصب کے اختیارات ابوجعفر نے امام ابوحنیفہ کے سپرد کرنا چاہا تھا اگر یہ روایت صحیح ہے تو اسلامی قضا کی تاریخ میں ایک انقلابی روایت ہونے کی حیثیت اس کو حاصل ہونی چاہیے لیکن افسوس ہے کہ گو درج کرنے کی حد تک اس روایت کو ان ہی لوگوں نے درج کیا ہے اور ایک روایت نہیں بلکہ جیسا کہ میں نے عرض کیا دو دو روایتیں اس باب میں مروی ہیں جن میں ایک مجمل ہے اور دوسرے میں اسی اجمال کی شرح کی گئی ہے لیکن ذکر ان کا کچھ ایسے سرسری انداز میں کیا گیا ہے کہ مشکل ہی سے اس کی اہمیت کی طرف توجہ لوگوں کی ہو سکتی ہے اسی کا نتیجہ ہے کہ عام طور پر علماء میں یہ مشہور بھی نہیں ہے سمجھا یہی جاتا ہے کہ قاضی القضاۃ کے عہدے کی طرف سب سے پہلے ہارون الرشید کا ذہن منتقل ہوا یعنی اس نے قاضی ابو یوسف کو کہتے ہیں کہ اس عہدے پر بحال کیا اتنی بات تو صحیح ہے کہ اس عہدے پر بحالی اسلامی تاریخ میں سب سے پہلے قاضی ابو یوسف ہی کی ہوئی جس کا ذکر آگے آ بھی رہا ہے۔ لیکن خود اس عہدے کی طرف ہارون کے زمانہ حکومت میں توجہ ہوئی یہ صحیح نہیں ہے بلکہ آپ دیکھ رہے ہیں کہ ابوجعفر منصور ہی کے زمانہ میں یہ سوال پیدا ہو چکا

تھا اور ابوجعفر کی تجویز کو امام اگر قبول کر لیتے تو ابو یوسف نہیں بلکہ اسلام کے سب سے پہلے قاضی القضاۃ امام ابوحنیفہ ہی قرار پاتے۔

بہر حال لوگوں کی توجہ ادھر مبذول ہوئی ہو یا نہیں ہوئی ہو لیکن اگر یہ واقعہ گذرا ہے تو یقیناً یہ سوچنے کی بات ہے کہ آخر ابوجعفر منصور کے سامنے یہ سوال کس راستے سے آیا؟

یہ صحیح ہے کہ ابوجعفر منصور امام ابوحنیفہ کو شکار کرنا چاہتا تھا پہلے اس نے امام کے زور کو توڑنے کے لئے حجاج بن ارطاۃ کے سر پر دست شفقت رکھا' اور جب ان میں مقابلہ کی صلاحیت نظر نہ آتی تو امام مالک کو میدان میں لانے کا ارادہ کیا ان سے بھی مایوس ہونے کے بعد اب براہ راست وہ امام ہی کو قابو میں لانے کی فکر میں مشغول تھا جیسے شکاری شکار کے سامنے والوں کو بدل بدل کر ڈالتے چلے جاتے ہیں خیال کرتے ہیں کہ ان دانوں پر اگر شکار نہ گرا تو شاید دوسرے دانے اس کو مرغوب ہوں اس لئے ان کو چھڑکتا ہے۔ ان سے بھی مایوسی ہوتی ہے تو کسی تیسری قسم کا انتخاب کرتا ہے' کوئی شبہ نہیں کہ اس وقت ابوجعفر کے طرز عمل کی نوعیت یہی نظر آتی ہے۔ لیکن امام ابوحنیفہ کے لئے قضا کے دانے کا انتخاب اس نے خاص طور پر کیوں کیا؟ اس کے پاس اس قسم کے دانوں کی کیا کمی تھی وہ بڑی سی بڑی گورنریاں بانٹ سکتا تھا' جس قسم کی اور جس شعبہ کی وزارت چاہتا خیرات کر سکتا تھا اور بھی بیسیوں چیزیں ہو سکتی تھیں جنہیں دانہ بنا کر اپنے بچھائے ہوئے دام کے نیچے چھڑک سکتا تھا۔ لیکن یہ فیصلہ کہ جس شکار کو اس وقت پھنسانا چاہتا ہوں اس کے لئے مرغوب ترین شے قضا کے عہدے ہی کا دانہ ہو سکتا ہے؟ جہاں تک قیاس کا اقتضاء ہے اس کا تعلق تجربوں سے نظر آتا ہے جو خروج ابراہیم کے واقعہ سے پہلے ساحل دجلہ کے شاہی کیمپ میں امام ابوحنیفہ کے متعلق ابوجعفر کو ان دنوں میں ہوتا رہا تھا' جب تعمیری مشوروں میں شریک کرنے کے لئے دوسرے ماہرین اور اہل علم و فضل کے ساتھ امام ابوحنیفہ کو بھی بلا کر اس نے اپنے پاس رکھا تھا اس زمانہ میں ابوجعفر کے ذہن میں ان سے یہ اثر پیدا ہوا ہو جس کا اظہار اس وقت وہ کر رہا تھا' یعنی امام ابوحنیفہ

کے متعلق اس نے تاڑ لیا ہو کہ یہ شخص صرف قاضی ہونا ہی نہیں چاہتا بلکہ حکومت کے اس شعبہ کو کلی طور پر اپنے قبضہ اقتدار میں لانا چاہتا ہے جس سے قضاء اور عدالت یعنی مسلمانوں کے باہمی خصومات کے فیصلوں کا تعلق ہے تو اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں ہے آپ پھر ان چیزوں کو پڑھیے جنہیں اس موقعہ پر میں نے نقل کیا ہے۔

حقیقت تو یہ ہے کہ اسلامی قوانین کو ایک باضابطہ مجلس کے ذریعہ مدون کرنا اور اسی کے ساتھ سرکاری قاضیوں کے فیصلوں پر مسلسل بجلی گراتے رہنا پھر خلیفہ سے قرب کا موقعہ جب ملتا ہے تو اس موقعہ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے علم اور معلومات اور اپنی فکری ونظری قوت سے متاثر کرنے کی کوشش کرتے رہنا ازیں قبل امام اس سلسلہ میں جو کچھ کرتے رہتے تھے ان سب کو دیکھ کر اگر صراحۃً امام کی طرف سے خواہش کا اظہار نہ بھی کیا گیا ہو جب بھی ان کی زندگی اور زندگی کی ساری سرگرمیوں سے قدرتی طور پر آدمی کو اس نتیجہ تک پہنچ جانا چاہیے تھا جس پر منصور پہنچا تھا۔

بہرحال میرا خیال یہی ہے کہ امام کی یہ مرغوب ترین خوراک ہوسکتی ہے' خود امام ہی کا قصداً پیدا کرایا ہوا احساس تھا۔ بلکہ امام مالک کے سامنے ابوجعفر نے یہ تجویز جو پیش کی تھی کہ ان کے اجتہادی نتائج کو مدون کرا کے ان ہی کی پیروی سارے ممالک محروسہ میں لازم کرادوں گا یہ خیال بھی جہاں تک میرا انداز ہے امام ابوحنیفہ ہی کا پیدا کرایا ہوا خیال تھا شاید انتقام کی سب سے بہتر صورت اس کو یہی نظر آئی کہ جن امیدوں پر ابوحنیفہ جی رہا ہے ان کے ختم کرنے کی بہترین صورت یہی ہوسکتی ہے کہ امام مالک کے اجتہادات کو سارے اسلامی ممالک میں مروج کر دیا جائے اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ حضرت امام مالک کی روحانی بصیرت سے امام ابوحنیفہ کی امداد قدرت کی طرف سے عین وقت پر اگر نہ کرائی جاتی تو ان کی ساری محنت جواب تک اس سلسلہ میں انہوں نے کی تھی سب برباد اور اکارت ہو کر رہ جاتی ان کی مجلس وضع قوانین کی کوششوں کا سارا سرمایہ نیز اس عرصے میں اپنے شاگردوں کو جن اغراض کے تحت انہوں نے تیار کیا تھا یعنی وہی بات جس کا وقتاً فوقتاً اظہار فرماتے رہتے تھے کہ ان میں کچھ تو مفتی ہونے کی صلاحیت

رکھتے ہیں کچھ قاضی بن سکتے ہیں اور چند ایسے بھی ہیں جو قاضیوں اور مفتیوں کی تربیت و تعلیم کا کام انجام دے سکتے ہیں یہ سارا مسودہ ان کا دھرا کا دھرا رہ جاتا لیکن امام مالک نے ابوجعفر کو اپنے متعلق کچھ اتنا مایوس کر کے واپس کیا کہ اب کوئی دوسری صورت اس کے سوا سامنے نہ رہ گئی کہ ابوحنیفہ کو قابو میں لانے کے لئے ان دانوں کو اس کے سامنے بکھیر دیا جائے جن کے لئے وہ زندگی بھر تڑپتا رہا ہے۔

میرا تو خیال ہے کہ اسلامی عدالت کی یہ تنظیم یعنی یہ جو ہو رہا تھا کہ حکومت جسے چاہتی تھی قاضی مقرر کر کے مختلف علاقوں میں بھیج دیتی تھی اور اس کی مطلقاً پروانہیں کی جاتی تھی کہ نقاطِ نظر اور معلومات وغیرہ کے لحاظ سے ان کا کیا حال ہے؟ جس کا نتیجہ یہ ہو رہا تھا کہ وقت پر جس کی سمجھ میں اپنے خام غیر منقح معلومات کی بنیاد پر جو بات بھی آ جاتی تھی اسی کو فیصلہ قرار دے دیتا تھا' اس سلسلہ میں جو کچھ ہو رہا تھا تفصیل سے اس کا ذکر کر چکا ہوں۔ بتا چکا ہوں کہ امام ابوحنیفہ کے طریقہ کار سے بھی سمجھ میں آتا ہے کہ وہ انتشار و پراگندگی فوضویت دلا مرکزیت کے ان خرخشوں کا اسلامی عدالتوں سے خاتمہ کرانا چاہتے تھے سب سے پہلا کام اس سلسلہ میں اسی لئے انہوں نے اسلامی قوانین کی باضابطہ تدوین کو قرار دے کر اپنا سب کچھ اسی نصب العین کی تکمیل میں لگا دیا تھا اور میں تو سمجھتا ہوں کہ مشہور انشا پرواز عبداللہ بن المقفع جس کا قیام بصرے میں تھا اس کی طرف تاریخوں میں یہ بات جو منسوب کی گئی ہے کہ اسی عباسی خلیفہ ابوجعفر منصور کے پاس اس نے ایک خط لکھ کر اس مضمون کا بھیجا تھا جس کا خلاصہ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ اس نے کوفہ اور بصرہ ان دو شہروں کے متعلق خصوصاً اور عام اسلامی علاقوں کے متعلق یہ لکھا تھا کہ:

> ''میں امیر المومنین کو ان شدید اختلافات کی طرف متوجہ کرانا چاہتا ہوں جو قضاۃ کے فیصلوں کے اختلافات کی وجہ سے پیدا ہو رہے ہیں لوگوں کی جان اور لوگوں کے ناموس وعزت کے متعلق طرح طرح کی بے ترتیبیاں پیدا ہو گئی ہیں' یہ واقعہ ہے کہ حیرہ (جو کوفہ سے کل چھ میل دور ہے) اس شہر میں کسی شخص کی گردن مارنے کا فیصلہ کر دیا جاتا ہے یا عورت کسی مرد کو دلا دی

جاتی ہے۔ حالانکہ ٹھیک اسی نوعیت کے مقدموں میں دیکھا جاتا ہے کہ وسط
کوفہ میں بیٹھے ہوئے قضاۃ بالکل اس کے مخالف فیصلے دے رہے ہیں۔

اس نے یہ بھی اسی خط میں لکھا تھا کہ:

بہت سے لوگ تو بنی امیہ کی حکومت کے زمانہ کے فیصلوں کو بہ طور نظیر کے استعمال کر رہے ہیں پوچھا جاتا ہے کہ ایسا فیصلہ کس بنیاد پر تم نے کیا تو نہ رسول اللہ ﷺ کے عہد کا کوئی فیصلہ پیش کیا جاتا ہے اور نہ خلفاء راشدین کے عہد کا بلکہ کہہ دیا جاتا ہے کہ عبدالملک بن مروان کے زمانہ میں فلاں شخص نے مثلاً یہی فیصلہ کیا تھا یا اسی قسم کے دوسرے حکمرانوں کا نام لے کر لوگوں کو خاموش کر دیا جاتا ہے۔"

بیان کیا جاتا ہے کہ اسی ابن المقفع نے آخر میں اپنی یہ رائے ابوجعفر کے سامنے اس خط میں یہ پیش کی تھی کہ:

اسلامی قوانین کا ایک مجموعہ سنت اور صحیح قیاس کی روشنی میں مدون کیا جائے اور حکومت اسی کو عدالتوں میں بطور ضابطہ کے نافذ کر دے تاکہ اس گڑبڑ اور انتشار و پراگندگی کا خاتمہ ہو جائے۔ (ص ۸۵ القضاء فی الاسلام)

اگر ابن المقفع نے واقعی اس قسم کا کوئی خط ابوجعفر کو لکھا تھا تو میں خیال کرتا ہوں کہ یہ بھی امام ابوحنیفہ کے نقطہ خیال سے متاثر ہونے ہی کا نتیجہ ہو سکتا ہے اور تاثر نہ سہی توارد ہی ہو پھر بھی ابن المقفع بے چارا تو صرف ایک تجویز پیش کر رہا تھا اور امام ابوحنیفہ ان سارے قصوں کو عملاً ختم کر چکے تھے۔ بیس سال کی مسلسل محنت کدو کاوش سے اسلامی قوانین کا ایک مکمل ضابطہ بھی انہوں نے مدون کر لیا تھا اور ان ضوابط کو صحیح طور پر استعمال کرنے والوں کی ایک بڑی جماعت اپنے تلامذہ کی شکل میں اگر سارے اسلامی ممالک میں نہیں تو ممالک محروسہ عباسیہ کے سارے مشرقی شہروں میں وہ یقیناً پھیلا چکے تھے۔ مشکل ہی سے کوئی مرکزی شہر عراق و خراسان وغیرہ میں بچا ہوا تھا جہاں ان کے شاگرد موجود نہ تھے اور کیسے شاگرد؟ اگر لوگوں کا یہ بیان صحیح ہے کہ امام کے چار شاگرد ایسے تھے

جن کے متعلق حسن بن حماد کا یہ قول نقل کیا جاتا ہے۔

كان الحفاظ للفقه كما يحفظ القران اربعة زفر ويعقوب واسد بن عمرو علي بن مسهر. (ج ۲ ص ۲۱۶ كردری)

فقہ (کے مسائل) کے حافظ چار آدمی تھے اسی قسم کے حافظ جیسے قرآن کے حافظ ہوتے ہیں یعنی زفر یعقوب (ابو یوسف) اسد بن عمرہ، علی بن مسہر۔

امام ابوحنیفہ کی مجلس کے مدونہ قوانین کی تعداد کے متعلق خوارزمی ہی کے بیان کو اگر صحیح مان لیا جائے یعنی (۸۳) ہزار دفعات پر ان کا یہ مجموعہ مشتمل تھا جب بھی خیال کیا جا سکتا ہے کہ زبانی اتنے دفعات کو قرآن کی طرح یاد کر لینا کیا آسان تھا؟ مگر امام کے سامنے جو لائحہ عمل تھا جس کو پیش نظر رکھ کر وہ کام کر رہے تھے۔ اس کے لحاظ سے اس پر تعجب بھی نہیں ہوتا جو علانیہ اپنے طلبہ اور تلامذہ کو یہ مشورہ دیتا ہو کہ ایسے کمالات اپنے اندر پیدا کرو کہ لوگ تمہارے محتاج ہو جائیں، شاگردوں کو وصیت کرتا ہو کہ حکومت کی ملازمت میں اس وقت تک تم لوگوں کو شریک نہیں ہونا چاہیے جب تک اس کا اطمینان نہ کر لو کہ تم پر دوسروں کو حکومت اب ترجیح نہ دے گی الغرض یہ اور اسی قسم کی دوسری باتیں جن کا ذکر پہلے تفصیل سے کر چکا ہوں ان کو دیکھتے ہوئے کچھ بعید نہیں ہے اگر امام کے خاص شاگردوں نے ان کے مدونہ قوانین کے سارے مجموعہ کو زبانی یاد کر لیا ہو، خصوصاً قاضی ابو یوسف کے متعلق جو باتیں ان سے مروی ہیں مثلاً یہی کہ ایک دفعہ اپنی طالب العلمی کے زمانہ میں قاضی ابو یوسف بیمار ہوئے مرض سخت تھا، امام ابوحنیفہ بار بار ان کی عیادت کو جایا کرتے تھے۔ ایک دن امام صاحب حسب دستور ان کو دیکھنے کے لئے جو آئے تو دیکھا کہ ابو یوسف کی حالت بہت غیر ہو رہی ہے، بے ساختہ امام صاحب کی زبان پر انا للہ وانا الیہ راجعون کے الفاظ جاری ہو گئے۔ راوی کا بیان ہے کہ اس کے بعد بڑے دردناک لہجے میں امام ابوحنیفہ کو میں نے سنا کہ وہ کہہ رہے تھے۔

ما اعظم بركة الى حنيفة فتح

ابو حنیفہ کتنے بابرکت آدمی تھے دنیا اور آخرت

لناسبيل الدنيا والاخراة. دونوں کی راہ میں ہم پر ان ہی کی کھولی ہوئی ہیں۔ (ص ۴۳۴ ج ۲)

آپ قاضی ابو یوسف کے اس فقرے کو امام ابو حنیفہ کے مذکورہ بالا فقرے کے ساتھ ملائیے جوان کی زندگی سے مایوس ہونے کے وقت انہوں نے فرمایا تھا کیا قاضی ابو یوسف کا یہ صراحۃً کھلا ہوا اعتراف اس کا نہیں ہے کہ جو صورتیں ان کے ساتھ بعد کو پیش آئیں ان میں امام ابو حنیفہ ہی کا ہاتھ تھا۔

اور ایک ابو یوسف کیا؟ آپ ان تلامذہ کے حالات پڑھیے' جنہیں امام نے عباسیوں کے ممالک محروسہ کے اکثر علاقوں میں پھیلا دیا تھا کیفاً و مقداراً ان کی جو تعداد تھی تو وہ وہ بجائے خود ہے' شافعی المذہب مورخ حافظ ابن حجر نے خیرات الحسان میں جن کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

"صحیح طور پر امام کے تلامذہ کا اور ان لوگوں کی تعداد کا پتہ چلانا دشوار ہے جنہوں نے امام ابو حنیفہ سے علمی استفادہ کیا ہے شاید اسی وجہ سے بعض لوگوں نے کہا ہے کہ ابو حنیفہ کے اصحاب اور تلامذہ کی جتنی کثرت ہے اس کی نظیر مسلمانوں کے دوسرے مشہور ائمہ میں مشکل ہی سے مل سکتی ہے۔

حافظ ہی نے اس کے بعد نقل کیا ہے کہ:

"پچھلے زمانہ میں بعض محدثین نے امام ابو حنیفہ کے شاگردوں کی فہرست جو بنانی چاہی تو قریب قریب آٹھ سو نام اس سلسلہ میں ان کو ملے۔" (ص ۵۴ منقول از معجم)

موفق نے (۷۳۰) آدمیوں کے نام اس سلسلہ میں گنوائے[1] ہیں صاحب

---

[1] یہاں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ یہ تعداد امام کے ان شاگردوں کی ہے جنہوں نے امام سے مسائل اخذ کر کے دوسروں سے بیان کئے ہیں ورنہ ان ہی موفق نے اپنے والد کے حوالہ سے یہ بات نقل کی ہے کہ امام کے شاگردوں اور معتقدیوں کی تعداد ہزار ہا ہزار سے متجاوز ہے تفصیل کے لیے مناقب موفق اور معجم المصنفین التونکی ۱۲۔

المصنفین نے اس فہرست کو درج کرتے ہوئے اجمالاً ان کے حالات کی طرف جو اشارے کئے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ تقریباً پچاس آدمی ان میں ایسے تھے جنہوں نے حکومت عباسیہ کے مختلف علاقوں میں امام ابوحنیفہ کے بعد قضا کی خدمت انجام دی ہے' لیکن یہ غلط فہمی ہوگی اگر سمجھا جائے کہ امام کے تلامذہ میں قاضیوں کی تعداد اسی حد تک محدود ہے بلکہ یہ تعداد تو ان قاضیوں کی ہے جن کا رجال اور تاریخ کی کتابوں میں تذکرہ ملتا ہے۔ عموماً صحاح کی کتابوں میں ان سے چونکہ حدیثیں مروی ہیں اسی لئے ائمہ نقد نے اسماء الرجال کی جو فہرستیں بنائی ہیں ان میں ان کے نام کو داخل کر دیا گیا ہے' ورنہ امام کے بعد ان کے شاگردوں میں جو قاضی ہوئے ہیں ان کی حقیقی تعداد اس سے کہیں زیادہ ہے' مثلاً میں قاضی توبہ بن سعد مروزی کو پیش کرتا ہوں' رجال کی کتابوں میں ان کا ذکر نہیں ملتا۔ لیکن امام ابوحنیفہ کے سوانح نگاروں نے ان کو ان قاضیوں میں شمار کیا ہے انہیں امام ابوحنیفہ کے شاگردوں میں خاص امتیاز حاصل تھا اور کیسا امتیاز؟ موفق نے نصر بن زیاد کے حوالہ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ امام مالک کی مجلس میں بیٹھا ہوا تھا۔ قاضیوں کا ذکر چھڑ گیا۔ اسی سلسلہ میں قاضی توبہ بن سعد کا نام بھی آیا۔ نصر کہتے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ توبہ کے ذکر پر امام مالک فرما رہے ہیں۔

لوددت ان عندنا واحداً مثله. (ص ۱۲۶ ج ۲) — میری آرزو ہے کہ ہم میں اس جیسا ایک آدمی بھی ہو۔

اسی سے اندازہ کیجئے کہ جن قاضیوں کا رجال کی کتابوں میں تذکرہ نہیں ملتا' ان میں کیسے کیسے لوگ ہوں گے۔

اور علاوہ ان بزرگوں کے جنہوں نے قضا کے عہدے کو قبول کیا' مشکل ہی سے ممالک محروسہ عباسیہ کا کوئی ایسا شہر یا قصبہ اس زمانہ میں تھا جس میں امام کے تلامذہ نہ پائے جاتے ہوں ان میں ایک بڑا گروہ ان لوگوں کا تھا جنہیں درس و تدریس افتاء و تصنیف وغیرہ کے لحاظ سے اپنے اپنے علاقوں میں مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ مولانا محمود حسن ٹونکی نے اپنی کتاب معجم المصنفین میں ان مقامات کی فہرست درج کرتے ہوئے

جہاں جہاں امام کے تلامذہ اس زمانے میں پائے جاتے تھے حسب ذیل شہروں کا نام لیا ہے یعنی:

(۱) بصرہ (۲) واسط (۳) موصل (۴) جزیرہ (۵) رقہ (۶) نصیبین (۷) دمشق (۸) رملہ (۹) مصر (۱۰) یمن (۱۱) یمامہ (۱۲) بحرین (۱۳) بغداد (۱۴) اہواز (۱۵) کرمان (۱۶) اصفہان (۱۷) حلوان (۱۸) استراباد (۱۹) ہمدان (۲۰) رے (۲۱) قومس (۲۲) دامغان (۲۳) جرجان (۲۴) نیشاپور (۲۵) سرخس (۲۶) نسادر (۲۷) مرو (۲۸) بخارا (۲۹) سمرقند (۳۰) کش (۳۱) ترمذ (۳۲) بلخ (۳۳) ہرات (۳۴) قہستان (۳۵) سجستان (۳۶) رم (۳۷) خوارزم۔

ان کے سوا کوفہ جو امام کا وطن تھا اور حرمین (مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ) جہاں برسوں امام مقیم رہے ہیں ان کا تذکرہ اس فہرست میں نہیں کیا گیا ہے اس زمانے میں مسلمانوں کی آمد و رفت کا سلسلہ جس طریقہ سے مروج تھا خصوصاً حج کے لئے خراسان سے براہ کوفہ جو لوگ سفر کرتے تھے اگر یہ باتیں لوگوں کے سامنے ہوں تو جو فہرست پیش کی گئی ہے قطعاً اس پر ان کو تعجب نہ ہونا چاہیے' میں نے اس مسئلہ کی طرف پہلے بھی شاید کچھ اشارہ کیا ہے اور سچ یہ ہے کہ اس قسم کے معاملات میں کچھ غیبی تائیدوں کو بھی دخل ہوتا ہے' موفق نے عبداللہ[1] بن عبیداللہ کے حوالہ سے ایک قصہ نقل کیا ہے۔ یعنی وہ کہتے

---

[1] غالباً یہ وہی عبداللہ ہیں جن کا تذکرہ دوسری صدی ہجری کے ابتدائی حصہ کے واعظوں کے سلسلہ میں کیا جاتا ہے بہ ظاہر امام ابوحنیفہ کی زندگی ہی کا یہ واقعہ ہے یا ان کی وفات کے کچھ دن بعد کا اور اس پر تعجب نہ کرنا چاہیے کہ کوفہ سے منتقل ہو کر نہ صرف امام ابوحنیفہ کا مذہب ہی بلکہ ان کی مجلس وضع قوانین کی مدونہ کتابیں افریقہ کے دور دست علاقوں میں اسی زمانہ میں کیسے پہنچ گئیں۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ ایک صاحب جن کا نام عبداللہ بن فروخ تھا۔ ۱۱۵ھ ہجری میں پیدا ہوئے اصل وطن تو ان کا خراسان تھا لیکن بعد کو کسی وجہ سے ہجرت کر کے یہ افریقہ کے مشہور شہر قیروان چلے گئے اور وہیں رہ پڑے۔ لکھا ہے کہ انہوں نے کوفہ پہنچ کر باضابطہ امام ابوحنیفہ سے تعلیم حاصل کی اور ۱۴۷ھ ہجری میں یہ مصر آئے' مصر سے قیروان چلے گئے' غیر معمولی ذہین آدمی تھے اسی سے ان کی ذہانت کا اندازہ کیجئے کہ امام ابوحنیفہ کے تمام شاگردوں میں سب سے زیادہ ذہانت میں زفر بن ہذیل کی شہرت ہے' للہ

تھے کہ میں نے مسجد حرام (مکہ معظمہ) میں اپنے والد کو دیکھا کہ ایک شخص سے بحث کر رہے ہیں۔ یہ ایک پردیسی مسافر آدمی معلوم ہوتا تھا' مگر باتیں پتے پتے کی پوچھ رہا تھا میرے والد نے اس کے سوالات کی گہرائیوں کو دیکھ کر دریافت کیا کہ بھائی تم کہاں کے رہنے والے ہو'اس نے کہا کہ جناب میرا وطن طنجہ ہے اسلام کے آخری حدود کا یہ علاقہ ہے مکہ معظمہ سے کئی ہزار میل دور ہے میرے والد نے پوچھا کہ پھر یہ باتیں تمہیں کس ذریعہ سے معلوم ہوئیں جو تم پوچھ رہے ہو اس نے کہا کہ امام ابوحنیفہ کی کتابوں سے اور آخر میں اس نے کہا کہ گو ہمارے یہاں امام مالک اور امام اوزاعی کے اقوال کا بھی تذکرہ کیا جاتا ہے۔ لیکن فتویٰ عموماً ابوحنیفہ کے قول پر دیا جاتا ہے۔

کچھ بھی ہو یہ خیال عباسیوں کے دورِ حکومت کے ابتدائی دنوں میں جو پیدا ہو گیا تھا کہ قضا کے مسئلہ میں جو گندگی اور انتشار کی کیفیت پیدا ہو گئی ہے اس کو ختم کر کے باضابطہ تنظیم اس کی اس طور پر کی جائے کہ ممالک محروسہ کے سارے قضاۃ اور ساری

لہ لیکن لکھا ہے کہ زفر کو ہمیشہ ابن فروج کے مقابلہ میں شکست ہی اٹھانی پڑی' خود ابن فروج بیان کرتے تھے کہ جس کسی سے میں اب تک ملا ہوں سب سے زیادہ فقیہ میں نے آپ ہی کو پایا بجز ابوحنیفہ کے علاوہ علم و فضل کے لوگ ان کے تقویٰ اور پارسائی کی بھی شدت سے معتقد تھے' گھر سے جب نکلتے تو مریضوں کا ہجوم راستہ پر دم کرانے کے انتظار میں کھڑا رہتا تھا' حزی اور ابن حبان بستوں نے ان کا ذکر کیا ہے اور توثیق کی ہے ان سے بھی محدثین کو ان ہی دو باتوں کی شکایت تھی ایک تو وہی کہ نبیذ کو حلال سمجھتے تھے اور دوسری بات امام ابوحنیفہ کے سیاسی نقطۂ نظر میں ان کی ہم نوائی تھی۔ یعنی لکھا ہے کہ کان یری الخروج علی اھل الجور (ظالم حکمرانوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے کے قائل تھے ان سے سنن ابوداؤد میں روایت بھی ہے کہ دیکھو جواہیر مضیہ ص ۲۸۰ ج ۱۔ میں یہ کہنا چاہتا تھا کہ مقریزی نے کتاب الخطط میں ان ہی عبداللہ بن فروج کے متعلق لکھا ہے۔ کہ افریقہ میں پہلے کسی خاص مسلک کے لوگ پابند نہ تھے بلکہ حدیث و قرآن پر عامل تھے ان ہی عبداللہ بن فروج نے امام ابوحنیفہ کے مذہب کو افریقہ میں پھیلایا اور ان کے بعد اسد بن فرات امام کی کتابیں افریقہ میں لے گئے۔ دیکھو مقریزی ص ۱۰۱ ج ۱۱ اسد بن فرات کا ذکر میں نے اجمالاً کہیں پہلے کیا ہے فقہ مالکی اور حنفی فقہ میں جو تعلق ہے اس کی تاریخ میں اسد کے وجود کو بڑی اہمیت حاصل ہے' کتاب تدوین فقہ میں انشاء اللہ اس کی تفصیل کی جائے گی۔ ۱۲

عدالتوں کو کسی ایک ہی آدمی کے سپرد کر دیا جائے یعنی ''قاضی القضاۃ''۔

ابوجعفر نے امام ابوحنیفہ کے سامنے پیش کیا تھا یہ خیال خود امام ابوحنیفہ ہی کا پیدا کیا ہوا تھا۔ انہوں نے اسلامی عدالت کی تنظیم اور نظام عدالت کی توحید کیلئے سر دھڑ کی بازی لگا دی تھی اور کوئی شبہ نہیں کہ جس وقت ابوجعفر نے امام کو اپنے دام میں لانے کے لئے ان کے اس آخری مرغوب دانے کو سامنے رکھ دیا تو بہ ظاہر عقل کا تقاضا یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس عہدے کو چاہئے تھا کہ وہ قبول کر لیتے اور جس طرح مقامی یا چند صوبوں کی قضا کو انہوں نے مسترد کر دیا تھا حکومت کے اس پیش کش کو مسترد نہ کرتے۔

امام ابوحنیفہ کا آخری امتحان

لیکن میرے خیال میں امام ابوحنیفہ کی زندگی کا یہی آخری امتحان تھا' یہی دیکھنے کی بات تھی کہ اس وقت وہ کیا فیصلہ کرتے ہیں؟ یہ سچ ہے کہ اگر اس پیش کش کو حکومت کے وہ قبول کر لیتے تو بہ ظاہر یہی سمجھ میں آتا ہے کہ اپنے اس مقصد میں جس کے لئے وہ جی رہے تھے اس میں کامیاب ہو جاتے لیکن ابوحنیفہ ابوحنیفہ ہی کب بنتے اگر ان کی سمجھ میں بھی وہی بات آتی جو ہر عامی کی سمجھ میں آتی ہے۔

سوچنا چاہئے کہ سارے ممالک محروسہ کے قاضی القضاۃ بن کر حکومت عباسیہ میں امام ابوحنیفہ ایک ممتاز مقام اگر حاصل کر لیتے' گویا ایک طرح سے ابوجعفر منصور کے وزیر عدالت کے منصب جلیل پر اس طریقہ سے فائز ہو جاتے اور وہی گراں قدر تنخواہ اور دوسری آمدنیاں اسی عزت و جاہ کے ساتھ امام ابوحنیفہ کو مل جاتیں جو اسی قاضی القضاۃ کے عہدے پر بحالی کے بعد قاضی ابویوسف کو ملیں[1] تو اس کا نتیجہ کیا ہوتا؟ یقیناً ایسے

---

[1] قاضی ابو یوسف کو مالی منافع کیا حاصل ہوئے' اگر ان کا حساب کیا جائے تو لاکھوں لاکھ سے وہ متجاوز ہو جائیں گے۔ شاید کوئی مہینہ گذرتا ہوگا جس میں خلیفہ کی طرف سے یا خلیفہ کے اعزہ واقرباء اور بیگموں کے پاس سے قاضی صاحب کے پاس بڑی بڑی رقمیں انعام میں نہ آتی تھیں۔ علاوہ رقوم کے قیمتی کپڑوں کے تھان طرح طرح کے ظروف اور تحفے ہدایا جن کا ذکر مورخین نے کیا ہے' ابھی تک

زمانے میں جب ان ہی عہدوں اور مال و جاہ کو حاصل کرنے کے لئے لوگ سب کچھ کر رہے تھے آسمان کے قلابے زمین سے اور زمین کے قلابے آسمان سے ملا رہے تھے' نہ خود مرنے سے ڈرتے تھے نہ دوسروں کو مارنے کی پروا کرتے تھے۔ مسلمانوں کا خون بہاتے تھے۔ قریب سے قریب تر عزیزوں اور رشتہ داروں تک کو اپنی راہ میں حائل پاتے ہوئے دیکھ کر بے دردی کے ساتھ ان کو ختم کر دیتے تھے۔ الغرض جیسے ہمیشہ جاہ و مال کے لئے دنیا سب کچھ کرتی رہی ہے وہ بھی کر رہے تھے۔ سمجھنے والوں کو کون روک سکتا تھا۔ اگر یہ سمجھتے کہ ان ہی راہوں میں ایک راہ علم اور دین کی بھی تھی جس کو ذریعہ بنا کر حکومت کے اس منصب و اقتدار کے حاصل کرنے میں ابوحنیفہ نے کامیابی حاصل کی' خدانخواستہ مخلوق کو اس رائے کے قائم کرنے کا موقعہ اگر دے دیا جاتا' خواہ نیت کے لحاظ سے یہ رائے ان کی غلط ہی ہوتی۔ لیکن امام صاحب کی ساری کوششوں کے رائگاں ہونے میں کیا کوئی شبہ باقی رہ سکتا تھا۔ یقیناً انہوں نے جو کچھ کیا تھا سب اکارت ہو کر رہ جاتا' ایک وقتی طمطراق کے سوا ان کے مجاہدات کی نوعیت قطعاً اور کچھ باقی نہیں رہتی جیسے ہر زمانہ میں اس قسم کی کوششوں کا انجام ہوا ہے کوئی وجہ ہو سکتی تھی جو امام کی کوششیں اس بڑے انجام سے بچ سکتی تھیں۔

مگر مصیبت یہ تھی کہ یہ آخری خوراک تھی جسے حکومت نے ان کے سامنے پیش کیا

لے پوری تحقیق سے نہیں کہہ سکتا۔ لیکن ابن المبارک کے حوالہ سے عام کتابوں میں ان کی تنخواہ بتائی گئی ہے کہ طلائی سکہ ۱۰۰ اسو اور نقرئی سکے ہزار ماہوار ملتے تھے۔ دینار طلائی سکہ اس زمانے کا موجودہ عہد کے روپے سے کتنے روپیہ کا ہوتا تھا یہ ذرا تفصیل طلب مسئلہ ہے مگر جیسا کہ میں نے عرض کیا عطایا اور انعام کے مقابلہ میں اس تنخواہ کی کوئی حقیقت نہ تھی۔ ہارون نے جب کبھی انعام دیا ہے تو ایک لاکھ دو لاکھ درم دس ہزار سے کم تو شاید کبھی نہیں دیا۔ دیکھئے امام ابو یوسف کی سوانح عمری لکھا ہے کہ ان ہی کے ساتھ یہ خاص رعایت ہارون کی تھی کہ سوار سراپردہ تک پہنچتے اور پردہ جس وقت اٹھتا اس وقت بھی سوار ہی رہتے۔ ہارون پہلے سلام کرتا۔ جب قاضی ابو یوسف ہارون کے سامنے آتے تو عادۃً اس مصرعہ کو ضرور پڑھتا۔ ع: جاءت بہ معتجراً ببردہ یعنی عمامہ باندھے چادر اوڑھے وہ میرے سامنے آیا لکھا ہے کہ قاضی صاحب کے اصطبل میں ایک ایک وقت میں سات سات سو خچر اور تین تین سو گھوڑے رہتے تھے۔ ۱۲

تھا۔ ابوجعفر کا اصلی مقصد تو امام کو اپنے قابو میں لانا تھا' ان فتوں کا جن کا تجربہ امام ابو حنیفہ سے ہو چکا تھا۔ اس کے سوا کوئی علاج نہ تھا کہ امام کو یا تو حکومت میں شریک کرلیا جائے یا ان کو ختم کر دیا جائے۔ وہ طے کر چکا تھا کہ اس خطرناک کانٹے کو اپنی حکومت کی راہ سے بہرحال نکال کر رہوں گا' اور وہ جو کچھ بھی کر رہا تھا اسی لئے کر رہا تھا۔ قاضی القضاۃ کا عہدہ یعنی عدل وانصاف فصل خصومات جیسا کہ عرض کر چکا ہوں حکومت کے اس جوہری شعبہ کے کلی اختیارات کی سپردگی اس سیاسی بازیگری کا آخری پتہ تھا جسے ابو جعفر نے پھینک دیا تھا۔ اس کے بعد اگر کوئی اور چیز دی جاسکتی تھی تو شاید وہ خود خلافت ہی ہوسکتی تھی۔

ابوجعفر کے وزیر عبدالملک بن حمید کا حضرت امام کو مشورہ

خلاصہ یہ ہے کہ یہ آخری لقمہ تھا ابوجعفر اس کے ردعمل کو دیکھنا چاہتا تھا' کہ اب ابو حنیفہ کیا کرتے ہیں؟ امام کے سوانح نگاروں نے امام ابوحفص الکبیر کے صاحبزادے ابو عبداللہ محمد کے حوالہ سے جو یہ نقل کیا ہے کہ ابوجعفر منصور اور امام ابوحنیفہ کے درمیان جس زمانے میں کش مکش کا یہ سلسلہ جاری تھا تو ابوجعفر کے وزیر عبدالملک بن حمید جو امام سے عقیدت رکھتا تھا اس نے آکر امام کو سمجھاتے ہوئے مطلع کیا تھا کہ:

ان امیر المومنین یطلب علیک علة فان لم تقض صدقک علی نفسک ھاظن بک. (ص ۲۰۶ ج ۱ موفق)	امیر المومنین (یعنی ابوجعفر) تو صرف حیلہ کی تلاش میں ہے اگر آپ اس کے عطیہ کو قبول نہ کریں گے ہم جو بدگمانیاں آپ کے متعلق رکھتے ہیں ان کے متعلق یقین کرلیں گے کہ سچ ہیں۔

امام ابوحنیفہ کے سامنے اب کل دو راہیں یا تو ابوجعفر کے اس پیش کئے ہوئے آخری لقمہ کو نگل کر خود بچ جائیں' لیکن اپنی زندگی کی ساری کمائی کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیں' یا ابوجعفر کی بدگمانیوں کو یقین کے درجے تک پہنچا کر اپنے نصب العین کو بقاء دوام بخشنے کے لئے خود اپنی ذات کے ختم ہو جانے کے خطرے کو برداشت کرنے کے لئے

آمادہ ہو جائیں۔

حضرت امام کے تازیانے کی سزا کی روایتوں پر تنقید

مجھے بار بار افسوس کے ساتھ اس کا اظہار کرنا پڑتا ہے کہ امام کے سوانح نگار اپنی ذاتی دلچسپیوں کی تفصیل میں کچھ اس طرح منہمک ہو گئے ہیں کہ بہت سے واقعات جن کا تذکرہ ضروری تھا ان کو غیر اہم قرار دے کر لوگوں نے نظر انداز کر دیا ہے، مثلاً اس قسم کی باتیں کہ ابو جعفر نے امام کے سامنے اتنی رقمیں پیش کیں۔ اس قصے کو یا ابو جعفر کی طرف جو یہ منسوب ہے کہ امام کو اس نے کوڑے سے پٹوایا بھی تھا اس کی تفصیل سے ان کو اتنی دلچسپی معلوم ہوتی ہے کہ کوڑوں کی تعداد کتنی تھی کوئی دس کوڑے یومیہ کا حساب بتاتا ہے، کوئی تیس کوڑوں کی روایت کو ترجیح دینا چاہتا ہے پھر یہ کہ جب ابو جعفر کو اس کے چچا عبدالصمد نے آکر ڈانٹا تو گھبرا کر ابو جعفر نے کہا کہ فی تازیانہ میں تیس تیس ہزار درہم بطور فدیہ دینے پر تیار ہوں، آپ جا کر ان کو راضی کیجئے لیکن امام صاحب راضی نہ ہوئے اس پر راوی پھر اپنی یہ رائے پیش کرتا ہے کہ:

> سوچنے کی بات ہے کہ یہ اس زمانے کا قصہ ہے جب ایک درم آج کل کے حساب سے سو درم کا قائم مقام تھا کیونکہ پہلے زمانہ میں روپے کی اتنی کثرت نہ تھی جتنی اب ہے۔[1]

---

[1] موفق نے راوی کا نام عبدالعزیز بن عصام بتایا لکھا ہے کہ ابو حنیفہ کے دیکھنے والوں میں تھے ان کے اس تشریح سے میری سمجھ میں ایک اور بات آ رہی ہے یعنی کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اپنے اپنے زمانہ کے متعلق شائد ہمیشہ لوگوں میں یہ خوش اقتصادی پائی گئی ہے کہ روپیہ ان ہی کے زمانہ میں سستا اور ارزاں ہو گیا ہے ورنہ ان کے زمانے سے پہلے بہت کامیاب تھا۔ آج بھی بولنے والے تقریباً آٹھ نو سو سال کے بعد بخبسہ ان ہی الفاظ کو دہراتے ہوئے نظر آتے ہیں میں نے مسلمانوں کے معاشی اور معاشرتی مسائل کے متعلق بعض معلومات ایک کتاب میں کچھ جمع کر دیئے ہیں ان کو دیکھئے اس مغالطہ کی حقیقت کسی نہ کسی حد تک ان معلومات سے واضح ہوتی ہے اس میں بہت کچھ دخل میرے نزدیک اپنے اپنے زمانہ کی خوش اعتقادیوں کو بھی ہے۔ ۱۲

حالانکہ جہاں تک میں خیال کرتا ہوں خود راویوں کو ملا یا نہ زندگی کے لحاظ سے ان رقموں کو خواہ جتنی بھی اہمیت حاصل ہو۔ لیکن کروڑوں نہیں تو لاکھوں لاکھ کے کاروبار کرنے والے امام ابوحنیفہ کی نسبت سچ پوچھئے تو اتنے روپوں کی چنداں وقعت بھی نہ تھی۔ لیکن ان حضرات کے نزدیک چونکہ یہی بہت بڑی چیز تھی۔ اس لئے بار بار مختلف پیرایوں میں یا تو روپے کے ردوقبول کے ذکر پر اپناز وران حضرات نے خرچ کر دیا ہے یا داستان کو زیادہ پرکیف اور بامزہ بنانے کے لئے مار پیٹ کے قصوں کے بیان کرنے میں یہ سوچے بغیر کہ دوسرے حالات پر وہ کس حد تک منطبق ہو سکتے ہیں بڑی دراز نفسیوں سے کام لیا گیا ہے حتیٰ کہ بعضوں نے تو یہاں تک بیان کر دیا کہ علانیہ کھلے میدان میں جس کا نام ''عقابین'' کا میدان تھا' کہتے ہیں کہ امام ابوحنیفہ کو کوڑوں سے پیٹا جاتا تھا' اور بات اسی پر ختم نہیں ہوگئی ہے۔ ان ہی بیان کرنے والوں نے ایسی روایتیں بھی پھیلا دی ہیں جن کو اگر صحیح مان لیا جائے تو اس کا مطلب یہی ہوسکتا ہے کہ امام صاحب کے بدن سے کپڑے اتروا کر صرف پائجامے کے ساتھ پولیس والے ہاتھ میں بیڑیاں ڈالے جیل خانے سے ان کو باہر لاتے۔ پھر تماشا دیکھنے کے لئے لوگوں کو عام دعوت دی جاتی' جب لوگ جمع ہو جاتے تو امام پر کوڑے لگائے جاتے' مارتے مارتے کھال ادھیڑ دی جاتی' حتیٰ کہ امام کی ایڑیوں سے خون بہنے لگتا' اسی حال میں پولیس کے یہی سپاہی امام صاحب کو بغداد کے سارے بازاروں میں خلیفہ کے حکم سے گشت کراتے' امام صاحب روتے جاتے ایک سے زیادہ دن تک ان لوگوں کا بیان ہے کہ بغداد کے بازاروں میں یہ تماشا پیش ہوتا رہا کوئی شبہ نہیں کہ ان اضافوں سے مظلومیت کی تصویر کشی میں درد کی کیفیت بہت زیادہ بڑھ جاتی ہے لیکن اب اسے کیا کہئے کہ ایک ہی سانس میں ان روایتوں کے ساتھ ساتھ یہ بھی کہتے جاتے ہیں کہ ان ہی حالات میں آخر امام کی وفات ہوگئی اور جس میدان میں جنازہ کی نماز پڑھی گئی نمازیوں سے وہ بھر گیا تھا میدان کی جب پیمائش کی گئی تو اندازہ کیا گیا کہ کم از کم پچاس ہزار آدمی جنازے کی نماز میں شریک تھے۔ یہ بھی کہتے ہیں کہ نمازیوں کی کثرت کی وجہ سے چھ دفعہ امام کے جنازے پر نماز ہوئی بلکہ بعض

روایتوں میں ہے کہ جن لوگوں کو جنازے کی نماز نہ مل سکی وہ قبر پر بیس دن یا اس سے بھی زیادہ دن تک نماز پڑھتے رہے یہی لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ امام کی وفات کی خبر جب شہر میں پھیلی تو

کثر بکاء الناس بکثرت لوگ امام کی وفات پر روئے۔
علیه.(ص ۱۸۲ ج ۲ موفق)

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جس شخص کی عام ہر دل عزیزی اور حسن قبول کا یہ حال تھا کیا ابوجعفر منصور عقل۔ سے اتنا کورا تھا کہ عام مخلوق کے ایسے با اثر مذہبی پیشوا کو اس طرح بازاروں میں روزانہ گشت کرا کے پٹوا کر وہ ساری دنیا کو اپنی حکومت کی دشمنی پر خواہ مخواہ بلا وجہ آمادہ کر لیتا؟ کسی اور جگہ اسی کتاب میں میں نے اسی ابوجعفر کے بیٹے مہدی کا وہ قول نقل کیا ہے کہ سفیان ثوری سے اور مہدی سے جب کچھ سخت گفتگو ہوتی تو مہدی کے درباری ربیع نے کہا کہ امیر المومنین! اس جاہل کی یہ مجال جو آپ سے ایسی گفتگو کرے مجھے حکم دیجئے میں اس کی گردن اڑا دیتا ہوں اس پر مہدی نے جھڑکتے ہوئے ربیع کو کہا تھا۔

اسکت ویللک ما یرید هذا و امثاله الا ان نقتلهم فنشقی بعادتهم.(ص ۱۱۲) چپ رہ کم بخت یہ اور ان جیسے لوگوں میں اس کے سوا اور آرزو کیا پائی جاتی ہے کہ ہم ان کو قتل کر دیں اور ان کی سعادت و خوش بختی ہمیں بدبخت بنا دے

عباسیوں کا احوذی باز اشہب کیا اسی سیاسی نظریہ سے ناواقف تھا؟

واقعہ یہ ہے کہ کچھ امام ابوحنیفہ ہی کے اس قصے میں نہیں بلکہ اس نوعیت کے اکثر واقعات میں یہ دیکھا گیا ہے کہ جو واقعہ ہے صرف اسی پر قناعت کرتے ہوئے لوگوں کو بہت کم پایا گیا ہے خدا جانے یہ کیوں سمجھ لیا جاتا ہے کہ جو کچھ گذرا ہے صرف اسی کا اظہار سننے والوں پر اس اثر کو نہیں پیدا کر سکتا جسے بیان کرنے والے پیدا کرنا چاہتے ہیں شاید اسی لئے عموماً ان واقعات کی تعبیر میں اضافہ اور حاشیہ آرائی کچھ ناگزیر عادت سی بن گئی ہے جس کی سب سے بڑی مثال ”فاجعہ کربلا“ ہے۔ کربلا میں جو کچھ رسولؐ کے گھرانے

پر گذرا بجائے خود اپنی دور انگیزیوں اور اثر آفرینوں میں وہی کیا کم ہے۔ لیکن بیان کرنے والے خدا جانے ان کو کیوں ناکافی خیال کر کے رنگ آمیزیوں سے کام لینا ضروری قرار دیتے ہیں؟ جہاں تک میں سمجھتا ہوں امام ابوحنیفہ کے اس واقعہ کے متعلق بھی کچھ اسی قسم کی صورت پیش آتی ہے۔

میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ تازیانہ زنی کے جس واقعہ کو ابوجعفر خلیفہ کی طرف لوگ منسوب کرتے ہیں وہ سرے سے غلط ہے بلکہ کہنا یہ چاہتا ہوں کہ واقعہ کی تعبیر و اظہار میں یہاں بھی حاشیہ آرائیوں سے کچھ کام ضرور لیا گیا ہے امام ابوالمحاسن حسن علی المرغینانی[1] نے جو تحریر بخارا سے لکھ کر امام ابوحنیفہ کے اسی واقعہ کے متعلق علامہ موفق کے پاس بھیجی تھی اس تحریر کو درج کرتے ہوئے موفق نے لکھا ہے کہ عبدالعزیز بن عصام جن کے حوالہ سے علامہ مرغینانی نے اس واقعہ کو اپنی مسلسل سند سے نقل کیا ہے یہ امام ابوحنیفہ کے دیکھنے والوں میں تھے ان کا بیان تھا کہ میں نے ابوحنیفہ کو دیکھا تھا۔ واقعہ ان کے ساتھ یہ پیش آیا کہ ابوجعفر خلیفہ نے قضا کے لئے ان کو بلایا تھا۔ لیکن امام نے جب انکار کیا اور دونوں میں گفتگو اپنی انتہائی شدت کو پہنچ گئی تو ابوجعفر نے غصے سے مغلوب ہو کر امام کو برا بھلا کہا اور کوڑوں سے پٹوایا بھی۔ راوی کہتا ہے کہ میں نے عبدالعزیز سے پوچھا کہ کیا تم نے خود اپنی آنکھوں سے امام رحمۃ اللہ علیہ کو مار کھاتے ہوئے دیکھا اسی کے جواب میں جو بات کہی گئی وہی سوچنے کی ہے انہوں نے کہا کہ:

''یہ واقعہ تو خلیفہ کے سامنے پیش آیا' بھلا مجھ جیسے آدمی کی وہاں کیا گذر ہو سکتی تھی۔''

اس کے بعد کہا کہ:

''ہاں جب خلیفہ کے سامنے سے وہ باہر لائے گئے تو اس وقت میں نے دیکھا کہ صرف پائجامہ پہنے ہوئے ہیں اور پشت پر ان کے مار کے نشانات

---

[1] یہ صاحب ہدایہ کے استاد ہیں جامع ترمذی کی سند صاحب ہدایہ نے ان ہی سے حاصل کی تھی۔ دیکھو جواہر مفیہ ج اص ۱۹۷۔۱۲

نمایاں تھے ایڑیوں پر خون بھی بہہ رہا تھا۔''

یقیناً عبدالعزیز بن عصام کی اس چشم دید شہادت کو دوسروں کی سنی سنائی روایتوں پر ترجیح دینی چاہیے۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں عبدالعزیز کے اس بیان سے حسب ذیل باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ یعنی ایک تو یہی کہ امام کے ساتھ یہ واقعہ کسی ایسی جگہ میں پیش آیا ہے جہاں عوام کی گذر نہیں ہو سکتی تھی اور یہی بات قرین عقل و قیاس بھی ہے' بلکہ آگے عبدالعزیز بن عصام کا جو یہ بیان ہے کہ امام صاحب باہر لائے گئے اس میں ایک لفظ کا اضافہ بھی ہے عربی الفاظ یہ ہیں۔

ولكن اخرج مجرد الى الدار	لیکن باہر لائے گئے امام صاحب دار کی طرف
فی السراویل. (ص ۱۸۲)	پائجامے میں۔

اس میں ''الی الدار'' کا لفظ قابل غور ہے میں نے اس اصطلاح کی شاید کہیں پہلے بھی تشریح کی ہے یعنی عربی میں دار کا لفظ ''احاطہ'' کے مفہوم کو ادا کرتا ہے بہ ظاہر اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ خلیفہ کی خاص نشست گاہ کے سامنے تو واقعہ پیش آیا جہاں عوام کی گذر نہیں ہو سکتی تھی' اس کے بعد امام صاحب دارالخلافت کے اس عام احاطہ میں لائے گئے۔ جہاں تک عوام بھی پہنچ سکتے تھے وہیں امام کو عبدالعزیز نے اس حال میں پایا بہر حال میرا خیال ہے کہ اس حال میں بھی امام صاحب کو دارالخلافت کے احاطہ ہی میں دیکھا گیا ہے عام جگہ سے اس کا تعلق نہیں ہے۔

کس قدر عجیب ہے اسی عبدالعزیز بن عصام کی روایت کا وہ مشہور جز جس کا مختلف موقعوں میں تذکرہ کرتا چلا آرہا ہوں۔ یعنی تازیانہ کے اس واقعہ کے بعد ابوجعفر کے پاس اس کا چچا عبدالصمد[1] پہنچا اور کہنا شروع کیا۔

---

[1] عباسی خاندان کا یہ عجیب و غریب تاریخی آدمی ہے۔ لکھا ہے کہ ان کی عمر (۸۱) سال کی ہوئی لیکن جس دانت کو لے کر پیدا ہوئے اسی کو لے کر دنیا سے روانہ ہوئے جس کے معنی یہی ہوئے کہ دودھ کے دانت ان کے نہیں ٹوٹے تھے۔ حضرت عبداللہ بن عباس صحابی کے حقیقی پوتے ہیں یعنی عبدالصمد بن علی بن عبداللہ بن عباس یہ نسب نامہ ہے۔ عباسی خلفاء میں سے السفاح ابوجعفر مہدی' تلك

امیر المومنین! آپ نے آج کیا کیا' ایک لاکھ تلواریں اپنے اوپر کھچوالیں' یہ عراق والوں کا امام ہے' مشرق والوں کا فقیہ ہے۔

اگر یہی واقعہ تھا' اور یقیناً یہ واقعہ تھا' تو ابوجعفر جیسے ہوشیار سیاس کی طرف اس غلطی کو عقل منسوب کرنے کی جرأت کر سکتی ہے کہ عراق اور مشرق کے مسلمانوں سے بھرے شہر بغداد میں امام کے ساتھ علانیہ اس قسم کے حرکات کا وہ ارتکاب کرے بلکہ عبدالعزیز ہی کے بیان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اپنی خاص نشست گاہ (دیوان خاص) میں امام کو تازیانے لگانے کا حکم ابوجعفر نے کسی وقتی اور فوری غصہ کے زیر اثر دیا تھا اور یہ بھی اس کی غلطی تھی جس پر فوراً اس کے بہی خواہ چچا نے آ کر اس کو متنبہ کیا' پھر عبدالعزیز کی اسی روایت کے آخر میں جو یہ اضافہ ہے کہ امام صاحب جب ابوجعفر کے سامنے سے ہٹائے گئے اور دار (احاطہ) میں لا کر کھڑے کئے گئے تو ابوجعفر کو اس کی اس فاش سیاسی غلطی پر ملامت کرنے کے بعد عبدالصمد جو امام صاحب کے متعلق خلیفہ سے سفارش کرتا رہا آخر میں ہے کہ:

حتیٰ اذن له فی الانصراف الی منزله. (موفق ص ۱۸۲ ج ۲) تا آنکہ خلیفہ نے امام ابوحنیفہ کو اپنی فرودگاہ جانے کی اجازت دی۔

اس سے بھی میرے اس دعویٰ کی تائید ہوتی ہے کہ عبدالعزیز نے خلیفہ کے سامنے سے آنے کے بعد امام کو دارالخلافت کے احاطہ ہی میں دیکھا تھا بلکہ آگے بیان کیا ہے کہ:

عبدالصمد نے امام صاحب کو ان کے کپڑے پہنائے اور جہاں وہ ٹھہرے ہوئے تھے پہنچا دیا۔ (ص ۱۸۲)

اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ دارالخلافت سے امام صاحب اپنے پورے

لے ہادی ہارون پانچ خلفاء کے زمانے کو دیکھا۔ ہارون کے دربار میں ایک دن بطور لطیفہ کے کہا بھی تھا کہ امیر المومنین! آپ کے اس دربار میں امیر المومنین کے چچا اور چچا کے چچا' نیز چچا کے چچا بھی موجود ہیں' یعنی خود اپنی طرف عبدالصمد کا اشارہ تھا گویا اس حساب سے ہارون عبدالصمد کا رشتہ چھڑ پوتا ہوا دیکھو الخطیب ۳۶ اج ۱۱۔

لباس میں باہر نکلے۔ بہر حال اس قسم کی روایتیں کہ بازاروں میں روزانہ گشت کرا کے عقابین کے میدان میں امام کو کوڑے لگائے جاتے تھے میرے نزدیک یہ عام حاشیہ آرائی ہے جس کے اضافہ کا اس قسم کے واقعات میں عام رواج ہے۔

قاضی القضاء کے عہدہ کے پیشکش پر حضرت امام اور ابو جعفر کی گفتگو

خیر میں یہ کہنا چاہتا تھا کہ اصل معاملہ یعنی مقامی قضا یا چند صوبوں کی قضا کے بعد آخر میں ابو جعفر خلیفہ نے سارے مالک محروسہ کی عدالتوں کے قاضی القضاۃ ہونے کا عہدہ امام پر جب پیش کیا تو ہر ہر منزل پر امام صاحب اور خلیفہ میں تفصیلی گفتگوئیں جو ہوتی رہیں افسوس ہے کہ ترتیب کے ساتھ امام کے سوانح نگاروں نے ان کو نقل نہیں کیا ہے وہ زیادہ تر رقتی قصوں اور تازیانہ زنی کے واقعات میں الجھے نظر آتے ہیں ان کے بیانات سے بہ مشکل جو چند معلومات فراہم ہوتے ہیں ان کے متعلق یہ کہنا دشوار ہے کہ ان میں سے کس گفتگو کا تعلق ان تینوں تدریجی منزلوں میں سے کس منزل سے ہے تخمینی طور پر اگر کچھ کہا جا سکتا ہے تو شاید وہ یہی ہو سکتا ہے کہ مقامی قضا کا قصہ جب امام کے سامنے پیش کیا گیا تو کوفہ کے قاضی ہونے سے انکار کرتے ہوئے امام نے وہی عذر پیش کیا' جس کا ذکر کر چکا ہوں' یعنی میں خباز (نانبائی) یا خزاز (خز فروش) کا لڑکا ہوں کوفہ والے مجھے قاضی دیکھ کر اینٹ اور پتھر سے میری خبر لیں گے۔ اسی طرح معلوم ہوتا ہے کہ بجائے کوفہ کے خود بغداد دار الخلافہ کے قاضی ہونے سے انکار امام نے جب کیا تو شاید اسی وقت ابو جعفر سے آپ نے وہ باتیں فرمائیں جنہیں الفاظ کے معمولی ردو بدل سے تقریباً تمام سوانح نگاروں نے نقل کیا ہے غور کرنے سے ان کا مطلب کم از کم میری سمجھ میں جو آتا ہے وہ یہی ہے کہ عدالت و انصاف خدا کی ایک امانت ہے جو بادشاہوں کے سپرد کی جاتی ہے اس امانت کی ذمہ داریوں سے صحیح معنوں میں عہدہ برا ہونے کی اس

میں کوئی شبہ نہیں کہ یہی صورت ہوسکتی ہے کہ ایسے آدمی کا تقرر قضا کے فرائض کی بجا آوری کے لئے کیا جائے جس کے دل میں کسی کا خوف نہ ہو اس کلی قاعدے کے ذکر کے بعد خود اپنے متعلق امام نے کہا:

''مجھ پر بھروسہ تم کو نہ کرنا چاہیے اگر خوشی سے بھی اس عہدے کی ذمہ داری میں قبول کروں جب بھی میں آپ کو مطلع کرنا چاہتا ہوں کہ آپ کے خلاف بھی فیصلہ دینے کا موقعہ میرے سامنے آ گیا اور مجھے یہ دھمکی دی جائے کہ اس فیصلہ سے یا تو ہٹ جاؤ ورنہ دریائے فرات میں تجھے غرق کر دیا جائے گا تو میں کہے دیتا ہوں کہ فرات میں ڈوب مرنے کو قبول کرلوں گا لیکن فیصلے کے بدلنے پر راضی نہیں ہوسکتا اور جب رضامندی سے اس عہدے کو قبول کرنے میں یہ میرا خیال رہے گا تو اسی سے اندازہ کیجئے کہ زبردستی خلاف مرضی اگر مجھے قاضی بنایا گیا تو اس وقت غصہ کی حالت میں میں جو کچھ کروں گا وہ ظاہر ہے۔'' (ص ۱۷۱ ج ۲ موفق)

کہتے ہیں کہ اسی سلسلہ میں امام نے فرمایا تھا کہ:

ولک حاشیة یحتاجون الی من یکرمھم لک. (موفق ص ۱۷۱ ج ۲)	آپ کے حاشیہ (اسٹاف) میں لوگ ہیں جنہیں ضرورت ایسے آدمی کی ہے جو آپ کی وجہ سے ان کے وقار کو برقرار رکھیں۔

ظاہر ہے کہ اس کا مطلب یہی تھا کہ بھلا جو خلیفہ کے خلاف بھی فیصلہ کرنے کا عزم رکھتا ہو، خواہ اسے جان ہی سے دست بردار ہونے کی دھمکی اسے کیوں نہ دی جائے تو وہ اس کا خیال کہاں تک کرسکتا ہے کہ آپ کے اسٹاف والوں کا وقار کس فیصلہ سے متاثر ہوتا ہے اور کس سے متاثر نہیں ہوتا جہاں تک میں سمجھتا ہوں کہ دارالخلافت کے قاضی ہونے سے امام نے جب انکار کیا تھا غالباً اسی وقت اس عذر کو آپ نے پیش فرمایا تھا۔

باقی اسی سلسلہ میں جو یہ نقل کیا جاتا ہے کہ مسئلہ قضا کے ردوقدح سوال و جواب کے ان ہی قصوں میں امام نے ابوحنیفہ منصور کو ایک دفعہ یہ بھی کہا تھا کہ:

''قاضی بننے کے لئے ایسے آدمی کی ضرورت ہے جو تمہارے خلاف بھی فیصلہ کرنے کی ہمت وجرأت اپنے اندر رکھتا ہو نیز تمہارے خانوادے کے لوگوں[1] اور تمہارے فوجی افسروں کے خلاف بھی فیصلہ صادر کرنے کی اس کے دل میں قوت ہو۔'' (ص ۲۱۵ ج ۱)

بظاہر کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاید یہ باتیں امام نے خلیفہ کے سامنے اس وقت فرمائی ہیں جب چند صوبجات یا سارے ممالک محروسہ کے قاضی اور عدلیہ کے مطلق العنان حاکم ہونے کا عہدہ ان پر پیش کیا گیا تھا اس زمانہ میں صوبجات کے ولاۃ اور اعلیٰ حکام شاہی خانوادے سے عموماً منتخب ہوتے تھے اس لئے علاوہ خلیفہ کے ان کا نیز شاہی خاندان کے سوا دوسرے حکام کا بھی آپ نے تذکرہً فرمایا ورنہ دار الخلافت کی حد تک تو صرف خلیفہ اور خلیفہ کے حاشیہ (اسٹاف) سے معاملہ تھا' لیکن سارے ممالک محروسہ کے قاضی القضاۃ کو تو حکومت کے سارے عہدہ داروں کے مقابلہ میں اگر ضرورت پیش آئے گی تو مخالفانہ فیصلہ کرنے پر آمادہ ہونا پڑے گا۔

ابوجعفر کے سامنے حضرت امام کا عباسی حکومت پر بے اعتمادی کا اظہار

اس تقریر میں ان ہی باتوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اسی کے ساتھ آخر میں بے اعتمادی اور بے اطمینانی کی۔ اس کیفیت کو ظاہر کرتے ہوئے جو حکومت کی طرف سے بے چارے سرکاری قاضیوں اور سرکاری ملازموں کے دلوں میں پائی جاتی تھی امام نے فرمایا کہ:

---

[1] اصل لفظ عربی میں یہاں پر ''ولدک'' کا ہے جس کا لفظی ترجمہ تو ہوگا کہ تمہارے بچوں کے خلاف میں فیصلہ کروں گا۔ ظاہر ہے کہ نابالغ بچوں کے خلاف مقدمہ ہی کیا دائر ہوگا مقصود یہی ہے کہ شاہی خانوادے کے افراد جو عموماً خلفاء کی اولاد ہیں اور وہی عموماً صوبجات کے حکام ہوتے تھے ان کے خلاف فیصلہ کی ضرورت پیش آئے گی تو ایسا فیصلہ کر گذرنے میں بھی مجھے تامل نہ ہوگا۔

''مگر اپنا حال تو میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ (اتنے بڑے اہم فیصلوں کے متعلق تو مجھے کیا اطمینان ہوگا) تم جس وقت مجھے بلاتے ہو تو جان میں میری جان اس وقت تک واپس نہیں ہوتی جب تک کہ (بخیر و خوبی) تمہارے دربارے سے باہر نہیں آتا ہوں۔

گویا مطلب یہ تھا کہ جہاں مطلق العنانی کا دور دورہ اس رنگ میں ہو کہ دربار میں ایک شخص جب بلایا جاتا ہے تو اس کو کچھ نہیں معلوم کہ میرے ساتھ کیا کیا جائے گا' وہاں سے زندہ لوٹوں گا' یا میری لاش واپس ہوگی جہاں غیر سرکاری اشخاص کی بے اطمینانی کا یہ حال ہو' وہاں بے چارے سرکاری ملازمین اور نوکروں کے بے اعتمادی اور بے اطمینانی کی جو کیفیت ہو سکتی ہے ظاہر ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ جب تک حکومت کی طرف سے اس کی پوری پوری ضمانت نہ دی جائے کہ ہر حال میں حکومت کی مطلق العنان مرضی کی نہیں بلکہ حکومت کے صرف آئین و قوانین کی پابندی سرکاری ملازمین کا فریضہ ہوگا' اس وقت تک خلیفہ یا خلیفہ کے خانوادے کے ارکان یا دوسرے ولاۃ و حکام کے مقابلہ میں فیصلہ کرنے کی جرأت آدمی میں کہاں پیدا ہوگی وہ تو شاید کسی چپراسی یا خلیفہ کے گھر کی کسی لونڈی کے خلاف بھی فیصلہ کرنے کی ہمت مشکل ہی سے کر سکتا ہے۔ خواہ بظاہر اس کو قاضی یا قاضی القضاۃ ملک القضاۃ یا جس قسم کے الفاظ سے بھی مخاطب کیا جائے۔

یہ عجیب بات ہے کہ اس موقعہ پر امام صاحب سے منسوب کر کے لوگوں نے چند ایسے الفاظ نقل بھی کئے ہیں جن سے مذکورہ بالا مطلب سمجھ میں آ سکتا ہے۔ لیکن حیرت اس پر ہے کہ امام کے اس مطالبے پر ابوجعفر نے پھر کیا کہا اس کا قطعاً کسی نے کوئی تذکرہ نہیں کیا ہے لکھا ہے تو صرف یہ لکھا ہے کہ امام صاحب کی اس گفتگو کو سن کر ابوجعفر نے کہا کہ:

''تو پھر میرے رقمی عطیہ کو آپ کیوں قبول نہیں کرتے؟''

گویا اس کا بہ ظاہر مطلب یہی ہوا کہ امام صاحب کی اس شرط کے قبول کرنے پر

وہ راضی نہیں ہوا۔ اس لئے بات ہی اس نے بدل دی' حالانکہ کسی حیثیت سے سمجھ میں نہیں آتا کہ ابوجعفر اس مطالبے کے قبول کرنے سے گریز کرنا چاہتا تھا؟ گذر چکا کہ اس کا اصل مقصود تو کسی نہ کسی طرح امام کو اپنے قابو میں لانا تھا۔ اور یہ ایسا معقول مطالبہ تھا کہ خواہ آئندہ اس پر عمل ہوتا یا نہ ہوتا۔ لیکن وعدہ کر لینے میں کیا بگڑتا تھا' میں دیکھتا ہوں کہ ان ہی لوگوں نے قاضی شریک کے قصے کو جہاں نقل کیا ہے۔ جس کا تذکرہ ابتدائے کتاب میں کر چکا ہوں وہاں قاضی شریک کی طرف سے قریب قریب یہی شرط اسی ابو جعفر منصور کے سامنے پیش کی گئی۔ گذر چکا کہ اس کے جواب میں منصور نے کہا تھا کہ:

احکم علی وعلی والدی.(ص ۱۶۲ ج ۱ موفق) تم مجھ پر اور میری اولاد کے خلاف بھی فیصلہ کر سکتے ہو۔

پھر یہ کیا سمجھ میں آنے کی بات ہے کہ امام ابوحنیفہ کے اسی معقول مطالبہ کے جواب میں وہ اسی جواب کے دہرا دینے کے قابل نہ تھا جہاں تک میرا خیال ہے امام کے اس مطالبہ کے جواب میں بھی یقیناً ان کو اسی طرح مطمئن کیا گیا ہوگا' جیسے کچھ دن پہلے قاضی شریک کے اسی مطالبہ کو ابوجعفر نے منظور کر لیا تھا۔ لیکن دوسرے جزئیات کی تفصیل میں پھنس کر ایسی بہت سی ضروری باتیں بیان کرنے سے رہ گئی ہیں ان ہی میں یہ جواب بھی خلیفہ کا رل گیا اور سچ تو یہ ہے کہ قاضی القضاۃ کے عہدے پیش کرنے ہی میں اس شرط کی ضمانت مستور تھی جیسا کہ میں نے کہا کہ عمل کرنا یا نہ کرنا یہ دوسری بات ہے۔ لیکن اس عہدے پر بحال کرنے کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ وہ سارے اختیارات تم استعمال کر سکتے ہو جو قاضی القضاۃ کے قدرتی اور آئینی اختیارات میں اس عہدے کے پیش کر دینے کے بعد اس سوال کے اٹھانے کی امام صاحب کو ضرورت بھی نہ تھی' جسے انہوں نے ملازمت سے بچنے کے لئے اٹھایا تھا۔ جہاں بیسیوں قسم کے معاذیر وہ پیش کر رہے تھے جیسا کہ موفق ہی نے علی بن علی الحمیری کے حوالہ سے جو روایت نقل کی ہے اس میں بیان بھی کیا گیا ہے کہ:

ارادہ علی القضاء غیر مرۃ قضا کی خدمت ابوحنیفہ کے سامنے ابوجعفر کی

فاعتذروا استعفی واحتال بکل حیلة. (ص ۱۷۸)	طرف سے متعدد بار پیش کی گئی لیکن وہ عذر ہی کرتے رہے معافی چاہتے رہے اور جتنے حیلے حوالے ممکن تھے سب ہی سے کام لیتے رہے۔

دراصل اسی سلسلہ میں اس سوال کو بھی امام نے اٹھایا تھا۔لیکن یہ ایسا عذر تھا جس کا جواب ابوجعفر اثبات میں دے کر نہایت آسانی سے ان کو چپ کر سکتا تھا کوئی وجہ نہیں ہوسکتی کہ وہ خاموش رہا ہوگا۔

اسی لئے میں سمجھتا ہوں کہ قاضی القضاۃ کے عہدے کے ساتھ جن شرائط کی ضمانت امام ابوحنیفہ صراحۃً خلیفہ سے لینا چاہتے تھے۔اس کی ضمانت ان کو ضرور دی گئی' اسی طرح دی گئی جیسے قاضی شریک کو دی گئی تھی مگر سوال آگے یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس کے بعد امام نے کیا کیا افسوس ہے کہ درمیان کی یہ کڑی کچھ اس طرح گم ہوگئی ہے کہ کنایۃً و اشارۃً بھی اس کا کوئی سراغ کسی روایت میں اب تک مجھے نہیں ملا ہے۔

البتہ ایک بات یعنی آخری دفعہ امام ابوحنیفہ جب ابوجعفر کے پاس بغداد آتے ہیں یا لائے جاتے ہیں' جس کے بعد پھر کوفہ واپس نہ ہوسکے اور جیسا کہ معلوم ہے میں بھی آئندہ بیان کروں گا بغداد ہی میں ان کی وفات ہوئی' اس سے پہلے کوفہ میں ہم امام کو ایک خاص حال میں پاتے ہیں۔

امام ابوحنیفہ کی ایک اہم تاریخی تقریر

میرا مطلب یہ ہے کہ موفق نے جو روایت نقل کی ہے۔اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ ایک دن امام صاحب کے جو بڑے بڑے ممتاز شاگرد تھے وہ خود امام کے پاس حاضر ہوئے لیکن صاحب معجم المصنفین کے الفاظ یہ ہیں کہ:

فجلس فی مجلس فی جامع الکوفة فاجتمع معه الف من اصحابه اجلهم وافضلهم	امام ابوحنیفہ کوفہ کی جامع مسجد کی ایک مجلس میں بیٹھے پھر ان کے ایک ہزار شاگرد جمع ہوئے جن میں چالیس آدمی تو ایسے تھے جو اجتہاد کے مرتبہ تک

اربعون قد بلغوا حد الاجتهاد پہنچ چکے تھے پس امام نے ان کو اپنے قریب ہونے
فقربھم وناداھم. (ص ۵۵) کا حکم دیا اور بلند آواز سے ان کو کہنا شروع کیا۔

مجھے نہیں معلوم کہ صاحب مجم نے یہ الفاظ کس کتاب سے نقل کئے ہیں لیکن اگر اس کا وہی مطلب ہے جو ظاہر الفاظ سے سمجھ میں آتا ہے یا کم از کم میری سمجھ میں جو بات آئی ہے وہ یہی ہے کہ امام ابو حنیفہ نے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اپنے شاگردوں کو اطراف و جوانب سے جمع ہونے کا حکم دیا۔ ایک ہزار کی تعداد جب جمع ہوگئی تو سب کو لے کر کوفہ کی جامع مسجد میں تشریف لائے پھر مجمع میں سے چالیس آدمیوں کو خصوصیت کے ساتھ اپنے قریب بلایا۔ اور ایک تقریر اس موقعہ پر کی۔

اہمیت تو اسی تقریر کو ہے جسے میں پیش کرنا چاہتا ہوں لیکن صاحب مجم کے ان الفاظ سے اس تقریر کی اہمیت زیادہ بڑھ جاتی ہے بہر حال اس حد تک تو موفق اور صاحب مجم دونوں متفق ہیں کہ امام ابو حنیفہ نے اپنے ممتاز تلامذہ کے سامنے ایک تقریر کی باقی یہ بات کہ تلامذہ خود حاضر ہوئے تھے یا بلائے گئے تھے صاحب مجم کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ باضابطہ دعوت پر دور دور سے لوگ جمع کئے گئے تھے۔ اور اس کے بعد یہ تقریر کی گئی تھی، کچھ بھی ہو پہلے میں حضرت امام کی اس اہم تاریخی تقریر کا ترجمہ درج کرتا ہوں تلامذہ کے اس مجمع کو ان الفاظ سے خطاب کرتے ہوئے کہ:

> ''میرے دل کی مسرتوں کا سارا سرمایہ صرف تم لوگوں کا وجود ہے تمہاری ہستیوں میں میرے حزن اور غم کے ازالہ کی ضمانت پوشیدہ ہے۔''

امام نے فرمانا شروع کیا کہ:

> ''فقہ (اسلامی قانون) کی زین تم لوگوں کے لئے کس کر میں تیار کر چکا ہوں اس کے منہ پر تمہارے لئے لگام بھی میں چڑھا چکا ہوں اب تمہارا جس وقت جی چاہے اس پر سوار ہو سکتے ہو میں نے ایک ایسا حال پیدا کر دیا ہے کہ لوگ تمہارے نقش قدم کی جستجو کریں گے اور اسی پر چلیں گے۔ تمہارے ایک ایک لفظ کو لوگ اب تلاش کریں گے۔ میں نے گردنوں کو

تمہارے لئے جھکا دیا اور ہموار کر دیا ہے۔"

پھر ان خاص چالیس حضرات کو خصوصیت کے ساتھ متوجہ کرتے ہوئے جنہیں امام نے اپنے قریب بلایا تھا۔ فرمایا:

"پس اب وقت آ گیا ہے کہ آپ لوگ میری مدد کریں میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ تم (چالیس) میں ہر ایک عہدہ قضاء کی ذمہ داریوں کے سنبھالنے کی پوری صلاحیت اپنے اندر پیدا کر چکا ہے اور دس آدمی تو تم میں ایسے ہیں جو صرف قاضی ہی نہیں بلکہ قاضیوں کی تربیت و تادیب کا کام بخوبی انجام دے سکتے ہیں۔"

کہتے ہیں کہ ان الفاظ کے بعد امام نے ان ہی چالیس شاگردوں کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

"اللہ کا واسطہ دیتے ہوئے اور علم کا جتنا حصہ آپ لوگوں کا ملا ہے اس علم کی عظمت و جلالت کا حوالہ دیتے ہوئے آپ لوگوں سے میری یہ تمنا ہے کہ اس علم کو محکوم ہونے کی بے عزتی سے بچاتے رہنا' اور تم میں سے کسی کو قضا کی ذمہ داریوں میں مبتلا ہونے پر اگر مجبوری ہونا پڑے تو میں یہ کہہ دینا چاہتا ہوں ایسی کمزوریاں جو مخلوق کی نگاہوں سے پوشیدہ ہوں جان بوجھ کر (اپنے فیصلوں میں) جو ان کا ارتکاب کرے گا اس کو معلوم ہونا چاہیے کہ ایسے آدمی کا فیصلہ جائز نہ ہوگا' اور نہ قضا کی ملازمت اس کی حلال ہوگی' جو تنخواہ اس سلسلہ میں اس کو ملے گی وہ اس کی پاک آمدنی نہ ہوگی۔

قضا کا عہدہ اسی وقت تک صحیح اور درست رہتا ہے جب تک کہ قاضی کا ظاہر باطن ایک ہو اسی قضا کی تنخواہ حلال ہے:

سلسلہ کلام کو جاری رکھتے ہوئے فرمایا:

بہر حال ضرورت کو دیکھ کر اس عہدے کی ذمہ داریوں کو تم میں سے جو قبول کرے میں اسے وصیت کرتا ہوں کہ خدا کی عام مخلوق اور اپنے درمیان

روک ٹوک کی چیزوں کو مثلاً دربان، حاجب وغیرہ کو حائل نہ ہونے دے گا۔ چاہیے کہ جماعت کے ساتھ وہ شہر کی جامع مسجد میں پانچوں وقت کی نماز ادا کیا کرے۔ اور نماز کے اوقات میں سے ہر وقت میں اعلان کرائے کہ کسی قسم کی کوئی ضرورت یا حاجت کوئی پیش کرنا چاہتا ہو تو پیش کرے۔ پھر عشاء کی نماز کے بعد خصوصیت کے ساتھ تین دفعہ باآواز بلند اس اعلان کا اعادہ کرایا جائے اس کام سے فارغ ہونے کے بعد گھر جائے۔ اور چاہیے کہ بیماری کی وجہ سے جتنے دن تک قضا کے کام سے قاضی معذور رہا ہو تو حساب کر کے اتنے دن کی تنخواہ کٹوا دیا کرے''(۱)

اس تقریر کا آخری فقرہ وہ بھی تھا جس کا ذکر پہلے آچکا ہے یعنی:

''امام (یعنی مسلمانوں کا بادشاہ اور امیر) اگر مخلوق خدا کے ساتھ کسی غلط رویہ کو اختیار کرے تو اس امام سے قریب ترین قاضی کا فرض ہوگا کہ اس سے باز پرس کرے''۔ (موفق ج:۲، ص:۱۰۰)

بہر حال یہ تو امام کی تقریر کا ترجمہ تھا حتی الوسع میں نے لفظی ترجمہ ہی کی کوشش کی ہے، بعض مقامات پر ممکن ہے ایک دو تشریحی الفاظ کا اضافہ ہو گیا ہو، تقریر کی تاریخی اہمیت کا اندازہ اسی سے کیا جاسکتا ہے کہ امام موفق نے لکھا ہے کہ میرے پاس اس تقریر کی نقل نیشاپور سے بھی آئی اور ہمدان سے بھی، شہر نیشاپور سے تو شیخ صالح ابوسعد محمد بن جامع نے اور ہمدان سے سید الحفاظ ابومنصور دار الدیلمی نے قلم بند کر کے روانہ کی تھی۔ تقریر کے ابتدائی راوی قاضی ابویوسف سے حسن بن زیاد براہ راست سن کر لوگوں سے اس کو نقل کیا کرتے تھے، موفق نے یہ بھی لکھا ہے کہ ظہیر الاسلام حسن بن علی المرغینانی نے بھی اپنی کتاب میں اس تقریر کو درج کیا ہے۔

میں نے جیسا کہ شروع میں عرض کیا کہ یہ تقریر امام نے کب اور کن حالات کے تحت

(۱) ظاہر ہے کہ اس کی بنیاد ان شرائط پر قائم ہے جو حکومت ملازمتوں کے لیے طے کرتی ہے۔ اگر یہی شرط ہو کہ بیماری کے زمانہ کی تنخواہ نہیں دی جائے گی تو اس وقت تنخواہ لینے کا حق قاضی کو نہ ہوگا، لیکن بیماری کے زمانے میں بھی کل یا نصف تنخواہ کی شرط پہلے سے اگر موجود ہو تو اس وقت بیماری کی تنخواہ شرط پابندی کے ساتھ حلال ہو جائیگی۔ ۱۲

کی؟ اس کا پتہ کتابوں سے نہیں چلتا، لیکن اگر یہ صحیح ہے کہ آخر میں امام ابوحنیفہؒ کے سامنے حکومت کی طرف سے سارے ممالک محروسہ عباسیہ کے کلی اختیارات پیش کیے گئے تھے اور ابوجعفر ان کو قاضی بنانے پر راضی ہو چکا تھا، تو کیوں نہ سمجھا جائے کہ معاملہ کو اس آخری حد تک پہنچانے کے بعد امام نے اپنے تلامذہ کو اس سے مطلع کیا کہ جس نصب العین کے لیے کوشش جاری تھی اس میں کامیاب ہونے کا وقت آ گیا۔ امام کے بلیغانہ اشارے، کہ کس کسا کر گھوڑے کو تیار کر دیا گیا ہے، لگام بھی چڑھا دی گئی ہے، راستہ صاف ہے، دنیا ساتھ دینے کے لیے تیار ہے۔ تم لوگوں کے علم کی ضرورت کا عام احساس لوگوں میں پھیل چکا ہے، صرف سوار ہو کر چل پڑنے کی ضرورت ہے، پھر اسی کے ساتھ چالیس آدمیوں میں تیس کو قضا کے عام عہدوں کے مناصب قرار دینا، اور دس شاگردوں کے متعلق یہ دعویٰ کہ قاضیوں کی تربیت و پرداخت کی صلاحیت اپنے اندر رکھتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں جس کا کھلا ہوا مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ قاضی القضاۃ کے عہدے کے قیام کے امکان کو محسوس کر کے، جن لوگوں میں اس جلیل منصب کی ذمہ داریوں سے عہدہ برانے کی قابلیت پائی جاتی تھی ان کو بھی امام صاحب نے متعین کر کے بتا دیا۔ گویا ''فقہ اسلامی'' کا شاندار مستقبل بعد کو تاریخ کے سامنے جو آیا امام صاحب نے بھانپ لیا کہ اس کے لیے زمین تیار ہو چکی ہے۔

خود ہی سوچنا چاہیے کہ ان خیالات کے اظہار کا موقع اس وقت کے سوا اور کب مل سکتا تھا؟ جب امام میں اور حکومت میں اسی قاضی القضاۃ کے اس عہدے کے متعلق جو گفتگو ہو رہی تھی اس گفتگو کے بعد امام صاحب کو کوفہ آنے کا اور اطراف و جوانب سے تلامذہ واصحاب کے جمع کرنے کا موقع کیسے ملا اور کس وقت ملا؟ بلاشبہ یہ ایک سوال ہے کہہ چکا ہوں کہ سلسلہ کی یہی تو وہ کڑی ہے جسے امام کے سوانح نگاروں نے دوسرے جزئی واقعات کی تفصیل کی لذتوں میں غرق ہو کر درمیان سے غائب کر دیا ہے اس کے سوا اور کوئی چارہ کار نہیں ہے کہ کچھ قرینے اور قیاس سے کام لیا جائے۔

جہاں تک میں سمجھتا ہوں ''قاضی القضاۃ'' کا یہ عہدہ جو اسلامی حکومت کی ڈیڑھ سو سال کی اس طویل مدت میں ایک نئی قطعاً نئی بات تھی، جو سامنے آئی تھی۔ حتی کہ واقعات سے اور فقہ اسلامی کی صحیح تاریخ سے جو ناواقف ہیں ان کے لیے اب تک یہ سوال معمہ بنا ہوا ہے کہ مسلمانوں میں ڈیڑھ سو سال بعد اچانک ''قاضی القضاۃ'' کے اس عہدے کا خیال کہاں سے اور کیوں آیا؟ ایک عصری مصنف جنھوں نے ''اسلامی قضا'' کے متعلق مغربی زبانوں کی کتابوں کا بھی مطالعہ کیا ہے اور اپنی کتاب ''تاریخ القضاء فی الاسلام'' میں علاوہ اسلامی تاریخوں کے ان مغربی مصنفین کے معلومات اور خیالات سے بھی کافی استفادہ کیا ہے۔ انھوں نے اس مسئلہ پر بحث کی ہے، لیکن بایں ہمہ اس سوال کو اٹھاتے ہوئے مصر کے یہی عصری مصنف رقم طراز ہیں:

''انتہائی بحث و جستجو کے بعد بھی اب تک اس سوال کا کوئی واضح جواب نہیں ملا ہے کیوں کہ خلفاء راشدین کے زمانہ میں بھی ''قاضی القضاۃ'' کا لفظ نہیں پایا جاتا اور نہ بنی اُمیہ کے عہد میں اس کا سراغ ملتا ہے۔ اور اب تک ہمارے علم میں یہ بات نہیں آئی کہ اسلام کے مرکزی شہروں کے قضاۃ کی قضیات اور قری کے قضاۃ ان دونوں زمانوں میں نیابت کرتے تھے خود دارالخلافت میں قاضی کے عہدے پر جس کا تقرر بنی اُمیہ کے زمانے میں ہوا کرتا تھا گو اس کا انتخاب خلیفہ کرتا تھا۔ لیکن دوسرے قاضیوں اور دارالخلافت کے اس قاضی میں کسی کا فرق نظر نہیں آتا یعنی دوسرے قاضیوں کے انتخاب کا اختیار کسی زمانہ میں بھی دارالخلافت کے قاضی کو نہیں دیا گیا'' (ص:۹۰۶)

پھر اس واقعہ کا تذکرہ کر کے کہ:

''اچانک بنی عباس کے زمانہ میں قاضی القضاۃ کا عہدہ نظر آتا ہے اور کتابوں میں اس کے اختیارات کی تفصیل کی جاتی ہے، بتایا جاتا ہے کہ قاضی القضاۃ ہی کو دوسرے قاضیوں کے تقرر کا بھی اور عزل و موقوف کرنے کا بھی اختیار ہوتا ہے۔ نیز

قاضی القضاۃ کے فرائض میں یہ ہے کہ ملک کے تمام قاضیوں کی نگرانی کرتا رہے ان کے حالات سے باخبر رہے، ان کے فیصلوں کی جانچ پڑتال کرتا رہے اور ان کے چال چلن، طرز وروش سے واقفیت حاصل کرتا رہے۔ لوگوں کے ساتھ کس قسم کے معاملات وہ کر رہے ہیں ان کی خبر لیتا رہے۔ ہر علاقے کے قاضیوں کے متعلق اس علاقے کی معتبر شخصیتوں سے ان کے حالات دریافت کرتا رہے''۔

یہی مصنف اس کے بعد لکھتا ہے کہ:

''یہ قطعی ہے کہ یہ جدید عہدہ سب سے پہلی دفعہ بغداد میں قائم ہوا''

مگر بغداد میں کیوں قائم ہوا؟ کس کی اندرونی کوششوں کا یہ نتیجہ تھا؟ اور اسلامی تاریخ میں سب سے پہلی دفعہ کس کے سامنے حکومت نے قاضی القضاۃ کے اس عہدے کو پیش کیا؟ کیوں پیش کیا؟ چوں کہ بے چارا مصنف باوجود کافی وسیع النظر ہونے کے ان چیزوں سے ناواقف ہے، اس لیے آخر میں جیسا کہ اس زمانہ کا عام دستور ہے کہ ہلکی سی مشابہت کے ادنیٰ ترین سے اشارے کو بھی کسی نتیجہ کے پیدا کر لینے کے لیے کافی سمجھا جاتا ہے۔ جرأتیں جب یہاں تک بڑھی ہوئی ہیں کہ آدم زاد کی شکل وصورت میں بندروں کی شکل وصورت کی جو ہلکی سی جھلک پائی جاتی ہے، صرف اسی جھلک کی روشنی میں اس شجرہ نسب کی قطعیت کا دعویٰ کر دیا گیا ہے، جو بعض لوگوں نے حال میں مرتب کر کے انسانی نسب نامے کے منہ کو حیوانی نسب نامہ کے ساتھ ملا دیا ہے۔ اور آج کی زندگی کے واقعاتی مہمات کا ایک بڑا حصہ اب اسی ''نسب نامہ'' پر مبنی کر دیا گیا ہے۔

ظاہر ہے کہ جب ایسے عظیم انقلابی عقیدے کی بنیاد معمولی صوری مشابہت پر اس زمانے میں قائم ہو سکتی ہے، تو اس بے چارے مصنف کے اس خیال پر تعجب نہ ہونا چاہیے کہ جب سوال کے حل کی کوئی صورت ان کو نظر نہیں آئی تو یہ خیال کر کے کہ کچھ نہ کچھ کہنے سے یہ بہتر ہے کچھ کہہ ہی دیا جائے۔ انھوں نے اپنا خیالی جواب پیش کیا کہ:

''ایرانیوں سے قاضی القضاۃ کا یہ نظام معلوم ہوتا ہے کہ لیا گیا''۔

منشاء اس خیال کا جیسا کہ وہی لکھتے ہیں یہ ہے کہ:

''ایرانیوں ہی میں قاضی القضاۃ ہوا کرتے تھے''۔

آپ کو تعجب ہوگا کہ قاضی القضاۃ تو عربی زبان کا لفظ ہے پھر ایرانیوں میں یہ کیسے پایا جاتا تھا؟ اس حیرت کا ازالہ مصنف صاحب کی اس تحقیق سے فرمائی، لکھتے ہیں کہ:

''شاپور ذوالاکتاف ایرانی بادشاہ کے عہد میں جب موبذ موبذان مر گیا، تو لوگوں نے شاپور کو پتہ دیا کہ اصطخر کے ضلع میں ایک شخص ہے جو اس موبذ موبذان کے عہدے کے لیے مناسب ہوگا''۔

مصنف نے جاحظہ کی مشہور کتاب ''التاج'' سے اس واقعہ کو نقل کرتے ہوئے لکھا ہے کہ جاحظ نے اسی موقع پر یعنی ''موبذ موبذان'' کے عہدے کے لیے بجائے موبذ موبذان کے لکھا ہے کہ ''قضاء القضاء'' کا لفظ مناسب ہوگا۔ پس معلوم ہوا کہ یہی ''موبذ موبذان'' ''قاضی القضاۃ'' تھا۔

خدا جانے مصنف نے جو کچھ کہنا چاہا اسے آپ نے سمجھا بھی یا نہیں؟ مطلب یہ ہے کہ جاحظ نے ''موبذ موبذان'' کے لفظ کا ایک جگہ اپنی کتاب میں چوں کہ ''قضاء القضاء'' کا ترجمہ کیا ہے بس یہی ''بنیاد'' ہے، جس پر یہ ساری عمارت کھڑی کردی گئی کہ عباسیوں نے ایرانیوں سے قاضی القضاۃ کے عہدے کو اخذ کیا تھا۔ گویا جاحظ اگر ''موبذ موبذان'' کے اس لفظ کا اتفاقاً قضاء القضاء کے لفظ سے ترجمہ نہ کرتا، بلکہ وہی ایرانی لفظ ''موبذ موبذان'' کا رہنے دیتا تو پھر تو تحقیق کا جو دروازہ ہمارے اس عصری مصنف پر اچانک وا ہوا ہے بند ہی رہتا۔

اب اس دعویٰ اور دلیل طریقہ استدلال کے متعلق میں کیا کہوں؟ واقعہ یہ ہے کہ ''موبذ'' دراصل ایرانیوں کے ''پروہت'' کو کہتے تھے۔ یہ ایک قسم کا مذہبی مقتداء ہوتا تھا، اور سارے مذہبی رسوم وعبادات وغیرہ کا وہ نگراں ہوتا تھا۔ محکمہ عدل وانصاف اولاً اس کا کوئی

تعلق ہی نہ تھا، تھوڑا بہت اگر تھا بھی تو اس کی حیثیت ثانوی کام کی تھی۔ حقیقی فرائض موبذ دں پوجا پاٹ ہوم وغیرہ کی راہ نمائی تھی۔ مگر کیا کہیے جاحظ نے چوں کہ ''قضاء القضاء'' کے لفظ سے غلط یا صحیح اس کا ترجمہ چوں کہ کر دیا ہے۔ پس حریفوں کو آگ بنا لینے کے چنگاری کے لیے چنگاری مل گئی۔ بظاہر مصنف صاحب کی شاید یہ اپنی اپج نہیں ہے بلکہ یورپ ہی کے وحیوں میں غالباً ایک وحی یہ بھی ہے۔

خیر کچھ بھی ہو اس میں سچ پوچھیے تو دوسروں سے زیادہ ہمیں اپنوں ہی سے شکایت کرنی چاہیے ''القضاء فی الاسلام'' کے مصنف کو تو چھوڑ یئے میں پوچھتا ہوں کہ اسلامی علوم کے علماء کے خاص حلقوں میں بھی اس کی کتنوں کو خبر ہے کہ قاضی ابو یوسف کے قاضی القضاۃ ہونے سے پہلے اور بہت پہلے خود امام ابوحنیفہؒ کے سامنے بھی حکومت نے اس عہدے کو پیش کیا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ خود موفق نے ایک چھوڑ دو دو طریقوں اور سندوں سے اپنی کتاب میں اس واقعہ کو نقل کیا ہے جس کی تفصیل گزر چکی، لیکن ذکر کرنے والوں نے ذکر ہی اس واقعہ کا اس طریقے سے کیا ہے کہ مشکل ہی سے اس کی اہمیت کا پڑھنے والوں کو اندازہ ہو سکتا ہے، نگاہ اس پر اسی شخص کی اٹک سکتی ہے جس نے ابتداء سے آخر تک اس راہ میں امام ابوحنیفہؒ کی جدوجہد کے ہر ہر جز اور جو قدم بھی اس راہ میں انھوں نے اٹھایا ہے، اس کا کامل احتیاط اور انہماک و توجہ سے مطالعہ کیا ہو، بلاشبہ وہ اپنے اس مطالعہ کے سلسلہ میں خود بخود ایک ایسی منزل پر پہنچ سکتا ہے جہاں پر امام صاحب اس وقت کھڑے ہوئے نظر آ رہے ہیں۔ یعنی مقامی قضا پھر چند صوبوں کی قضا کے بعد سارے ممالک محروسہ عباسیہ کی قضا و عدالت کے کلی اختیارات کا مسئلہ امام اور حکومت کے درمیان چھڑا ہوا ہے۔ حکومت امام کو قابو میں لانے کے لیے اس آخری لقمہ کے پیش کر دینے پر تیار ہو جاتی ہے۔ لیکن حکومت کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپنے قابو میں رکھنے کے لیے امام اس پیش کش کے قبول کرنے پر راضی

نہیں ہورہے ہیں۔ یہاں تک کی تو تحریریں شہادتیں کسی نہ کسی طرح کسی نہ کسی رنگ میں مل جاتی ہیں، لیکن آگے کیا ہوا؟ جیسا کہ میں نے کہا کہ امام نے جب یہ عذر پیش کیا کہ حکومت کے سامنے ہمیشہ اپنے اور اپنے حکام کے وقار کا مسئلہ پیش آتا رہتا ہے۔ اور قاضی القضاۃ کے فرائض سے صحیح طور پر وہی عہدہ برا ہوسکتا ہے، جو ہر چیز سے بے پروا ہوکر خود حکمراں اور حکمراں کے شاہی خانوادے اور دوسرے حکام اور فوجی افسروں کے مقابلہ میں فیصلہ کرنے کا اقتدار رکھتا ہو، لیکن جس بے اطمینانی کی یہ کیفیت ہو کہ دربار میں آنے کے بعد اس سے بھی وہ مطمئن نہیں رہتا کہ یہاں سے زندہ واپس ہوگا۔ یا مردہ۔ اس بے چارے کو صرف لفظی طور پر قاضی القضاۃ اگر بنا ہی دیا گیا تو واقع میں وہ قاضی القضاۃ کے فرائض تو کیا معمولی قاضی کی ذمہ داریوں کو بھی صحیح طور پر ادا نہیں کرسکتا۔

امام کے اس عذر کے جواب میں ابوجعفر نے کیا کہا؟ اس کے متعلق کوئی تصریح مجھے اب تک نہیں ملی ہے۔ لیکن قاضی شریح کے اسی عذر کے جواب میں اسی ابوجعفر نے ان کے سارے شرائط مان لیے تھے۔ میں نے عرض کیا تھا کہ کوئی وجہ نہیں ہوسکتی کہ امام ابوحنیفہؒ پر حجت پوری کرنے کے لیے وہی ابوجعفر ان ہی الفاظ کے دہرانے سے کیوں باز رہا ہوگا؟ یقیناً اس کے بعد امام صاحب کے لیے کافی دشواری پیش آگئی ہوگی۔ اس کے بعد اب حکومت کے پیش کش کو مسترد کرنے کی وجہ ہی ان کے پاس اور کیا باقی رہی تھی؟ لیکن چوں کہ یہ تو امام صاحب بہر حال طے کئے ہوئے تھے کہ حکومت کی ملازمت خواہ جس نوعیت کی بھی ہو اس کو قبول کرکے اس خطرے کو کبھی نہیں خریدوں گا، جس کے بعد اللہ کے لیے اور اللہ کے رسول کے لیے، مسلمانوں کے لیے جو خدمت انھوں نے انجام دی تھی وہی خدمت کم از کم دنیا والوں کی نگاہوں میں صرف ایک شخصی اقتدار، منصب وجاہ کے حصول کا آلہ بن کر رہ جاتی، کم از کم کہنے والوں کے لیے کہنے کی گنجائش نکل ہی آتی اور یہ تو خیر باہر کی بات تھی، امام

کے باطن کے جو جاننے والے تھے ان کے اقوال اس باب میں جو نقل کیے جاتے ہیں آج تو ان پر اعتماد کرنا ہی مشکل ہے، مثلاً امام بخاری کے مشہور استاذ اسحاق بن[1] راہویہ سے ان کے صاحبزادے علی یہ بگوش خود سنے ہوئے الفاظ نقل کرتے تھے کہ امام ابوحنیفہؒ کے اسی قصہ کا تذکرہ کرتے ہوئے یعنی قضا پر حکومت ان کو مجبور کرتی رہی وہ راضی نہ ہوئے اسحاق نے پھر اپنے ذاتی احساس کا اظہار ان الفاظ میں کیا:

کان یحتسب فی تعلیمه وإرشاده موفق: ۲، ص: ۵۸)

"یعنی اپنی تعلیم میں بھی اور مسلمان کی راہ نمائی میں بھی امام ابوحنیفہؒ کے سامنے خدا کے سوا اور کچھ نہ تھا"۔

جس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہے کہ ملازمت قبول کر لینے کی صورت میں دنیاوی آلائش کا چوں کہ خطرہ تھا اس لیے اس قسم کی آلودگیوں سے اپنے آپ کو پاک رکھنے کے لیے اسحاق بن راہویہ کی رائے تھی کہ امام ابوحنیفہؒ نے قضا کی خدمت قبول نہ کی، اسی طرح اپنی تعلیم میں یہی اخلاص کے رنگ کو باقی رکھنے کے لیے خود تو کسی قسم کا معاوضہ کیا لیتے؟ گزر چکا کہ پڑھنے والوں کی امداد فرمایا کرتے تھے۔ اور کیسی امداد؟ اور واقعہ یہ ہے کہ می وانکبن کی لاگ سے اپنے عمل کو پاک رکھنے کا دعویٰ کر لینا تو آسان ہے لیکن زندگی کی آخری سانس تک

(۱) اسلامی تاریخ میں اسلام کی تائید ونصرت کے لحاظ سے جو چند اعزازی ہستیاں پائی جاتی ہیں ان میں ایک ابن راہویہ کی بھی ہے۔ علاوہ فقیہ ہونے کے جلیل القدر محدثوں میں آپ کا شمار ہے۔ امام بخاری نے اپنی صحیح کتاب ان ہی کے اشارے سے مرتب فرمائی۔ ہزار ہا ہزار حدیثیں زبانیں یاد تھیں۔ لوگ پوچھتے کہ آپ کو کتنی حدیثیں یاد ہیں؟ فرماتے کہ عدد تو نہیں بتا سکتا لیکن جو حدیث میں نے سنی ہے سب یاد ہیں۔ بارہا ان کے حافظہ کا امتحان ہوا ایک حرف کی کمی وبیشی نہ ہوئی۔ امام ابوحنیفہؒ سے بعض اجتہادی مسائل میں اختلاف بھی رکھتے تھے، لیکن امام کی جو خوبی تھی اس کا بھی اعتراف مذکورہ الفاظ میں آپ نے کیا ہے، اس زمانہ کا عام حال یہی تھا۔ یہی ابن راہویہ ہیں امام احمد بن حنبلؒ نے یہ فرماتے ہوئے کہ گو بعض مسائل میں میرا ان سے اختلاف ہے۔ لیکن دعوی سے کہہ سکتا ہوں کہ خراسان جاتے ہوئے دجلہ کے پل سے جتنے آدمی بھی گذرے ہیں ان میں ابن راہویہ کے جوڑ کا کوئی نہ تھا۔ ۱۲ (دیکھو خطیب ترجمہ اسحاق بن ابراہیم حنظلی: ج۶)

اس التزام کے نباہ دینے میں ان ہی لوگوں کو کامیابی ہوتی ہے جو امام ابوحنیفہؒ جیسے حضرات کی طرح خصوصی طور پر توفیق یافتہ ہوں۔

اسی کے ساتھ جیسا کہ آئندہ اس واقعہ کا ذکر آگے آرہا ہے اس کو پیش نظر رکھتے ہوئے شاید ایک اور بات بھی تھی، مطلب یہ ہے کہ ہر مسئلہ میں انتہائی احتیاط کے پہلو کو اختیار کرنا امام ابوحنیفہؒ کے اجتہاد کی عام خصوصیت بتائی جاتی ہے۔ تفصیل کا موقع نہیں ہے۔ ورنہ ثبوت میں ان کے بیسیوں اجتہادی مسائل پیش کیے جاسکتے ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمیشہ وہ محتاط ترین پہلو کے اختیار کرنے کی کوشش کرتے ہیں، اور عام طور پر ان مثالوں سے اہل علم واقف بھی ہیں، عموماً ان کا تذکرہ بھی کیا جاتا ہے۔ غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ اجتہادی مسائل جو کتاب وسنت کو پیش نظر رکھ کر پیدا کیے جاتے ہیں ان میں تو احتیاط کے پہلو کو ملحوظ رکھا جاسکتا ہے، یعنی احوط ترین پہلو جو کتاب وسنت کے لحاظ سے نظر آئے اسی کو آدمی اختیار کرتا چلا جائے، لیکن حوادث وواقعات کے متعلق جب مختلف دعویٰ کرنے والے مختلف دعووں کے ساتھ آپ کے سامنے آئیں تو ان میں کس کے دعویٰ اور بیان کو واقعہ کے مطابق قرار دیا جائے، یعنی مقدمات کے فیصلہ کرنے میں جو کام آدمی کو کرنا پڑتا ہے ان میں بھی اگر چاہا جائے کہ احتیاط کے اسی اصول کو پیش نظر رکھ کر فیصلہ کیا جائے تو بادنی تامل معلوم ہوسکتا ہے کہ یہ کتنی دشوار بات ہے، نبوت کبریٰ کی روشنی سے جو فطرت منور تھی یعنی خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اس باب میں جب یہ حال تھا کہ لوگ مقدمات لے کر خدمت والا میں حاضر ہوتے، ہر فریق اپنے اپنے مدعا کے ثبوت میں باتیں کرتا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم طرفین کی باتوں کو سن کر بالآخر کوئی فیصلہ فرمادیتے، لیکن فیصلہ کے ساتھ ساتھ یہ بھی ارشاد فرماتے جس کا حاصل یہ ہوتا کہ تم میں بعض لوگ اپنے مطلب کے اظہار میں بیانی قوت سے کام لیتے ہیں، میں رائے قائم کرلیتا ہوں کہ اپنے بیان میں وہ سچا ہے اسی لیے اسی کے مطابق فیصلہ کردیتا ہوں۔ لیکن (میں بتانا چاہتا ہوں کہ) ناحق فیصلہ اگر ہوا ہے تو اس حق کے

لینے والے کو سمجھ لینا چاہیے کہ میں اسے آگ کا ٹکڑا دے رہا ہوں۔

بہر حال جہاں تک میں سمجھتا ہوں یہ احوط پسندی جو امام ابوحنیفہؒ کی کچھ فطری خصوصیت معلوم ہوتی ہے ہوسکتا ہے کہ اسی کو پیش نظر رکھتے ہوئے واقعۃً امام صاحب اپنے آپ کو فیصلہ کرنے کے قابل نہ پاتے ہوں، جو قصہ آگے آرہا ہے اس سے اس کی تصدیق بھی ہوتی ہے۔ بلخ کے مشہور حنفی امام خلف ابن ایوب(۱) جو خود ہی حد سے زیادہ محتاط تھے، امام ابوحنیفہؒ کا ذکر کرتے ہوئے کہا کرتے تھے:

"امام ابوحنیفہؒ کے خصائل وعادات میں ان کی یہ دو باتیں مجھے سب سے زیادہ پسند آئیں یعنی قضاء کی خدمت انھوں نے جو نہ قبول کی حالاں کہ اس کے لیے انھیں طرح طرح ترغیبیں بھی دی گئیں۔ اور دھمکیوں سے بھی ڈرائے گئے، مار بھی کھائی، ایک بات تو یہ دوسرا ان کا یہ خاص طریقہ کہ قرآن کی تفسیر میں انھوں نے حصہ نہیں لیا" (ج۲، ص:۶۱)

میرے نزدیک یہ بڑی پتہ کی بات ہے۔ اجتہادی مسائل کے متعلق تو ابتداء ہی سے یہ طے شدہ ہے کہ سب کے سب ظنی ہوتے ہیں، اس لیے ان کا مسئلہ اتنا دشوار نہیں ہے اور کتاب وسنت کو سامنے رکھ کر جس پہلو میں زیادہ احتیاط ہو اسکو آدمی اختیار کرسکتا ہے، لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا فصل خصومات کا تعلق تو واقعہ کی تحقیق سے ہوتا ہے دلائل و وجوہ کا انبار فریقین کی طرف سے لگا دیا جاتا ہے محتاط ترین فیصلہ کیا ہوگا؟ اس کا طے کرنا حوادث و واقعات کے متعلق آسان نہیں ہے۔ اسی طرح قرآن ظنی نتائج کی کتاب نہیں ہے بلکہ جو علم

(۱) یہ امام کے نہیں بلکہ ان کے شاگردوں ابویوسف، اسد بن فرات، عمرو الجلی وغیرہ کے شاگرد ہیں، حدیثیں بڑے بڑے لوگوں سے سنی، اور مشہور رئیس الصوفیہ ابراہیم بن ادہمؒ کی صحبت میں تربیت نفس کی منزلیں طے کیں۔ ان کی ذہین نزاکت حسی کا اندازہ اسی سے کیجئے کہ اذان ہورہی تھی، دیکھا کہ بجائے اذان کی طرف متوجہ ہونے کے ایک شخص لکھنے میں مشغول ہے گواہی میں وہی جب پیش ہوا تو اسے مردود الشہادۃ قرار دیا۔ ان ہی کا مشہور فتویٰ ہے کہ مسجد میں فقیروں کو جو بھیک دے گا اس کی شہادت مسترد کردی جائے گی۔ یعنی مسجد میں بھیک مانگنے ہی کو گناہ نہیں سمجھتے تھے بلکہ دینے کو بھی اور اتنا بڑا گناہ کہ شہادت تک ایسے آدمی کی غیر معتبر ہوجاتی ہے۔ ۱۲ (جواہر سفینہ)

بھی اس سے پیدا ہوتا ہے اس کا تعلق یقین سے ہے، حقیقت یہ ہے کہ ظنی آراء بلکہ آحاد روایتیں جو زیادہ سے زیادہ مفید ظن ہیں ان کی مدد سے قرآن کے مفہوم کو متعین کرنے کی جرأت۔ بڑی جرأت ہے، تفسیر میں صحیح حدیثیں جو بہت کم پائی جاتی ہیں۔ ایک راز اس کا یہ بھی ہے اور امام ابوحنیفہؒ کی طرف قرآنی آیات کی تفسیریں جو نہیں منسوب یا بہت کم منسوب ہیں، اس میں بھی ان بے چارے کی اسی فطری خصوصیت کو دخل تھا، اسی [1]، میں سمجھتا ہوں کہ قاضی بننے کی صلاحیت نہیں رکھتا، یہ دعویٰ جو امام کی طرف منسوب کیا ہے اس کا ایک یہ بھی ہوسکتا ہے بلکہ اس کے سوا ان کے اس دعویٰ کی دوسری توجیہ تو میرے خیال میں مشکل ہی ہے۔

بہر حال میں اپنے مطلب سے دور ہوتا چلا جا رہا ہوں غرض یہ تھی کہ حکومت کی طرف سے اگر امام ابوحنیفہؒ کو اس کا اطمینان دلایا گیا تھا کہ وہ خلیفہ اور شاہی خانوادے سرکاری حکام کے خلاف بھی حکومت کے وقار کا خیال کئے بغیر بھی فیصلہ دینے کا اختیار رکھیں گے، حکومت ان کے ان فیصلوں کو بھی اسی طرح تعمیل کرائی گئی جیسے عام فیصلوں کا نفاذ اس کا کام ہے، تو اس وقت ملازمت کے قبول نہ کرنے کا عذر ان کی طرف سے پھر کیوں پیش ہوا؟ متعین طور پر تو یہ اس کا پتہ نہیں چلتا، یہ عذر کہ میں قاضی بننے کی صلاحیت نہیں رکھتا اس میں شک نہیں کہ لوگوں نے بکثرت مختلف روایتوں میں ان کی طرف سے ان الفاظ کو منسوب کیا ہے لیکن میرا خیال ہے کہ گو امام نے آخر میں اسی عذر کو پیش کیا ہے لیکن امام جیسے آدمی سے اس کی توقع کہ ابتداء ہی میں وہ اس عذر کو لے کر کھڑے ہو گئے قرین عقل نہیں معلوم ہوگا۔ اسی ابوجعفر کے سامنے مجھ ہی سے آپ سن چکے کہ امام ابوحنیفہؒ نے امتیازات کو تفصیل سے بیان کیا تھا صبح سے شام تک سرکاری قاضیوں کے فیصلوں پر اعتراض کرتے رہتے تھے، اور یوں بھی ابوجعفر تو بڑا مردم شناس تھا، اس زمانے کے کسی عامی کو بھی امام صاحب مشکل ہی سے یہ باور کرا سکتے تھے کہ میں قاضی بننے کے لائق نہیں ہوں، جہاں تک میں سمجھتا ہوں امام صاحب نے یہ بات کہی ضرور ہے، لیکن اس وقت کہی ہے جب کوئی حیلہ اور کوئی عذر

ملازمت سے گلوخلاصی کے لیے ان کے پاس باقی نہ رہا تھا، ان کے معاذیر کے ترکش کا یہ آخری تیر تھا۔ چوں کہ یہ ایسی بات تھی جسے بظاہر امام صاحب کی زبردستی ہی سمجھی جاسکتی تھی، معلوم ہوتا ہے کہ ابوجعفر کو اسی پر غصہ آ گیا، اور اسی غصے کی حالت میں یہ سمجھ کر یہ شخص غلط بیانی سے قصداً کام لے رہا ہے، اس نے تازیانہ لگانے کا حکم دیا۔ اور معاملہ اسی پر ختم ہو گیا۔ لیکن جس مرحلہ پر اس وقت امام صاحب اور حکومت کے درمیان کی گفتگو تھی کم از کم میرا خیال یہی ہے کہ نہ اس مرحلے پر امام نے اس عذر کو پیش کیا تھا اور نہ اس سے پہلے ایک ایسے دعوے کے پیش کرنے کی ان میں جرأت پیدا ہو سکتی تھی، جسے ہر سننے والا سننے کے ساتھ غلط قرار دینے پر مجبور تھا۔ امام صاحب ایسے نادان نہیں تھے کہ نجات کی دوسری راہوں کے باقی رہتے ہوئے خواہ مخواہ ایک ایسی بات پیش کر دیتے جس کے متعلق دنیا ان ہی کو الزام دینے پر آمادہ ہو جاتی۔ جیسا کہ میں نے کہا واقعہ کے لحاظ سے امام کا یہ عذر اگرچہ غلط نہیں تھا، لیکن ہر شخص کی سمجھ میں یہ نکتہ کہاں سے آسکتا تھا کہ اتنے بڑے عالم وفقیہ ہونے کے باوجود ''فصل خصومات'' کی صلاحیت اپنے اندر نہیں رکھتے ہیں، جس کام کو ہر ادنی قانون کا جاننے والا آدمی انجام دیتا رہتا ہے لیکن وہی سوال سامنے آتا ہے کہ اس موقعہ پر آخر انھوں نے کس عذر کو پیش کیا اور اس کے بعد کیا ہوا؟ کہہ چکا ہوں کہ میرے پاس کوئی ایسا وثیقہ نہیں ہے جس کی بنیاد پر کسی قطعی جواب کو پیش کروں، تاہم میں نے پہلے بھی علی بن علی الحمیری کے حوالہ سے ایک بات نقل کی تھی، یعنی یہی کہ امام ابوحنیفہؒ پر قضا کی خدمت متعدد بار پیش کی گئی لیکن وہ عذر ہی کرتے رہے معافی ہی چاہتے رہے اسی سلسلہ میں علی نے کہا تھا کہ:

و کلم وزراء امیر المومنین و خاصته: ج ۲، ص: ۱۷۳.

''پھر خلیفہ کے وزراء اور دربار کے خاص لوگوں نے امام کے متعلق خلیفہ سے گفتگو کی''

گو یہ الگ الگ ٹکڑے ہیں اور مختلف روایتوں میں مذکور ہیں۔ مگر ان سب کو سامنے رکھتے ہوئے اگر یہ کہا جائے کہ امام کی نرم گفتگو اور مداراتی انداز کچھ وزراء اور دربار کے

امراء کی سعی وسفارش سے کم ازکم ایک دفعہ امام کوکوفہ واپس جاتے اوراپنے خاص لوگوں (یعنی شاگردوں اور اصحاب سے) مشورہ لینے کا موقع حکومت کی طرف سے دے دیا گیا اوراسی کے بعد امام کوفہ پہنچ پہنچ کر اطراف وجوانب سے اپنے شاگردوں کوجمع کر کے مذکورہ بالاتقریر کی، تو شاید عقل وقیاس کے قریب تر یہی بات ہوسکتی ہے۔ امام کی اس تقریر کو دوبارہ ذراغور سے پڑھیے الفاظ پر غور کیجیے۔ کم ازکم میرا احساس تو اس تقریر کے الفاظ پرغور کرنے کے بعد بھی ہے کہ ''قاضی القضاۃ'' کا جو عہدہ امام پر حکومت کی طرف سے پیش کیا گیا تھا اور جس قسم کے اختیارات عطا کرنے پر اس کے ضمن میں حکومت نے آمادگی کی تھی، اسی کے بعد اس قسم کی تقریر کی جاسکتی ہے۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تقریر میں جن جن باتوں کی طرف امام نے اجمالاً اشارے کئے ہیں، تقریر کے بعد ان کے متعلق تفصیلی مشورے بھی ہوئے ہوں گے؟

میرا مطلب یہ ہے کہ حکومت کی ملازمت میں نہ داخل ہونے کا جو قطعی ارادہ امام کا تھا خواہ اس کا انجام کچھ بھی ہو، اس ارادے کے اظہار کے بعد اپنے شاگردوں میں سے جو جو قاضیوں کی تربیت وپرداخت یعنی قاضی القضاۃ بننے کے لائق تھے، اگر ان کو امام صاحب نے اس پر تیار کیا ہو کہ حکومت جب اس عہدے کو منظور کر چکی ہے اور سارے عدالتی اختیارات کو اپنے اقتدار سے نکال کر اہل علم کے سپرد کرنے پر آمادہ ہوچکی ہے تو اس پر قبضہ کرنے کے لیے تم لوگوں کو تیار ہوجانا چاہیے، اسی طرح جن میں صرف قاضی بننے کی صلاحیت امام کے نزدیک تھی ان کو قاضی بننے کے لیے کھڑا ہوجانا چاہیے ان باتوں کو اگر شاگردوں کی اس مجلس میں امام صاحب نے پیش کیا ہو ہر ایک کی متعلقہ ذمہ داریاں جن کا تقریر میں اجمالاً ذکر فرمادیا گیا ہے، ان کی تفصیل کی ہو تو جو تقریر اس موقعہ پر آپ نے فرمائی ہے اس کے الفاظ دیکھتے ہوئے عقل تجویز کرتی ہے کہ اسی قسم کی کارروائیاں ضرور ہوئی ہوں گی۔ صاحبِ معجم نے امام کی اس تاریخی تقریر کو نقل کرتے ہوئے آخر میں ان الفاظ کا بھی

جو اضافہ کیا ہے یعنی امام صاحب نے آخر میں فرمایا کہ:

فإن الناسَ قد جعلونی جسرًا فالراحة لغیری و التعب علی ظهری: ص:۵٦.

"لوگوں نے (مقصد) تک پہنچنے کے لیے مجھے پل بنالیا، پس غیروں کے لیے تو صرف آرام ہی آرام ہے اور سارا بوجھ میری پیٹھ پر ہے"۔

واللہ اعلم صحیح مطلب ان الفاظ کا کیا ہے؟ لیکن واقعہ کی جو نوعیت ہے اس کو سامنے رکھتے ہوئے اس کا مطلب اگر یہ لیا جائے کہ ان عہدوں اور بڑے بڑے مناصب تک پہنچانے کے ذریعہ امام کی ذات جز بن رہی تھی، اور اوّل سے آخر تک اس ساری کش مکش کا بوجھ براہ راست امام نے اٹھایا۔ لیکن عہدوں پر قبضہ کرنے کے بعد راحت ان ہی شاگردوں کو حاصل ہوگی تو محل و مقام کی خصوصیت کے لحاظ سے میں نہیں خیال کرتا کہ ان الفاظ کا اور کوئی دوسرا مطلب لیا جاسکتا ہے؟

بظاہر خیال گزرتا ہے کہ ان ہی مشاغل میں کچھ دن امام کے بسر ہوئے ہوں گے لیکن ابوجعفر کا دل ان ہی کی طرف لگا ہوا ہوگا، وہ تو امام کو اپنی راہ کا کانٹا یقین کر چکا تھا کہ کچھ بھی ہوجائے ان کو آزاد چھوڑے رہنا کسی حیثیت سے بھی جائز نہیں ہوسکتا اسی بنیاد پر پھر بغداد ان کی طلبی کا فرمان اس نے بھیجا۔

جہاں تک میں سمجھتا ہوں کہ امام کی کوفہ سے بغداد کی طرف آخری روانگی جس کے بعد پھر کوفہ اور کوفہ والوں کے دیکھنے کی نوبت نہ آئی، اسی طلبی کے بعد ہوئی کس طرح بلائے گئے؟ کتنے دنوں کے بعد بلائے گئے؟ کیوں بلائے گئے؟ بدستور ان سارے ضروری سوالوں پر پردہ پڑا ہوا ہے، بکھری بکھری منتشر روایتوں میں کچھ اجزاء پائے جاتے ہیں ان ہی سے کچھ اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

میں نے جیسا کہ کہا امام کی مذکورہ بالا تاریخی تقریر جو شاگردوں کے گویا سب سے

بڑے مجمع میں ہوئی۔ اگرچہ اس کے صحیح وقت کا متعین کرنا ذرا دشوار ہے، لیکن بجائے خود اس تقریر کی ہم دیکھتے ہیں کہ کافی اہمیت پچھلے لوگوں میں محسوس کی گئی ہے، جس کی ایک واضح دلیل یہ ہے کہ اس مجمع میں امام کے جو ممتاز چالیس تلامذہ تھے مثلاً داؤد طائی(۱) عافیہ اودی(۲) قاسم بن(۳) حسن مسعودی، حسن، حفص بن غیاث نخعی، وکیع بن الجراح(۴) مالک(۵) بن مغول، زفر بن ہذیل وغیرہ حضرات کے تذکرے حنفی طبقات کی کتابوں میں جہاں درج کئے گئے میں عموماً سب سے پہلے ان کو روشناس کراتے ہوئے یہی لکھا جاتا ہے کہ:

(۱) داؤد طائی امام کے ان شاگردوں میں ہیں جنھوں نے پڑھنے پڑھانے کو ترک کر کے عزلت اور گوشہ نشینی کی زندگی اختیار کر لی تھی۔ بیس دینار کل وراثت میں ان کو ملے تھے۔ بیس سال کی زندگی اس بیس دینار سے داؤد نے پوری کی۔ کسی سے کبھی کچھ نہ لیا، باوجود اس کے امام ابوحنیفہ کے بڑے بڑے شاگرد مشکل مسائل ان سے جا کر پوچھتے، امام محمد فرماتے ہیں کہ ایسا کوئی مسئلہ جب پیش آتا اور میں داؤد سے جا کر پوچھتا تو وہ اندازہ کر لیتے کہ واقعی اس مسئلہ کی ضرورت مسلمانوں کو ہے تو جواب دیتے اور اگر یہ محسوس ہو جاتا کہ صرف ذہنی کرتب کا نتیجہ ہے تو مسکرا کر چپ ہو جاتے کہتے کہ بھائی مجھے کام ہے۔۱۲

(۲) ان کے حالات کا اجمالاً ذکر گزر چکا ہے۔۱۲

(۳) یہ مشہور صحابی عبداللہ بن مسعود سے نسبی تعلق رکھتے ہیں فقہ کے سوا عربیت یعنی عربی ادب کے امام مانے جاتے تھے مشہور نحو کا امام ان کے قول کے شہادت میں پیش کرتا تھا لیکن خود ان سے پوچھا گیا کہ ادبی علوم اور فقہ میں آپ کیا تعلق پاتے ہیں؟ بولے کہ خدا کی قسم امام ابوحنیفہؒ کی ایک کتاب کا مقابلہ بھی ادبی علوم کا سارا ذخیرہ نہیں کر سکتا۔ کوفہ کے قاضی تھے لیکن تنخواہ کبھی نہیں لی۔۱۲

(۴) جلیل محدثین میں ان کا شمار ہے علی بن مدینی نقد رجال کے امام کا بیان تھا کہ سفر و حضر میں وکیع کے ساتھ میں رہا ہوں وہ صائم الدہر تھے، ہر شب میں قرآن ختم کرتے تھے اور ایک تہائی قرآن پڑھے بغیر سوتے نہ تھے۔ ان کا ترجمہ بہت طویل ہے چاہا جائے تو ایک مختصری کتاب لکھی جا سکتی ہے۔۱۲

(۵) مالک بن مغول ان کے مقام کے اندازہ کرنے کے لیے یہی کافی ہے کہ بخاری اور مسلم کے راویوں میں ہیں۔ اور یہی حال حفص بن غیاث کا ہے یہ بھی بغداد کے قاضی ہوئے، خاتم القضاۃ ان کو سمجھا جاتا تھا۔ خطیب نے طویل ترجمہ ان کا نقل کیا ہے باقی زفر بن ہذیل بیسیوں جگہ اسی کتاب میں ان کا ذکر گزرا ہے یہ تو قاضی ابو یوسف کے جوڑ کے آدمی حنفی فقہ کی کتابیں ان کے ذکر سے معمور ہیں۔۱۲

''یہ امام کے ان شاگردوں میں جو اس تقریر والی مجلس میں شریک تھے جس میں ان لوگوں کو خطاب کر کے امام نے ''انتم مسار قلبی و جلاء حزنی'' فرمایا تھا یعنی وہی الفاظ جن کا ترجمہ اردو میں یہ کیا گیا تھا کہ:

''میرے دل کے لیے سرمایہ نشاط تم ہی لوگ ہو، تم ہی سے میرا غم غلط ہوتا ہے''۔

آپ طبقات وتراجم کی کتابوں میں ان بزرگوں کے حالات اٹھا کر دیکھئے۔ عموماً سب سے پہلا فقرہ ان کے تذکرے میں یہی ملے گا کہ یہ ان لوگوں میں ہے جن کے متعلق امام نے اَنْتم مسار قلبی وجلاء حزنی فرمایا تھا۔ اسی سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کوئی معمولی تقریر اور معمولی واقعہ نہ تھا۔ اس مجلس میں اسی اہمیت کی بنیاد پر خیال گزرتا ہے کہ ابوجعفر امام ابوحنیفہ سے یوں تو خیر کھٹکا ہی ہوا تھا۔ کیا تعجب ہے کہ پہنچانے والوں نے کوفہ سے اس تک یہ خبر پہنچائی ہو کہ امام نے اپنے شاگردوں کو اطراف وجوانب سے بلا بلا کر اکٹھا کیا ہے، ان کے سامنے تقریر کرتے ہیں، مشورے ہو رہے ہیں، شاید اس خبر نے ابوجعفر کو آمادہ کیا ہو کہ کوفہ سے جہاں تک ممکن ہو امام کو بلا لیا جائے۔ یوں تو امام کئی دفعہ بغداد بلائے گئے ہیں۔ لیکن جس روایت میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ کوفہ کے گورنر عیسیٰ بن موسیٰ کے پاس ابوجعفر کا فرمان بایں الفاظ آیا کہ:

إحمل أباحنيفه :ص: ۱۷۱.

''سوار کرا کے ابوحنیفہؒ کو میرے پاس فوراً روانہ کرو''۔

بعض روایتوں میں یہ بھی ہے کہ ڈاک کی سواری کا انتظام کیا گیا اور لکھا ہے کہ سوار ہونے کے بعد گورنر سے ملاقات کر کے پھر امام صاحب کو گھر جانے کا بھی موقع نہ دیا گیا بلکہ وہیں سے بغداد روانہ ہو گئے حمیری نے محمد بن عثمان کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ:

''میں طلبی کے فرمان کی خبر سن کر امام سے ملنے کے لیے گیا تو دیکھا کہ وہ سوار ہو چکے ہیں۔ اور گورنر کے پاس رخصت ہونے کے لیے جا رہے ہیں'' ص:۱۷۱۔

اسی حال میں امام روانہ ہوئے اسی روایت میں ہے کہ کل پندرہ دن بعد کوفہ امام کی وفات کی خبر آئی' جہاں تک اس سلسلہ کی ساری روایتوں کو ملا کر میں نے غور کیا ہے ان سارے اجزاء کا تعلق امام کی اسی آخری روانگی سے معلوم ہوتا ہے' البتہ بعض راویوں کے بیان میں جو یہ پایا جاتا ہے کہ اس آخری روانگی کے موقعہ پر امام ابوحنیفہ کے چہرے کو بہت اداس پایا گیا ایسا اداس کہ کانہ مسیح (امام کا چہرۂ خشک ٹاٹ کا جیسا معلوم ہوتا تھا) اور بعض کہتے ہیں کہ چہرۂ ان کا سیاہ پڑ گیا تھا لکھا ہے کہ:

کاد وجهه لیسود خوفا. (ص ۱۷۱ ج ۲ موفق)

ڈر کی وجہ سے قریب تھا کہ امام کا چہرۂ سیاہ پڑ جائے۔

یہ اسی کے قریب قریب دوسرے الفاظ جو اس سلسلہ میں نقل کئے گئے ہیں ان سے قطع نظر اس بات کے کہ امام کی طرف ایک ایسی کمزوری منسوب کی گئی ہے جو ان کی سیرت و کردار کے لحاظ سے کچھ بعید سی معلوم ہوتی ہے اور عام بشری کمزوری پر محمول کر کے ہم اس کو مان بھی لیں پھر بھی اس کی تصحیح اسی وقت ہو سکتی ہے جب یہ تسلیم کر لیا جائے کہ ابوجعفر منصور نے جو سلوک اس طلبی کے بعد آپ سے کیا اس کا علم بغداد پہنچنے سے پہلے کوفہ ہی میں آپ کو ہو چکا تھا حالانکہ اس کا ثابت کرنا آسان نہیں ہے کم از کم مجھے تو اب تک کوئی روایت اس سلسلہ میں ایسی نہیں ملی ہے جس سے تھوڑی بہت تائید بھی اس کی ہو سکتی ہو یہ سچ ہے کہ ابوجعفر کی جانب سے خطرات تو امام کو ضرور تھے' اور ان خطرات کا اندازہ کرنے کے بعد ہی انہوں نے ابراہیم کا بھی ساتھ دیا تھا فوجیوں کو بھی توڑ رہے تھے جانتے تھے کہ حسن بن قحطبہ کی اچانک علیحدگی فوج سے جب عمل میں آئے گی تو یہ واقعہ چھپا نہیں رہ سکتا کہ عساکر عباسی کے اس سب سے بڑے جنرل کے توڑنے میں کن کن لوگوں کا ہاتھ تھا اور اس کا جو کچھ انجام ہو سکتا تھا امام صاحب کی بصیرت سے زیادہ اس کا صحیح اندازہ اور کون کر سکتا تھا' لیکن یہ خطرات تو اس وقت تک تھے جب تک کہ خروج ابراہیم کے واقعہ کے بعد خلیفہ سے ان کی ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ مگر ملاقات ہو جانے کے بعد بھی خوف کی بات کوئی باقی رہی تھی بجائے سزا اور انتقام کے جب اس کی

کوشش ابو جعفر کی طرف سے پوری قوت کے ساتھ ہو رہی تھی کہ حکومت میں امام ابو حنیفہ کو کسی نہ کسی طرح شریک کر کے اپنا ہم نوا اور ہمدرد بنا لیا جائے اور اس کے لئے بڑی سے بڑی پیش کش جو ممکن ہو سکتی تھی اسے امام کے سامنے بڑھا چکا تھا' تو امام کے لئے خوف کی گنجائش ہی کیا تھی بات یہ کہ اس آخری پیش کش کے مسترد کر دینے کا اظہار جب میری طرف سے ہوگا' تو اس وقت ابو جعفر پر اس انکار کا ردعمل کن شکلوں میں ہوگا؟ ابھی ابہام کی حالت میں تھا کم از کم ایسی حالت قطعاً نہ تھی کہ بڑے سے بڑے حادثہ میں جس کی تمکنت و وقار میں کسی قسم کا کوئی تغیر نہیں محسوس کیا گیا۔ بعض واقعات و شواہد اس سلسلے میں گذر بھی چکے ہیں جن سے امام کی فطرت کا اندازہ ہوتا ہے۔ بھلا ایک غیر متعین انجام کے تصور سے ان کا اتنا زیادہ متاثر ہو جانا کہ چہرہ کالا پڑ گیا' خون خشک ہو گیا' معلوم ہوتا تھا کہ بجائے کھال کے امام کے چہرے پر کوئی ٹاٹ چڑھا ہوا ہے' میں اس کی کوئی معقول وجہ نہیں پاتا۔ علاوہ ان عقلی قرائن کے ابن سعد نے اپنے استاذ واقدی[1] کے حوالہ سے امام

---

[1] اس زمانہ میں بعض خاص نقطہ نظر رکھنے والے مصنفین نے واقدی بے چارے کو کچھ اس طرح بدنام کیا ہے کہ کسی روایت کی وقعت کھو دینے کے لئے واقدی کا نام کافی سمجھا جاتا ہے لیکن یہ ایک شدید اور خطرناک مغالطہ ہے مجھے تو اس میں بھی غیروں کی سیہ کاریوں کی جھلک نظر آتی ہے' حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں میں جہادی روح کو تر و تازہ رکھنے میں دوسری چیزوں کے ساتھ ساتھ واقدی کی کتابوں کا بھی ایک ہزار سال سے بہت بڑا حصہ ہے' ہندوستان میں بھی مسلمانوں میں نئی زندگی پیدا کرنے کا خیال بعض لوگوں میں جب پیدا ہوا تھا تو آج سے تقریباً سو سال پہلے اردو زبان میں واقدی کی کتابوں کا...... ترجمہ کر کے اسلامی گھرانوں میں پھیلا دیا گیا تھا بلکہ شاہ نامہ کے وزن پر پوری تاریخ واقدی کو ٹونک کے ایک مجاہد خاندان کے رکن نے نظم کا لباس بھی پہنا دیا تھا پچھلے دنوں واقدی کو جو بدنام کیا گیا تو اس کی کتابوں سے مسلمانوں کی دلچسپیوں کو دیکھتا ہوں کہ کم ہو گئی ہیں بہر حال واقدی در حقیقت اتنا غیر معتبر راوی نہیں ہے کہ اس کی کتابوں کی روایتوں کی وقعت دنیا کی عام تاریخی کتابوں سے کسی حیثیت سے بھی گری ہوئی ہے ائمہ نقد نے واقدی کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس کا تعلق احکام و عقائد کی حدیثوں سے ہی جن سے اسلامی قانون پیدا ہوتا ہے بہر حال مورخ ہونے کی حیثیت سے کوئی وجہ نہیں کہ دنیا کے دوسرے مورخوں کی صف میں مسلمانوں کا یہ مورخ کسی حیثیت سے بھی ناقابل اعتماد سمجھا جائے اور اس وقت بھی واقدی کی ایک تاریخی روایت ہی کو ثبوت میں پیش کر رہا ہوں۔ ۱۲

ابوحنیفہ کی اسی روانگی کے متعلق جو روایت درج کی تھی میرے نزدیک ان بیانات کی تردید واقدی کی اس چشم دید شہادت سے بھی ہوتی ہے' ابن سعد نے امام ابوحنیفہ کا تذکرہ درج کرتے ہوئے ایک روایت یہ بھی نقل کی ہے۔

قال محمد بن عمرو کنت یوم مات بالکوفة اتوقع قدومه فجاءنا نعیه.(ص ۲۵۷ ج۶ ابن سعد)	محمد بن عمر (یعنی واقدی) کا بیان ہے کہ جس دن امام ابوحنیفہ کی وفات ہوئی میں کوفہ ہی میں تھا ان کے آنے کی توقع کر رہا تھا کہ اچانک ان کی وفات کی خبر آئی۔

جس سے معلوم ہو رہا ہے کہ امام صاحب کی وفات بغداد میں جس وقت ہوئی ہے اس وقت واقدی کوفہ ہی میں تھے جیسا کہ میں نے عرض کیا کوفہ سے روانہ ہونے کے دس پندرہ دن بعد امام کی وفات ہوگئی ہے' اس لئے واقدی کے متعلق یہ سمجھنا چاہئے کہ روانگی کے وقت بھی وہ کوفہ ہی میں ہوں گے پھر آگے واقدی کا یہ بیان کہ ہم لوگ امام کی واپسی کا انتظار کر رہے تھے لیکن خبر ان کی وفات کی آئی' اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ ابو جعفر کی اس آخری طلبی کے موقعہ پر امام کے متعلق کسی قسم کے خطرے کا احساس دلوں میں نہیں پایا جاتا تھا' بلکہ برخلاف اس کے بخیر وخوبی واپسی کی توقع لوگ کر رہے تھے اور وفات کی خبر کوفہ کوفہ والوں کی توقع کے خلاف پہنچی' اضطراب و پریشانی سراسیمگی' اور گھبراہٹ کی ان ہی کیفیتوں کے ساتھ کوفہ سے امام اگر بغداد روانہ ہوئے ہوتے تو یقیناً واقدی یہ نہیں کہتے کہ ہم آنے کی توقع کر رہے تھے ایسی صورت میں تو آنا خلاف توقع ہوتا۔ اور وفات کی خبر توقع کے مطابق ہوتی' کچھ بھی ہو میرے نزدیک امام کے اضطراب و پریشانی وغیرہ کی یہ روایتیں بھی کچھ اسی طرح بے اصل معلوم ہوتی ہیں جیسے خواہ مخواہ امام کی طرف بازاروں میں گشت کرانے اور عقابین کے میدان میں پبلک کو بلا بلا کر سب کے سامنے کوڑے لگوانے وغیرہ کے واقعات منسوب کئے گئے ہیں تنقیح کے بعد جیسے یہ روایتیں بے اصل ثابت ہوئی ہیں' کچھ یہی حال اس کا بھی ہے' خدا جانے دنیا کا یہ کیا عارضہ ہے کہ ہمیشہ اس قسم کے واقعات کے بیان کرنے میں اصل واقعہ کے اظہار

سے ان کی تسلی نہیں ہوتی کچھ نہ کچھ اضافہ اپنی طرف سے بیان کرنے والے ضروری سمجھتے ہیں اور امام کے متعلق تو اس سلسلے میں لوگوں نے بہت زیادہ حاشیہ آرائیوں سے کام لیا ہے ہم سے پہلے بھی تنقید کر کر کے لوگوں نے ان اضافوں کو مسترد کردیا ہے۔[1] میرے نزدیک یہ باتیں بھی اسی قبیل کی ہیں اور آپ دیکھ رہے ہیں تھوڑی تنقید و جرح کے بعد

---

[1] اس سلسلہ میں کردری نے ایک دلچسپ بات لکھی ہے یعنی ان کا بیان ہے کہ میں جن دنوں خوارزم میں تھا تو وہاں ایک ''مجلدہ ضخیمہ'' کی صورت میں ایک کتاب ''سیر الصالحین'' مجھے ملی اس میں امام ابوحنیفہ کی وفات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا تھا کہ ابوجعفر نے ان کو زہر پلوایا' لیکن اس کو خیال گذرا کہ زہر معدے سے جلدی سارے جسم میں نہیں پھیلے گا اس لئے ستون میں باندھ کر اس نے حکم دیا کہ کوڑے سے امام کو پیٹا جائے تا کہ خون میں مل کر زہر سارے جسم میں کوڑے کی مار سے جلد پھیل جائے پس یہی کیا گیا امام صاحب پر زہر کا اثر فوراً مرتب ہوا اور مر گئے اور یہی نہیں اسی ''مجلدہ ضخیمہ'' میں کردری کہتے ہیں کہ واقعہ بھی میں نے پڑھا کہ امام صاحب مر گئے اور عوام الناس کی شورش کا ابوجعفر کو خطرہ محسوس ہوا تو وزیر کو بلا کر اس نے مشورہ لیا' رائے وزیر نے یہ دی کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ بدعتی عقائد رکھنے والا آدمی قبر میں کالے کتے کی صورت اختیار کر لیتا ہے پس مناسب ہے کہ امام کی لاش قبر سے نکال لی جائے اور مار کر ان کی جگہ ایک کالے کتے کو گاڑ دیا جائے ابوجعفر کو یہ رائے پسند آئی حکم دیا گیا کہ امام کی قبر کھودی جائے اور کالا کتا ان کی جگہ رکھ دیا جائے لیکن امام ابوحنیفہ نے مرنے سے پہلے اپنے لوگوں کو وصیت کی تھی کہ پہلی رات میری لاش کو اس قبر میں نہ رہنے دینا جس میں گاڑا جاؤں' وصیت کی تعمیل کرتے ہوئے منصور کے آدمیوں سے پہلے امام کی لاش کو نکال کر لوگ لے جا چکے تھے۔ اب منصور کے آدمیوں نے امام کی قبر جو کھولی تو لاش غائب تھی' لوگوں کو حیرت ہوئی لیکن پھر بھی کہا گیا کہ کالا کتا جو مار کر لایا گیا اسے امام کی جگہ دفن کردیا جائے۔ صبح کو خبر پھیلائی گئی کہ قبر میں امام کی لاش نے کالے کتے کی شکل اختیار کر لی ہے لوگ جمع کئے گئے اور قبر کھولی گئی' لیکن ٹھیک جس وقت یہ عمل ہو رہا تھا امام کے لوگوں نے آ کر خبر دی کہ امام کی لاش تو گھر میں ہے قبر سے تو ہم لوگوں نے اس کو نکال لیا تھا تب لوگوں کو محسوس ہوا کہ یہ حکومت کی کارستانی تھی' ابوجعفر دل میں بہت ذلیل ہوا کردری نے اس قصے کو نقل کر کے لکھا ہے کہ اس کتاب میں اور بھی اس قسم کی بہت سی باتیں بڑھا چڑھا کر بیان کی گئی ہیں جو امام کی عام سوانح عمریوں میں نہیں پائی جاتیں آخر میں اس قسم کے واقعات کی تغلیط کرتے ہوئے کردری نے اپنی رائے یہ ظاہر کی ہے کہ اس قسم کی بعید از فہم و عقل روایتوں پر اعتماد نہ کرنا چاہیے دیکھو مناقب کردری ص ۲۵ ج ۲۔

ان کی قلعی کتنی آسانی کے ساتھ کھل جاتی ہے۔

بہر حال امام کوفہ سے روانہ ہوئے اور جہاں تک عقلی و نقلی شہادتوں کا اقتضا ہے اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان کی روانگی اس حال میں ہوئی کہ جو واقعات ان کے ساتھ بغداد میں پیش آئے امام کو ان کی توقع نہ تھی باقی یہ مسئلہ کہ اس دفعہ امام صاحب جو جارہے تھے تو خود کیا سوچتے ہوئے جارہے تھے۔ یعنی یہ تو قطعی طے شدہ مسئلہ تھا کہ خواہ جتنے وسیع اختیارات کے ساتھ قضا کے عہدے کو حکومت پیش کرے گی اس کو میں قبول نہیں کروں گا، لیکن بجائے اپنے کیا ان شاگردوں کے نام کو پیش کرنا چاہتے تھے جن میں مذکورہ بالا مجلسی تقریر میں مختلف صلاحیتوں کی انہوں نے نشان دہی کی تھی یا کہئے تو کہہ سکتے ہیں کہ امام کی وفات کے بعد واقعات جس رنگ میں پیش آئے یعنی ان کے شاگرد قاضی ابو یوسف عباسی حکومت کے پہلے قاضی القضاۃ مقرر ہوئے اور تھوڑے ہی دنوں میں ممالک محروسہ عباسیہ کی ساری عدالتوں میں عموماً امام ہی کے مکتب خیال کے فقہاء جو داخل ہو گئے کیا بطور مشورے کے حکومت کے سامنے اسی کو وہ پیش کرنا چاہتے تھے؟ ایسی کوئی روایت مجھے اب تک نہیں ملی ہے، جس کی روشنی میں اس کا کچھ جواب دیا جا سکتا ہو۔

اور سچ تو یہ ہے کہ ایسی کوئی تجویز حکومت کے سامنے امام صاحب رکھتے بھی تو پذیرائی کی توقع ہی کیا ہو سکتی تھی؟ کیونکہ اصلی مسئلہ قضا اور عدالت کی تنظیم جدید کا کیا کب تھا یہ تو ایک دام تھا جس میں ابوجعفر اس شخص کو پھنسانا چاہتا تھا جسے ایک لحہ کے لئے آزاد چھوڑے رکھنا اپنی حکومت کے لئے عظیم خطرہ خیال کئے ہوئے تھا۔ شاگردوں کے تقرر سے اس کا یہ مطلب کب پورا ہو سکتا تھا اور میں تو سمجھتا ہوں کہ اپنی طرف سے اس تجویز کے پیش کرنے میں امام صاحب نے اگر یہ محسوس کیا ہو کہ حالات نے جن چیزوں کے امکانات کو قریب تر کر دیا ہے کہیں وہ دور نہ جائیں تو ان کی دوراندیش عقل سے یہ بعید نہیں ہے، خیر ان امور کو تو جانے دیجئے جن کی نفی و اثبات کی کوئی شہادت ہی ہمارے سامنے نہیں ہے۔ اب ان واقعات کو سنیے جو بغداد پہنچنے کے بعد اس دفعہ امام صاحب کے سامنے پیش آئے۔

یہاں بھی مجھے یہی کہنا پڑتا ہے کہ روایتوں میں باتیں بکھری ہوئی ہیں اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں ہے کہ قرائن وقیاس کی امداد سے ان میں ترتیب پیدا کی جائے ان روایتوں کو سامنے رکھنے کے بعد جو ترتیب مجھے نظر آتی ہے وہ یہ ہے۔

مطلب یہ ہے کہ بغداد پہنچنے کے بعد امام صاحب کی خلیفہ کے دربار میں باریابی ہوئی قضا کی جس خدمت پر حکومت تمہارا تقرر کرنا چاہتی ہے' آخر تم نے اس کے متعلق کیا فیصلہ کیا؟ ابوجعفر کی طرف سے جیسا کہ چاہیے تھا پھر یہی دریافت کیا گیا۔ یہ سوال ظاہر ہے کہ ایک دفعہ نہیں متعدد بار امام صاحب کے سامنے پیش کیا گیا۔ لوگوں نے یہ بیان کرتے ہوئے احتال بکل حیلہ (جواب میں امام مختلف حیلوں سے کام لیتے رہے) یا یہ کہتے ہوئے کہ اعتل علیه بعلل ولم یقبل (مختلف اسباب انکار کے پیش کرتے رہے) اور قبول نہیں کیا گیا پھر امام کے مختلف جوابوں کو مختلف راویوں نے نقل کیا ہے' اپنے اپنے موقعہ پر جہاں تک میری سمجھ میں آیا ہے ان جوابوں میں ترتیب پیدا کر کے میں درج کر چکا ہوں' ان ہی جوابوں کے سلسلہ میں لوگ یہ بھی نقل کر کے گذر جاتے ہیں کہ امام صاحب نے ایک دفعہ یہ بھی کہا تھا کہ انی لا اصلح (میں قاضی بننے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتا) جس طریقہ سے سرسری طور پر اس جواب کا لوگ ذکر کرتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کوئی معمولی بات تھی جسے امام نے دوسرے جوابوں کے ساتھ کبھی یہ بھی کہہ دیا تھا۔ لیکن بادنیٰ تامل واضح ہوسکتا ہے کہ جس جواب کو غیر اہم بنا کر بیان کرنے والوں نے درج کیا ہے' واقعہ میں یہ اتنا غیر اہم جواب نہ تھا۔ سوچنے کی بات ہے کہ یہ کون کہہ رہا ہے اسلامی قانون کا امام اعظم کہہ رہا ہے اور کہہ کیا رہا ہے پوری ذمہ داری کے ساتھ خلیفہ وقت کے آگے گویا دعویٰ کی شکل میں ایک واقعہ کا اظہار کر رہا ہے۔ ابوالحسن مرغینانی کی تحریری یادداشت سے موفق نے اسی قصے کو جہاں نقل کیا ہے اس میں تو یہاں تک تصریح موجود ہے کہ دربار سے باہر آنے کے بعد علی حمیری سے جو امام صاحب کے ساتھ کوفہ سے بغداد آیا تھا' خود امام نے بیان کیا کہ:

اعلمته انی لا اصلح. میں نے ابو جعفر کو مطلع کیا کہ قضا کی مجھ میں صلاحیت نہیں ہے۔ (ص ۲۱۵ ج ۱ موفق)

نیز دوسری روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں میں سوال و جواب کا ردو بدل ہوتا رہا امام صاحب کہتے کہ لا اصلح اور ابو جعفر کہتا بل انت تصلح (بلکہ تم ضرور صلاحیت رکھتے ہو)۔

حقیقت یہ ہے کہ سوال و جواب کے اس سلسلہ میں امام نے اس سے پہلے جتنی باتیں کہی تھیں وہ ایسی تھیں کہ بہ ظاہر ابو جعفر کا سننے کے بعد جو حال بھی رہتا ہو لیکن اندر سے اس کا ضمیر ان کمزوریوں کے اعتراف کو شعوری یا غیر شعوری طور پر ضرور پاتا ہوگا جن کی طرف امام اشارہ کرتے تھے لیکن امام کی طرف اس دفعہ جواب جو دیا گیا تھا۔ ابو جعفر ہی کیا میں تو کہتا ہوں کہ اس کی جگہ کوئی دوسرا آدمی ہوتا ہم ہوتے آپ ہوتے کوئی ہوتا اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر انصاف کرنا چاہیے کہ اس کے جواب کا ردعمل آدمی کے ضمیر پر کیا ہوسکتا ہے؟

اپنے علم و فضل اور اپنی قانونی و فقہی مہارت کے متعلق جن معلومات کو بلا واسطہ یا بالواسطہ ابو جعفر تک خود مسلسل امام صاحب پہنچاتے رہے تھے ان معلومات سے قوت حاصل کرتے ہوئے ابو جعفر کے ضمیر نے زندہ ہو کر شاہی اختیارات کے استعمال کے جواز کی سند اس کے ہاتھ میں اس جواب کے بعد اگر دے دی ہو تو اس پر قطعاً متعجب نہ ہونا چاہیے اور بات اسی حد تک ختم ہو جاتی تو شاید معاملہ آگے نہ بڑھتا لیکن ہوا یہ کہ اپنے قطعی غیر مشکوک معلومات اور ذاتی تجربات پر اعتماد کرتے ہوئے امام کے اس جواب کو سن کر ابو جعفر نے صاف لفظوں میں امام کی طرف غلط بیانی کو منسوب کرتے ہوئے کہا:

کذبت انت تصلح. تم جھوٹ بولتے ہو قطعاً تم قضا کی صلاحیت رکھتے ہو۔ (ص ۱۷۰ ج ۲)

لیکن امام صاحب خاموش نہیں ہوئے بلکہ انتہائی بے پروائی کے ساتھ اس مشہور الزامی جواب کا اعادہ ابو جعفر کے سامنے آپ نے کیا جسے عموماً امام صاحب کی ذہانت

کے ذکر کے سلسلے میں لوگ بیان کرتے ہیں، یعنی جوں ہی کہ ابو جعفر کے منہ سے نکلا کہ:

''تم جھوٹ بولتے ہو قطعاً قضا کی لیاقت رکھتے ہو۔''

امام نے فرمایا:

''لیجئے آپ نے اپنے خلاف خود فیصلہ کر دیا' آپ کے لئے کیا یہ جائز ہے کہ اس شخص کو قاضی بنائے جو جھوٹا اور کذاب ہے۔''

بعض روایات کے الفاظ کا ترجمہ تو یہی ہے بعضوں کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ امام نے فرمایا:

''آپ جب جانتے ہیں کہ میں قضا کی لیاقت رکھتا ہوں' باوجود اس کے مجھ سے سن رہے ہیں کہ میں اس کی لیاقت نہیں رکھتا جس کے معنی یہی ہوئے کہ میں آپ کے سامنے جھوٹ بول رہا ہوں ایسی صورت میں اس عہدے پر میرا تقرر جائز کیسے ہوسکتا ہے۔ (ص ۱۸۱ ج ۲ موفق)

الفاظ کچھ ہوں' یہ ہوں یا وہ ہوں مآل دونوں کا واحد ہے۔

حضرت امام کو عہدہ قاضی القضا پر مامور کرنے کے لیے ابو جعفر کی قسم

ابو جعفر امام صاحب کے ابتدائی جواب سے پھر چکا تھا' اس جواب الجواب نے جس میں ایک طرح سے ذہنی شکست کی رسوائی بھی شریک تھی اسے حد سے زیادہ مشتعل کر دیا۔ امام کے پہلے جواب ہی کے بعد عرض کر چکا ہوں کہ شاہی اختیارات کے استعمال کی سند جواز بغیر کسی دغدغہ کے اس کا ضمیر دے چکا تھا جواب الجواب نے جب اس کے اشتعال کو حد سے زیادہ متجاوز کر دیا تو اب وہ قسم کھا بیٹھا بشیر بن الولید الکندی کے حوالے سے خطیب نے جو روایت تاریخ بغداد میں نقل کی ہے اس میں ہے کہ:

تحلف المنصور لیفعلن. قسم کھا بیٹھا منصور کہ تم کو قضا کا کام کرنا ہی پڑے گا

عہدۂ قاضی القضاۃ کے قبول نہ کرنے پر حضرت امام کی قسم

ادھر منصور عباسیوں کا مطلق العنان فرماں روا قسم کھا رہا تھا اور اسی کے مقابلہ میں دیکھا جا رہا ہے کہ اسی آزادی کے ساتھ امام ابو حنیفہ بھی اس کی قسم کے سننے کے ساتھ ہی فرماتے ہیں کہ قسم خدا کی میں ہرگز نہیں کروں گا۔''

ابو جعفر منصور کی طرف یہ جو منسوب کیا گیا ہے کہ امام صاحب کو اس نے تازیانے کی سزا دی، میں عرض کر چکا ہوں کہ سزا کے اس قصے میں راویوں کی رنگ آمیزیوں کا بہت بڑا حصہ شریک ہے لیکن اصل واقعہ کا بھی انکار نہیں کیا جا سکتا میرا خیال ہے کہ اسی سوال و جواب کے قصے میں بتدریج ابو جعفر کا قصہ بڑھتا رہا اور معلومات کی بنیاد پر قطعاً امام کو غلطی پر اور اپنے آپ کو حق پر وہ پا رہا تھا پھر اس الزامی جواب سے قدرتاً کھسیا سا جانے کی کیفیت جو اس میں پیدا ہوئی اور معاً اس کی قسم کے ساتھ امام صاحب نے بھی قسم جو کھالی تو ابو جعفر کے حاجب ربیع سے امام کی اس جسارت پر نہیں رہا گیا اور کہنے لگا کہ:

''تم کیا کر رہے ہو، امیر المومنین کی قسم کے مقابلہ میں قسم کھا رہے ہو۔''

اس پر بھی امام صاحب نے اس حاضر دماغی کے ساتھ ربیع کو جھڑکتے ہوئے کہا کہ:

''امیر المومنین اپنی قسم کے کفارہ کے ادا کرنے میں مجھ سے زیادہ قادر ہیں۔''

یعنی قسم کو تو ہم دونوں نے کھائی ہے پھر اپنی قسم میں کیوں توڑوں، ابو جعفر ہی کیوں نہ توڑیں، وہ تو امیر آدمی ہیں ہر مشکل کے کفارے پر قادر ہیں ایسی صورت میں کوئی تعجب نہیں کہ غصے سے اندھے ہو کر عواقب اور نتائج کا اندازہ کئے بغیر ابو جعفر کے منہ سے تازیانہ برداروں کو حکم امام صاحب کے مارنے کا دے دیا گیا ہو۔

جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ تازیانہ زنی کے سلسلے میں روایتوں کا ایک انبار جمع ہو گیا ہے لیکن بتا چکا ہوں کہ عقلاً و نقلاً بہت زیادہ اجزاء ان روایتوں کے ناقابل اعتبار ہیں اس سلسلہ میں سب سے سنجیدہ ترین روایت کم از کم میرے نزدیک وہی ہے

جسے پہلے بھی ترجیح دے چکا ہوں یعنی عبدالعزیز بن عصام کی چشم دید شہادت جس میں اس شخص نے پوچھنے پر کہا تھا کہ مار کھاتے ہوئے امام ابوحنیفہ کو ہم جیسے عوام کیسے دیکھ سکتے تھے کہ واقعہ ابوجعفر کی نشست گاہ خاص میں پیش آیا وہاں ہماری گذری کہاں تھی البتہ وہاں سے نکلنے کے بعد دارالخلافت کے احاطہ رواں میں میں نے امام صاحب کو دیکھا تھا کہ پشت مبارک ننگی تھی بدن میں صرف پاجامہ تھا ایڑیوں پر خون بہہ رہا تھا۔ بہرحال ان روایتوں کی تنقید کی بحث گذر چکی ہے۔

تازیانے کی سزا کے متعلق صحیح روایات

اس وقت مجھے صرف یہ کہنا ہے کہ صحیح تر روایت عبدالعزیز ہی کی معلوم ہوتی ہے گو خود اس شخص نے بھی دیکھا نہیں تھا لیکن معتبر لوگوں سے غالباً سنا ہوگا کیونکہ وہیں وہ موجود تھا اس نے کوڑوں کی تعداد تیس بتائی ہے بلکہ اس عدد کو بتاتے ہوئے اس نے فوری طور پر غصہ سے مغلوب ہو جانے کی وجہ خلیفہ کے متعلق بھی بیان کی ہے کہ:

جب امام صاحب نے ابوجعفر کو الٹ کر ملزم بنا دیا کہ میری طرف جھوٹ کو منسوب کر کے تم نے فیصلہ کر دیا کہ میں قاضی بننے کے لائق نہیں ہوں۔

اس پر ابوجعفر جھلا گیا اور بولا۔

ان زایغیر الکلام بانی کذا. — یہ شخص بات کو بدلتا ہے اور کہتا ہے کہ میں ہی نے یہ فیصلہ کر دیا یا میں ہی ملزم ہوں۔

عبدالعزیز نے اس کے بعد بیان کیا ہے کہ:

لثمة ودعا لدبالسیاط فضربه ثلاثین. (موطا ص ۱۸۱) — ابوجعفر امام صاحب کو بڑا بھلا کہنے لگا اور کوڑا منگا کر تیس کوڑے لگائے۔

بلکہ عبدالعزیز کے الفاظ کو بلاوجہ مجاز پر اگر محمول نہ کیا جائے۔ تو اس کے الفاظ کے حقیقی معنی سے تو یہ ثابت ہوتا ہے' کہ ابوجعفر نے تازیانہ پردازوں سے امام کو نہیں پٹوایا۔ بلکہ غصہ میں خود ہی چند کوڑے لگائے۔ اگرچہ امام جیسی معظم ومحترم ہستی کے ساتھ اور وہ

بھی عمر کے ایسے حصے میں جب وہ ستر سال میں قدم رکھ چکے تھے۔ بڑی بے رحمی کا کام یہ کیا گیا اس لحاظ سے ابو جعفر کو جو کچھ بھی کہا جائے۔ لیکن میرے نزدیک اس تازیانے کے قصے کی اصل حقیقت اس سے زیادہ نہیں ہے شاید لوگوں نے ابن ہبیرہ کے واقعات پر ابو جعفر کے واقعات کو قیاس کر لیا حالانکہ اس وقت امام کی حیثیت زیادہ تر کوفہ کے ایک کامیاب دولت مند تاجر سے زیادہ نہ تھی۔ لیکن ابو جعفر کے زمانے میں تو یہ واقعہ ہے کہ وہ عراق کے امام مشرق کے فقیہ تھے جیسا کہ اسی روایت میں ابو جعفر کے چچا عبدالصمد نے ابو جعفر کی اس حرکت کی خبر پانے کے ساتھ ہی اس کو ان ہی الفاظ سے دھمکایا بھی جس کا مختلف حیثیتوں سے ذکر گذر چکا ہے۔ اور یہاں اب اس کے اعادے کی ضرورت نہیں۔

کچھ بھی ہو یہ واقعہ تو گذر گیا۔ اور جس طرح بھی گذرا ہو۔ اسے خدا کے علم کے حوالہ کیجئے۔ لیکن یہاں دو سوالات اب باقی رہ جاتے ہیں کہ نوبت جب تازیانہ زنی کے اس واقعہ تک پہنچی تو اس کے بعد پھر کیا ہوا؟ اور اس سے بھی اہم سوال وہی ہے کہ امام صاحب کے اس قول کا کیا مطلب تھا کہ میں قاضی بننے کے لائق نہیں ہوں یقیناً ان جیسے دانش مند آدمی سے غالباً یہ بات پوشیدہ بھی نہ ہوگی کہ ان کے اس جواب کو ابو جعفر کیا کوئی دوسرا آدمی بھی مشکل ہی سے صحیح تسلیم کر سکتا ہے۔

ان ہی منتشر پراگندہ روایتوں سے جو باتیں ان دو سوالوں کے جواب میں میری سمجھ میں آئی ہیں انہیں اب پیش کرتا ہوں۔

صرف تازیانہ کے اس واقعہ کے بعد اتنا تو پہلے ہی معلوم ہو چکا ہے۔ کہ ابو جعفر کے سامنے سے جب دار الخلافہ کے احاطہ میں امام صاحب لائے گئے تو ابو جعفر کے چچا عبدالصمد نے ابو جعفر کو لعنت ملامت کرنے کے بعد امام صاحب کو کپڑے پہنا کر گھر پہنچا دیا۔ یہ بھی گذر چکا کہ عبدالصمد کے متنبہ کرنے کے بعد ابو جعفر کو بھی اپنی فاش سیاسی غلطی کا احساس ہوا اور باوجودیکہ بے چارا ایک ایک دانق کی نگرانی کرتا تھا۔ پھر بھی واقعہ کی اہمیت کا اندازہ کر کے کہ فی تازیانہ ایک ہزار درہم بطور زر فدیہ ادا کرنے کے لئے وہ تیار ہو گیا۔ عبدالعزیز ہی کی روایت میں یہ جز بھی پایا جاتا ہے آگے بیان کیا ہے کہ ابو

جعفر کے حکم سے حساب کر کے تیس ہزار درم کے توڑے امام صاحب کے پاس پیش کیے گئے لیکن ظاہر تھا کہ امام صاحب اس کا کیا جواب دیتے۔ شاید اس معاملہ پر یہ نفسیاتی ترکیب اس کی سمجھ میں آئی کہ اس کی تازیانہ کی اس حرکت کے جو اثرات عام مسلمانوں پر پڑ سکتے ہیں ان کے ازالہ کی یہی شکل ہو سکتی ہے کہ روپیہ کے ذریعہ سے اس کو دھو دیا جائے۔ اور کوئی شبہ نہیں کہ امام صاحب بھی خدانخواستہ اگر دوانیقی الفطرت آدمی ہوتے اور اس زرِ فدیہ کو قبول کر لیتے تو اس کے نصب العین کی تکمیل میں ضرب تازیانہ کے اس واقعہ سے جو قدرتی امداد حاصل ہوئی' وہ قطعاً حاصل نہ ہوتی بلکہ ساری مصیبت انہوں نے اس راہ میں جو اٹھائی تھی سب رائیگاں ہو کر رہ جاتی۔[1]

جہاں تک میرا اندازہ ہے روایتوں میں امام صاحب کی نظر بندی کا اور اس بات کا کہ لوگوں سے ان کے متعلق ان امور کا جو تذکرہ کیا گیا ہے وہ اسی کے بعد کا واقعہ ہے۔

---

[1] اس سلسلہ میں خود میرا قریب قریب ایک چشم دید واقعہ ہے چند سال ہوئے بہار کے ایک شہر میں ہندوؤں اور مسلمانوں میں لڑائی ہوئی ہندوؤں کے ہاتھ سے اتفاقاً اس شہر کے مسلمان سیشن جج کے صاحبزادے پٹ گئے' مقدمہ جب حکومت میں دائر ہوا تو اس واقعہ نے ہندوؤں کی پوزیشن کو بہت کمزور کر دیا تھا۔ لیکن اس وقت ان کی سمجھ میں یہی دوانیقی علاج آیا۔ جج صاحب کی خدمت میں لوگ حاضر ہوئے اور عذر و معذرت عدم علم وغیرہ کے بہانے پیش کر کے ان کا عندیہ جو لیا گیا تو معلوم ہوا کہ ولایت جانے کا خرچ اگر ان کے مضروب لڑکے کے لیے ہندو جمع کر دیں تو وہ اپنے لڑکے کے دعویٰ کو درمیان سے اٹھا لیں گے روپیہ جس کی کافی تعداد تھی سنا گیا کہ جج صاحب کی خدمت میں لا کر جمع کر دیا گیا اور اسی روپے سے ان کے مضروب صاحبزادے نے ولایت میں تعلیم حاصل کی لیکن اس کا اثر یہ دیکھا گیا کہ جج صاحب اور جج صاحب کے لڑکے کے ساتھ مسلمانوں کی جو عام ہمدردیاں تھیں اور ان ہی ہمدردیوں نے اس واقعہ میں بہت زیادہ اہمیت پیدا کر دی تھی وہ ساری اہمیت دھل دھلا کر صاف ہو گئی بلکہ عام مسلمانوں کے قلوب میں اس مسلمان جج کی جانب سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نفرت و حقارت کے جذبات پیدا ہو گئے' اسی کا نام میں نے دوانیقی نفسیاتی ترکیب رکھ چھوڑا ہے۔ ۱۲

سزا کے بعد مفتی کی خدمت کی پیش کش اور

حضرت امام کا انکار

احمد بن بدمال والی روایت میں جو یہ بیان کیا گیا ہے کہ تازیانے کی اس سزا کے بعد امام صاحب کے متعلق ابو جعفر نے یہ حکم دیا کہ:

''اچھا تو تم کو حکم دیا جاتا ہے کہ قضا نہ سہی الباب یعنی دارالخلافت کے دروازے پر جا کر قیام کرو اور جس قسم کے احکام تمہارے پاس بھیجے جائیں ان کے متعلق فتویٰ دیا کرو۔''

اسی رعایت میں یہ بھی ہے کہ:

واخذ منه الکفلاء. (ص ۱۷۳) امام صاحب سے ابو جعفر نے کفیل لئے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دربار میں جن لوگوں کو امام ابو حنیفہ سے ہمدردی تھی مثلاً عبدالصمد عباسی ابو جعفر کے چچا یا دوسرے وزراء و امراء جن کے متعلق گذر چکا کہ ابو جعفر سے ابو حنیفہ کے متعلق سفارش کیا کرتے تھے ان کو بلا کر ابو جعفر نے حکم دیا کہ میں دارالخلافت کے باب (دروازے) پر قیام کا ان کو حکم دیتا ہوں' اور اس بات کی ضمانت کہ یہاں سے یہ غائب نہ ہونے پائیں تم لوگوں کو ضمانت دینی پڑے گی' ضمانت غالباً دے دی گئی' لیکن بیان کیا جاتا ہے کہ جب دروازے پر لا کر امام صاحب کو بٹھایا گیا۔ اور ابو جعفر نے بعض مسائل امام صاحب کے پاس بھیجے تو انہوں نے فتویٰ دینے سے انکار کر دیا جس پر بات پھر بڑھی۔

جیل کی سزا

لکھا ہے کہ تب ابو جعفر نے امام کو جیل بھیج دینے کا حکم دیا اور یہ کہ ان پر سختی کی جائے اصل الفاظ یہ ہیں۔

وغلظ وضیق علیه تضیقاً شدیداً. (ص ۱۷۳)	ان پر سختی کی جائے اور خوب تنگ کیا جائے۔

واللہ اعلم اس سختی اور تنگی کی عملی شکلیں کیا کیا تھیں بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ کھانے پینے میں تکلیف پہنچائی گئی۔ داؤد بن راشد واسطی کے حوالہ سے موفق نے جو روایت درج کی ہے یہ بیان کرتے ہوئے کہ میں بھی اس زمانہ میں بغداد میں موجود تھا داؤد کہتے تھے کہ:

ضیقوا الامر فی الطعام والشراب والحبس. (ص ۱۷۴ ج ۲ موفق)	کھانے پینے میں امام پر تنگی کی گئی اور قید و بند میں بھی سختی اختیار کی گئی۔

نظر بندی

لیکن معلوم ہوتا ہے کہ چند دن سے زیادہ امام کو جیل میں نہ رہنا پڑا کیونکہ لکھا ہے۔

کلّم وزراء امیر المومنین وخاصته بان یخرجه من السجن فی منزل. (ص ۱۷۳)	امیر المومنین کے وزراء اور خاص لوگوں نے ابو جعفر سے امام کے مسئلہ میں گفتگو کر کے اس پر راضی کیا کہ قید خانے سے ان کو نکال لیا جائے اور کسی خاص مکان میں رکھا جائے۔

مطلب وہی تھا کہ ایک طرف امام صاحب قضا کی خدمت کو قبول کر کے جیسے کسی طرح اپنی عمر بھر کی محنت کے رائگاں اور برباد کرنے پر آمادہ نہ تھے اسی طرح ابو جعفر بھی اپنی حکومت کی راہ کے سب سے بڑے کانٹے کو آزاد چھوڑ کر رکھنا نہیں چاہتا تھا' سعی و سفارش کا صرف اتنا اثر اس نے لیا کہ بجائے جیل کے کسی مکان میں نظر بند کرنے کا حکم دیا اسی کے بعد لکھا ہے کہ:

"اس مکان میں منتقلی کا حکم دیتے ہوئے ابو جعفر نے بھی اس کا حکم دیا کہ نہ تو

امام کے پاس فتویٰ وغیرہ پوچھنے کے لئے لوگوں کو آنے دیا جائے اور نہ کسی
کو ان کے پاس بیٹھنے کی اجازت ہوگی اور یہ کہ اس مکان سے وہ باہر بھی
نہیں نکل سکتے ہیں۔" (ص ۱۷۴ ج ۲)

گویا دنیا کو امام سے اور امام کو دنیا سے حکومت نے جدا کر دیا بعض روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس عرصے میں ابوجعفر امام کے پاس وقفہ وقفہ سے اپنے اس پیغام کو لے کر بھیجا بھی کرتا تھا کہ:

ان اجبت لاخر جتک من الحبس ولاکرمک. (ص ۱۸۲)	اگر میری بات تم اب بھی مان لو تو قید سے آزاد کر کے تمہیں سرفرازی بخشی جائے گی۔

رصافہ کی خدمت قضا کی قبولیت

یہ روایت عبدالرحمٰن بن مالک کی ہے اسی کے بعد ہے کہ امام بہرحال شدت کے ساتھ انکار ہی پر اصرار کرتے رہے عام طور پر لوگوں کا بیان ہے کہ اسی حال میں امام صاحب کا انتقال ہوگیا۔ لیکن عباس دوری کے حوالہ سے ایک روایت اسی سلسلہ میں امام کے سوانح نگاروں کو ہم نقل کرتے ہوئے پاتے ہیں جس کا حاصل یہ ہے کہ نظر بندی کے ان ہی دنوں میں ابوجعفر کی طرف سے امام کو سمجھانے بجھانے کے لئے جو آیا کرتے تھے انہوں نے آخر ایک دفعہ امام کو آمادہ کر لیا کہ اس مصیبت کو آپ کب تک جھیلتے رہیں گے۔ خلیفہ برسر ضد آمادہ ہے قسم کھا چکا ہے جب تک اس کی ضد کی تکمیل نہ ہوگی۔ وہ آپ کو نہیں چھوڑے گا' اس کے بعد ان لوگوں نے جو کچھ لکھا ہے اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ شاید امام صاحب کی سمجھ میں اس وقت ایک بات آگئی۔ یعنی خلیفہ کی قسم اور ضد بھی پوری ہو جائے اور ملازمت کو قبول کرنے میں اس کا جو خطرہ تھا کہ ان کی ساری کوششوں کا حاصل وہی سمجھا جائے گا کہ یہ ساری کش مکش حکومت میں ایک بڑے عہدے کے حاصل کرنے کے لئے تھی' اس خطرہ کا بھی احتمال نہ پیدا ہو کہتے ہیں کہ امام کی طرف سے یہ تجویز پیش ہوئی کہ خاص دارالخلافہ میں تو نہیں البتہ دجلہ کے

اس پار ایک چھوٹی سی[1] آبادی کی بنیاد جو پڑ رہی تھی جو بعد کو ابوجعفر کے بیٹے مہدی کا فوجی کیمپ قرار پایا اور ''رصافہ'' کے نام سے ایک مستقل شہر بن گیا تھا۔ اسی بیرونی آبادی کی قضا کی خدمت اختیار کر کے میں خلیفہ کی قسم کو پوری کر دیتا ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ اتنی شدید کش مکش اور مقابلہ کے بعد امام کا اگر اس چھوٹی موٹی خدمت کے قبول کر لینے پر آمادہ ہو جانا اس وقت بہت بڑی بات سمجھی گئی ہوگی ابوجعفر کو ان کی رضامندی کی خبر پہنچائی گئی۔ بہت خوش ہوا اور اس نے حکم دیا کہ اچھا اسی آبادی کے وہ قاضی مقرر کیے جاتے ہیں امام کو نظر بندی والے مکان سے نجات ملی اور دجلہ کے اس پار جہاں وہ آبادی تھی پہنچے۔

حضرت امام کی عدالت میں مقدمہ

اب یہیں سے سننے کا قصہ ہے بیان کیا جاتا ہے کہ دو دن تک تو کوئی مقدمہ ہی

---

[1] یہ میری اپنی تعبیر ہے ورنہ روایت میں تو ''رصافہ'' ہی کا ذکر ہے تعبیر کے بدلنے کی وجہ یہ ہوئی کہ فوجی چھاؤنی قرار پانے کے بعد ''رصافہ'' کے نام سے ایک مستقل شہر بغداد کے مقابلہ میں جو قائم ہوا تو جیسا کہ عام مورخین نے لکھا ہے کہ یہ واقعہ ۱۵۱ھ ہجری کا ہے جب مہدی خراسان سے واپس آیا ہے اور ظاہر ہے کہ امام صاحب کی وفات اس سے ایک سال پہلے ۱۵۰ھ میں ہی ہو چکی تھی میرا خیال ہے کہ اگر یہ واقعہ صحیح ہے تو جہاں پر ''رصافہ'' آباد ہوا اسی جگہ کی کسی چھوٹی آبادی کی خدمت قضا امام صاحب نے قبول کی تھی یہ جو کہا جاتا ہے کہ دو دن تک کوئی مقدمہ ہی پیش نہ ہوا اور تیسرے دن پیش ہوا بھی تو ایک کشمیرے کا مقدمہ دعویٰ بھی دو درم چار پیسوں کا یعنی ایک روپیہ سے بھی کم کا اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ جس وقت امام صاحب اس مقام میں جا کر بیٹھے ہیں اس کی حیثیت بالکل معمولی آبادی کی ہوگی بے چارے ادنیٰ درجے کے غرباء وغیرہ وہاں رہتے ہوں گے امام نے اس کو پسند بھی اسی نے کیا تھا کہ ایسے مقام کی قضاء کی خدمت پر وہ شبہ نہیں ہو سکتا جو قاضی القضاۃ یا کسی بڑے اہم شہر کے قاضی ہونے پر کیا جا سکتا ہے۔ یہ ممکن تھا کہ بجائے اس آبادی کے اور بھی بیسیوں کسمپرس آبادی ایسی ہو سکتی تھی لیکن ابوجعفر وہاں ان کو جانے کب دیتا وہ اپنے سامنے اپنی نگرانی میں ان کو رکھنا چاہتا تھا۔ ۱۲

دائر نہیں ہوا۔ تیسرے دن ایک غریب ٹھٹھرا (صفار) ایک آدمی کے ساتھ امام صاحب کے سامنے آیا اور دعویٰ کیا کہ اس شخص پر میرے دو درم اور چار پیسے باقی ہیں میں نے اس کو پیتل کی ایک ٹھلیا دی تھی جس کی قیمت میں سے اتنے دام باقی رہ گئے ہیں' امام صاحب نے ٹھٹھیرے کے مدعیٰ علیہ کو خطاب کر کے کہنا شروع کیا کہ:

''بھائی اللہ سے ڈر ٹھٹھیرا جو کچھ کہہ رہا ہے بتا کہ واقعہ کیا ہے''

مدعیٰ علیہ نے صاف انکار کر دیا اور بولا کہ مجھ پر اس کا حبہ بھی باقی نہیں ہے چونکہ مدعی کے پاس کوئی شہادت اپنے دعویٰ کے ثبوت کے لئے نہ تھی تو جیسا کہ قاعدہ ہے اسلامی قانونی کی رو سے مدعی کو حق دیا گیا ہے کہ وہ مدعی علیہ سے قسم لے' ٹھٹھیرے نے امام صاحب سے کہا کہ اس شخص سے قسم لیجئے۔ قسم لینے کا جو قانونی طریقہ ہے اسی کو اختیار فرماتے ہوئے امام نے مدعی علیہ کو مخالب کر کے کہا:

قل واللہ الذی لا الہ الا ھو. کہ اچھا کہو قسم ہے اس اللہ کی جس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔

ادھر امام صاحب کے منہ سے یہ الفاظ نکلے کہ سننے کے ساتھ ہی انہوں نے دیکھا کہ مدعی علیہ نے بغیر کسی جھجک کے بے تحاشا بغیر کسی تردد و غدغہ اور جھجک کے وہ قسم کھانے لگا۔ ایمان کی جس حسی ذکاوت سے ان کی فطرت سرفراز تھی قسم کھانے والے کی یہ دلیری اور جرأت ان کے لئے نا قابل برداشت بن گئی۔ لکھا ہے کہ ابھی اس کے الفاظ پورے بھی نہیں ہوئے تھے کہ درمیان میں بات کو کاٹ کر کے اس کو امام صاحب نے چپ کر دیا۔ دیکھا گیا کہ اپنی آستین سے کچھ چیز نکال رہے ہیں۔ ایک دستی بیگ تھا جس میں کچھ درم پڑے ہوئے تھے بیگ کو کھول کر امام صاحب نے دو بھاری بھاری درم نکالے اور ٹھٹھیرے کی طرف مخالب ہو کر فرمایا کہ:

''اپنے دام کے جس بقایا کا دعویٰ تم نے اس پر کیا ہے لو مجھ سے لے لو۔''

اور اس ترکیب سے مدعیٰ علیہ کو جو بے محابا حق تعالیٰ وسبحانہ کے نام سے قسم کھا رہا تھا' آپ نے قسم کھانے سے روک دیا۔ ساری زندگی میں کسی مقدمہ کے تجربہ کا یہی ایک

موقعہ تھا' جوان کو ملا میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ روایت کس حد تک درست ہے۔ لیکن اگر واقعہ ہے تو شاید یہ قدرت کی طرف سے بات تھی کہ اپنے متعلق بار بار باصرار تمام ابو جعفر کے سامنے یہ جو فرماتے تھے کہ میں قاضی بننے کی صلاحیت نہیں رکھتا' اس دعوے کے ثبوت میں ایک عملی دلیل گویا مہیا ہوگئی۔

میں نے پہلے بھی لکھا ہے کہ عدم صلاحیت کا یہ دعویٰ یقیناً کسی واقعہ پر مبنی تھا۔ اپنے حال سے وہ خود واقف تھے۔ غالباً ان کے ایمان کی یہ حسی ذکاوت سب سے بڑی روک تھی۔ جس کی طرف وہ اشارہ کر رہے تھے جانتے تھے کہ قانون کا سمجھنا قانون کا واقعہ پر منطبق کرنا' یہ سارے کام تو میں کر سکتا ہوں' لیکن اس کا یقین کیسے حاصل کر سکتا ہوں کہ مدعی یا مدعیٰ علیہ جو کچھ کہہ رہے ہیں اس میں اصل واقعہ کیا ہے۔ عرض کر چکا ہوں کہ یہ ایک ایسا معاملہ ہے کہ پیغمبر تک نے اعلان کر دیا کہ میرے فیصلہ سے کسی کو دھوکہ نہ کھانا چاہیے کہ میں نے واقعہ کے مطابق جو واقعی حق دار ہے اسی کو حق دلایا ہے۔ ایسی صورت میں وہ سمجھتے تھے کہ بہت سی باتیں ایسی پیش آئیں گی جنہیں میری فطرت برداشت نہیں کر سکتی' جیسے یہی صورت آپ دیکھ رہے ہیں کہ قسم کے پورے الفاظ کا سننا بھی ان کے لئے قابل تحمل نہ رہا اور اپنی جیب سے دام نکال کر قصے کو آپ نے ختم فرما دیا۔[1]

---

[1] اس قسم کے اکابر میں بعض ایسی باتیں پائی جاتی ہیں جن کا صحیح اندازہ ہم جیسے عامی لوگوں کو ہو بھی نہیں سکتا۔ ٹھیک جیسے یہ امام ابو حنیفہ کا قصہ ہے کہ دنیا کے بڑے بڑے مصنفین کی صف اول کے آدمی ہیں۔ لیکن قانون کے عملی استعمال سے اپنے آپ کو وہ معذور پاتے تھے جس کا اعتبار مشکل ہی سے کوئی دوسرا کر سکتا ہے ابو جعفر کی حد سے زیادہ بڑھی کی وجہ بھی ان کا یہی دعویٰ بن گیا۔ ٹھیک جیسے امام ابو حنیفہ کا یہ حال تھا۔ امام مالک کی طرف بھی کتابوں میں ایک عجیب بات منسوب کی گئی ہے۔ یعنی وفات سے کچھ دن پہلے ان پر ایک خاص حال طاری ہو گیا تھا کہتے ہیں کہ آخر میں انہوں نے مسجد آنا ترک کر دیا تھا' نہ روز کی جماعتوں میں شریک ہوتے تھے اور نہ جمعہ میں بلکہ جنازے تک کی نماز آپ نے ترک کر دی تھی۔ لوگ جب وجہ پوچھتے تو جواب میں صرف اس قدر فرما دیتے کہ ہر شخص اس پر قادر نہیں ہے کہ اپنے عذر کو لوگوں سے بیان کرے حالانکہ آپ ہی سے یہ بھی منقول ہے کہ رویا میں رسول اللہ ﷺ کی زیارت ہر شب میں نصیب ہوتی تھی اور ان کی جلالت شان کا کون انکار کر سکتا ہے مگر یہ لله

حضرت امام کی وفات

عباس دوری کی اسی روایت میں یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ قضا کی اس خدمت کے تین دن تو اس حال میں گذرے دو دن یہ سلسلہ اور بھی جاری رہا مگر بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ جیسے پہلے دو دنوں میں کوئی مقدمہ نہیں آیا تھا ان باقی دو دنوں میں بھی نہ آیا کہ عباس کے الفاظ اس کے بعد یہ ہیں کہ:

فلما کان بعد یومین اشتکی ابو حنیفہ فمرض ستة ایام ثم مات. (ص ۱۷۹ ج ۲ موفق)

دو دن کے بعد امام ابوحنیفہ بیمار ہوئے اور چھ دن بیمار رہے پھر آپ کی وفات ہوگئی۔

عباس دوری کا شمار معتبر ترین روایت حدیث میں ہے ان خوش قسمت راویوں میں ہیں جن پر ائمہ نقد رجال میں سے کسی نے کسی قسم کی کوئی تنقید نہیں کی ہے۔ سب ان کی صداقت لہجہ پر متفق ہیں۔ اس روایت کو بیان کرتے ہوئے وہ کہا کرتے تھے کہ حدثونا یعنی کسی ایک آدمی سے سن کر اس روایت کو نہیں بیان کرتے تھے۔ بلکہ جماعت سے یہ خبر امام ابوحنیفہ کے متعلق انہوں نے سنی تھی۔

وفات کے اسباب

بہر حال ان کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ امام صاحب کی وفات مرض میں مبتلا ہونے کے بعد ہوئی ہے۔ جہاں تک میرا خیال ہے۔ زیادہ تر قرینہ عقل و قیاس بھی یہی بات معلوم ہوتی ہے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ میں ابوجعفر خلیفہ کی برأت کرنا چاہتا

لہ کیسی عجیب بات ہے کہ سنت کی اشاعت میں جس کا سب سے بڑا ہاتھ ہے۔ وہی جماعت جیسی سنت مؤکدہ کی پابندی سے معذور ہو گیا تھا۔ پھر کیا تعجب کہ مسلمانوں کا جو سب سے بڑا مقنن تھا۔ قانون کے استعمال سے اپنے آپ کو عاجز پاتا تھا اور یہ وجہ جو میں نے پیش کی ہے۔ اتفاقاً معلوم ہوگئی ہے کون کہہ سکتا ہے کہ قضا کی عدم صلاحیت کا دعویٰ کن کن باتوں پر مبنی تھا واللہ اعلم۔ ۱۲

ہوں۔ آخر اس کا ماننا تو بہر حال ضروری ہے کہ ابوجعفر نے امام کو کوڑے لگائے' خیال کرنے کی بات ہے امام صاحب کی زندگی علمی زندگی تھی۔ عمر بھی ستر کے قریب پہنچ چکی تھی' ایک دو نہیں بلکہ غصہ میں تیس تیس کوڑے سے آپ کا مار کھانا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ اگر اس ضرب کا بھی آپ پر اثر ہوا ہو۔ نیز جیل خانے میں کھانے پینے کی جو تکلیف آپ کو دی گئی' اور جو سختیاں آپ پر کی گئیں۔ مجموعی طور پر ان ہی چیزوں نے آپ کو بیمار ڈال دیا ہو تو اس میں کیا تعجب ہے اور میں تو سمجھتا ہوں کہ ان ہی بیان کرنے والوں میں سے بعضوں نے جو یہ بیان کیا ہے کہ ابوجعفر کی اس دارو گیر تشدد و جبر سے بیزار ہو کر امام صاحب رویا کرتے تھے اور۔

اکثر الدعاء. (ص ۱۸۲ ج ۲) اور بہت زیادہ دعا کرنے لگے۔

کس چیز کی دعا کرنے لگے؟ گو اس کی تصریح نہیں کی گئی' لیکن راوی کا اسی کے بعد یہ بیان کہ:

قلم یلبث الایسیراً حتی مات. پس نہ ٹھہرے اس کے بعد لیکن چند روز تا این کہ وفات ہوگئی۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جو صورت پیش آئی شائد اسی کی دعا میں زور لگا دیا گیا تھا۔ یا یوں سمجھئے کہ ظالم کے پنجے سے نجات کی دعاء کرتے ہوں گے اور موت ہی کو قدرت نے ان کی نجات کا ذریعہ بنا دیا۔[1]

لکھا ہے کہ امام کو اپنی موت کا جب یقین ہو گیا تو سجدے میں چلے گئے اور اسی

---

[1] امام بخاری کے ساتھ جب بخارا کے حاکم نے اسی قسم کا ظلم و تشدد شروع کیا۔ اور تنگ آ کر بخارا سے آپ سمرقند کے ایک قصبہ خرتنگ اپنے بعض اعزہ کے پاس چلے گئے راوی کا بیان ہے کہ ان ہی دنوں میں جب وہ خرتنگ میں تھے عشاء کی نماز کے بعد میں نے دیکھا کہ ان پر ایک حال طاری ہے' ہاتھ اٹھائے ہوئے فرما رہے ہیں کہ پروردگار! زمین اپنی ساری وسعتوں کے باوجود مجھ پر تنگ ہو چکی ہے۔ پس پروردگار! اب اپنے پاس مجھے بلا لیجئے کہتے ہیں کہ مہینہ بھی پورا ہونے نہ پایا کہ اسی قریہ میں امام بخاری کی وفات ہوگئی۔ ۱۲

حال میں ان کی جان جان آفرین کے پاس واپس ہوگئی۔[1]

غسل

یہ ۱۵۰ھ ہجری کے شعبان یا شوال یا جیسا کہ اکثروں نے لکھا ہے رجب کا مہینہ تھا' ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس عرصے میں امام کے صاحبزادے حماد بن کے سوا ان کی اور کوئی اولاد نہ تھی بغداد پہنچ گئے تھے۔ وفات کی خبر شروع میں چند خاص لوگوں میں مثلاً شہر کے قاضی حسن بن عمارہ[2] وغیرہ تک محدود تھی۔ عبداللہ بن واقد کا بیان ہے کہ غسل کا پانی میں ہی ڈال رہا تھا اور قاضی حسن بن عمارہ امام کو غسل دے رہے تھے۔ کپڑوں کے اتارنے کے بعد امام کے جسم پر مجاہدات کے جو نشانات تھے ان کو دیکھ کر سب رو پڑے

---

[1] موفق نے اس روایت کو کتاب المتجمین " سے نقل کرتے ہوئے لکھا ہے کہ جس سند سے یہ روایت نقل کی گئی ہے موتی کی لڑی ہے یعنی بڑے بڑے معتبر ثقہ رواۃ ہیں۔ مگر تعجب اس پر کیا ہے کہ سب کے سب شافعی المذہب حضرات ہیں پھر شکر یہ ادا کیا ہے کہ خود حنفیوں کی کتابوں میں یہ روایت نہیں پائی جاتی ہے۔ لیکن امام رحمۃ اللہ علیہ کی موت کی یہ خصوصی کیفیت ان ہی شافعی علماء کے ذریعہ سے ہم لوگوں تک پہنچی۔ فجزاھم اللہ احسن الجزا۔ (ص ۱۸۵ ج ۲ موفق)

[2] حسن بن عمارہ کا ذکر مختلف مقامات پر گذرا ہے' یہی صاحب جن کے قول کی تصحیح کرتے ہوئے بھری مجلس میں امام ابوحنیفہ نے اپنی غلطی کا اعتراف کیا تھا یہ ابوجعفر منصور کے عہد میں خاص بغداد کے قاضی تھے۔ بڑے جواد اور سخی تھے۔ ان کے متعلق ابوجعفر کا ایک دلچسپ لطیفہ یہ ہے کہ مہدی جو ابوجعفر کے بعد عباسی خلیفہ ہے اپنی نوجوانی کے زمانہ میں مقاتل بن سلیمان کو زیادہ پسند کیا کرتا تھا۔ دراصل مقاتل افسانہ گو تھا' ابوجعفر کو خبر ہوئی تو بیٹے کو بلا کر سمجھایا کہ قصے کہانیوں سے تمہیں اپنی آئندہ زندگی میں کام نہیں پڑے گا' اگر اپنی حکومت کے عہد میں کامیاب ہونا چاہتے ہو تو حسن بن عمارہ سے فقہ سیکھو اور محمد بن اسحاق سے سیر و مغازی کے واقعات کا علم حاصل کرو' اس سے اس زمانہ کے خلفاء کے علمی رجحانات اور تعلیمی نقطہ نظر کا پتہ چلتا ہے۔ مگر کیا کیجئے کہ نوجوانی کے دنوں میں آدمی کو مقاتلیات یعنی افسانوں کے پڑھنے پڑھانے کا شوق ہوتا ہے پہلے بھی یہی تھا۔ اب بھی ہے۔ صرف نام بدل جاتے ہیں۔ آج ناول اور افسانچے وغیرہ کے ناموں سے ان ہی گپوں کو نوجوان زیادہ شوق سے پڑھتے ہیں۔ ۱۲

قاضی صاحب نہلاتے جاتے تھے اور روتے جاتے تھے۔

جنازہ پر لوگوں کا ہجوم

جنازہ بھی جس وقت اٹھا ہے تو بعض دیکھنے والوں کا بیان ہے کہ ابتداء میں چار پانچ آدمی سے زیادہ نہ تھے، وہی صاحب کہتے ہیں کہ خراسانی دروازے کے طاقوں سے ہم گذر رہے تھے۔ اچانک ایسا معلوم ہوا کہ سارے شہر میں کسی نے بجلی دوڑا دی، یہ سننے کے ساتھ ہی کہ امام ابوحنیفہ کا جنازہ جا رہا ہے۔ جو جہاں تھا۔ جس حال میں تھا وہیں سے پلٹا اور جنازے کی شرکت کی سعادت حاصل کرنے کے لئے شریک ہوگیا۔ پل کے پاس کے دروازے کے پاس پہنچتے پہنچتے لوگوں کے اژدہام اور بھیڑ کا یہ حال ہوا کہ عصر کے بعد بھی بہ مشکل جنازے کی نماز سے فراغت ہوئی۔ اس روایت کا تذکرہ تو گذر ہی چکا کہ چھ دفعہ امام کے جنازے کی نماز پڑھی گئی اور جتنے آدمیوں نے نماز پڑھی ان کا جب اندازہ کیا گیا تو

بلغ خمسین الفاو اکثر. پچاس ہزار یا اس سے بھی زیادہ تعداد ان کی ثابت ہوئی۔ (ص ۱۷۲ ج ۲ موفق)

خیر یہ تو امام اور ان کے جنازے کا حال تھا۔ لیکن اب آیئے اور دیکھئے ابو جعفر خلیفہ کا کیا حال ہے شائد یہ اسی وقت کی روئداد ہے جب چاروں طرف سے سمٹ سمٹ کر امام کے جنازے میں لوگ شریک ہو چکے تھے اور جیسا کہ ابو رجا الہروی کا بیان ہے کہ:

لم اربا کیا اکثر من یومئیذ. (ص ۱۷۲ ج ۲ موفق) اتنے زیادہ آدمیوں کو روتے ہوئے میں نے نہیں دیکھا تھا۔

تدفین

یہی دردناک منظر تھا جو عاشق کا جنازہ پیش کر رہا تھا کہتے ہیں کہ زمین کے جس مبارک قطعہ کو امام کی خواب گاہ ہونے کا شرف حاصل ہے خلیفہ کو معلوم ہوا کہ اسی زمین

میں وضع کرنے کی امام نے وصیت کی تھی۔ ان کا خیال نقل کیا گیا کہ اسی زمین کو وہ پاک زمین سمجھتے تھے اور کہتے تھے کہ بغداد جس قطعہ اراضی پر آباد کیا گیا ہے وہ غصباً زبردستی حاصل کیا گیا ہے۔[1]

میں نے پہلے بھی کہیں نقل کیا ہے کہ امام کی اس وصیت کی خبر ابو جعفر خلیفہ کو جب پہنچائی گئی تو اس کی زبان سے بے ساختہ نکلا۔

من یعذرنی منہ حیا و میتاً. (ص ۱۸۰ ج ۲) مجھے ابو حنیفہ کے سامنے کون معذور ٹھہرا سکتا ہے زندگی میں بھی اور موت کے بعد بھی۔

اور بے چارا سچ کہتا تھا' یہی ایک واقعہ کیا اور اسی وقت کیا' امام کی وفات کی اس خاص نوعیت نے ابو جعفر ہی کے لئے نہیں بلکہ حکومت عباسیہ کے لئے ایک مستقل مسئلہ کی شکل اختیار کر لی۔ حسینؓ کا قتل جیسے ہمیشہ یزید کے مرگ کا پیغام بن جاتا ہے' تاریخ پھر اسی واقعہ کو دہرا رہی تھی کون اندازہ کر سکتا ہے ابو جعفر کی اندرونی سوزشوں اور پریشانیوں کا اوہام و وساوس کے بادل شور و پکار کے چھائے چلے جاتے ہوں گے وہی اس کو سمجھ سکتے ہیں۔ جنہیں کبھی اس حال سے دو چار ہونا پڑے ایک لاکھ انسانوں کے ہاتھوں میں کھینچی ہوئی تلواروں کا جو نقشہ ابو جعفر کے تجربہ کار بوڑھے چچا عبد الصمد نے کھینچ کر دکھایا تھا تو کون کہہ سکتا ہے کہ امام کا جنازہ اس شان و شوکت کے ساتھ جب مقبرہ خیزران کی طرف جا رہا تھا تو نقشہ نقشہ نہیں بلکہ واقعی میں وہ شمشیر ابو جعفر کے دل و دماغ میں نہیں چمک رہی تھیں؟ عباسی تخت پر ابو جعفر کے بعد خلیفہ بن کر جو

---

[1] اگرچہ امام صاحب کے متعدد سوانح نگاروں نے یہ روایت ان کی طرف منسوب کی ہے' لیکن البلاذری نے مدینۃ السلام کی تعمیر کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ مدینۃ الاسلام کی زمین ابو جعفر نے مختلف دیہاتوں کے باشندوں سے خریدی تھیں۔ ص ۳۰۴ بلاذری ایسی صورت میں امام کی روایت کا مطلب شاید یہ ہو سکتا ہے کہ دام حکومت کی طرف سے ادا کئے گئے ہوں لیکن مالکان زمین کی رضامندی شاید بیچنے میں شریک نہ تھی غصب کا ایک مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے اور یہ دستور تو اس وقت تک ان حکومتوں میں بھی مروج ہے جن کا دعویٰ ہے کہ ان سے پہلے انصاف و عدالت کے لفظ سے بھی دنیا واقف نہ تھی۔ ۱۲

بیٹا یعنی مہدی سفیان ثوری کے قصے میں ربیع کو ڈانٹتے ہوئے اس نے جو کہا تھا یہ تو وہی لوگ ہیں جو موت کی سعادت حاصل کر کے ہماری شقاوت اور کور بختی میں اضافہ کرنا چاہتے ہیں۔

میں تو سمجھتا ہوں کہ امام کی وفات نے مہدی کے باپ ابوجعفر کی قسمت پر شقاوت کی مہر جو لگا دی تھی اسی کے مشاہدے نے شاید اس خیال کو مہدی میں پیدا کیا تھا۔

حضرت امام کی وفات کے اسباب پر بحث

اسی سے اندازہ کیجئے کہ امام کی ''موت'' جو ظاہر ہے کہ ایک ہی موت تھی' اور ایک ہی دفعہ واقع ہوئی تھی۔ لیکن کیسے واقع ہوئی کیوں واقع ہوئی؟ اسی زمانہ میں معلوم ہوتا ہے کہ بیسیوں روایتیں مشہور کرنے والوں نے عوام میں پھیلا دی تھیں میں نے تو عباس دوری کی روایت پر بھروسہ کرتے ہوئے اسی کو نقل کر دیا ہے لیکن جیسا کہ موفق نے لکھا ہے کہ:

ثم اختلفوا بعد ذلک فمنهم من یقول مات من الضرب وبعضهم قالوا سقی السم.(ص ۱۷۹ ج۲ موفق)

پھر لوگوں میں اختلاف ہے بعض لکھتے ہیں کہ مار سے امام کی وفات ہوگئی اور بعض کہتے ہیں کہ امام کو زہر پلایا گیا تھا۔

اور یہ اختلافات تو کیوں کے جواب میں یعنی اسباب موت میں تھے۔ باقی یہ سوال کہ موت کیسے واقع ہوئی؟ اس کے جوابوں کا جو ذخیرہ ہے وہ صحیح ہوں' یا غلط' لیکن عوام کے جذبات کا ان سے ضرور اندازہ ہوتا ہے۔ منسوب کرنے والوں نے تو ابوجعفر کی طرف یہاں تک منسوب کیا ہے کہ:

''ابوجعفر نے بلا کر امام صاحب کی طرف ایک پیالہ بڑھایا جس میں زہر تھا اور اس کے پینے کا حکم دیا۔ امام نے کہا کہ میں نہیں پیوں گا۔ اس پر ابوجعفر

نے اصرار سے کہا کہ پینا پڑے گا' الغرض وہ انکار کرتے جاتے تھے اور خلیفہ کا اصرار پلانے پر اسی نسبت سے بڑھتا چلا گیا' آخر میں امام نے کہا مجھے معلوم ہے کہ اس پیالے میں کیا ہے میں اپنی خودکشی پر مدد نہیں کروں گا۔ تب امام صاحب پٹکے گئے اور ان کے منہ کو زبردستی کھول کر زہر کے گھونٹ کو ابوجعفر نے حلق میں اتار دیا۔''

اور قصہ اسی پر ختم نہیں ہو گیا ہے راوی کا بیان ہے کہ:

''امام اس کے بعد اٹھ بیٹھے اور جانے کے لئے کھڑے ہوئے تب خلیفہ نے کہا کہ چلے کہاں؟ امام نے فرمایا کہ جہاں تم مجھے بھیجنا چاہتے ہو۔''

اصل حقیقت سے تو عالم الغیوب کے سوا اور کون آگاہ ہو سکتا ہے۔لیکن مجھے تو بے چارے ابوجعفر پر رحم آتا ہے یہ خبریں اس کے کانوں تک جب پہنچتی ہوں گی' یعنی مسلمانوں میں یہ خیالات پھیلے ہوئے ہیں کہ میں نے عراق کے فقیہ اور مشرق کے امام کو پٹک کر زہر کا پیالہ زبردستی منہ چیر کر پلایا اور اسی زہر سے وہ مر گئے' سوچئے تو اس کا کیا حال ہوتا ہوگا۔اور ایک یہ زہر ہی کیا؟ کچھ دیر پہلے تازیانہ کے قصے کی بوقلمونیوں کا ذکر بھی تو گذر چکا ہے۔جیل جانے سے روزانہ دس دن تک باہر نکالا جانا کپڑے اتروا کر ساری مخلوق کے سامنے سر پر کوڑوں کی بارش' کوڑے پڑتے جاتے ہیں اور امام روتے جاتے ہیں' خون بہہ رہا ہے' بلکہ ان ہی حاشیوں میں خوارزمی کی کتاب کا ایک حاشیہ وہ بھی تو تھا جس میں کوڑے کی مار اور زہرخوانی دونوں جرائم کو ابوجعفر کی طرف منسوب کرتے ہوئے یہ نکتہ بھی پیدا کیا گیا تھا کہ سارے جسم میں زہر کے اثر کو پھیلانے کے لئے جسم کے ہر حصہ پر کوڑے لگائے جاتے تھے تاکہ خون کے ساتھ مل کر ہر جگہ زہر پھیل جائے۔ بجائے خود یہ قصے جیسے کچھ ہیں ظاہر ہے۔لیکن جن جن راویوں کی طرف منسوب کر کے کتابوں میں لوگوں نے ان کو نقل کیا ہے۔عموماً ان میں زیادہ تر وہی لوگ ہیں جو امام کی وفات کے زمانے میں یا اس زمانے سے قریب تر زمانے میں پائے جاتے تھے جس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ ابوجعفر کی زندگی ہی میں ان واقعات کا انتساب

اس کی طرف ہو چکا تھا غریب ابوجعفر امام کو اپنے دام میں پھنسانا چاہتا تھا۔ لیکن ان مسموعات کے بعد جس پیکرے میں خود اپنے آپ اپنی آل واولاد کو اپنی حکومت کو جکڑا ہوا پاتا ہوگا۔ اس کا اندازہ ہم یا آپ شاید صحیح طور پر کر بھی نہیں سکتے' تاریخ کی عام کتابوں میں اس قسم کے واقعات جو نقل کئے جاتے ہیں کہ امام ابوحنیفہ کا جس سال انتقال ہوا۔ اسی کے کچھ دن بعد ابوجعفر نے ایک خاموش سفر حج کا اس طور پر کیا کہ اچانک لوگوں نے دیکھا کہ خلیفہ کوفہ پہنچا ہوا ہے کوفہ کے گورنر تک کو ابوجعفر کی آمد کی خبر اس وقت ہوئی جب شہر کے سواد میں وہ پہنچ چکا تھا' پھر اسی کے بعد خاص ترکیب سے کوفہ کی صحیح مردم شماری سے واقفیت حاصل کرنا اور ان ہی دنوں میں سفیان ثوری عباد بن کثیر ابن جریج جیسے ائمہ کبار کو گرفتار کرانا اگرچہ ان واقعات کا ابوحنیفہ کی موت سے کوئی تعلق نہیں بیان کیا گیا ہے۔ لیکن نہ بیان کرنا کسی چیز کے نہ ہونے کی دلیل نہیں ہوسکتا۔

بہرحال کچھ بھی ہو جیسے ایک طرف خلیفہ کی شقاوتوں میں شقاوتوں کا اضافہ ہوتا چلا جاتا تھا۔ بے چارے نے جو کچھ کیا تھا' وہ تو خیر کیا ہی تھا۔ لیکن رنگ آمیزیوں اور حاشیہ آرائیوں کا جو طوفان اس کے بعد اٹھا تھا وہ اس کی رسوائیوں پر رسوائیوں کی تہ پر تہ جماتے چلے جاتے تھے۔ ادھر اس کا تو یہ حال تھا اور دوسری طرف یہ قدرتی بات تھی کہ امام کی احترامی سعادتوں کا اضافہ اسی نسبت سے ہوتا چلا جائے' سو ہو رہا تھا۔

کش مکش کی اس راہ میں امام کی جن قربانیوں کا تماشا مسلسل دنیا کر رہی تھی۔ یقیناً ان کی قیمت ضائع نہیں ہوسکتی۔ آخر بادشاہی کے سوا اور کون سی چیز تھی جس کا لقمہ امام کے سامنے نہیں پیش کیا گیا۔ لیکن۔

پنجہ با پنجہ خدائے زدہ
ہر چہ ادنیست پشت پائے زدہ

کی ٹھوکروں سے حکومت کے مقابلہ میں گول پر گول جو وہ کرتے چلے گئے تھے بے کسی اور شہادت کی اس موت نے یقیناً اس میں چار چاند لگا دیئے۔ کہتے ہیں کہ قاضی حسن بن عمارہ امام کو غسل دیتے ہوئے دوسری باتوں کے ساتھ یہ بھی کہتے جاتے تھے۔

اتعتبر من بعدک وفضحت القرّاء. (ص ۱۷۳ ج ۲ موفق) اپنے بعد کو لوگوں کو بڑی مصیبت میں تم نے مبتلا کر دیا۔ اہل علم کو تم نے رسوا کر دیا۔

مطلب قاضی صاحب کا وہی تھا کہ علم کے خصوصاً علم دین کے صحیح تقاضوں کی تکمیل میں جو علمی نمونے چھوڑ کر دنیا میں تم گئے' دوسروں سے اس کی نباہ مشکل ہی ہو گی تمہارے مقابلے میں سب کا چراغ گل ہو گیا' سر اٹھانے کی گنجائش علماء کے لئے باقی نہیں رہی!

اور صورت حال بھی کچھ ایسی ہی ہے اسلامی تاریخ کا دامن بحمد اللہ گو دین کی راہوں کی قربانیوں سے خالی نہیں ہے شاید ہی کوئی صدی ایسی گذری ہے جس میں محمد ﷺ کے علم و دین کے محافظوں کی طرف سے جب ضرورت پیش آئی ہے۔ استقامت و استقلال صبر و ثبات کے مہیب نظائر نہیں پیش ہوئے ہیں' ان ہی دنوں میں مجھ ہی سے امام مالک سفیان ثوری وغیرہ حضرات کی قربانیوں کا اجمالاً ذکر سن چکے ہیں یا امام کے کچھ ہی دن بعد امام احمد بن حنبل امام شافعی وغیرہ ائمہ کبار میں سے کون ہے جو اسی قسم کی آزمائش کی بھٹیوں سے کھرا ہو کر نہیں نکلا ہے؟ لیکن مجموعی طور پر سوچئے ان حضرات کو مصائب ضرور برداشت کرنے پڑے اور سخت سے سخت جگر گذار روح گسل مصائب لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا بھٹیوں میں جانے کے بعد وہ باہر نکل آئے لیکن آزمائشوں کی اسی راہ میں جان بھی دے دی گئی ہو' ایسی صورت ان حضرات کے ساتھ نہیں پیش آئی۔ اگرچہ یہ صحیح ہے کہ نوبت اس کی بھی اگر آ جاتی تو انشاء اللہ ان میں سے کسی کا قدم پیچھے نہ ہٹتا' تاہم فرق ہے کہ گذرنے میں اور کر گذارنے کی توقع میں۔[1]

خود امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ جو استقامت و ثبات کی اس راہ کے بھی بڑے امام ہیں اسماعیل بن سالم بغدادی کی روایت ہے کہ امام اپنی آزمائش سے گذرنے کے

---

[1] بات بہت طویل ہو جائے گی' ورنہ ان نظائر و امثال پر کافی بحث ہو سکتی ہے حضرت امام بخاری کو دیکھئے بے شک بحالت غربت و مسافرت حکومت کے ساتھ اسی کش مکش کے قصے میں حضرت کی وفات ہوئی لیکن جہاں تک واقعات کا تعلق ہے زدو کوب جیل اور حبس کے مصائب سے خدا نے ان کو محفوظ رکھا اسی طرح اسی کتاب میں ابراہیم الصائغ رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ بڑا دردناک واقعہ ہے جسے آپ پڑھ چکے ہیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ اسلامی تاریخ میں ابراہیم اس صنف کے آدمی نہیں ہیں جس طبقہ

بعد امام احمد کو میں دیکھتا تھا کہ امام ابوحنیفہ کی آخر زندگی کے ان شرائد کا جب تذکرہ فرماتے تو رو دیتے اور امام کے لئے دعا فرماتے۔ (ص ۱۶۹ ج)

بلکہ میں تو سمجھتا ہوں کہ موفق وغیرہ نے اس قسم کی روایتیں جو نقل کی ہیں مثلاً عبداللہ بن یزید کے متعلق لکھا ہے کہ امام ابوحنیفہ کا جب ذکر کرتے تو کہتے "حدثنا شاہ مردان" مردوں کے بادشاہ نے مجھ سے یہ بیان کیا ص ۳۲ یا ابوعبدالرحمٰن المقری کی عادت تھی کہ بجائے نام کے امام کی طرف کسی بات کو منسوب کرتے ہوئے کہتے کہ "حدثنا شاھنشاہ" ص ۳۰ (مجھ سے بادشاہوں کے بادشاہ نے یہ بیان کیا) شاید یہ ان کی اسی شان دار موت کے بعد کے واقعات ہیں۔ گویا جو جوانمردی امام نے دکھائی اور حکومت کے مقابلہ میں علم اور دین کی جو لاج انہوں نے رکھ لی تھی۔ ان ہی باتوں کا اعتراف صرف عراق بغداد و کوفہ ہی کی حد تک نہیں بلکہ جن علاقوں کی زبان عربی نہیں تھی وہاں بھی ان الفاظ سے کیا جاتا تھا۔

اور گو کتابوں میں بعض واقعات کا تذکرہ سرسری اور ضمنی طور پر کر دیا گیا ہے۔ لیکن میرے نزدیک تو امام کی عظیم وجلیل قربانیوں کے وہ ناگزیر نتائج ہیں اگر لوگ نہ بھی بیان کرتے جب بھی علل واسباب کی روشنی میں انسانی تاریخ کے مطالعہ کرنے والے جانتے ہیں کہ جو حالات پیش آئے تھے ان کے بعد وہی ہونا بھی چاہیے تھا جو ہوا میرا مطلب یہ ہے' امام موفق' یا الکردری وغیرہ نے اپنی کتابوں میں اس قسم کے واقعات جو نقل کئے ہیں۔ مثلاً لکھا ہے کہ مشہور نحو وعربیت کے امام نضر بن شمیل جو امام ابوحنیفہ اور ان کے تلامذہ کی طرف سے دل میں کچھ رقابت رکھتے تھے۔[1] جب یہ حضرت خراسان پہنچے جہاں

بقیہ میں ابوحنیفہ تھے اور یہی میرا مطلب ہے کہ مجموعی حیثیت سے امام کی قربانیاں اپنے اندر جو خصوصیتیں رکھتی ہیں ان کی نظیر مشکل ہی سے مل سکتی ہے۔ ۱۲

[1] موفق نے لکھا ہے کہ نضر بن شمیل کی مجلس میں کسی مسئلہ کا ذکر کرتے ہوئے ایک صاحب نے کہا کہ قاضی ابو یوسف اس باب میں امام ابوحنیفہ کا یہ قول نقل کرتے تھے اس پر بے ساختہ نضر کی زبان سے نکلا کہ بیمار کی روایت بیمار سے مجلس میں قاسم بن شبہ نامی ایک بزرگ بیٹھے ہوئے تھے انہوں بقیہ

مامون الرشید کا چہیتا وزیر فضل بن سہل جو ذوالریاستین کے لقب سے ملقب تھا۔ اس کے مزاج میں اچھا درخور ان کو حاصل ہو گیا۔ آخر ایک دن موقعہ پر فضل کو انہوں نے اس پر آمادہ کیا کہ امام ابوحنیفہ کے قول پر عدالتوں میں عمل درآمد نہ کیا جائے معلوم ہوتا ہے کہ ابتداء میں فضل نے ان کے اس مشورے پر زیادہ توجہ نہ کی لیکن کہتے کہتے آخر اس مسئلہ کو فضل کے لئے انہوں نے قابل غور بنا دیا۔ اس نے اہل علم وعقل کے سربر آوردہ افراد کو جمع کیا اور اس معاملہ میں ان کی رائے دریافت کی بیان کیا جاتا ہے کہ بحث ومباحثہ کے بعد اس مجلس شوریٰ نے جس رائے پر اتفاق کیا وہ یہ تھی کہ:

ان هذا الامر لا ینفذ وینتقض جمیع الملک علیکم.	یہ بات قطعاً نہیں چلے گی بلکہ سارا ملک آپ لوگوں (عباسی حکمرانوں) پر ٹوٹ پڑے گا حکومت کا نظام درہم برہم ہو جائے گا۔

ارباب شوریٰ نے فضل سے یہ بھی کہا کہ:

من ذکر ذلک فهو ناقص العقل.(ص ۱۵۸ ج ۲ موفق)	جس نے یہ رائے آپ کو دی ہے وہ کوئی کوتاہ عقل آدمی معلوم ہوتا ہے۔

ارباب عقل وعلم یا راوی کے الفاظ ہیں اهل العقل والخبرة بالامور (یعنی فضل نے جن لوگوں سے مشورہ لیا تھا وہ دانشمند لوگ تھے اور گردوپیش کے حالات سے باخبر تھے) ان لوگوں کا یہ کہنا کہ ابوحنیفہ کے قول پر عمل درآمد کی ممانعت اگر عدالتوں میں کر دی جائے گی تو حکومت عباسیہ میں ابتری پھیل جائے گی اور سارا ملک ٹوٹ پڑے گا یہ رائے کیا امام کی وفات کے سو دو سو برس بعد دی گئی تھی؟ ظاہر ہے کہ یہ مامون الرشید عباسی کے عہد کا واقعہ ہے' گویا امام کی وفات کو پچاس سال بھی تو پورے نہیں ہوئے تھے۔ ہم مامون کو عباسی حکومت کا خلیفہ پاتے

لہ نے نضر سے کہا کہ جناب والا جب قاضی ہوئے تھے تو اس وقت خاکسار سے امام ابوحنیفہ کی مجلس کی کتابیں مانگ کر پڑھا کرتے تھے تو بیچارگی کی روایت بیچارے اس وقت جناب کے خیال میں نہ تھی نضر شرمندہ ہو کر چپ ہو گئے۔ (ص ۱۵۷ ج ۲)

ہیں بلکہ جاننے والے جانتے ہیں کہ فضل تو مامون الرشید کی رفاقت میں اسی زمانے سے تھا جب مامون خراسان کا حاکم بنا کر بھیجا گیا تھا اور مامون نے اسی زمانے میں سارے مہمات اسی کے سپرد کر رکھے تھے۔[1] میرا خیال ہے کہ نضر بن شمیل کے اس مشورہ کا تعلق بھی اسی زمانہ سے ہے جب مامون خراسان کا حاکم تھا۔ جس کے معنی یہی ہوئے کہ امام کی وفات کے تیس بتیس سال بعد گویا یہ حال تھا بلکہ اسی سلسلہ میں ان ہی مناقب والوں نے مشہور صوفی صافی حارث محاسبیؒ[2] کے حوالہ سے تو خود مامون الرشید کے متعلق نقل کیا ہے کہ نضر نے مامون کو بھی وہی رائے دی تھی' جو فضل کے سامنے پیش کی تھی' شاید اس کی وجہ ہو کہ ارباب خبریت کے مشورے کے بعد فضل نے نضر سے کہا تھا کہ:

> ''مامون تمہاری رائے کو اگر سن لیں گے تو ناپسند کریں گے' اور ایسی بات جس میں ان کی ناگواری ہو' میرے لئے ناقابل برداشت ہے۔'' (ص ۱۵۸ ج ۲ موفق)

معلوم ہوتا ہے کہ نضر نے فضل سے یہ سن کر خود مامون ہی کو متاثر کرنا چاہا اس میں

---

[1] دیکھئے فضل کے حالات علاوہ عام کتابوں کے تاریخ خطیب میں دراصل یہ ایرانی شاہزادوں کے خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کا باپ سہل ہی مسلمان ہو گیا تھا پھر خدا نے فضل کو وزارت مطلقہ کے عہدے تک پہنچایا۔ بڑا کریم اور جواد آدمی تھا۔ کہا کرتا تھا کہ بخل میں مجھے خدا کے ساتھ بدگمانی اور سخاوت میں خدا کے ساتھ حسن ظن کی کیفیت نظر آتی ہے۔ آخر میں بیچارہ قتل ہو گیا۔

[2] حارث محاسبی ان لوگوں میں ہیں جن کی طرف اسلامی تصوف کی بنیادی تعمیر منسوب کی جاتی ہے۔ ان کے والد بڑے دولت مند تھے۔ لیکن عقیدہ ان کا صحیح نہ تھا۔ یہ اعلان کر کے کہ دو دو دین والے باہم ایک دوسرے کے وارث نہیں ہوتے۔ ایک حبہ باپ کی دولت سے لینا گوارا نہ کیا ساری زندگی فقر و فاقہ میں گذار دی' تصوف و کلام میں ان کی معرکۃ الآراء کتابیں تھیں۔ جن کا اب پتہ نہیں چلتا' جب مرنے لگے تو اپنے اصحاب سے کہا کہ دم نکلنے کے وقت چہرے پر میرے اگر مسکراہٹ معلوم ہو تو سمجھنا کہ معاملہ ٹھیک ہوا اور نہ خیال کرنا کہ ساری زندگی اکارت گئی' لوگوں نے تبسم ہی کو دیکھا ۲۴۰ ہجری میں وفات ہوئی۔ ۱۲

شک نہیں کہ نضر کی ادبی قابلیت کی وجہ سے مامون ان کو بہت مانتا تھا اسی سے فائدہ اٹھا کر جیسا کہ حارث محاسبی کا بیان ہے نضر نے یہ تجویز ماموں کے سامنے بھی ایک دن پیش کی کہ:

''حنفی مسلک کے سارے قاضیوں کو برطرف کردیا جائے۔''

لیکن لکھا ہے کہ:

انہ ماکان یحبیبہ الی ذلک	مامون نضر کے مشورے کو قبول نہیں کرتا تھا۔
لان الغلبة بخراسان کان لا	کیونکہ خراسان میں ابوحنیفہ کے شاگردوں کا
صحاب ابی حنیفة.	اقتدار اور غلبہ تھا۔

(ص ۱۵۶ ج ۲)

اور سچ تو یہ ہے کہ ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب کی تعمیر کردہ سیرتوں کا جب یہ حال ہو کہ خطیب جیسا مورخ جو حنفی مکتب خیال کے بزرگوں کے حالات کے بیان کرنے میں بہت زیادہ احتیاط سے کام لینے کے عادی ہیں اپنی تاریخ بغداد میں مستقل سند کے ساتھ یہ روایت نقل کی ہے کہ خلیفہ ہونے کے بعد بھی مامون الرشید اپنے اسی وزیر فضل ذوالریاستین کے ساتھ مرو پہنچا۔ اس زمانہ میں مرو میں امام محمد بن حسن الشیبانی کے شاگرد ابراہیم بن رستم نے دباغوں (چمڑا پکانے والوں) کے محلہ میں قیام اختیار کر کے ان ہی دباغوں کے بچوں کو پڑھانا شروع کیا تھا جس وقت مامون مرو پہنچا تو ابراہیم بن رستم کے علم و فضل سے مرو کو معمور پایا۔ مامون نے ابراہیم کو خاص طور پر دعوت دے کر اپنے دربار میں بلایا اور بہت دیر تک باتیں کرتا رہا' قضا کا عہدہ بھی پیش کیا' لیکن ابراہیم راضی نہ ہوئے اور درس و تدریس ہی کے مشغلہ میں رہنا اپنے لئے پسند کیا لکھا ہے ایک دن فضل دباغوں کے اس محلہ میں ابراہیم کی قیام گاہ پر ان سے ملنے کے لئے آیا اس وقت وہ دباغوں کے بچوں کے پڑھانے میں مصروف تھے فضل ان کے حلقہ کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا لیکن خطیب کے الفاظ ہیں کہ:

فلم يتحرك له ولا فرق اصحابه عنه. (تاريخ بغداد ص ۷۲) نہ تو ابراہیم اپنی جگہ سے ہلے اور نہ پڑھنے والوں کو جدا کیا۔[1]

ایک صاحب جو وزیر کے ساتھ تھے اور بڑے بولنے والے تھے ان سے نہ رہا گیا۔ ابراہیم کی طرف خطاب کر کے کہنے لگے:

"ابراہیم تعجب ہے خلیفہ کا وزیر آپ کے پاس آیا ہے اور تم ان چمڑوں کے پکانے والوں کے خیال سے جو تمہارے پاس بیٹھے ہیں وزیر کی تعظیم کے لئے اٹھے بھی نہیں۔"

ابراہیم ابھی کچھ کہنے بھی نہ پائے تھے کہ حلقہ کے شاگردوں میں سے ایک شاگرد بول اٹھا۔

"ہاں! جناب ہم لوگ اب چمڑے کے دباغ نہیں ہیں بلکہ اس دین کو پختہ کر رہے ہیں جس نے ابراہیم کو اتنی بلندی بخشی ہے کہ خلیفہ کا وزیر بھی ان کے پاس آتا ہے۔"

---

[1] خلیب کی تاریخ میں اس واقعہ کو جس وقت پڑھ رہا تھا معاً سامنے ایک چشم دید منظر آ گیا خاکسار جس زمانے میں حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن قدس اللہ سرہ العزیز سے دارالعلوم دیوبند میں حدیث پڑھا کرتا تھا یہ صورت ایک دفعہ نہیں متعدد بار پیش آئی کہ حضرت حلقہ درس میں تشریف فرما ہیں اور ضلع کا انگریز کلکٹر یا کمشنر دارالعلوم کے معائنہ کے سلسلہ میں گھومتا ہوا مولانا کے حلقہ تک آتا ہے لیکن ایک دفعہ نہیں ہر بار یہی دیکھا گیا کہ مولانا نے نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھا کہ کون آیا ہے بلکہ طلبہ کی طرف خطاب کر کے فرماتے جاتے ہاں صاحب آگے بڑھیے آخر میں جب صوبہ کا گورنر جس کا نام جیمس مسٹن تھا۔ دارالعلوم کے معائنہ کے لئے آیا ظاہر ہے کہ مدرسہ کی سب سے بڑی ذمہ دار ہستی حضرت ہی تھے وہی صدر دارالعلوم اور سب کچھ تھے لیکن جب تک گورنر کا قیام مدرسہ میں رہا مولانا مدرسہ تشریف نہ لائے گھر آپ کا مدرسہ سے پانچ چھ منٹ کے راستہ پر تھا لیکن وہاں سے نہ نکلے۔ لاکھ مختلف طریقہ سے لوگوں نے آپ پر اثر ڈالا کہ ملاقات کر لینے میں کیا حرج ہے۔ فرماتے رہے کہ مجھ غریب آدمی کا گورنر صاحب سے کیا تعلق۔ ۱۲

ظاہر ہے کہ ابراہیم بن رستم کا شمار ائمہ احناف کی صف اول کے لوگوں میں نہیں ہے۔لیکن ان کا حال بھی جب یہ تھا تو اسی سے یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ امام کے وفات کے بعد ممالک عباسیہ میں بڑے بڑے قضاۃ جن میں چالیس تو وہی تھے جن کا ذکر امام کی تاریخی تقریر کے سلسلہ میں گذر چکا اور سمجھنے کے کیا معنی ان بزرگوں کے حالات تو کتابوں میں موجود ہیں میری کتاب بہت طویل ہو جائے گی۔اگر ان میں سے چند کے حالات بھی یہاں درج کرتا ہوں۔اس وقت تو صرف اجمالاً صرف ان شقاوتوں اور سعادتوں کی تصویر پیش کر رہا ہوں جن کا ایک ہی نسبت کے ساتھ خلیفہ اور امام ابو حنیفہ کے ساتھ اضافہ ہو رہا تھا ابو جعفر جس کا سب کچھ تھا آپ دیکھ رہے ہیں اس کے جانشینوں اور وارثوں کو کہ اپنے ہی ملک میں وہ کچھ نہیں کر سکتے ہیں۔

حضرت امام کا ترکہ

اور امام ابو حنیفہ غریب جن کا کچھ نہ تھا' اور جیسا کہ لوگوں کا بیان ہے کہ گو امانتیں تو امام کے پاس لاکھوں لاکھ کی وفات کے بعد نکلیں' لیکن ان کے ذاتی مملوکات کے متعلق لکھا ہے کہ:

لم یجدوا فی بیته الا مصحف القران.(ص ۱۸۱ ج۲ موفق) نہ پایا امام ابو حنیفہ کے گھر میں لوگوں نے مگر صرف قرآن کا ایک نسخہ۔

واللہ اعلم یہ روایت کہاں تک صحیح ہے' کچھ بھی ہو' ابو جعفر کے مقابلہ میں بھلا امام صاحب بے چارے کی کیا حیثیت تھی۔لیکن جس کا کچھ نہیں تھا آج اس کے جانشین ابو جعفر ہی کے ملک میں ایسے اقتدار کے مالک ہیں کہ حکومت ان کو آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکتی حالات و واقعات سے جو واقف تھے' وہ جانتے تھے کہ ان کے چھیڑنے کا مطلب یہ ہوگا ابو جعفر کے وارثوں کو حکومت ہی سے دست بردار ہونا پڑے گا۔

بہر حال کچھ بھی ہو' امام کی وفات کے کل بیس سال کے بعد یعنی ہارون الرشید کے خلیفہ ہونے کے زمانہ تک آپ عباسیوں کے قاضیوں کا رجسٹر اٹھا کر دیکھئے بغداد' بصرہ'

کوفہ، واسط، مدائن، مرو، مدینہ منورہ، مصر، خوارزم، رے، کرمان، نیشاپور، بجستان، دمشق، ترمذ، جرجان، بلخ، ہمدان، ضعا، شیراز، اہواز، تستر، اصفہان، سمرقند، ہرات، رم، اوران کے سوا ممالک محروسہ عباسیہ کے تقریباً اکثر مرکزی شہروں میں حنفی قاضیوں کو محکمہ عدالت پر قابض ودخیل پائیں گے۔[1] جن میں بعض کا تقرر ابوجعفر منصور نے بعض کا مہدی نے بعض کا ہادی نے بھی کیا تھا اور ہارون الرشید کے عہد تک تو خیر انتہا ہی ہوگئی ایسا انقلابی واقعہ پیش آیا جس کے اثرات حال حال تک باقی تھے اس انقلابی واقعہ کی تفصیل تو آگے آ رہی ہے لیکن اس سے پہلے میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ حنفی قضاۃ یا حنفیت کے آگے عباسیوں کی جبار حکومت نے فوراً ہی سرنہیں جھکا دیا تھا' ابوجعفر کے متعلق تو گذر ہی چکا کہ امام ابوحنیفہ اوران کے شاگردوں کے زورکو عراق میں توڑنے کے لئے امام مالک کے بغداد لانے کی انتہائی کوشش کی مگر ناکام واپس آیا' ابوجعفر کے بعد اس کا جانشین مہدی بھی اپنے عہد حکومت میں جہاں تک معلوم ہوتا ہے' اس کوشش سے باز نہیں آیا' امام مالک کا شاگرد بنا اوران کی اتنی عظمت کرتا تھا کہ بھرے دربار میں امام مالک کی تشریف آوری اگر کہیں ہو جاتی تو خاص طور پر بلا کر اپنے پاس بٹھاتا بلکہ ایک دفعہ تو جگہ اتنی تنگ تھی کہ مہدی اگر ایک پاؤں کو اٹھا نہیں لیتا تو جگہ نہیں نکل سکتی تھی۔ اس نے یہ بھی کیا اور امام صاحب کو ساری مجلس پر ترجیح دے کر اپنے پاس ہی بٹھایا۔ مگر آخر میں وہی بات کہ ''بغداد'' تشریف لے چلئے تو جو جواب باپ کو دیا گیا تھا وہی اس کو بھی دیا گیا شاید اس قصے کو میں نے کہیں نقل بھی کیا ہے کہ مہدی نے حضرت کی خدمت میں جو نذر پیش کی تھی۔ فرمایا کہ اشرفیاں مہدی کی دی ہوئی اپنے حال پر رکھی ہیں' چاہیں تو واپس لے جا سکتے ہیں۔ لیکن بندہ مدینہ نہیں چھوڑ سکتا۔ بلکہ اگر یہ صحیح ہے جیسا کہ متعدد کتابوں میں لوگوں نے نقل کیا ہے کہ ہارون نے بھی حضرت امام مالک کے سامنے اپنے دادا کی تجویز موطا کی عمومیت ولزوم کی پیش کی تھی اور وہی بغداد چلنے کی آرزو ظاہر کی۔ لیکن امام نے

---

[1] کچھ نہیں تو معجم المصنفین مولانا محمود حسن خاں ٹونکی میں امام کے تلامذہ کی فہرست پر ایک سرسری نظر ڈال لینے سے اس کا اندازہ ہو سکتا ہے کہ امام کے کتنے شاگرد کہاں کہاں کے قاضی تھے۔۱۲

جو جواب اس کے دادا کو دیا تھا قریب قریب ہارون سے بھی وہی فرما کر بغداد جانے سے قطعی طور پر انکار کر دیا۔ گویا اس کے یہی معنی ہوئے کہ حنفیوں کے زور کے گھٹانے کی کوششوں کا سلسلہ ہارون کے ابتدائی عہد تک منقطع نہیں ہوا تھا بلکہ ٹھیک جس سال امام ابوحنیفہ کی وفات بغداد میں ہوئی۔ یعنی ۱۵۰ھ ہجری اسی سال سفیان ثوری کے متعلق بالاتفاق لوگ جو یہ لکھتے ہیں کہ وہ کوفہ سے غائب ہو گئے اور حکومت ان کی تلاش میں سرگرداں رہی۔ ابوجعفر بھی اپنی زندگی بھر ان کا پیچھا کرتا رہا اور ابوجعفر کے بعد مہدی بھی اسی فکر میں مصروف رہا کہ کسی طرح سے وہ اس کی حکومت میں قضا کا عہدہ قبول کر لیں۔ گذر چکا کہ ایک دفعہ کسی طرح گرفتار ہو کر مہدی کے دربار میں سفیان ثوری پہنچے بھی' پروانہ تقرر بھی ان کو عطا کیا گیا۔ لیکن دجلہ میں پھینک کر پھر روپوش ہو گئے اور روپوشی ہی کی حالت میں یہ مقام بصرہ ۱۶۰ھ میں ان کی وفات مہدی کے زمانہ میں ہوئی کیا تعجب ہے کہ اس قصے کا تعلق بھی کچھ اسی واقعہ سے ہو اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس زمانے میں امام مالک کے بعد حدیث وفقہ کی جامعیت کے لحاظ سے سفیان ثوری ہی کا درجہ تھا لیکن یہ امام ابوحنیفہ کی نیت کی برکت تھی کہ ان دونوں اماموں میں سے کوئی بھی ان کے ہتھے نہ چڑھ سکا۔ سفیان ثوری سے ایک دفعہ امام اوزاعی نے پوچھا تھا کہ آخر آپ ان لوگوں سے الگ الگ کیوں رہتے ہیں۔ جواب میں فرمایا کہ:

انا لیس نقدو نضربھم فانما	ہم ان لوگوں کو مار نہیں سکتے اس لئے ان
لوادبھم بمثل ھذ الذی تری	طریقوں سے ان کو ادب سکھاتے ہیں۔

خطیب. (ص ۱۵۹ ج ۹)

مطلب وہی تھا کہ حکمرانوں کو یہ مغالطہ ہو جاتا ہے کہ خدا کی زمین پر سب سے بڑی طاقت وہی ہوتے ہیں' ساری دنیا ان کی محتاج ہو گئی اور وہ کسی کے محتاج باقی نہ رہے اسی لئے چاہتے ہیں کہ ساری دنیا ان کا احترام کرے اور ان کی نیاز مند بنی رہے۔ ان لوگوں کو یہ دکھانا چاہیے کہ خدا کے بندے کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جن کی تمہیں ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن انتہائی حقارت کے ساتھ وہ تمہیں ٹھکرا دیتے ہیں۔

بہر حال جب یہی ان کا نصب العین تھا تو وہ ان کی ملازمت کیسے قبول کر سکتے تھے اور کون کہہ سکتا ہے کہ اپنے فرار اور روپوشی میں سفیان ثوری کے سامنے خود امام ابوحنیفہ کا مسئلہ بھی نہ تھا ان بزرگوں کے درمیان اس میں کوئی شبہ نہیں کہ باہمی معاصرانہ چشمکوں کا بھی تذکرہ کیا جاتا ہے۔ لیکن ایسے واقعات ایک نہیں بیسیوں ہیں کہ باہر سے لوگ ایک دوسرے سے الگ نظر آتے تھے مگر جب وقت آتا تھا تو معلوم ہوتا تھا کہ دل سب کے ایک تھے۔[1]

ہارون الرشید کے متعلق کبری زادہ نے مفتاح السعادۃ میں یہ روایت بھی نقل کی ہے کہ امام مالک کو بغداد لانے سے مایوس ہونے کے بعد وہ واپسی میں مکہ معظمہ پہنچا اور اس زمانے میں مکہ کی علمی امامت اور ریاست جن کے ہاتھ میں تھی یعنی سفیان بن عینیہ ان سے ملا۔ ملنے کے بعد حکم دیا کہ جو کتابیں انہوں نے لکھی ہیں میرے ساتھ کر

---

[1] طبقات ابن سعد میں ابراہیم تیمی اور ابراہیم نخعی کے جن تعلقات کا تذکرہ کیا گیا ہے اسی سے اس زمانے کے حالات کا کچھ اندازہ ہوتا ہے یعنی اسی طبقات میں ایک سے زیادہ اقوال ایسے بھی نقل کئے ہیں جن سے کوفہ کے ان دونوں معاصر علماء کے درمیان معلوم ہوتا ہے کہ معاصرانہ چشمکیں چلتی رہتی تھیں لیکن باوجود اس کے یہ قصہ سننے کا ہے کہ بنی امیہ کا طافیہ حجاج جب ابراہیم نخعی کے درپے ہوا اور نخعی اس کے ظلم و زیادتی کے خوف سے روپوش تھے لکھا کہ ایک دن حجاج کے ان ہی آدمیوں نے جو ابراہیم نخعی کی تلاش میں تھے ابراہیم نخعی کے شبہ میں ابراہیم تیمی کو گرفتار کر لیا اور حجاج کے پاس یہ باور کراتے ہوئے ان کو پیش کر دیا کہ یہی ابراہیم نخعی ہیں حالانکہ ابراہیم تیمی جانتے تھے کہ اپنے متعلق اگر میں یہ کہہ دوں کہ میں ابراہیم تیمی ہوں، نخعی نہیں ہوں تو چھوڑ دیا جاؤں گا۔ لیکن وہی ابراہیم نخعی جن سے بہ ظاہر ان کے تعلقات معاصرانہ بہتر نظر نہیں آتے تھے۔ ان کو بچا لینے کے لئے آخر وقت تک وہ نہ کھلے۔ تا اینکہ حجاج نے جیل بھی بھیج دیا۔

یہ ایک ایسا جیل تھا جس میں چھت کا سایہ نہ تھا۔ کھلا میدان تھا۔ صرف چاروں طرف دیواریں تھیں۔ گرمی سردی سے بچاؤ کا کوئی سامان نہ تھا اور دو دو آدمیوں کو زنجیر میں جکڑ کر دھوپ میں ڈال دیا جاتا تھا۔ یہی سلوک ابراہیم تیمی کے ساتھ بھی کیا گیا۔ لیکن اس پر بھی بندہ خدا کی زبان پہ ایک لفظ نہیں آیا تا اینکہ ان کی وفات جیل ہی میں ہوگئی۔ ۱۲

دیں ابن عینیہ نے اپنا سارا دفتر ہارون کے لوگوں کے حوالہ کر دیا' عراق پہنچ کر جب ان کے کام کی ہارون نے جانچ کرائی تو لکھا ہے کہ نتیجہ بہت مایوس کن نکلا۔ ہارون نے بڑے افسوس کے لہجہ میں کہا۔

رحم الله سفیان تو اطاء لنافلم ننتفع بعلمه. (ص ۸۸ ج ۲)	سفیان پر خدا رحم کرے ہمارے ساتھ ہم آہنگی پر وہ آمادہ بھی ہوئے تو ان کے علم سے ہم نفع نہ اٹھا سکے۔

اور نفع کیا اٹھا سکتا تھا۔ ابن عینیہ اور ان جیسے بزرگوں کے پاس علم کا جو ذخیرہ تھا بالکل خام حالت میں تھا یعنی حدیثیں تھیں صحابہ اور تابعین کے آثار تھے' لیکن ان کو پیش نظر رکھ کر باضابطہ کسی ایسے مجموعہ قوانین کی تدوین وترتیب جو کسی حکومت کے دستور العمل بننے کی صلاحیت رکھتے ہوں یہ بات ان لوگوں کے بس کی تھی بھی نہیں یہ کام تو صرف امام ابوحنیفہ بڑی محنت سے اپنی مجلس وضع قوائین کی مدد سے انجام دیا تھا اور سچ تو یہ ہے کہ اسد بن فرات کی کوشش سے پہلے خود امام مالک کا علم بھی کچھ غیر مترتب ہی حال میں تھا جس کا ذکر اجمالاً کہیں پر میں کر بھی چکا ہوں اور اس کے صحیح تفصیل کے مقام میری کتاب ''تدوین فقہ'' ہے۔

خلافت مہدی

حضرت امام کے شاگرد

بہر حال اس ساری تفصیل سے غرض یہ ہے کہ جس اقتدار کو امام ابوحنیفہ عباسی حکومت کے شعبہ عدالت میں قائم کرنا چاہتے تھے۔ ان کی وفات کے بعد بھی پندرہ بیس سال تک حکومت اس کا اندرونی طور پر مقابلہ ہی کرتی رہی اور گو امام کی وفات کی وجہ سے جس خطرے کو ابوجعفر نے عباسی حکومت کے لئے پیدا کر دیا تھا ممکنہ حد تک امام ابوحنیفہ کے سر برآوردہ ممتاز شاگردوں کو قاضی بنا بنا کر حکومت اس خطرے کے انسداد کی

تدبیروں میں مشغول رہی جیسا کہ میں نے عرض کیا اس پندرہ بیس سال کے عرصے میں اکثر مرکزی مقامات کو امام ہی کے تربیت یافتہ قاضیوں سے بھر دیا گیا تھا۔

عہدۂ قاضی القضاۃ کا قیام

لیکن امام کی زندگی میں یہ مسئلہ جو اٹھ چکا تھا کہ عدالت کے شعبہ کو بالکلیہ اپنے اقتدار سے نکال کر اہل علم کے سپرد کر دیا جائے یعنی قاضی القضاۃ کا عہدہ قائم کیا جائے جہاں تک واقعات سے معلوم ہوتا ہے۔ اس سے حکومت کتراتی ہی رہی اور تو اور امام ابو حنیفہ کے شاگردوں میں قاضی ابو یوسف اور زفر بن ہذیل کے متعلق امام نے اپنی تاریخی تقریر میں فرمایا تھا کہ یہ ایسے دو آدمی ہیں جو صرف قاضی ہی نہیں بن سکتے ہیں بلکہ قاضیوں اور مفتیوں کی تربیت و تادیب کا کام بھی کر سکتے ہیں ان دونوں کو بھی گو حکومت نے ملانے کی کوشش امام کی وفات ہی سے شروع کر دی تھی۔

امام زفر کے سامنے عہدۂ قاضی القضاۃ کی پیش کش

لیکن امام زفر نے تو بالکلیہ حکومت کی حلقۂ ملازمت میں شریک ہونے سے انکار کر دیا، طاش کبریٰ زادہ نے لکھا ہے۔

> ''زفر کو مجبور کیا گیا کہ قضا کی خدمت کو قبول کر لیں۔ لیکن انہوں نے شدت کے ساتھ انکار کر دیا، اور روپوش ہو گئے۔ حکومت نے حکم دیا کہ ان کا گھر ڈھا دیا جائے۔ گھر گرا دیا گیا، لیکن اس کے بعد بھی وہ زمانہ تک روپوش ہی رہے۔ کچھ دن کے بعد ظاہر ہوئے اور اپنے منہدم شدہ مکان کو درست کرایا حکومت نے دوبارہ پھر ان پر اصرار کیا۔ لیکن کسی طرح راضی نہ ہوئے، آخر مجبور ہو کر ان کا پیچھا چھوڑ دیا گیا اور معافی[1] دی گئی۔ (ص ۱۱۴ ج ۲ مفتاح السعادۃ)

---

[1] اسی کتاب میں ہے کہ امام زفر کی وفات کا وقت جب آیا، احتضار کی حالت میں تھے قاضی ابو یوسف نے کہا کہ کچھ وصیت کرنی ہو تو کیجئے تو بولے گھر اور جو کچھ اس میں سرمایہ ہے یہ تو میری ←

امام ابو یوسف

لیکن ابو یوسفؒ جیسا کہ معلوم ہے حلقہ ملازمت میں داخل ہو گئے، لیکن ''قاضی القضاۃ'' کا مسئلہ قاضی ابو یوسف کی ملازمت کے قبول کر لینے کے بعد بھی ایک مدت تک سربمہر ہی رہا امام زرنجری کے اس بیان سے جسے کردری نقل کیا ہے یعنی خود قاضی ابو یوسف کہتے تھے کہ:

> ''مہدی (جو ابو جعفر کے بعد ۱۵۹ھ ہجری میں خلیفہ ہوا اس نے مجھے بغداد کے مشرقی حصے کا قاضی مقرر کیا پھر مہدی کا انتقال ہو گیا، اور میں ہادی (جو ۱۶۹ھ ہجری میں خلیفہ ہوا اس کی طرف) قاضی رہا پھر رشید (جو ۱۷۰ھ ہجری میں خلیفہ ہوا، اس نے بھی مجھے قضا پر بحال رکھا۔'' (ص ۱۴۲ ج ۲)

''اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ابو جعفر کے بعد ہی ان تینوں خلفاء کے زمانے میں ابو یوسف قاضی رہے۔ ابن سعد نے طبقات میں لکھا ہے کہ مہدی نے اپنے بیٹے ہادی کے ساتھ قاضی ابو یوسف کو خراسان بھیج دیا تھا۔[1] ہادی نے جرجان کا انتخاب اپنے قیام کے لئے کیا تھا۔ قاضی ابو یوسف جرجان میں ہادی کے ساتھ اس وقت تک رہے جب مہدی

لے بیوی کو دے دیا جائے اور تین ہزار درم ہیں یہ میرے بھتیجے کے حوالہ کر دیئے جائیں اس کے سوا نہ مجھ پر کسی کا باقی ہے نہ میرا کسی پر کچھ باقی ہے، وفات کے بعد گھر میں جو سامان تھا اس کی قیمت لگائی گئی تو تین درم سے زیادہ کا نہ ٹھیرا وہ بچہ جسے تین ہزار درم دینے کے لئے فرمایا تھا۔ یہ اسی عورت کا بچہ تھا جو ان کی بیوی تھی کیونکہ بھائی کے مرنے کے بعد انہوں نے اس سے نکاح کر لیا تھا۔ ۱۲

[1] کوئی خاص وثیقہ تو مجھے اب تک نہیں ملا ہے۔ لیکن امام ابوحنیفہ کے سب سے بڑے شاگرد جو گویا ابوحنیفہ کے خلیفہ تھے۔ مہدی کا اپنے بیٹے کے ساتھ ان کو خراسان بھیجنا ممکن ہے کہ کسی سیاسی مصلحت پر بھی مبنی ہو کیونکہ جہاں تک واقعات سے معلوم ہوتا ہے، خراسان کے مسلمانوں پر امام ابو حنیفہ کا سب سے زیادہ اثر تھا ان کے بڑے بڑے تلامذہ خراسان کے اکثر شہروں میں پھیلے ہوئے تھے قاضی ابو یوسف کی وجہ سے یقیناً ان جذبات کے دبانے میں حکومت کو مدد ملی ہوگی، جو امام ابوحنیفہ کی موت نے قدرتی طور پر لوگوں میں پیدا کر دیا ہوگا۔

کی وفات کی خبر جرجان پہنچی اور خلیفہ بن کر قاضی ابو یوسف کے ساتھ ہادی بغداد پہنچا اور بغداد کا قاضی ان کو مقرر کیا۔'' (ص ۲۴۷ ج ۷ موفق)

بہر حال کچھ بھی ہو بغداد میں ہو یا جو جان میں قاضی ابو یوسف کی حیثیت ایک معمولی قاضی سے زیادہ اس وقت تک نہ تھی جس کا مطلب یہی ہوا کہ ایک مدت تک خلفاء دوسرے قاضیوں کے تقرر یا عزل ونصب کے اختیارات کوکسی دوسرے کے سپرد کرنے پر آمادہ نہ ہوئے تھے۔ حالانکہ امام ابوحنیفہ کی آخر زندگی میں ابوجعفر ہی اس پر تیار ہو چکا تھا' بہ ظاہر اس کی وجہ وہی معلوم ہوتی ہے کہ اب تک حکومت کسی دوسرے مکتب خیال کے فقہاء کو امام ابوحنیفہ اور ان کے تیار کئے ہوئے شاگردوں کے مقابلے میں کھڑا کرنے سے مایوس نہیں ہوئی تھی۔ لیکن ہارون پر آخر میں جب ثابت ہو گیا کہ جن لوگوں کو کھڑا کر کے پبلک کے دل سے حنفی خیال کے فقہاء کی عظمت میں اضمحلال پیدا کرنا ممکن ہے وہ بغداد آنے پر آمادہ نہیں ہوتے اور جو آنا چاہتے ہیں ان میں اس نے دیکھا کہ مقابلہ کی صلاحیت نہیں ہے آخر سفیان بن عینیہ سے بڑی شخصیت اور کس کی ہوسکتی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ براہ راست اسی سے اوپر تابعین سے استفادہ کا موقعہ ان کو ملا تھا۔ امام شافعی فرمایا کرتے تھے۔

> کہ امام مالک اور سفیان بن عینیہ اگر نہ ہوتے تو حجاز کا علم دنیا کو نہ ملتا۔ (ص ۱۷۹ خطیب ج ۹)

یعنی حجاز والوں کے پاس حدیث وآثار کا جو ذخیرہ تھا وہ غائب ہو جاتا علم حدیث وآثار میں ان کا جو پایہ تھا' کہتے ہیں کہ خود ہارون الرشید بھی اس سے اتنا متاثر تھا کہ مکہ معظمہ سے جب کوئی آدمی ہارون کے پاس پہنچتا تو وہاں کے سربرآوردہ ہاشمیوں کی خیر وعافیت دریافت کرنے کے بعد پوچھتا کہ:

وما فعل سید الناس. لوگوں کے سردار کا کیا حال ہے۔

راوی نے حیرت سے پوچھا کہ آپ کے ہوتے ہوئے بھی کوئی سید الناس ہوسکتا ہے۔ ہارون نے کہا کہ سید الناس ''سفیان بن عینیہ'' ہیں خطیب ص ۱۷۹ ج ۹ لیکن بایں

ہم آپ دیکھ چکے کہ ان کے علم کے سارے طومار کو ہارون نے منگوا کر جانچنے کا حکم دیا۔ لیکن سفیان کا علم ہارون اور اس کی حکومت کے کام کا نہ تھا۔

جیسا کہ بہت سی چیزوں کے نہ ملنے پر میں نے افسوس کا اظہار کیا ہے۔ افسوس ہے کہ ان تجربات کے بعد بالآخر حکومتِ عباسیہ نے جو آخری انقلابی فیصلہ کیا۔ اس کا ذکر لوگوں نے اتنی لاپروائی کے ساتھ سرسری طور پر کتابوں میں کیا ہے کہ اگر وہ واقعہ نہ ہوتا تو شاید اس کی طرف لوگوں کی توجہ بھی نہ ہوتی اور ''قاضی القضاۃ'' کے جس عہدے کو امام ابوحنیفہ پر ابوجعفر نے پیش کیا تھا جسے دنیا اس کو بھول چکی ہے۔ اس واقعہ کو بھی شاید بھول ہی جاتی!

میرا مطلب یہ ہے کہ یوں تو ابوجعفر کے زمانے سے ہارون تک جیسا کہ گذر چکا امام ابوحنیفہ کے شاگردوں کا دارالسلطنت بغداد اور اس کے مختلف اسمات کے سوا اکثر صوبوں اور ضلعوں پر بھی حکومت مسلسل قضا کے عہدے پر تقرر کرتی چلی جاتی تھی، لیکن امام ابوحنیفہ کے سامنے سامنے ''قاضی القضاۃ'' اور اس کے اختیارات کا مسئلہ جو چھڑا تھا۔ اس بیس سال کے عرصے میں ہم اس کا ذکر کرتے ہوئے کسی کو نہیں پاتے۔ بلکہ اندرونی طور پر حکومت حنفیوں کے زور کے توڑنے ہی میں ایک طرح سے مشغول نظر آتی ہے، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حج کے جس سفر کے بعد امام مالک اور سفیان بن عینیہ کے متعلق ہارون قطعی طور پر ناامید ہو گیا، تو اس کے سوا اب کوئی صورت ہی اس کے سامنے باقی نہ رہی کہ اپنے جن دو شاگردوں کے متعلق امام ابوحنیفہ بھری مجلس میں یہ اعلان فرما کر چلے گئے کہ:

هما يصلحان لتاديب القضاة وارباب الفتوىٰ.	یہ دونوں صلاحیت رکھتے ہیں کہ قاضیوں اور فتویٰ دینے والوں کی تربیت پرداخت کریں۔

ان دونوں میں سے کسی ایک کے ہاتھ میں ''قضا اور اربابِ فتویٰ کی تادیب'' کا کام سپرد کرے امام زفر کے متعلق تو گذر ہی چکا کسی شرط پر بھی حکومت میں شریک ہونے کے لئے وہ تیار نہ ہو سکے گھر تک ان کا منہدم کرا دیا گیا۔ لیکن انکار ہی پر مصر رہے۔ اب

دوسرے قاضی ابو یوسف یعقوب ہی باقی رہ گئے تھے سلسلہ ملازمت میں وہ مہدی ہی کے زمانے سے داخل ہو چکے تھے۔[1]

خلافت ہارون الرشید

عہدۂ قاضی القضاۃ پر امام ابو یوسف کا تقرر

ہادی سے بھی جیسا کہ واقعات سے معلوم ہوتا ہے قاضی ابو یوسف کے تعلقات بہت اچھے تھے غالباً یہی وجوہ واسباب تھے کہ بالآخر ہارون کو اپنے اس مشہور تاریخی فیصلہ پر مجبور ہونا پڑا جس کا ذکر مقریزی نے بایں الفاظ کیا ہے۔

فلما قام هارون الرشید الخلافة ولی القضاء ابا — جب خلافت کی گدی پر ہارون الرشید آیا تو اس نے ابو یوسف یعقوب بن ابراہیم کے سپرد قضا

---

[1] خود قاضی ابو یوسف ہی کے حوالہ سے لوگوں نے نقل کیا ہے کہ میرا حال آخر میں جب اس نوبت کو پہنچ گیا کہ کوئی چیز جب باقی نہ رہی تو اپنے سسرالی مکان کی ایک شہتیر نکلوا کر بازار بیچنے کے لئے میں نے بھیجا' یہ بات میری خوشدامن صاحب کو جو معلوم ہوتی تو دیکھا کہ ان کے چہرے پر کافی گرانی کے آثار میں بلکہ بڑی بی اس بات میں ان سے کچھ بولیں بھی۔ شاید یہی کہا ہوگا کہ اچھی میری لڑکی کی قسمت پھوٹی' ایسے آدمی سے بیاہی گئی جو خود تو کیا کھلائے پلائے گا اب میرے گھر کی شہتیر تک بیچ بیچ کر کھانے لگا۔ کہتے ہیں کہ ساس کے اس طرز عمل سے دل پر سخت چوٹ پڑی اور بات برداشت سے باہر ہوگئی۔ اس کے بعد میں نے ''مہدی'' کی حکومت میں قضا کا عہدہ قبول کر لیا۔ گو اس میں یا کسی دوسرے واقعہ میں اس کی تصریح نہیں ہے کہ جیسے زفر پر حکومت نے قضا کا عہدہ پیش کیا تھا' قاضی ابو یوسف پر بھی پیش کیا گیا تھا یا نہیں۔ لیکن انداز سے معلوم ہوتا ہے کہ قاضی ابو یوسف بھی حتی الوسع اس تعلق سے کتراتے ہی رہے اور جس طرح ممکن ہو سکا زندگی گذارتے رہے۔ لیکن جب بات یہاں تک پہنچ گئی تب مجبوراً انہوں نے ملازمت اختیار کی۔ امام کے دوسرے شاگرد قاضی حفص بن غیاث کے حالات میں بھی لکھا ہے کہ فرماتے تھے جب مردار کا کھانا مجھ پر علال ہو گیا تب میں نے قضا کا عہدۂ قبول کیا۔۱۲

یوسف یعقوب بن ابراهیم احد اصحاب ابی حنیفة رحمه الله علیه بعد سنة سبعین ومائة فلم یقلد بلاد العراق وخراسان والشام و مصر الامن اشاربه القاضی ابویوسف.(ص ۱۸۱ جلد۴)

کو کر دیا۔ یہ ابو یوسف امام ابوحنیفہ کے شاگردوں میں تھے اور واقعہ ۱۷۰ھ کے بعد کا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عراق' خراسان' شام' مصر' میں کوئی قاضی مقرر نہیں ہو سکتا تھا۔ لیکن وہی جس کے متعلق ابو یوسف رائے دیتے۔

حافظ ابن عبدالبر کے حوالہ سے قرشی نے بھی نقل کیا ہے۔

کان الیه تولیة القضاء فی الافاق من الشرق الی الغرب.

قاضی ابو یوسف ہی کے اختیار میں تھا کہ مشرق سے مغرب تک قاضیوں کا تقرر کریں۔

(ص ۲۲۱ ج۲ جواهر)

خود اس قصے میں بھی جس کا تذکرہ میں نے حاشیہ میں کیا ہے' یعنی معاشی دشواریاں جب قاضی ابو یوسف کی اس حد کو پہنچ گئی تھیں کہ سسرالی گھر کی شہتیر فروخت کرنے پر مجبور ہونے اور اپنی خوش دامن پر ناگواری کے آثار ان کو جب محسوس ہوئے. تب غیرت دامنگیر ہوئی' کوفہ سے بغداد پہنچے خود فرماتے ہیں کہ:

''مہدی جو اس وقت خلیفہ تھا' وزیر وقت نے مجھے اس پر پیش کیا' صلوٰۃ خوف کے متعلق گفتگو ہوئی اس کے بعد مہدی نے بغداد کے مشرقی حصہ کا قاضی مجھے مقرر کیا اور ہمیں ہزار درم عطا کئے' مہدی کی وفات کے بعد میں ہادی کے ساتھ رہا ہادی کے بعد ہارون الرشید کا زمانہ جب آیا تو۔

فولانی قضاء البلاد کلها.(ص ۲۳۹ جلد۲ موفق)

اپنے سارے ممالک محروسہ کا عہدۂ قضا میرے سپرد کر دیا۔

قاضی القضاۃ کے اختیارات

بہر حال یہ تو قطعی ہے کہ ''قاضی القضاۃ'' کا عہدہ سب سے پہلے ہارون الرشید ہی کے زمانہ میں قائم کیا گیا۔ اگرچہ اس عہدہ کا خیال جیسا کہ تفصیلاً عرض کر چکا ہوں۔ ابو جعفر منصور ہی کے زمانہ میں قائم ہو چکا تھا' لیکن بجائے امام ابوحنیفہ کے سارے مورخین اس پر متفق ہیں کہ قاضی ابو یوسف کی بحالی اس عہدے پر ہوئی اور یہ بھی مسلم ہے کہ اس عہدہ کا مطلب وہی تھا جس کی تصریح مقریزی اور ابن عبدالبر نے کی ہے' گویا دوسرے معنی اس کے یہی ہوئے کہ محکمہ عدلیہ کی مطلق العنان وزارت قاضی ابو یوسف کے حوالہ کی گئی تھی' ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خود ان کے زمانہ میں لوگ ''قاضی القضاۃ'' کے ساتھ ساتھ کبھی کبھی ان کو ''وزیر'' بھی کہہ دیتے۔ ابوالولید الطیالیسی کے حوالہ سے ایک روایت موفق وغیرہ نے نقل کی ہے جس کے آخر میں ہے کہ ابوالولید نے کہا:

هذا هوالوزير وقاضی القضائة.　　یہی شخص وزیر اور قاضی القضاۃ ہے۔

(ص ۲۲۵ ج ۲ موفق)

لیکن بایں ہمہ جی چاہتا تھا کہ ہارون الرشید نے جس وقت اپنی حکومت میں اس عہدے کو قائم کیا تھا اور قاضی ابو یوسف کو بلا کر اس عہدے کی ذمہ داریاں سپرد کی تھیں۔ اس وقت کے واقعات کا مورخین اگر تفصیل سے ذکر کرتے تو مسئلہ زیادہ واضح شکلوں میں لوگوں کے سامنے آتا۔ اتنا تو معلوم ہوتا ہے کہ قاضی ابو یوسف کے غیر معمولی اعزاز اور اختیارات کو دیکھ کر ہارون سے بعض لوگوں نے جب کچھ شکایت کی تو اس نے جواب میں کہا کہ:

''میں نے یہ جو کچھ کیا ہے' جان بوجھ کر کیا ہے' کافی تجربوں کے بعد میں اس فیصلہ پر پہنچا ہوں' خدا کی قسم علم کے جس باب میں بھی اس شخص کو میں نے جانچا اس میں اس کو کامل اور ماہر پایا۔ (ص ۲۳۳ ج ۲ موفق)

درمیان میں ہارون نے اپنی طالب علمی کے زمانہ کے بعض تجربات کا بھی ذکر کیا

ہے جن سے معلوم ہوتا ہے کہ قاضی ابو یوسف کی قابلیت کی دھاک اس کے دل پر اسی زمانے سے بیٹھی ہوئی تھی آخر میں قاضی صاحب کی دینی سیرت و کردار کے متعلق جو احساس ہارون اپنے اندر رکھتا تھا اس کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے:

"علمی امتیازات کے ساتھ ساتھ میں نے مذہب میں اس شخص کے قدم کو استوار پایا ہے میں آلودگیوں سے اس کے دین کو محفوظ پاتا ہوں' آخر کوئی آدمی قاضی ابو یوسف کے جیسا ہو تو پیش کرو۔" (ص ۲۳۲ ج ۲ موفق)

محکمہ عدلیہ پر امام ابوحنیفہ کی جدوجہد کا اثر

ہارون اور قاضی ابو یوسف کے تعلقات کے بیسیوں دلچسپ قصے مزے لے لے کر لوگوں نے جو بیان کئے ہیں' ان سے بھی اور جو خصوصی مراعات دربار میں قاضی صاحب کے ساتھ کئے جاتے تھے جن کا میں نے پہلے بھی کہیں ذکر کیا ہے ان سب سے ثابت ہوتا ہے کہ قاضی صاحب نے ہارون کی طبیعت پر غیر معمولی اقتدار حاصل کر لیا تھا' بنی امیہ کے عہد میں اسی عدلیہ یا محکمہ قضا پر بے تمیزی کا ایک زمانہ وہ بھی گذرا تھا کہ قاضی کے لئے معمولی نوشت و خواند تک کو غیر ضروری قرار دیا گیا تھا چالیس چالیس مشائخ کی شہادت گذرتی تھی کہ خلفاء اور سلاطین کی ذات قانونی دار و گیر سے بالاتر ہے۔ عباسیوں کے عہد میں بھی آپ دیکھ چکے کہ قاضی شریک سے وعدہ وعید کرنے کے بعد بھی خلیفہ کی ڈیوڑھی کی ایک لونڈی کی شکایت پر قاضی صاحب عہدے سے برطرف کر دیئے گئے۔ لیکن امام ابوحنیفہ کی جدوجہد اور ان کی وفات کی خاص نوعیت کے بعد ہی اگرچہ قضا میں بہت کچھ اصلاح کے آثار نمایاں ہو چکے تھے ایک طرف حکومت بھی کافی طور پر متاثر ہو چکی تھی اور دوسری طرف ملک کے طول و عرض میں امام کے تلامذہ کے قالب میں ایسے محکم کردار اور استوار سیرت کے نمونے پھیلے ہوئے تھے کہ اب آسانی کے ساتھ حکومت من مانے فیصلے ان لوگوں سے نہیں کرا سکتی تھی جن کے ہاتھ میں فصل خصومات' عدل و انصاف کا کام سپرد کیا جا سکتا ہے' ابو جعفر منصور کے بعد ہی مہدی خلیفہ ہوا ہے اسی کے

زمانہ کا قصہ بیان کیا جاتا ہے کہ بخارا میں قاضی ابویوسف کے شاگرد مجاہد بن عمرو قاضی تھے' مہدی نے اپنا ایک خاص قاصد ان کے پاس کسی خاص غرض سے بھیجا قاضی صاحب نے جو جواب وہ چاہتا تھا' نہیں دیا' قاصد نے مہدی سے اپنی طرف سے ایک جھوٹ بات تراش کر بیان کردی' یہ قاصد بخارا کا رہنے والا تھا' جب بخارا واپس آیا قاضی مجاہد کو اس کی افترا پردازی کی خبر مل چکی تھی۔ انہوں نے افترا کا مقدمہ اس پر قائم کر کے اسی کوڑے لگوا دیئے مجاہد کے شاگردوں کو سخت تشویش ہوئی کہ مہدی کو جب اس کی خبر ہوگئی کہ قاضی نے اس کے خاص آدمی کو تازیانے لگائے ہیں تو دیکھئے اس کا نتیجہ کیا ہوتا ہے۔ لیکن موسم بدل چکا تھا لکھا ہے کہ مہدی کی جب خبر ہوئی کہ افتراء کے جرم میں قاضی مجاہد نے اس کو سزا دی ہے' تو بجائے رنجیدہ ہونے کے قاضی مجاہد کی اس جرأت سے وہ خوش ہوا اور انعام واکرام سے ان کو سرفراز کیا۔ (ص ۲۳۹ ج ۲ کردری)

مہدی کے بعد ہادی خلیفہ ہوا اس وقت بغداد کے قاضی امام ابویوسف تھے ایک باغ کے معاملہ میں خود ہادی سے کسی عامی آدمی کا جھگڑا تھا۔ پہلی بات تو یہی ہے کہ ہادی نے حکم دیا کہ مقدمہ قاضی کی عدالت میں پیش ہو۔ خلیفہ کی طرف سے بعض لوگوں نے قاضی صاحب کے اجلاس میں شہادت ایسی ادا کی کہ اس شہادت پر اگر بھروسہ کیا جاتا تو باغ خلیفہ ہی کے قبضہ میں رہ جاتا۔ قاضی ابویوسف کو تحقیق سے معلوم ہوگیا تھا کہ دراصل باغ اسی بے چارے کا ہے جس کے خلاف گواہوں نے گواہی دی ہے اس وقت ایک تدبیر ان کی سمجھ میں آئی' مقدمہ کو اس وقت تو ملتوی کردیا۔ ہادی سے ملاقات ہوئی۔ اس نے پوچھا کہیے۔ اس مقدمہ میں آپ نے کیا فیصلہ کیا جو میری طرف سے آپ کی عدالت میں دائر کیا گیا ہے' قاضی صاحب نے کہا کہ جی ہاں آپ کے گواہوں کی شہادتیں تو گذری ہیں لیکن فریق کی طرف سے مطالبہ کیا گیا ہے کہ مدعی (خلیفہ) سے اس بات پر حلف لیا جائے کہ ان کے گواہوں نے جو کچھ بیان کیا ہے۔ سچ بیان کیا ہے۔ ہادی نے پریشان ہو کر پوچھا کہ پھر آپ کی کیا رائے ہے۔ حالانکہ حنفی مذہب میں مدعی علیہ کو اس قسم کے مطالبہ کا حق نہیں ہے' خود قاضی صاحب کی رائے بھی یہی تھی۔ لیکن جواب میں

خلیفہ سے انہوں نے کہا کہ ابن ابی لیلیٰ کا فتویٰ یہی تھا' یہ سننے کے ساتھ ہی ہادی نے کہا کہ باغ اسی کے حوالہ کر دیجئے اور حلف لینے سے اس نے انکار کیا۔ (ص ۲۱۷ ج ۲ موفق)

اگرچہ یہ جزئی واقعات میں لیکن دلوں کی انقلابی کیفیت کا اس سے ضرور اندازہ ہوتا ہے مہدی ہو یا ہادی' دونوں مطلق العنان حکمراں تھے' بنی امیہ کے زمانہ کے خلفاء کی مطلق العنانیوں کے قصے ان تک پہنچے ہوئے تھے۔ لیکن آپ نے دیکھا کہ مہدی نے قانون کے نافذ کرنے پر بجائے غصہ ہونے کے قاضی مجاہد کو سراہا اسی طرح ہادی کے لئے یہی بڑی بات تھی کہ اس نے اپنا مقدمہ عدالت میں بھیج دیا اس سے بھی عجیب تر یہ ہے کہ جو چیز ایک زمانہ سے اس کے قبضہ میں چلی آ رہی تھی اس سے دست بردار ہو گیا۔

امام ابوحنیفہ کی جدوجہد کا بعد کے خلفاء کی سیرت و کردار پر اثر

اسی طرح ایک قصہ ہارون الرشید کا ہے یہ وہ زمانہ ہے کہ ابھی قاضی ابو یوسف ''قاضی القضاۃ'' نہیں بنائے گئے ہیں اور بغداد کے مشرقی سمت کے قاضی امام ابو حنیفہ کے دوسرے شاگرد حفص بن عیاث تھے۔ واقعہ کی صورت یہ تھی کہ ہارون کی شاہ بیگم زبیدہ خاتون (جو ابوجعفر منصور کی پوتی تھی) اس کا وکیل یعنی جاگیر کا گماشتہ ایک مجوسی (پارسی تھا) اس نے کسی خراسانی سے تیس ہزار درم میں چند اونٹ خریدے' لیکن دام ادا کرنے میں لیت و لعل کر رہا تھا' آخر جب کافی تاخیر ہو گئی تو خراسانی نے حفص بن غیاث کے اجلاس میں دعویٰ دائر کر دیا' قصہ تو طویل ہے حاصل یہ ہے کہ پارسی نے قاضی صاحب کے سامنے اقرار کر لیا کہ اس کے دام باقی ہیں' تب قاضی صاحب نے کہا کہ جب دام باقی ہیں تو ادا کرو۔ اس پر پارسی نے کہا میں تو زبیدہ خاتون کا وکیل ہوں مطالبہ سیدہ (زبیدہ) سے کرنا چاہیے۔ قاضی صاحب نے کہا کہ تم عجیب بے وقوف آدمی ہو

ابھی تم نے اقرار کیا کہ دام مجھ پر باقی ہیں' اور جب مطالبہ کیا جاتا ہے تو سیدہ کا نام لیتے ہو' تب مدعی یعنی خراسانی کی طرف متوجہ ہوئے اور پوچھا کہ تم کیا چاہتے ہو اس نے کہا کہ میرے دام دلائے جائیں' ورنہ اس کو قید کیا جائے۔[1] پارسی سے پوچھا گیا کہ اب تم کیا کہتے ہو' اس نے پھر وہی دہرایا کہ المال علی السیدہ یعنی زبیدہ پر دام واجب ہیں قاضی صاحب نے حکم دیا کہ اس کو جیل میں داخل کیا جائے پارسی قید ہو گیا اس کا قید ہونا تھا کہ خبر سارے شہر میں آگ کی طرح پھیل گئی۔ زبیدہ خاتون کو جس وقت معلوم ہوا کہ قاضی حفص نے یہ جانتے ہوئے کہ پارسی میرا وکیل ہے اس کو جیل دے دیا آپے سے باہر ہو گئی اپنی ڈیوڑھی کے غلام خاص جس کا نام سندی تھا حکم دیا کہ میرے وکیل کو جیل سے چھڑا کر فوراً میرے پاس حاضر کرو' سندی جیل خانہ پہنچا اس کے حکم سے سرتابی کی محال کس میں تھی آسانی کے ساتھ چھڑا کر لے آیا۔ یہ خبر قاضی حفص کو ملی یہ بھی امام ابوحنیفہ کے تربیت یافتہ قاضی تھے۔ بولے یا تو پارسی زبیدہ کا وکیل جیل واپس کیا جائے گا۔ ورنہ قضا کے اجلاس میں آئندہ میں بیٹھنے سے باز آیا۔

یہ خبر سندی کو ملی۔ اس نے خیال کیا کہ ساری مصیبت میرے سر پر ٹوٹے گی روتا دھوتا زبیدہ کے پاس پہنچا اور بولا کہ:

> ''حضور! یہ قاضی حفص کا معاملہ ہے۔ امیر المومنین (یعنی ہارون) اگر مجھ سے پوچھ بیٹھے کہ قاضی نے جسے جیل میں داخل کیا تھا۔ تو نے کس کے حکم سے اس کو جیل سے باہر نکالا تو میں کیا جواب دوں گا' میرے لئے تو قیامت ہی برپا ہو جائے گی۔''

اور گڑگڑا کر زبیدہ سے کہنے لگا کہ۔

> ''اس وقت اس پارسی کو جیل واپس کر دینے کی اجازت دیجئے' میں قاضی حفص کو سمجھا بجھا کر اس کو رہائی دلا دوں گا۔''

---

[1] قرض خواہوں کو اس کا حق اسلامی قانون میں دیا گیا ہے کہ اپنے قرض داروں کو جیل دلا سکتے ہیں۔ ۱۲

زبیدہ کو سندی بے چارے کے حال پر رحم آ گیا' اور اجازت دے دی کہ اچھا اسے جیل میں واپس کر دو۔ وہ تو خیر جیل میں پھر واپس ہو گیا۔ لیکن اتنے میں ہارون زبیدہ کے پاس آیا دیکھتے کے ساتھ ہی زبیدہ نے کہنا شروع کیا۔

"ہارون! تمہارا یہ قاضی بڑا احمق آدمی ہے' میرے وکیل کو اس نے جیل بھیج دیا۔ میری اس نے سخت تحقیر کی' میں چاہتی ہوں کہ قضاء کے عہدے سے اس کو معزول کر دو۔"

ہارون سخت کش مکش میں مبتلا ہو گیا' زبیدہ کی کبیدگی اس کے لئے ناقابل برداشت تھی آخر کچھ سوچ کر قاضی حفص کے نام حکم لکھوایا جس کا حاصل یہی تھا کہ اس پارسی کے معاملہ سے درگذر کیجئے ابھی ہارون یہ حکم لکھوا ہی رہا تھا۔ کہ قاضی حفص کے گوئندوں نے ان تک خبر پہنچائی کہ خلیفہ کا حکم اس نوعیت کا آ رہا ہے۔ قاضی صاحب نے یہ سن کر خراسانی کو کہا کہ فوراً اپنے گواہ میرے سامنے پیش کر دو تا کہ خلیفہ کے حکم کے وصول ہونے سے پہلے میں اسی پارسی پر تمہارے بقایا کا فیصلہ کر کے عدالت کی مہر لگا دوں۔ یہی کیا گیا۔ قاضی صاحب کے فیصلہ پر مہر لگ ہی رہی تھی کہ خلیفہ کا حکم لے کر آدمی قاضی صاحب کے پاس آ گیا۔ اور یہ کہتے ہوئے کہ یہ امیر المومنین کا فرمان ہے۔ لیکن قاضی حفص نے کہا کہ ٹھہرو' ایک کام کر رہا ہوں اس سے فارغ ہو جاؤں تب اس فرمان کو پڑھتا ہوں' فرمان لانے والا بار بار کہتا تھا کہ امیر المومنین کا فرمان ہے اور قاضی صاحب کہتے تھے کہ ٹھہرو میں کام سے فارغ ہو لوں۔ بہر حال اس عرصے میں باضابطہ عدالت کی مہر وغیرہ فیصلہ پر ثبت ہو گئی۔ تب فرمان لے کر قاضی صاحب نے پڑھا پڑھ کر فرمان لانے والے سے کہا کہ:

"امیر المومنین سے میرا اسلام عرض کرنا اور کہنا کہ فرمان سے پہلے میں فیصلہ کر چکا تھا۔"

فرمان لانے والے نے کہا کہ آپ نے جو کارروائی کی ہے میں اسے دیکھ رہا تھا یعنی قصداً فیصلہ سے پہلے فرمان کے لینے سے تم نے گریز کیا۔ میں امیر المومنین کے گوش

گذار اس واقعہ کو دوں گا۔ قاضی صاحب نے کہا کہ تیرے جو جی میں آئے کہہ دینا۔ آدمی ہارون کے پاس واپس ہوا اور جو واقعہ تھا اس کی رپورٹ کی اور کہہ دیا کہ قاضی نے فیصلہ کی تکمیل سے پہلے فرمان لینے سے گریز کیا۔

لیکن لوگوں کو یہ دیکھ کر حیرت ہوگئی کہ قاضی حفص کے اس طرز عمل کی خبر سے بجائے برافروختہ ہونے کے دیکھا گیا کہ ہارون ہنس رہا ہے اور صرف ہنسنے ہی بات ختم نہیں ہوگئی۔ ساتھ ہی ہارون نے حاجب کو خطاب کر کے کہا۔

"تیس ہزار درم کے توڑے ابھی قاضی حفص کی خدمت میں روانہ کرو۔"

ہارون کا وزیر یحیٰی بن خالد برمکی جو دربار میں موجود تھا اور اس کو اس کی خبر نہیں تھی کہ خلیفہ نے قاضی صاحب کو کیا لکھا تھا اس کا جواب کیا آیا۔ صرف اتنا دیکھا کہ ہارون نے تیس ہزار درم کے انعام کا حکم قاضی کے لئے دیا ہے۔ دربار سے اٹھ کر قاضی صاحب کے پاس یحیٰی پہنچا اور پوچھا کہ آج آپ نے کیا کیا جس پر امیر المومنین اتنے خوش ہوئے۔ قاضی حفص نے کہا کہ بھائی! میں نے اس کے سوا تو اور کچھ نہیں کیا ہے کہ مجوسی پر جو دعویٰ کیا گیا تھا۔ دعویٰ چونکہ صحیح تھا اس لئے مدعی کے منشاء کے مطابق میں نے فیصلہ کر دیا ہے۔ زبیدہ کو قاضی حفص اور ہارون دونوں کے طریقہ کار کی جب خبر ملی تو آگ بگولا ہوگئی۔ ہارون جب اس کے پاس پہنچا تو دیکھا کہ غصہ سے کانپ رہی ہے اور کہہ رہی ہے کہ:

"اب نہ میں تمہارے لئے ہوں اور نہ تم ہمارے لئے جب تک کہ قاضی حفص کو تم قضا سے برطرف نہیں کرتے۔"

لیکن ہارون پر بھی اس وقت خلافت کا نشہ چڑھا ہوا تھا گویا جہانگیر کی طرف نور جہاں کے متعلق یہ فقرہ جو منسوب ہے کہ اسی قسم کے ایک واقعہ میں نور جہاں سے اس نے کہا تھا کہ "جاناں بتو جان دادہ ام ایماں نہ دادہ ام" آج ہارون بھی قریب قریب ان ہی الفاظ یا ان کے مفہوم کو زبیدہ کے سامنے دہرا رہا تھا۔ زبیدہ تاڑ گئی کہ اب ناز سے کام نہیں چلے گا، اپنی سبکی اور خفت کو مٹانے کے لئے اس نے نیاز مندی سے کام لینا شروع

کیا۔ اور خوشامد برآمد کر کے ہارون کو اس پر راضی کر لیا کہ کم از کم اس قاضی کا تبادلہ کر دیا جائے۔ ہارون نے اس کو منظور کر لیا اور بجائے بغداد کے قاضی حفص اپنے وطن کوفہ کی قضا پر منتقل کر دیئے گئے۔ (خطیب ص ۱۹۲ ج ۸)

اور یہ قصے تو اس وقت کے ہیں جب تک قاضی ابو یوسف قاضی القضاۃ مقرر نہیں ہوئے تھے ان کے قاضی القضاۃ ہونے کے بعد حکومت اور قانون میں جو تعلق پیدا ہو گیا تھا۔ آج بھی ان قصوں کو سن کر حیرت ہوتی ہے۔ ایک بری رسم جس کی بنیاد بنی امیہ کے سلاطین کے زمانہ سے پڑ گئی تھی۔ آخر بتدریج اس پر قابو حاصل کرتے ہوئے اسلامی قضاۃ قوت و اقتدار کے کس مقام تک پہنچ گئے تھے اس کا اندازہ اس سے کیجئے کہ قاضی ابو یوسف نے خلیفہ کے وزیر کو مردود الشہادت قرار دیا یعنی کسی مقدمہ میں وزیر نے گواہی دی تھی۔ لیکن خلیفہ کے بعد حکومت کا جو سب سے بڑا آدمی تھا ابو یوسف کے اجلاس سے اس کو سنایا گیا کہ تمہاری شہادت قابل قبول نہیں ہو سکتی۔ وزیر اپنی اس توہین کو دیکھ کر قاضی صاحب کے اجلاس سے سیدھا خلیفہ کے دربار میں پہنچا اور قاضی ابو یوسف کے اس برتاؤ کی شکایت کی۔ کہتے ہیں کہ وزیر کی اس شکایت پر ہارون نے قاضی ابو یوسف کو بلا کر دریافت کیا کہ اس بے چارے کو آپ نے مردود الشہادۃ کیوں قرار دیا۔ روایتیں مختلف ہیں بعض کہتے ہیں کہ قاضی صاحب نے مردود الشہادۃ کیوں قرار دیا۔ روایتیں مختلف ہیں بعض کہتے ہیں کہ قاضی صاحب نے کہا کہ میں نے خود اپنے کانوں سے اس شخص کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ "میں تو خلیفہ کا عبد اور بندہ یا غلام ہوں۔"[1] اور بعض

---

[1] روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ کی خوشامدی امیروں میں کچھ یہ دستور بھی چل پڑا تھا کہ خلیفہ وقت کا اپنے آپ کو عبد اور بندہ کہتے تھے۔ دراصل یہ لوگ بے چارے خلیفہ کے بندے تو کیا ہوتے تھے۔ درحقیقت اس درم و دینار کے بندے ہوتے تھے جو خلیفہ کے خزانے میں تھے' بہر حال معلوم ہوتا ہے کہ قاضی ابو یوسف ہر اس امیر کو مردود الشہادت قرار دیتے تھے جس کے متعلق ان کو معلوم ہو جاتا تھا کہ اس قسم کے الفاظ استعمال کرتا ہے یہ تو وزیر کا قصہ ہے مناقب کی ان ہی کتابوں میں ایک فوجی افسر کے متعلق بھی لکھا ہے کہ اسی عبد الخلیفہ کے قول کی بنیاد پر اس کی شہادت قاضی ابو یوسف نے مسترد کر دی تھی۔ (۱۲۔ دیکھو موفق ص ۱۴۰ جلد ۲)

روایتوں میں ہے کہ قاضی صاحب نے اس پر یہ جرح کی کہ جماعت کے ساتھ نماز نہیں پڑھتا اور ایسے آدمی کی شہادت میں قبول نہیں کر سکتا اگر دوسرا زمانہ ہوتا تو حکومت کے وقار کے اس صدمہ ہی کا برداشت کرنا مشکل تھا' لیکن ہارون نے قاضی صاحب کے جواب کو خاموشی کے ساتھ سننے کے سوا جہاں تک راویوں کا بیان ہے' اور کچھ نہیں کہا بلکہ آگے ان ہی روایتوں میں جو اضافہ پایا جاتا ہے کہ وزیر نے اپنی ڈیوڑھی کے صحن میں مسجد تعمیر کی اور جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے کا پابند ہو گیا میں تو خیال کرتا ہوں کہ ہارون ہی کے اشارے سے اگر یہ ہوا ہو تو کچھ تعجب نہیں۔ (ص ۲۲۷ ج ۲ موفق)

قاضی کی اہم ذمہ داریاں

اور یہ تو خیر وزیر ہی کا قصہ ہے' قانون کی قوت ہارون کے زمانہ تک اس حد تک پہنچ چکی تھی کہ خلیفہ کی طرف سے نہیں بلکہ قاضی ابو یوسف کا بیان ہے کہ خود ان کی کمزوری کی وجہ سے جب اس واقعہ کا خیال آ جاتا تو تکلیف ہوتی تھی' قصہ وہ بھی ایک باغ ہی کا تھا ہارون الرشید کے قبضے میں ایک باغ تھا' قاضی ابو یوسف کہتے ہیں کہ سواد کے ایک بوڑھے کسان نے دعویٰ کیا کہ باغ اس کا ہے جس پر خلیفہ غاصبانہ قبضہ کئے ہوئے ہیں۔ یہ دعویٰ اس دن پیش ہوا جس دن خود ہارون انصاف کے لئے اجلاس کیا کرتا تھا۔ اور لوگوں کے بیانات قاضی ابو یوسف خلیفہ کے سامنے پیش کرتے تھے اسی سلسلہ میں اس بڈھے کسان نے بھی قاضی ابو یوسف کے سامنے اپنا مقدمہ پیش کیا' قاضی صاحب نے چاہا کہ بجائے ہارون کے باغ کی ملازموں کی طرف اس کے دعویٰ کو رجوع کر دیں۔ لیکن بڈھے کو اصرار تھا کہ براہ راست غصب کی یہ کارروائی امیر المومنین ہی نے کی ہے۔ قاضی صاحب نے ہارون کے سامنے یہی بیان کر دیا کہ آپ ہی پر وہ دعویٰ باغ کے متعلق کر رہا ہے اسی کے ساتھ کہا کہ حکم ہو تو سامنے حاضر کیا جائے ہارون نے کہا کہ ہاں! لائیے بڈھا سامنے آیا۔ قاضی صاحب نے پھر پوچھا کہ تیرا کیا دعویٰ ہے۔ ہارون کی نشست کرسی پر تھی بازو میں یحییٰ بن خالد برمکی وزیر دوسری کرسی پر تھا' بڈھے نے کہا کہ

امیر المومنین پر میرا دعویٰ ہے میرے باغ پر ناحق انہوں نے قبضہ کر لیا ہے' قاضی ابو یوسف نے بڈھے سے کہا کہ تیرے پاس کوئی دلیل بھی ہے گواہ پیش کر سکتا ہے؟ اس نے کہا کہ امیر المومنین سے قسم لیجئے بس یہی میری دلیل ہے' قاضی صاحب نے ہارون سے کہا کہ آپ کو قسم کھانا چاہیے ہارون نے قسم کھا کر کہا کہ میرے والد (مہدی) نے یہ باغ مجھ کو عطا کیا ہے اور اس کا میں مالک ہوں اسی بنیاد پر میں اس پر قابض ہوں' ہارون کی زبان سے قسم سن کر بڈھا یہ کہتا ہوا کہ جیسے کوئی ستو پی جائے' اس شخص نے قسم کھالی' ایک معمولی رعیت کی زبان سے یہ سن کر ہارون کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ لیکن یحییٰ بن خالد نے فوراً قاضی ابو یوسف کو خطاب کر کے کہنا شروع کیا۔

"یعقوب! اس انصاف اور عدالت کی نظیر دنیا میں مل سکتی ہے ایک معمولی رعیت کے ساتھ تم نے دیکھا امیر المومنین نے کیسا برتاؤ کیا۔

قاضی ابو یوسف نے بھی کہا' سبحان اللہ کیا کہنے مگر اسی کے ساتھ قاضی ابو یوسف نے اتنا اضافہ کیا کہ "انصاف سے چارہ بھی تو نہ تھا" اس پر یحییٰ نے کہا کہ فاروق سے اس قسم کے انصاف کی توقع کی جا سکتی ہے۔

ان دونوں کی گفتگو نے ہارون کے دل سے اس بار کو اتار دیا جو غصہ کی وجہ سے پیدا ہو گیا تھا۔ حکومت نے قانون کے سامنے اپنے آپ کو کس حد تک جھکا دیا تھا۔ یہ تو خیر بجائے خود ہے۔ میں یہ ذکر کرنا چاہتا تھا کہ قاضی ابو یوسف اس قصے کو بیان کر کے آخر میں یہ بھی فرما دیا کرتے تھے کہ:

"اس مجلس کے واقعہ کا جب کبھی خیال آ جاتا ہے۔ تو اپنے اندر سخت کوفت محسوس کرتا ہوں' اور ڈر معلوم ہوتا ہے کہ انصاف کے حق کے ادا کرنے میں مجھ سے جو کوتاہی ہوئی ہے' اس کا خدا کو کیا جواب دوں گا۔"

لوگ پوچھتے کہ آپ نے بھلا انصاف میں کوتاہی کیا کی' اس سے زیادہ آپ کے اختیار ہی میں کیا تھا۔ (یعنی ایک معمولی کسان کے مقابلہ میں دنیا کے سب سے بڑے بادشاہ کو قسم کھانے پر آپ نے مجبور کیا اور اس کو قسم کھانی پڑی) قاضی ابو یوسف جواب

میں کہتے کہ تم لوگوں نے سمجھا نہیں کہ مجھے تکلیف کس خیال سے ہوتی ہے لوگ کہتے کہ آخر اب باقی ہی کیا رہ گیا تھا جس کا آپ کو اتنا خیال ہے تب قاضی صاحب بڑے افسوس کے لہجہ میں کہتے کہ بھائی! امیر المومنین سے میں یہ نہ کہہ سکا کہ کرسی سے اتر جائے۔ جیسے آپ کا فریق زمین پر کھڑا ہے' آپ بھی زمین ہی پر کھڑے ہو جایئے۔ یا اس کے لئے بھی کرسی منگوایئے لیکن افسوس کہ میں یہ نہ کہہ سکا۔ (ص ۲۴۴ ج ۲ موفق) آپ دیکھ رہے ہیں۔ یہی قاضی ابو یوسف ہیں یا ہادی کے زمانہ میں ان ہی کا حال یہ تھا کہ ابن ابی لیلیٰ کے فتویٰ کی پناہ میں خلیفہ سے حق دار تک حق کے پہنچانے میں کامیابی حاصل کر سکے تھے' یعنی صاف صاف کھڑے الفاظ میں ہادی نے یہ کہنے کی جرأت نہ کر سکے کہ انصافاً باغ اسی کا ہے جس نے دعویٰ کیا ہے۔ لیکن رفتہ رفتہ قانون کی اقتداری قوت ہارون ہی کے زمانہ میں ارتقاء کی اس منزل تک پہنچ گئی کہ ہارون اور ایک معمولی کسان کی نشست میں مساوات کے نہ پیدا کرنے کا عمر بھر ان کو افسوس رہا ظاہر ہے کہ افسوس یا حسرت ان کے اسی توقع پر مبنی ہو سکتی ہے کہ ہارون کو اگر توجہ دلائی جاتی تو قاضی ابو یوسف کو امید تھی کہ خلیفہ اسلامی مساوات کے اس حکم کے سامنے سر جھکا دیتا۔

سچ تو یہ ہے کہ امام ابو حنیفہ کے تلامذہ نے قاضی ہونے کے بعد جس قسم کے تجربات خلفاء کو دے رہے تھے۔ ان کے بعد دلوں میں شریعت کے قوانین کا اتنا احترام اگر پیدا ہو گیا تھا تو اس پر تعجب نہ کرنا چاہیے۔ ہارون الرشید ہی کا زمانہ ہے۔ قاضی عافیہ اودی جن کا ذکر مختلف حیثیتوں سے گذر چکا ہے۔ یعنی امام ابو حنیفہ کی مجلس وضع قوانین کے مشہور رکن جن کے متعلق امام کی ہدایت تھی کہ ان کو دکھائے بغیر کوئی فیصلہ کتاب میں درج نہ کیا جائے' بہر حال یہی قاضی عافیہ بغداد کے قاضی تھے۔ کسی مقدمہ میں ایک فریق نے قاضی صاحب کے خلاف خلیفہ یعنی ہارون کے دربار میں بے جا پاس داری کی شکایت پہنچائی' شکایت کرنے والا کوئی بڑا آدمی تھا' خطیب کی روایت ہے کہ قاضی عافیہ کا یہ طرز عمل ہارون کو سخت ناگوار گذرا' اور فرمان صادر ہوا کہ قاضی صاحب کو دربار خلافت میں حاضر ہونے کا حکم دیا جائے' قاضی عافیہ حاضر ہوئے ابھی اصل معاملہ پر گفتگو کا آغاز

بھی نہیں ہوا تھا کہ اسی عرصے میں ہارون کو چھینک آ گئی۔ چھینک کا آنا تھا کہ "یرحمک الله یرحمک الله" کی دعا سے دربار گونج اٹھا' اصطلاحاً چھینک کے موقعہ پر یہ دعا جو دی جاتی ہے' اس کا نام "تشمیت" ہے جیسا کہ عام طور پر مسلمان جانتے ہیں کہ چھینک آنے کے بعد مسنون ہے کہ جسے چھینک آئی ہو وہ "الحمد لله" کہے تب چاہیے کہ سننے والے یرحمک الله (اللہ تم پر رحم کرے) کے ساتھ اس کو جواب دیں۔ لیکن ہارون نے الحمد لله نہیں کہا تھا۔ مگر دربار کے خوشامدیوں کو اس کی کیا ضرورتھی۔ امیر المومنین کی چھینک ہی رحمک الله کہنے کے لئے کافی تھی' ہارون نے دیکھا کہ سارے درباریوں نے تو تشمیت کی لیکن قاضی عافیہ چپ بیٹھے رہے۔ اس نے پوچھا کہ کیوں قاضی صاحب سبھوں نے تو تشمیت کی آپ کیوں چپ رہے بے محابا قاضی عافیہ نے جواب دیا کہ آپ نے الحمد لله کب کہا تھا۔ جو میں "رحمک الله" کہتا ساتھ ہی انہوں نے ایک حدیث بھی سنا دی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی مجلس مبارک میں دو صاحبوں کو چھینک آئی جن میں ایک صاحب کی تشمیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ والہ وسلم نے فرمائی اور دوسرے صاحب کی تشمیت نہیں کی گئی' انہوں نے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ اس شخص کو تو آپ نے رحمک الله کی دعا دی اور مجھے محروم رکھا گیا۔ جواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ والہ وسلم نے فرمایا کہ انہوں نے الحمد لله کہا تھا اس لئے ان کو رحمک الله کہا گیا۔ تم نے الحمد لله نہیں کہا میں نے بھی نہیں کہا۔ ہارون قاضی عافیہ کے جواب کو سن رہا تھا۔ بات ان کی جب ختم ہوئی۔ ہارون نے کہا کہ:

> "جایئے جایئے آپ اپنا کام قضا کا جا کر کیجئے' بھلا میری چھینک کے ساتھ جو کسی اور رعایت پر آمادہ نہیں ہو سکتا' وہ کسی دوسرے کی پاس داری فیصلہ میں کیا کرے گا۔"

یہ تو قاضی صاحب سے ہارون نے کہا اور جس شخص نے ان کی شکایت کی تھی اور درباریوں میں جن لوگوں نے اس کی حمایت کی تھی سب کی سرزنش کی گئی۔ (ص ۳۰۹

ج ۳ تاریخ بغداد)

امام ابوحنیفہ کی وفات کے بعد جیسا کہ عرض کر چکا ہوں ممالک محروسہ عباسیہ کے طول و عرض کی عدالتوں میں عموماً ان کے تلامذہ کا قضا کے عہدے پر تقرر کیا گیا تھا۔ تقریباً ہر ایک سے خلفاء کو بھی اور صوبہ کے ولاۃ و حکام کو بھی اس قسم کے تجربے آئے دن ہوتے رہتے تھے اور یہی میں کہنا چاہتا ہوں کہ اس قسم کے کردار کے وہ لازمی نتائج تھے حکومت ان لوگوں کے سامنے اگر نہ جھکتی تو کرتی کیا؟

امام ابویوسف کی کتاب ''کتاب الخراج'' کے

دیباچہ پر تبصرہ

ہارون کے عہد تک قانون اور شریعت کا پنجہ حکومت کے مقابلہ میں کتنا مضبوط ہو چکا تھا۔ قطع نظر ان تاریخی تصریحات کے میں تو کہتا ہوں کہ قاضی ابو یوسف کی مشہور کتاب ''کتاب الخراج'' کے دیباچے کی عبارت کا لب ولہجہ بھی اس کے اندازہ کرنے کے لئے کافی ہے۔ یہ تو ایسی قطعی شہادت ہے جس میں اس قسم کے شکوک وشبہات کی بھی گنجائش نہیں جو عموماً تاریخی روایتوں کے متعلق دلوں میں پیدا ہوتے ہیں یہ دیباچہ جو تقریباً سترہ اٹھارہ صفحات میں پھیلا ہوا ہے ظاہر ہے کہ سب کے نقل کرنے کی یہاں کیا گنجائش ہے لیکن مثالاً ابتداء کے چند فقروں کا ترجمہ درج کر دیتا ہوں' اندازہ کے لئے انشاء اللہ یہی کافی ہوں گے۔

یہ تو شاید لوگوں کو معلوم ہوگا کہ قاضی ابو یوسف نے ہارون کے حکم سے اس کتاب میں مال گذاری اور خراج کی تحصیل وصول و مصارف وغیرہ کے شرعی قوانین مدون کر دیئے ہیں' یہ لکھنے کے بعد کہ آپ نے مجھ سے جو یہ خواہش کی ہے کہ حکومت کی آمدنی اور اس کے مختلف اقسام کے متعلق ایک جامع کتاب لکھ دوں' اسی کی تعمیل کر رہا ہوں قاضی ابو یوسف نے ہارون کو خطاب کر کے لکھا ہے!

''امیر المومنین! خدا کا شکر ہے کہ ایک بڑی ذمہ داری آپ کے سپرد کردی گئی ہے جس کا ثواب بھی تمام ثوابوں میں بڑا ہے' لیکن اس کی سزا بھی تمام سزاؤں سے بدتر اور سخت ہے آپ کے سپرد اس امت (مسلمانوں) کے معاملات کئے گئے ہیں' آپ ذمہ دار ٹھہرائے گئے ہیں کہ خدا کی بے شمار مخلوق کے حقوق کی بنیادوں کو مستحکم کریں ان کے امین ہیں اور اس ذمہ داری کو آپ پر عائد کر کے خدا آپ کی آزمائش کر رہا ہے۔

میں یہ کہہ دینا چاہتا ہوں کہ خدا کے ڈر پر جس تعمیر کی بنیاد نہیں رکھی جائے گی' اس کے متعلق ڈرتے رہنا چاہیے کہ کس وقت قدرت اس کو اوندھے منہ گرا دیتی ہے۔

پھر بہت سی نصیحتوں کے ساتھ بیچ بیچ میں لکھتے چلے گئے ہیں۔

''قیامت کے دن وہی حکمراں سب سے زیادہ خوش بخت ثابت ہوگا جس نے اپنی رعیت کو خوش حال رکھنے کی کوشش کی دیکھئے آپ جادۂ مستقیم سے اگر ہٹے تو رعیت بھی آپ کی ہٹ جائے گی...... دنیا اور دین میں جب کش مکش کی صورت پیش آئے۔ تو چاہیے کہ آپ دین کے پہلو کو ترجیح دیں کہ وہی باقی رہنے والی چیز ہے۔

پھر قیامت کے میدان کا نقشہ پیش کر کے اور حق تعالیٰ کے جلال و جبروت کا حوالہ دیتے ہوئے ہارون کو کہتے ہیں۔

''پس چاہیے کہ خدا سے آپ کی ملاقات ایسی حالت میں نہ ہو کہ آپ ان لوگوں کی راہ پر چلے ہوں جنہوں نے اس کے مقررہ حدود کی پروا نہ کی ہر شخص کو اپنے عمل کا بدلہ ملے گا دنیا میں اس کا کیا مقام تھا اس کی پرواہ اس وقت نہیں کی جائے گی۔''

بہر حال اس قسم کی باتوں کے ساتھ ہارون سے قاضی صاحب نے مطالبہ کیا ہے کہ:

لوگوں کے متعلق آپ کو چاہیے کہ خدا کے قانون کے لحاظ سے سب برابر ہوں خواہ آپ کے قریب ہوں یا آپ سے دور ہوں ملامت کرنے والوں کی پروا نہ کرنی چاہیے۔

اور کتاب کے مضامین کے شروع کرنے سے پہلے لکھا ہے۔

آپ نے جو حکم دیا تھا میں نے اسی کے مطابق کتاب لکھ دی ہے اور آپ کے لئے ساری باتوں کی شرح جیسی کہ چاہیے میں نے کر دی ہے' اب یہ آپ کا کام ہے کہ ان کو سمجھئے غور کیجئے اور بار بار اس کا مطالبہ کیجئے۔ تا ایں کہ کتاب آپ کو یاد ہو جائے۔ میں نے آپ کی اور مسلمانوں کی بھی خواہی میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا ہے۔

عباسی شہزادوں کو فقہ حنفی کی تعلیم

سچ پوچھئے تو قاضی ابو یوسف کی کتاب الخراج اور اس کتاب کے طرز خطاب کو دیکھنے کے بعد حنفی فقہ کے مورخین کی ان روایتوں میں شک کرنے کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی جن سے معلوم ہوتا ہے کہ عباسی شہزادوں کو دوسرے علوم وفنون کے ساتھ فقہ حنفی کی باضابطہ استدلالی رنگ میں تعلیم دی جاتی تھی اور کیسی تعلیم؟ وہی نضر بن شمیل جن کا پہلے بھی ذکر آ چکا ہے' مرو پہنچنے کے بعد اور مامون جو اس زمانے میں اپنے والد ہارون کی طرف سے خراسان کے والی ہونے کی حیثیت سے مرو میں مقیم تھا اس کے دربار میں نضر نے اقتدار اور رسوخ جو حاصل کر لیا تھا اپنے اس اقتدار سے وہ چاہتے تھے کہ حکومت میں حنفی فقہ اور فقہاء کا جو اثر ہے اس کو کسی طرح ختم کر دیا جائے' مرو کے مقامی علماء کی ایک جماعت جو حنفیوں سے ناراض تھی وہ اس مہم میں نضر کے ساتھ ہو گئی تھی مامون کو حنفی فقہ کی اس مخالفانہ تحریک کا جب عالم ہوا تو اس نے خود اس مسئلہ کا فیصلہ کرنا چاہا کہتے ہیں کہ دربار میں دونوں فریق کے علماء جمع تھے' مامون نے نضر بن شمیل کی طرف خطاب کر کے پوچھا کہ حنفی فقہ کے ساتھ آخر آپ لوگوں کے اس مخالفانہ طرز عمل کی وجہ کیا ہے خود نضر تو

کچھ جواب نہ دے سکے۔ لیکن ان کے ایک ہم خیال عالم احمد بن زہیر نے عرض کیا کہ مجھے حکم ہو تو کچھ عرض کروں مامون نے کہا کہ یہی تو میں پوچھنا چاہتا ہوں' احمد بن زہیر نے وہی پرانی بات کہ ابوحنیفہ کی فقہ میں فلاں فلاں مسائل ایسے ہیں جن میں صراحۃً کتاب اللہ اور رسول اللہ ﷺ کی سنت کی مخالفت کی گئی ہے مامون نے پوچھا کہ تم نے کیسے سمجھا کہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کی ان مسائل میں خلاف ورزی کی گئی ہے احمد سے یہ کہنے کے بعد مامون نے قاضی خالد بن صبیح حنفی جو وہیں دربار میں بیٹھے تھے ان سے دریافت کیا کہ اچھا آپ بتایئے اس مسئلہ میں جس کا احمد نے ذکر کیا ہے امام ابوحنیفہ کا کیا فتویٰ ہے جو فتویٰ تھا۔ قاضی صبیح نے بیان کیا' احمد بن زہیر نے سن کر کہا کہ لیجئے اسی مسئلہ میں سنیے رسول اللہ ﷺ نے تو یہ فرمایا ہے اور ابوحنیفہ نے بالکل اس کے خلاف فتویٰ دیا ہے' احمد بن زہیر کی بات جب ختم ہوگئی تو بجائے قاضی خالد نے خود مامون احمد کی طرف متوجہ ہوا ایک ہی حدیث نہیں بلکہ لکھا ہے کہ:

جعل المامون یحتج لا بی حنیفة باحادیث لم یکن یعرفها هولاء .(ص ۵٦ ج۲ موفق)	ابوحنیفہ کی تائید میں ایسی چند حدیثیں دلیل ہیں مامون پیش کرنے لگا جن سے مخالف جماعت کے لوگ ناواقف تھے۔[۱]

---

[۱] حیرت ہوتی ہے کہ اس زمانے میں بادشاہوں اور شاہزادوں کے علم کا یہ حال تھا کہ بڑے بڑے محدثین اور فقہاء بھی ان معلومات سے محروم تھے اور یہ کیفیت تو مامون کے دینی علم کی تھی عقلی علوم وفنون سے اس کی دلچسپیوں کا جو حال تھا وہ اسی سے ظاہر ہے کہ آج ایک اقلیدس کی ایک مستقل شکل مامونی کے نام سے موسوم ہے اور کسی جگہ تو نظر سے یہ بات نہیں گذری ہے۔ لیکن "المجمع العلمی" شام کی طرف سے جو محاضرات (لکچرز) شائع ہوئے ہیں ان ہی لکچروں میں ایک لکچر میں بیان کیا گیا ہے کہ خلیفہ مامون الرشید کو علاوہ اپنی مادری زبان کے یونانی جرد (عبرانی) فارسی زبانوں میں بھی دست گاہ حاصل تھی اور دلچسپ بیان اسی محقق کا یہ بھی ہے کہ وہ ہندی (غالباً سنسکرت) زبان بھی جانتا تھا۔ (ص ۱۳۳ محاضرات المجمع العلمی دمشق الشام موفق کی اسی کتاب میں ہے کہ اپنے ایام خلافت میں مامون الرشید کا قاعدہ تھا کہ اس کے دربار میں سو آدمی ہمیشہ ایسے ہوتے تھے جن کا فقہ میں لکھ

اور ایک ہی مسئلہ نہیں بلکہ جس جس مسئلہ کے متعلق مخالف فریق کا الزام تھا کہ اس میں قرآن وحدیث کی مخالفت کی گئی ہے مامون پوچھتا تھا اور امام ابوحنیفہ کی تائید میں دلیلیں پیش کرتا جاتا تھا جب اس قسم کے مسائل کی کافی مقدار پر بحث ہو چکی تو جیسا کہ بیان کیا گیا ہے۔

فلما اکثر وامن هذا قال المامون لو وجد ناه مخالفاً لکتاب الله تعالیٰ وسنة رسوله صلی الله علیه وسلم ما استعملناه. (ص ۵٦ ج ۲ موفق)

جب اس قسم کے مسائل پر کافی بحث ہو چکی تب مامون نے کہا کہ اگر حنفی فقہ کو ہم اللہ کی کتاب اور رسول اللہ ﷺ کی سنت کے مخالف پاتے تو دستور العمل کی حیثیت سے ہم اس کو قطعاً اختیار نہیں کرتے۔

لکھا ہے کہ ان الفاظ کے بعد نضر اور ان کی جماعت کی طرف خطاب کر کے مامون نے کہا:

''خبر دار! آئندہ پھر اس قسم کی حرکت کی جرات تم میں کوئی نہ کرے اگر تمہاری جماعت میں اس وقت یہ شیخ (یعنی نضر بن شمیل) نہ ہوتے تو تم میں ہر ایک کو میں ایسی سزا دیتا جسے تم کبھی بھول نہیں سکتے تھے۔ (ص ۵٦)

بہر حال بجائے خود قصہ کی نوعیت جو کچھ بھی ہو میں تو اس نتیجے پر متنبہ کرنا چاہتا ہوں جو اس تاریخی بیان سے پیدا ہوتا ہے خیال کرنے کی بات ہے کہ مامون سے گفتگو جن لوگوں سے ہو رہی تھی ان میں نضر بن شمیل جیسے وسیع معلومات والے آدمی بھی تھے اور ان کو بھی جانے دیجئے کیونکہ ان پر حدیث وقرآن سے زیادہ ادب وشعر کا مذاق غالب تھا حیرت تو اس پر ہوتی ہے کہ احمد بن زہیر جنہوں نے اجازت لے کر مامون سے گفتگو شروع کی تھی ان کا شمار حفاظ حدیث میں ہے خطیب نے لکھا ہے کہ:

لہ پایہ بہت بلند ہوتا تھا' کوئی ان میں جب مر جاتا تھا تو اس کی جگہ دوسرے فقیہ کا تقرر کر دیا جاتا تھا۔ لیکن مسائل کی تحقیق کے وقت ثابت ہوتا تھا کہ ان تمام فقیہوں میں سب سے بڑا فقیہ خود مامون ہے۔ (ص ۵٦ ج ۲ موفق)

كان ثقة عالماً متقضاً حافظاً بصيراً. (ص ۱۶۲) | بڑے معتبر محتاط عالم اور حافظ حدیث تھے۔

علم حدیث میں ان کا جو پایہ تھا اس کا اندازہ اسی سے ہوتا ہے کہ یحییٰ بن معین اور احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہما کے ممتاز تلامذہ میں لوگوں نے ان کو داخل کیا ہے ان کی تاریخ میں ایک مشہور کتاب بھی ہے جس کے متعلق خطیب کا بیان ہے کہ:

> "میں جن کتابوں کو جانتا ہوں ان میں تاریخ کی اس کتاب سے جسے اس شخص نے تصنیف کی ہے کوئی ایسی دوسری کتاب ان فوائد پر مشتمل نہیں پائی جو اس کتاب کی خصوصیت ہے۔ (ص ۱۶۲ ج ۴)

مگر آپ دیکھ رہے ہیں کہ فقہ حنفی کے مسائل جن آثار و احادیث پر مبنی ہیں مامون الرشید کو جن کی تعلیم دی گئی تھی۔ ان سے ابن زہیر بھی واقف نہ تھے اور یہی میرا مطلب تھا۔ اس دعویٰ سے کہ فقہ حنفی کی عباسی شاہزادوں کو باضابطہ دلائل و وجوہ کے ساتھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تعلیم دی جاتی تھی۔ اس سلسلہ میں موفق وغیرہ نے بعض دوسری روایتیں بھی نقل کی ہیں لیکن میں ان کو نظر انداز کرتا ہوں۔

حقیقت یہ ہے کہ حضرت امام نے اپنے بعد اپنی مدونہ فقہ اور اس فقہ کے جاننے والوں کی جو جماعت چھوڑی تھی ان سے حکومت کو مسلسل ایسے تجربات ہی ہو رہے تھے کہ قدرتاً ان تعلقات کا پیدا ہو جانا ضروری تھا جو اس فقہ کے ساتھ عباسی حکومت کے قائم ہو گئے تھے ایک طرف امام کے تلامذہ کے تجربات کی وہ نوعیت اور دوسری طرف اسی عباسی حکومت اور اس کے حکمرانوں میں دوسرے طبقات کے علماء اور فقہاء کے متعلق ایسے احساسات جب پیدا ہو رہے تھے جن کا ایک مشہور نمونہ خود ہارون الرشید کے عہد کا یہ ہے۔

امام ابویوسف کی وفات

قاضی ابو یوسف کا جب انتقال ہو گیا تو سوال پیدا ہو کہ قاضی القضاۃ کا جو عہدہ حکومت میں قائم ہو گیا ہے۔ اس پر کس طبقہ کے عالم کا تقرر کیا جائے قاضی ابو یوسف نے قدرتی طور پر سارے ممالک عباسیہ کی عدالتوں کو اپنے ہم مشرب علماء یعنی حنفی فقہاء کے قاضیوں سے بھر دیا تھا' گو خود ہارون فقہ حنفی اور حنفی فقہاء سے متاثر ہو چکا تھا اور اس سے زیادہ اس کے تاثر کا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے کہ اس نے اپنے شاہزادے مامون کو ضابطہ فقہ حنفی کی ایسی تعلیم دلائی تھی کہ بڑے بڑے محدثین کے علم پر مامون کے معلومات برتری حاصل کئے ہوئے تھے۔ لیکن پھر بھی بہ ظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک ہی طبقہ اور جماعت کا حکومت میں اتنا غیر معمولی اقتدار ہارون کو سیاسی مصالح کے خلاف معلوم ہوا[1] قاضی ابو یوسف کی زندگی تک تو خاموش رہا۔ لیکن ان کی وفات کو ایک مغتنم موقعہ خیال کر کے ایک ایسے عالم کا اس عہدے کے لئے اس نے انتخاب کیا' جس کا نسلی طور سے خاندان قریش سے تعلق تھا۔

قاضی القضاۃ کے عہدہ پر قاضی وہب کا تقرر

میرا اشارہ قاضی وہب بن القرشی کی طرف ہے جو اپنی کنیت ابوالبختری کے نام سے عام طور پر مشہور ہیں۔ خطیب نے بھی اور حنفی طبقات کے مورخین نے بھی اس کی تصریح کی ہے کہ:

---

[1] خود برامکہ کے ساتھ ہارون نے آخر میں جو سلوک کیا' بازاری گپوں کو تو جانے دیجئے' لیکن اصلی راز اس کا بھی وہی تھا کہ حکومت کے ہر شعبہ پر آل برامکہ کا چھا جانا ہارون کو ایک خطرہ کی بات معلوم ہوئی۔ ۱۲

كان الرشيد ولى ابا البختری وهب بن وهب قضاء القضاة بغداد بعد ابی یوسف.	ہارون رشید نے ابوالبختری وہب بن وہب کا قاضی القضاۃ کے عہدے پر ابویوسف کے بعد تقرر کیا۔

(ص ۱۸۹ ج۸ موفق)

قاضی وہب کی پستی کردار

مگر اس قریشی قاضی سے ہارون کو جو تجربات ہوئے' آج تک تاریخ کے اوراق میں وہ محفوظ ہیں ایک دفعہ نہیں متعدد مواقع ایسے پیش آئے ہیں کہ ہارون کسی کام کو کرنا چاہتا تھا لیکن اس کے جواز عدم جواز میں اس کو شبہ تھا۔ قاضی وہب نے ہر موقعہ پر یہ حرکت کی کہ اسی وقت اپنے دماغ سے تراش کر ایسی حدیث ہارون کو سنا دی' جس سے اس فعل کا جواز ثابت ہوتا ہو' لکھا ہے کہ ہارون مدینہ پہنچا' جیسا کہ اس زمانے کا دستور تھا' خطبہ اور امامت کا کام خلفاء بھی انجام دیا کرتے تھے منبر نبوی پر خطبہ دینے کے لئے جب ہارون چڑھنے لگا تو معاً اس کو خیال آیا کہ درباری رنگ سیاہ کپڑوں کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کے منبر مبارک پر چڑھنا شاید مناسب نہ ہو وہ رک گیا۔ قاضی وہب نے معاً ایک حدیث گھڑ کر سنا دی کہ:

> "جبرئیل رسول اللہ ﷺ پر نازل ہوئے اس وقت جبرئیل کے جسم پر سیاہ قبا تھی۔ کمر میں پٹکا اور ٹپکے میں خنجر تھا۔" (ص ۴۵۲ ج ۴)

گویا جس لباس میں ہارون اس وقت تھا' قاضی وہب نے باور کرایا کہ یہ لباس تو جبرئیل کا تھا' ہارون جو خود بھی حدیثوں سے کافی واقفیت رکھتا تھا۔ دل میں سمجھ تو گیا کہ قاضی نے محض میرے خاطر یہ حدیث گھڑی ہے' لیکن اس وقت خاموش ہو گیا' کچھ دن بعد ہارون بغداد میں کبوتر اڑا رہا تھا۔ اتنے میں قاضی وہب بھی آ گئے' ہارون نے پوچھا کہئے کبوتر بازی کے متعلق بھی کوئی روایت آپ کے علم میں ہے۔ بے محابا اس شخص نے کہنا شروع کیا کہ:

"مجھ سے ہشام بن عروہ نے یہ روایت بیان کی ہے کہ ہشام سے ان کے والد عروہ روایت کرتے تھے کہ عائشہ صدیقہ نے ان سے یہ بیان کی کہ رسول اللہ ﷺ بھی کبوتر بازی فرماتے تھے۔ (ص ۴۵۳)

اس وقت ہارون آپے سے باہر ہوگیا اور کہا کہ:

"نکل جا میرے سامنے سے اگر تیرا خاندانی تعلق قریش سے نہ ہوتا تو تجھے میں معزول کر دیتا۔"

بسا اوقات ایسی صورتیں بھی پیش آئی ہیں کہ وقتی ضرورت سے قاضی وہب کوئی حدیث گھڑ کر بیان کر دیتے۔ لیکن "دروغ گورا حافظہ نہ باشد" بھول جاتے ہارون نے اس سلسلہ میں ان کی گرفت بھی کی' آخر شرمندہ ہونا پڑا!!

بہر حال قاضی ابو یوسف کے بعد ایک غیر حنفی قاضی القضاۃ کا تقرر کر کے ہارون الرشید بے چارے پر جو اثر مرتب ہو سکتا تھا وہ ظاہر ہے حنفی قضاۃ جو اولاً زور زبردستی سے عہدہ قبول کرتے تھے اور جب قبول کر لیتے تو اپنے کردار اور سیرت کے وہ نمونے پیش کرتے تھے جن کا ذکر قاضی عافیہ' قاضی حفص بن غیاث وغیرہ کے سلسلہ میں گذر چکا' اور دوسری طرف غیر حنفی قضاۃ کے متعلق حکومت کے سامنے یہ شہادتیں پیش ہو رہی تھیں جن کی ابتداء حجاج بن ارطاۃ سے ابوجعفر منصور کے زمانے میں ہوئی اور اختتام ان تجربات کا اسی قاضی وہب بن وہب پر ہوا جس پر خود اس کی زندگی میں ساری علمی دنیا کی طرف سے ملامت کے تیروں کی بارش ہو رہی تھی۔ انتہا یہ تھی کہ حضرت امام احمد بن حنبل کے متعلق لوگوں کا بیان ہے کہ اپنی فطرت نرم مزاجی کی وجہ سے صراحۃً کسی کو "کذاب" نہیں فرمایا کرتے تھے۔ لیکن قاضی وہب کی جرأت کذب بیانی میں اس حد کو پہنچ گئی تھی کہ حضرت والا بھی اس کو رجل کذاب (سخت جھوٹا آدمی) فرمایا کرتے تھے۔ قاضی وہب کا وطن مدینہ منورہ تھا لکھا ہے کہ بغداد سے رخصت لے کر جب کبھی مدینہ منورہ جاتے تو اپنی عام بدنامی اور شرم کی وجہ سے باہر نہیں نکلتے۔ امام مالک نے ایک دن فرمایا بھی شاید کسی وجہ سے وہ اس مجلس میں موجود تھے کہ:

"بعض لوگوں کا یہ کیا حال ہے کہ مدینہ سے باہر جا کر لوگوں کو باور کراتے پھرتے ہیں کہ مجھ سے مدینہ کے عالم جعفر بن محمد یا ہشام بن عروہ نے یہ بیان کیا وہ بیان کیا۔ لیکن جب مدینہ آتے ہیں تو گھر میں چھپ کر بیٹھ جاتے ہیں۔ (ص ۴۵۵ خطیب ج ۱۴)

ایک اہم آزمائشی مقابلہ

واقعہ یہ ہے کہ حضرت امام کی وفات کے بعد جہاں ان کے تلامذہ کے ایک طبقہ نے حکومت کے محاکم عدل کی ملازمتوں کو قبول کر لیا تھا۔ جن میں بعض تنخواہ لیتے تھے اور بعض ایسے بھی تھے جو بغیر کسی تنخواہ کے کام کرتے تھے مثلاً حضرت عبداللہ بن مسعود کے پوتے قاضی قاسم بن معن بن عبدالرحمٰن بن عبداللہ بن مسعود کے متعلق لکھا ہے کہ:

كان قاضيا بالكوفة ولا يا خذ اجرا. (ص ۴۱۲ جواھر) وہ کوفہ کے قاضی تھے لیکن قضا کی تنخواہ نہیں لیتے تھے۔

اور ایک بڑا طبقہ ان لوگوں کا بھی تھا جنہوں نے حکومت کے اصرار شدید پھر بھی اپنے استاذ ہی کے طریقہ کو اختیار کیا' ہم آئندہ ان کا کچھ تذکرہ بھی کریں گے۔

امام محمد

ان ہی لوگوں میں امام محمد بن حسن الشیانی بھی تھے ایک زمانہ تک ملازمت سے یہ کنارہ کش رہے اور اپنا سارا وقت امام کی مجلس کے مدونہ قوانین کی تہذیب و ترتیب و بتویب میں خرچ کرتے رہے۔ لکھا ہے کہ سارے مسائل اور قوانین کو امام محمد نے چھوٹی بڑی ہزار کتابوں پر تقسیم کر کے مرتب کیا۔ اور اس وقت فقہ کی کتابوں میں کتاب الطہارت کتاب الصلوٰۃ وغیرہ وغیرہ کے نام سے جو کتابیں پائی جاتی ہیں۔[1] نیز یہ امام محمد

---

[1] امام محمد کے حالات میں لکھا ہے کہ آپ نے دس رومیات (یورپین) عورتوں کو جو شرعی کنیز ہونے کی حیثیت رکھتی تھیں عربی زبان اور کتابت کی تعلیم دی تھی اور ان کی تدوین و ترتیب کے کام میں ان کا ہاتھ بٹاتی تھیں دیکھو کردری ص ۱۶۳ ج ۲۔۱۲

ہی کی کتابوں کی یادگار ہے۔ لیکن ان کتابوں کی ترتیب وتہذیب سے فارغ ہونے کے بعد زندگی کے آخر دنوں میں ہارون الرشید کے محبوب و پسندیدہ شہر رقہ[1] کی قضاءت کا عہدہ انہوں نے قبول کرلیا تھا۔[2]

یحییٰ بن عبداللہ کی مہم

اسی زمانے میں جب امام محمد رقہ کے قاضی تھے حکومت عباسیہ کے لئے ایک نئے خطرے نے ویلم کے کوہستانوں سے سر اٹھایا' قصہ تو طویل ہے حاصل یہ ہے کہ محمد نفس زکیہ کے ایک بھائی جن کا نام یحییٰ بن عبداللہ بن حسن بن حسن بن علی علیہم السلام تھا' یہ نفس زکیہ کی مہم کی ناکامی کے بعد مختلف علاقوں میں روپوش ہوتے ہوئے بالآخر ویلم پہنچے اور

---

[1] یہ ساحل فرات کا ایک شامی شہر ہے حلب سے چار دن کی راہ پر واقع تھا۔ ابن حمر نے لکھا ہے کہ فرات کے بائیں طرف جانب جنوب لب دریا اس کا محل وقوع تھا' تجارت کا بڑا مرکز تھا' حران رہا اس رقہ کے مفصلاتی شہر تھے۔ طبری نے لکھا ہے کہ بغداد میں ہارون کی طبیعت اچھی نہیں رہتی تھی۔ حتیٰ کہ اسی وجہ سے اپنے دادا کے بسائے ہوئے اس شہر کو وہ ''بخار'' کہتا تھا۔ ص۱۵ ج ۱۰۔ اسی لئے زیادہ تر ہارون رقہ ہی میں رہتا تھا' بعضوں نے اس کی شکایت بھی کی تو معذرت کرتے ہوئے اس نے کہا کہ بلاشبہ بغداد میرے باپ دادا کی جگہ ہے اور مجھے اس سے نفرت نہیں ہے۔ لیکن میں نے شام کے قریب رقہ کو اس لئے پسند کیا ہے کہ شام ہی میں بنی امیہ کے شجر ملعونہ کی جڑ ہے' نیز اس ملک اور اس کے اطراف میں چوروں ڈاکوؤں کی کثرت ہے ص۷۹ طبری بہر حال ہارون الرشید کے عہد میں رقہ کو چونکہ بہت اہمیت حاصل ہوگئی تھی اس لئے خصوصی طور پر اس شہر کا قاضی بھی ہارون نے ایک ایسے شخص کو مقرر کیا جن کا درجہ علم و فضل اور تمام دوسرے مقامات میں قاضی ابو یوسف کے بعد امام کے شاگردوں میں دوسرے درجہ پر تھا۔۱۲

[2] بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ہارون نے رقہ کی قضاءت پر جب ان کا تقرر کرنا چاہا تو آپ نے انکار کیا قاضی ابو یوسف زندہ تھے انہوں نے ان کو وسیلہ بنا کر کوشش کی کہ اس جھگڑے سے حکومت انہیں آزاد ہی رکھے لیکن بات سنی نہیں گئی مجبوراً قبول کرنا پڑا۔۱۲

بتدریج ایک ایسا اقتدار اس علاقے میں یحییٰ بن عبداللہ نے حاصل کر لیا کہ عباسی حکومت اب ان سے اغماض اختیار نہیں کر سکتی تھی ان کی قوت و طاقت کی جو خبریں ہارون الرشید تک پہنچائی گئی تھیں، طبری نے لکھا ہے کہ ہارون ان سے اتنا متاثر ہوا کہ اس زمانے میں اس نے نبیذ کا استعمال تک ترک کر دیا تھا اور سخت فکر میں مبتلا ہو گیا۔ بالآخر پچاس ہزار کی ایک فوج دے کر فضل بن یحییٰ برمکی کو یحییٰ بن عبداللہ کے مقابلہ کے لئے اس نے روانہ کیا۔ فضل بجائے لڑائی بھڑائی کے صلح جوئی کی تدبیروں سے کام لینے لگا۔ ویلم کے بڑے بڑے لوگوں میں کافی روپیہ اس نے تقسیم کیا اور یحییٰ بن عبداللہ سے خط و کتابت کر کے اس نے ان کو راضی کر لیا کہ خود ہارون الرشید اپنے ہاتھ سے امان نامہ لکھ کر میرے پاس اگر بھیجے گا تو میں اپنے آپ کو ہارون کے حوالہ کر دوں گا فضل نے ہارون کو اس شرط سے مطلع کیا، دل کی یہی مراد تھی۔

ہارون کا امن نامہ

اسی وقت ہارون نے امان نامہ لکھا اور بڑے بڑے علماء اور قاضیوں کے سوا بنی ہاشم کے سر برآوردہ بزرگوں کے دستخطوں سے مزین کر کے بیش بہا تحفوں اور ہدایا کے ساتھ اس امان نامہ کو فضل کے پاس روانہ کر دیا۔ یحییٰ بن عبداللہ نے حسب وعدہ اپنے آپ کو فضل کے حوالہ کر دیا اور فضل جیسا چاہیے تھا انتہائی اکرام و تعظیم کے ساتھ اپنے ساتھ لئے ہوئے ہارون کی خدمت میں حاضر ہو گیا بڑی گرم جوشی سے ہارون بھی حضرت یحییٰ بن عبداللہ سے ملا اور ان کے رہنے سہنے کا بہترین انتظام اس نے کر دیا۔ طبری نے لکھا ہے کہ ان کی ساری ضرورتوں کی براہ راست ہارون خود نگرانی کرتا تھا اور جو وعدہ اس نے کیا تھا اسے پورا کرتا رہا۔

امن نامہ کی خلاف ورزی کے لیے شرعی حیلے

لیکن بعض دراندازوں کی درااندازیوں سے متاثر ہو کر ہارون کی طبیعت حضرت یحییٰ کی طرف سے بتدریج بدل گئی پھر ان کے ساتھ اس نے کیا کیا بڑی طویل داستان سے میری غرض کا صرف اس جزء سے تعلق ہے جس کا ذکر علاوہ حنفی مورخین کے طبری نے بھی اپنی تاریخ مین کیا ہے:

امام محمد کی طلبی اور امن نامہ کے متعلق استفسار

ہوا یہ کہ جب رفتہ رفتہ ہارون کی سور مزاجی حضرت یحییٰ سے بڑھتے ہوئے اس حد تک پہنچ گئی کہ اس کے لئے نا قابل برداشت ہوگئی اور وہ امن نامہ کی خلافت ورزی کر کے ان کے قتل پر آمادہ ہو گیا چاہتا تو اپنے اس ارادہ کو یوں بھی پورا کر سکتا تھا' لیکن دین کا خیال یا خلق اللہ کی رسوائی کا خیال کر کے شرعی حیلہ کے نیچے پناہ لینے کے لئے اس نے فقہاء اور قضاۃ کو طلب کیا' واقعہ غالباً رقہ ہی کا ہے جہاں کے امام محمد قاضی تھے اور شاہی کیمپ کے ساتھ قاضی القضاۃ وہب بن وہب بھی وہیں موجود تھے۔ بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے امام ابو حنیفہ کے ایک اور شاگرد قاضی حسن بن زیاد بھی اس مجلس میں بلا لئے گئے تھے۔ لیکن طبری کی روایت میں حسن بن زیاد کا ذکر نہیں ہے بہ ظاہر وہاں ان کے رہنے کی کوئی وجہ بھی نہیں معلوم ہوتی۔

امام محمد کا جواب

بہر حال طبری نے جعفر بن یحییٰ برمکی ہارون الرشید کے مشہور وزیر کے حوالہ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ:

''ہارون نے یحییٰ بن عبداللہ کو اس امان نامہ کے ساتھ جو ان کو لکھ کر دیا گیا

تھا' طلب کیا اور محمدؒ بن حسن کو پہلے خطاب کر کے اس نے پوچھا کہ کیا یہ امان نامہ جو اس شخص کو لکھ کر دیا گیا ہے صحیح ہے؟ (یعنی مجھ پر اس کی پابندی کیا ضروری ہے؟) امام محمد نے کہا کہ اس کے صحیح ہونے میں کیا شبہ ہے؟ یقیناً صحیح ہے۔ تب ہارون ان سے جھگڑنے لگا۔

بہ ظاہر معلوم ہوتا ہے کہ یحییٰ بن عبداللہ کے گذشتہ باغیانہ طرز عمل کو پیش کر کے ان کو مجرم قرار دینا چاہتا تھا غالباً اسی کا جواب تھا جو امام محمد نے ہارون سے کہا۔

''میں پوچھتا ہوں کہ حکومت سے باغی ہو کر جس نے جنگ کی ہو' لیکن بعد کو تائب ہو جائے اور اسے امن دیا جائے تو کیا وہ مامون و محفوظ نہیں ہو جائے گا۔''

مطلب یہی تھا کہ امان نامہ کے بعد اگر عہد کی خلاف ورزی یحییٰ بن عبداللہ سے ہوئی ہو تو بے شک اس وقت گنجائش پیدا ہوتی ہے لیکن امان نامہ سے پہلے کی باتوں کو الزام قرار دینا صحیح نہ ہوگا۔

قاضی وہب کا جواب

طبری کا بیان ہے:۔

''تب امام محمدؒ سے رخ پھیر کر ابوالبختری یعنی قاضی القضاۃ وہب بن وہب کی طرف ہارون متوجہ ہوا اور اسی سوال کو ان پر پیش کیا۔''

قاضی وہب جیسے آدمی تھے وہ اپنے آپ کو شریعت کا نہیں بلکہ ہارون کا ملازم سمجھتے تھے انتہائی بے شرمی کے ساتھ اس شخص نے کہنا شروع کیا کہ:

''یہ امان نامہ مختلف وجوہ سے ٹوٹ چکا ہے جس کی یہ وجہ ہے۔ یہ وجہ ہے۔''

طبری میں تو صرف اسی قدر ہے لیکن حنفی مورخین نے لکھا ہے کہ:

''قاضی وہب نے اپنے موزے سے ایک چاقو نکالا اور امان نامہ کو اسی سے چاک کر کے کہنا شروع کیا کہ یہ امان نامہ منسوخ ہو چکا ہے۔''

اور ہارون کو خطاب کر کے کہا کہ:

''آپ اس شخص کو قتل کر دیجئے اس کے خون کو میں اپنی گردن پر لیتا ہوں۔''

طبری نے لکھا ہے کہ ہارون نے۔

''قاضی وہب سے یہ سن کر کہا کہ آپ قاضی القضاۃ ہیں آپ ہی اس مسئلہ کو زیادہ جان سکتے ہیں اس کے بعد قاضی نے امان نامہ کو چاک کر دیا اور اس پر تھوک ڈال دیا۔[1] (ص ۵۷ ج ۱۰)

امام محمد پر ہارون کا عتاب

واللہ اعلم حنفی مورخین کا یہ بیان ہے کہاں تک صحیح ہے کہ ہارون نے اس کے بعد امام محمد کو غصہ کی نگاہ سے دیکھا اور کہا کہ:

''تم ہی جیسے لوگوں سے شبہ پاپا کر یہ لوگ بغاوت پر آمادہ ہوتے ہیں۔''

اور آپے سے باہر ہو کر لکھا ہے کہ دوات جو سامنے رکھی ہوئی تھی اٹھا کر امام محمد کے منہ پر ہارون نے دے ماری جس سے ان کا چہرۂ زخمی ہو گیا۔ (ص ۱۶۴ ج ۲ کر)

لکھا ہے کہ امام محمد مجلس سے اٹھ کر چلے گئے ان کے ساتھ ان کے شاگرد رشید محمد بن سماعہ بھی ساتھ تھے ان کا بیان ہے کہ میں نے دیکھا امام محمد چلتے ہوئے روتے جاتے تھے، میں نے عرض کیا کہ اللہ کی راہ میں اگر مجروح ہوئے ہیں تو کیا یہ رونے کی بات ہے جواب میں امام محمد نے کہا۔

---

[1] لکھا ہے کہ قاضی وہب نے جس وقت یہ فتویٰ دیا تو یحییٰ بن عبداللہ نے ہارون سے کہنا شروع کیا امیر المومنین یہ شخص جس کا باپ مدینہ میں طبال تھا یعنی طبلچی تھا آپ اس کے فتویٰ پر عمل کرتے ہیں ذرا اس کی پیٹھ کھول کر دیکھئے (کوڑوں) کے نشانوں سے بھری ہوئی ہے مدینہ کے حمام کے سارے والا ک اس سے واقف ہیں اور اس وقت کرۂ زمین کا جو سب سے بڑا فقیہ ہے اس کے فتویٰ سے اعراض کرتے ہیں۔۱۲

''میں اپنی چوٹ کی وجہ سے نہیں رو رہا ہوں بلکہ اپنی اس کوتاہ ہمتی پر رو رہا ہوں کہ قاضی القضاۃ جس وقت یہ باتیں بنا رہا تھا اور جن وجوہ سے دعویٰ کر رہا تھا کہ یہ امان نامہ منسوخ اور مسترد ہو چکا ہے، مجھ میں اس کی ہمت کیوں نہ ہوئی کہ اس سے میں اس دعویٰ کے دلائل پر بحث کرتا، میں اپنی اس (بزدلی) کی خاموشی پر رو رہا ہوں۔'' (ص ۱۶۴ ج ۲ کر)

جہاں تک واقعات سے معلوم ہوتا ہے، گو ہارون نے امام محمد کی رائے تسلیم نہیں کی اور وہب ہی کے فتویٰ کو اس نے سراہا لیکن قتل کرنے کی ہمت امام محمد کے اختلاف کی وجہ سے اس کو نہ ہو سکی۔ خطیب نے ہارون کے یہ الفاظ بھی نقل کئے ہیں کہ:

''خدا کی قسم اگر میرے نزدیک اس شخص کا قتل جائز ہوتا تو میں ضرور اس کی گردن اڑا دیتا۔ اور میں قسم کے ساتھ یہ بھی کہتا ہوں کہ میں نے نہ اس شخص کو خود زہر پلایا ہے اور نہ کسی دوسرے سے پلوایا ہے۔'' (ص ۱۱۱ ج ۱۴)

اور اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ بہ ظاہر ہارون نے جس طرز عمل کا بھی اظہار غصہ میں کیا ہو لیکن عمل اس نے امام محمد ہی کی رائے پر کیا۔

بلکہ ان ہی یحییٰ بن عبداللہ اور عبداللہ بن مصعب کے ساتھ ہارون ہی کے دربار میں اس واقعہ کے بعد جو صورت پیش آئی جس کا حاصل یہ ہے کہ عبداللہ بن مصعب نے حضرت یحییٰ پر بعض رکیک الزامات لگائے یحییٰ بن عبداللہ نے ان کا انکار کیا۔ آخر میں قسم تک بات پہنچی ہارون نے عبداللہ کو اس قسم پر مجبور کیا جس کا یحییٰ نے مطالبہ کیا تھا۔ اکثر مورخین نے لکھا ہے کہ ابن مصعب اس قسم کے بعد اسی دن یا تیسرے دن مر گیا الخطیب کا بیان ہے کہ قسم کے اس فوری اثر کا خیال ہارون کو جب کبھی آ جاتا تو کہتا کہ:

لا الہ الا اللہ ابن مصعب سے یحییٰ کا بدلہ کتنا جلد لیا گیا۔

(ص ۱۱۲ ج ۱۴)

کہتے ہیں کہ دربار سے ابن مصعب گھر جا رہا تھا گھوڑے سے گرا اور مر گیا، بعض کہتے ہیں کہ فالج کا حملہ ہوا اور کئی دن بعد مر گیا۔

قاضی وہب کا انجام

اور عجیب بات یہ ہے کہ قاضی وہب بن وہب کے متعلق بھی یہی لکھتے ہیں کہ:

سقط ومال۔ (ص ۴۵۴ خطیب)	گرا اور ایک طرف جھک گیا۔

اگر چہ قاضی وہب بن وہب کے سن وفات میں مورخین کی مختلف رائیں ہیں لیکن بہ ظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ مغلوب ہونے کے بعد قضا کے عہدے سے ہٹا دیئے گئے اور ہارون جس نے قاضی ابو یوسف کی وفات کے بعد غیر حنفی قاضی القضاۃ کا جو تجربہ کرنا چاہا تھا اس کو قاضی وہب سے ایسے تجربات مسلسل ہوتے چلے گئے جس کے بعد قدرتی طور پر ان کی جگہ حنفی قاضی القضاۃ کے تقرر کو اس نے مناسب خیال کیا۔ امام محمد رقہ کے قاضی تو پہلے ہی سے تھے۔ اگر چہ بعضوں کا بیان ہے کہ یحییٰ بن عبداللہ طالبی کے قصے میں ہارون نے غصہ میں ان کو برطرف بھی کر دیا تھا۔ لیکن عرض کر چکا ہوں کہ عمل بہر حال اس نے امام محمد ہی کے فتویٰ پر کیا۔

امام محمد کا قاضی القضاۃ کے عہدے پر تقرر

قدرتاً ایسی حالت میں اس کی نگاہ قاضی وہب کے بعد قاضی القضاۃ بنانے کے لئے امام محمد ہی پر جا سکتی تھی۔ ہو سکتا ہے کہ زبیدہ خاتون کی جس سفارش کا لوگ تذکرہ کرتے ہیں اسی کو حیلہ ہارون نے بنا لیا ہو۔ اور دوبارہ دربار میں بلا کر قاضی القضاۃ کا عہدہ ان کے سپرد کر دیا ان کے شاگرد ابن سماعہ کے حوالہ سے لوگوں نے نقل کیا ہے کہ:

ثم قرب الرشيد محمد بن الحسن بعد ذلک وتقدم عنده وولاة قضاء القضاء. (ص ۴۱ بلوغ الامانی الفاضل الکوثری)	پھر ہارون نے محمد بن الحسن کو قرب عطا کیا دربار میں ان کو برتری حاصل ہوئی اور ہارون نے قضاء القضاۃ کا عہدہ ان کے سپرد کیا۔

امام محمد کی وفات

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ امام محمد کی عمر نے وفا نہ کی اور قاضی القضاۃ ہونے کے بعد ہارون کے ساتھ پہلے سفر میں جو اس نے خراسان کیا تھا بہ مقام رے ان کی وفات ہوگئی اسی لئے امام محمدؒ کے قاضی القضاۃ ہونے کے واقعہ نے زیادہ شہرت حاصل نہ کی' تاہم اس عرصے میں ہارون کے ساتھ چند واقعات ایسے پیش آئے ہیں جن کا مورخین نے تذکرہ کیا ہے جن میں ایک واقعہ تو وہی ہے جو ٹھیک اسی دن پیش آیا جس دن ہارون نے زبیدہ کے اشارے سے دربار میں بلا کر اپنی رنجش اور خفگی کے ازالہ کا اعلان کیا۔ اس روایت کا ذکر خطیب کے حوالہ سے پہلے بھی کسی موقعہ پر کر چکا ہے اس وقت علامہ ابوجعفر طحاوی نے امام محمد کے شاگرد خاص قاضی ابن سماعہ کے حوالہ سے جن الفاظ میں اس قصے کو درج کیا ہے ہم اس روایت کا ترجمہ پھر نقل کرتے ہیں قاضی ابن سماعہ کا بیان ہے کہ:

> ''ہارون کے شاہی محل میں امام محمد کے ساتھ میں بھی تھا۔ جس وقت زبیدہ کی کوشش سے ان کی معافی ہوئی تھی' ہوا یہ کہ جہاں پر ہم لوگ بیٹھے ہوئے تھے' اچانک ہارون وہیں ہم لوگوں کے سامنے آیا ہر ایک جو وہاں بیٹھا ہوا تھا' ہارون کے آنے کے ساتھ ہی کھڑا ہو گیا مگر ساری جماعت میں میں نے دیکھا کہ تنہا محمد بن الحسن جیسے بیٹھے ہوئے تھے بیٹھے رہے ہارون تیز نظروں سے ان کی اس حرکت کی وجہ سے ان کو دیکھنے لگا اور محل خاص میں پہنچ کر اس نے آدمی بھیجا جس نے آواز دی کہ صرف محمد بن حسن فقیہ کی طلبی ہے۔''

ابن سماعہ کہتے ہیں کہ یہ سن کر میرے تو ہوش اڑ گئے اور میں نے خیال کیا کہ اندر بلا کر قیام نہ کرنے کی وجہ سے خلیفہ یقیناً کسی سخت سزا کا حکم ان کے متعلق دینے والا ہے جب ہی تو اکیلے ان ہی کی طلبی ہوئی ہے لیکن تھوڑی دیر بعد جب وہ واپس ہوئے تو دیکھا کہ ہشاش بشاش ہیں میں نے دریافت کیا کہ واقعہ کیا پیش آیا بولے کہ ہارون نے بلا کر

مجھ سے دریافت کیا کہ تم نے یہ کیا حرکت کی سارا مجمع تو مجھے دیکھ کر کھڑا ہو گیا' اور تم بیٹھے کے بیٹھے رہے۔ امام محمد نے کہا کہ میں نے ہارون سے عرض کیا کہ۔

''جس طبقہ میں آپ نے مجھے شریک کیا ہے' خود اپنی مرضی سے میں نے نہیں چاہا کہ اس طبقہ سے اپنے آپ کو خارج کر کے دوسرے طبقہ میں داخل کردوں' میں نے کہا کہ امیر المومنین نے مجھے علم کا اہل قرار دیا ہے' میں نے یہ مناسب نہ خیال کیا کہ آپ جسے علم کا اہل قرار دیں اس کو ان لوگوں کے طبقے میں شریک کردوں جس کا کام خدمت اور نوکری ہے آپ ہی کے ابن عم صلی اللہ علیہ وسلم سے مجھے یہ روایت پہنچی ہے کہ:

جس کی یہ خواہش ہو کہ لوگ اس کی تعظیم میں اس کے سامنے کھڑے ہو جایا کریں' چاہیے کہ ایسا آدمی اپنا ٹھکانہ جہنم کو بنائے۔''

(ص ۱۷۳ خطیب جلد ۲)

امام محمد نے اس کے بعد ہارون کو سمجھایا کہ عام درباریوں کا قیام آپ کو دیکھ کر اس کی تو خیر گونہ گنجائش پیدا ہو سکتی ہے کہ اس سے دوسروں پر خلیفہ کا رعب قائم ہوتا ہے۔ دشمن اس حال کو دیکھ کر دل میں خیال کرتے ہیں کہ درباریوں کے دل میں آپ کی اور آپ کے احکام وفرامین کی کتنی عزت ہے۔ لیکن علماء کے متعلق یہی خواہش کہ آپ کو دیکھ کر کھڑے ہو جایا کریں میرے نزدیک اس حدیث کی خلاف ورزی ہوگی ان ہی کا بیان ہے کہ ہارون نے ان کی تقریر کو سن کر کہا کہ صدقت (تم نے سچی بات کہی) ص ۴۲ بلوغ الامانی وغیرہ۔

امام محمد کہتے ہیں کہ اس کے بعد ہارون نے مجھ سے بنی تغلب کے نصاریٰ کے متعلق فتویٰ دریافت کیا۔ ہارون کی رائے تھی کہ بنی تغلب کے عیسائیوں نے جو معاہدہ اسلامی حکومت سے کیا تھا' اس کی خلاف ورزی کے وہ مرتکب ہوئے ہیں اسی لئے ہم پر بھی ان رعایتوں کی پابندی ضروری نہیں ہے' جو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانہ

میں از روئے معاہدہ ان کو حاصل تھیں[1]

---

[1] بنی تغلب دراصل خالص عربی النسل قبیلہ تھا، لیکن بادیہ عرب سے علیحدہ ہو کر فرات کے مشرقی اور مغربی سواحل میں آباد ہو گیا تھا نسطوری پادریوں نے ان کو عیسائی بنا لیا تھا۔ لیکن ان کی عیسائیت محض نام کی عیسائیت تھی۔ بعض مغربی مورخین نے سچ لکھا ہے کہ شراب خواری اور زنا کاری کے سوا عیسائیت نے ان کو اور کچھ نہیں سکھایا تھا غالباً یہی وجہ ہے حضرت ابن عباس کے اس فتویٰ کی جسے البلاذری نے نقل کیا ہے کہ بنی تغلب کے عیسائیوں کا نہ تو ذبیحہ حلال ہے اور نہ ان کی عورتوں سے مسلمانوں کو نکاح کرنا جائز ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اپنے اس فتویٰ کے بعد یہ بھی فرماتے تھے کہ یہ لوگ نہ ہمیں سے ہیں اور نہ اہل کتاب میں سے ہیں۔ ص ۱۸۹ اسی لئے عیسائیوں اور مسلمانوں میں جن قانونی تعلقات کی اجازت اسلام نے دی ہے بنی تغلب کے عیسائیوں کے ساتھ ان کا قائم کرنا درست نہ ہوگا۔ بہر حال قصہ یہ ہے کہ جب فرات کے سواحل عہد فاروقی میں فتح ہوئے تو جیسے عام ذمی رعایا جنہوں نے اسلام قبول کرنے سے انکار کیا تھا۔ ان پر جزیہ لگایا گیا تھا، بنی تغلب کے ان عیسائیوں پر یہی ٹیکس لگا دیا گیا مگر اس کو اپنی بے عزتی خیال کر کے اسلامی محروسہ سے وہ بھاگنے لگے۔ وہ مدعی تھے کہ ہم خالص عرب ہیں، ہم جزیہ ادا کرنے پر راضی نہیں ہو سکتے حضرت عمر کو ان کے نمائندوں نے بنی تغلب کے اس طرز عمل کی اطلاع دی، آپ نے حکم دیا کہ ان لوگوں کو روکو اور پوچھو کہ آخر وہ چاہتے کیا ہیں رد و قدح کے بعد بنی تغلب والوں نے منظور کیا کہ بجائے جزیہ کے ہم بھی وہی محصول حکومت کو ادا کریں گے جو مسلمان ادا کرتے ہیں بلکہ مسلمانوں سے دونی رقم ادا کریں گے بشرطیکہ اس کا نام جزیہ نہ رکھا جائے حضرت عمر نے ان کی اس شرط کو مان لیا لیکن اپنی طرف سے بھی ایک شرط یہ پیش کی کہ نام نہاد مذہب جو تمہارا ہے یعنی اپنے آپ کو عیسائی کہتے ہو اس مذہب کے قبول کرنے پر اپنی آئندہ اولاد کو مجبور نہ کرو گے اور اصطباغ یعنی بپتسمہ بچپن ہی میں دے کر ایسی صورت حال ان کے لئے پیدا نہ کرو گے کہ تمہاری اس عیسائیت کے قبول کرنے پر اپنے آپ کو وہ مجبور پائیں۔ بنی تغلب والوں نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اس شرط کو تسلیم کر لیا۔ لیکن حضرت عمر ہی کے زمانہ میں عملاً اس شرط کی تعمیل سے گریز کرتے رہے۔ حضرت عثمان، حضرت علی رضی اللہ عنہما کی خلافت کے عہد میں بھی بپتسمہ دینے کا رواج ان میں مسلسل جاری رہا۔ لیکن حکومت اسلامی نے کسی قسم کی دارو گیر نہ کی۔ البلاذری ص ۱۸۱ بنی تغلب کے متعلق ایک چیز یاد رکھنے کی یہ بھی ہے کہ ان سے اپنی اولاد کے متعلق یہ معاہدہ حضرت عمر نے کیا تھا کہ ان کو نصرانی نہ بنائیں گے محدثین کو خود اس روایت کی صحت میں شبہ ہے۔ دیکھو جمع الفوائد ص ۱۴ ج ۲)

کہتے ہیں کہ ہارون کے ان الفاظ کو سن کر امام محمد نے تعجب کے ساتھ پوچھا کہ آخر کون سی نئی بات پیدا ہوئی جو آپ ایسا کرنا چاہتے ہیں ہارون نے وہی جواب دیا کہ ان سے معاہدہ تھا کہ اپنے بچوں کو اصطباغ نہ دیں گے مگر انہوں نے ایسا نہیں کیا بلکہ علانیہ اس کا کاروبار ان میں جاری ہے' امام محمد نے فرمایا کہ اصطباغ کا یہ دستور تو عہد فاروقی میں بھی بنی تغلب میں جاری رہا' لیکن حضرت عمر نے امان نامہ کی خلاف ورزی کا الزام ان پر قائم نہیں کیا جس حال میں تھے ان کو اسی حال پر باقی رکھا گیا جس سے معلوم ہوا کہ عملاً یہ شرط ان کے معاہدے سے خارج ہو چکی تھی' ہارون نے کہا کہ ہو سکتا ہے حضرت عمر کچھ کرنا چاہتے ہوں لیکن ان کی حکومت کی مختصر مدت میں اس کا موقعہ ان کو نہ مل سکا' بہر حال ان کی خاموشی کا یہ مطلب نہیں ہو سکتا کہ معاہدے سے یہ شرط عملاً خارج ہو چکی تھی امام محمد نے کہا کہ مان لیا جائے کہ حضرت عمر کو موقعہ نہ مل سکا۔ لیکن ان کے بعد بھی دو عادل ترین خلفاء گذرے جن کی حکومت کی مدت بھی کافی دراز تھی۔ یعنی حضرت عثمان اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے بھی اپنے اپنے زمانہ میں بنی تغلب والوں کو نہیں چھیڑا جس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ:

کانا امضیالھم الصلح بلاشریطة علیھم فیه بلوغ. (ص ۴۳)	ان دونوں عادل حکمرانوں نے بنی تغلب کی صلح کو بغیر کسی مزید شرط کے باقی رکھا اور ان پر اسی کو نافذ رہنے دیا۔

ہارون امام محمد کی اس تقریر کے بعد خاموش ہو گیا بعض روایتوں میں ہے کہ اس نے امام محمد سے کہا کہ اچھا تو آپ جائیے۔ لیکن ضمیری کے حوالہ سے جو روایت نقل کی جاتی ہے۔ اس میں مزید اضافہ یہ بھی ہے کہ آخر میں محمد بن حسن نے کہا کہ:

''یہ صلح عمر اور ان کے بعد کے خلفاء کی قائم کی ہوئی ہے' اور آپ کے لئے دست اندازی کا کوئی موقعہ نہیں ہے' علم کی جو بات تھی وہ آپ کے آگے میں نے رکھ دی آئندہ جو آپ کی رائے ہو۔''

اسی روایت میں یہ بھی ہے کہ ہارون نے یہ سن کر امام محمد کو مخاطب کر کے کہا کہ:

''اچھا طریقہ کاران خلفاء نے اختیار فرمایا تھا' میں بھی اسی کو جاری رکھوں گا۔ انشاء اللہ ص ۴۳۔

آخر میں اس نے امام سے کہا کہ:

''پیغمبر ﷺ کو بھی حق تعالیٰ نے مشورہ کرنے کا حکم دیا تھا اسی لئے آپ لوگوں سے مشورہ فرماتے تھے اور فیصلہ کا علم جبرئیل علیہ السلام کے ذریعہ سے آپ کو حاصل ہو جاتا تھا (پس میں نے بھی تم سے مشورہ کیا) اب تم اس شخص کے لئے دعا کرو جس کے ہاتھ میں تم لوگوں کی نگرانی سپرد کی گئی (کہ خدا اس کو بھی نیک توفیق عطائے اور صحیح فیصلہ کا الہام کرے) تم خود بھی دعا کرتے رہو۔ اور اپنے رفقاء کار شاگردوں کو بھی کہو کہ دعاء کریں۔ (ص ۴۳)

ہارون نے اس کے بعد ایک بڑی رقم کی منظوری صادر کی کہ امام محمد کے حوالہ کی جائے تا کہ ارباب استحقاق میں اپنے صوابدید سے تقسیم کر دیں۔ علاوہ حنفی مورخین کے اس واقعہ کا ذکر الخطیب نے بھی تاریخ بغداد میں کیا ہے صاحب بلوغ الامانی نے ان کی سوانح عمری میں اس واقعہ کو نقل کرنے کے بعد بالکل صحیح لکھا ہے کہ:

''اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان فقہاء کی رائے کتنی بے لاگ ہوتی تھی' مسلمان ہو یا عیسائی کوئی ہو حق کے اظہار میں قطعاً کسی کی جنبہ داری نہیں کرتے تھے۔''

واقعہ یہ ہے کہ اس وقت ان چیزوں کی اہمیت کا اندازہ ہم لوگوں کو ہو بھی نہیں سکتا۔ ہارون جو اپنے عہد میں کرۂ زمین کا سب سے بڑا طاقت ور مطلق العنان بادشاہ تھا۔ اپنے منشاء کو ظاہر کرتا ہے اور ایک کس مپرس قبیلہ سے اس کا تعلق ہے جو مسلمان قبیلہ بھی نہیں ہے۔ لیکن ہارون کی حکومت قاہرہ اظہار حق میں مانع نہ آ سکی' اور نہ بے چارے بنی تغلب کی کس مپرسی کا ان کے متعلقہ مسئلہ کی اہمیت پر کوئی اثر پڑا۔

اور یہ تھے وہ اسباب و وجوہ جس نے بالآخر عباسی حکومت کو امام ابو حنیفہ اور ان کے تلامذہ کے آگے گھٹنے ٹیک دینے پر مجبور کر دیا۔ امام محمد کو جیسا کہ میں نے عرض کیا۔

قضاء القضاء کے اختیارات سے نفع پہنچانے کا موقعہ اس لئے نہ مل سکا کہ عہدے کے جائزہ لینے کے ساتھ ہی ان کی حیات کا پیالہ لبریز ہوگیا' ہارون خراسان کے دورے پر امام محمد کو ساتھ لے کر روانہ ہوگیا' رے میں چار مہینہ اس کا قیام رہا۔

عمر و مقام تدفین

اور اسی رے کے شاہی کیمپ میں کل (۵۸) سال کی عمر میں انتقال ہوگیا' یہ عجیب اتفاق کی بات تھی کہ ہارون کے ساتھ اس سفر میں جیسے وقت کی سب سے بڑی قانونی ہستی امام محمد کی تھی' اسی طرح لغت اور عربیت کے امام الکسائی کو بھی ہارون نے ساتھ رکھ لیا تھا۔ اتفاق کی بات یہ ہوئی کہ ایک ہی دن یا دو تین دن کی تقدیم و تاخیر کے ساتھ اپنے اپنے فن کے دونوں اماموں کا رے ہی میں انتقال ہوا۔[1]

---

[1] کہتے ہیں کہ ہارون کا شاہی کیمپ بارہ میل میں پھیلا ہوا تھا' اسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں کی وفات اگرچہ ایک ہی کیمپ میں ہوئی۔ لیکن مقام وفات میں دونوں میں بارہ میل کا فاصلہ تھا' کسائی جن کا نام ابوالحسن علی بن حمزہ الاسدی ہے' ان سے اور امام محمد سے ہارون کے دربار میں بعض دلچسپ مکالمے ہوئے ہیں' کسائی نے ایک دفعہ دعویٰ کیا' کسی ایک علم کا کمال دوسرے علوم کی راہوں کو بھی آدمی پر کھول دیتا ہے' امام محمد نے کہا کہ اچھا آپ بتایئے کہ سجدۂ سہو میں بھی آدمی سے سہو ہو جائے تو کیا کرے کیا اس کے لئے بھی سجدہ سہو کرے گا۔ کسائی نے کہا کہ نحو کا قاعدہ ہے کہ جس نام کی تصغیر ایک دفعہ ہو جاتی ہے تو پھر اس تصغیر شدہ نام کی تصغیر نہیں ہوتی۔ پس اسی پر قیاس کر کے کہا جائے گا کہ سجدہ سہو کے سہو میں سجدہ سہو نہ ہوگا اور بھی دوسرے لطائف اس سلسلہ میں محاضرات کی کتابوں میں منقول ہیں الکسائی لغت قرات عربیت کا حالانکہ مسلم عندالکل امام تھا۔ لیکن شعر سے بیچارے کو دور کی بھی مناسبت نہ تھی ہارون کے بدقسمت شہزادے امین الرشید کا کسائی استاذ تھا۔ بعض کہتے ہیں کہ ہارون کا بھی کسائی استاذ تھا اور کسی کتاب میں تو یہ بات نظر سے نہیں گذری۔ لیکن شرح سیر کبیر میں شمس الائمہ سرخسی نے لکھا ہے کہ کسائی امام محمد کے خالہ زاد بھائی تھے' اور یہ بھی لکھا ہے کہ سیر کا جو خاص باب ''کتاب الامان'' ہے جس میں فقہاء حنفیہ نے انتہائی دقیقہ سنجیوں سے کام لیا ہے خصوصاً لغوی اور نحوی مسائل سے اس بات میں خاص طور پر کسائی سے مدد لی گئی ہے۔ شمس الائمہ کا بیان ہے کہ کسائی سے بھی امام محمد ان مسائل میں مشورہ لیا کرتے تھے دیکھو شرح سیر کبیر ص ۱۶۸ جلد ۱۔

امام محمد کی وفات پر ہارون کا تاثر

کہتے ہیں کہ اس عجیب اتفاق پر ہارون بار بار کہتا کہ:

''میں نے رے کی سرزمین میں فقہ اور لغت دونوں کو دفن کر دیا۔''

(ص ۱۸۱ الخطیب)

یہ واقعہ ۱۸۹ھ ہجری میں پیش آیا حافظ ابن عبداللہ نے انتقاء میں نقل کیا ہے کہ امام محمد کا کیا مقام تھا۔ بلکہ بعض لوگوں کو امام محمد کے قاضی القضاۃ ہونے میں جو تھوڑا بہت شبہ ہے اس کا ازالہ ہو جاتا ہے آخر اس سے بڑی شہادت اور کیا ہو سکتی ہے کہ خود خلیفہ ان کو ''قاضی القضاۃ'' کے خطاب سے یاد کرتا ہے۔

قاضی القضاۃ کے عہدہ پر یحییٰ بن اکثم کا تقرر

اور قصہ کچھ امام محمد ہی پر ختم نہیں ہو گیا' بلکہ ہارون کے بعد قاضی القضاۃ کے اس عہدے کی اہمیت روز بروز بڑھتی ہی چلی گئی۔ مامون الرشید کے عہد کے قاضی القضاۃ یحییٰ بن اکثم کے اقتدار کا جب یہ حال تھا جیسا کہ مورخین نے لکھا ہے:

اخذ جامع قلبه حتیٰ قلده قضاء القضاة وتدبير مملكته فكانت الوذراء لا تعمل فی تدبير الملك شيئاً الابعد مطالعة يحيى بن اكثم.

(ص ۱۹۸ ج ۱۴ خطیب)

مامون الرشید کے دل و دماغ پر قاضی یحییٰ بن اکثم چھا گئے تھے' تا ایں کہ قضاء القضاۃ کے عہدے پر مامون نے ان کا تقرر کیا اور حکومت کے انتظام و تدبیر میں بھی ان کو شریک کر دیا تھا' اسی کا نتیجہ تھا کہ حکومت کے نظم و ضبط میں وزراء کسی تجویز پر اس وقت تک عمل نہیں کر سکتے تھے جب تک کہ قاضی یحییٰ بن اکثم کی نظر سے وہ تجویز گذر نہ لے۔

قاضی یحییٰ بن اکثم کی دینی خدمات

مامون اور یحییٰ بن اکثم کے تعلقات اور بے تکلفی کی داستانوں سے تاریخ کے اوراق معمور ہیں حقیقت تو یہ ہے کہ قاضی یحییٰ نے اپنے اس دنیوی اقتدار سے دین کی ایک ایسے نازک ترین موقعہ پر خدمت بجالائی ہے کہ آج تک اس کے تشکر و امتنان سے مسلمان مورخین رطب اللسان ہیں[1] اور ہے بھی یہ بات کہ مسلمان امیروں کے اوباش

---

[1] میرا اشارہ مسئلہ متعہ کی طرف ہے تفصیل تو کتابوں میں پڑھیے حاصل یہ ہے کہ ایام جاہلیت کے تمدن میں عورتوں سے استفادے کے مختلف طریقے جو مروج تھے۔ مثلاً ایک رسم استبضاع کی تھی کسی اچھے بہادر خوبصورت آدمی کا تخم کوئی اگر حاصل کرنا چاہتا تھا تو اپنی خوشی سے اپنی بیوی کو اس کے پاس بھیج دیتا تھا گویا آج یورپ وامریکہ سے اس قسم کی خبریں جو آ رہی ہیں کہ شیشے کی نلکیوں میں لوگوں کے نطفوں کو محفوظ کر کے عورتوں میں انجکٹ کرنے کا طریقہ وہاں مروج ہونے والا ہے یا ہو چکا ہے اسی کی ایک شکل ایام جاہلیت میں مروج تھی' فرق صرف اس قدر ہوگا کہ عرب چرمی نلکیوں سے تخموں کو اپنی مرضی کے مطابق منتقل کراتے تھے اور یورپ وامریکہ والے اپنی جدید جاہلیت میں شیشے کی یا غلواتی نلکیوں سے کام لیں گے۔ بہر حال اسی سلسلہ کی ایک چیز متعہ بھی تھی سفر میں عرب کے جاہل اس طریقے سے زیادہ کام لیتے تھے' یعنی عورت سے جتنے دن یا جتنے گھنٹوں کے لئے چاہتے تھے معاہدہ کر لیتے تھے معاوضہ بھی کبھی زیادہ کبھی کم ہوتا تھا۔ کہتے ہیں کہ ایک ایک مٹی جو یا جواری پر بھی معاملہ ہو جاتا تھا' خیبر کے سفر میں رسول اللہ ﷺ کو دو باتیں معلوم ہوئیں ایک تو گدھوں کے گوشت کے متعلق آپ کو معلوم ہوا کہ لوگوں نے ہانڈیوں میں چڑھا رکھا ہے اسی وقت ہانڈیاں الٹوادی گئیں پھر واپسی کے وقت کچھ عورتوں پر نظر پڑی دریافت سے پتہ چلا کہ ان عورتوں سے بعضوں نے متعہ کیا تھا جیسے گدھے کے گوشت کی حرمت کا اعلان کیا گیا تھا' متعہ کی حرمت کا بھی اعلان کر دیا گیا' ظاہر ہے کہ جیسے گدھے کے گوشت کے متعلق یہ کہنا صحیح نہ ہوگا کہ اسلام میں پہلے حلال تھا اور بعد کو حرام کیا گیا۔ اسی طرح متعہ کے متعلق بھی یہ صحیح تعبیر نہ ہوگی کہ اسلام میں کبھی وہ حلال ٹھہرایا گیا تھا' بلکہ جاہلی دستور کے مطابق جیسے گدھے کے گوشت کو لوگوں نے پکنے کے لئے چڑھا دیا تھا' یہی طرز عمل متعہ کے متعلق بھی بعض لوگوں نے اختیار کیا ہوگا پیغمبر کو جب علم ہوا تو اس کی حرمت کا آپ نے اعلان کرادیا پھر متعہ کے ساتھ یہ صورت پیش آئی کہ فتح مکہ کے بعد بکثرت نئے لوگ جو اسلام میں داخل ہوئے اور مکہ سے طائف بقیہ

آوارہ مزاج افراد کی حد سے گذری ہوئی عیاشیوں کے تذکروں سے مسلمانوں کی تاریخ یوں ہی گھناؤنی بنی ہوئی ہے۔[1] خدانخواستہ اسلام کا یہ قاضی اگر اس دن جان پر کھیل کر حق کے اظہار میں کچھ بھی کمزوری دکھاتا تو خدا ہی جانتا ہے کہ اس کا انجام کیا

[لہ] واوطاس کے طرف جو مہم روانہ ہوئی اس میں نومسلموں کا یہ گروہ جوق درجوق شریک ہو گیا اسلامی احکام سے ان نومسلموں کو واقف ہونے کا موقعہ چونکہ نہیں ملا تھا۔ اس لئے پھر اسی پرانے جاہلی دستور کے مطابق بعضوں نے متعہ کرلیا رسول اللہ ﷺ کو جب خبر ہوئی تو دوبارہ آپ نے اس کی حرمت کا اعلان کرا دیا۔ واقعہ کی کل نوعیت جہاں تک روایات کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ میرے نزدیک یہی ہے۔ لیکن بدقسمتی سے بعض راویوں نے اسی واقعہ کی تعبیر ان الفاظ میں پھیلا دی کہ متعہ دو دفعہ حلال کیا گیا اور دو دفعہ حرام کیا گیا' ابتداء اسلام میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تعبیری مغالطے کی وجہ سے بعض لوگ غلط فہمی کی شکار ہے' مشہور کر دیا گیا تھا کہ عباسیوں کے جد اعلیٰ حضرت عبداللہ بن عباس صحابی رضی اللہ تعالیٰ عنہما بھی ان لوگوں میں تھے جو متعہ کو جائز سمجھتے تھے' مامون کو یہی باور کرایا گیا' چاہا کہ دادا کے فتویٰ کو بزور حکومت نافذ کرے' قاضی یحییٰ بن اکثم کو خبر ہوئی منہ بنائے ہوئے دربار میں حاضر ہوئے' مامون نے پوچھا کیوں چہرۂ آپ کا مکدر کیوں ہے؟ بولے مسلمانوں کے لئے زنا جب حلال کر دیا جائے تو اس سے زیادہ صدمہ کی بات اور کیا ہو سکتی ہے' زنا کے حلال ہونے کا فتویٰ؟ مامون نے پوچھا قاضی نے کہا ہاں زنا ہی کا فتویٰ' تم کس دلیل سے ایسا کہتے ہو' مامون نے کہا قاضی نے قرآن کی پھر مشہور آیت تلاوت کی جس میں ''ازواج'' یعنی بیویوں اور ماملکت ایمانکم (شرعی عورت شرعی لونڈی تو ظاہر ہے کہ نہیں ہے اور ازواج میں بھی اس کو شریک نہیں کر سکتے۔ کیونکہ قرآن نے زوج کو شوہر کا اور شوہر کو زوج کا وارث قرار دیا ہے متاعی عورت نہ وارث ہوتی ہے اور نہ متعہ کرنے والا اس کا وارث ہوتا ہے۔ ازواج کے دوسرے خصوصیات بھی قاضی نے بیان کر کے ثابت کا یہ کہ وہ ''زوج'' نہیں ہو سکتی' مامون یہ سن کر حیران ہو گیا۔ پھر حضرت علی کی حدیث سنائی جس میں رسول اللہ ﷺ کی طرف حضرت علی نے متعہ کی حرمت کو منسوب فرمایا ہے مامون نے قاضی یحییٰ کا وقت پر اس راہ نمائی کا شکریہ ادا کیا' مسلمان مورخین نے اسلام کے چند اہم دنوں میں ایک دن اس دن کو بھی قرار دیا۔ ۱۲

[1] دکن ہی کے مشہور بادشاہ فیروز شاہ بہمنی کے متعلق لکھتے ہیں کہ مختلف ممالک واقوام کی آٹھ سو عورتوں سے بوقت واحد اس نے عقد متعہ کیا۔ ۱۲

ہوتا۔ غیر قوموں کی نگاہوں میں مسلمانوں کا نام بجز ایک زنا کار قوم کے شاید اور کچھ نہ ہوتا' خدا قاضی یحییٰ کی قبر کو رشن رکھے کہ ہر چیز سے بے پرواہ ہو کر اپنے فرض کو انہوں نے ادا کیا اور نیت کی سچائی کا ثمرہ یہ ملا کہ اپنی کوشش میں وہ کامیاب ہوئے۔

معتصم' متوکل اور واثق کا زمانہ

قاضی القضات کے عہدے پر ابوعبداللہ کا تقرر

مامون الرشید کے بعد معتصم متوکل' واثق وغیرہ خلفاء کے زمانے میں قاضی القضاۃ ابوعبداللہ احمد بن ابی دواد کا دور دورہ بھی اپنی شوکت وجلالت میں کسی سے کم نہ رہا' افسوس ہے کہ اس بدبخت قاضی سے ایک ایسی ناقابل عفو غلطی سرزد ہوئی جس نے دین و دنیا میں اس کو روسیاہ کر دیا اور ساری خوبیوں پر اسی ایک فاش غلطی نے خاک ڈال دی۔ ورنہ عام مسلمانوں کو قاضی ابن درادا اپنے اقتدار سے جتنا نفع پہنچایا ہے۔ اگر اس کے دامن پر اس جرم شدید کا داغ نہ[1] ہوتا تو اسلام کے اکابر رجال میں شمار ہونے کے لائق تھا' اس کی

[1] ابن دواد کی کورنصیبی یہ تھی کہ اسی شخص کے اغوا واصرار سے حضرت امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ پر مسئلہ ''خلق قران'' میں مظالم کے پہاڑ توڑے گئے اسی چیز نے اس کو سارے جہان میں رسوا کر دیا ورنہ حکومت کے روپے سے اور خود اپنی ذاتی روپے سے غرباء فقراء ارباب حاجات کی حاجت روائیوں میں اس کے اقدامات ایسے ہیں جن کی تاریخ میں مشکل ہی سے نظیر مل سکتی ہے' ایک دلچسپ واقعہ اسی کا یہ بیان کیا جاتا ہے کہ معتصم کسی مجرم کو واجب القتل قرار دینے کے بعد نطع (چمڑا جس پر مقتول بٹھایا جاتا تھا) پر مقتول کو بٹھا چکا تھا' جلاد کی تلوار کھینچ چکی تھی کہ جرأت کر کے ابن دواد نے پکار کر کہا امیر المومنین تلوار کو انصاف سے آگے بڑھنے کا موقعہ نہ دیجئے۔ معتصم متوجہ ہو گیا۔ قاضی کا بیان ہے کہ پیشاب کے تقاضے کی شدت میں اسی وقت میں مبتلا ہو گیا' دیکھ رہا تھا کہ لمحہ بھر کے لئے بھی اگر میں غائب ہوتا ہوں تو اس غریب کی جان چلی جائے گی۔ میں نے اپنے جسم کے کپڑوں کو (چادر وغیرہ کو نیچے رکھ لیا' اور پیشاب خطا کر گیا' پیشاب کرتا جاتا تھا اور معتصم سے اس کی معافی کے وجوہ بھی لکھ

جلالت قدر، اور حکومت میں اس کے اثر نفوذ کا اسی سے اندازہ کیجئے کہ خلفاء کے دربار میں دستور تھا کہ ان کے خطاب سے پہلے کوئی خلفاء کو خطاب نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن ابن دواد پہلا آدمی ہے جس نے اس رسم کو توڑا کہتے ہیں کہ جس وقت مامون کو اپنی زندگی سے مایوسی ہوئی تو اپنے جانشین معتصم کو بلا کر اس نے وصیت کی تھی کہ:

"ابوعبداللہ احمد بن ابی دواد کو کسی حال میں کسی وقت نہ چھوڑنا اور ہر معاملہ میں اس شخص سے مشورہ لیتے رہنا۔ (ص ۱۲۵ خطیب ج ۲)

آل ابن ابی الشوارب اور آل دامغانی کے قضاۃ

اوران دو قاضی القضاۃ کے بعد عباسیوں کی حکومت میں پشتہا پشت تک آل ابن ابی الشوارب، اور آل دامغانی کے قضاۃ کا اس عہدے پر جس آن بان سے قبضہ رہا ہے، عباسیوں کی سینکڑوں سال کی تاریخ سے ان قاضیوں کی تاریخ وابستہ ہے۔

یہاں اس مسئلہ کے چھیڑنے کی اگر چہ چنداں ضرورت نہیں ہے کہ حکومت عباسیہ کے یہ ہمارے قاضی القضاۃ تفقہ وافتاء فصل خصومات میں کس مسلک کے پابند تھے کیونکہ مجھے تو صرف یہ دکھانا ہے کہ حضرت امام ابوحنیفہ کی جدوجہد کا نتیجہ یہ ہوا کہ بالآ حکومت نے اپنے شعبہ عدل وانصاف کو بالکلیہ اہل علم کے سپرد کر دیا اور جس دن سے حکومت کا یہ شعبہ اہل علم کے ہاتھ میں آیا، اس پر اسی طبقہ کا اقتدار کا وزن بروز بڑھتا ہی چلا گیا خواہ اہل علم کے اس طبقہ کا تفقہ واجتہاد کے جس مکتب خیال سے بھی تعلق ہو۔

بقیہ عرض کرتا جاتا تھا، یہاں تک کہ بات اس یک سمجھ میں آ گئی مجرم قتل سے بچ گیا، لیکن جب میں اٹھا تو جگہ پیشاب سے تر تھی، معتصم کی نظر پڑ گئی، پوچھا کہ قاضی یہ تمہارے نیچے پانی کہاں سے آیا، تب میں نے گردن جھکا کر جو واقعہ پیش آیا تھا۔ عرض کیا اس پر معتصم اتنا خوش ہوا کہ ایک لاکھ درم انعام کے لئے اس نے میرے واسطے فرمان کیا۔ الیافعی ص ۱۲۴ ج ۲۔

لیکن یہ واقعہ ہے کہ عباسیوں کو تقریباً[1] پانچ صدیوں تک حکومت کرنے کا موقعہ جو ملا اس طویل و دراز مدت میں ان کے قاضیوں خصوصاً قاضی القضاۃ کے عہدے پر سرفراز ہونے والوں میں عموماً حنفی مسلک ہی کے پابند فقہا تھے الا ماشاء اللہ کسی خاص وجہ سے دوسرے مسلک کے علماء کو بھی کبھی کبھی اس کا موقعہ ملا ہے۔[2]

میں نے آل دامغانی کے قاضیوں کا جو ذکر کیا ہے ان کے متعلق تو خیر کچھ کہنے کی بھی ضرورت نہیں کہ وہ حنفی تھے اس خاندان کے بیسیوں آدمیوں کے نام عباسیوں کے ''قاضی القضاۃ'' کی فہرست میں نظر آتے ہیں اور سب کے سب حنفی تھے باقی آل ابن ابی[1] الشوارب

---

[1] ابن خلدون نے اپنی تاریخ کی جلد سوم کے خاتمہ میں مشہور عرب فلسفی یعقوب کندی کے حوالہ سے یہ عجیب بات نقل کی ہے کہ اس نے نجوم کے حساب سے یہ پیش گوئی کی تھی کہ عربوں کی دولت کا خاتمہ ۶۶۰ء میں معلوم ہوتا ہے کہ ہو جائے گا' ابن خلدون نے اس کی تصدیق کی ہے کہ قریب قریب واقعہ بھی کچھ اسی کی پیش گوئی کے مطابق پیش آیا یعنی ۱۳۲ھ ہجری میں سفاح اول الخلفا بنی عباس کے ہاتھ پر بیعت ہوئی اور مستعصم عباسی تاتاریوں کے ہاتھ سے ۶۵۶ھ میں قتل ہو گیا اور اسی پر اسی عربی دولت کا خاتمہ ہو گیا اس حساب سے گویا پانچ سو تیس سال دنیا میں حکومت رہی بغداد میں اس خاندان کے (۳۷) خلفاء گذرے ابن خلدون ص ۵۲۸ ج سوم۔

[2] مثلاً مشہور محدث اور اسماء الرجال کے مستند عالم علامہ ابن ماکولا کو ۴۲۰ھ ہجری میں خلیفہ قادر باللہ عباسی نے بغداد کا قاضی القضاۃ مقرر کیا خطیب نے ان کے تذکرے میں تصریح کی ہے کہ کان ینتحل مذھب الشافعی (یعنی شافعی مسلک کے پابند تھے) ص ۸۰ ج ۸ لیکن اسی کے ساتھ ہمیں جب یہ معلوم ہے کہ مشہور عباسی امیر ابودلف العجلی سے ان کا نسلی تعلق تھا' تو اس پر کوئی تعجب نہیں ہوتا کہ باوجود شافعی ہونے کے ان کے تقرر کو بغداد والوں نے کیسے قبول کر لیا' علم و فضل کے ساتھ پشت با پشت سے دولت و امارت ان کے خاندان میں چلی آ رہی تھی۔ قاضی القضاۃ جیسے اہم ذمہ دارانہ عہدے کے لئے ان سے بہتر آدمی اور کون مل سکتا تھا۔۱۲

[1] عقاب بن اسید صحابی جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے سب سے پہلی دفعہ ان کو مکہ معظمہ کا قاضی مقرر کیا اسی لئے تاریخ قضاۃ اسلام میں ان کا نام سب سے پہلے لیا جاتا ہے' ان ہی کے بھائی خالد بن اسید کی نسل سے آل ابن ابی الشوارب کا نسبی تعلق تھا چونکہ یہ لوگ بنی امیہ کے خاندان سے تھے اس لئے ابتدا سے دولت و امارت اس خاندان میں مسلسل منتقل ہوتی رہی' عباسیوں کے عہد میں محکمہ قضا پر قبضہ کر کے ان لوگوں نے اپنی گذشتہ عزت و عظمت کو مدتوں قائم رکھا۔۱۲

تو ابن ابی الشوارب کے صاحبزادے عبدالملک سے براہِ راست یہ روایت نقل کی جاتی ہے، جب وہ بصرہ میں رہتے تھے، تو ایک مسئلہ کا تذکرہ کرتے ہوئے انہوں نے اپنے خاندانی پرانے محل (قصرعتیق) کی طرف اشارہ کرکے کہا:

قد خرج من هذا الدار سبعون قاضيا على مذهب ابى حنيفة. (ص ۲۶۲ جواهر)	اس گھر سے ستر آدمی ایسے نکلے ہیں جو امام ابوحنیفہ کے مسلک کے مطابق کام کرتے تھے۔

باقی قاضی یحییٰ بن اکثم یہ صحیح ہے کہ دارقطنی نے ان کو شافعی المذہب عالم قرار دیا ہے۔ لیکن حنفی مورخین کو ان کے حنفی ہونے پر اصرار ہے دلائل سے اسی کی تائید ہوتی ہے جس کی تفصیل کا یہاں موقعہ نہیں ہے، البتہ قاضی ابن ابی داؤد کے متعلق مجھے اب تک ان کے حنفی ہونے کی شہادت نہیں ملی ہے، لیکن متعدد قرائن ایسے ہیں جن کی بنیاد پر ان کو بھی حنفی قرار دینا زیادہ قرین صواب ہے۔

ابن ابوعبداللہ کی ناقابل تلافی غلطی

بہ ظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ امام احمد بن حنبل کے ساتھ مسئلہ خلق قرآن میں جو زیادتیاں اس شخص سے سرزد ہوئی ہیں ان کی وجہ سے اپنی جماعت کی طرف اس شخص کے انتخاب کو کوئی پسند نہیں کرتا، حالانکہ یہ قصہ کچھ ابن آبی دواد کے ساتھ مخصوص نہیں ہے اہل علم جانتے ہیں کہ ایک بڑا طبقہ علماء کا ایسا گذرا ہے جو فروعاً اہل السنت والجماعت کے چاروں ائمہ میں سے کسی امام کا مقلد نہ تھا۔ لیکن اعتقاداً غیرسنی عقائد رکھتا تھا مثلاً معتزلی، یا کرامی، یا جھمی وغیرہ ہوتا تھا خصوصاً حنفی مذہب کی تاریخ میں تو اس کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں۔[1]

---

[1] امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی فقہ اور اجتہاد کی لطافت اور اس کی گہرائیاں عموماً ذہین لوگوں کو ان کی طرف مائل کرتی ہیں، لیکن ذہانت کہے یا عقلیت، کہیں اس کے غلط استعمال کا کوئی شکار ہوگیا، تو یہی عقلیت اس کے لئے مصیبت بن جاتی ہے، وہ عوام کو سفہا اور بدعقلیوں کی جماعت قرار دے لیتا

بہر حال میرا خیال ہے کہ گو چار پانچ سو سال کے اس طویل عرصے میں دوسروں کا بھی عباسی حکومت میں قاضی القضاۃ کے عہدے پر تقرر ہوا ہے لیکن غالب اکثریت ان ہی لوگوں کی تھی جو امام ابوحنیفہ کے تفقہ و اجتہاد سے خصوصی تعلق رکھتے تھے خواہ صراحۃً اپنے آپ کو حنفی نہ کہتے ہوں الیافعی نے ۳۲۰ھ ہجری کے حوادث و واقعات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

"خلیفہ مقتدر باللہ کے زمانہ میں شافعی عالم ابوعلی بن خیران کے سامنے بغداد کے قضا کا عہدہ پیش کیا گیا' لیکن انہوں نے انکار کیا۔"

آگے بعض دوسرے واقعات کا تذکرہ کرنے کے بعد ابن خیران کا یہ فقرہ بھی

لہ کر اپنے عقائد میں جدت پیدا کرنا چاہتا ہے لیکن "غیبی حقائق" جو عقل و حواس کے حدود سے خارج ہیں ان کو جاننے کی فطری راہ نبوت و وحی ہے۔ صحیح علم اس باب میں ان ہی لوگوں کا باقی رہتا ہے' جو وحی و نبوت کے عطا کئے ہوئے معلومات کو بغیر کسی ترمیم و اضافہ و اصلاح کے مان لیتے ہیں' عقلیت صادقہ کا یہی تقاضا ہے اسی لئے کہا جاتا ہے کہ "عقائد" کے باب میں چاہیے کہ آدمی دین العجائز (یعنی بوڑھیوں کے دین پر رہے' یعنی من و عن وحی و نبوت سے جو کچھ معلوم ہوا ہے اسی کو تسلیم کرے عوام کی راہ سے ہٹ کر مذہب کے اساسی حقائق جن کا عموماً غیب سے تعلق ہوتا ہے جو ان کو عقلی خراد پر تراش خراش کر کے مانتے ہیں' قرآن مجید نے ان ہی لوگوں کے متعلق فرمایا کہ الا انهم هم السفهاء (یعنی بد عقل و بے وقوف وہی لوگ ہیں جو ان مسائل میں اپنے آپ کو عوام کی سطح پر رکھنے سے گھبراتے ہیں) بہر حال سلامت روی خدا کی دین ہے ہر زمانہ میں عقلیت کا غلط استعمال کیا گیا ہے یہی لوگ عملی زندگی میں حنفی ہونے کے باوجود عقائد میں معتزلی وغیرہ ہو جاتے تھے علامہ کوثری نے سچ لکھا ہے کہ امام ابوحنیفہ اور ان کے تلامذہ راشدین کو ارباب روایات نے جو بدنام کیا ہے۔ اس بدنامی میں منجملہ دوسرے وجوہ کے ان عقلیت زدہ حنفیوں کے وجود کو بھی دخل ہے انہوں نے ایک عربی شعر بھی اسی موقعہ پر استعمال کیا ہے کہ گناہ کوئی کرے اور پکڑا کوئی جائے قاضی احمد بن ابی دواد بھی میرے خیال میں ان ہی لوگوں میں ہیں صولی کی جو ہجو خطیب نے اپنی تاریخ میں ان کے متعلق نقل کی ہے اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ شخص عملاً اور فروعاً حنفی مسلک ہی کا پابند تھا اور یہی دوسرے اسباب و وجوہ ایسے ہیں جن سے اس دعویٰ کی تائید ہوتی ہے' انشاء اللہ کتاب تدوین فقہ میں اس پر مفصل بحث کی جائے گی۔ ۱۲

شافعی نے نقل کیا ہے کہ:

ھذ الامر لم یکن فینا وانما کان فی اصحاب ابی حنیفۃ رحمھم اللہ تعالیٰ.(۲۸۰ ج ۲)	قضا کا عہدہ ہم لوگوں میں کبھی نہیں رہا بلکہ یہ تو امام ابو حنیفہ کے ماننے والوں میں رہا ہے۔

چوتھی صدی کے آغاز تک کی یہ کھلی ہوئی شہادت ایک شافعی عالم کی ہے کہ قضا کا محکمہ عباسیوں کے عہد حکومت میں حنفیوں ہی کے قبضے میں رہا اسی کے ساتھ مقریزی کے اس بیان کو بھی ملا لیجئے جس کا بڑی تفصیل سے اس نے ذکر کیا ہے۔خلاصہ یہ ہے کہ ۳۹۳ ہجری میں مشہور شافعی عالم ابو حامد اسفرائینی کی کوشش سے خلیفہ قادر باللہ نے حنفی قاضی ابو محمد بن الاکفانی کی جگہ ایک شافعی عالم احمد بن محمد مازری کا قاضی القضاۃ کے عہدے پر تقرر کر دیا یہ ایک ایسا واقعہ تھا کہ نہ صرف بغداد بلکہ سارے مشرقی علاقے جو عباسیوں کے زیر اقتدار تھے۔ان میں ہلچل مچ گئی۔آخر نیشاپور سے قاضی ابو العلاء صاعد بن محمد بغداد آئے طول طویل جھگڑوں کے بعد خلیفہ کو شافعی قاضی کے عزل پر اور ان کی جگہ الاکفانی کو مقرر کرنا پڑا اس موقعہ پر جو بیان ایوان خلافت سے شورش عام کو دبانے کے لئے شائع ہوا تھا یہ ظاہر کرتے ہوئے کہ بعض غلط فہمیوں اور بداندیشوں کی دراندازیوں کی وجہ سے یہ غلط انتخاب عمل میں آیا۔لیکن۔

> اب خلافت کی طرف سے یہ اعلان کیا جاتا ہے کہ امیر المومنین اپنے گذشتہ اسلاف کی روش پر حنفیوں کے ساتھ جو ترجیحی سلوک قضاء القضاء کے سلسلہ میں کیا جاتا تھا اسی کو آئندہ جاری رکھیں گے اور آئندہ احناف ہی کا اس عہدے پر تقرر ہوا کرے گا' المازری کو اسی بنیاد پر معزول کیا جاتا ہے اور جس کا یہ حق ہے اسی کو واپس دلایا جاتا ہے جیسا کہ ہمیشہ سے دستور چلا آتا ہے۔
>
> اعلان کیا جاتا ہے کہ حنفیوں کے احترام واعزاز کا خیال حکومت جیسے اب تک کرتی چلی آئی ہے آئندہ بھی کرتی رہے گی (ص ۱۸۱ مقریزی جلد ۴)

یہ اور اسی قسم کی باتوں پر خلافت کا فرمان مشتمل تھا۔

بہر حال چوتھی صدی ہجری تقریباً جس وقت ختم ہو رہی تھی عباسی حکومت نے ''فقہ حنفی'' کے علماء سے اپنے عہد قدیم کی گویا یہ تجدید کی تھی اور اس سے حنفی علماء کے اقتدار کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ جو حکومت پر انہوں نے حاصل کر لیا تھا۔ آپ نے دیکھا کہ ایک تقرر جو علماء احناف کے منشاء کے خلاف ہوا تھا۔ اس نے مشرق سے مغرب تک ملک میں ہلچل پیدا کر دی اور فتنہ اس وقت تک فرو نہ ہو سکا' جب تک کہ حکومت اپنی غلطی کے اعتراف کے بعد اس غلطی کی اصلاح پر آمادہ نہ ہوئی۔

سچ تو یہ ہے کہ حنفی مورخین کا یہ بیان اگر صحیح ہے' اور جس سند سے موفق نے یہ روایت درج کی ہے اس میں کوئی غیر معتبر آدمی بھی نہیں ہے یعنی مامون الرشید ہارون کے زمانے میں جب مرو کا والی تھا' اور قاضی خالد بن صبیح وہاں کے قاضی تھے تو خود قاضی خالد کی یہ روایت ہے کہ ایک مقدمہ میں بجائے امام ابوحنیفہ کے قول کے میں نے قاضی ابو یوسف کے قول کے مطابق فیصلہ صادر کر دیا تھا' اس کی خبر جب مامون الرشید کو معلوم ہوئی تو اس نے مجھے ہدایت کی کہ:

''مسئلہ میں جب تک ابوحنیفہ کا قول موجود ہو' فیصلہ اسی کے مطابق کیا کرو اور اس سے ہرگز تجاوز نہ کرو۔ (ص ۱۵۹ ج ۲)

آپ دیکھ رہے ہیں کہ امام ابوحنیفہ اور ان کے تفقہ و اجتہاد کی قدر و منزلت عباسیوں کے ابتدائی خلفاء کے قلوب میں جب اس حد تک قائم ہو چکی تھی کہ خود ان کے شاگرد ابو یوسف کے قول تک کو اختیار کرنے سے منع کیا جاتا تھا۔ جب تک امام کا قول موجود ہو' اسی پر قیاس کرنا چاہیے کہ دوسرے علماء اور فقہا کے آراء اور فتاویٰ کے لیے کیا گنجائش رہی ہوگی' اور جیسا کہ میں نے عرض کیا آئندہ یہ رنگ روز بروز پختہ تر ہوتا چلا گیا تو عباسیوں کی حکومت میں بحیثیت قاضی ہونے کے دوسروں کے داخل ہونے کی صورت ہی کیا باقی رہی ہوگی۔ الا یہ کہ خود علماء احناف ہی ان کے تقرر پر جب کبھی راضی ہو جاتے تھے تو کبھی کبھی دوسروں کو بھی موقعہ مل جاتا تھا۔ مازری کے قصے میں فتنہ دراصل اٹھا ہی

اس لئے تھا کہ بقول مقریزی۔

اجیب الیه بغیر رضا یعنی مازری کے تقرر کو قادر باللہ نے قاضی اکفانی الاکفانی. (ص ۱۴۵) سے رائے لئے بغیر منظور کر لیا تھا۔

نہ صرف اس فقرے سے بلکہ دوسرے معلومات سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ درمیان میں کبھی کبھی غیر حنفی قضاۃ کا تقرر ہو بھی جاتا تھا تو اس میں حنفی قاضی القضاۃ کی رائے ضرور شریک ہوتی تھی۔

بہر حال بات بہت طویل ہو گئی۔ میں یہ کہنا چاہتا تھا کہ امام ابوحنیفہ نے جو کچھ سوچ کر وضع قوانین کی مجلس بنائی تھی، اور جن لوگوں کو اپنی صحبت میں رکھ کر تیار کیا تھا امام کی للّٰہیت اور صادق نیت کا یہ اثر تھا کہ خدا نے ان کو اس میں بھی کامیاب کیا کہ ان کی مجلس کے وضع کردہ قوانین کے مجموعہ نے حکومت کے باضابطہ آئین کی حیثیت حاصل کر لی اور بنی امیہ کے خلفاء کی بے تمیزیوں کی وجہ سے شریعت اسلامی کے مطابق زندگی بسر کرنے کی نعمت سے بتدریج مسلمان جو محروم ہوتے چلے جا رہے تھے امام کو خدا نے اس میں کامیابی نصیب کی کہ ان پر حکومت نے اسی قانون کو نافذ کر دیا جو اپنے خصوصیات کی بنیاد پر ان کے دین کے منشا اور روح کا سب سے بڑا محافظ اور جو ان کی شریعت محتاط ترین شرح بغیر کسی دغدغہ کے قرار دی جا سکتی ہے اور اسی کے ساتھ سیرت سازی اور کردار تراشی کا جو فطری سلیقہ امام میں تھا اس کی بدولت نہ صرف ابتدائی زمانے میں بلکہ بعد کو بھی اس قانون کے نفاذ و انطباق کے لئے حکومت کو عموماً ایسی ہستیاں ملتی رہیں، جن میں سب کے متعلق تو نہیں کہا جا سکتا لیکن اکثریت ان ہی لوگوں کی تھی جو امام ابوحنیفہ کی ڈھالی ہوئی سیرتوں کی زمانہ دراز تک نمائندگی کرتے رہے۔

میرا مطلب یہ ہے کہ قاضی القضاۃ کے اس عہدے پر جو حکومت کا اہم ترین شعبہ بن گیا تھا اس پر امام ابوحنیفہ کے براہ راست ساختہ پرداختہ تلامذہ کے بعد جن لوگوں کا تقرر ہوتا رہا۔ ان کے متعلق یہ کلی دعویٰ تو غلط ہوگا کہ سب کی سیرتیں معیاری نہیں نہ یہ عقلاً ہی جائز ہو سکتا ہے، اور نہ واقعات ہی سے اس کی تائید ہوتی ہے کسی اور قوم کی تاریخ ہوتی

تو ممکن تھا کہ اس میں واقعات کے چھپانے کی کوشش بھی کی جاتی بلکہ میرا خیال تو یہ ہے کہ بہت سی قوموں نے اپنی تاریخ کو شاید اسی خیال سے کہ اچھے واقعات کے ساتھ افراد قوم کے برے حالات کا بھی تذکرہ کرنا پڑتا ہے اس لئے سرے سے انہوں نے تاریخ کے قصے ہی کو ختم کر دیا شاید ان کے لئے غالباً اسی وجہ سے یہ آسان ہو گیا ہے کہ اپنے گذرے ہوئے بزرگوں کو جو جی میں آئے مان لیں' فرشتہ مان لیں' دیوتا مان لیں' یا ان سے بھی زیادہ بڑی چیزیں مان لیں' لیکن مسلمانوں نے تاریخ بنائی نہیں ہے بلکہ جو واقعات گذرے ہیں' انہیں قلم بند کر لیا ہے' آپ دیکھئے قضاۃ ہی کا قصہ ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ عہدہ ہی اس قسم کا تھا جس میں اہل علم کے سوا خصوصاً امام ابوحنیفہ کی کوشش کے بعد دوسرے کا داخلہ ممکن ہی نہ تھا۔ لیکن مسلمانوں نے محض اس لئے کہ علماء کے طبقہ سے چونکہ ان کا تعلق ہے اس لئے یہ نہیں کیا ہے کہ اچھوں کی اچھائیوں کے ساتھ بروں کی برائیوں کے ذکر کو نظر انداز کر دیا ہو۔ آپ ان قضاۃ کی تاریخ اٹھا کر پڑھیے۔ ان میں آپ کو ہر طرح کے لوگ نظر آئیں گے۔ یہی آل ابن ابی الشوارب' یا آل دامغانی کے قضاۃ ہیں۔ ان میں جہاں اچھے معیاری قضاۃ گذرے ہیں ان ہی کے ساتھ اسلامی مورخین ہمیں یہ بھی سناتے ہیں کہ آل ابن ابی الشوارت کے مشہور قاضی محمد بن حسن بن عبداللہ المتوفی ۲۶۷ھ ہجری ان میں جہاں یہ خوبیاں تھیں کہ بڑے سخی اور جواد تھے وہیں ان کی زندگی کا ایک پہلو یہ بھی تھا کہ:

كان قبيح الذكر فيما يتولاه من الاعمال منسوباً الى الاستر شاء على الاحكام والعمل فيها بمالا يحوز وقد شاع ذلك عند (الخطيب ص ۲۰۱ ج ۲)	جس عہدے کی ذمہ داری ان کے سپرد کی جاتی تھی اس میں ان کا ذکر برائی کے ساتھ لوگ کرتے تھے اپنے کام میں رشوت خواری اور عمل میں ناروا باتوں کا یہ ارتکاب کرتے تھے اور یہ بات ان کے متعلق عام طور پر پھیلی ہوئی ہے۔

اور جیسے اس خاندان کے بعض افراد کا یہ حال تھا اسی طرح عباسی قاضیوں کے

دوسرے خانوادے الدامغانی کے ایک بزرگ جن کا نام حسین بن احمد الدامغانی تھا ۵۷۹ھ میں وفات ہوئی ہے۔ ان کے حالات میں بھی لکھے ہیں:

لم یکن محمود السیرة فی حکمه. (جواھر مغیه ص ۲۰۸ ج ۱) — اپنے فیصلوں میں ان کا کردار قابل تعریف نہ تھا۔

قاضیوں کی کمزوری کردار کی یہی عام تعبیر اس زمانے میں تھی جس سے اشارہ وہی رشوت ستانی وغیرہ کی طرف کیا جاتا تھا۔ لیکن اسی کے ساتھ بلا خوف تردید یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ بحمد اللہ اکثریت زمانہ درانہ تک ان ہی لوگوں کی رہی جو حتی الوسع اپنے قدیم اسلاف کی روایتوں کو زندہ کئے ہوئے تھے اور یہی نہیں کہ قضاۃ کے سلسلے میں امام ابوحنیفہ اور ان کے تلامذہ ان شاگردوں کی سیرت کی پیروی کی جاتی تھی جنہیں امام نے اپنی صحبت میں رکھ کر بنایا تھا بلکہ ایک طبقہ حنفی فقہا کا ہر زمانہ میں پایا گیا ہے جو امام کے نقش قدم پر باوجود اصرار شدید کے حکومت کی ملازمت سے کارہ رہا اور گریز کرتا رہا۔ امام کے شاگردوں کے حالات کا تذکرہ تو مختلف حیثیتوں سے گذر چکا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ پچھلے زمانہ کی چند مثالی ہستیوں کے ذکر پر اس کتاب کو ختم کردوں۔

میں نے کہا تھا کہ امام کے تلامذہ میں جن لوگوں نے قضا کا عہدہ قبول کر لیا تھا۔ ان میں بعض حضرات تو ایسے تھے جو حکومت کی تنخواہ اور داد و دہش کے لینے سے انکار نہیں کرتے تھے۔ ابن جوزی نے ۲۵۸ہجری کے واقعات کے سلسلہ میں حنفی قاضی احمد بن بدیل کے حالات کا ذکر کرتے ہوئے بیان کیا ہے کہ معتصم کے مشہور ترکی جنرل بغا کے بیٹے موسیٰ بن بغا کا ایک مقدمہ مرو میں کسی جائداد کے متعلق دائر تھا۔ مقدمہ تو خیر طویل ہے' خلاصہ یہ ہے کہ موسیٰ بن بغا کے سکریٹری عبیداللہ بن سلیمان بیان کرتے تھے کہ موسیٰ ایک جائداد کے لینے کا خواہش مند تھا۔ جس میں کسی یتیم کا بھی حصہ تھا قاضی ابن بدیل کو میں نے لاکھ آمادہ کیا کہ موسیٰ کی جلالت قدر کا خیال کر کے یتیم کے معاملہ میں تھوڑی چشم

پوشی سے کام لیں لیکن وہ کسی طرح راضی نہیں ہوئے تب میں نے جھنجھلا کر کہا کہ قاضی کچھ سمجھ بھی رہے ہو۔ معاملہ کس کا ہے؟ انہ موسی بن بقا (یعنی موسیٰ بن بغا کا معاملہ ہے) لیکن سننے کے ساتھ قاضی کی زبان سے نکلا کہ اعزک اللہ انہ تبارک وتعالیٰ (خدا تیری عزت کو قائم رکھے ادھر بھی تو اللہ تبارک وتعالیٰ کا معاملہ ہے) عبیداللہ کا بیان ہے کہ شرم سے میری گردن جھک گئی اور میں نے جب موسیٰ کے سامنے قاضی کے اس فقرے کو دہرایا تو وہ بھی اس درجہ متاثر ہوا کہ ''انہ تبارک وتعالیٰ'' کے الفاظ کو بار بار دہراتا تھا اور روتا جاتا تھا۔ پھر اس نے قاضی صاحب کو کہلا بھیجا کہ آپ کو جس چیز کی بھی ضرورت ہو بے تکلف طلب کرلیا کیجئے۔ جواب میں کہلا بھیجا کہ میری مقررہ تنخواہ رکی ہوئی ہے، بس اس کے سوا اور مجھے کچھ نہیں چاہیے۔ (المنتظم ص ۹ ج ۵)

اور یہ قصہ تو ایک ایسے قاضی کا تھا جو تنخواہ لے کر کام کرتے تھے، میں نے ذکر کیا تھا کہ امام کے براہ راست شاگردوں میں قاضی قاسم بن معن بھی ہیں جو قضا کی خدمت حسبۃً للہ بغیر کسی معاوضہ کے انجام دیتے تھے لیکن قصہ ان ہی پر ختم نہیں ہو گیا تھا بعد کو بھی حنفی فقہاء میں ایسی مثالیں پیدا ہوتی رہی ہیں، ابن جوزی ہی نے قاضی حسن بن عبداللہ جن کی وفات ۳۸۴ ہجری میں ہوئی ہے یعنی چوتھی صدی ہجری کے عالم ہیں ان کے والد مجوسی تھے بہزاد نام تھا مسلمان ہونے کے بعد عبداللہ نام رکھ لیا تھا، بہر حال ابن جوزی کا بیان ہے کہ درس اور قضا دونوں خدمتیں انجام دیتے تھے لیکن قطعاً حکومت سے کبھی اس کا معاوضہ نہ لیا، ان کا قاعدہ تھا کہ روزانہ دس ورق کی کتابت کرلیتے تھے جس سے روزانہ دس درم ان کو مل جاتے تھے جو ان کی گذر کے لئے کافی ہو جاتا تھا دستور تھا کہ پہلے یہ دس ورق لکھ لیتے تب قضا اور تدریس کی خدمت کے لئے گھر سے باہر نکلتے۔ (ص ۹۵ ج ۷ منتظم)

اور یہ مثالیں تو ان لوگوں کی تھیں جنہوں نے قضا کی خدمت قبول کرلی تھی۔ لیکن آپ علماء احناف کے طبقات کی کتابیں پڑھیے مشکل ہی سے کوئی زمانہ ایسا ملے گا جس

میں آپ کو ایسے علماء نظر نہ آئیں جن کو ملازمت کے قبول کرنے پر حکومت مجبور کرتی رہی لیکن امام کے نقش قدم کی پیروی کرتے ہوئے کسی طرح آمادہ نہ ہوئے ابتدائی صدیوں میں تو خیر ایسے بزرگوں کی کثرت ہے۔ لیکن پانچویں صدی تک کے عالم محمدؒ بن موسیٰ کے حال میں ابن جوزی نے لکھا ہے کہ اپنے وقت میں حنفی مذہب کی ریاست ان ہی پر ختم ہوتی تھی حکومت نے لاکھ چاہا کہ کسی طرح قضا کے عہدے قبول کر لیں لیکن راضی نہ ہوئے۔[1] (ص ۲۶۶)

حکومت عباسیہ کو متاثر کرنے میں امام رحمۃ اللہ علیہ کی کوششیں کس حد تک بارآور ہوئیں' اس وقت تک محض اسی کی تفصیل میں وقت صرف ہو گیا پھر بھی بہت سی چیزوں کے فقط اجمالی تذکرے پر قناعت کرنی پڑی خصوصاً اس حکومت کے بعض ممتاز قاضیوں کے حالات تفصیل کے طالب تھے۔ لیکن کتاب اپنے مقررہ پیمانے سے یوں ہی زیادہ بڑھ چکی ہے مجبوراً قلم کو روکنا پڑا۔

---

[1] محمدؒ بن موسیٰ کے حال میں ابن جوزی نے یہ عجیب بات لکھی ہے کہ باوجودیکہ حنفی فقہاء کے اپنے عہد میں یہ سرخیل تھے بڑے بڑے احناف ان سے شرف تلمذر کھتے ہیں خصوصاً قاضی صمیری جن کی طبقات حنفیہ میں بہترین کتاب ہے' ان ہی کے شاگرد ہیں' لیکن نماز کے متعلق لکھا ہے کہ ایک حنبلی امام کے پیچھے پڑھا کرتے تھے بلکہ معلوم ہوتا ہے کہ قصداً اسی کو انہوں نے اپنا امام بنایا تھا۔ اس سلسلہ میں یعنی حکومت سے امداد کے نہ لینے میں بعضوں کا غلو کس حد تک پہنچا ہوا تھا مشہور حنفی امام ابوالحسن الکرخی کا دردناک قصہ ہے بغداد میں حنفی فقہ کے اپنے زمانے میں سب سے بڑے مدرس و مفتی تھے حکومت کی ملازمت سے گریز کرتے رہے۔ آخر عمر میں فالج کا حملہ ہوا افلاس کی وجہ سے جیسا کہ چاہیے تھا علاج ممکن نہ ہوا ان کے بعض شاگردوں نے حلب کے بادشاہ سیف الدولہ کو لکھ بھیجا کہ اتنا بڑا عالم مفلسی کی وجہ سے اپنا علاج بھی نہیں کرا سکتا۔ اسی وقت دس ہزار درم سیف الدولہ نے روانہ کئے روپے کے پہنچنے سے پہلے کسی طرح الکرخی کو اس کی خبر ہو گئی کہ لوگوں نے سیف الدولہ سے میرے لئے امداد طلب کی ہے لکھا ہے کہ گڑگڑا کر خدا سے کہنے لگے کہ آپ نے رزق جس راہ سے مجھے عطا کیا ہے اس کے سوا دوسری راہ مجھ پر نہ کھولئے کہتے ہیں کہ روپیہ پہنچنے سے پہلے کرخی کا انتقال ہو چکا تھا خدا نے سیف الدولہ کے احسان سے ان کو بچا لیا۔ ۱۲

دوسری حکومتوں کی عدالتوں پر فقہ حنفی کا اثر

اب آخر میں یہ بتا کر کہ حکومت عباسیہ کی اثر پذیری کے بعد دوسری حکومتوں پر امام کی جدوجہد کا بالواسطہ کیا اثر پڑا۔ اس کتاب کو ختم کر دیتا ہوں۔

واقعہ یہ ہے کہ ٹھیک ان ہی دنوں میں جب ہارون الرشید کے سامنے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہ گیا تھا کہ دولت عباسیہ کے محاکم عدل و قضا کی باگ بالکلیہ قاضی ابو یوسف کے سپرد کر دے، جیسا کہ معلوم ہو چکا' بالآخر یہی اس کو کرنا بھی پڑا عباسیوں کے اس اقدام کو دیکھ کر جیسا کہ المقریزی نے لکھا ہے اسلام کی مغربی حکومت یعنی بنی امیہ کی اندلس میں جو حکومت قائم تھی اس حکومت نے بجائے امام ابوحنیفہ کے حضرت امام مالک کے ایک شاگرد جن کا نام یحییٰ بن یحییٰ معمودی تھا۔ ان ہی کو بلا کر اپنی حکومت کے عدلیہ کو ان کے سپرد کر دیا۔ المقریزی کے بجز الفاظ کا ترجمہ یہ ہے کہ:

"ہارون الرشید مسند آرائے خلافت ہوا اور قاضی ابو یوسف یعقوب بن ابراہیم جو امام ابوحنیفہ کے تلامذہ میں سے تھے ان کے حوالہ ہارون نے قضا کا محکمہ کر دیا یہ ۱۷۰ھ ہجری کا واقعہ ہے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عراق خراسان شام مصر میں" قاضیوں کا تقرر ابو یوسف کی رائے کے ساتھ وابستہ ہو گیا ان تمام علاقوں میں وہی قاضی مقرر ہو سکتا تھا جس کے تقرر کی منظوری قاضی ابو یوسف دیتے تھے اسی طرح اندلس میں الحکم المرتضیٰ بن ہشام بن عبدالرحمٰن بن معاویہ بن ہشام بن عبدالملک بن مروان اپنے باپ کے بعد تخت حکومت پر متمکن ہوا اور اپنا لقب اس نے منتصر رکھا۔ اسی لئے ۱۸۰ھ ہجری میں یحییٰ بن یحییٰ بن کثیر الاندلسی سے خصوصی تعلقات قائم کئے' یحییٰ نے حج بھی کیا تھا اور امام مالک سے موطا ان کی کتاب بھی سنی تھی بجز چند ابواب کے پھر (امام مالک کے تلامذہ) وہب اور ابن القاسم وغیرہ سے بھی اس نے علم کا بہت بڑا سرمایہ حاصل کیا تھا (تعلیم کے ان مراحل کو طے کرنے

کے بعد یحییٰ) اندلس واپس ہوئے اور (بنی امیہ کی اس مغربی حکومت) میں ایسا اقتدار ان کو حاصل ہوا' جو آج تک کسی دوسرے کو نصیب نہ ہوا تھا۔ حکومت اور عوام دونوں ہی کا مرکز و مرجع' ملجاد ماویٰ یحییٰ کا دروازہ تھا' سارے اختیارات ان ہی کو دے دیئے گئے تھے اندلس میں کوئی قاضی ان کی منظوری کے بغیر مقرر نہیں ہوسکتا تھا۔ (ص ۱۸۱ مقریزی جلد ۴)

جس کا مطلب یہی ہوا کہ اندلس کی اموی حکومت جیسے تمام دوسرے معاملات میں عباسیوں کو دیکھتی رہتی تھی اور مشرق کی اسی حکومت کو اس نے اپنے لئے نمونہ بنا رکھا تھا قضا اور عدالت کے باب میں بھی اس کو وہی کرنا پڑا' جس کا فیصلہ عباسی حکومت کر چکی تھی۔ اسی لئے اندلس کے اس انقلاب کو بھی میں امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی کوششوں کا بالواسطہ نتیجہ قرار دیتا ہوں اور خواہ اسے خوش اعتقادی ہی کیوں نہ سمجھا جائے لیکن میرا خیال ہے کہ امام ابو حنیفہ کے اثر اور زور کو عراق اور اس کے زیر اثر ممالک میں توڑنے کے لئے عباسی حکمرانوں خصوصاً ابو جعفر منصور نے امام مالک کو بغداد لا کر جو کھڑا کرنا چاہا تھا جس کی تفصیل گذر چکی۔ لیکن جب کبھی امام کے سامنے یہ تجویز پیش کی گئی۔ آپ سن چکے کہ امام دار الہجرت نے صاف لفظوں میں انکار فرما دیا' ابو جعفر سے بھی یہی کہا' اور کہا جاتا ہے کہ ہارون کو بھی آپ نے خشک جواب دے کر مایوس کر دیا تھا۔ میرا یہ احساس ہے کہ قدرت کی طرف سے اسی اخلاص اور للہیت کا صلہ حضرت امام مالک کو اس شکل میں ملا کہ ان سے دور بہت دور ایسی حکومت جو یورپ میں قائم تھی اس نے امام مالک کی فقہ کو اپنی حکومت کے آئین کی حیثیت سے تسلیم کر لیا اور اسی کو اپنے ممالک محروسہ میں نافذ کر دیا۔

یہ سوال کہ اندلسی حکومت میں امام مالک کی فقہ کو جو حیثیت حاصل ہوئی کیا اس میں خود امام کو بھی کسی حیثیت سے دخل تھا؟ ایک دلچسپ سوال ہے اتنی بات تو صحیح ہے کہ حج و زیارت کے سلسلے میں اندلس اور مغرب اقصیٰ کے مسلمانوں کی آمد و رفت حجاز میں جاری تھی۔ امام مالک اپنے عہد میں حجاز کے سب سے بڑے عالم و فقیہ و محدث تھے قدرتاً باہر سے آنے والے لوگوں میں امام سے ملنے کی تمنا رہتی تھی خصوصاً نوجوانوں کا جو طبقہ مغربی

علاقوں سے علاوہ حج وزیارت کے تحصیل علم کا بھی شوق رکھتا تھا۔ اس کو امام مالک کے قالب میں علم کا ایک ایسا سرچشمہ مدینہ منورہ میں بآسانی مل جاتا تھا جس کی تلاش میں علاوہ حج وزیارت کے سفر کے کسی دوسرے سفر کی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ امام مالک کے حلقہ درس میں ہمیشہ مغربی ممالک کے طلبہ کی کافی تعداد رہتی تھی۔ نقل کرنے والے امام مالک سے ایسی روایتیں نقل کرتے ہیں کہ فارغ ہونے کے بعد جب مغربی علاقے کے ان طلبہ کو آپ رخصت فرماتے تو اس وقت آپ کی زبان مبارک سے ایسے الفاظ بھی نقل جاتے تھے جن سے معلوم ہوتا تھا کہ اس مغربی حکومت کو اپنی فقہ کی سرپرستی پر آپ متوجہ کرنا چاہتے ہیں۔[1]

خود بھی یحییٰ بن یحییٰ معمودی جو بنی امیہ کی اندلسی حکومت کے گویا قاضی ابو یوسف تھے ان کا بیان ہے کہ امام مالک سے وطن جانے کے لئے میں رخصت ہونے لگا تو امام سے میں نے درخواست کی کہ مجھے خاص طور پر کچھ ہدایتیں دی جائیں۔ یحییٰ کہتے ہیں کہ میری اس درخواست پر آخری وصیت امام نے نے مجھے یہ کی جس کا خلاصہ یہ تھا کہ:

> ''اللہ کی' اللہ کے کتاب کی' مسلمانوں کے ائمہ (حکمرانوں) کی اور عام مسلمانوں کی بہی خواہی' اس کو اپنی زندگی کا فرض منصبی قرار دینا۔'' (ص۳۵۱ الدیباج المذہب)

یہ خود یحییٰ کا براہ راست بیان ہے میرا خیال ہے کہ امام مالک کی طرف جس آرزو کو لوگ منسوب کرتے ہیں' خدا نے جسے پوری کیا اس آرزو کی جھلک امام کی اس وصیت میں بھی نظر آتی ہے آخر امام ابوحنیفہ بھی اس کے سوا اور کیا چاہتے تھے یہی کہ مسلمانوں کی حکومت مسلمانوں کی کتاب (قرآن) کی مرضی کے مطابق حکومت کرے' امام مالک نے بھی مذکورہ بالا الفاظ سے اسی خواہش کا تو اظہار کیا ہے۔

---

[1] تیمور پاشا مصری کا مقالہ فقہ اسلامی کی تاریخ پر عربی زبان میں اگرچہ ایک مختصر سی کتاب ہے مگر معلومات اس کے قیمتی ہیں اس مقالہ میں بھی امام مالک کی طرف اس قسم کے الفاظ منسوب کئے گئے ہیں۔۱۲

حاصل کلام

بہر حال کچھ بھی ہو کوفہ میں امام نے جس نصب العین کو پیش نظر رکھ کر کام کرنا شروع کیا تھا کسی نہ کسی طرح پہلے مشرق اور مشرق کے بعد مغرب کے مسلمانوں کی زندگی اسی دستور اور آئین کے نیچے آگئی فرق مغرب اور مشرق میں اگر کچھ ہوا تو یہی کہ مشرقی ممالک میں اسلامی شریعت کی حنفی تشریح نافذ ہوئی اور مغربی علاقوں میں امام مالک کے نقطہ نظر کو حسن قبول حاصل ہوا۔ اصل مقصد دونوں حال میں حاصل ہو گیا۔ یعنی حکمرانوں اور ان کے وزراء و امراء کے ذاتی خیالات و جذبات کی پابندیوں سے نکل کر مسلمانوں کو اپنے دین کے تحت آئینی زندگی بسر کرنے کا موقعہ مل گیا۔

اور مسئلہ اسلام کی ان ہی دونوں مرکزی حکومتوں یا خلافتوں کی حد تک محدود نہ رہا' بلکہ ان حکومتوں کے ساتھ ان کے زیر اثر یا ان سے آزاد ہو کر دنیا کے مختلف حصوں میں جو حکومتیں قائم ہوتی رہیں' یا ان دونوں مرکزی سلطنتوں کے زوال کے بعد مسلمانوں نے اپنی بادشاہت مشرق یا مغرب کے کسی علاقے میں قائم کی' تو جیسا کہ چاہیے تھا' عموماً ان حکومتوں کے سامنے حکمرانی کے معیاری نمونے مشرقی اور مغربی خلافت کے طور طریقے تھے چونکہ دونوں خلافتوں میں عدلیہ کا محکمہ بالکلیہ علماء دین کے سپرد کر دیا گیا تھا۔ اس لئے آئندہ ہر حکومت کو یہی کرنا پڑا اور گو حکومتیں بدلتی رہیں' انقلاب پر انقلاب برپا ہوتے رہے۔ لیکن امام ابوحنیفہ کو جو کامیابی اپنے نصب العین کی تکمیل میں ہوئی تھی یقین مانئے کہ آخر وقت تک یعنی دنیا کی سیاست کی امامت و قیادت مسلمانوں کے ہاتھ سے مغربی اقوام کے جب تک منتقل نہیں ہوئی تھی' برابر یہی دستور اپنے پورے اقتدار و اختیار کے ساتھ جاری رہا اس معاملہ میں امام ابوحنیفہ کا وجود اتنا نمایاں اور روشن تھا کہ جب مصر پر ایک غیر سنی حکومت یعنی فاطمیوں یا عبیدیوں کا اقتدار قائم ہوا تو گو اہل سنت کے ائمہ کی فقہ کو اس نے تسلیم نہیں کیا' لیکن یہ مسئلہ کہ عدلیہ کا محکمہ علماء ہی کے ہاتھ میں رہے گا اس

مروجہ دستور کے ماننے اور نافذ کرنے پر اس کو بھی مجبور ہونا پڑا' بلکہ ایک دل چسپ لطیفہ اس حکومت کا یہ ہے کہ مصری فاطمیوں کا پہلا حکمراں المعز الدین اللہ سے مقابلہ کرتے ہوئے ایک قاضی بھی معز کے ساتھ آیا تھا جس کا خدا جانے اصلی نام کیا تھا۔لیکن بعد کو وہ ابوحنیفہ نعمان ہی کے نام سے مشہور ہوا' گویا جیسے عباسی حکومت کے آئینی شعبے کی بنیاد میں امام ابوحنیفہ نعمان تھے۔اس کی نقل اتارنے والی مصری حکومت نے نام تک میں اس کی تقلید کی' کہتے ہیں کہ پہلے فاطمیوں کا یہ قاضی مالکی فقہ کا پابند تھا۔لیکن معز کی صحبت میں اس نے امامیہ مشرب اختیار کیا' لوگوں کا بیان ہے کہ بجائے خود بڑا عالم و فاضل آدمی تھا' اہل سنت کے ائمہ اجتہاد کے مقابلہ میں اس نے بھی بڑی بڑی ضخیم کتابیں لکھی تھیں جن میں سینوں کی فقہ پر اس نے سخت تنقیدیں کی تھیں (دیکھو الیافعی ص ۳۸۱ جلد ۲ ولسان المیزان وغیرہ) میرے نزدیک تو امام ابوحنیفہ کی خدمات کا غیروں کی طرف سے یہ عملی اعتراف تھا۔

یہ مسئلہ کہ قاضی ابویوسف کے حوالہ جس دن سے ہارون نے دولت عباسیہ کے عدلیہ کو کیا تھا اس دن سے آخر وقت تک مسلسل یعنی اسلامی دول کے تفوق و برتری کا کرۂ زمین پر جب تک خاتمہ نہ ہوا اس وقت تک جس زمانہ اور جس ملک میں بھی مسلمانوں کی حکومتیں قائم ہوتی رہیں۔ان کا محکمہ عدلیہ ہمیشہ علماء ہی کے ہاتھ میں رہا۔اگر اس کی بھی تفصیل کا ارادہ کیا گیا تو کتاب بجائے ایک جلد کے مجلدات کی شکل اختیار کر لے گی' مختصر اتنا سمجھ لینا چاہیے کہ جیسے جیسے زمانہ آگے کی طرف بڑھتا رہا۔قاضی القضاۃ اور اس کے اختیار و اقتدار کی قوتوں میں قوتوں کا اضافہ ہی ہوتا چلا گیا' سلاطین اور حکمرانوں نے ہمیشہ ان قاضیوں کے سامنے اپنے آپ کو بے دست و پا محسوس کیا' قاضی ہی کے کردار کی نرمی یا کمزوری سے نفع اٹھا لیتے تھے تو یہ دوسری بات ہے۔لیکن القضاۃ بجائے خود کسی بات پر اگر ڈٹ جاتا تھا تو حالات ہی ایسے پیدا ہو گئے تھے کہ حکومت اس سرتابی اور انحراف نہیں کر سکتی تھی حتیٰ کہ نومسلم تاتاری حکمرانوں کا جب دور دورہ ہوا تو قضاۃ کے

اقتدار میں اس وقت بھی کسی قسم کی کوئی کمی نہیں ہوئی' بلکہ تاتاری اور ترکی قبائل پر جہاں تک میرا خیال ہے علماء کا اثر و نفوذ عربوں سے زیادہ ہی قائم رہا[1] حکومتوں کے بدل

---

[1] آج امام ابوحنیفہ کے مشہد و روضہ کے نام سے بغداد میں جو عظیم الشان عمارت نظر آتی ہے تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ترک مسلمانوں کی یادگار ہے' ابن جوزی نے اپنی تاریخ میں ابن عقیل کے حوالہ سے یہ قصہ نقل کیا ہے کہ ابتداء میں امام ابوحنیفہ کی قبر پر صرف ایک سائبان سی کوئی چیز تھی' ابن عقیل کہتے ہیں ۴۳۶ھ ہجری میں جس وقت میری عمر پانچ سال کے قریب تھی یہ میرے سامنے کی بات ہے کہ ایک ترکی امیر نے امام کی قبر کے سامنے چونے اور گچھ سے ایک عظیم مسجد کی بنیاد رکھی یہ ترکی امیر حج کے سلسلہ میں بغداد آیا تھا۔ پھر شرف الملک نے جو امام کے شدید عقیدت مندوں میں تھا اس نے اس قبہ کی تعمیر کی جو اس وقت امام کے روضہ پر پایا جاتا ہے' ابن عقیل کا بیان ہے کہ شرف الملک سے پہلے ایک ترکمان امیر نے بجائے سائبان کے امام کی قبر کو مسقف کر دیا۔ پھر ان عقیل نے ایک عجیب بات نقل کی ہے' یعنی شرف الملک نے امام کی قبر پر قبہ کی تعمیر کا جب ارادہ کیا تو سامنے جو مسجد تھی' اور دوسرے مکانات تھے سب گرا دیئے گئے' اور بڑے بڑے ماہر مہندسین (انجینئر) اور قطاعین (نقشہ مکانوں کا بنانے والے) حاضر کئے گئے' قبہ کی تعمیر کے لئے جب زمین کھودی جانے لگی تو سخت زمین کی تلاش میں سترہ ہاتھ گہرائی اور سولہ ہاتھ عرض کھود دینا پڑا' اس کھدائی میں بہت سی ہڈیاں برآمد ہوئیں جو گذشتہ اموات کی وہاں پر دفن تھیں' امام ابوحنیفہ کی قبر کی قربت کی وجہ سے لوگ وہاں چار سو سال سے دفن ہوتے چلے آرہے تھے' ان ہڈیوں کو کسی دوسری جگہ لے جا کر لوگوں نے دفن کر دیا' کہتے ہیں کہ اسی سلسلہ میں ایک مسلم لاش بھی برآمد ہوئی جس کی ہڈیاں باہم ایک دوسرے کے ساتھ پیوستہ تھیں یعنی الگ الگ نہیں ہوئی تھیں اور کافور کی خوشبو اس نے نکل رہی تھی۔ ابن جوزی نے اس کے بعد ابن عقیل کا یہ لطیفہ نقل کیا ہے کہ لوگوں سے میں نے کہا کہ کہیں ایسا تو نہیں ہوا کہ جس کے لئے پھر یہ سہرپیا قبہ بنایا گیا ہے وہ اس مقام میں اب موجود نہ ہو' یعنی ابن عقیل کا خیال تھا کہ ہڈیاں جو برآمد ہوئی تھیں ان ہی میں امام ابوحنیفہ کی لاش بھی شریک تھی خصوصاً جو مسلم ڈھانچہ کافور کی خوشبو والا نکلا تھا ابن عقیل کے اس لطیفہ کی وجہ سے کافی ہلچل بغداد میں مچ گئی تھی' ابن جوزی نے اس روایت کے بعد ابن المہتدی کی زبانی بھی ایک روایت نقل کی ہے کہ امام ابوحنیفہ کا مشہد آج کل جہاں پر ہے یہاں پر امام کے جسد کا ہونا صحیح نہیں ہے۔ ابن مہتدی نے اپنے بیان کی توجیہ کرتے ہوئے کہا کہ جہاں آج کل قبہ تعمیر کیا گیا ہے دراصل قاعدہ یہ چل پڑا تھا کہ (خراسان و ترک سے) حج کے لئے براہ بغداد جو لوگ بقیہ

کے بعد بھی زیادہ تر یہی ہوا کہ قاضی القضاۃ کے عہدے پر جو عالم پہلے سے مقرر تھا آنے والی حکومت نے بھی عموماً اسی کو بحال رکھا' اسی سے اندازہ کیجئے کہ صلاح الدین ایوبی جس وقت دمشق کے قلعہ پر یورش کر رہا تھا' اور قلعہ فتح نہیں ہو رہا تھا' صلاح الدین نے اس عرصے میں دمشق کے قاضی ابوالفضل شہرزوری کے مکان کی طرف رخ کیا۔ صلاح الدین کو دیکھ کر قاضی صاحب کے ہوش وحواس جاتے رہے۔ لیکن فوراً صلاح الدین نے آگے بڑھ کر ان کو تسلی دی اور کہا کہ:

طب نفسا فالامر امرک و البلد بلدک. (ص ۳۹۸ الیافعی جلد ۳)

آپ بالکل مطمئن رہیے' حکم آپ ہی کا حکم رہے گا اور شہر آپ ہی کا شہر رہے گا۔

اگرچہ ظاہر ہے کہ ''خیر القرون'' سے مسلمان جس حد تک دور ہوتے چلے گئے اسلامی خصوصیات کی تر و تازگی افسردگی اور پژمردگی سے بدلتی چلی جارہی تھی زندگی کے دوسرے شعبے جیسے اس عام قانون سے متاثر ہو رہے تھے اس سے طبقہ قضاۃ کا علم و عمل کیسے مستثنیٰ رہ سکتا تھا۔ لیکن بایں ہمہ میں تو اس کو بھی حضرت امام ہی کے خلوص نیت کا نتیجہ خیال کرتا ہوں کہ نومسلم ترک اور تاتاری حکومتوں میں بھی سیرت و کردار کے بعض حیرت انگیز مثالیں آخر زمانہ تک مسلسل ملتی چلی جاتی ہیں۔ حاکم شہید[۱]، شمس[۲] الائمہ سرخسی

بقیہ عرب جاتے تھے تو امام ابوحنیفہ کی قبر خیال کر کے اس مقام کی زیارت کرتے تھے اور طواف کرتے تھے۔ لیکن امام کی قبر کہاں پڑ ہے اس کی خبران کو بھی نہ تھی۔ ص ۲۴۶ منتظم ۸ لیکن یہ یاد رکھنا چاہیے کہ ابن عقیل ہوں یا ابن جوزی حنبلی حضرات ہیں اور حنفیوں سے چٹکی لینے کی عادت انکی پرانی ہے۔ ۱۲

[۱] سامانی امیر بخارا کے عہد میں شہید ہوئے۔

[۲] جند کے جب (یعنی کنوئیں) میں زمانہ تک قید محض اس لئے رکھے گئے کہ ترکی خان نے لوگوں پر ناجائز محصول عائد کئے تھے شمس الائمہ نے اس محصول کے دینے سے خمس کو ابھارا کہ انکار کر دیں حکومت کی طرف سے سخت سزائیں آپ کو دی گئیں آخر میں کنویں میں قید کر دیئے گئے تھے' طلبہ کنوئیں کے سن پر بیٹھ جاتے تھے اور شمس الائمہ اندر سے املاء کراتے تھے مبسوط شمس الائمہ سرخسی کی بقیہ

جیسے بزرگوں کی مثالیں نادر مثالیں نہیں ہیں' علماء کا ایک بڑا طبقہ ہر زمانہ میں دین وعلم کے وقار کی حفاظت میں ممکنہ قربانیاں آخر وقت تک پیش کرتا رہا جس میں ہندوستان کی اسلامی حکومتوں کے قضاۃ کا کافی اور معقول حصہ ہے۔

بلکہ افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ آخر زمانے میں بعض ناقابل عفو مہلک بے ضابطگیاں مسلمانوں کے مظالم قضاء افتاء ودرس امامت وخطابت واحتساب وغیرہ میں جو پیدا ہوگئیں ان میں غیر عربی حکمرانوں اور حکومتوں کی حد تک بڑھی ہوئی ان عقیدت مندیوں کو بھی دخل ہے جو موروثی طور پر ان اقوام وممالک میں مذہبی طبقات کے متعلق پائی جاتی تھیں اور جیسا کہ دستور ہے کہ ہر خیر حدود سے تجاوز کر جانے کے بعد شر بن جاتا ہے' علماء اور قضاۃ کے اقتدار کا بھی حشر یہی ہوا' یہ ایک مستقل کتاب کا مضمون ہے سردست صرف اتنا اجمالی اشارہ کافی ہے۔

امام ابوحنیفہ کے خدمات کی مندرجہ بالا روئداد کے پڑھنے کے بعد میں خیال کرتا ہوں کہ اس زمانے میں ایک سوال دلوں میں جو یہ پیدا ہوتا ہے کہ مسلمانوں کو کرۂ زمین کے بڑے حصہ پر تقریباً ایک ہزار سال تک حکمرانی کے جو مواقع ملے تو ان کی یہ حکمرانیاں کس آئین اور دستور کی پابند تھیں؟ ان کے آئین ودستور کا وہ دفتر کہاں ہے جس کی راہ نمائی میں مسلمان حکومت کے فرائض انجام دیتے رہے' بعض اچھے پڑھے لکھوں کو میں نے دیکھا ہے کہ اس سوال کے جواب میں وہ کچھ چکرا سے جاتے ہیں مسلمانوں کے کتب خانوں میں وہ اسی قسم کی کتابیں تلاش کرتے ہیں جیسے موجودہ زمانہ کی مغربی حکومتیں آئین ودستور کے نام سے مرتب کرتی رہتی ہیں۔ پھر ان کی حیرت کی کوئی انتہاء نہیں رہتی جب کتاب تو کتاب شاید اس نوعیت کے چند اوراق کے پانے میں بھی بے چارے کامیاب نہیں ہوتے اور کچھ چیزیں اس سلسلہ میں ملتی ہیں تو ایک ایسی

لے تمیں جلدوں میں جو طبع ہو چکی ہے اسی زمانے کے لکچروں کا یہ مجموعہ ہے کتاب کے مختلف مقامات پر اس کا ذکر ہے کہ کتاب اس فصل تک پہنچی ہے اور میں ابھی قید ہی کی سزا بھگت رہا ہوں ان لوگوں کے تفصیلی حالات کے لئے ''تدوین فقہ'' کی اشاعت کا انتظار کیجئے۔ ۱۲

قوم جس کی سینکڑوں حکومتیں زمین کے مختلف حصوں میں مختلف زمانوں میں قائم ہوتی رہی ہیں اس کی عظمت اور حکومتوں کی کثرت کے لحاظ سے گویا نہ ہونے کے مترادف ہیں۔ مثلاً ہندوستان کے اکبری عہد کا آئین یا اسی قبیل کی بعض چیزیں۔

لیکن واقعہ یہ ہے کہ قانون سازی اور آئین طرازی کے سلسلے میں مسلمانوں نے جو کام کیا ہے دعویٰ کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ موجودہ زمانہ کی قانونی حکومتوں کے آئینی خدمات اور کتابیں ابھی مسلمانوں کی کتابوں کے حساب سے کماً کیفاً بہت پیچھے ہیں۔ جیسا کہ بتایا جا چکا کہ مسلمانوں کی آئینی خدمت ابتدا سے آخر وقت تک علماء کے سپرد رہی اور فقہ و اصول فقہ کے نام سے نہ صرف حنفی علماء بلکہ ان کے سوا مالکیہ شافعیہ حنابلہ وغیرہ نے جو کام کیا ہے اور آئین و قانون پر جو کتابیں لکھیں ہیں' جو سرمایہ ضائع ہو چکا ہے اس کو تو جانے دیجئے۔ کتب خانوں میں اب بھی جو کچھ موجود ہے میں تو نہیں جانتا کہ دنیا کی کوئی قوم اتنا بڑا قانونی سرمایہ پہلے زمانے میں تو کیا کسی زمانے میں بھی پیش کر سکتی ہے؟ متون' شروح' حواشی کے سوا وقائع و نوازل' حوادث و فتاویٰ جن کی حیثیت گویا وہی ہے' جو آج کل کی عدالتوں میں نظائر کی ہے' بلکہ نظائر کی تدوین و ترتیب کا خیال بھی کوئی تعجب نہیں کہ مسلمانوں کی ان ہی کتابوں کو دیکھ کر پیدا ہوا ہو' بہر حال فقہ کی کتابوں کی ان مختلف قسموں کے سلسلے میں چھوٹی بڑی جو کتابیں لکھی گئی ہیں کیا آدمی ان کو گن سکتا ہے' ان میں بعض بعض کتابیں پچاس پچاس ساٹھ ساٹھ بلکہ اسی اسی سو سو ضخیم جلدوں پر مشتمل ہیں مبسوطات اور حاویات یا محیط کے نام سے جو فقہی انسائیکلوپیڈیا ئیں مختلف اعصاء و قرون میں مدون ہوئی ہیں' کیا دنیا کی کوئی قوم اپنے پاس ایسی قانونی کتابیں رکھتی ہیں۔؟

کچھ بھی ہو' ہوا تو یہ کام ہے صدیوں میں' لیکن انصاف کا تقاضا یہی ہے' واقعات اس کے شاہد ہیں کہ ان ساری قانونی اور فقہی سرگرمیوں کا ابتدائی سرچشمہ اسی شخص کی ذات بابرکات تھی جس کے متعلق سمجھا جاتا ہے کہ پیغمبر اسلام ﷺ نے:

لو کان الایمان بالثریا لتناوله رجال من فارس. (ترمذی)	اگر ثریا ستارے تک چڑھ کر ایمان (زمین) چلا گیا تو فارس (ایران) کے لوگ اس کو پالیں گے۔

کے الفاظ میں پیش گوئی فرمائی تھی فاللھم ارحمه واغفرله والناوالجمیع المسلمین.

مناظر احسن گیلانی
جوار الجامعۃ العثمانیہ حیدر آباد دکن